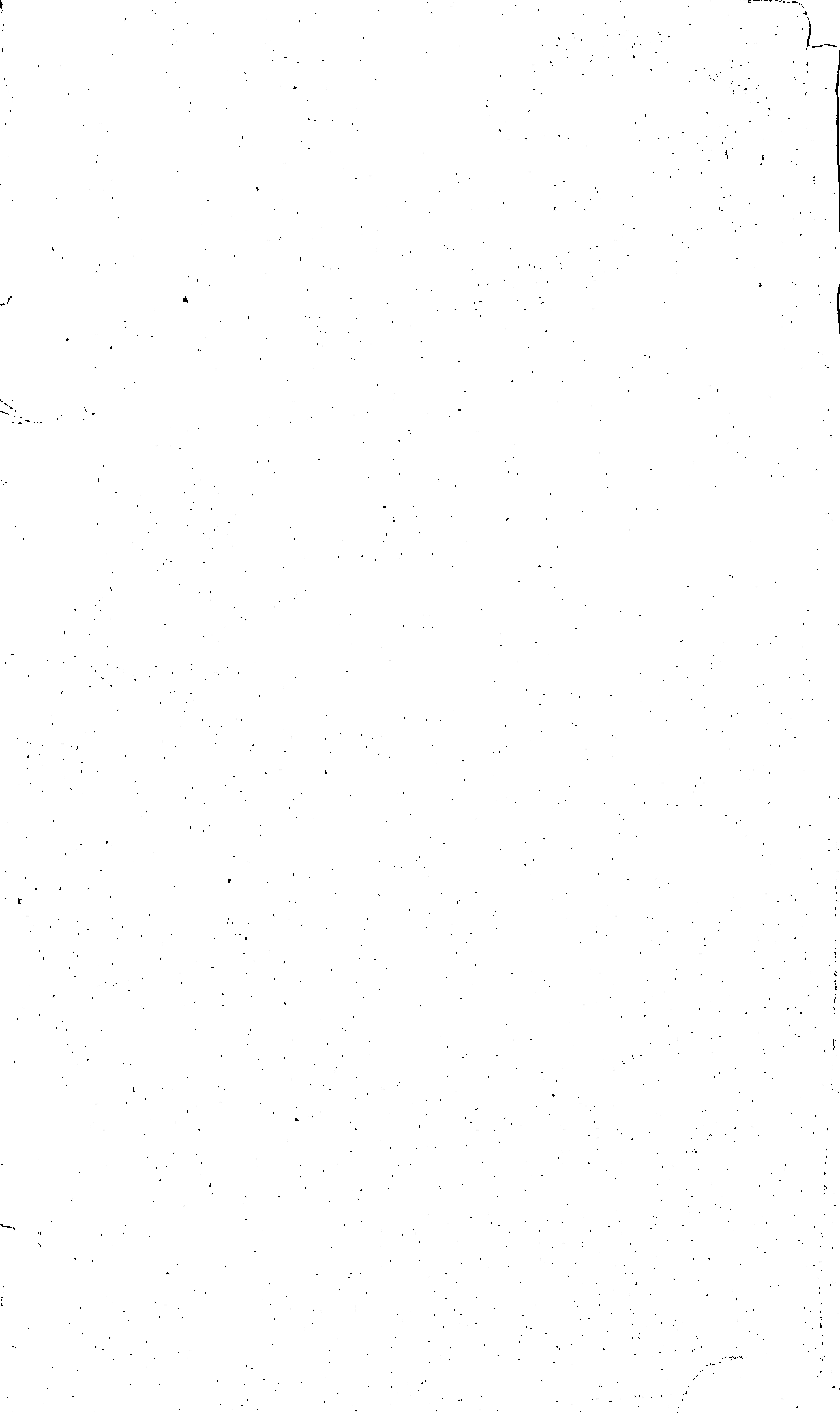
اردو میں تاریخ ادب عربی پر جامع و مستند کتاب
جس میں عربی زبان کے تمام قدیم و جدید بلند پایہ
ادبا و شعراء اور مفکرین کے حالات اور ان کے کلام
کا منتخب نمونہ درج ہے۔ اردو میں عربی ادب کے
متعلق اتنی معلومات اب تک کسی کتاب میں موجود نہیں

از
استاذ احمد حسن زیات

ترجمہ
عبدالرحمن طاہر سورتی
[illegible]

تاریخ ادب عربی

تاریخ ادبِ عربی



تاریخ ادب عربی

اردو میں تاریخ ادب عربی پر جامع و مستند کتاب جس میں
عربی زبان کے تمام قدیم و جدید بلند پایہ ادبا و شعراء و
مفکرین کے حالات اور ان کے کلام کا منتخب نمونہ درج
ہے۔ اردو میں عربی ادب سے متعلق اتنی معلومات اب
تک کسی کتاب میں موجود نہیں ہیں۔

از

استاذ احمد حسن زیات

ترجمہ

عبدالرحمٰن طاہر سورتی

مؤسس انجمن ترقی عربی (پاکستان)

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پرنٹرز
جامعہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

مقامِ اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور



ہدیۂ تشکر

الحمد للہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ و

صحبہ اجمعین۔

تاریخ ادب عربی کا یہ ترجمہ ۱۹۴۷ء میں مجلس نشر و تالیف بھوپال کے ڈائرکٹر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے ایماء پر شروع کیا گیا تھا، اُسی زمانہ میں جب کہ اس کام کا بیشتر حصہ مکمل ہو چکا تھا، وہ مجلس توڑ دی گئی اور یہ کام تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ الحمد للہ کہ اب یہ عظیم کام ہدیہ ناظرین ہو رہا ہے۔ اس موقع پر میں اپنے محترم بھائی جناب عبید بن محمد عرب، پروفیسر شعبۂ عربی، حمیدیہ کالج، بھوپال کا شکر گذار ہوں، جن کی کوشش سے محفوظ رہی اور مجھے واپس مل گئی۔

مخلص

عبدالرحمن طاہر سورتی

۴ جون ۶۱ء

فہرست ترجمہ تاریخ ادب عربی

مضمون

تیسری فصل۔ شاعری

صفحہ	مضمون

صفحہ | مضمون

صفحہ	مضمون

مضمون | صفحہ

صفحہ	مضمون
۳۳۸	خوارزمی ۔ حالات زندگی ۔ ادب و انشاء میں اس کا مرتبہ ۔ اس کا منتخب کلام ۔ شاعری کا نمونہ ۔
۳۴۰	بدیع الزمان ہمدانی ۔ حالات زندگی ۔ اخلاق اور خداداد صلاحیتیں ۔ اس کی نثر و نظم ۔ مقامات ۔ منتخب نثر و نظم کا نمونہ ۔
۳۴۴	حریری ۔ حالات زندگی ۔ اس کی نثر و نظم ۔ اس کی تصانیف ۔ مقامات ۔ مقامات کے عیوب ۔ مقامات کی تالیف کا سبب ۔ منتخب کلام ۔ (نثر و نظم)
۳۴۷	قاضی فاضل ۔ حالات زندگی ۔ انشاء پردازی میں اس کا مرتبہ ۔ نمونہ نثر ۔
۳۴۹	چوتھی فصل ۔ شاعری پر تمدن و سیاست کا اثر ۔ شاعری کی شکل، اوزان و بحور اور موضوعات پر تہذیب و تمدن کی اثر اندازی ۔ علوم کے ترجمہ کا اثر شاعری پر ۔ سیاسی گروہ بندی اور شاعری ۔ خلفاء کی طرف سے شاعری کی حوصلہ افزائی ۔ اس حوصلہ افزائی کے فائدے اور نقصانات ۔ عہد سلجوقی میں شاعری کی حالت ۔
۳۵۴	عباسی دور کی شاعری کے نمونے :- شجاعت ۔ مدح ۔ مرثیہ ۔ ہجو ۔ وصف ۔ حکیمانہ اور ضرب المثل اشعار ۔ معذرت خواہی اور استعطاف ۔
۳۶۶	پانچویں فصل ۔ مولد شعراء ۔ شاعری کا ارتقاء ۔ شاعری میں موالیوں کی اثر اندازی ۔
۳۶۶	بغداد کے شعراء :-
۳۶۹	بشار بن برد ۔ حالات زندگی ۔ اس کا حلیہ اور اخلاق ۔ اس کی شاعری کے عیوب ۔ شاعری کا نمونہ ۔
۳۷۲	ابو العتاہیہ ۔ حالات زندگی ۔ حلیہ اور اخلاق ۔ اس کی شاعری ۔ نمونۂ شاعری ۔
۳۷۶	ابو نواس ۔ حالات زندگی ۔ حلیہ اور اخلاق ۔ شاعری میں اس کا مقام ۔ شاعری کا نمونہ ۔
۳۸۱	ابن الرومی ۔ حالات زندگی ۔ اس کی شاعری ۔ شاعری کا نمونہ ۔

صفحہ | مضمون

صفحہ	مضمون

صفحہ	مضمون

صفحہ | مضمون

صفحہ | مضمون

مضمون | صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

وجہ انتخاب "تاریخ ادب عربی" کا یہ ترجمہ جسے ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں مصر کے مشہور و فاضل ادیب جناب احمد حسن زیات کی تالیف ہے یوں تو عربی زبان میں تاریخ ادب عربی کے موضوع پر اور بھی متعدد تصانیف ہیں، لیکن احمد حسن زیات کی "تاریخ الادب العربی" کو اختصار و جامعیت کے لحاظ سے ان سب پر فضیلت حاصل ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے اردو ترجمہ کے لیے انتخاب کیا ہے۔ بلاشبہ مصنف نے بڑی تحقیق و کاوش سے کام لے کر اس گرانقدر کتاب کو مرتب کیا ہے، اور اس کے ذریعہ عربی ادب میں ایک نہایت مستند مرجع و ماخذ کا اضافہ کیا ہے، جس پر عربی کا ہر طالب علم ان کا شکر گذار رہے گا۔

عربی ادب کی اکملیت اور عربی زبان کی افضلیت: عربی ادب کا سرمایہ متعدد وجوہ کی بناء پر بڑی وسعت اور عظیم اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے قدیم زمانہ میں دنیا کی تمام ترقی پسند اقوام کے علوم و فنون و آداب کو نہایت کشادہ ظرفی سے اپنے اندر محفوظ کر لیا تھا اور آج بھی یہ دنیا کی جدید علمی تحقیقات اور ادبی تصانیف کو اپنے اندر جذب کر لینے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کر رہا ہے۔ اس طرح دنیا کی تمام زبانوں میں صرف عربی زبان ہی کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ بیک وقت علوم قدیمہ و جدیدہ کا تمام ضروری و کار آمد سرمایہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کی زبانوں میں سے صرف ایک زبان سیکھ کر تمام دنیا کی مختلف زبانوں کے آداب و ادیان اور فلسفہ و حکمت کے مطالعہ کرنے کا متمنی ہے تو اس کی یہ تمنا صرف عربی زبان ہی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ یورپ کے محققین تکمیل تحقیق کے سلسلہ میں عربی زبان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اپنی اس فضیلت کے ساتھ عربی زبان کو ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے اور وہ یہ کہ دین اسلام کا تمام بنیادی سرمایہ صرف اسی ایک زبان میں ہے اور دنیا کی کوئی دوسری زبان اس فضیلت میں اس کی شریک و سہیم نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ متفقہ طور پر بین الاسلامی زبان بن گئی ہے اور دنیا میں کوئی انفرادی یا اجتماعی تحریک عربی زبان کو ترک کرنے کے بعد بین الاسلامی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی۔

عربی زبان کو قدرت نے بے شمار لفظی و معنوی محاسن و فضائل سے نوازا ہے، اگر ہم اس زبان کی صوتی و معنوی ہم آہنگی پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ زبان ہر معنی کے لیے ایک خاص آواز رکھتی ہے۔ اس میں حروف کی حرکت و تکرار ایک مخصوص معنی کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے۔ حروف کی قلت و کثرت معنی میں کمی بیشی کا سبب ہوتی ہے۔ پھر مختلف اوزان اور ان کے مطابق مادہ سے مشتقات کا ایک معین معنی کے لیے مخصوص ہونا اس امر کی بین شہادت ہے کہ یہ زبان انتہائی سائنٹفک، مرتب اور با اصول و باقاعدہ

ہے۔ اس زبان کے قواعد و اصول کا گہرا مطالعہ اس زبان کے مختصر و جامع ہونے کی بین شہادتیں پیش کرتا ہے اور ان تمام امور پر غور و خوض سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے آخری ضابطۂ حیات عربی زبان ہی میں کیوں بھیجا گیا۔

دنیا اب سمٹ کر ایک محلہ بن گئی ہے۔ رفتہ رفتہ یہاں رہنے والوں کے باہمی تعصبات بھی فناء ہوتے جا رہے ہیں، انسانیت متحد ہونے اور ایک دوسرے سے قریب تر ہونے کے لیے بے تاب و بےقرار ہے۔ وہ دن بہت قریب ہے جب دنیا کی تمام قومیں مل کر ان حجابات کے ازالہ کی کوششیں کریں گی جو بھائیوں سے ملنے میں مانع بنے ہوئے ہیں، اور اس وقت زبانوں کے حجابات بھی زیر بحث آئیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ انسانیت تعصبات سے بالاتر ہو کر باہمی افہام و تفہیم کے لیے شدت سے ایک زبان کی ضرورت محسوس کرے گی، اس وقت تمام زبانوں کو تحلیل و تجزیہ کے لیے غیر متعصب معملوں میں بھیجا جائے گا اور جب ہر اثر و رسوخ اور رعایت و تعصب سے بالاتر ہو کر ایک ایسی با اصول اور سائنٹفک، کامل اور جامع و مختصر زبان کی تلاش کی جائے گی جو باریک سے باریک معنی کے اظہار اور نازک سے نازک مسئلہ کی توضیح و تشریح اور جدید سے جدید تقاضوں کو باحسن وجوہ پورا کرنے پر قادر ہونے کے ساتھ آسان بھی ہو، تو وہ زبان عربی کے سوا کوئی دوسری زبان نہ ہو سکے گی، اور اس وقت اپنے تجربہ کے بعد انسان اس سربستہ راز کو فاش کرے گا کہ بنی نوع انسان کے لیے آخری کتاب ہدایت اور معلم کتاب، عربی زبان سے کیوں وابستہ کیے گئے تھے۔

ادب اور اس کی مختلف تعریفیں: "ادب" کیا ہے اس کا جواب مختلف علماء مختلف پہلوؤں سے دیتے چلے آئے ہیں، پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ادب نام ہے ایک آمیزہ کا جس میں زبان سے متعلق جملہ علوم ہوں مثلاً صرف و نحو، معانی و بیان و بدیع، لغت و اشتقاق، خط و تحریر، عروض و قافیہ، شعر و نثر وغیرہ۔

علماء عرب کا ایک گروہ اس سے آگے بڑھ کر ادب کی تعریف میں کہتا ہے کہ یہ ان تمام علوم و معارف اور جملہ معلومات پر حاوی ہے جو انسان تعلیم و تدریس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور اس میں صرف و نحو، علوم و بلاغت، شعر و نثر، امثال و حکم، تاریخ و فلسفہ، سیاسیات و اجتماعیات سب ہی شامل ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ابن قتیبہ نے "ادب الکاتب" میں ادیب کے لیئے ریاضیات اور دیگر صنعتیں جاننے کی شرط لگائی ہے۔ ادب کے ضمن میں علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کوئی ایسا لفظ نہیں جس کے معنی معین و محدود ہوں، بلکہ اس کا اطلاق ہر اس لفظ پر ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ انسان اخلاق و آداب سیکھے، تعلیم و تربیت حاصل کرے اور اپنے نفس کو شائستہ بنا کر کردار کی بلندی پیدا کرے۔

صاحب تاج العروس ادب کی بحث میں لکھتا ہے کہ یہ لفظ علوم عربیہ کے معنوں میں بعد کی پیداوار ہے یعنی عہد اسلام میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ عجمیوں سے اختلاط کے باعث اس لفظ کو مسلمانوں نے وسیع مفہوم میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے حتیٰ کہ لفظ "ادب" علوم و اخلاق

فنون و صنعت سب ہی کو اپنے اندر لے لیتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس لفظ کا اطلاق موسیقی، شطرنج، طب انجنیئری، فوجی علوم نیز دیگر علوم عرب کے سوا گفتگو کے اقتباسات، کہانیوں اور مجلسی باتوں پر بھی ہو جاتا ہے۔

علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں علم ادب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ادب سے مراد ہے زبان کا خلاصہ اور اس کا نچوڑ نیز اسالیب عرب کے مطابق نظم و نثر میں عمدگی پیدا کرنا۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ جب عرب اس فن کی معین تعریف کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں "ادب" عربوں کی شاعری اور ان کی تاریخ و اخبار کو حفظ کرنے نیز ہر علم میں سے کچھ حصہ اخذ کرنے کا نام ہے، اور علم سے مراد ہے وہ علوم جو زبان سے متعلق ہوں یا علوم شرعیہ کے متون جو قرآن و حدیث پر منحصر ہیں"۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ دراصل اس علم سے غرض یہ ہے کہ عربی عبارت اور اس کے اسالیب سمجھنے کا ملکہ پیدا ہو جائے تاکہ جب کلام عرب سامنے آئے تو اس کا کوئی پہلو نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے۔ ادب کی اس تعریف کے بعد ہمیں ابن خلدون کا وہ جملہ سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آتی جس میں وہ کہتا ہے:۔

ہم نے اثنائے درس میں اپنے اساتذہ کی زبانی سنا ہے کہ اس فن (ادب) کے اصول و ارکان چار کتابوں میں جمع ہیں اور وہ ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب" مبرد کی "الکامل" جاحظ کی "البیان والتبیین" اور ابو علی قالی کی "کتاب النوادر" ہیں"۔

کشف الظنون میں ادب کی تعریف کے تحت لکھا ہے:۔

"ادب وہ علم ہے جس کے ذریعہ عربی زبان بولنے اور لکھنے میں غلطیوں سے محفوظ رہ جائے"۔

جرجانی نے اپنی تعریفات میں لکھا ہے:۔

"یہ لفظ ان تمام معلومات پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ ہر قسم کی خطا سے محفوظ رہا جا سکے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ادب علوم و فنون کی روح، ہماری زندگیوں کا ماحصل، ہمارے افکار و جذبات و احساسات کا خلاصہ، اور انسانی عقول و نفوس اور قلوب و اجسام پر حکمرانی کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ ادب ایک موثر قوت ہے جو انسانوں کے احساسات پر قابو پا کر ان کو اپنا تابع فرمان بنا لیتی ہے اور ان کے اخلاق و عادات کو اپنے ساز کی تاثیر سے قوموں کو مست خرام اور مائل بہ عمل رکھتی ہے۔ ادب سان ہے جس کے ذریعہ قوموں کے دلوں اور ان کے اخلاق کو صیقل کیا جاتا ہے۔

ادب حسین الفاظ اور شگفتہ اسلوب میں مافی الضمیر کے اظہار کا نام ہے، تاکہ ان ذرائع سے کام لے کر معانی براہ راست سامع یا قاری کے دل میں ڈال دیئے جائیں، اور اس طرح کاتب و شاعر لوگوں سے جو کچھ کرانا چاہتا ہو اس میں کامیاب ہو جائے۔ اور اسی اثر آفرینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا" ان من البیان لسحرا و ان من الشعر لحکمۃ۔"

ادب اپنے زمانہ کی پوری تصویر اور صحیح تاریخ ہوتا ہے۔ آپ کسی زبان کے ایک دور کا ادب پڑھ کر اس عہد کے لوگوں کے اعتقادات، علمی سطح اور ان کی عملی فنون کا پورا پورا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ادب کی دو قسمیں: ادب میں انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے جذبات و احساسات، میلانات و عواطف میں اختلاف ہوتا ہے اور اسی طرح مختلف اوقات میں انسانوں کے مختلف جذبات و عواطف بیدار ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ نئے نئے تقاضے پیدا کرتے ہیں لہٰذا ان تمام جذبات و احساسات کے تحت مختلف تقاضوں کی موثر تعبیر ادب کے نام سے یاد کی جائے گی۔ انسانوں کے جذبات و میلانات کبھی بلند ہوتے ہیں اور کبھی پست، انسانیت کے احتیاجات و مقتضیات کبھی عالیہ ہوتی ہیں اور کبھی سافلہ، لہٰذا ادب کے بھی دو حصے ہو جاتے ہیں۔ جو ادب مقتضیات عالیہ کی ترجمانی کرتا ہے وہ ادب عالی، اور جو احتیاجات سافلہ کی ترجمانی کرتا ہے وہ "ادب سافل" کہلائے گا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو کامل ادب وہی ہوگا جو تمام مقتضیات انسانیت کو پورا کر رہا ہو۔ ادب کی اس تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم کسی زبان کے ادب کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں اس کی شاعری اور نثر میں تنوع مضامین، اختلاف آراء و افکار، تباین احساسات و جذبات دیکھنے پر کوئی تناقض و تضاد نظر نہ آئے گا۔

عربی زبان پر خدا کی عنایت خصوصی: عربی زبان اور اس کے ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات کھل کر واضح ہو جاتی ہے کہ اس زبان و ادب پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات رہی ہیں، خدا جب کسی انسان کو نبوت کے لیے چنتا ہے تو اسے ایک خاص انداز اور مخصوص ماحول میں پروان چڑھاتا ہے، اسی طرح جب اس نے عربی زبان کو اپنے آخری پیغام ہدایت کے لیے انتخاب فرمایا تو اس کو ابتداءً ایک خاص انداز سے اپنی نگرانی و حفاظت میں پروان چڑھایا اور جب اس زبان کا ادب استعداد و صلاحیت کے اس بلند مقام پر پہنچا جہاں وہ روح خداوندی کا متحمل ہو سکے تو اس میں قرآن مجید نازل کیا گیا جو ادب عربی کا اعلیٰ و اکمل نمونہ ہے۔

قرآن مجید عربی ادب کی بلند ترین مثالی کتاب ہے: قرآن مجید نے ادب میں حریت فکر، وسعت نظر، پاکیزگی تخیل، بلندی معنی پیدا کیے۔ ادب عربی قرآن مجید سے قبل لفظی حسن و شوکت کے ساتھ بیشتر جذبات سافلہ کی ترجمانی میں لگا ہوا تھا۔[1] قرآن مجید نے آکر ادب عربی کو لفظی و معنوی حسن[2] کے ساتھ جذبات عالیہ کی ترجمانی کے آداب سکھائے اور یہ قرآن مجید کی تعلیم ہی کا فیضان ہے کہ آج عربی زبان تمام دنیا کے علوم و افکار سے بھری پڑی ہے۔ میری نظر میں عربی زبان و ادب کا محور قرآن مجید ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ زبان قرآن مجید کو اپنے اندر لینے کی تیاریاں کر رہی تھی اور قرآن مجید کے بعد یہ اسی کی خادم بنی رہی۔ اس ضمن میں بطور ثبوت اتنا بتا دینا کافی

---

[1] اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ادب جاہلی میں بلند معانی و مطالب بالکل نہ تھے۔ عربوں میں آزادی و خودداری، جود و سخا اور بہادری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور قوم میں جو عادات و خصائل ہوتے ہیں وہی اس کے ادب میں نمایاں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جاہلی ادب میں فخر و حماسہ، عزت نفس، آزادی اور جود و سخا کی ترجمانی مختلف اسالیب کے ساتھ بکثرت ملتی ہے۔

[2] قرآن مجید نے لفظی شوکت و بلندی کا کس قدر اہتمام کیا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے راغب اصفہانی نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہے کہ ادب جاہلی کا جو سرمایہ آج محفوظ شکل میں مل رہا ہے وہ سب قرآن مجید کی زبان کو محفوظ کرنے اور اسے سمجھنے کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ اسی طرح صرف ونحو، معانی بیان، لغت وتفسیر، حدیث وفقہ، علم کلام سب ہی قرآن مجید کے معانی و مطالب حل کرنے اور اس کے اوامر ونواہی کی شرح کرنے کے لیے وجود میں آئے حتیٰ کہ عربوں نے جب تاریخ و جغرافیہ اور دیگر علوم کو اپنایا تو وہ بھی قرآن مجید کے احکام و ہدایات کو سمجھنے اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی ایک کوشش تھی۔ تاریخ ادب عربی کا مطالعہ کرنے والا دیکھے گا کہ یہ زبان جن نازک مرحلوں سے معجزانہ طور پر جان بچا کر نکل آئی یہ محض قرآن مجید کی قوت کا نتیجہ تھا ورنہ دنیا کی بے شمار زبانیں اس سے بھی کمتر صدمات کی تاب نہ لاکر زندگی کھو بیٹھیں اور آج ان کا نام بھی لوگ نہیں جانتے۔

قرآن مجید نے الفاظ و معانی کے ضمن میں عربی زبان کی امکانی وسعتوں کو آشکارا کیا۔ اثر آفرینی کے سلسلہ میں حقائق پسندی، نفع بخشی اور افادی ہمہ گیری کو ملحوظ رکھنے کا درس دیا اور حقیقت پسند ادب کا عملی نمونہ پیش کرتے ہوئے اس قدیم مقولہ کی تردید کر دی کہ ان اعذب الشعر اکذبہ۔ قرآن مجید نے ادب کو پاکیزہ و بلند اقدار سے شناسا کیا اور ادب کا مقصود تزکیہ نفوس متعین کیا۔ اس نے بتایا کہ انسانوں کو دیگر حیوانات سے جو صفت ممتاز کرتی ہے وہ ادبی تخلیق کی طاقت ہے۔ قرآن مجید نے ادب کے لیے جو نام انتخاب کیا وہ "البیان" ہے سورۂ الرحمٰن میں جہاں اس نے "علّمہ البیان" کہا ہے تو اس سے مراد "ادب" بھی ہے۔

قرآن مجید نے ادب کا رخ عدل و انصاف، خدمت انسانیت، تائید حق و صداقت، نفاست پسندی، عفت وحیا اور خدا پرستی کی طرف پھیر دیا، اس نے ہر موضوع کو بیان کرنے کے لیے مناسب و پروقار اسالیب بخشے، غور وفکر اور دلائل و براہین سے کام لینے کی دعوت دی۔ قرآن مجید نے بتایا کہ ادب کا فریضہ یہ ہے کہ وہ طیبات کو معاشرہ میں مقبول بنائے اور خبائث کے لیے معاشرہ کی فضا ناسازگار بنا دے۔

قرآن مجید نے ادب کو یاس وقنوط کے مہلک جراثیم سے نجات دلا کر اسے جہاد مسلسل اور حیات آفریں رجائیت کا داعی بنایا۔ تنقید کے لیے بلند اصول دیئے اور "احسن" اختیار کرنے میں کسی قسم کا تعصب نہ کرنے کی تلقین کی اس نے مدح وہجو کے لیے نئے پیمانے مقرر کیے اور "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" کا بلند ترین معیار عطا فرمایا۔

قرآن مجید نے عربی ادب میں حقائق کا اس طرح خمیر اٹھایا کہ اس کے بعد جس زبان میں بھی کسی شکل سے عربی ادب پہنچا اس خمیر کی تاثیر نے اُس زبان کو بھی فکری ومعنوی بلندیوں سے ہمکنار کر دیا۔ آج دنیا کے ادب میں وحدت عالم، وحدت انسانیت، آزادی اور اخلاق فاضلہ کی جو حوصلہ افزائی ہو رہی ہے وہ اسی قرآنی ادب کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اور اگر آج انسانیت اپنی آنکھوں سے تعصبات کی عینکیں اتارنے کی کوشش کر رہی ہے تو یہ اسی ادب قرآنی کے فیض کا ثمرہ ہے۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ) لکھا ہے کہ قرآن مجید نے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو بظاہر چھوٹے اور مختصر ہیں لیکن بڑی معنوی وسعت و ہمہ گیری رکھتے ہیں، نیز یہ کہ قرآن مجید کے مستعملہ الفاظ عربی زبان کا گودا ہیں۔

اس جگہ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم قرآن مجید سے پہلے اور قرآن مجید کے بعد عربی ادب سے مثالیں پیش کر کے اپنے دعوی کا ثبوت فراہم کریں اس لیے کہ تاریخ ادب عربی کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی ادب میں قرآنی انقلاب کی تاثیر کو پوری شدت و قوت سے محسوس کر لے گا۔

اردو ادب میں گرانقدر اضافہ: ہم ادب اُردو میں عربی کے اس گرانقدر اور عظیم سرمایہ کا اضافہ کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ اس اضافہ سے ہمارے ملک کے شعراء و ادباء عربی ادب سے قریب تر ہو سکیں گے۔ عربی ادب کی لذت و حلاوت سے بہرہ ور ہوں گے۔ عربی ادب کے نامور ادیبوں شاعروں اور مفکروں سے متعارف ہوں گے اور عربی ادب کے قدیم و جدید رجحانات کا مطالعہ کر سکیں گے۔

دولت خداداد پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں اور پڑوسیوں کو سمجھنے اور خود کو انہیں سمجھانے کی کوششیں مستحکم بنیادوں پر استوار کریں۔ ان مسلمانوں کا بڑا حصہ وہ ہے جو عربی زبان بولتا اور سمجھتا ہے۔ "تاریخ ادب عربی کا یہ ترجمہ ہمیں اپنی اسلامی میراث اور اپنے مسلمان بھائیوں سے قریب تر کرنے کا ایک اچھا موقع دے گا۔

کسی زبان کے ادب کو آسودہ و توانا بنانے اور اس میں وسعت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کی تاریخ موجود ہو اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عربی جیسی جامع و کامل زبان کی تاریخ ادب کا ترجمہ اردو زبان کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ام الالسنۃ: عربی زبان کے ام الالسنۃ ہونے میں شک نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک ثبوت تو خود عربی زبان کے آغاز و ارتقاء کا مسئلہ ہے جو آج تک راز بنا ہوا ہے اور موجودہ علمی تحقیقات اس کا صحیح جواب دینے میں ناکام رہی ہیں۔ پھر قرآن مجید میں "ام القری" کا لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں انسانی اجتماعیت کا آغاز مکہ سے ہوا، اس خیال کو خانہ کعبہ کے لیے" اول بیت وضع للناس" سے تقویت پہنچتی ہے، ظاہر ہے کہ جہاں انسان نے سب سے پہلے اجتماعیت پیدا کی اور خدا کی عبادت شروع کی وہیں سب سے پہلے انسانوں نے زبان بھی بنائی ہوگی، لہذا "ام القری" کی زبان" ام الالسنۃ" ہی ہوگی۔ مجھے خوشی ہے کہ اس ضمن میں عزیز فاضل افتخار اعظمی صاحب کا ایک مقالہ "حرف آغاز" کے عنوان سے پیش کر رہا ہوں، جس میں انہوں نے اپنے علم لسانیات کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عربی زبان ہی ابتدائی اور فطری آوازوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے "ام الالسنۃ" کہلانے کی مستحق ہے۔ موصوف کا یہ مقالہ بہر حال "حرف آغاز" ہے جو مزید غور و فکر کرنے والوں کے لیے اساسی مواد فراہم کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین اس اہم موضوع سے دلچسپی لیں گے۔ ان کے اس مقالہ کے بعد آپ اصل کتاب تاریخ ادب عربی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں گے۔

اعتذار: ہم قارئین کی خدمت میں ادب عربی کا ترجمہ پیش کرنے سے قبل معذرت خواہ ہیں کہ یہ ترجمہ آج سے تقریباً پندرہ سال قبل کیا گیا تھا۔ اور باوجود نظر ثانی کے اس میں علمی و ادبی خامیاں رہ جانے کے امکانات ہیں۔ بہر حال یہ ایک کوشش تھی جسے اردو دان حضرات کے لیے پیش کرنا فائدہ سے خالی نہ تھا۔ عربی طلبہ کے لیے ہم نے

عربی اشعار بھی دے دیئے ہیں تاکہ وہ خود بھی ان کے ذریعہ عربی زبان کی حلاوت سے بہرہ ور ہو سکیں۔ میں ان حضرات کا شکر گذار رہوں گا جو میری کسی خامی اور کوتاہی سے مجھے مطلع فرما کر میری اصلاح کریں گے۔

والسلام

عبدالرحمٰن طاہر سورتی

انجمن ترقی عربی (پاکستان) - لاہور

یکم مئی ۱۹۶۱ء



حرفِ آغاز

از

افتخار احمد اعظمی

زبان کی ابتدا کیوں کر ہوئی :- بولنا یا بات چیت کرنا انسان کی ان خصوصیات میں سے ہے جو اُسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں، لیکن یہ ایک قدیم سوال ہے کہ بولنا انسان نے کیسے سیکھا اور زبانیں کیوں کر وجود میں آئیں۔ قرآن اجمالاً اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ انسان کو بولنا خدا نے سکھایا:-

خلق الانسان ہ علمہ البیان ہ — اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان دادائے مافی الضمیر سکھایا۔

لیکن یہ کہہ کر ہمیں اس سوال پر غور و فکر کی ترغیب بھی دیتا ہے کہ ان گوناگوں زبانوں میں بے شمار اسرار و حقائق پوشیدہ ہیں:-

ومن آیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذالك لآیات للعلمین ہ — ارض و سما کی تخلیق، زبانوں اور رنگوں کا اختلاف، آیات الٰہی میں سے ہے۔ اس میں ارباب نظر کے لیے غور و فکر کے مقامات ہیں۔

وہ انسان کی تخلیق کے متعلق اتنا اشارہ کرتا ہے کہ خدا اس کا خالق ہے لیکن تفصیل سے نہیں بتاتا کہ آیا کس تدریجی رفتار سے اُسے بنایا اور کن مادی اجزا سے اس کا ہیولیٰ تیار کیا، اگرچہ وہ اس موضوع کو جا بجا زیر بحث لاتا ہے تاہم اس مسئلے کی تحقیق اس نے ہمارے اوپر چھوڑ دی ہے تاکہ ہم خود غور و فکر کر کے اس مسئلہ کو حل کریں، چنانچہ وہ کہتا ہے:-

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدأ اللہ الخلق ثم یعیدہ ہ — تم زمین میں سیر و سیاحت کرو اور دیکھو کہ خدا نے خلق کی ابتدا کیوں کر کی اور پھر وہ اس کا اعادہ کیسے کرتا ہے؟

اسی طرح زبانوں کے اسرار و حقائق معلوم کرنا بھی ہمارے ذمے کر دیا ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ زبانوں کی پیدائش کے بارے میں تحقیق کریں اور ان کے اسرار و رموز کا سراغ لگائیں کیوں کہ مذہب جماعت انسانی کے عیوب کا پردہ چاک کرنے اور انسانی اعمال کی اصلاح کرنے کے لیے آیا ہے نہ کہ زبان یا آفرینش عالم کی تاریخ بتانے کے لیے۔

زبان کے تدریجی ارتقاء کی تاریخ بتانے کے لیے ہمیں انسان کے ابتدائی دورِ حیات کی مجمل آوازوں اور فطری بولیوں پر غور کرنا ہو گا تاکہ ہمیں تمدن کی تدریجی رفتار کا بھی اندازہ ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو سکے

کہ جوں جوں انسان کے تصورات میں اضافہ ہوتا رہا، آوازیں بھی بڑھتی رہیں۔ اس طرح تہذیب کا ایک خاکہ ہمارے ذہن میں آجائے گا۔

انسان اپنے ابتدائی دورِ حیات میں جانوروں کی طرح آوازیں نکالتا تھا جو اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوتی تھیں۔ اس کے قلب پر خارجی یا داخلی موثرات جیسا اثر ڈالتے، اس کی زبان سے ویسی ہی آوازیں نکلتیں۔ جس طرح جانور مختلف مواقع پر بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، یوں ہی انسان بھی بولتا تھا۔ . . . . .
. . . . بولیاں آواز کے اتار چڑھاؤ سے بدلتی رہتی ہیں، مثلاً مرغیاں انڈے دینا چاہتی ہیں تو کڑکڑاتی ہیں اور اپنے بچوں کو جب بلاتی ہیں تو کٹکٹاتی ہیں۔ بلیاں اپنے بچوں کی تلاش میں ہوں یا بھوک سے بے قرار تو "میاؤں میاؤں" کرتی ہیں اور اگر غصے میں ہوں تو غراتی ہیں۔ کتے اپنے ہم جنسوں کو دیکھتے ہیں تو بھونکتے ہیں، مالک پر ان کی نظر پڑتی ہے تو ایسی آوازیں نکالتے ہیں جو کچھ نرمی لیے ہوتی ہیں۔ سانپ غضب ناک ہے تو پھنکارتا ہے مور رقص نشاط سے پہلے مورنی کو اپنی جھنکار سے پیام دعوت دیتا ہے۔ شیر اپنے شکار پر جست سے پہلے دھاڑتا ہے تو شکم سیری کے بعد ڈکارتا ہے جس طرح مختلف جذبات کے تحت مختلف آوازیں جانوروں کے منہ سے بے ساختہ نکلتی ہیں، اسی طرح انسان بھی کبھی صرف طبیعی تاثرات سے مجبور ہو کر مختلف آوازیں نکالتا تھا جو جذبات کی عکاسی کرتی تھیں۔

عربی زبان کی قدامت:- ہماری موجودہ زبانیں ہزاروں برس کے پے در پے تغیرات کے باعث کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں پھر بھی ہمیں اپنے ذخیرۂ الفاظ میں کچھ ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہم کس طرح جذباتی بولیاں بولتے تھے۔ قریب قریب ہر زبان میں ان فطری بولیوں کے تھوڑے بہت آثار نظر آتے ہیں لیکن عربی زبان نے ابتدائی آوازوں کو صرف محفوظ ہی نہیں رکھا بلکہ وہ اُن تمام کڑیوں کا بھی پتہ بتاتی ہے جن کی طرف دنیا کی دوسری قدیم زبانیں کم رہنمائی کرتی ہیں۔ اگر عربی زبان کا سائنٹفک (علمیانہ) تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسان کی فطری بولیاں کیوں کر وجود میں آئیں اور انہوں نے رفتہ رفتہ ارتقائی مراحل طے کر کے متمدن الفاظ کی شکل کس طرح اختیار کی؟

فطری بولیاں (دورِ اول):- انسان کے جذبات و احساسات بے شمار ہیں لیکن پہلے پہل جب وہ رحم مادر سے عالم وجود میں قدم رکھتا ہے تو اسے دکھ کا احساس ہوتا ہے نہ اس کے ہاتھوں میں سکت ہوتی ہے اور نہ اس کے پاؤں میں طاقت، نہ اپنی غذا حاصل کرنے کی استطاعت ہوتی ہے اور نہ ماحول کے مضر اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت۔ ایسے عجز و ناتوانی کے عالم میں ہوا اس کے بدن کو چھوتی ہے تو چیخنے لگتا ہے، دھوپ کی گرمی اسے ستاتی ہے تو چلاتا ہے غرضیکہ یہی کمال نطق کا مدعی اس وقت ایسا بے زبان ہوتا ہے کہ چیخنے کے سوا اسے اظہار مدعا کا اور کوئی طریقہ معلوم نہیں ہوتا۔ وہ تکلیف کے اظہار کے لیے مختلف قسم کی چیخیں حلق سے نکالتا ہے "آؤں، آں، "آہ، "آخ" وغیرہ انسان کی ابتدائی چیخ پکار ہے اور "ہہ، ہا،" "ہاہا" "آہاہا" یہ سب خوشی کی آوازیں ہیں جو بالکل اسی طرح یا ادنیٰ تغیر منہ سے نکلتی تھیں۔ اس طرح کی تمام آوازیں جو رنج یا راحت کے اظہار کے لیے ابتداء

ہیں طبیعی طور پر زبان سے نکل پڑتی تھیں، اُن میں شعور و قصد کا کوئی دخل نہ تھا۔

دُکھ یا آرام کے احساس کے بعد انسان کو سب سے پہلے یا یوں کہنا چاہیے کہ مسرت و کلفت کے احساس سے بھی پہلے انسان کو دودھ پینے کی خواہش ہوتی ہے اور اسی کی خاطر وہ چیخ پکار کرتا ہے۔ بچہ "غوں، غاں" "آغوں، آغوں" دودھ کی خواہش کے لیے بولتا ہے اور منہ بند کر کے اپنے تصور میں دودھ پینے لگتا ہے تو اس سے ایک مبہم آواز نکلتی ہے جیسے عربی میں "غمغمۃ"۔ کہتے ہیں غَمْغَمَ الصبی علی لبان اُمہ"۔ یہی "غمغمہ" دودھ کی خواہش کے اظہار کے لیے پہلا شفحلقی[۵] لفظ ہے۔

یہی غمغمہ، "عیمۃ" (دودھ کی خواہش) "غیم" (پیاس) "اُوام" (پیاس) "ماء" (پانی) اور "اُم" (ماں) کا ماخذ ہے۔ اسی "غوں، غاں یا اوں، آں" کی طرح بچہ "اُم اُم" یا عم عم، زبان سے نکالتا ہے۔ ماں سمجھتی ہے کہ بچہ دودھ پینا چاہتا ہے۔ وہ آتی ہے اور اسے دودھ پلا دیتی ہے۔ اس طرح بار بار بچے کے منہ سے ایسی ہی آوازیں نکلتی ہیں اور اس کی خواہش ماں پوری کر دیتی ہے۔ بچہ بار بار کے تجربے سے یہ یقین کر لیتا ہے کہ اسی طرح بول کر اس کی بھوک کی تسکین ممکن ہے، اسی وجہ سے دودھ کی خواہش جب اُسے ستاتی ہے تو ایسی آوازوں میں وہ اُسے ظاہر کرتا ہے۔ دوسری طرف دیکھیے کہ ماں ان آوازوں کو سنتی ہے تو سمجھتی ہے کہ بچہ دودھ پینا چاہتا ہے اور اسی لیے اُسے بلا رہا ہے۔ ماں کے اس تصور "اُم اُم" "عم عم" اور "آم آم" ماں اور دودھ پینے کی خواہش کے لیے سمجھا جانے لگتا ہے اور یہی آوازیں رفتہ رفتہ سدھر کر "عام" (دودھ کی خواہش مند ہوا) اور "اُم" (ماں) بن جاتی ہیں۔ اسی طرح پیاس کے اظہار کے لیے "اُم اُم" "مم مم" "ما ما" جیسی آوازیں بچہ منہ سے نکالتا ہے جو تدریجی انداز میں خود بخود درست ہو کر "آم" (پیاسا ہوا) "ماء" (پانی) جیسے الفاظ کی شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔

وہ الفاظ جو تمام زبانوں کی مشترکہ میراث ہیں: "اُم" (ماں) "عیمۃ" (دودھ کی خواہش) "ماء" (پانی) جیسے الفاظ طبیعی اور فطری الفاظ ہیں اس لیے اُن کے مماثل الفاظ اگر کسی دوسری زبان میں ملیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ الفاظ عربی سے دوسری زبانوں میں گئے ہیں کیونکہ بچہ جہاں بھی پیدا ہو سب سے پہلے حلق سے بولے گا، پھر ہونٹوں سے اور یہ آوازیں ماں کو پکارنے یا اپنی بھوک پیاس رفع کرنے کے لیے نکالے گا۔ دوسری زبانوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی عربی کے "اُم" اور "ماء" جیسے الفاظ موجود ہیں۔ آریائی زبانوں میں لفظ "اُم" کے مماثل الفاظ ملتے ہیں۔ "ماں" "ماتا" ہندی میں اور "MOTHER" انگریزی میں ہے۔ "THER" لاحقہ ہے جو

---

[۴] "غمغمۃ الثور": خوف کے وقت بیل کی آواز "غمغمۃ الابطال": جنگ آزمائی کے وقت سورماؤں کی آواز۔ چونکہ یہ دونوں آوازیں مبہم ہوتی ہیں اس لیے مبہم کلام پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ لیکن ابہام کا مفہوم حکایت صوت سے بھی آیا ہے اور بچے کی غوں، غاں جیسی مبہم آواز سے بھی اس لیے یہ مفہوم دو مختلف لسانی شاخوں کے تصادم کی مثال ہے۔

[۵] یہ میرے استاذ علامہ ابوالجلال ندوی کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے۔ یہ دو لفظوں سے مرکب ہے اول شفوی دوم حلقی۔

(افتخار اعظمی)

رشتہ ظاہر کرتا ہے)

"ماء" اور "مم" تو بالکل ایک ہی ہیں۔ ہاں "ماء" "آب" اور "پانی"[1] "WATER"[2] جیسے الفاظ بظاہر ایک نہیں معلوم ہوتے لیکن تبادلۂ حروف کے اصول کو پیش نظر رکھیے تو معلوم ہو گا کہ "م" کا تبادلہ "ب" سے اور "ب" کا "پ" سے ہوتا ہے۔ اب "ماء" کو اُلٹیے تو "ام" ہو جائے گا۔ "ام" کے معنی عربی میں ہیں پانی کا خواہش مند ہوا۔ چونکہ "م" کا تبادلہ "ب" سے ہوتا ہے اور "ب" کا "پ" سے اور پ یا "ف" کا "و" سے اس لیے "ماء" اور "ام" نے "آب" "پانی" اور "WATER" کے سے الفاظ کی صورتیں اختیار کر لیں۔ یہ الفاظ تمام قوموں کی مشترکہ میراث ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان الفاظ میں سے کوئی لفظ بھی کسی نے دوسرے سے لیا۔ یہ الفاظ غالباً اُس زمانے کی بولیاں ہیں جب نسل انسانی ایک جگہ رہتی سہتی تھی ان بولیوں سے نوع انسانی کی وحدت کا پتہ چلتا ہے اور اس وحدت کی طرف عربی زبان کی ہمہ گیری و قدامت اشارہ کرتی ہے کیونکہ اُس کے دامن میں فطری بولیوں سے بنے ہوئے الفاظ اور اُن کی پھیلی ہوئی شاخیں تدریج و ترتیب کے ساتھ محفوظ ہیں۔

شغلقی الفاظ کا معنوی اشتراک:- بچہ سب سے پہلے حلق سے پہنچتا ہے (آ، عا، غا، خا، حا، ہا) پھر ہونٹوں کو کھول موند کر ما، با، وا، فا، جیسی آوازیں نکالتا ہے۔ ان دو طرح کی آوازوں کے اجتماع سے "غام" اور "ماء" جیسے الفاظ بنے جو ابتداء میں یقیناً مرادف رہے ہوں گے، بعد میں جب ان الفاظ کے معانی کثیر اور ان کے طرز ادا میں تغیرات کی وجہ سے تعدد پیدا ہوا تو مختلف مناسبتوں کا لحاظ کر کے ایک لفظ کو ایک معنی کے لیے اور دوسرے کو دوسرے معنی کے لیے خاص کیا گیا لیکن ان تغیرات کے باوجود "شغلقی" الفاظ باہم معنوی اشتراک رکھتے ہیں۔

فطری بولیوں سے مشتق الفاظ:- "غَیْمَۃ" (دودھ کی خواہش) شغلقی الفاظ میں بنیادی لفظ ہے۔ اس سے دو شاخیں پھوٹتی ہیں، ایک شاخ تو پانی اور اُس کے متعلقات کو اپنے دامن میں لیے ہے اور دوسری شاخ ماں، باپ اور دوسرے قریبی رشتوں کو اپنے اندر جذب کیے ہے۔

"غَیْمَۃ" — اس لفظ کے اصل معنی دودھ کی خواہش ہیں جو انسان میں فطری اور جبلی ہے۔ یہ ابتداءً صرف شیرخوار بچوں کے لیے مخصوص رہا لیکن زبان کے پیہم تغیرات کی وجہ سے اس کی تخصیص تعمیم میں بدل گئی مثلاً غَامَ الصَّبِیُّ فھو غیمان: بچہ دودھ کا خواہش مند ہوا۔ یہ تخصیص ہے اور غَامَ الرَّجل فھو غیمان: آدمی دودھ کا خواہش مند ہوا۔ یہ تعمیم ہے۔ اِغْتِیَام۔ اس لفظ کے حقیقی معنی دودھ لینے کے رہے ہوں گے لیکن بعد میں یہ ہر لطیف و خوش ذائقہ چیز کے انتخاب کے معنی میں استعمال ہونے لگا، گویا ہر خوش مزہ شئے شیر مادر ہے۔

"اُوام": پیاس۔ سخت پیاس (جس سے سر چکرا جائے) (سر چکرانا) آمَ النَّحْلَ اُوَامًا: شہد کی مکھیوں کو دھواں دیا گیا تاکہ وہ چکرا کر نکل بھاگیں اور شہد نکال لیا جائے۔ "اُوام" کا بنیادی مفہوم سخت پیاس کی وجہ سے سر چکرانے

---

[1] "پانی" میں اصل "پا" ہے اور "نی" "غنے کی آواز ہے [2] "TER" لاحقہ ہے، اصل "WA" ہے۔

کا تھا یہاں تشبیہ کی وجہ سے مفہوم میں تعمیم ہوگئی۔ اَم الرَّجُلُ الی المَرْأَۃ فھو ایمان: مرد عورت کا خواہش مند ہوا۔ یہاں جنسی خواہش کو پیاس قرار دیا گیا ہے۔ "اَلْاَیِّم" بیوہ (زوج سے محروم)۔

ھَامَ الرَّجُلُ: سخت پیاسا ہوا، سرگرداں ہوا۔ ھَیْمان: بے حد پیاسا۔ ھَیْمَاء: پیاسی زمین۔ ھائم: پیاسا۔ سرگرداں۔ ھُیام: جنون۔ جنون عشق۔ (مفہوم اول سے مستعار)

حَامَ: پیاسا ہوا (پیاس کی حالت میں) پانی کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ یہ لفظ "ھَامَ یَھِیْمُ" سے مشابہ ہے ھَامَ الطائرُ حولَ الماء: پرندہ پانی کے گرد منڈلایا۔ حام الرجل حول الامر: حصول مقصد کے لیے بڑھا۔ (مفہوم اول سے مستعار)

"عَوْم": تیرنا۔ عُوْمَۃ: پانی کا بھنگا جو ہمہ وقت تیرتا رہتا ہے۔ عامۃ: ڈونگی جو دریا میں چلتی ہے۔ عامت النجوم فی منازلھا: ستاروں نے اپنے اپنے دائرے میں گردش کی۔ ستاروں کے چلنے کو پانی میں تیرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کل فی فلک یسبحون (قرآن)۔ عام: (وہ مقررہ مدت جس میں سیارے ایک جگہ سے چل کر پھر اُسی جگہ واپس آجاتے ہیں) برس۔ مُعَاوَمَۃ: ایک برس کے لیے معاہدہ کرنا۔

"غَیْم": پیاس۔ غیم: ابر۔ غامَتِ السماءُ: آسمان ابر آلود ہوگیا۔ "تَغْیِیْم": تاریک ہونا۔ ابر کا نتیجہ تاریکی ہے۔ غَیَّمَتِ اللَّیْلَۃُ: رات تاریک ہوگئی۔

ماء: پانی۔ ماءَ البِئرُ: کنویں کا پانی زیادہ ہوا۔ کشتی کے اندر پانی آیا۔ "تمویہ": شمشیر کو آب دینا۔ ملمع کاری۔ مُوَاھَۃ: چہرے کی آب وتاب، تازگی، شگفتگی۔ الماویۃ: آئینہ۔

مَیْع: پانی کی طرح سیال ہونا۔ مائع: بہنے والی چیز۔ ماعت ناصیۃ الفرس: طالت وسالت۔ میعۃ: انڈیلی ہوئی چیز کا بہاؤ۔

مَیْح: کنویں سے مٹی نکالنا تاکہ صاف پانی ملے۔ "میع" (سیلان) میں پانی کا عمل ہے اور "میح" ایک انسانی فعل ہے لیکن دونوں میں "مائیت" وجہ اشتراک ہے۔

حمی۔۔۔ احْمومی: ابر کی طرح تاریک ہوا۔ حمیٰ: چراگاہ۔ سبزہ زار۔ سبزہ بارش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عربوں کے لیے چراگاہ ایک نعمت تھی، وہ شدت سے اس کی حفاظت کرتے تھے اور اگر بغیر اجازت کوئی اس میں داخل ہو جاتا تھا تو وہ اسے اپنی غیرت وحمیت کے خلاف سمجھتے تھے۔ "حمایۃ" بمعنی نگرانی اور "حمیۃ" بمعنی ایار و مرؤت لفظ "حمیٰ" کے شاخسانے ہیں۔ حمیٰ: گرمی۔ (دیکھو حَمِیْم)

عَماء: ابر سیاہ۔۔۔ عَمایَۃ: گمراہی۔۔۔ عمی: اندھاپن۔ "اعمیٰ": اندھا۔ گمراہی اور اندھے پن کو تیرہ وتار گھٹا سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اندھیرے میں چیزیں نظر نہیں آتیں اس لیے "عمایۃ" سے "عَمِیَ الأمر علیہ" نکلا یعنی بات اس پر ظاہر نہیں ہوئی۔

غماء: ابر تاریک۔ اغماء: بے ہوشی۔ غباوۃ: کند ذہنی۔ غوایۃ: گمراہی۔ بے عقلی۔ عشق۔ یہ تمام الفاظ کسی چیز کو چھپانے یا ڈھانپنے کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں۔ ابر ہماری نگاہ اور آفتاب کے درمیان ایک اوٹ ہے۔ "غباوۃ" ایک ذہنی پردہ ہے۔ "غوایۃ" اخلاقی قسم کی کور بینی ہے۔

عَمَّ المَطَرُ الأرْضَ : جل تھل ہوگیا۔ عَمَّ المَطَرُ النخلَ : بارش نے کھجور کو سیراب کیا۔ اِعْتَمَّ النخلُ : کھجور خوشوں سے لدگئی۔ اعْتَمَّ المالُ : دولت فراواں ہوگئی۔ اعتم الشباب : شباب بھرپور انداز میں پھوٹ نکلا۔ عُمُوم : عام ہونا۔ یہ لفظ ”عم المطر الاماض (بارش عام ہوگئی) سے آیا ہے (عم: چچا) کی تشریح آگے آئے گی)

هُمام : برف۔ برف۔ منجمد پانی۔ اِنْهِمام : پگھلنا۔ پسینے کا بہنا۔ تندرستی کا زائل ہونا۔ جس طرح آفتاب کی حرارت برف کو پگھلا دیتی ہے۔ هَمّ : حزن و ملال — غم کی خاصیت بھی انسان کو گھلا دینا ہے۔

هِمّة : عزم۔ یہ لفظ حکایت صوت سے آیا ہے (آگے اس کا لسانی تجزیہ درج ہے) هَمَّ : قصد کرنا۔ یہ ”أَمَّ اِلَیه“ کی طرح ہے، لفظ ”اُم“ کے سلسلے میں اس کی تشریح ملاحظہ ہو۔

حمیم : گرم پانی۔ سخت سرد پانی۔ حَمّام : غسل خانہ۔ حَمَّ الماء : پانی گرم کیا۔ حَمَّ التَّنُّورَ : تنور گرم کیا۔ حَمَّ الشَّحْمَ : چربی پگھلائی۔ حَمّ : گرمی۔ حَمُّ الظَّهِیرَة : دوپہر کی گرمی۔ حُمّٰی : بخار۔

اوپر ”عَیْمَة“ کی پانی والی شاخ کا تجزیہ کیا گیا۔ یہاں قرابتوں والی شاخ کی وضاحت کی جائے گی۔

عَیمة (دودھ کی خواہش) محسوس ہونے کے وقت بچہ ”عم عم“، ”أم أم“، ”بابا“، ”أب أب“ بولتا ہے۔ ماں، باپ، چچا وغیرہ سمجھتے ہیں کہ اس نے انہیں پکارا اس لیے ماں کے لیے ”اُم“ چچا کے لیے ”عم“ اور باپ کے لیے ”أب“ سمجھا جانے لگتا ہے۔ ماں کا خاص وصف ”حوبة“ (مامتا) ہے، یہی مامتا عام ہوکر ”محبة“ بنی۔ اقربا سب کے سب ”احباب“ تھے اس لیے ”حمیم“، ”حبیب“ اور ”حَمُو“ وغیرہ شفلقی الفاظ ہیں ”حَمُو“ کے دائرے میں تمام سسرالی رشتہ دار آتے ہیں۔

اُمَّة : دودھ پلانے والی (ماں)۔ انا۔ أَمَة : لونڈی۔ اصل مفہوم مرضعۃ تھا۔ امتداد زمانہ سے یہ لفظ حقیقی معنی کو چھوڑ کر دایہ اور لونڈی پر دلالت کرنے لگا۔ اس لیے ”آمَة“ اور ”اُمَّة“ میں بہ ظاہر کوئی قرابت نہ رہی۔ اُمّة : قوم، جماعت۔ یہ اصل میں ”بنو اُمٍ و بنو اُمَّةٍ“ (ہم نسل لوگ یعنی ایک ہی ماں کی اولاد) رہا ہوگا۔ بعد میں صرف ”اُمّة“ رہ گیا۔ جس طرح ماں بچے کی تربیت و پرداخت کے ساتھ ساتھ وادیٔ حیات کے خم و پیچ میں اس کی رہنمائی کرتی ہے اسی طرح ”امام“ (رہبر، پیشوا) دینی، سیاسی اور سماجی مشکلات میں اپنی قوم کو صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ اِمّة : دین و شریعت۔

دودھ پینے کے لیے بچہ ”اُم اُم“ کرتا ہے ماں دودھ پلانے کے لیے آتی ہے اس بنا پر ”أَمَّ“ کے معنی قصد کرنے کے ہو جاتے ہیں عربی میں اسے یوں کہیں گے : عَامَ الصَّبِیُّ فَأَمَّتِ الْاُمُّ اِلَیه : بچے کو دودھ کی طلب ہوئی تو ماں اس کی طرف بڑھی۔ پہلے یہ لفظ ماں کے قصد و ارادہ کے لیے مخصوص رہا ہوگا۔ بعد میں عام ہوگیا ”امام“ سڑک (جس پر لوگ چلتے ہیں۔

لفظ میں کسی حرف کی زیادتی معنی میں اضافہ کا سبب ہوتی ہے :

عربی زبان میں شفلقی الفاظ کی کثیر تعداد ہے۔ مثلاً حوبہ، حُب غیب، عیب، عب، وغیرہ۔ ان کے علاوہ دو حرفی الفاظ میں ایک حرف بڑھا کر سہ حرفی بنایا جائے

مثلاً غَمْر : آب کثیر۔ غَمْل : پودے کا گھنا ہونا۔ غَمْن : چمڑے کو نرم کرنے کے لیے زمین میں گاڑنا۔ غمس : پانی کے اندر کسی چیز کو غوطہ دینا۔ غمط : پانی تیزی سے پی لینا۔ غمت : پانی میں غوطہ دینا۔ ، تو معلوم ہو گا کہ شفلتی الفاظ کے اصل معانی کے ساتھ ساتھ بعض مفاہیم کا اضافہ ہوا مثال کے طور پر "غمر" کو لیجیے۔ لفظ "غم" جو شفلتی ہے۔ اس میں "ر" کا اضافہ ہوا اس لیے وہ شفلتی الفاظ کے مفہوم مسوم "پانی" پر مفہوم "کثرت و اخفاء" کے اضافہ و تضمین کے ساتھ دلالت کرتا ہے۔

حکایت صوت دورِ دوم: اوپر اس بات کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ فطری بولیوں سے ہمارے لغت میں ہزاروں الفاظ کیونکر بنے۔ اب ہم مختصر طور پر یہ بتائیں گے کہ حکایت صوت سے لغات میں کس طرح اضافہ ہوا۔

صحیح معنوں میں بولنے کا آغاز محاکات سے ہوا۔ ہماری ترقیوں کا راز یہ ہے ہم بندر کی طرح ہر کام کی نقل اتارتے اور طوطے کی طرح ہر ایک کی بات کو دھراتے رہے۔ کبھی خود اپنی بولی کی نقل کی اور کبھی دوسری بے جان اور جان دار چیزوں کی۔ رفتہ رفتہ ان نقالیوں نے ہمیں جانوروں سے بات کرنا سکھایا! ہماری زبان صدہا مراحل طے کرنے کے بعد آج اس منزل پر پہنچی ہے کہ بقول غالب

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جانوروں کی آوازیں اور ان سے مشتق الفاظ: ہماری زبان کے بہت سے الفاظ جانوروں سے سنی ہوئی آوازوں کی محاکات سے وجود میں آئے۔ ذیل میں ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں :۔

غاغا : کوے کی کائیں کائیں۔ غاغاء: سیاہ پہاڑی کوے کی آواز۔ غوغاء القوم: لوگوں کا شور و غوغا (تمثیلاً)

اجمتوا امرهم بليل فلما | اصبحوا اصبحت لهم غوغاء

الغوغاء : نیچ لوگ

هَمْهَمَة : شیر، گائے اور گدھے کی آواز۔ هَمْهَام : شیر۔ بہادر اور فراخ دل سردار۔ هُمَام: اولوالعزم بادشاہ (استعارہ) هِمَّة : عزم۔

بَهْبَهَہ : نر (نحل) کی آواز (مادہ کو مائل کرنے کے لیے) باہ : نکاح۔

وعوعه : شیر بھیڑیے اور گیدڑ کی آواز۔ وعواع الناس : لوگوں کا شور غوغا (تشبیہاً۔ وعواع : لوگوں کی بھیڑ۔

وادا: گیدڑ کی آواز۔ اسی آواز سے گیدڑ کا نام (اینٹ "ادی" پڑا۔

بے جان چیزوں کی آوازیں اور ان سے مشتق الفاظ: حیوانات کی بولیوں کے ساتھ ساتھ بہت بے جان چیزوں کی آوازیں انسان نے نقل کیں اور وہ رفتہ رفتہ سدھر کر ہماری زبان کا جزء بن گئیں۔ عربی زبان میں اس محاکات کی مثالیں کثرت

سے موجود ہیں۔

ق۔ ط ۔ وہ تمام الفاظ جن کا "فا" کلمہ "ق" اور "عین" کلمہ "ط" ہے، ان سب کا مأخذ کسی سخت چیز کے دوسری سخت چیز سے ٹکرانے کی آواز ہے۔ باہمی ٹکراؤ سے عموماً چیزیں ٹوٹ جاتی ہیں اس لیے اس طرح کے الفاظ کسی نہ کسی نوع کے ٹوٹنے، توڑنے، کٹنے یا کاٹنے پر یا ان مفاہیم سے مناسبت رکھنے والے معانی پر دلالت کرتے ہیں۔

قط: کاٹنا، قَطَّ الْقَلَمَ: قلم پر قط رکھا۔ قط الشَّعْر: بال کا قصیر ہونا۔ (دیکھو "قص" اور "قصر")۔ "قص"، "قض" وغیرہ میں بھی کاٹنے کا مفہوم ملتا ہے۔ لفظ "قط" میں کسی حرف کا اضافہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کاٹنے کا مفہوم بنیادی طور پر موجود ہے اور "اَلزِّیَادَۃُ فِی اللَّفْظِ لِلزِّیَادَۃِ فِی الْمَعْنٰی" کے اصول کے تحت بعض معانی کا اضافہ ہوا۔ مثلاً:

ق ط ب ۔ قَطَبَ الشَّیْءَ: چیز کو کاٹا اور پھر جمع کیا۔ "ب" کے اضافے کی وجہ سے اس میں کاٹنے کے علاوہ جمع کرنے، ملانے اور جوڑنے کا مفہوم بڑھ گیا۔ قَطَبَ الشَّرَابَ: شراب میں پانی ملایا۔ قَطَبَ الْقَوْمُ: لوگ جمع ہوئے۔

قُطْب: چکی یا جانتے کی کھونٹی۔ چکی یا جانتے کی کھونٹی لکڑی کاٹ کر بنائی جاتی ہے۔ قُطْبُ الْقَوْمِ: قوم کا رہنما، جس کے محور پر قوم کو گردش کرتی ہے۔ قُطْبُ الْاَرْضِ: زمین کا محور۔ یہ لفظ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ عربوں کا یہ تصور تھا کہ جیسے چکی اپنی کھونٹی کے گرد گھومتی ہے یوں ہی زمین بھی اپنے محور پر گردش کرتی ہے۔

قطب: ایک تارا جسے قطب شمالی کے سامنے دیکھا جاتا ہے۔ قطبین: زمین کے شمالی اور جنوبی سروں کو نامعلوم زمانے سے "قطبین" کہتے ہیں قطبین کا لفظ بتاتا ہے کہ "زمین اپنے محور پر گھومتی ہے" کوئی نیا تصور نہیں ظہور اسلام سے صدیوں قبل کے عرب اس حقیقت کو جانتے تھے۔

تبادلہ حروف: چونکہ "ق" اور "ج" کا "ط" کے ساتھ اجتماع نہیں ہوتا اس لیے "قط" کے حرف اول کو "خ" سے بدل کر "خط" پر غور کیجیے۔ خط: لکیر دھاری کھینچنا، لکھنا، تحریر کرنا۔ خاط: لکیریں کھینچنے والا جادوگر (کیونکہ بعض جادوگر لکیریں کھینچ کر منتر پڑھتے ہیں)۔

خَاطَ، خیطًا: سیا۔ (خیط سے کام لیا) خَیْط: دھاگا۔ خیط ابیض: وہ خط نور جو پو پھٹنے سے پہلے دکھائی دیتا ہے۔

خُطْوَۃ: قدم یعنی چلنے میں دونوں پیروں کے درمیان کا فاصلہ "خطو" اور "قطو" دونوں ہم معنی الفاظ ہیں، غالباً "قطو" فرع ہے اور "خطو" اصل دونوں کے معنی ہیں چھوٹے چھوٹے پگ اٹھا کر چلنا۔ اخطأ: راہ بھولا۔ غلطی کی۔ خطأ: غلطی۔

خطام: نکیل ۔ خَطَمَ الْبَعِیْرَ بِالْخِطَامِ: اونٹ کے نتھنوں میں نکیل ڈالی۔ خَطْم: چوپائے کی ناک کا اگلا حصہ۔ آدمی کی ناک۔ خَطَمَ الرَّجُلَ: آدمی کی ناک پر مارا۔

خَطْف: چھین لینا۔ اچک لینا۔ خطاف: چور اچکا۔ "خطف" (چھین لینا) کو "قطف" (توڑ لینا)

سے مشابہت ہے۔

مندرجہ بالا الفاظ کے ہر حرف کو تبادلۂ حروف کے اصول کے تحت بدل کر نئے لفظ بنائے جائیں تو معانی میں کافی فرق کے باوجود یہ ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں معلوم ہوں گے۔ مثلاً تَقضّب : کاٹنا۔ تَقضّم : دانتوں سے توڑنا اور کھانا۔ تقصف : توڑنا۔ قصب : کاٹنا۔ بوٹی بوٹی کرنا۔ قصف : توڑنا۔ قتل : مار ڈالنا۔ قطل : کاٹنا۔ گردن مارنا۔ قطر الثوب [۱] : کپڑا سینا۔ قطن : روئی دھننا۔ بنولے نکالنا۔ قطم : کاٹنا اور چکھنا۔ قطف : پھل توڑنا۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے الفاظ بنیادی لفظ "قط" سے کھلا ہوا ربط رکھتے ہیں۔

عکس وقلب۔ مذکورہ بالا الفاظ کو اصول عکس وقلب کے تحت الٹ دیا جائے تو جو الفاظ بنیں گے، وہ بھی اپنی اصل سے کسی نہ کسی نوع کی مناسبت ضرور رکھیں گے، مثلاً مقط : گردن توڑنا۔ تَمّط : ذرا سا کھا کر چکھنا۔ (دیکھو قطم) تمطق القوس : کمان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ فتق : پھاڑنا، سیون ادھیڑنا۔ لقط : پیوند لگانا۔ کھیت کٹنے کے بعد بالیاں چننا۔ طلق : اونٹنی کا اس کے بندھن سے الگ ہونا۔ عورت کا اپنے مرد سے جدا ہونا۔ (طلاق)

وضع الفاظ (دور سوم)۔ انسان میں نقل ومحاکات کے ساتھ ساتھ ایجاد واختراع کی صلاحیت بھی ہے۔ مختلف مناسبتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے بعض الفاظ خود بنائے۔ ہماری زبان میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن میں سے چند کے وضع کیے جانے کا تاریخی ثبوت موجود ہے اور چند کی لسانی خصوصیات اس بات کا سراغ دیتی ہیں کہ یہ گڑھے گئے۔ ایسے الفاظ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ بکم : ب (منہ کھلا) ک (زبان تالوں سے چپکی) م (ہونٹ بند ہو گئے اور بول نہ سکا)۔

۲۔ بجم :

۳۔ بغم : بولا، صاف نہیں بولا مگر کچھ مطلب ادا کر گیا۔

۴۔ بجیم : بت۔ بت جیسا بے زبان۔ شاعری کرنا نہیں جانتا۔

۵۔ بہیم : بولتا ہے۔ لایعنی بولتا ہے۔

۶۔ وہم : وہم سا ہوا۔ کچھ سمجھا۔

۷۔ فہم : سمجھ لیا۔

غضب۔ اس لفظ کی بناوٹ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کے غصے کی نقل کیوں کر اتاری۔ شدت غضب کا تصور کیجیے کہ غصہ کرنے والے کی آواز گلے میں پھنس جاتی ہے (غ)۔ دانت پیسنے لگتا ہے (ض)۔ بالآخر منہ بند ہو جاتا ہے (ب)

ان کیفیات کی حروف کے ذریعے مکمّل تصویر کھینچی گئی اور یہی تصویر وتشکیل آگے چل کر مستقل لفظ "غضب" بن گئی۔

---

[۱] "قطرۃ" اور "تقاطر" جیسے الفاظ "قطقط" (بارش کی ٹپ ٹپ) سے نکلے ہیں۔

عربی زبان کا حکیمانہ مزاج:- گزشتہ صفحات میں ہم نے عربی زبان کا اس حیثیت سے جائزہ لیا ہے کہ فطری بولیاں منجھ کر متمدن الفاظ کس طرح بنیں اور جو آوازیں ہم نے بے جان اور جان دار اشیاء سے سن کر نقل کیں، انہوں نے عربی لغت میں کیوں کر اضافہ کیا، دوسرے اس لسانی تجزیے سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ عربی زبان نہایت سائنٹفک و حکیمانہ مزاج رکھتی ہے۔ اس کی فطری ترتیب، اس کا تدریجی ارتقاء، اس کی کڑیوں کا باہمی ربط و تعلق، اس کے الفاظ میں عکس و قلب اور تبادلۂ حروف کے بعد معنوی ہم آہنگی اور اصول اشتقاق کی وجہ سے متنوع لفظی رنگ روپ، اس کی عظمت و وسعت اور ہمہ گیری کی شہادت دیتے ہیں۔

قدامت الفاظ اور قدامت تہذیب:- عربی زبان کی یہ وسعت بتاتی ہے کہ عرب تہذیب کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام سے پہلے ان کا تمدن زوال سے ہمکنار ہو چکا تھا لیکن اس دور کے الفاظ سیاسی، تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی اعتبار سے ان کی عظمت رفتہ کا پتہ دیتے ہیں۔

لسانیات کا یہ اصول ہے کہ جو لفظ جس زمانے میں پایا جاتا ہے، اسے صرف اسی زمانے تک محدود نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہ اس سے پہلے بھی رائج رہا ہوگا۔ قرآن میں جو تمدنی الفاظ آئے ہیں، ان میں سے بیشتر عہد اسلام کے نہیں بلکہ ماقبل اسلام کے مانے جائیں گے۔ قرآن کے مضامین، اس کے الفاظ اور اس کے امثال پورے طور پر نہ سہی، پھر بھی بڑی حد تک عربوں کی اجتماعی زندگی کے مختلف گوشوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ قرآن میں جنت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، یقیناً ایسا نہیں جس سے عرب آشنا نہ رہے ہوں اور جنت کے مناظر کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، وہ بھی ایسے نہیں جن سے وہ واقف نہ رہے ہوں۔ سورۂ غاشیہ کی آیات بطور مثال درج کی جاتی ہیں:-

فیھا عین جاریہ، فیھا سرر مرفوعۃ واکواب موضوعۃ و نمارق مصفوفۃ وزرابی مبثوثۃ	جنت میں چشمے جاری ہوں گے، اونچے اونچے تخت لگے ہوں گے، قالین بچھے ہوں گے اور مسندیں لگی ہوں گی۔

ان آیات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عرب قریب قریب اسی طرح رہتے سہتے تھے اور اسی انداز زندگی کی آرزو رکھتے تھے۔

قرآن کے بہت سے الفاظ بتاتے ہیں کہ اسلام سے پہلے کسی زمانے میں عربوں کا تمدن اوج کمال پر تھا مثلاً "قواریرا من فضۃ" سے خیال ہوتا ہے کہ وہ غالباً چاندی کی ایسی شیشیاں بناتے تھے جن پر چمک دار شیشوں کا دھوکا ہوتا تھا۔

مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ، الزجاجۃ کانھا کوکب دری (قرآن)	اس کے نور کی مثال طاق (دریوٹ) میں رکھے ہوئے چراغ کی سی ہے اور وہ چراغ شیشے (فانوس) میں جلوہ نما ہے۔ وہ شیشہ چمکتے ہوئے ستارے کی طرح ہے۔

اس آیت میں چراغ کے علاوہ حسب ذیل چیزوں کا تصور پایا جاتا ہے :-

۱- طاق یا دیوٹ- ۲- فانوس-

اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں میں چراغ کے استعمال کا یہ طریقہ تھا-

اولئك لهم جنات عدن تجری من تحتها الانهار یحلون فیها من اساور من ذهب ویلبسون ثیابا خضراً من سندس و استبرق متکئین علی الارائك- (الکہف)

یہی لوگ ہیں جن کے لیے سدا رہنے کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، "سندس" (لاہی) اور استبرق (تافتہ) کے جوڑے زیب تن کیے ہوں گے اور مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے-

اگر یہ چیزیں جن کا ان آیات میں ذکر ہے، عرب میں موجود نہ ہوتیں یا وہ ان کے استعمال سے آگاہ نہ ہوتے تو یہ قرآن کی بلاغت کے خلاف ہوتا کہ وہ ان کے سامنے ایسی مادی چیزیں پیش کرے جنہیں وہ محسوس نہ کر سکیں۔

تحریر کی قدامت اور "سمات" عرب:

اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی بدویانہ سادگی میں ڈوبی ہوئی تھی- اس سادگی کا اقتضاء تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان کے تصورات محدود ہوتے اور ان کی زبان کم مایہ ہوتی لیکن آثار و شواہد بتاتے ہیں کہ صرف ان کی زبان ہی وسیع وہمہ گیر نہ تھی بلکہ وہ فن تحریر سے بھی آگاہ تھے- بعض واضح اشارات تو ہمیں اس طرف لے جاتے ہیں کہ حروف تہجی عربوں کے "سماتِ اِبل" کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں ذیل میں ہم اس خیال کی توجیہہ و تشریح پیش کرتے ہیں-

دنیا میں خیالات کو قلم بند کرنے کے جتنے طریقے آج تک رائج ہوئے ہیں- ان میں قدیم تر طریقہ تصویر کشی ہی کو قرار دیا جاتا ہے- جن اقوام نے اپنے کارناموں کی تحریری یادگاریں چھوڑی ہیں، ان میں اہل مصر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے- مصری آثار کی شہادت یہ ہے کہ ابتداء میں حروف نہیں تھے بلکہ تصویروں کے ذریعہ احساسات و جذبات اور خیالات و تصورات قلم بند کیے جاتے تھے- اہل مصر سے زیادہ اہل بابل کی تہذیب پرانی ہے- یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ سب سے پہلے کس قوم نے تحریر کا آغاز کیا— اہل بابل کی تحریریں زیادہ تر میخ نما نقوش کی صورت میں ہیں- پرانے نقوش جو ہمیں ملتے ہیں، انہیں دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقوش بھی ابتداء میں دراصل اشیاء کی تصویریں تھے- بہرکیف تحریر کے جتنے طریقے بھی آج تک رائج ہوئے ہیں، ان سب کا سلسلہ یا تو اشیاء کی تصویر کشی پر ختم ہوتا ہے یا ان کا نقطۂ آغاز عربوں کے "سماتِ اِبل" کو قرار دیا جا سکتا ہے-

عربوں میں نامعلوم زمانے سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنے اونٹوں کے مختلف اعضاء پر طرح طرح کے نشان بناتے رہے ہیں جنہیں عربی میں "سمات" کہا جاتا ہے- اب تو یہ نقوش محض لایعنی ہیں لیکن اپنے آغاز میں ہر نقش بذات خود ایک بامعنیٰ کلمہ تھا- "سمات" "سمۃ" کی جمع دراصل "وَشم" تھا- نام کی عربی "اسم" ہے- ائمہ لغت کہتے ہیں کہ یہ لفظ "سِمْوٌ" تھا- لیکن یہ محل غور ہے، اس لفظ کا عبری تلفظ "شِمْ" ہے جس کی جمع "شِمُوت" ہے "شموت" کے معنی ہیں "اسماء و اعلام" عربی میں دو لفظ ہیں، "وَشم" اور "وَشْم"- قدیم عربوں میں یہ رواج تھا کہ وہ اپنے جسمانی اعضاء پر طرح طرح کے گودنے بناتے تھے- اس طرح کی نقش آرائی کو "وشم" کہتے

ہیں اسی طرح "وسم" اور "وشم" وغیرہ متعدد الفاظ ہیں جن کے معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ عرب اشیاء پر مختلف قسم کے نشانات لگایا کرتے تھے۔ سمات نویسی کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ نشان دیکھ کر لوگ یہ جان لیں کہ اس چیز کا مالک کون ہے، کس قبیلے کا ہے، اور کہاں رہتا ہے۔ بلکہ "وسم" اور "وشم" کے کچھ اور مقاصد بھی تھے۔ چنانچہ "اِتَّسَمَ الرَّجلُ" کا مطلب ماہرین لسانیات نے یہ بتایا ہے کہ "جعل لنفسه علامات ليُعرف بها" یعنی شناخت کی غرض سے اس نے اپنے لیے بعض علامتیں بنالی ہیں۔ بقول حسان بن ثابت رضؓ:-

"ہر قبیلے کی ایک سِمَۃ (علامت) ہوتی ہے جس سے اُسے پہچانا جاتا ہے — ہماری "سِمَۃ" شعرگوئی ہے۔ ہمارے سمات دشمنوں کو روسیاہ اور دوستوں کو سرخ رو کرتے ہیں"

حضرت حسان رضؓ کے اس شعر سے ظاہر ہے کہ عرب کے ہر قبیلے کا ایک "سماتی" نام تھا۔ اسی خیال کو ایک اور شاعر یوں ادا کرتا ہے:-

حتّٰی سقوا آبالهم بالنار والنار قد تشفي من الاوار

چونکہ "سمات" عموماً آگ سے داغ کر بنائے جاتے تھے اس لیے "سِمَۃ" کو "نار" (آگ) بھی کہتے ہیں۔ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ "نار" یعنی "داغ" دیکھ کر لوگوں نے ان کے اونٹوں کو سیراب کر دیا کیونکہ وہ جان گئے کہ یہ اونٹ کس کے ہیں۔

"سمات" جنہیں لوگ اپنے اعضاء، اپنے اونٹوں اور اپنے املاک پر بنایا کرتے تھے، اگرچہ ابتدا میں لایعنی نقوش تھے، مگر بعد میں یہ نقوش بامعنٰی الفاظ بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ "وشم" سے مشتق لفظ "وَشْمَۃ" بامعنٰی کلمہ اور کلام پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اہل عرب بولتے تھے کہ:-

واللہ ماکتمت وشمة حکاها۔	بخدا اس نے جو بات کہی، اسے میں نے نہیں چھپایا۔
ماعصیتك وشمة۔	میں نے تمہاری ہر بات مان لی۔
بیننا وشیمة۔	ہمارے درمیان کچھ ان بن ہے۔

ان محاوروں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہر "وسم" یا ہر "وشم" عربوں کے تصور میں ایک بامعنٰی کلمہ یا کلام تھا۔ ایک روایت ہے:-

ان داؤد علیه السلام وشم خطیئته فی کفه۔	حضرت داؤدؑ نے اپنی خطائیں اپنی ہتھیلی پر منقوش کر لی تھیں۔

یہ روایت بالکل غلط ہے، پھر بھی لسانی حیثیت سے اس بات کی دلیل ہے کہ واضع روایت کے تصور میں "وشم" کا مفہوم بامعنٰی لفظ و عبارت منقوش کرنا تھا۔ اونٹ۔ پہاڑ، لکڑی کے تختے اور پتھر کی لوح پر نقش کیے جانے والے اکثر "سمات" بامعنٰی اشارات والفاظ تھے۔

وہ نشانات جو اونٹوں پر آگ سے داغ کر لگائے جاتے تھے، ان سے صرف اونٹوں کے مالک ہی کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات ان سے بہت سے واقعات بھی سمجھ لیے جاتے تھے۔ ایک غارت گر شاعر یہ کہہ کر اپنی اونٹنی پر ناز کرتا ہے:-

نجا کل ابل نحبا ھا   و نا ا ھل العالمین نا رھا

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ میری اونٹنی بار بار غارت گر قبائل کی ملک رہ چکی ہے، ہر قبیلے کی "سمۃ" اس کے بدن پر نقش ہے۔ اس طرح یہ اونٹنی بذات خود ایک چلتا پھرتا نوشتہ ہے۔

ان دلائل سے یہ بات پورے طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ "سمات" بے معنی نقش و نگار نہیں تھے بلکہ ہر نقش اپنے اندر ایک مفہوم رکھتا تھا۔ جس طرح آج ہم حروف کو ایک خاص ترتیب دے کر ایک لفظ لکھتے ہیں یوں ہی عرب بھی کسی زمانے میں آڑے ترچھے خطوط کھینچ کر اپنے خیالات کی نقش آرائی کیا کرتے تھے۔ یہ "سمات" صرف حروف ہی کا کام نہیں دیتے تھے بلکہ بامعنی الفاظ بھی ہوا کرتے تھے۔ بظاہر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ ایک مختصر سا نقش اتنی بڑی عبارت کو کس طرح ادا کرتا تھا لیکن بعض "سمات" کی تشریح سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہو جائے گی۔

عربی "سمات ابل" میں سے ایک کا نام "سُطاع" ہے، خیمے کے بیچ کے ستون کو "سطاع" کہتے ہیں۔ اس نقش کی صورت الازہری کے بیان کے مطابق ہماری اردو تحریر کے الف کی سی تھی، عربی تحریر میں یہ نقش الف کا کام دیتا ہے۔ کلدانی تحریر میں ایک لمبی میخ کے دائیں، اوپر تلے دو چھوٹی چھوٹی میخیں رکھنے سے حرف "ا" بنتا ہے۔ اور اس نقش کو دیکھا جائے تو اس کی آواز "اسے" کی سی ہوتی ہے۔ "آ" عربی میں کلمۂ "زجر" ہے جب کسی جانور کو بلانا یا کسی ہرے بھرے کھیت میں جانے سے روکنا مقصود ہوتا تو "آ" بولتے۔

بہر نوع یہ "سِمۃ" جس کا نام "سطاع" ہے کبھی ایک بامعنی نقش تھا، جو عموماً زجر و توبیخ جیسے معانی ادا کرنے کے علاوہ "آ" کی آواز دیتا تھا۔

"سطاع" کی بابت الازہری نے لکھا ہے کہ اونٹ کی گردن پر یہ نقش لگایا جاتا تھا۔ کھڑی لکیر کو "سطاع" اور "ب" جیسی پڑی لکیر کو "علاط" کہتے ہیں۔ ایک عربی ماہر لسان ابوعلی کا بیان ہے کہ "علاط" کبھی تو ایک لکیر ہوتی تھی، کبھی تلے اوپر دو لکیریں ہوتی تھیں، اور کبھی چاروں طرف سے خطوط کھینچ دیے جاتے تھے۔ اب ان عربی "سمات" کا بابلی حروف سے مقابلہ کیجیے تلے اوپر دو میخیں عرضاً رکھ دیجیے تو یہ صورت بنے گی۔ یہ نقش انگریزی "b" کی آواز دے گا۔ یہی نقش عبری میں ہو جائے گا، پھر حمیری میں بن کر عربی میں ب ہو جائے گا۔ "باءۃ" کے معنی عربی میں منزل اور باڑ کے ہیں، عبرانی نام اس نقش کا "بیت" یعنی گھر ہے، گویا یہ نقش گھر کے مفہوم کو ادا کرتا تھا۔ ذیل میں "ب" کی مختلف شکلیں جو دوسری زبانوں میں ہیں، ہم درج کرتے ہیں۔

مصری تصویر - عبری - عبری - عربی

مصری تصویر "بیت" کی شکل تھی جو بعد کو مختلف زبانوں میں حرف "ب" بنی۔ ایک "سطاع" یعنی کھڑی لکیر کو جب ایک "علاط" یعنی پڑی لکیر کاٹ دے تو چلیپا کی صورت بن جاتی ہے۔ اس نقش کا نام عربی میں "تِنواء" ہے۔ اس نام سے عربی لفظ "تَوِی" اور "تاوِ" مشتق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "تَوِیَ مَالُہٗ" یعنی اس کا مال ضائع ہو گیا۔ اس سے ملتی جلتی ایک مصری شکل ہے ——یہ ایک ٹانگ پر دھری ہوئی چھری ہے، یہ شکل قتل خوں ریزی، جنگ و جدال جیسے معانی ادا کرتی تھی۔ اس نقش کا مصری تلفظ "تبا" ہے۔ عربی زبان میں "تبا یَتْبُوْ تَبوًا" کے معنی ہیں جنگ کرنا۔ لوٹ مار کرنا۔ اس مصری نقش کا عبرانی نام "تناؤ" ہے۔ یہ نقش کبھی کبھی سامی زبانوں میں "ت" کی آواز دیتا ہے۔ یہ صورت حمیری وغیرہ کئی زبانوں میں "تنائے تسرشت" کا کام دیتی ہے۔ یہی شکل ذرا سدھر کر انگریزی حرف "T" بنی۔ "تِنواء" کے نیچے دونوں سروں پر دو حلقے لگا دیے جائیں تو قینچی کی شکل بن جاتی ہے۔ اس شکل کا سماتی نام "جَلَم" ہے۔ اس چیز کا جو کام ہے، اسے عربی لفظ "قص" (بال کاٹنا) ادا کرتا ہے، انگریزی حرف (X) کی وجہ تسمیہ اس عربی لفظ "قص" سے بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ سامی نقوش ہی کی ایک شکل ہے، کیونکہ مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ یورپ کو حرف ابجد کی تعلیم کنعان کے تاجروں نے دی جنہیں "فینیقی" کہا جاتا ہے۔ اوپر "تِنواء" کی جتنی تصویریں دی گئی ہیں۔ ان سب میں مشترک معنی ہیں کسی چیز کو کسی چیز سے کاٹنا یا مجروح کرنا۔

"سطاع" (کھڑی لکیر) کے اوپر ایک حلقہ لگا دینے سے عربی سِمَۃ "زاجل" بن جاتی ہے، جو حمیری میں حطی کے حرف سوم کا کام دیتی ہے۔ ایک حلقہ اور لگا دیا جائے تو یہ شکل بن جائے گی۔ اس "سمت" کو لوگ "قَیْدُ الفرس" کہتے تھے، حمیری تحریر میں یہ نقش "ث" کی آواز دے گا۔ اس "سمۃ" کے بارے میں ایک شاعر کہتا ہے :-

کوم علیٰ اعناقہا قَیْدُ الفَرَس ۔۔۔ تنجو اذا اللیل تدانی والتبس

اس شعر سے ظاہر ہے کہ "قید الفرس" والی "سمۃ" بے معنی نہیں تھی۔ نہایت تیز رو اونٹنیوں کی گردن پر یہ نقش بنایا جاتا تھا۔ گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ اونٹنیاں اتنی تیز رو ہیں کہ گھوڑے کو بھی قید کر لیتی ہیں یعنی پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ نقش جسے "قید الفرس" کہتے ہیں ایسی اونٹنیوں پر لگایا جاتا تھا جو تیز رفتار ہوں اور غارت گری کے لیے استعمال کی جا سکیں۔ حمیری میں یہ نقش "ث" کی آواز دیتا ہے اور عربی میں کہتے ہیں۔

اثأَیَ فی القوم: اس نے لوگوں کو زخمی کیا۔ "اثأی" غالباً اسی "سِمۃ" سے ماخوذ ہے۔

قید الفرس کے برعکس "سِمَاتِ زاجل" ایسی اونٹنیوں پر لگائی جاتی تھی جو ذبح کرنے کے لیے پالی جاتی تھیں "سمات" میں سے ایک نام "شعب" ہے، ابن شمیل نے اس کی صورت یہ بتائی ہے۔

"خطان یلاقی بین طرفیہا الاعلیین والاسفلان متفرقان"

یہ شکل ہمدانی کے بیان کے مطابق حمیری جیم کے مختلف اشکال میں سے ایک تھی۔ بنو غطفان اور

بنو ہوازن کے دو قبیلے بنو غاضرہ کہلاتے تھے، ان کے نشان کا ذکر ایک شاعر ان الفاظ میں کرتا ہے :-

تا ۷ علیہا سمۃ الغواضر — الحلقتان والشعاب الفاجر

اس شعر سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی شکل کو "بنوغاضرہ" پڑھا جاتا تھا۔

ہم نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ "شعب" یا "شعاب" کی شکل ایک لکڑی میں بندھی ہوئی "انکسی" کی سی ہوتی ہے، یہ صورت حمیری جیم کی مختلف شکلوں سے ملتی جلتی ہے، ذیل میں ہم مختلف زبانوں کے مختلف نقوش کو پیش کرتے ہیں، جو جیم کا کام دیتی تھیں۔

سمۃ "شعاب" — حمیری جیم — عبری جیم — عربی جیم — ہندی چ — ہندی جیم

اوپر کے نقشے سے اندازہ ہوگا کہ عربی سمۃ "شعاب" متعدد تحریروں میں جیم کا کام دیتی ہے۔

عربی سمات میں ایک نام "مِجْدَاح" ہے، جس کے معنی ہیں "متھنی" دو لکڑیاں صلیب کی شکل میں رکھ کر اگر اس کے نیچے ایک ڈنڈی لگا دی جائے تو سمۃ "مجداح" کی شکل اس طرح کی ہو جائے گی یہی شکل بدلتے بدلتے ترشول جیسی بنی جو حمیری طرز تحریر میں حائے حطی کا کام دیتی ہے۔ تقریباً ایسی ہی شکل بابلی تحریر میں "حی" کی آواز دیتی ہے۔

عربی سمات میں ایک نام "حوماء" ہے اس کی شکل انگریزی حرف O کی سی ہوتی ہے یہ "سمۃ" کئی سامی زبانوں میں حرف "ع" کی ہے، یہ صورت عربوں کے تصور میں کوئی اہم مطلب رکھتی تھی۔ ابوجہل نے اپنے گھٹنوں پر یہ شکل منقوش کر رکھی تھی۔ اونٹ کی ران پر جب یہ شکل بنائی جاتی تھی تو اس کو "حلق" کہتے تھے اور جس اونٹ پر یہ نشان بنایا جاتا تھا اسے "ذو حلق" اور "مُحلَّق" کہتے تھے۔ نابغہ کا ایک مصرع ہے :- "وذکرت من لبن المحلق شربۃ" — اس مصرع سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نشان اس اونٹنی پر لگایا جاتا تھا جس کا دودھ خوش ذائقہ ہوتا تھا۔ اس "سمۃ" کا دوسرا نام "تحجیر" اور "حاجوم" بھی تھا۔ جس اونٹ پر یہ نشان ہوتا اس کا مطلب یہ لیا جاتا کہ اسے گزند نہ پہنچاؤ۔ اس کو ستانا حجر، محجور (قطعی ممنوع) ہے۔

عربی "سمات ابل" میں سے جن کا ہم نے تجزیہ کیا، ان سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "سمات عرب" مختلف زبانوں میں ا، ب، ت، ث، ج اور ح کا کام دیتے ہیں۔ عرب اونٹوں پر جو نقش بناتے تھے، وہ لایعنی کلمات نہیں تھے، بلکہ اظہار خیال کے لیے وہ ہماری آج کی تحریروں کا سا کام دیتے تھے۔ ان میں سے کچھ نقوش تو مختلف اقوام کے حروف تہجی اور کچھ مختلف قبائل کے اسماء بن گئے۔ "سمات عرب" وہ قدیم تحریریں یادگاریں ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ عربوں میں فن تحریر کا رواج نامعلوم زمانے سے تھا۔

عربی ادب کی وسعت و عظمت : جو دلائل و آثار پیش کیے گئے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں عربوں کی تہذیب، ان کا تمدن اور ان کی زبان اوج کمال پر تھی۔ فن تحریر جو تہذیبی ارتقاء کا ایک مظہر ہے، اس سے بھی وہ بے بہرہ نہ تھے۔ اگر یہ لسانی و تہذیبی رفعت نہ

ہوتی تو کیا ممکن تھا کہ قرآن جو علم وفن اور حکمت وموعظت کا سرچشمہ ہے، عربی زبان اس کی متحمل ہوسکتی؛ ماقبل اسلام کی نظم ونثر کے جو نمونے ہمیں ملتے ہیں، وہ بھی فنکارانہ جلال وجمال کا دل کش مرقع ہیں۔

دورِ جاہلیت کی شاعری کا بیشتر حصہ ضائع ہوچکا ہے، پھر بھی جو کچھ موجود ہے، اس میں تازگی وتوانائی، شکوہ وجلال، جذبہ واحساس کا حسن اور کمالِ حقیقت آرائی ہے۔ اس زمانے کی شاعرانہ تخلیقات میں مادی وحسی کیف پورے طور سے نمایاں ہے اور شدتِ احساس کی وجہ سے وہ غنائیت میں یکسر ڈوبی ہوئی ہیں۔ فن کے ایسے تابندہ نقوش زبان وبیان کے ابتدائی مراحل میں ظہور پذیر نہیں ہوسکتے۔ یقیناً عربی شاعری ارتقائی مراحل طے کرکے اپنے دورِ شباب میں داخل ہوئی جہاں سے مہلہل، امرؤالقیس، نابغہ، زہیر، طرفہ، عمرو بن کلثوم، لبید، اعشیٰ اور عنترہ جیسے شاعروں کے عظیم فن کا آغاز ہوتا ہے۔ دورِ جاہلیت کے یہی ائمہ سخن ہیں اور امرؤالقیس ان سب کا سرتاج ہے یہاں تک کہ شعرائے فارس نے بھی اسے اپنا استاذ تسلیم کیا ہے۔

رئیس الشعراء: امرؤالقیس کی شاعری بڑی حد تک ایک داستان عیش ونشاط ہے اور اس داستان کا ہر گوشہ رعنائی خیال، مستی شوق اور رنگینیٔ بیان کا ایک مرقع ہے۔ اس کا عشق خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے اس میں سماوی برودت نہیں بلکہ ارضی حرارت ہے۔ اس کے یہاں کاروبارِ شوق کی تن آسانیاں ہیں، غالب کی طرح وہ بھی اس بات کا قائل تھا۔

اسد بہارِ تماشائے گلستانِ حیات ... وصالِ لالہ عذارانِ سروقامت ہے

یہ کہنا صحیح نہیں کہ زہیر اور سموأل وغیرہ کے کلام میں جو پاکیزہ عظمت ملتی ہے، وہ امرؤالقیس کے یہاں یکسر مفقود ہے۔ اس کے یہاں دل سوزی مروّت، خلوص، انسانی ہمدردی، فراخ دلی، حمیت وغیرت اور مردِ آزاد کی جرأت ذبے نیازی جیسے صحت مند عناصر بھی ملتے ہیں۔ جہاں تک امرؤالقیس کی غیر معمولی شاعرانہ قوت کا تعلق ہے، اس میں کوئی ہم عصر اس کا عدیل وہمسر نہیں۔ اس نے عربی شاعری کو نئے اسالیب سے آشنا کیا۔ اس کا فن، اس کی شخصیت، اس کے مزاج اور اس کی زندگی سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔

فلسفیانہ فکر اور مذہبی احساس: دورِ جاہلیت کا رنگ کلام اگرچہ یکسر غنائی ہے لیکن کہیں کہیں فلسفیانہ فکر ونظر کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں مثلاً زہیر کے یہ اشعار:

رأیت المنایا خبط عشواء من تصب ... تمته ومن تخطی یعمر فیهرم

ومن هاب اسباب المنایا ینلنه ... ولو نال اسباب السماء بسلم

ومن یجعل المعروف من دون عرضه ... یفره ومن لا یتق الشتم یشتم

زندگی کے بارے میں طرفہ کا نقطۂ نظر مادی ہے لیکن یہ صرف جمالیاتی کیف وانبساط تک محدود نہیں بلکہ اس میں انسانیت کا درد بھی شامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تین چیزیں میرے لیے جینے کا بہانہ ہیں (۱) بادۂ گلفام (۲) وصلِ حبیب اور (۳) مظلوم وبے کس کی حمایت۔ اس نے اپنے نظریۂ حیات کو شاعرانہ پیکر میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے:۔

فمنهن سبقی العاذلات بشربة ... کمیت متی ما تعل بالماء تزبد

وتقصير يوم الدجن والدجن معجب — ببهكنة تحت الخباء المعمّد

وكذي اذا نادى المضاف مجنبا — كسيد الغضا ذي السورة المتورد

اُمیہ بن ابی الصلت کی شاعری دینِ براہیمی کے رجحانات کی آئینہ دار ہے۔

عربی ادب کا دورِ انقلاب: اسلام سے پہلے زندگی کا تصور اگرچہ محدود تھا پھر بھی اُس زمانے کے ادب میں فن کے اچھے نمونوں کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کے بعض روشن گوشے بھی ملتے ہیں۔

اسلام کی آمد سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ خیالات و افکار میں انقلاب آتا ہے۔ قرآن کا آفاقی تصورِ زندگی کے افق کو وسیع کر دیتا ہے۔ اس انقلاب سے ہر شعبۂ حیات متأثر ہوتا ہے۔ شعر و ادب پر بھی اس کا خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ شعراء کے فکر و فن کا مقصد بدل جاتا ہے اور ان کی شاعری اسلام کی ہمہ گیر تحریک سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ حضرت حسان رضؓ، کعب بن مالک رضؓ اور عبداللہ بن رواحہ رضؓ وغیرہ کے کلام میں اسلامی شعور نمایاں ہے۔ فکر و فن کے اعتبار سے حسانؓ کا مرتبہ بلند تر ہے۔

پہلا اسلامی شاعر: حسان رضؓ اپنے دور کے عظیم شاعر تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ حسان کی وہ شاعری جس میں انہوں نے اپنے تصورِ حیات کی مدافعت کی ہے اور جس کے ذریعہ قریش کی ہجو گوئی کا جواب دیا ہے، اس میں شکوہ وافر ہے، ہجرت سے فتح مکہ تک ان کی شاعری بلاشبہ ان کے کلامِ جاہلیت سے کہیں زیادہ پرزور ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تصورِ اسلام سے لگاؤ، دینی حمیت اور دشمنانِ اسلام کی مخالفت نے ان کی نظموں میں جذباتی حرارت بھر دی۔

قرآن و حدیث کا فکر و فن: قرآن و حدیث کی ادبی بلندی کا راز یہ ہے کہ دونوں میں فن اور نظریے، مواد اور اسلوب کا نہایت معتدل امتزاج ہے۔ قرآن کے بارے میں یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ اُس کی ہیئت کیا ہے کیونکہ اس میں اصنافِ ادب کی تمام اعلیٰ خصوصیات کو کمال لطافت کے ساتھ سمویا گیا ہے۔ وجدان اور ذوقِ سلیم ان لطافتوں کا احساس تو ضرور کر سکتا ہے لیکن عقل بے مایہ کے لیے ممکن نہیں کہ پورے طور پر ان کی تحلیل کرے اور تجزیے کے بعد انہیں الفاظ کے پیراہن میں پیش بھی کر سکے۔ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ کائنات کا عیاں اور نہاں، جلال اور جمال قرآن و حدیث میں سب سے زیادہ نکھری ہوئی شکل میں ملتا ہے۔ دونوں کے اندازِ بیان میں ایک الہامی شان تقدس ہے اور اس ملکوتی جمال میں ہماری زندگی کی ارضی حرارت بھی پوشیدہ ہے۔ اس کے مابعد الطبیعی تصورات حیاتِ انسانی کے حقائق سے وابستہ ہیں۔

قرآن کے آفاقی افکار و نظریات سے علم و فن کے بہت سے زاویے بنے۔ فقہ، تفسیر، علم کلام، معانی و بیان، فلسفہ اور تاریخ و سیر یہ سب ایک ہی آفتابِ علم و حکمت کی مختلف کرنیں ہیں۔ صدرِ اسلام سے لے کر اب تک انسانی بہتری کے لیے دنیا میں جتنی بھی تحریکیں اُٹھیں، ان میں قرآن کے ہمہ گیر تصور کی روح کسی نہ کسی طرح ضرور موجود رہی۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ بھی اسلام کے ارتقائے عقلی کا ایک کرشمہ ہے۔
جمال آرٹ کا نصب العین ہے اور کمال حکمت بالغہ کا نام ہے۔ حکمت سے مراد تمام محاسن انسانی اور اخلاق فاضلہ ہیں۔ کمال حکمت سے حسن و راستی اور عدل و خیر کی قوتیں پھوٹتی ہیں۔ حکمت حقیقت کبرےٰ کا بلند ترین مظہر ہے۔ فن کی رنگینی و رعنائی کے ساتھ جب یہ بلند معنوی خصوصیات مل جاتی ہیں تو عظیم تخلیق ظہور میں آتی ہے۔ کلام نبوی میں اقوال زریں کا جو حصہ ہے، وہ ان تمام خوبیوں کا دلکش مرقع ہے۔

عہد اسلام میں نثر کا ارتقاء

قرآن سے عربی نثر جس درجہ فیض یاب ہوئی۔ شاعری اس حد تک متاثر نہ ہو سکی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں جب فتوحات بڑھیں، اسلامی مملکت کی حدیں وسیع ہوئیں اور سیاسی و عمرانی مسائل میں اضافہ ہوا تو نثر کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ قرآن و حدیث کے فیض و اثر نے اس دور کے طرز نثر نگاری کو پرکیف سادگی عطا کی۔ خلفائے اسلام اور والیان حکومت میں خط و کتابت کے جو نمونے ملتے ہیں، ان میں سہل ممتنع کی سی کیفیت ہے۔

خلفائے راشدین کے عہد میں جس ادب و انشار کی بناڈالی گئی، عصر اموی میں اسے کچھ اور وسعت حاصل ہوئی۔ عبدالحمید الکاتب (متوفی ۱۳۲ھ) نے طرز ادا کو نرم اور سلیس بنایا، اس میں لوچ اور دلکشی پیدا کی، اس نے حکیمانہ خیالات کو مانوس انداز بیان (Familiar style) میں اس لطافت سے پیش کیا کہ عربی ادب میں نثر نگاری ایک فن بن گئی۔

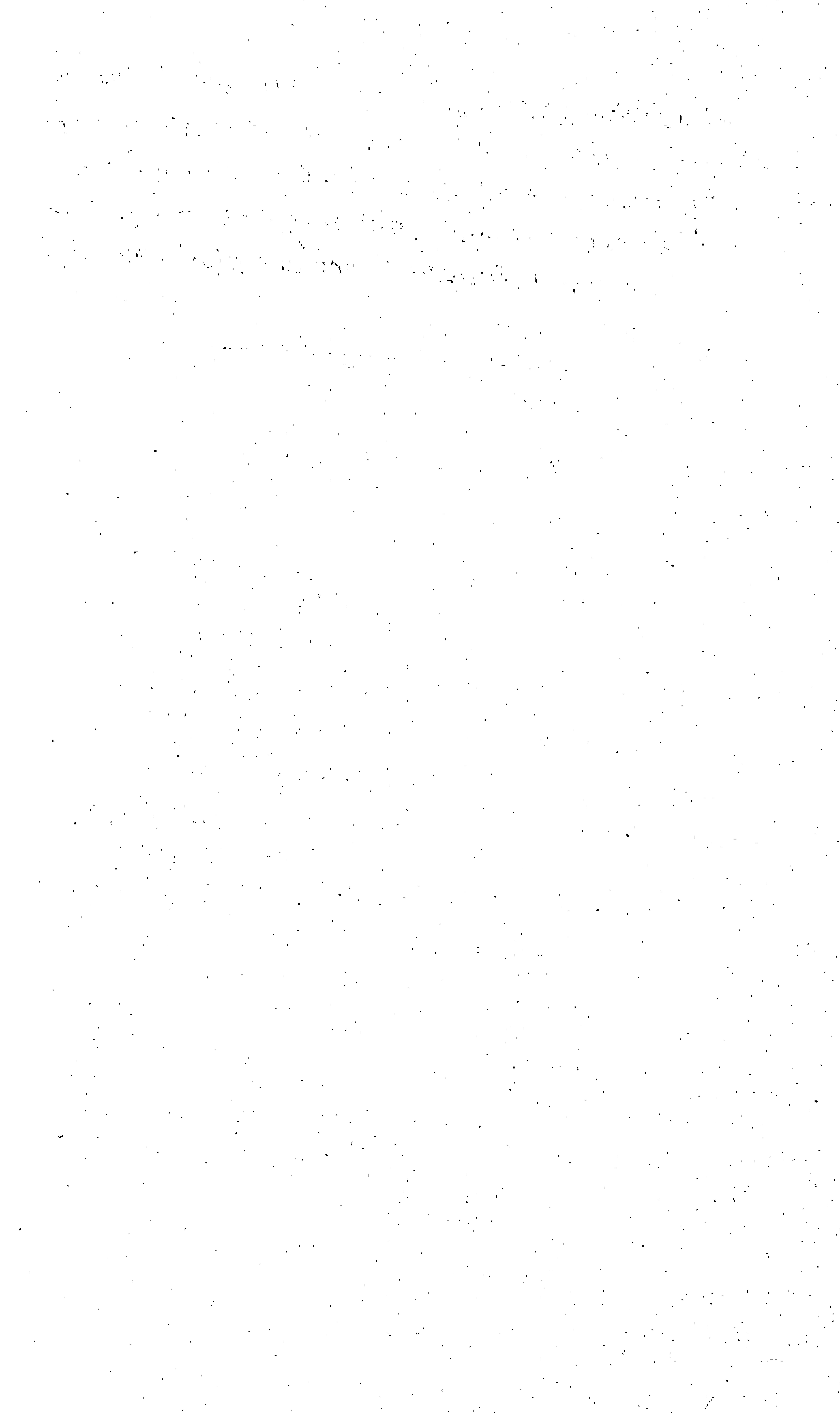
عبداللہ بن المقفع (متوفی ۱۴۲ھ) نے اپنے پیش رو نثر نگاروں کی لافانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے عربی ادب کو نیا اسلوب اور نیا فکر دیا چونکہ وہ خاص و عام دونوں کو یکساں فیض پہنچانا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنی تحریروں میں وضاحت خیال اور سلاست ادا کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اس کے اسلوب میں سادگئ اظہار کے ساتھ ساتھ ایک فطری حسن بھی ہے، اس کے یہاں الفاظ کی میناکاری ہے لیکن ابن العمید کی طرح صناعی کی حد تک نہیں۔ اس کے یہاں سجع و قافیہ، جذبۂ و خیال کی قدرتی رو کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ابن المقفّع کے بعد جاحظ نے عربی نثر کو قوت اظہار و حسن و ابلاغ کے ساتھ حکیمانہ وقار بخشا۔ اس کے بے پایاں علم، اس کے بے پناہ استدلال اور اس کے غیر معمولی تجزیے نے اس کے اسلوب بیان کو شکوہ و جلال عطا کیا۔ اس کے یہاں عالمانہ اظہار فصاحت پایا جاتا ہے۔ اس کی نثر میں علم اور فن اپنی تمام وسعتوں اور رعنائیوں کے ساتھ گم ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن و حدیث نے عربی ادب کے ہر گوشے کو اس انداز سے سنوارا کہ مختلف علوم کے چشمے پھوٹ نکلے اور عربی نثر کا پایہ عربی شاعری کی بہ نسبت بہت بلند ہو گیا۔ حیرت ہے کہ اسلام کے آفاقی تصور کو رومی اور اقبال نے اپنے کلام میں جس طرح جذب کیا، اس کی مثال صدر اسلام سے لے کر دور عباسی بلکہ دور جدید تک کے عربی شعراء میں کہیں نہیں ملتی۔

یہ صحیح ہے کہ عربی شاعری اسلام کے ہمہ گیر نظام حیات کو مکمل طور پر اپنے اندر سمو نہ سکی پھر بھی عہد اسلام کے شعراء کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فن کا و نہج یا اسلوب نہیں

رہا جو دورِ جاہلیت کا خاصہ ہے دورِ اسلام میں جو شاعری پروان چڑھی، کلامِ جاہلیت کے مقابل میں اس کا انداز نرم اور لطیف ہے، زبان شستہ، پاکیزہ اور نکھری ہوئی ہے، طرزِ ادا ستھرا اور دلنشیں ہے، سوقیت و ابتذال کم یاب ہے۔ بقول ابن خلدون "مسلم فنکاروں کا فن نثر و نظم میں کلامِ جاہلیت سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ حضرت حسان رض، عمر بن ابی ربیعہ، حُطیئہ، جریر، فرزدق، ذوالرُّمہ، احوص، اور بشار وغیرہ کا کلام بلاغت اور شعریت کے اعتبار سے عنترہ، علقمہ، زہیر، عمرو بن کلثوم اور طرفہ سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔"



مقدمہ

ادب: کسی زبان کے شعراء ومصنفین کا وہ نادر کلام، جس میں نازک خیالات وجذبات کی عکاسی اور باریک معانی ومطالب کی ترجمانی کی گئی ہو، اس زبان کا "ادب" کہلاتا ہے۔ اسی ادب کی نفس انسانی میں شائستگی، اس کے افکار وخیالات میں جلاء، اس کے احساسات میں نزاکت وحسن، اور زبان میں سلاست وزور پیدا ہوتا ہے۔ ادب کا اطلاق ان تصانیف پر بھی ہوتا ہے جو کسی علمی یا ادبی شعبے میں تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ اس لحاظ سے گویا لفظ ادب ان تمام تصانیف کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے جو محقق علماء کے انکشافات، مضمون نگاروں کے افکار، شاعروں کے انوکھے تخیلات اور نازک تصورات پر مشتمل ہوں۔

عربی زبان کا ادب دنیا کی تمام دوسری زبانوں کے ادب کے مقابلہ میں زیادہ مالا مال ہے۔ اس لیے کہ اس کا آغاز آفرینش انسان ہوتا ہے اور اس کی انتہاء عربی تمدن کے مٹ جانے پر ہوگی۔ خاندانِ مضر کی یہ زبان اسلام پھیلنے کے بعد صرف ایک قوم ہی کی زبان نہ رہی بلکہ ان تمام اقوام عالم کی زبان بھی بن گئی جو وقتاً فوقتاً اسلام کی دعوت قبول کرتی رہیں۔ یہ دعوت قبول کرنے والے بھی اپنی زبانوں کے اسرار وغوامض، انوکھے تصورات وخیالات اور نادر مطالب ومعانی کا اس زبان میں اضافہ کرتے رہے اور آگے چل کر یہ زبان حامل دین وادب، داعی علم وتمدن بن کر زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیلی اور اس نے ہر اس زبان کو جو اس سے نبرد آزما ہوئی زیر کرلیا۔ اس طرح اس زبان نے یونانیوں، ایرانیوں، یہودیوں، ہندؤں، اور حبشیوں کے قدیمی علوم وآداب اپنے اندر جذب کرلیے، اور زمانہ کی سخت گردشوں کے باوجود ان درمیانی صدیوں میں بخیر وخوبی محفوظ رہی۔ اس نے اپنے گرد وپیش کی کئی زبانوں کو تباہ وبرباد ہوتے دیکھا مگر یہ بہادری کے ساتھ پروقار طور پر سر اونچا کیے تمام مذہبی فلسفوں اور ادبی افکار وخیالات کو اپنے اندر جمع کرتے ہوئے بسلامت نکل آئی۔ دوسری قوموں کی زبانیں اس کے مقابلہ میں نالوں، ندیوں، نہروں اور دریاؤں کی حیثیت رکھتی ہیں، جو متفرق مقامات پر بڑھنے اور پھیلنے کے باوجود ایک ہی سمندر میں گرتی ہیں، اور وہ سمندر عربی زبان ہے۔

ادب کی تاریخ: کوئی زبان کتنے متفرق ادوار سے گذری، مختلف زمانوں میں اسے ادباء وشعراء نے کس قدر نظم ونثر کا ذخیرہ دیا، اور وہ کون سے اسباب تھے جو اس کی ترقی یا تنزل اور تباہی کے باعث بنے؟ یہی وہ علمی مبحث ہے جسے ہم اس زبان کے ادب کی تاریخ کہتے ہیں۔ اس ضمن میں اس زبان کے مشہور مصنفین، بلند پایہ ادباء وشعراء کے حالات کا تذکرہ، ان کی تالیفات پر نقد وتبصرہ، نیز علماء وادباء کا فکر وفن میں باہمی تاثر، اور طرز انشاء واسلوب نگارش میں ایک دوسرے پر اثر اندازی کا

بیان کیا جاتا ہے [1]۔

یہ ہے تاریخ ادب کی جدید اور مخصوص ترین تعریف، لیکن اس کی وہ تعریف جو عام طور پر کی جاتی ہے یہی ہے کہ زمانہ کے تسلسل کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام ان چیزوں کا بیان جو اوراق و کتب پر، مدون ہوتی ہوں یا جو کچھ پتھروں پر کندہ کیا گیا ہو جس سے کسی جذبہ و خیال کا اظہار یا کسی علم و فن کی تعلیم، یا کسی واقعہ کی یاد کو ہمیشہ کے لیے باقی رکھنا مطلوب ہو، اس تعریف میں بلند پایہ مفکرین و مصنفین اعلماء و حکماء، کے حالات، ان کے طبعی رجحانات ان کے مذاہب و عقائد اور ان کی فنی قابلیت و منزلت کا تذکرہ بھی شامل ہے تاکہ اس زمانہ کے علوم و فنون کی ترقی و انحطاط کا اندازہ ہو سکے۔

تاریخ ادب کا فائدہ: قوموں کی بقاء و حیات میں تاریخ ادب کا بہت بڑا ہاتھ ہے کیونکہ زبان اور اس سرمایۂ معلومات کی حفاظت جو عقل و فکر کی کاوشوں سے اُس میں فراہم کیا گیا ہے وہی درحقیقت ان بنیادی قوتوں میں سے ایک قوت ہے جس پر کسی قوم کی وحدت، سربلندی اور فخر و شرف کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کو اس کے موروثی علمی و ادبی ذخیروں سے محروم کر دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اپنے قومی خصائص و امتیازات سے جدا ہو جائے گی اس کی وحدت کا شیرازہ ابتر ہو جائے گا، اور وہ عقلی غلامی کا شکار بن جائے گی جو سیاسی غلامی سے بدرجہا بدتر ہے۔ اس لیے کہ جسمانی

---

[1] تاریخ ادب اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے بالکل جدید پیداوار ہے، جسے اطالوی باشندوں نے اٹھارویں صدی میں ایجاد کیا، مشرق اس لفظ سے ناواقف تھا، لیکن مغرب نے میل جول کے بعد سب سے پہلے مرحوم حسن توفیق العدل نے اپنے جرمنی کے سفر سے واپسی اور دارالعلوم میں تاریخ ادب کے پروفیسر مقرر ہونے پر اہل مشرق سے اس فن کا تعارف کرایا۔

عربوں میں ایسی تصانیف بکثرت پائی جاتی ہیں جن میں ادباء، علماء، شعراء وغیرہ کے حالات ہیں، اور اس سلسلہ میں انہوں نے متفرق طریقے اختیار کیے تھے جن سے اس فن میں ان کے کمال کا پتہ چلتا ہے مثلاً (۱) وفیات الاعیان لابن خلکان۔ فوات الوفیات للکتبی، (۳) بغیۃ الوعاۃ للسیوطی (۴) معجم الادباء لیاقوت (۵) تاریخ الحکماء للقفطی (۶) الاغانی لابی الفرج الاصبہانی (۷) یتیمۃ الدہر للثعالبی (۸) دمیۃ القصر لباخرزی (۹) خریدۃ القصر للکاتب الاصبہانی (۱۰) قلائد العقیان للفتح بن خاقان (۱۱) نفح الطیب للمقری، لیکن ان کتابوں کو تاریخ ادب سے اسی قسم کا تعلق ہے جیسا اینٹوں کو مکان سے، اس لیے کہ ان میں غیر مسلسل اور بے ترتیبی سے منتشر حالات جمع کر دیے گئے ہیں، جن سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شعراء و ادباء میں باہم علم و فن اور مقصد و اسلوب میں کیا ربط تھا۔ ان سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ نظم و نثر میں کب اور کیونکر تغیرات و انقلابات رونما ہوئے۔ وہ مواد جو تاریخ ادب کے سلسلہ میں (۱) العمدۃ لابن رشیق (۲) المثل السائر لابن الاثیر (۳) المقدمہ لابن خلدون (۴) الفہرست لابن الندیم میں ملتا ہے وہ نہایت مختصر اور جزئی قسم کا ہے مزید برآں ان میں یہ مواد منتشر اور غیر مربوط درج ہے تاریخ ادب سے اس قسم کی غفلت کیوں برتی گئی اس کے اسباب ہم آگے "عربوں کے تاریخ نویسی کے طریقوں" پر بحث کرتے ہوئے بیان کریں گے، تفصیل ہماری کتاب "فی اصول الادب"، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۵ء میں دیکھئے۔

غلامی کا تو علاج ممکن، اور اس سے شفاء کی اُمید ہے۔ لیکن روحانی غلامی تو قومیت کے حق میں ایسی موت ہے جس کی دوا کسی طبیب کے پاس بھی نہیں۔

تاریخ ادب کی تقسیم: ہر قوم کی ادبی تاریخ ان کی سیاسی اور اجتماعی تاریخ سے وابستہ ہوتی ہے۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ یہ دونوں باہم لازم و ملزوم، ایک دوسرے کی معاون و مددگار اور ایک دوسری پر اثر انداز ہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا، فرق صرف یہ ہے کہ ادبی تاریخ سیاسی و اجتماعی تاریخ سے اسی طرح مقدم ہے جس طرح عمل سے پہلے فکر و ارادہ، تمام سیاسی انقلابات اور اجتماعی کوششیں اور تحریکیں اس ذہنی انقلاب کا نتیجہ ہوتی ہیں جن کو پہلے شاعروں کی زبانیں اور علماء کے قلم اپنی حساس، دور رس اور پاکیزہ طبیعتوں سے رونما کرتے ہیں، پھر تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ان کے خیالات عوام میں پھیل کر ایک انقلاب کا باعث بن جاتے ہیں۔

اس لیے ہم بھی دیگر مصنفین سے موافقت کرتے ہوئے اپنی اس ادبی تاریخ کی کتاب کو انہی پانچ زمانوں میں تقسیم کریں گے جن کے مطابق عربی اور اسلامی اقوام میں سیاسی و اجتماعی انقلابات رونما ہوئے۔ اور وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ زمانہ جاہلیت:۔ یہ دور پانچویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوتا ہے جب عدنانیوں نے یمنیوں سے خود مختاری حاصل کی اور ۶۲۲ھ میں آغاز اسلام پر یہ زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ صدر اسلام تا عہد بنی امیہ:۔ یہ دور اسلام کے آغاز سے شروع ہو کر ۱۳۲ھ میں عباسی حکومت کے قیام پر ختم ہوتا ہے۔

۳۔ دور عباسی:۔ یہ دور عباسیوں کی حکومت کے قیام سے شروع ہو کر ۶۵۶ھ میں بغداد تاتاریوں کے قبضہ میں جانے پر ختم ہوتا ہے۔

۴۔ دور ترکی:۔ بغداد تاتاریوں کے قبضہ میں جانے پر اس دور کی ابتداء اور ۱۲۲۰ھ کی انقلابی تحریک کے شروع ہونے پر اس کی انتہاء ہوتی ہے۔

۵۔ دور حاضر:۔ محمد علی پاشا کے مصر پر حاکم ہونے سے اس کی ابتداء ہوئی، اور اب تک یہی دور جاری ہے۔

عرب، ان کے رہائشی مقامات، ان کے طبقات اور مشہور قبائل: عرب ان اقوام میں سے ایک ہے جن کو مؤرخین اپنی اصطلاح میں سامی اقوام (۱) (سام بن نوح کی اولاد) کہتے ہیں، جو بابلیوں، اشوریوں، عبرانیوں، فینیقیوں، آرامیوں، اور حبشیوں پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ تمام قومیں ایک ہی جڑ سے پھوٹی ہیں۔ جہاں انہوں

---

(۱) سب سے قبل اس اصطلاح کو جرمنی مؤرخ فرڈریک شلوسر نے اپنی کتاب "التاریخ العام" میں استعمال کیا۔ اس مؤرخ کی وفات ۱۸۶۰ء میں ہوئی۔

نے ابتدائی پرورش پائی، اور پھر وہاں سے متفرق مقامات میں پھیل گئیں۔ وہ جڑ کہاں تھی، اس کے تعین میں اختلافات ہیں، بعض عراق بتاتے ہیں کچھ جزیرہ عرب کو ترجیح دیتے ہیں اور بقیہ حبشہ قرار دیتے ہیں۔ اس اختلاف کی خواہ کوئی نوعیت ہو، بہرصورت سب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ قومیں بہت قدیم زمانہ ہی میں منتشر ہو گئی تھیں۔ بابلیوں اور اشوریوں نے عراق میں سکونت اختیار کی۔ فینیقیوں نے شام کا ساحلی علاقہ آباد کیا۔ عبرانیوں نے فلسطین، اور حبشیوں نے حبشہ۔ عرب ایک جزیرہ نما ہے جو براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ شمال میں شام کی حدود سے اس کی حدیں ملتی ہیں۔ مشرق میں دریائے فرات اور بحرہند واقع ہے۔ جنوب میں بھی بحر ہند نے اس کو گھیر رکھا ہے، اور مغرب میں بحیرۂ احمر ہے اس جزیرہ نما کو کوہ سراۃ جس کا سلسلہ یمن سے شام تک پھیلا ہوا ہے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے (۱) مغربی حصہ (۲) مشرقی حصہ، مغربی حصہ دامن کوہ سے لے کر ساحل بحیرۂ احمر تک نشیبی ہے۔ اور اسی لیے یہ علاقہ ''غَوْرْ'' (نشیب) یا گرمی زیادہ ہونے کی وجہ سے ''تِہَامَہ'' کہلاتا ہے، مشرقی حصہ ابھرتا ہوا عراق و سماوہ تک پھیل گیا ہے، مرتفع ہونے کی وجہ سے اس علاقہ کو ''نجد'' کہا جاتا ہے۔ ان دونوں حصوں کے درمیان جو علاقہ واقع ہے وہ ''حجاز'' کہلاتا ہے، اس لیے کہ یہ دونوں حصوں کے درمیان حد فاصل ہے۔ وہ حصہ جو مشرق میں نجد کو لیتے ہوئے یمامہ، بحرین عمان کو اپنے اندر شامل کرتا ہے ''عَرُوض'' کہلاتا ہے، اس لیے کہ یہ یمن اور نجد کے درمیان عرضاً پھیلا ہوا ہے، حجاز سے جنوبی سمت جو میدانی علاقہ ہے وہ ''یمن'' کہلاتا ہے، یہ یمن اس لیے کہلاتا ہے کہ کعبہ سے داہنی جانب واقع ہے یا پھر اس لیے کہ سرسبز و شاداب ہونے کی وجہ سے وہ بابرکت ہے۔

عرب کے مذکورۂ بالا علاقوں میں قحطان و عدنان کے خاندان پھیلے ہوئے ہیں۔ قحطانیوں نے یمن میں رہنا شروع کیا جہاں ان کی شاندار آبادی کے ساتھ ان کا روشن تمدن ظہور پذیر ہوا، اور جب آب و ہوا راس نہ آئی تو وہ دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے۔ چنانچہ کہلان میں سے ثعلبہ بن عمرو حجاز کی سمت نکل گئے جہاں ان کی وجہ سے یہودیوں نے یثرب پر غلبہ پایا، اوس و خزرج اسی کی نسل سے ہیں۔ خزاعہ جو حارثہ بن عمرو سے ہے سرزمین حرم میں جا ٹھہرا۔ عمران بن عمرو نے عمان کی راہ لی جہاں ان کی اولاد ازدعمان کے نام سے موسوم ہوئی۔ نصر بن الازد کے قبائل نے تہامہ کو وطن بنا لیا اور وہ ازد شنوءۃ کہلائے جفنہ بن عمرو کا پیش دستہ شام میں خیمہ زن ہوا جہاں وہ اور اس کی اولاد رہی اور انہی میں سے غساسنہ پیدا ہوئے۔ بنو لخم حیرہ میں رہے انہیں میں نصر بن ربیعہ ہیں جو حیرہ کے بادشاہوں (مناذرہ) کے جد اعلیٰ ہیں۔ عدنانیوں نے حجاز اور اس سے متصل بائیں جانب کے عراقی سبزہ زار میں بود و باش اختیار کی چنانچہ قریشی خاندانوں نے مکہ اور اس کے قرب و جوار کو مسکن بنایا۔ کنانہ کے قبائل نے تہامہ کو، بنو ذبیان تیماء و حوران کے درمیانی علاقہ میں اترے، ثقیف طائف میں، اور ہوازن مشرقی مکہ میں، بنو اسد کوفہ سے مغربی جانب اور تیماء مشرقی جانب جا بسے، بنو تمیم نے بصرہ کے دیہاتوں میں پڑاؤ ڈال دیا۔ تغلبی قبائل فراتی جزیرہ میں بس گئے۔ بقیہ تمام بکر بن وائل یمامہ کے ساحلی علاقہ اور بصرہ و کوفہ کے درمیانی علاقہ میں آباد ہو گئے۔

مؤرخین عربی اقوام کو مندرجۂ ذیل تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں :-

(۱) بَائِدَہ: یہ وہ قومیں ہیں جن کے حالات نامعلوم اور آثار ناپید ہو چکے ہیں۔ تاریخ ان کے بارے میں ایسے ابہام سے کام لیتی ہے جس سے نہ تو حقیقت پر روشنی پڑتی ہے نہ گمانوں کی تردید ہوتی ہے، ان کے مشہور قبیلے عاد، ثمود، طسم اور جدیس ہیں۔ قرآن ان کے بارے میں یہ بیان کرتا ہے کہ:-

"فاما ثمود فاھلکوا بالطاغیہ - واما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیہ"

قوم ثمود سخت کڑک کے ذریعہ ہلاک کر دی گئی اور قوم عاد تند و سرکش باد صرصر کے ذریعہ تباہ ہو گئی"۔ طسم اور جدیس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ کسی زنانہ افسانوی واقعہ کی بنا پر آپس میں کٹ مرے۔

(۲) عَارِبَہ: یہ وہ یمنی باشندے جن کا نسب یَعْرُب بن قحطان سے ملتا ہے اور جن کو تورات میں یارح بن یقطان کہا گیا ہے، عربوں کا خیال ہے کہ یہی بزرگ ان کی زبان کے اصل بانی ہیں، اور انہیں پر فخر کرتے ہوئے حسان بن ثابت نے کہا تھا:-

تعلّمتم من منطق الشیخ یعرب ابینا فصرتم معربین ذوی نفر
وکنتم قدیمًا مالکم غیر عجمۃ کلام وکنتم کالبھائم فی القفر

"تم نے ہمارے بزرگوار باپ یعرب سے بات کرنا سیکھی تب جا کر تمہاری زبان درست ہوئی اور تم میں جماعتی نظام پیدا ہوا، حالانکہ پہلے تمہاری زبان گونگی تھی اور تم وحشی جانوروں کی طرح بیابانوں میں رہتے تھے"۔

انہی یمنیوں میں حِمْیَر کے گھرانے ہیں جن میں زید الجمہور، قضاعہ، سکاسک قابل ذکر ہیں، نیز قبائل کہلان جن میں ہمدان، طَئی، مَذحج، کِندہ، لخم مشہور ہیں، لخم کی اولاد میں منذر اور اس کے بیٹے حیرہ میں، ازد سے اوس و خزرج مدینہ میں، اور غسانیہ شام میں سکونت پذیر ہوئے۔ یمن میں حِمْیَر کی حکمرانی تھی اور انہی میں سے نواب اور بادشاہ بنتے تھے۔

(۳) مُستَعْرِبَہ: یہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں جو تقریباً انیسویں صدی قبل مسیح حجاز آ کر ٹھہرے، اور شاہان جرہم سے دامادی کا رشتہ جوڑ کر وہاں مستقل اقامت اختیار کر لی، یہاں ان کی نسل بکثرت پھیلی جسے زمانہ کے تاریک گوشوں نے اپنے اندر اس طرح چھپا لیا کہ اب تاریخ بھی یقینی شکل میں عدنان سے اوپر کوئی صحیح نسب نامہ نہیں بتاتی، چنانچہ عربی نسل کا صحیح سلسلۂ نسب عدنان پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔

اس طبقہ کے مشہور قبائل ربیعہ، مُضَر، انمار اور ایاد، ہیں، ربیعہ سے عبدالقیس اور عبدالقیس سے وائل کے دونوں بیٹوں بکر و تغلب کی نسل چلی۔ مُضَر سے قیس عیلان اور یاس بن مُضر کے قبائل نے جنم لیا۔ قیس عیلان کے مشہور قبیلے ہوازن اور غطفان ہیں غطفان سے بغیض کے دو بیٹے عَبس و ذُبیان کی نسل جاری ہوئی۔ یاس کی اولاد تمیم بن مُرّ، ہُذیل بن مُدرکہ، اسد بن خزیمہ اور کنانہ بن خزیمہ کے خاندان ہیں اور کنانہ سے خاندان قریش چلتا ہے۔ پھر قریش کے متفرق گھرانے جُمَح، سَہم، مَخزوم، تیم، عبدالدار اور عبد مناف ہیں۔ عبد مناف کے چار بیٹے تھے عبد شمس، نوفل، مطلب اور ہاشم، ہاشم سے عبدالمطلب پیدا ہوئے، اور عبدالمطلب کے دس بچے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ حضرت علیؓ کے والد ابو طالب، اور حضرت عباسؓ انہی کی اولاد ہیں۔

عَلَوی خاندان حضرت علی رضؓ کی طرف منسوب ہے اور عباسی حضرت عباس رضؓ کی طرف، بَنُو اُمَیّۃ کا ہاشم کے خاندان میں سے کچھ حصہ نہیں، وہ ہاشم کے بھائی عبدشمس کی اولاد ہیں۔

مؤخر الذکر (بنو ہاشم) ہی وہ طبقہ ہے جن کے سر ہماری عربی زبان، اس کے ادب و بیان اور ہمارے دین اسلام کا سہرا ہے۔

عہد جاہلیت میں عربوں کی اجتماعی، سیاسی، دینی اور عقلی حالت:

کسی ملک کی آب و ہوا کا اس ملک کے باشندوں کے اخلاق اور ان کے معاشی و اجتماعی نظام پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ان کی طبیعتیں اور عادتیں اسی آب و ہوا کے مطابق نشو و نما پاتی ہیں۔ عرب ایک جزیرہ نما ہے، جہاں کی زمین خشک اور بنجر ہے، بارش کی قلت نیز چشموں اور نہروں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ زمین نہ تو زراعت کے قابل ہے نہ شہری زندگی کے لیے موزوں، اس لیے فطری تقاضوں کے ماتحت وہاں کے باشندے دیہاتی خانہ بدوش زندگی گذارتے ہیں، خیموں میں رہتے، مویشی پال کر ان کے دودھ اور گوشت سے پیٹ بھرتے ہیں، ان کے اُون اور بالوں سے اپنی پوشاک تیار کرتے ہیں، جانوروں کو چرانے کی خاطر سبزہ زاروں اور بارانی علاقوں کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں، البتہ قریش اور قحطانی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ شہری زندگی گذارتے تھے اور خانہ بدوش نہ تھے۔ قریش تو اس لیے کہ انہیں خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے مقدس و بزرگ تصور کیا جاتا تھا، اور یمن و شام کے تجارتی سفروں میں انہیں بے خوفی نصیب تھی، اور قحطانی اس لیے کہ ان کا علاقہ سرسبز و شاداب تھا، وہاں غلہ اور پھلوں کی فراوانی تھی۔ چنانچہ جب کبھی بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑتا تو وہ آپس ہی میں ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور مال وغیرہ لوٹ لیتے تھے، جس کے باعث ان کی طبیعتیں بگڑ گئی تھیں۔ آپس میں دشمنی، مسلسل جنگ دائمی شورش و ہنگامہ ان کی زندگی کا لائحہ عمل بنے ہوئے تھے۔ جنگ اور قحط یہ دو ہی ان کی زندگی کے بڑے محرک تھے، انہی کی وجہ سے وہ بہادری اور سخاوت کے ثناخواں تھے، زبان دانی و فصاحت پر فخر کرتے تھے۔ اولاد نرینہ ان کو زیادہ مرغوب تھی، لڑکیوں کو وہ زندہ درگور کر دیتے تھے[1] جماعت کی تعداد، اکثریت کی قوت ان کے لیے باعث فخر و ناز چیزیں تھیں، رشتہ داریوں کے زیادہ پھیلنے کو وہ عزت و غلبہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

سفر اور خانہ بدوشی کی زندگی سے انس، نیز جنگ و جدال میں انہماک کی وجہ سے وہ بے قید زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔ عصبیت و وحشت کا ان پر غلبہ تھا، ان کا اپنا کوئی اجتماعی تمدن نہ تھا، نہ سیاسی حکومت تھی نہ فوجی نظام نہ ہی کوئی دینی عقائد پر مبنی فلسفہ، کوئی وسیع سماجی تصور اُن کے پاس نہ تھا،

---

[1] زندہ درگور کرنے کا طریقہ تمام عربوں میں عام نہ تھا بلکہ تمیم و اسد کے بعض قبائل فقر و فاقہ کے ڈر سے ایسا کرتے تھے۔ اسی کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: لا تقتلوا اولادکم خشیة املاق، نحن نرزقهم و ایاکم۔

ہر گھر یا ہر قبیلہ جدا جدا ایک سماج بنا ہوا تھا۔ قبائل کے سرداروں کو وراثتاً حکومت ملا کرتی تھی، جسے وہ اپنے بزرگوں کے مروجہ دستور کے مطابق چلاتے تھے۔ اُن کا طرزِ حکومت یونانیوں کی خاندانی حکومت کی طرح نہ تھا، نہ ایران و مصر کی طرح۔ ان کے یہاں شاہی حکومت تھی۔ البتہ حیرہ اور شام میں عرب تاجدار تھے لیکن وہ خود مختار نہ تھے، حیرہ کا لخمی خاندان ایران کے کسریٰ کا، اور شام میں غسانی روم کے قیصر کے مطیع تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تمدن و شہریت، رائے عامہ، امراء کی حکومت[1]، جمہوریت اور جاگیرداری کے معانی و مطالب کے اظہار کے لیے اُن کے اور دوسری سامی اقوام کے پاس الفاظ نہیں ملتے۔ فوجی نظام تو اسلام کے بعد تک بھی مکمل شکل میں قائم نہ ہو سکا تھا، اس لیے کہ ماتحتی میں رہنا اور اپنی انفرادی شخصیت سے دست بردار ہو جانا، یہی دو چیزیں ہیں جن پر فوجی تنظیم کا مدار ہے۔ اور یہی وہ عادتیں ہیں جو عرب کی طبیعت اور ذہنیت کے بالکل برعکس ہیں۔ مذہب بھی سادگی، بے تکلفی اور زہد و تقشف کا حامی تھا۔ چنانچہ عربوں میں یونانیوں کی طرح کئی خداؤں اور دیوتاؤں کا تصور نہ تھا، بڑی بڑی عمارتیں، عالیشان عبادت گاہیں بھی ان کے یہاں نہ تھیں مجسمے نصب کرنے کا رواج بھی نہ تھا، پرانے لوگوں کے قصے اور کہانیاں بھی ان کے پاس بہت نہ تھیں، نہ کوئی عقائد کا فلسفہ تھا۔ جہالت کی کارفرمائی، خانہ بدوشی، بے سروسامانی اور پھر طویل مدت گذرنے کی وجہ سے ان کے پاس جو دین ابراہیمی کا بقیہ رہ گیا تھا وہ بھی بگڑ چکا تھا، اور اسی کا اثر تھا کہ وہ بتوں کی عزت اور ان کی پوجا کرتے تھے، وہ کعبہ میں بت رکھا کرتے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ ان بتوں کے توسل سے وہ خدا کا قرب حاصل کر لیں گے۔ عرب کی بڑی تعداد اسی قسم کی بت پرستی کو مذہب قرار دے چکی تھی۔ یمن اور یثرب کے گرد و نواح (تیماء، خیبر) میں کچھ لوگ یہودی مذہب اختیار کیے ہوئے تھے، غسانی اور ربیعہ قبیلہ کے کچھ لوگ شام میں اور نجران و حیرہ کے کچھ لوگ عیسائی مذہب پر بھی تھے۔

ان کا خاندانی نظام موجودہ مصر کے دیہاتی علاقہ کے خاندانوں سے بہت حد تک ملتا جلتا تھا، وہ افراد جن سے خاندان بنتا تھا اور جو خاندان کی ریڑھ کی ہڈی کہلاتے تھے، ماں باپ، اولاد، پوتے اور غلاموں پر مشتمل تھے۔ باپ کو اپنے گھر والوں پر اختیار کلی حاصل تھا۔ حتیٰ کہ ان میں سے کسی کو مارنا یا باقی رکھنا بھی اسی کی مرضی پر منحصر تھا۔ ان میں سے وہ جس کو چاہے بیچ سکتا تھا اور جسے چاہے عاق کر سکتا تھا۔ کبھی مفلسی کے اندیشہ سے وہ اپنی بیٹی کو زندہ گاڑ دیتے تھے۔ ذلت و عار کے خوف سے اپنی لونڈی کے پیٹ کے بچہ کو اپنا نہ بناتے۔ شوہر کے بعد خاندان میں بیوی کا دوسرا درجہ تھا۔ شوہر اس کا احترام ملحوظ خاطر رکھتا، اسے اپنا شریک کار بناتا اور اظہار محبت کے لیے شعروں میں اسی کا نام گاتا تھا۔ بیٹا ماں سے منسوب ہونے پر بھی وہی ناز کرتا تھا جو باپ سے منسوب ہونے پر۔ ان کے ہاں شادی کی رسم میاں بیوی کے باہمی خوشگوار تعلقات اور محبت کی بنا پر انجام پاتی تھی۔ اگر نکاح کے وقت کوئی شرط نہ طے کی ہو تو طلاق کا تمام تر حق شوہر کو حاصل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ شادی کے دوسرے طریقے بھی تھے جو بدکاری اور بدمعاشی سے زیادہ مشابہ تھے اور جن سے صرف شہوت پرست بدمعاش جوان ہی بہرہ ور ہوتے تھے............ مثلاً ایک طریقہ

---

[1] وہ طرزِ حکومت جس میں حکمرانی چند مضبوط خاندانوں میں رہتی ہو۔

تلوار کے ذریعہ نکاح کا تھا، اس کا قاعدہ یہ تھا کہ کوئی ایسا پردیسی جس سے ان کا کوئی معاہدہ نہ ہو اپنی بیوی کے ہمراہ ہو تو تلوار لے کر اس سے مقابلہ کرتے، اور فتح پانے کے بعد اس کی عورت پر قبضہ کر لیتے۔ عرب والے ایک ساتھ کئی شادیاں کر لیتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں ان کے یہاں کوئی مقررہ حد نہ تھی، باپ کی بیوی سے شادی کرنا ان کے نزدیک جائز تھا۔ خالہ، پھوپھی، بیٹی اور بہن سے شادی کرنا حرام سمجھا جاتا تھا، بچپا زاد بھائیوں میں اگرچہ آپس میں اندرونی طور پر کشیدگی رہتی تھی تاہم گھریلو اور خاندانی تعلقات اس جاہلی مقولہ کے مطابق تھے کہ اُنصر اخاک ظالمًا او مظلومًا یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، چنانچہ ایک فرد کی حمایت میں پورا قبیلہ اور قبیلہ کی حمایت میں ایک ایک فرد اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

اُن کی عقلی حالت اور علمی مقام کا اندازہ یمنی تبابعہ (تبع بادشاہوں)، حیرہ کے منذر بادشاہوں، اور شامی غساسنہ، کے کارناموں سے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے عالیشان بند باندھے، بنجر زمینوں کو کاشت کے قابل بنایا، ویرانوں کو آباد کیا، شہروں کو بسایا، لیکن بایں ہمہ ان کی ترقی کا صحیح مقام، اور ان کے علوم کی حقیقت ہم پر اس وقت تک پوشیدہ رہے گی جب تک کہ آثار قدیمہ کے ماہرین اپنی تحقیقی روشنی اس پر نہ ڈالیں[1]۔

عدنانیوں کو ان کی قوت نظری وسیع تجربہ کاری اور ضرورت مندیوں نے بہت کافی معلومات بہم پہنچا دیں۔ جنگ میں لگے رہنے کی وجہ سے طب، بیطاری اور شہسواری میں وہ ماہر ہو گئے۔ بارش اور گھاس پر دارومدار ہونے کی وجہ سے وہ ان تاروں کو پہچاننے لگے تھے، جن سے بارش کی اطلاع ملتی ہے۔ ہواؤں کے چلنے کا رخ انہیں معلوم ہو گیا تھا۔ بری و بحری سفروں میں تاروں کی مدد سے وہ تاریک راتوں میں رہنمائی حاصل کر لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی نسلوں کی بقاء اور قومی تعصب کو برقرار رکھنے کے لیے علم نسب، اپنے قابل فخر واقعات بیان کرنے کے لیے قصہ گوئی، اور اپنے کارناموں کو دوام بخشنے کے لیے شاعری میں کمال حاصل کر لیا تھا۔

فراست اور قیافہ شناسی[2] میں وہ ماہر ہو گئے تھے تاکہ اپنی نسل میں بیگانوں کا میل نہ ہو سکے اور بھاگنے والے مجرموں کو ان کے نقش قدم سے تلاش کر لیں، روحانی میلان نے ان کو کہانت، عرافت

---

[1] قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہمیں ان گذری ہوئی نسلوں کے آثار مل جائیں گے۔ جنگ عظیم کے بعد سے عربی ممالک میں فرانسیسی اور انگریزی ... دخل ہو گیا ہے۔ نو آبادین اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے مشرق قدیم میں فلسطین، شام اور عراق کے کھنڈروں کی چھان بین شروع کر دی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں فرانسیسی پروفیسر مونٹے نے قدیم فینقی شہر ودجبیل کے آثار دریافت کرنے پر اس تحقیق کی خوش آئند ابتدا کر دی ہے۔

[2] فراست ظاہری قرائن و آثار سے اندرونی حالات تک رسائی کا نام ہے مثلاً کسی شخص کی باتوں اور اس کے ناک نقشہ سے اس کے اخلاق و عادات کا اندازہ لگانا، چنانچہ عربوں کے نزدیک چوڑی پیشانی ذہانت و ذکاوت کی نشانی تھی، چوڑی گدی کند ذہنی کی دلیل، کوتاہ آنکھ بخل کی علامت اور موٹے ہونٹ دوستی یا دشمنی میں انتہا پسندی کی علامت تھے۔

قیافہ کی دو قسمیں ہیں ایک تو آثار شناسی جس سے نقوش پہچان کر مفرور مجرم کو پکڑ لیا جائے، دوسرے انسان کی کھال، حلیہ ڈیل ڈول دیکھ کر اس کے نسب و نسل کو بتانا۔

اور زجر[1] پر ایمان دلایا۔ اپنی بیماریوں میں وہ کاہنوں کی طرف رجوع کرتے۔ حتیٰ کہ اسلام نے آکر ان کے تمام مزعومات باطلہ، عقائد فاسدہ اور خرافات کا استئصال کیا۔

مختصر یہ کہ عربوں کا اجتماعی نظام صرف قبائل تک محدود تھا۔ زبان، سیاست اور اقتصادیات کے اعتبار سے ان میں آپس میں کوئی یگانگت نہ تھی۔ البتہ ثقافت، ذہنیت اور ادب کے لحاظ سے ان میں ایک گونہ اشتراک پایا جاتا تھا، اگر ان کے ادب و زبان کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان میں بڑی بلند، عالی دماغ، ذہین و طباع ہستیاں ملیں گی۔ دوررسی، تجربہ کاری، وسعت نظر اور وسیع معلومات کی ایسی مثالیں نظر آئیں گی جو تمام تر اُن کی اپنی جودت فکر اور طباعی کا نتیجہ ہیں۔ ان کی زبان نے جو درحقیقت ان کی اجتماعی شکل کی ترجمان ہے روحانی و مادی، فکری و خیالی، اجتماعی و انفرادی، الغرض آسمان و زمین کی کسی چیز کو بھی ایسا نہ چھوڑا جس کے اظہار معانی کے لیے اپنے اندر کوئی لفظ نہ بنایا ہو۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے تمام الفاظ کو سلسلہ وار ضبط کر رکھا ہے[2]۔ کسی لفظ کو کسی چیز کے لیے بنانے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ وہ چیز موجود ہے، دوسرے یہ کہ وہ چیز ایک معلوم شے ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ کوئی زبان اس وقت تک متمدن نہیں ہو سکتی جب تک کہ معنوی طور پر اس میں ایک ترقی یافتہ اجتماعی تمدن ظہور پذیر نہ ہو جائے خواہ وہ لفظی طور ترقی یافتہ نہ ہو، ایسا تمدن جو اپنے اثر کے اعتبار سے ہمہ گیر ہو خواہ وہ اپنے لوگوں میں ہمہ گیر نہ ہو۔

---

[1] کہانت اور عرافت غیب کی باتیں معلوم کرنے نیز گذرے ہوئے اور آنے والے واقعات بتانے کو کہتے ہیں، فرق یہ ہے کہ کاہن آنے والے واقعات جاننے والے اور پیشگوئی کرنے والے کو کہتے ہیں، اور عراف گذشتہ زمانہ کے حالات واقعات بتانے والے کو۔ عربوں کا خیال تھا کہ کاہنوں اور عرافوں کے جنات تابع ہوتے ہیں جو پوشیدہ طور پر عالم غیب سے حالات سن کر ان کو مطلع کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ان پر بڑا ایمان رکھتے اور اہم معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ پیچیدہ معاملات میں ان سے مشورہ لیتے، جھگڑے ان سے فیصل کراتے، بیماریوں میں ان سے علاج کراتے، خوابوں کی تعبیر انہی سے پوچھتے، اُن کے سب سے مشہور کاہن شق اور سطیح ہیں اور عرافوں میں ابلق اسدی رنجد میں، رباح عجلہ دیمامہ میں، قابل ذکر ہیں۔

زجر جانوروں کی آواز، ان کی حرکت و ہیئت سے آئندہ پیش آنے والے واقعات کا اندازہ لگانے کو کہتے ہیں مثلاً اگر کوئی شخص کسی پرندہ کو پتھر مار کر یا شور مچا کر اڑاتا اور وہ پرندہ اس کے دائیں سمت سے اٹھا چلا جاتا تو اسے وہ فال نیک سمجھتے لیکن اگر بائیں جانب سے ہو کر اڑتا تو اسے وہ بدشگونی تصور کرتے اور منحوس خیال کرتے۔

[2] اس کی مثالیں ثعالبی کی فقہ اللغہ اور ابن سیدہ کی المخصص میں ملیں گی۔

پہلا باب

زمانۂ جاہلیت

پہلی فصل

عربی زبان کی پیدائش اور ارتقاء: عربی زبان ان سامی زبانوں میں سے ایک زبان ہے جو سب کی سب ایک زمین کی پیداوار ہیں جہاں سے وہ پھوٹ کر بڑھی اور پھیلی ہیں۔ جگہ کی تنگی اور گنجان آبادی کی وجہ سے جب سامی قومیں متفرق مقامات میں بٹ گئیں تو اُن کی آپس کی جدائی اور دوسروں میں اختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی زبانوں میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ پھر ماحول کی اثر اندازی اور درازئ مدت نے اس لسانی اختلاف کی خلیج کو اور وسیع کر دیا۔ حتیٰ کہ زبان کا ہر لہجہ بجائے خود ایک نئی زبان بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سامی زبانوں کے باہمی تعلق کو سب سے پہلے قرونِ وسطیٰ میں علمائے یہود نے معلوم کر لیا تھا۔ لیکن یورپ کے مستشرقین نے باقاعدہ پختہ دلائل کے ساتھ اس باہمی تعلق کو ثابت کر دیا ہے، چنانچہ اب یہ تعلق ایک ایسی علمی حقیقت بن گیا ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

ماہرین لسانیات نے جس طرح آریائی زبانوں کے تین حصے "لاتینی، یونانی اور سنسکرت" کیے ہیں سامی زبانوں کو بھی تین حصوں "آرامی، کنعانی اور عربی" میں تقسیم کر دیا ہے۔ آرامی زبان سے کلدانی، اشوری اور سریانی زبانیں وجود میں آئیں۔ کنعانی زبان عبرانی اور فینقی زبان کا سرچشمہ ہے۔ عربی سے مضر کی فصیح زبان اور دوسری متفرق بولیاں جنہیں یمنی اور حبشی قبائل بولتے ہیں وجود پذیر ہوئیں۔ عربی زبان دنیا سے الگ محدود علاقہ میں رہنے کی وجہ سے دوسری زبانوں کے برعکس انقلابات زمانہ سے بہت کم متأثر ہوئی، اس لیے یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ عربی ہی وہ زبان ہے جو آرامی اور کنعانی زبانوں کی نسبت اپنی اصل سے زیادہ مشابہ اور قریب تر ہے۔

عربی زبان کا سب سے پہلی بار وجود میں آنے اور اس کی ترقی کے ابتدائی مدارج کا کھوج لگانا کسی محقق کے بس کی بات نہیں رہی، اس لیے کہ ہمیں اس زبان کی تاریخ ہی اس وقت سے ملنا شروع ہوئی ہے جو اس کے عین شباب وترقی کا زمانہ ہے۔ اس سلسلہ میں چند ایسے تاریخی کتبوں اور پتھروں سے بھی کچھ مدد نہیں ملتی جو جزیرہ عرب میں پائے گئے ہیں، البتہ وہ درمیانی احوال وحوادث جن کے اثر سے اس زبان کے مختلف لہجوں میں یگانگت اور اس کے الفاظ میں شائستگی پیدا ہوئی وہ ہمیں عقلی ونقلی دلائل سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب والے ایک امی قوم تھے۔ جنہیں دین، تجارت یا حکومت میں سے کوئی چیز بھی باہمی ارتباط اور میل جول

پر مائل نہ کرتی تھی، چنانچہ وہ ایک ہی چیز کے لیے اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ کئی نام بنا لیتے تھے۔ ثانیاً خانہ بدوش زندگی گذارنے، جداگانہ زندگی بسر کرنے یا دوسروں میں گھل مل جانے کی وجہ سے ان کی زبان میں اضطراب وخلل واقع ہو گئے اور یگانگت باقی نہ رہی تھی، مترادف الفاظ بکثرت پائے جانے لگے۔ معرب، مبنی اور تعلیل وغیرہ کی وجہ سے لہجوں کا اختلاف بڑھتا گیا، کچھ اختلاف ادائیگی حروف کی خامیوں اور کمزوریوں نے پیدا کیا مثلاً، قضاعہ قبیلہ کا عجعجہ، حمیر کا طمطمانیہ، ہذیل کا فحفحہ، تمیم کا عنعنہ، اسد کا کشکشہ طئی کا قُطعہ وغیرہ[1]۔ ان چیزوں نے زبان کی مختلف بولیوں کو اس حد تک ایک دوسری سے جدا کر دیا کہ ایک ہی زبان بہت سی زبانوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسری کے لیے ناقابل فہم ہو رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان کی اصل بھی ایک دوسری سے الگ ہے۔

عربوں کی ان متعدد بولیوں اور ان کے باہمی اختلافات کو ہم دو بنیادی حصوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) شمالی عربی زبان (۲) جنوبی عربی زبان۔ ان دونوں زبانوں میں اعراب، ضمائر اشتقاق اور صرف کا جو واضح فرق ہے اسے دیکھتے ہوئے ابو عمرو بن العلاء نے یہاں تک کہہ دیا کہ نہ تو حمیر کی زبان ہماری زبان ہے نہ ان کی لغت ہماری لغت۔ مگر اس عظیم اختلاف کے باوجود بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ جرمن محقق گلازر کی تحقیق کے مطابق ۲۷۰ھ عریں سیلاب سے بند ٹوٹ جانے پر قحطانی اپنا وطن چھوڑ کر جزیرہ عرب کے شمالی حصہ میں جا بسے تھے جہاں انہوں نے اپنی پوری قوت وطاقت اور تمدن وترقی سے کام لیتے ہوئے یہ کوشش کی کہ جس طرح وہ یمن میں عدنانیوں کو زیر کر چکے تھے شام وعراق میں بھی ویسی ہی برتری حاصل کریں۔ اس صورت حال سے اگرچہ دونوں اقوام میں سے کوئی بھی فریق مخالف پر غالب نہ آسکا اس لیے کہ اگر ایک حیثیت سے قحطانی اپنی قوت کی وجہ سے غالب تھے تو دوسری طرف صحرا پر پورا تسلط جم جانے کی وجہ سے عدنانی بھی قحطانیوں سے کسی حالت میں کمزور نہ تھے، تاہم اس کشمکش کی وجہ سے دونوں گروہوں میں ایک قسم کا سیاسی وتجارتی تعلق پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے دونوں کی زبانوں کے الفاظ ملنے لگے اور ادائیگی الفاظ کا طریقہ بھی یکساں ہونے لگا۔ یہ کشمکش چھٹی صدی عیسوی تک جاری رہی تا آنکہ یمن میں رفتہ رفتہ حمیری حکومت کا زور کبھی ایرانی اقتدار اور کبھی حبشیوں کے تسلط کی وجہ سے کم ہوتا گیا۔ اب عدنانیوں کی حالت ان کے بالکل برعکس تھی۔ انہیں بازاروں اور میلوں

---

[1] مشدد "ی" یا وہ "ی" جس کے قبل "ع" ہو قبیلہ قضاعہ اس "ی" کو "ج" سے بدل دیتا تھا اس تبدیلی کا نام عجعجہ ہے، مثلاً "راعی" کو "راعج" "کرسی" کو "کرسج" بولنا۔ طمطمانیہ "ال" کی جگہ "ام" بولنے کو کہتے ہیں، مثلاً "البر" کو "امبر" "الصیام" کو "امصیام" کہنا۔ "ح" کی جگہ "ع" ادا کرنے کو فحفحہ کہتے ہیں، مثلاً احل اللہ الحلال کو اعل اللہ العلال" کہنا۔ عنعنہ کسی لفظ کے شروع میں جو "ہمزہ" ہو اسے "ع" کر دینے کو کہتے ہیں مثلاً "آمان" کو "عمان" کہنا۔ کشکشہ مؤنث حاضر کے "ک" کو "ش" سے بدل دینے کا نام ہے مثلاً "علیک" کو "علیش" کہنا۔ کسی لفظ کے آخری حرف کو حذف کر دینے کا نام قُطعہ ہے، مثلاً "یا ابالحسن" کو یا ابالحسا کہنا۔

میں شرکت، حج بیت اللہ کی برکت حمیری اور ایرانی حکومتوں سے مقابلہ کی جد و جہد، جنگ اور تجارت کے سلسلہ میں روم اور حبشہ سے تعلقات وغیرہ کی بنا پر ترقی و اتحاد، محبت و ہمدردی اور خود مختاری کے بیشتر ذرائع مہیا ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زبان اور اپنے ادب کو مغلوب حمیر پر ٹھوپ دیا پھر اسی حالت میں اسلام آ گیا، اور اس نے بھی مذکورہ بالا عوامل کو تقویت پہنچائی، اس طرح جنوبی لہجے اور یمنی قومیت کا خاتمہ ہو گیا، اور حمیری زبان ان کا ادب اور ان کی تاریخ آج تک کے لیے مٹ گئی۔ صرف یہی نہیں کہ جنوبی زبانوں کو شمالی زبانوں نے مغلوب کر دیا بلکہ جہالت، درندگی اور بدتہذیبی کے وہ اثرات بھی زائل ہو گئے جو زبانی خامیوں اور مختلف و مترادف الفاظ کی کثرت کی شکل میں رونما ہو گئے تھے نتیجۃً قریش کی زبان کو دینی، اقتصادی اور اجتماعی وجوہ سے تمام دوسری زبانوں پر غلبہ حاصل ہو گیا ان میں سے چند اہم اسباب ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

میلے اور بازار:- عرب والے تجارتی اغراض کے لیے سال کے مختلف مہینوں میں مختلف مقامات پر میلے اور بازار لگاتے رہتے تھے اور ایک بازار سے دوسرے بازار میں آمد و رفت کرتے رہتے تھے۔ طبیعت انسانی کا خاصہ ہے کہ جب بہت سے آدمی یکجا جمع ہو جاتے ہیں تو وہ آپس میں گفت و شنید، تبادلۂ خیال اور شعر و شاعری کی مجلسیں قائم کر لیتے ہیں۔ جن کے ذریعہ وہ اپنے اہم واقعات، بلند کارنامے، حسب و نسب کی بڑائیاں اور اس قسم کی دوسری باتوں کا چرچا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان میلوں اور بازاروں کے اجتماعات میں بھی یہ چیز پیدا ہو گئی اور تجارتی منڈیاں شعراء و خطباء کے افکار و خیالات کی نشرگاہیں بننے لگیں جہاں عربوں کو اپنے دین، اخلاق، عادات اور اپنی زبان میں اتحاد پیدا کرنے کا موقع بھی ملنے لگا۔ شعراء اور مقررین ہمیشہ عام فہم الفاظ اور پسندیدہ طرز اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے سامعین زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں اور وہ مقبولیت و ہردلعزیزی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا کہ ان مراکز میں پڑھے جانے والے اشعار قبیلہ میں پھیل کر عام ہو جاتے اور یہی وجہ تھی کہ عوام کے مختلف لہجے، طرز، خیالات و افکار رفتہ رفتہ ہم آہنگی و موزونیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ ان میلوں میں قابل ذکر عکاظ، مجنۃ اور ذوالمجاز[1] کے میلے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر میلہ کو عربی زبان کی اصلاح و تہذیب میں بڑی برتری حاصل ہے

---

[1] عکاظ نخلہ اور طائف کے درمیان مکہ سے تین منزل کی مسافت پر ایک بستی ہے۔ ۵۴۰ء سے یہاں میلہ بھرنا شروع ہوا۔ اسلام کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری تھا تا آنکہ ۱۲۹ھ میں خوارج کے لوٹ مار کرنے پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

مجنۃ مکہ سے کچھ میلوں پر نشیبی علاقہ میں ایک جگہ ہے۔

ذوالمجاز عرفات کے پیچھے منیٰ میں ایک مقام ہے۔ اس قسم کے اجتماعات قائم کرنے میں یونانیوں کو عربوں پر سبقت حاصل ہے وہ ہر چار سال کے بعد ہیکل مشتری کا اولمپیا میں حج کرنے کے ساتھ ساتھ جمنازیم میں جمع ہو کر ورزشی کرتبوں کا مظاہرہ بھی کرتے تھے۔ عرب والوں کی طرح انہوں نے بھی کچھ مہینوں کو حرام قرار دے کر ان میں قتل و غارت گری کا سد باب کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہاں ورزشی کرتبوں کا اکھاڑا قائم ہو گیا، پھر جب اس اجتماع کو شاہی تائید حاصل ہوئی تو وہ شعر و شاعری (باقی صفحہ ۶۲ پر)

یہ بازار ذیقعدہ کی پہلی تاریخ کو بھرنا شروع ہوتا اور بیس تاریخ تک مسلسل لگاتار جاری رہتا۔ عرب کے تمام سردار و اعیان، تجار و ارباب کلام شعر و شاعری، حسب و نسب شماری، ادائے حج، لین دین اور سوداگری نیز قیدیوں کو چھڑانے کے لیے اس میلے میں شرکت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بقیہ تمام میلے مقامی حیثیت رکھتے تھے جن میں صرف گرد و نواح کے باشندے حصہ لیتے تھے۔ عکاظ کے میلہ کو حج کے حرام مہینوں میں لگنے کی وجہ سے ایک امتیازی شان حاصل تھی، اور یہی وجہ تھی کہ اس میں قبائل عرب کے تمام سربرآوردہ تجار و شعراء پہنچتے تھے، اور اس کو ہمہ گیر مقبولیت و شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ اس موقع پر عرب کے بڑے بڑے فیصلے چکانے والے حکم اور پنچ بھی موجود ہوتے تھے، اسی جگہ اُن کے سامنے بڑے بڑے اہم مقدمات پیش ہوتے تھے، جنہیں وہ بغور سنتے۔ پھر جس کی بات زیادہ سلجھی ہوئی، دلائل قوی اور بیان واضح تر پاتے اسی کے حق میں فیصلہ کر دیتے تھے۔

مکہ کی اہمیت اور قریش کا کاروبار: عربوں کی ترقی اور ان کی زبان کو متحد کرنے میں مکہ کے محل وقوع کو بہت بڑا دخل ہے۔ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے یہ علاقہ اُن قافلوں کے پڑاؤ کی جگہ تھی جو ہندوستان اور یمن کا تجارتی مال لے کر جنوبی سمت سے آتے تھے مکہ والے اُن سے تمام مال خرید کر خود اس مال کو شام و مصر کے بازاروں میں کھپاتے تھے۔ خانہ کعبہ کی عزت و حرمت اور قریش کی بزرگی پر تمام قبائل کے اتفاق نے مکہ کے تجارتی راستے ان کے لیے پر امن بنا دیے تھے۔ چنانچہ قریشی اپنے تجارتی مال سے لدے ہوئے قافلے بے خوفی سے لے جاتے تھے۔ بازاروں اور میلوں میں شرکت، ملکوں ملکوں کی سیاحت، اور تجارتی سفروں نے ان کی کاروباری معلومات میں اضافہ کر دیا تھا۔ عقل اور سمجھ بڑھنے کی وجہ سے زندگی کے دوسرے مسائل بھی قابل التفات ہوتے جا رہے تھے۔ مالی حالت بھی سدھر گئی تھی۔ اس کے علاوہ خود مکہ عرب والوں کے لیے ایک تجارتی منڈی بن گیا تھا، جہاں لوگ پاپیادہ اور سواریوں پر چاروں طرف سے آکر جمع ہوتے تھے تاکہ ارکان حج بجا لائیں اور اپنی ضرورتوں کا سامان وہاں سے خرید لائیں۔

(قریش جو مکہ کے باشندے اور وہاں کے رئیس تھے انہیں اپنے تمدن، خانہ کعبہ کی تولیت، حج کی قیادت، عکاظ کے بازار پر حکمرانی، جاڑوں میں یمن، اور گرمیوں میں شام کے تجارتی سفروں نے تمام عربی قبائل سے ربط و ضبط رکھنے، اور بخوبی واقف ہونے کا پورا موقع بہم پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی متفرق بولیوں اور مختلف لہجوں کو سن کر ان میں غور کیا کرتے تھے، حتی کہ ان میں الفاظ پرکھنے کا اچھا خاصہ ملکہ پیدا ہوگیا تھا، جس کی مدد سے انہوں نے اپنے لیے ایک پیاری اور نہایت شیریں زبان منتخب کر لی تھی، جو الفاظ اور لہجوں کی خامیوں سے پاک صاف اور نہایت درجہ دل نشین ہونے کے ساتھ ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱ کا) کی مجلس اور خیالات و افکار کی محفل میں تبدیل ہوگیا۔ اسی کا اثر ہے کہ آج تک یورپ بالخصوص جرمنی میں تعلیم گاہوں کے لیے "جمنازیم" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

اپنے مواد کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ وسیع تھی[1]۔ پھر شعراء و خطباء وغیرہ نے اس زبان کو اپنا کر اس کی ترویج و اشاعت میں اضافہ کر دیا، اور بعد میں جب قرآن مجید بھی اسی زبان میں اترا تو اس کے کامل غلبہ میں جو کمی باقی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔

دوسری فصل

نثر: کسی زبان میں تبادلۂ خیالات کرنے کے لیے کلام کی سب سے پہلی وجود پذیر ہونے والی قسم نثر ہے۔ اس لیے کہ وہ آسان و بے قید ہونے کے ساتھ ساتھ سب کی ضرورت کی چیز ہے۔ نثر کی دو قسمیں ہیں، ایک تو مسجع جس کے ہر دو فقروں کے آخری کلمات کو موزون و مقفی لانے کا التزام کیا جائے۔ دوسری مرسل جس میں سادگی اختیار کی جائے نہ تک بندی اور قافیہ کی قید ملحوظ نہ رکھی جائے۔ طبعی قوت، موروثی ذہانت اور عجمیوں سے بہت کم اختلاط کے باعث عربوں کی نثر نہایت شستہ، پاکیزہ، آسان اور سلجھی ہوئی تھی، البتہ صرف طبعی وجوہ کی بناء پر تلفظ اور مخارج کے اداء کرنے میں اختلاف تھا، مثلاً "ح" کی جگہ "ع" بولنا، حروف کو کھینچ کر بولنا، پُر یا باریک آواز سے بولنا وغیرہ۔ عربوں کی تاریخ و آدب کے راویوں نے نثر کی کثیر مقدار پائے جانے کے باوجود کچھ اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی، اور ہم تک نثر کا صرف وہی حصہ پہنچا جو اپنی موزونیت و نفاست یا بلاغت و ایجاز کی وجہ سے زبان زد خاص و عام ہو گیا، جیسے ضرب الامثال، حکیمانہ مقولے اور کہاوتیں، وصیتیں، خطبے اور تقریریں، یا پھر وہ نثر جس میں بخوبی کسی چیز کا وصف کیا گیا ہو۔

ضرب المثل کبھی تو بات کا ایک ٹکڑا، اور کبھی مستقل طور پر ایسا جملہ ہوتی ہے جس کا تعلق کسی مخصوص واقعہ سے ہوتا ہے، لیکن بعد میں اس سے مشابہ موقعوں پر اسے بلا تغیر و تبدل دہرا دیا جاتا ہے، اور سننے والا اس مختصر سے فقرہ سے پورے واقعہ کو سمجھ لیتا ہے، نثر کی یہ قسم خاص طور پر عربوں کی اجتماعی زندگی اور انفرادی حادثات کی پیداوار ہے۔ چند امثال بطور نمونہ درج ہیں:-

ضرب الامثال:- (۱) وافق شن طبقہ: شن (مرد کا نام) کو طبقہ (عورت کا نام) مل گئی، یہ مثل اس صورت میں پیش کی جاتی ہے جب کسی طرار اور شریر کو اس کے مقابلہ کا مل جائے (جیسے کو تیسا)۔

(۲) لأمرٍ ما جدع قصیر أنفہ: کچھ تو ہے جو قصیر نے اپنی ناک کاٹ لی ہے۔ جب کوئی شخص

---

[1] عقد الفرید کے مصنف نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ امیر معاویہؓ نے ایک دن اپنے درباریوں سے دریافت کیا "سب سے زیادہ صاف اور فصیح زبان کن لوگوں کی ہے"، سماط قبیلہ کے ایک شخص نے جواب دیا "یا امیر المومنین! اس قبیلہ کی جس میں نہ تو عراقی تتلاہٹ ہے نہ بکر کا کشکشہ، نہ تغلبی ففشفشہ، نہ قضاعہ کی طرح ان میں غمغمہ ہے نہ حمیر کا طمطمانیہ (گویا وہ زبان ہر قسم کی کجی اور خامی سے پاک ہے) امیر معاویہ نے کہا وہ کونسا قبیلہ ہے"؟ اس نے جواب دیا "اے امیر المومنین! وہ آپ ہی کا قبیلہ قریش ہے"۔

مطلب براری کے لیے بدحال بن جائے یا ظاہر باطن کے خلاف بنالے تو یہ مثل پیش کی جاتی ہے۔

(۳) یداك اوكتا وفوك نفخ :۔ تیرے ہاتھوں نے باندھا اور تیرے منہ نے پھونک ماری۔ جب کوئی شخص اپنی کوتاہی اور لاابالی پن کی وجہ سے نقصان اُٹھائے تو اس کے لیے یہ مثل پیش کرتے ہیں۔ (خود کردہ را علاج نیست)۔

علماء نے اس قسم کی ضرب الامثال جمع کرکے ان کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔ اس سلسلہ میں امثال حروف ہجاء کی ترتیب سے جمع کی گئیں ہیں اور تمام مشہور قدیم ضرب الامثال اس میں موجود ہیں۔

حکیمانہ مقولے :- وہ خوشنما مقولہ جو حکمت و دانشمندی سے لبریز، اور حقیقت کے مطابق ہو نیز اس میں بے ضرورت زائد الفاظ نہ ہوں، حکیمانہ مقولہ (کہاوت) کہلاتا ہے۔ یہ عموماً تجربہ کاری دانائی اور وسیع واقفیت کا نتیجہ ہوتا ہے، ہم عرب کے چند مقولے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) الخطأ زاد العجول : غلطی جلد باز کا توشہ ہے، یعنی جلد بازی کرنے والے سے ہمیشہ غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔

(۲) من سلك الجدد أمن العثار : جو سیدھی سڑک پر چلے گا کھٹکوں اور ٹھوکروں سے بچا رہے گا۔

(۳) عيّ صامت خير من عيّ ناطق : خاموش بے وقوفی ناطق بے وقوفی سے بہتر ہے۔

خطبے اور وصیتیں : خطبوں اور وصیتوں سے مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف مائل اور بدکرداریوں سے متنفر کیا جائے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ خطبہ بھری مجلسوں، میلوں وغیرہ میں دیا جاتا ہے اور وصیت معین موقع پر مخصوص لوگوں تک محدود ہوتی ہے، جیسے سفر کرنے والا یا مرنے والا اپنے گھر والوں کو وصیت کرتا ہے۔

جاہلیت کی نثر کے امتیازات : زمانہ جاہلیت کی نثر نہایت سادہ اور طبعی ہے، نہ اس میں تکلیف و آورد کو دخل ہے نہ بناوٹ اور تصنع کا شائبہ، نہ مبالغہ آمیزی کا وجود۔ وہ دیہاتی اخلاق اور بدویانہ ماحول کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، صاف شستہ الفاظ، عمدہ ترکیبیں، سلجھے ہوئے خیالات، چھوٹے چھوٹے جملے، استعاروں کی کمی، بیان میں اختصار و ایجاز، ان کی نثر کی خصوصیات ہیں، کبھی ان کی عبارتوں میں امثال اور مقولوں کا ایسا لگاتار سلسلہ بھی ملتا ہے جو بے ربط اور اپنی جگہ کے اعتبار سے غیر متناسب معلوم ہوتا ہے۔

فنِ خطابت : شاعری کی طرح فنِ خطابت کا تانا بانا بھی خیالات و افکار، اور فصاحت و بلاغت ہیں۔ آزادی و شجاعت ہمت و اولوالعزمی کے اظہار کا یہ ایک ذریعہ ہے۔ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے، دلائل سے خاموش کرنے اور اہم کاموں پر ابھارنے اور اُکسانے کا یہ ایک کارگر حربہ ہے۔ اس فن کے لیے چرب زبانی، خوش بیانی، اور برجستہ گوئی لازمی شرائط ہیں۔ عرب والے نہایت غیور و خوددار اور حساس و بہادر تھے اور ان میں یہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں، دیگر غیر متمدن اقوام

کی طرح انہیں باپ دادا کے حسب و نسب پر فخر، آبائی عزت و شرافت برقرار رکھنے کی خواہش، اور اسی قسم کے دیگر اسباب و مقاصد، مثلاً دو قبیلوں کے باہمی تعلقات کی اصلاح، قبائل کے سرداروں اور اپنے نوابوں یا حکمرانوں اور ان کے نائبوں کے مابین سفارت وغیرہ کی بنا پر خطابت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہیں اس فن میں کامل مہارت اور نمایاں سبقت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ بچپن ہی سے اپنے بچوں کی تربیت میں خطابت کا ملکہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ہر قبیلہ میں ایک مقرر (خطیب) اور ایک شاعر ہو جو ان کی تقویت کا باعث، اور ان کا ذکر بلند کرنے کا سبب ہو۔ چنانچہ کبھی کبھی یہ دونوں صفات ایک شخص میں بھی جمع ہو جاتی تھیں۔

اپنی تقریروں میں وہ دل نشین اسلوب، سحر بیانی، سلیس عبارت، خوشنما الفاظ، صاف صاف باتیں چھوٹے چھوٹے ہم وزن مسجع جملے اور زیادہ ضرب الامثال استعمال کرتے تھے۔ مضمون ذہن نشین کرانے اور ہر دلعزیز بنانے کے لیے تقریروں میں اختصار کو مدنظر رکھتے تھے۔ عربوں میں دستور تھا کہ مقرر اُونچی جگہ کھڑے ہو کر یا سواری پر بیٹھ کر تقریر کرتا۔ اثنائے تقریر میں ہاتھ ہلانا، مناسب اشاروں سے مفہوم کو واضح کرنا۔ ہاتھ میں عصا یا نیزہ اور تلوار کا سہارا لینا یا ان سے اشارہ کرنا بھی اُن کے یہاں رائج تھا۔

وہ مقرر ان میں درجہ قبولیت حاصل کرتا تھا جو خوش وضع وہ خوش شکل ہونے کے ساتھ بلند آواز، خوش بیان، دلیر اور بے باک ہوتا، زمانہ جاہلیت میں ان کے مشہور قابل ذکر مقررین قُس بن ساعدہ الایادی، عمرو بن کلثوم التغلبی، اکثم بن صیفی التمیمی، حارث بن عباد البکری، قیس بن زہیر العبسی، عمرو بن معدیکرب الزبیدی ہیں۔ ہم اس مختصر کتاب میں قارئین کے مطالعہ کے لیے صرف دو بڑے خطیبوں کے حالات درج کرتے ہیں۔

مقرّرین

ا۔ قُس بن ساعدۃ الایادی

یہ نجران کا بڑا پادری اور عرب کا مشہور فلسفی اور پنچ تھا۔ خدا پر پورا یقین رکھتا اور پند و وعظ کے ذریعہ لوگوں کو خدا کی طرف بلاتا تھا، اس کے متعلق مشہور ہے کہ اُونچی جگہ کھڑے ہو کر خطبہ دینے کی ابتدا اسی نے کی۔ تلوار کا سہارا لینا اور خطبہ میں "اما بعد" کہنا بھی اسی کی ایجاد ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "عکاظ" کے اجتماع میں جب اس کی تقریر سنی تو پسند فرمائی۔ روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "خدا قس پر رحم فرمائے، مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن وہ تنہا ایک قوم کی جگہ اٹھایا جائے گا۔" وقتاً فوقتاً قیصر کے دربار میں بھی جاتا تھا جہاں قیصر اس کا اعزاز و احترام کرتا تھا، لیکن آخری عمر میں وہ دنیاوی زیب و زینت سے کنارہ کش ہو کر سادہ زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ اس کا تمام وقت اللہ کی عبادت اور لوگوں کو پند و نصیحت کرتے گذرتا تھا۔ بڑی عمر پانے کے بعد ۶۰۰ء میں اس نے وفات پائی۔

اس کے نام سے منسوب ہو نثر ہمیں ملتی ہے اگر وہ واقعۃً اسی کی ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا طرزِ بیان اس کی اپنی روانیٔ طبع کا نتیجہ تھا۔ اس کی عبارت نہایت دلکش اور با اثر تھی، جس میں چھوٹے چھوٹے مسجع فقرے موزوں ضرب الامثال، اور چنے ہوئے الفاظ ہوتے تھے۔ اس میں سرکشوں کی تباہی اور دنیا کے ظاہری تغیرات سے درسِ عبرت دیا جاتا۔ وہ شعر بھی کہتا تھا، اور اس کی شاعری حسنِ الفاظ و معانی کے ساتھ ساتھ قوت تاثیر بھی رکھتی تھی جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہر ہے۔

اُس کے کلام کا نمونہ "نثر": عکاظ کے میلہ میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا:۔ "اے لوگو! سنو اور یاد رکھو، جو زندہ ہے وہ مرے گا، جو مرے گا وہ دنیا سے چلا جائے گا۔ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ یہ تاریک رات، یہ روشن دن، یہ برجوں والا آسمان، یہ چمکنے والے تارے، یہ موجیں مارتے والے سمندر، یہ جمے ہوئے پہاڑ، یہ پھیلی ہوئی زمین، یہ بہتی دریائیں، شاہد ہیں کہ یقیناً آسمان میں کوئی خاص قوت ہے۔ اور زمین میں عبرتیں ہیں۔ آخر یہ لوگ کہاں چلے جاتے ہیں کہ پھر وہاں سے واپس نہیں آتے؟ کیا وہ وہاں رہنے پر رضامند ہو گئے؟ یا پھر دنیا چھوڑ کر سو گئے؟ اے خاندانِ ایاد تمہارے آباء و اجداد کدھر گئے؟ ان ظالم فراعنہ کا کیا حشر ہوا؟ کیا مال و دولت میں وہ تم سے بڑھ چڑھ کر نہ تھے؟ کیا ان کی عمریں تمہاری عمروں سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی تھیں؟ زمانہ نے سب کو حوادث کی چکی میں نہیں ڈالا، اور ان کی جمعیتوں کو پارہ پارہ کر دیا۔

"نظم"

فی الذاهبین الاولین — من القرون لنا بصائر

لما رایت مواردًا — للموت لیس لها مصادر

ورأیت قومی نحوها — یسعی الاصاغر والاکابر

لا یرجع الماضی الیّ — ولا من الباقین غابر

ایقنت أنی لا محا — لة حیث صار القوم صائر

ہم سے پہلے گذرنے والی اقوام میں ہمارے لیے عبرت خیز انجام ہیں۔ جب میں نے موت کے گھاٹوں کو دیکھا کہ ان پر اترانے والے کے لیے واپس آنے کے راستے نہیں۔ اور یہ بھی دیکھ لیا کہ میری قوم کے سب چھوٹے بڑے تیزی سے اس گھاٹ کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں کوئی جا کر پھر وہاں سے ہمارے پاس نہیں آتا، اور نہ پسماندوں میں کوئی باقی رہنے والا ہے۔ تو مجھے یقین آ گیا کہ جو تمام قوم کا نتیجہ ہوا ہے وہی بالضرور میرا بھی انجام ہو گا۔

اس کے کلام کا نمونہ "نثر":۔ ۱۔ جو تم کو کسی کمزوری پر عار دلائے تو اس میں بھی ویسی ہی کمزوری ہو گی۔

۲۔ جو تم پر ظلم کرے گا، اس کو بھی کوئی ظالم مل جائے گا۔

۳۔ جب لوگوں کو تم کسی برے کام سے منع کرو تو پہلے خود اس سے باز آ جاؤ۔

۴۔ مفلسی میں لوگوں سے کنارہ کشی کرو، اور تونگری میں ان سے مل جل کر رہو۔

۵۔ جو کسی کام میں مشغول ہو اس سے مشورہ مت لو، خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو۔ اسی طرح بھوکے سے بھی مشورہ نہ کرو خواہ وہ بڑا دانشمند ہی کیوں نہ ہو۔ نہ خوفزدہ سے خواہ اس کی خیرخواہی پر تم کو کامل اعتبار ہی کیوں نہ ہو۔

مرثیہ: "اس کے مرثیہ کے اشعار جو اس نے دیر سمعان میں اپنے دو بھائیوں کی قبر پر کھڑے ہو کر کہے:۔

خلیلیّ ھبّا طالما قد رقدتما ۔ أجدّ کما لا تقضیان کراکما

ألم تعلما أنی بسمعان مفرد ۔ وما لی فیہ من حبیب سواکما

أقیم علی قبریکما لست بارحا ۔ طوال اللیالی او یجیب صداکما

جری الموت مجری اللحم والعظم منکما ۔ کأن الذی یسقی العقار سقاکما

فلو جعلت نفس لنفس وقایۃ ۔ لجدت بنفسی ان تکون فداکما

سأبکیکما طول اللیالی وما الذی ۔ یرد علی ذی عولۃ أن بکاکما؟

میرے دوستو! بہت سو چکے اب اُٹھ جاؤ، کیا سچ مچ ابھی تک تم نے اپنی نیند پوری نہیں کی؟
کیا تم کو نہیں معلوم کہ تمہارے بعد میں دیر سمعان میں تنہا ہوں اور کوئی بھی تم دونوں کے علاوہ یہاں میرا دوست نہیں۔

میں تمہاری قبروں کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا تا آنکہ تمہاری قبروں سے میری بات کا جواب نہ آئے۔
موت تمہارے گوشت پوست اور تمہاری ہڈیوں میں سرایت کر گئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شراب کے ساقی نے تم کو پلائی ہے۔
اگر ایک جان کو دے کر دوسری جان کو بچایا جا سکتا، تو میں اپنی جان دے کر تم دونوں پر قربان ہو جاتا۔

میں سدا تم دونوں پر روتا رہوں گا، تو کیا اس رونے کی وجہ سے نالہ وشیون کرنے والے کو کچھ حاصل ہو جائے گا؟

(۲) عمرو بن معدیکرب الزبیدی (متوفی ۲۴ھ ۶۴۳ء)

عمرو بن معدیکرب الزبیدی یمن کا شہسوار، عرب کا پرزور مقرر اور جنگ قادسیہ کا ہیرو ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب قحطان سے ملتا ہے۔ اس کی کنیت ابو ثور تھی ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے بعد ہی یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا، اور اپنی قوم کے ساتھ اسلام لے آیا۔ لیکن وہ دل جو جاہلیت خالصہ میں پل کر بوڑھا ہو گیا ہو، انسانوں کے گوشت اور خون سے کھیلا ہو، مے نوشی اور کھیل کود پر جان فدا کرتا ہو، دین کے آگے سچائی اور نیک نیتی سے سر تسلیم خم نہیں کر سکا، چنانچہ اسلام لانے کے بعد وہ مرتد ہو گیا۔ مگر پھر حق کی طرف رجوع کر لیا۔ اور خدا کی راہ میں تن من دھن کی بازی لگا دی۔ ایک سو دس برس کی عمر میں جنگ قادسیہ میں حصہ لیا، اور وہاں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ۲۳ھ ۶۴۳ء میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری ایام میں

انتقال کیا۔

اس کی صفات اور اس کا مرتبہ: عمرو بن معدیکرب نہایت توانا، فربہ، پر غرور اور اپنی قوم کا مطاع و ہر دلعزیز سردار تھا۔ جانباز و بہادر اور شاعر و مقرر تھا۔ اس کا شمار دوسرے درجہ کے شاعروں اور پہلے درجہ کے مقرروں میں ہوتا ہے۔ اس کی شاعری کا بڑا حصہ ذاتی بہادری کے کارناموں سے بھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نعمان بن منذر نے ان سربرآوردہ لیڈروں میں اسے بھی شامل کیا تھا جنہیں اس نے مدائن میں نوشیرواں کے پاس بھیجا تھا تاکہ یہ وفد عرب پر نعمان بن منذر کے دعوٰی کو سچا ثابت کرے، اور اُس کی شہرت و عزت کا موجب بنے۔ وہاں پہنچ کر عمرو بن معدیکرب نے ذیل کی تقریر کی :-

آدمیت کا دارومدار انسان کی دو چھوٹی چیزوں پر ہے، اور وہ دل اور زبان ہیں۔ راستی و صداقت بات کو مؤثر و دل نشین بنا دیتے ہیں۔ منزل مقصود کو پہنچنا تلاش و جستجو پر موقوف ہے۔ آمد آورد سے بہتر ہے۔ اپنی معلومات کے حدود میں رہنا اندھا دھند سرگردانی کی زحمت سے بہتر ہے۔ اے بادشاہ سلامت! ہمارے دلوں کو اپنی باتوں سے موہ لیجئے، اور جلدی میں ہم سے جو لغزشیں ہو جائیں ان کو بردباری سے کام لیتے ہوئے ضبط کیجئے۔ ہمارے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیجئے تو ہم بآسانی آپ کے فرمانبردار ہو جائیں گے۔ اور جان لیجئے کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ ٹھونگیں مار کر ہمارے سخت پتھر کو کچلنے کا ارادہ کرنے والے ہم کو گزند نہیں پہنچا سکتے، بلکہ جو ہمیں نیست و نابود کرنا چاہتا ہے ہم اس کے مقابلہ میں پوری طرح اپنی حفاظت و مدافعت کرتے ہیں۔

اُبی مرادی کے دھمکی دینے پر اس نے یہ شعر کہے :-

أعاذل سكتي بدني ورمحي	وكل مقلّص سلس القياد
أعاذل انما افنى شبابي	وترّم عاتقي ثقل النجاد
تمنانى ليلقاني أُبيّ	وددت وأينما مني ودادي
ولو لاقيتني ومعي سلاحي	تكشف شحم قلبك عن سواد
أريد حياته ويريد قتلي	عذيرك من خليلك من مراد

اے ملامت کرنے والی میری زرہ اور میرے نیزے کو، نیز ہر وفا شعار طاقتور گھوڑے کو آرام کر لینے دے، اور خوب سمجھ لے کہ میری جوانی جس نے برباد کی ہے اور میرے کاندھے کو جس نے زخمی کیا ہے وہ تلوار کے پرتلے کا بوجھ ہی ہے (یعنی میری عمر تمام تر جنگی مصروفیتوں میں کٹی ہے)

اُبی مجھ سے جنگ میں مقابلہ کی تمنا کرتا ہے، میری بھی یہی خواہش ہے لیکن میری خواہش کب پوری ہوتی ہے، اور اگر تو مجھے ہتھیار بند حالت میں مل جائے تو تیرے دل کی چربی بدن میں سے نکل پڑے گی۔ میں اس کی زندگی کا خواہاں ہوں، اور وہ میری موت کے درپے ہے (کیا کوئی تجھ کو تیرے مراد قبیلہ کے دوست سے چھٹکارا دلانے والا ہے ؟

اس کے کچھ اور اشعار:

لیس الجمال بمئزر — فاعلم وان رُدّیت بردا
ان الجمال معادن — و مناقب اورثن مجدا
اعددت للحدثان سا — بغة و عدّاء علندی
نهدا و ذا شطب یقدّ — البیض و الابدان قدّا
کم من اخ لی صالح — بوّأته بیدیّ لحدا
ما ان جزعت ولا هلع — ت ولا یرد بکای زندا
ذهب الذین احبّهم — و بقیت مثل السیف فردا

تم خواہ کیسی ہی حسین پوشاک کیوں نہ پہنا دیے جاؤ، یہ خیال نہ کرنا کہ حسن و جمال پوشاک میں ہوتا ہے۔ حقیقتاً حسن و جمال تو خیر و کرم کے وہ سرچشمے اور وہ بلند کارنامے ہیں جو تم کو عزت و سروری سے سرفراز کر دیں۔

میں نے آنے والے خطرناک حوادث کے لیے بھرپور زرہ، تیز رفتار قوی گھوڑا، آب دار تیز تلوار جو خودوں اور زرہوں کو کاٹ ڈالنے والی ہے تیار کر رکھی ہیں۔

کتنے ہی میرے نیک بھائی تھے جن کی میں نے اپنے ہاتھوں سے قبر تیار کی پھر میں اس صورت حال سے نہ تو گھبرایا نہ بیقراری کا اظہار کیا، اور ایسے موقع پر میرا رونا کچھ سود مند بھی نہیں ہوتا۔

وہ لوگ جن سے مجھے پیار تھا، چل بسے اور ان کے بعد میں تلوار کی مانند تنہا رہ گیا۔

زمانہ جاہلیت کی نثر کے نمونے: (الف) عربی ضرب الامثال:

۱۔ اذا سلمت الجلّة فالنیب هدر: جب موٹے توانا اونٹ بچ جائیں تو بوڑھی اونٹنیوں کا خون معاف ہے، یعنی فائدہ کی چیز بچ رہے تو ناکارہ کے ختم ہو جانے پر رنج و غم نہیں ہونا چاہیے۔

۲۔ ان کنت ریحا فقد لاقیت اعصارا: اگر تو ہوا تھا تو تجھے بگولا مل گیا۔ جب کوئی شخص اپنے اوپر بہت فخر کرتا ہو اور پھر اتفاقاً کوئی دوسرا اس سے بڑھ چڑھ کر اسے مل جائے تو یہ مثل پیش کی جاتی ہے۔ (جیسے سیر کو سوا سیر)

۳۔ انّك لا تجنی من الشوك العنب: کانٹوں (دار درخت) سے تم انگور نہیں چن سکتے۔ یعنی برے ماحول میں تم کو خوش اخلاق شخص نہیں ملے گا۔

۴۔ ذکرتنی فوك حماری اهلی: تیرے منہ نے تو مجھے میرے گھر کے دو گدھے یاد دلا دیے۔ اس کا واقعہ یوں ہے کہ ایک شخص اپنے دو گمے ہوئے گدھوں کی تلاش میں نکلا، راستہ میں ایک عورت ملی جس سے باتوں میں مشغول ہو کر وہ اپنے گدھوں کی تلاش سے غافل ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد جب عورت نے نقاب اُٹھایا اور اس کا مکروہ چہرہ نظر آیا تو اس نے یہ مثل کہی۔

۵۔ تجشأ لقمان من غير شبع : لقمان نے خالی پیٹ پر بناوٹی ڈکاریں لیں۔ بے حقیقت لمبے چوڑے دعوی کرنے والے کے لیے یہ مثل پیش کی جاتی ہے۔

۶۔ رمتنی بدائها وانسلت : مجھے اپنی بیماری دے کر بھاگ نکلی۔ اپنے عیوب دوسروں کے سر تھوپنے والے کے لیے یہ مثل پیش کی جاتی ہے۔

۷۔ رب کلمة تقول لصاحبها دعنی : بعض بات خود اپنے بولنے والے سے پناہ مانگتی ہے۔ یہ مثل فضول باتوں سے روکنے کے لیے پیش کی جاتی ہے تاکہ لوگ بکواس سے اکتا نہ جائیں۔

۸۔ أسرّ حسواً فی ارتغاء : جھاگ نکالنے کے بہانے چپکے سے دودھ کی گھونٹ پی لی۔ ایسا شخص جو بظاہر تمہاری خیر خواہی کرے اور بباطن اپنی بھلائی میں کوشاں ہو اس کے لیے یہ مثل پیش کی جاتی ہے۔ دراصل جب کسی شخص کے پاس دودھ آتا ہے تو وہ اس پر سے جھاگ نکالتے ہوئے کچھ دودھ بھی اس کے ہمراہ نکال لیتا ہے۔

۹۔ اوسعتهم سبا واودوا بالابل : میں نے تو ان کو خوب کوسا اور گالیاں دیں لیکن وہ اونٹ بھگا لے گئے۔ اس کہاوت کا قصہ یہ ہے کہ ایک شخص کے اونٹوں کو کچھ حملہ آور لے بھاگے، جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ پہاڑی پر چڑھ کر ان کو سخت سست کہنے اور کوسنے لگا۔ واپسی پر جب لوگوں نے اونٹوں کے متعلق دریافت کیا تو اس نے یہ مثل کہی۔

۱۰۔ أحشفاً وسوء کیلة : ایک تو ردی خرما اس پر ناپ میں کمی! ایک ساتھ دو بری خصلتیں کسی شخص میں جمع ہو جائیں تو یہ مثل پیش کی جاتی ہے (ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا)۔

۱۱۔ قد یحمل العیر من ذعر علی الأسد : گھبرا کر کبھی گدھا شیر پر حملہ کر دیتا ہے۔ جب کوئی شخص بے بسی اور خوف کی وجہ سے خلاف توقع بہادری کا مظاہرہ کر جائے تو یہ مثل پیش کی جاتی ہے۔

۱۲۔ قبل الرمی یراش السهم : تیر مارنے سے قبل تیر کے پر جمائے جاتے ہیں، یعنی کام کی ابتداء سے پہلے ضروری چیزوں کا بندوبست کر لینا چاہیے۔

(ب) عرب کے حکیمانہ مقولے :۔

۱۔ مصارع الرجال تحت بروق الطمع : لالچ کے فریبوں میں پھنس کر لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔

۲۔ کلم اللسان انکی من کلم السنان : زبان کا زخم نیزہ کے گھاؤ سے زیادہ کاری اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔

۳۔ رب عجلة تهب ریثا : کچھ جلد بازیاں تاخیر کا باعث ہوتی ہیں۔

۴۔ العتاب قبل العقاب: سزا سے قبل زجر و تنبیہ لازم ہے۔
۵۔ التوبۃ تغسل الحوبۃ: حق کی طرف واپس آ جانے سے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔
۶۔ من سلک الجدد امن العثار: جو سیدھی راہ چلے گا ٹھوکروں سے محفوظ رہے گا۔
۷۔ اول الحزم المشورۃ: حزم و احتیاط کی ابتدا مشورہ سے ہوتی ہے۔
۸۔ رب قول انفذ من صول: بعض بات حملہ سے زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے۔
۹۔ الحر حُرٌ ما وعد: شریف آدمی جو وعدہ کرتا ہے اسے وفا کرتا ہے۔
۱۰۔ اُترک الشر یترکک: تم برائی چھوڑ دو تو برائی تمہیں چھوڑ دے گی۔
۱۱۔ من ضاق صدرہ اتسع لسانہ: جب کسی کا دل تنگ ہو جاتا ہے تو زبان کھل جاتی ہے۔
۱۲۔ یداک منک وان کانت شلا: تمہارا ہاتھ شل ہو تو بھی تمہارا ہی ہاتھ ہے۔
۱۳۔ رب ملوم لا ذنب لہ: بعض اوقات جس کو برا بھلا کہا جاتا ہے وہ بے قصور بھی ہوتا ہے۔
۱۴۔ من مَأ منہ یؤتی الحذر: چوکنے اور چالاک شخص کو اسی جگہ سے نقصان پہنچتا ہے جہاں سے وہ بے فکر ہوتا ہے۔

(ج) عرب کے خطبات:۔

ہانی بن قبیصہ کی تقریر جو اس نے اپنی قوم کو جنگ پر آمادہ کرنے اور جوش دلانے کے لیے کی تھی۔ اس تقریر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی نثر میں معانی کی بندش کس قدر ڈھیلی، اور جملوں کا باہمی ربط کس قدر کمزور ہوتا تھا:۔

اے خاندان بکر! عذر کے ساتھ مر جانے والا جان بچانے کے لیے بھاگ جانے والے سے بدرجہا بہتر ہے۔ تقدیر کے مقابلہ میں احتیاط اور ہوشیاری کچھ فائدہ نہیں پہنچاتے۔ کامیابی کا ایک ذریعہ صبر ہے۔ ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دو، موت کا سامنے سے آنا پیچھے سے آنے سے بہتر ہے۔ کولہوں اور پیٹھوں پر نیزے کھانے سے سینوں پر نیزے کھانا زیادہ باعث عزت ہے۔ اے خاندان بکر! جنگ کرو کیونکہ موت سے نجات کی کوئی شکل نہیں ہے۔

حبشہ پر سیف بن ذی یزن کی فتح کے موقع پر عبدالمطلب نے فاتح کے دربار میں یہ تقریر کی:۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہایت بلند اور باعزت و پرشوکت مقام بخشا ہے۔ ایسے خاندان میں پیدا کیا جس کا سلسلہ نسب اعلیٰ ہے، جس کی بنیاد شرافت و برتری پر قائم ہے، جس کی شاخیں شریف خاندانوں اور پاکیزہ مقامات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ بلند اقبال ہیں۔ عرب کے سردار اور اس کی ایسی فصل بہار ہیں جس سے وہ سب سرسبز و شاداب ہوتے ہیں۔ آپ عربوں کے ہر دلعزیز فرمانروا ہیں۔ آپ ہی وہ محکم ستون ہیں جس نے عرب کی عمارت کو برقرار رکھا ہے۔ آپ ایسی حفاظت گاہ ہیں جہاں تمام

عرب پناہ گیر ہوتے ہیں۔ آپ کے اسلاف بہترین سلف تھے اور آپ ان کے بعد ہمارے لیے بہترین خلف ہیں۔ جو بزرگ آپ جیسا ارجمند فرزند چھوڑ جائے وہ ہرگز فنا نہیں ہو سکتا، اور جس اولاد کے آپ بزرگ ہوں وہ کبھی گمنامی میں نہیں رہے گی۔ اے بادشاہ! ہم حرم خداوندی میں رہنے والے اور خانۂ خدا کے پاسبان وخادم ہیں۔ ہمیں آپ کی خدمت میں وہ آرزو کشاں کشاں لے آئی ہے جس نے ہم کو ہماری پر محن اور گراں بار زندگی سے نجات کی خوشخبری دی ہے۔ ہمارا یہ وفد آپ کے پاس کسی مصیبت پر تعزیت کے لیے نہیں بلکہ فتح پر مبارکباد دینے کے لیے حاضر ہوا ہے۔

(د) عرب کی وصیتیں:۔

زہیر بن جناب کلبی نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا:۔

میرے بیٹو! میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میں نے زمانہ دیکھا ہے۔ زندگی کے بے شمار تجربوں نے مجھے پختہ کار بنا دیا ہے۔ یہاں تک میں سمجھ سکا ہوں زندگی اور اس کے معاملات آزمائش و تجربات ہی کا دوسرا نام ہے۔ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے دل لگا کر سنو اور یاد کر لو۔ خبردار! حوادث و مصائب کا مقابلہ کرنے میں کم ہمتی اور کمزوری کا مظاہرہ نہ کرنا۔ اپنے کاموں کو دوسروں پر مت ڈالنا، ورنہ تمہیں رنج وکوفت اور تمہارے دشمنوں کو مسرت حاصل ہوگی، جس کی وجہ سے تم خدا سے بدگمان ہو جاؤ گے۔ دیکھو زمانہ کی گردشوں کو مذاق سمجھ کر ان سے کبھی غافل اور بے خوف نہ رہنا، کیونکہ جس قوم نے بھی انقلابات زمانہ کا مذاق اڑایا وہ بڑی سخت مصیبتوں میں مبتلا ہو گئی۔ تم ان کے منتظر رہو، اس لیے کہ دنیا میں انسان اس نشانہ کی طرح ہے جسے تیراندازوں نے تختۂ مشق بنا رکھا ہو، ہو سکتا ہے کہ کبھی تیر اس تک پہنچتا ہی نہ ہو اور کبھی دائیں بائیں سے گذرتا ہوا آگے نکل جاتا ہو، لیکن یہ بھی تو ہے کہ کوئی تیر کسی وقت یقیناً ٹھیک نشانہ پر بھی لگ جائے۔

عرب کی ایک دیہاتی عورت نے اپنی بیٹی کو سہاگ رات کے موقع پر یہ وصیتیں کیں:۔

میری پیاری بیٹی! اگر باادب اور شائستہ ہونے کی وجہ سے کسی کو وصیت سے بالاتر سمجھا جاتا تو وہ تیری ہی ذات ہوتی، مگر اس وصیت سے غفلت شعار کو تنبیہ ہوتی، اور ہوشیار کو مدد ملتی ہے۔ پھر اگر ماں باپ کی محبت اور ان کی دولت کے باعث کوئی عورت شوہر سے مستغنی ہو سکتی ہے تو وہ تم ہی ہو سکتی تھیں۔

پیاری بیٹی! جس ماحول میں تم نے جنم لیا تھا آج تم اس سے جدا ہو رہی ہو۔ اپنے جانے پہچانے گھر اور مانوس ساتھیوں کو چھوڑ کر تم ایک اجنبی گھر اور ناآشنا ساتھی کے پاس جا رہی ہو۔ میری دس نصیحتیں ہیں ان کو اپنے ساتھ لیتی جاؤ، یہ تمہارے لیے بہت کارآمد ثابت ہوں گی۔ اپنے شوہر کے ساتھ صبر و شکر سے رہنا، خندہ پیشانی سے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگی رہنا۔ اس کی نگاہوں کو سمجھنا اور نہ ایسا موقع نہ دینا کہ اس کی آنکھیں تمہارے کسی عیب پر پڑ جائیں۔ اس کے کھانے کے اوقات معلوم کر لینا اور جب وہ سو رہا ہو تو خاموش رہنا، اس لیے کہ بھوک کی گرمی غصہ کو برانگیختہ کرتی ہے اور آرام میں خلل اندازی نفرت و عداوت کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر وہ کبیدہ خاطر ہو تو اس کے سامنے خوشی کا اظہار نہ کرنا، اگر وہ

خوش ہو تو تم رونے نہ بیٹھنا۔ اس لیے کہ اول الذکر عادت بدتمیزی ہے اور دوسری اس کی کوفت کا باعث۔ سب سے زیادہ اس کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا، تو وہ بھی تمہاری انتہائی عزت کرے گا، اور یقین کرلو کہ تم کو حقیقی مسرت اسی وقت نصیب ہو سکے گی جب تم اپنی مرضی کو اس کی مرضی پر قربان کر دو، اور اپنی خواہش کو اس کی خواہش کے آگے جھکا دو، خواہ اس میں تمہارا بھلا ہو یا برا۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا۔

ایک بدوی عورت نے اپنے لڑکے کو وصیت کرتے ہوئے کہا:-

میرے پیارے بیٹے! بہتان تراشی سے بچو، کیونکہ اس سے دلوں میں رنجش و عداوت، اور دوستوں میں جدائی ہوتی ہے۔ دوسروں کی عیب جوئی نہ کرو ورنہ تم نشانہ بنا لیے جاؤ گے، اور بہت ممکن ہے کہ تیروں کی بوچھاڑ سے نشانہ بجا نہ رہ سکے، ورنہ لگاتار تیر لگنے سے وہ بودا اور کمزور تو ہو ہی جائے گا۔ خبردار! اپنے دین میں سخاوت اور مال میں بخل کبھی روا نہ رکھنا۔ اگر کبھی تمہیں مدد یا احسان کی ضرورت ہو تو ایسے سخی کا در کھٹکھٹانا جو تمہاری درخواست پر نرم پڑ جائے، کمینہ کا در مت کھٹکھٹانا اس لیے کہ سخت پتھروں سے پانی نہیں پھوٹتا۔ لوگوں کا جو کام تم کو پسند ہو اسی کو نمونہ بناؤ اور اس کے مطابق عمل پیرا ہو جاؤ۔ ان کے جو کام تمہیں برے لگیں ان سے بچتے رہو، اس لیے کہ آدمی کی نظر اپنی برائیوں پر نہیں پڑتی۔ جس کی دوستی میں بظاہر خندہ پیشانی ہو لیکن اس کے کاموں سے ظاہر کی مخالفت ہوتی ہو تو اس کا دوست بھی ہوا کی طرح اس سے رخ بدلتا رہے گا۔ انسانوں کے بدترین اخلاق بے وفائی اور دغا بازی ہیں۔ اور جس میں تحمل کے ساتھ سخاوت بھی ہو تو گویا اس نے اپنی پوشاک نہایت خوبصورت بنا لی۔

تیسری فصل

شاعری

شعر کی تعریف اور اس کی ابتداء: شعر اس موزون و مقفی کلام کو کہتے ہیں جو نادر افکار، طرفہ خیالات اور پر اثر و معنی خیز مناظر و حالات کی صحیح ترجمانی و عکاسی کرے۔ شعر کبھی نثر میں ہوتا ہے اور کبھی نظم میں[1]۔ احساس سے تعلق اور طبیعت سے لگاؤ کی بنا پر، نیز عقلی و تمدنی ترقی اور علمی گہرائی اور تحقیقی کاوشوں کی ضرورت نہ ہونے کے باعث، شاعری کو ادبی آثار میں قدیم ترین

---

[1] جبران و یونان اور یورپ والوں کی طرح عربوں میں بھی شعر کی یہی تعریف ہے۔ وہ کہتے ہیں "شعر ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے سینوں میں جوش مارتی ہے، اور زبانوں کی راہ سے باہر نکل پڑتی ہے" حسان کے بیٹے نے ایک بھڑ کی تعریف میں جس نے اسے ڈنک مار دیا تھا، جب یہ کہا "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھڑ دو یمنی دھاری دار چادروں میں لپٹی ہوئی تھی" تو حسان نے کہا "بخدا یہ کلام شعر ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسجع نثر کو بھی شعر کہہ دیا کرتے تھے جس میں وجدانی طور پر کوئی اثر آفریں فکر و خیال موجود تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کو شعر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہہ دیا تھا۔

مقام حاصل ہے (عربوں میں شاعری کا آغاز کب ہوا اس کی تاریخ نہیں ملتی، البتہ یہ معلوم ہے کہ جب شاعری کو تاریخ نے جانا تو وہ نہایت محکم و مرتب قصائد کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ بہرحال جب بھی تاریخ کے کانوں نے عربی شاعری سنی اس وقت وہ پختہ اور منظم شکل اختیار کر چکی تھی۔ عقل یہ بات تسلیم نہیں کر سکتی کہ شاعری اپنے ابتدائی دور ہی میں اس قدر پاکیزہ و شستہ اور حسین و کامل شکل میں نمودار ہوئی ہو جیسی کہ وہ مہلہل بن ربیعہ اور امرؤ القیس کے شعروں میں نظر آتی ہے۔ یقیناً اس پر مختلف ادوار گذرے ہوں گے، وہ انقلابات زمانہ سے متاثر ہوئی ہوگی، زبانوں نے اس کو رواں کیا ہوگا تب کہیں جا کر اس کے اسلوب میں شائستگی، اور اس کے موضوعات میں وسعت، پیدا ہوئی ہوگی[1]۔ قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں نے آزاد نثر سے مسجع و مقفی نثر کی طرف قدم بڑھایا ہوگا[2]۔ پھر مسجع نثر سے رجز کی طرف اور بتدریج رجز سے قصیدہ کی طرف ترقی کی ہوگی۔ مسجع نثر ہی شعر کی سب سے پہلی شکل ہے جسے کاہنوں نے دیوتاؤں سے مناجات کرتے، حکیمانہ مقولوں کو محفوظ رکھنے، پہیلیوں میں جوابات دینے، سامعین کو محو حیرت کرنے، کے لیے اختیار کیا تھا۔ یونانی کاہنوں کی طرح عرب کے کاہنوں نے بھی سب سے پہلے شاعری کی اساس رکھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مہبط الہام ہیں۔ دیوتاؤں سے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ترانوں کے ذریعہ ان کے حضور رحم کے خواستگار، اور دعاؤں کے ذریعہ ان سے غیبی معلومات و الہامات کے طالب ہوتے تھے۔ پھر وہ اپنے دیوتاؤں کے سربستہ رازوں کو مقفی جملوں کے ذریعہ عوام کو بتاتے، اور اس عبارت کا نام سجع رکھتے کیونکہ کبوتر کی آواز (سجع) کی طرح اس میں بھی ایک ہم آہنگ نغمہ پیدا ہو جاتا تھا)

جب عربوں میں غناء و موسیقی کا مذاق بڑھا، اور شعر عبادت گاہوں سے نکل کر صحراؤں اور بیابانوں میں پہنچا، دعاؤں کے علاوہ حدی خوانی کی خدمت بھی انجام دینے لگا، تو وزن و قافیہ مل جانے کی

---

[1] شاعری کی قدامت پر مندرجہ ذیل اشعار ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں، خود امرؤ القیس کا شعر ہے :۔

عوجا علی الطلل القدیم لعلنا   نبکی الدیار کما بکی ابن حزام

(ترجمہ) قدیم ویران کھنڈروں پر ٹھہرو تاکہ جس طرح مکانوں پر ابن حزام رویا ہے ہم بھی روئیں۔

عنترہ کا مشہور مصرعہ ہے :۔

ھل غادر الشعراء من متردم

کیا پچھلے شعراء نے کچھ خلا چھوڑا ہے؟ (جسے ہم پر کریں)۔

زہیر کہتا ہے :۔

ما ارانا نقول الا معارا   او معادا من قولنا مکرورا

ہم جو مضمون شاعری میں ادا کرتے ہیں وہ یا تو مستعار ہوتا ہے یا پامال و فرسودہ اور کئی بار دہرایا ہوا ہوتا ہے۔

[2] باقلانی اپنی کتاب اعجاز القرآن میں لکھتے ہیں "عربوں نے سب سے پہلے زبان کی ابتداء نثر سے کی، پھر بتدریج اس کے ذریعہ شاعری تک پہنچے۔ دراصل شاعری تک ان کی پہنچ اتفاقاً ہوگئی، لیکن جب انہیں شاعری بھلی اور مناسب معلوم ہوئی، ان کے کانوں کو اس کی ہم آہنگی اچھی لگی اور ان کی طبیعتیں اس سے مانوس ہوگئیں تو اس نے اس کا تتبع شروع کر دیا، اسے سیکھا اور اس کے لیے طبیعت کو

وجہ سے رجز کی شکل نمودار ہوگئی[1]

پھر سروں اور راگوں کے اختلاف کی وجہ سے متعدد اوزان پیدا ہوئے۔ چنانچہ فخر و شجاعت اور بہادری (حماسہ) کے لیے الگ وزن بنا، اور غزل کے لیے الگ، ہزج (ترنم) کے لیے الگ، اور اسی طرح تمام دیگر اوزان وجود میں آئے جنہیں خلیل بن احمد نے پندرہ کی تعداد میں شمار کیا ہے[2]۔ ان میں سے ہر وزن کو "بحر" کہا جاتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ شاعری کا اولین مصدر رغنا ہے۔ کبوتر کی آواز سے سجع، اونٹوں کی چال اور ان کی حرکتوں سے رجز کا جنم لینا بھی اسی امر کی دلیل ہے۔ پھر خود شعر جو عبرانی لفظ "شیر" سے ماخوذ ہے، اس کے معنے راگ اور بھجن کے ہیں، نیز آج تک شعر پڑھنے کے لیے عربی میں "انشاد" (گانا) کا لفظ استعمال

---

[1] حدی خوانی کے لیے شاعری کی جس صنف کو عربوں نے سب سے پہلے استعمال کیا وہ رجز ہے۔ قوی گمان یہی ہے کہ رجز کا وزن اونٹ کی چال اور اس کی حرکتوں سے اخذ کیا گیا ہے، اس لیے کہ رجز کی تقطیع اور اونٹ کے قدموں کے پڑنے میں بہت زیادہ مناسبت ہے۔ عربوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے رجز کی ابتداء مضر بن نزار نے اس وقت کی جب اونٹ پر سے گرنے اور اپنے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹنے پر اس نے کہا تھا "وایداہ وایداہ" (ہائے میرا ہاتھ ہائے میرا ہاتھ) چونکہ اس کی آواز بہت اچھی تھی لہٰذا اونٹوں نے اسے بغور سنا اور تیز رفتاری سے چلنے لگے۔ چنانچہ حدی خوانی کے لیے انھوں نے اسی وزن کے راگ بنا لیے اور ان کا نام رجز رکھ دیا۔ راجز کے مندرجہ ذیل اشعار بطور مثال پیش ہیں۔

دع المطایا تنسم الجنوبا
ان لہا لنبأ عجیبا
حنینہا وما اشتکت لغوبا
یشہد أن قد فارقت حبیبا
ما حملت الا فتی کئیبا
یسرّ مما اعلنت نصیبا
لو ترک الشوق لنا قلوبا
اذن لآثرنا بہن النیبا
ان الغریب یسعد الغریبا

سواریوں کو جنوبی ہوائیں سے گذرنے دو، شوق اور تھکن کی شکایت سے ان کی عجیب حالت ہے جو گواہی دے رہی ہے کہ یہ معشوق سے جدا ہوگئی ہیں، انھوں نے ایک غمگین نوجوان کو اٹھا رکھا ہے جو اس چیز کو چھپاتا ہے جسے یہ سواریاں ظاہر کرتی ہیں۔ اگر جذب شوق ہمارے دلوں کو باقی چھوڑ دیتا تو ہم ضرور اونٹنیوں کو ان کے پیچھے لگا دیتے اس لیے کہ پردیسی کی مدد کرتا ہے۔

[2] خلیل کے بعد اخفش نے ان اوزان میں ایک بحر کا اضافہ کیا اور اس بحر کا نام متدارک رکھا۔

کرنا اس کی پوری تائید کرتے ہیں کہ دراصل شعر کا ماخذ غنا و موسیقی ہے۔

شاعری اور عرب عرب فطرتاً تمام سامی اقوام سے زیادہ شاعری کی قابلیت رکھتے ہیں، اور شاعری پر ان کو پورا پورا قابو حاصل ہے۔ اس لیے کہ ان کی زبان میں مفہوم ادا کرنے کے لیے بہت زیادہ وسعت ہے۔ ان کا ماحول خیال آفرینی کے لیے مناسب و موزوں ہے۔ ان کی طبیعتیں پاکیزہ اور ان کی زندگیاں سادہ ہیں۔ قوت عصبیت اور جذبۂ آزادی ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے نیز ان کا جزیرہ ان تمام موانع سے خالی ہے جو ذہن کو غور و فکر کی راہ سے روکیں۔ آسمان و بیابان کے درمیان وہ ایک ایسی لامحدود فضا میں ہیں جو دل و دماغ کو جلال و جمال اور افکار و خیالات سے بھر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی طبیعتیں حساس اور پرجوش ہیں۔ خوف اور خوشی کے جذبات ان کو بآسانی برانگیختہ کر دیتے ہیں۔ غم و غصہ یا عیش و مسرت بہت جلد ان کو بے خود اور مست کر دیتا ہے۔ چنانچہ جو خیال بھی ان کے دل میں آیا یا جس چیز کا انہیں احساس ہوا انہوں نے فوراً اس کو نظم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے علم و حکمت و تجارت کا مخزن، ان کے کردار اور جنگی وقائع کی مرقع، ان کے صحیح و غلط کی آئینہ دار اور ان کی گفتگو نیز شبینہ قصہ گوئیوں کا خلاصہ ہے۔ عربوں میں عام طور پر شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ برجستہ اور آمد ہے[1] چنانچہ ان کی شاعری میں وجدانی یا قلبی احساسات کی ترجمانی کرنے والا حصہ اس قدر وافر ہے کہ اس کی مثال دنیا کی کسی دوسری قوم کی شاعری میں نہیں ملتی۔

شاعری کی اس درجہ مقبولیت کی بناء پر یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ ایک شاعر عربوں کو اپنے شعروں

---

[1] بعض شعراء ایسے بھی تھے جو آورد اور تکلف سے شعر کہتے تھے۔ انہیں "غلامان شعر" کا خطاب ملا تھا، مثلاً زہیر، عدی بن الرقاع، حطیئہ۔ عدی بن الرقاع کہتا ہے:-

وقصيدة قد بتّ اجمع بينها
حتى اقوّم ميلها وسنادها
نظر المثقف في كعوب قناته
حتى يقيم ثقافه منآدها

بہت سے قصیدے ایسے ہیں جن کے اشعار میں رات رات بھر بیٹھ کر جوڑتا ہوں اور ان کی خامیاں اس طرح نکالتا ہوں جس طرح نیزوں کو درست کرنے والا ان کی کجی کو درست کرتا ہے۔

سوید بن کراع کا شعر ہے:-

ابيت بابواب القوافي كانما
أصادي بها سربا من الوحش نزّعا

میں قافیوں کی ترتیب و تنقیح میں اس طرح رات گذارتا ہوں جیسے میں جنگلی جانوروں کی ٹولی کے شکار کے لیے گھات میں بیٹھا ہوا ہوں۔

کے اثر سے گمراہ کرنے یا نیک راستے پر چلانے میں کامیاب ہو جاتا ہو، یا محض ایک ہی شعر ان میں انقلاب پیدا کر دیتا ہو۔ شاعروں کی جو وقعت اور شعر کا جو اثر ان کے دلوں میں تھا اس کی مثالیں تاریخ میں بکثرت موجود ہیں۔ اس ضمن میں اعشی اور محلق، حسان اور بنو عبد المدان، حطیئہ اور بنو انف الناقہ، کے قصے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاعری کی قسمیں اور اس کے موضوعات: شاعری کی تین قسمیں ہیں پہلی قسم غنائی یا وجدانی ہے جس میں شاعر اپنی طبیعت سے بد لینا، اپنے قلبی واردات بیان کرتا، اور اپنے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ شاعری کی دوسری قسم قصصی یا بیانیہ ہے جس میں لڑائیوں کے واقعات اور بلند قومی کارنامے قصہ کی شکل میں نظم کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ہومر کی ایلیڈ، فردوسی کا شاہنامہ۔ تیسری قسم کی شاعری تمثیلی یا ڈرامائی شاعری کہلاتی ہے جس میں شاعر ایک واقعہ یا کہانی کو مدنظر رکھتا ہے پھر اس کہانی کے حسب حال افراد (کردار) اپنے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک سے وہ باتیں کہلواتا اور وہ اعمال سرزد کراتا ہے، جو ان کے لیے مناسب حال ہوتی ہیں۔ شاعری کی مندرجہ بالا اقسام میں سب سے پہلے رونما ہونے والی قسم غنائی شاعری ہے کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ شاعری کی اصل غناء ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان دوسروں کو جاننے سے پہلے اپنے آپ کو جانتا ہے۔ اور غیروں کے جذبات و احساسات کو نظم کرنے سے پہلے خود اپنے جذبات و احساسات کو نظم کرتا ہے[1]۔

ظاہر ہے کہ شاعری کا مواد خیالات ہیں اور خیالات اپنی غذا محسوسات و مشہودات سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک عرب اپنے ماحول میں اپنے دیہاتی مناظر کے سوا کوئی منظر نہیں دیکھتا۔ جنگ اور بہادری کے قصوں کے علاوہ دوسرے قصے نہیں سنتا، عورت کے سوا حسن و جمال اسے کہیں نہیں ملتا، چنانچہ اس نے اپنی مشاہدہ کی دنیا میں جو جانور، نرم زمین، پہاڑ وغیرہ دیکھے ان کا انوکھے انداز سے وصف کیا، بہادری اور جنگ کے جذبات کی نہایت دلکش پیرایہ میں ترجمانی کی عشق و محبت کے ہاتھوں انہوں نے تشبیب و تغزل کے نئے نئے اسلوب نکالے۔ الغرض عربی شاعری تمام تر غنائی ہے جس میں شاعر اپنے نفس کی تصویر کشی، اپنے مشہودات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ چونکہ دلوں میں بیشتر ایک ہی قسم کے واردات و جذبات پیدا ہوتے ہیں اور ان جذبات و واردات کا بیان بھی مختلف زبانوں سے تقریباً ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ لہذا عربی شاعری میں مکرر مضامین، توارد افکار، مضمون کی چوری اسلوب ادا میں یگانگت، اور تاثرات

---

[1] زیدان کی کتاب "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" اور "الادب الجاہلی" اور "المجمل فی تاریخ الادب العربی" میں یہ بتایا گیا ہے کہ قصصی شاعری غنائی شاعری سے پہلے وجود پذیر ہوئی ہے، لیکن یہ بے بنیاد خیال ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ تمام علماء غنائی شاعری کو اصل اور قصصی و تمثیلی شاعری کو غنائی شاعری کی شکلوں میں سے دو شکلیں شمار کرتے چلے آئے ہیں۔

میں تشابہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجوہ ہیں کہ زہیر کو بجا طور پر یہ کہنے کا حق حاصل ہے :-

ما ارانا نقول الا معارًا   او معادا من لفظنا مکرورا

یعنی ہم شاعری میں جو مضامین پیش کرتے ہیں وہ مستعار ہوتے ہیں یا دہرائے ہوئے اور مکرر۔

قصصی اور ڈرامائی شاعری کا عنصر عربی شاعری میں ناپید ہے اس لیے کہ شاعری کی ان اصناف میں طبع آزمائی کے لیے غور و فکر درکار ہے۔ اور عرب برجستگی، روا روی اور بدیہ گوئی کے عادی ہیں، پھر ان دونوں صنفوں میں دوسروں کے کردار اور ان کی طبیعتوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن عرب والے اپنے آپ میں اس قدر مشغول و منہمک تھے کہ انہیں دوسروں کو دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ علاوہ ازیں یہ اصناف تطویل و تحلیل اور تجزیہ کی طالب ہیں اور عرب والے سختی سے اختصار کے پابند، اور بحث و تحقیق سے بہت کم سروکار رکھتے تھے۔ انہیں دور دراز کے سفروں اور سخت خطروں سے بھی بہت کم مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ سرزمین عرب کی طبعی حالت، اور عربوں کی ذہنی سادگی، خیالات کی تنگی اور توحید الٰہی کا اعتقاد، یہ سب ایسے عناصر تھے جنہوں نے عربوں کو قصوں کہانیوں کے ان ذخیروں سے محروم کر دیا تھا جو قصصی شاعری کے سرچشمے اور مادۂ حیات ہوتے ہیں۔ لہٰذا عربی شاعری کا سمندر فخر و حماسہ، مدح و ہجو، مرثیہ و عتاب، تغزل و تشبیب، وصف و اعتذار اور دیگر حکیمانہ افکار سے ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس قدر وسعت اور رنگینئ موضوعات کے باوجود بھی عربی شاعری ان جنگی واقعات کے تفصیلی بیانوں سے خالی ہے جن سے قوم کے قابل فخر کارناموں کی یاد دائمی بقا حاصل کر سکے[1]، یا قوم کے جانباز سپوتوں اور اولوالعزم کارکنوں کا تذکرہ ہمیشہ تک قائم رہ سکے جس طرح یونانیوں کے لیے ایلیڈ، رومیوں کے لیے اینیڈ، ہندوؤں کے لیے مہابھارت اور ایرانیوں کے لیے شاہنامہ ہیں[2]۔

---

[1] المثل السائر کے مصنف نے مضمون کو بڑھانے میں شاعر کی بے بسی پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :- "مضمون کو طول دینے میں مجھے عربوں سے عجمی زیادہ آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا شاعر ایک پوری کتاب اس طرح نظم کرتا ہے کہ اس میں قصوں اور واقعات کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اس کی زبان فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قوم کی معیاری زبان ہوتی ہے۔ جیسے فردوسی نے اپنا مشہور عالم دیوان شاہنامہ لکھا ہے جس میں ساٹھ ہزار شعر ہیں۔ اس کا موضوع تاریخ ایران ہے، یہ کتاب ایرانیوں کا قرآن ہے۔ تمام ایرانی اہل زبان اس فیصلہ پر متفق ہیں کہ فارسی میں اس سے زیادہ فصیح و بلیغ کوئی دوسری کتاب نہیں۔ لیکن عربی میں باوجود وسعت و ہمہ گیری کے اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی، حالانکہ عربی زبان کی وسعت کے سامنے دوسری زبانوں کی وسعت دریا اور قطرہ کی نسبت ہے۔

[2] ایلیڈ یونانی رزمیہ ہے جسے ہومر نے ٹرائے کی جنگوں کے واقعات میں نظم کیا ہے یہ کتاب یونانی تمدن کا صحیح نمونہ پیش کرتی ہے۔ اینیڈ لاطینی رزمیہ ہے جسے روم کے جلیل القدر شاعر ورجل (۷۰-۱۹ قبل مسیح) (باقی صفحہ ۵۹ پر)

زمانہ جاہلیت کی شاعری خصوصیات

صحرائی درشتی وسنگلاخی، گھٹری اور دکھی زندگی، آزادی فکر، آب وہوا کی تاثیر، دیہاتی سادگی، یہی وہ عوامل ہیں جن کے اثر نے جاہلیت کی شاعری کو ایک خاص رنگ میں رنگ کر اس میں امتیازی شان پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اس شاعر کی پہلی خصوصیت راستی اور سچائی ہے یعنی کسی جذبہ کی بے کم وکاست پوری اور سچی عکاسی، فطرت کی صحیح ترجمانی۔ آورد ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تکلفات سے یہ شاعری آپ کو بالکل خالی نظر آئے گی اور یہی وجہ ہے کہ اس میں اختصار زیادہ، مجاز کم، اور مبالغہ تو بالکل ہی نادر ہے۔

دوسری خصوصیت اس شاعر کی یہ ہے کہ اس میں منطقی طریقوں اور طبعی تقاضوں کے مطابق ترتیب و تسلسل افکار پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ معانی ومضامین کا باہمی ربط بہت کمزور ہوتا ہے، شعروں کی ترتیب بے جوڑ اور ڈھیلی ہوتی ہے، حتیٰ کہ اگر شعروں کی ترتیب میں تاخیر وتقدیم کر دی جائے یا بعض شعروں کو بالکل حذف کر دیا جائے تو بھی کوئی کمی یا خامی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دیہاتی فطرتاً فلسفیانہ نظر نہیں رکھتے۔ ان کی نظر میں تمام اشیاء وحوادث ایک دوسرے سے الگ اور بے تعلق ہوتے ہیں جنہیں کوئی رشتہ باہم نہیں ملاتا۔ یہی سبب ہے کہ عرب ادیبوں کے نزدیک شاعری کو پرکھنے کا معیار ایک ایک شعر ہوتا تھا نہ کہ پورا قصیدہ۔ جاہلی شاعری کی دیگر خصوصیات غریب ونامانوس الفاظ کا استعمال، تراکیب میں متانت اور الفاظ میں شوکت ہیں۔ یہ ان کے طبعی اور اجتماعی نظام میں قوت ودرشتی کی غمازی کر رہی ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز کھنڈرات اور مکانات کے ذکر سے ہوتا ہے اس لیے کہ وہ خانہ بدوش زندگی گذارتے تھے۔ آج یہاں خیمے نصب کر لیے کل وہاں، جہاں کچھ سرسبزی اور پانی نظر آیا وہاں کا رخ کر لیا۔ چنانچہ اسی آمد ورفت میں جب بھی کوئی شاعر پہلی جگہ سے گذرتا تو اسے اپنا وہاں بتایا ہوا زمانہ یاد آجاتا وہ ان دوستوں کو یاد کرتا جو اسے چھوڑ کر

(بقیہ صفحہ ۷۸ کا) نے نظم کیا۔ اس رزمیہ میں اس نے ہومر کے ایلیڈ کی نہایت خوش اسلوبی سے پیروی کی ہے۔

مہا بھارت ہندوستانی رزمیہ ہے جسے ہندوؤں کے مقدس گرو وباس نے سنسکرت زبان میں مسیح سے صدیوں قبل کورو پانڈو کی لڑائیوں کے بیان میں نظم کیا تھا۔ اس میں تقریباً دو لاکھ اشعار ہیں۔

شاہنامہ فارسی رزمیہ ہے جسے حسن بن اسحٰق فردوسی متوفی ۴۱۱ھ نے شاہان ایران (اکاسرہ) کی تاریخ اور ایرانیوں تورانیوں کے مابین جنگ کے واقعات میں نظم کیا اور فتح بن علی بنداری اصبہانی نے اس کا عربی نثر میں ترجمہ کرنے کے بعد کسی ایوبی بادشاہ کے کتب خانہ کو پیش کر دیا۔ اسی کو بعد میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بک نے ۱۹۳۲ء میں باضافہ مقدمہ وحواشی قاہرہ میں چھپوا کر شائع کیا۔

چلے گئے تھے، پھر وہ لطیف یادیں اسے بے قرار کردیتیں، چنانچہ وہ اس مکان کو دعائیں دیتا اور وہاں ان کی یاد میں روتا۔ الغرض مجموعی طور پر جاہلیت کی شاعری میں نیرنگی کم اور مشابہت زیادہ پائی جاتی ہے اور اس کی تمام دوڑ تقلید و سماع کے ایک ہی میدان تک محدود ہے۔

روایت شعراور معلقات

زمانہ جاہلیت کی مختصر سی مدت میں جو شاعری روایت کی گئی ہے وہ اتنی زیادہ ہے کہ اس کو یکجا کرنا مشکل ہے اور حافظہ اس کو یاد کرنے سے قاصر ہے حالانکہ اس کا بڑا حصہ راویان شعر کے فاتحانہ معرکوں میں مرجانے کی وجہ سے تلف ہوگیا۔ ابوعمرو بن العلاء کا مقولہ ہے "عرب کی شاعری کا بہت ہی کم حصہ تم تک پہنچا ہے۔ اگر وہ بکمال و تمام ملتا تو علم و حکمت اور شعر و ادب کا بہت بڑا حصہ تم کو ملتا"، لیکن اس بہت سے حصہ کی نسبت بھی جاہلیت کی طرف غیر صحیح اور اس کی روایت مشکوک ہے۔ اس لیے کہ شاعری کی تدوین دوسری صدی ہجری سے قبل تک نہیں ہوئی تھی، اور اتنے طویل زمانہ تک شاعری کا زبانی منتقل ہوتے رہنا اس امر کے امکانات رکھتا ہے کہ اس میں تبدیلیاں، اضافے اور مصنوعی اشعار جگہ پا چکے ہیں۔ دور جاہلیت کی شاعری کے مشہور راوی حماد اور خلف الاحمر کے متعلق شاعری کو مذاق بنانے اور من گھڑت شعروں کو جاہلی شعراء کی طرف منسوب کرنے کے جو قصے مذکور ہیں ان سے اس گمان کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔

شاید وہ انچاس (۴۹) قصیدے جنہیں ابوزید قرشی نے "جمہرۃ اشعار العرب" میں جمع کیا ہے قدیم شاعری کی سب سے زیادہ صحیح روایت ہیں اور جاہلی شاعری کے طرز ادا و اسلوب بیان کی سچی مثال پیش کرتے ہیں۔ پھر ان میں بھی باعتبار روایت سب سے زیادہ مستند بلحاظ حفاظت و عنایت سب سے زیادہ معتمد، وہ "معلقات" یا "مذہبات" یا "سموط" ہیں جن کے متعلق غالب رائے یہ ہے کہ وہی ایسے سات قصائد ہیں جو تمام مؤرخین کے خیال کے مطابق عربوں کے منتخب و پسندیدہ قصائد تھے۔ جنہیں آب زر سے وصلیوں پر لکھوا کر اظہار مقبولیت اور دائمی شہرت کے لیے کعبہ پر آویزاں کردیا گیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے بعض تو فتح مکہ کے دن تک وہاں لٹکے ہوئے تھے، اور کچھ اس آگ کی نذر ہوگئے تھے جو اسلام سے قبل خانہ کعبہ میں لگی تھی۔ ان سات قصیدوں کے کہنے والے شعراء امرؤالقیس، زہیر بن ابی سُلمیٰ، طرفہ بن العبد، لبید بن ربیعہ، عنترہ بن شداد، عمرو بن کلثوم اور حارث بن حلزہ ہیں۔ بعض لوگ ان قصائد کے خانہ کعبہ پر لٹکائے جانے کی بلاکسی معقول دلیل کے تردید کرتے ہیں متقدمین میں اس خیال کے مؤید ابوجعفر نحاس[1] متوفی ۳۳۸ھ

---

[1] ابوجعفر نحاس نے معلقات کی شرح میں لکھا ہے "ان سات قصائد کے جمع کرنے میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا قول ہے کہ عرب والے کثیر تعداد میں عکاظ کے میلہ میں جمع ہوتے، جہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے اور جب بادشاہ کسی قصیدہ کو پسند کرتا تو وہ حکم دیتا کہ اسے میرے خزانہ میں لٹکا کر محفوظ کردو لیکن یہ کہنا کہ یہ قصائد کعبہ میں آویزاں کیے گئے روایۃً کوئی سند نہیں رکھتا۔

ہیں اور متوٴخرین میں جرمن مستشرق نولڈکی[۱] حالانکہ اہم عہد ناموں کو کعبہ پہ آویزاں کرنا زمانہ جاہلیت کا ایسا دستور ہے جس کے آثار اسلام آنے کے بعد بھی باقی رہے چنانچہ قریش نے اپنی وہ قرارداد بھی خانۂ کعبہ پر لٹکائی تھی جس میں انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام پر آپ کی حمایت میں اُٹھنے والے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے ترک موالات کا تہیہ کیا تھا۔ نیز خلیفہ ہارون رشید نے بھی وہ عہد نامہ خانۂ کعبہ پر آویزاں کیا تھا جس میں اس نے اپنے بعد اپنے دو بیٹوں امین اور مامون کو خلیفہ بنانے کا عہد لیا تھا۔ پھر ان قصائد کے بارے میں ایسا تسلیم کر لینے میں کونسا امر مانع ہے جبکہ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ عرب شاعری سے کس قدر متاثر ہوتے تھے اور شاعروں کی ان میں کس درجہ عزت و وقعت تھی۔ ثانیاً یہ ایک ایسی رسم ہے جس کی مثالیں یونانی ادب میں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ وہ قصیدہ جو غنائی شاعری کے سربرآوردہ شاعر بنداار نے ڈیگورس کی مدح میں کہا تھا اسے بھی لمنوس میں ایتھنز کے معبد کی دیواروں پر آب زر سے لکھا گیا تھا[۲]

زمانۂ جاہلیت کی شاعری کے نمونے :- امرؤالقیس :-

وقد اغتدی والطیر فی وکناتها	لغیث من الوسمی رائدہ خال
تحاماه أطراف الرماح تحامیاً	وجاد علیه کل أسحم هطّال
بعجلزة قد أترز الجری لحمها	کمیت کأنها هراوة منوال

صبح سویرے جب پرندے اپنے گھونسلوں ہی میں ہوتے ہیں میں موسم بہار کی پہلی بارش سے اُگنے والے سبزہ زار کے لیے، جسے طلب کرنے والے ناکام رہتے ہیں اس لیے کہ نیزوں کی نوکوں سے اس کی پوری حفاظت کی جاتی ہے اور یہی وہ علاقہ ہوتا ہے جس پر پانی سے بھرے ہوئے سیاہ بادل خوب برستے ہیں، اپنے اس قدآور و مضبوط کمیت گھوڑے پرسوار ہو کر نکلتا ہوں جسے دوڑوں نے چھریرا بنا کر جلا دے کی کھڈی کی اس لکڑی سے مشابہ کر دیا ہے جس پر وہ کپڑا لپیٹتا ہے۔

ذعرت بها سربا نقیا جلوده	وأکرعه وشی البرود من الخال

---

[۱] پروفیسر نولڈکی نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں اس خیال کو ترجیح دی ہے کہ معلقات کے منتخبات یعنی پسندیدہ اور چنے ہوئے قصائد ہیں، اور یہ نام حماد نے ان قصائد کو گلے میں لٹکے ہوئے ہاروں سے تشبیہ دیتے ہوئے رکھا ہے۔ اس کی مزید تقویت کے لیے یہ دلیل پیش کی ہے کہ ان قصائد کو سموط بھی کہتے ہیں جس کے معنی بھی ہاروں کے ہیں۔

فرانسیسی پروفیسر کلے مین ہیار جس نے اپنی زبان میں تاریخ ادب عربی پر کتاب لکھی ہے وہ بھی نولڈکی کی اس رائے سے پورا اتفاق کرتا ہے۔

[۲] دیکھئے لاروس کی انسائیکلوپیڈیا میں لفظ "بنداار"۔

كأن الصوار إذ تجاهدن غدوة | على جمزى خيل تجول بأجلال
فجال الصوار، واتقين بقرهب | طويل القرا والروق أخنس ذيال

میں نے اس گھوڑے سے نیل گایوں کے اس گلہ میں دہشت پھیلا دی جن کی کھالیں نرم و صاف اور ٹانگیں دھاری دار تھیں، صبح سویرے جب وہ گائیں تیزی سے بھاگ رہی تھیں تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جھول پہنے ہوئے گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ یہ گائیں دوڑ کر ایک موٹے، لمبے اور بڑے سینگوں والے لمبی دم اور بیٹھی ناک والے جنگلی بیل کی پناہ میں آگئیں۔

فعادى عداء بين ثور ونعجة | وكان عداء إذ دكبت على بالي
كأني بفتخاء الجناحين لقوة | على عجل منها أطأطئ شملالي
تخطف خزان الأنيعم بالضحى | وقد حجرت منها ثعالب أورال
كأن قلوب الطير رطبا ويابسا | لدى وكرها العناب والحشف البالي

میں نے تیزی سے تعاقب کیا اور یکے بعد دیگرے ایک نیل گائے اور ایک جنگلی بیل مار گرایا۔ سوار ہونے کے بعد گھوڑا دوڑانے میں میں بہت ہوشیاری سے کام لے رہا تھا، جب میں اپنے تیز رفتار گھوڑے کو ایڑ لگا رہا تھا تو ایسا نظر آ رہا تھا کہ میں ایک پھرتیلے، بازو موڑ کر جھپٹنے والے عقاب پر سوار ہوں جو بوقت چاشت انیعم مقام کے نر خرگوشوں پر جھپٹ رہا ہو اور جس کے خوف سے اورال مقام کی لومڑیاں بھٹوں میں گھس گئی ہوں، اس عقاب کے گھونسلے کے اردگرد پرندوں کے تازہ اور خشک دل اس طرح پڑے ہوئے ہیں جیسے عناب اور ردی کھجوریں۔

فلو أن ما أسعى لأدنى معيشة | كفاني ولم أطلب قليل من المال
ولكنما أسعى لمجد مؤثل | وقد يدرك المجد المؤثل أمثالي
وما المرء ما دامت حشاشة نفسه | بمدرك أطراف الخطوب ولا آل

اگر میری کوششوں کا مقصود محض معمولی گذران حاصل کرنا ہوتا تو مجھے تھوڑا سا مال ہی کافی ہو جاتا لیکن میں یہ نہیں چاہتا، میں تو دائمی اور پائیدار عزت و سروری کا طلب گار ہوں، اور میرے جیسے لوگ اپنے مقصد کو پا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب تک انسان کی جان باقی ہے وہ مصائب کے سروں کو نہیں پا سکتا خواہ وہ انتھک کوشش کرے اور کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔

۲۔ اپنے قصیدے میں نابغہ ذبیانی، نعمان بن منذر کی مدح اور اس سے معذرت خواہی کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

أتاني، أبيت اللعن، أنك لمتني | وتلك التي تستك منها المسامع
مقالة أن قد قلت سوف أناله | وذلك من تلقاء مثلك رائع

اے بادشاہ بلند اقبال: مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے مجھے ملامت کی، اور یہ خبر ایسی ہے جسے سن کر کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اس کی گرفت کروں گا، اور

آپ جیسوں سے ایسی تنبیہ خطرہ سے کسی طرح خالی نہیں۔

لعمری وما عمری علیّ بهیّن لقد نطقت بطلا علیّ الاقارع
أقارع عوف لا أحاول غیرها وجوه قرود تبتغی من تجادع

میری زندگی کی قسم! اور میری زندگی میرے لیے کوئی حقیر شے نہیں ہے۔ اقارع نے مجھ پر جھوٹے الزامات اور بہتان لگائے ہیں، اقارع سے میری مراد صرف قریع بن عوف کی اولاد ہیں جن کے چہرے بندروں کی طرح ہیں، اور جو چاہتے ہیں کہ کوئی ان سے لڑتا جھگڑتا اور بد کلامی کرتا رہے۔

أتاك امرؤ مستبطن لی بغضة له من عدوّ مثل ذالك شافع
أتاك بقول هلهل النسج کاذب ولم یأت بالحق الذی هو ناصع
أتاك بقول لم أکن لاقوله ولو کبلت فی ساعدیّ الجوامع

یہ دروغ بیانی اس شخص کی ہے جو میری طرف سے دل میں کینہ چھپائے رکھتا ہے اور اسے اپنے جیسا ایک دشمن سفارشی بھی مل گیا، اس نے پوچ اور جھوٹی بات کہی ہے اور ہرگز اس نے سچی اور صحیح بات نہیں کہی، اس نے وہ بات کہی ہے کہ اگر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر بھی مجھ سے وہ بات کہلوائی جائے تو میری زبان سے وہ کلمات نہ نکل سکیں گے۔

حلفت فلم أترك لنفسك ریبة وهل یأثمن ذو أمة وهو طائع
بمصطحبات من لصاف وثبرة یزرن إلالاً سیرهن التدافع
سماماً تباری الریح خوصاً عیونها لهن رذایا بالطریق ودائع
علیهن شعث عامدون لحجهم فهن کأطراف الحنی خواضع

میں ان اونٹنیوں کی سچی قسم کھا کر کہتا ہوں جن کی آنکھیں بیٹھی ہوئی ہیں، بدن کمان کے سروں کی طرح جھکے ہوئے ہیں اور کچھ مرنے کے لیے راستہ میں چھوڑ دی گئی ہیں، وہ ایک ساتھ تیز رفتاری سے پرندوں کی طرح مکہ کے راستے کی منزلیں طے کر رہی ہیں، ان پر پراگندہ سر حاجیوں کا قافلہ سوار ہے، اور دیندار و فرمانبردار شخص کبھی جھوٹی قسم نہیں کھاتا۔

لکلفتنی ذنب امرئ وترکته کذی العرّ یکوی غیره وهو راتع
فإن کنت لا ذو الضغن عنی مکذّب ولا حلفی علی البراءة نافع
ولا أنا مأمون بشیء أقوله وأنت بأمر لا محالة واقع

آپ دوسرے کے کردہ گناہ پر میری گرفت کر رہے ہیں اور مجرم کو اس طرح چھوڑ رہے ہیں جس طرح خارشتی اونٹ کو چرتا چھوڑ کر دوسرے اونٹوں کو داغا جاتا ہے۔ اس پر بھی اگر میرے متعلق دشمن کو جھٹلایا نہ جائے اور براءت کے باوجود میری قسم سود مند نہ ہو، نہ میرے کہے پر اعتبار ہو، اور آپ کا فیصلہ اپنی جگہ پر بالضرور صادر ہونے والا ہو۔

فإنك کاللیل الذی هو مدرکی وإن خلت أن المنتأی عنك واسع

خطاطيف حُجن في حبال متينة   تمدّ بها أيد إليك نوازع

تو آپ کی مثال رات کی سی ہے جو ہر چیز پر چھا جاتی ہے خواہ میں اپنے دل میں یہ سمجھوں کہ آپ سے بچ نکلنے کی راہ بہت کشادہ ہے۔ اگر کوئی آپ سے بھاگنا چاہے تو اس کے لیے چار سُو ایسے مڑے ہوئے آنکڑے مضبوط رسیوں سے بندھے ہوئے پڑے ہیں کہ وہ ان میں پھنس کر لاچار آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔

أتوعد عبداً لم يخنك أمانة   وتترك عبد ظالم وهو ظالع

وأنت ربيع يُنعش الناسَ سيبُه   وسيف أُعيرته المنية قاطع

أبى الله إلا عدله ووفاءه   فلا النكر معروف ولا العرف ضائع

وتسقى إذا ما شئت غير مصرّد   بزوراء في حافاتها المسك كانع

کیا آپ اپنے وفادار غلام کو دھمکی دیتے ہیں اور جفا کار مجرم غلام کی گرفت نہیں کرتے ! لیکن خدائے تعالیٰ تو انصاف و وفا کا حامی ہے۔ اس لیے برائی بھلائی نہیں ہو سکتی اور نہ بھلائی کسی طرح اکارت جا سکتی ہے۔ آپ فصل بہار ہیں جس کا فیض عام کرتوں کو تھام لیتا ہے اور کاٹنے والی تیز تلوار ہیں جس میں موت پنہاں ہے کہ آپ جب چاہیں بلا روک ٹوک زوراء کے میخانوں میں سے مشک ملی ہوئی شراب آپ کو پلا دی جائے۔

۳۔ دریدبن الصمۃ[1] اپنے بھائی کے مرثیہ میں کہتا ہے :۔

أرثّ جديد الحبل من أُمّ معبد   بعاقبة أم أخلفت كلّ موعد

وبانت ولم أحمد إليك نوالها   ولم ترج منا ردّة اليوم أو غد

کیا کسی وجہ سے ام معبد کا نیا پیمان محبت کمزور ہو گیا ؟ یا اس نے وعدہ خلافی کو اپنا شعار بنا لیا ؟ اور وہ اس طرح جدا ہو گئی کہ آج کل میں ہماری ملاقات سے بھی مایوس ہو گئی، اس لیے کہ میں نے اس کے عطیہ کی ناشکری کی۔

---

[1] دُرید بن الصِّمّۃ بہادر سردار شاعر ہے۔ اسلام کا زمانہ پایا لیکن مسلمان نہیں ہوا۔ بنو غطفان نے اس کے بھائی عبداللہ کو اس برم میں قتل کر دیا کہ درید نے حملہ کر کے ان کے اونٹ بھگا لیے تھے۔ راستہ میں ایک جگہ عبداللہ مال غنیمت تقسیم کرنے کے لیے ٹھہرا تو درید نے بنو غطفان کے ڈر سے اس کو وہاں ٹھہرنے سے روکا۔ لیکن عبداللہ نے اس کی نہ سنی، یہاں تک کہ سواروں نے آن لیا اور عبس خاندان نے اس کو مار ڈالا، درید نے اس کی جان بچانی چاہی لیکن بے سود، اس صدمہ پر وہ تا حیات غمگین رہا اور برابر اپنے بھائی کے رنج میں مرثیے کہتا رہا۔ اور جب اس کی بیوی ام معبد نے اسے برا بھلا کہا تو اس نے اسے بھی طلاق دے دی۔ اس قصیدہ میں اس نے اپنی بیوی کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے بھائی کا مرثیہ بھی کہا ہے۔

كأنّ حمول الحيّ إذ متع الضحىٰ بناصبة الشحناء عصبة مذود

أو الأثاب العمّ المحرّم سوقه بكابة لم يخبط ولم يتعضد

دن چڑھے ناصبۃ الشحنا میں قبیلہ کے زنانہ ہودے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کوہ مذود کی بیل بوٹیاں ان پر چڑھی ہوں یا پھر وہ اثاب کے پھیلے ہوئے درختوں کی طرح جن کو کاٹنا ممنوع ہو اور اس لیے نہ ان کے پتے نچوڑے گئے ہوں اور نہ ان کی شاخیں کاٹی گئی ہوں۔

فقلت لعارض وأصحاب عارض

ورهط بني السوداء والقوم شهّدي

علانية: ظنوا بألفي مدجج

سراتهم في الفارسي المسرد

وقلت لهم: إن الأحاليف هذه

مطنبة بين الستار وثهمد

میں نے (اپنے بھائی) عارض اور اس کے ساتھیوں نیز بنو السوداء کے گروہ سے قوم کی موجودگی میں علانیہ کہا "ذرا ان دو ہزار مسلح بہادروں کا تصور کرو جو ایرانی مضبوط زرہیں پہنے ہوئے ہیں" اور میں نے ان سے یہ بھی کہا یہ تمہارے خلاف لڑنے والے دشمن جو باہم حلیف ہیں مقام ستار و ثہمد کے درمیان خیمہ زن ہیں۔

ولما رأيت الخيل قبلا كأنها

جراد يباري وجهة الريح مغتدي

أمرتهم أمري بمنعرج اللوى

فلم يستبينوا الرشد إلا ضحى الغد

فلما عصوني كنت منهم وقد أرى

غوايتهم أني بهم غير مهتدي

وهل أنا إلا من غزية إن غوت

غويت وإن ترشد غزية أرشد

اور جب میں نے شہسواروں کو سامنے آتے دیکھا جو صبح دم ہوا کے مخالف سمت اڑنے والے ٹڈی دل کی طرح تھے تو میں نے انہیں اپنا "منعرج اللوی" کا مشورہ پھر دیا، لیکن حقیقت حال ان پر آئندہ کل کی صبح ہی منکشف ہو سکی۔ جب انہوں نے میری بات نہ مانی تو میں ان کی مخالفت نہ کر سکا کیونکہ میں انہی میں کا ایک تھا، حالانکہ میں ان کی غلط روی اور حماقت دیکھ رہا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں راہ سے بھٹک رہا ہوں، اور بھلا بتایئے میرا موقف اس لشکر میں سوائے اس کے اور کیا تھا کہ میں اس کا ایک ممبر تھا، جب ساری قوم گمراہ ہو گی تو میں بھی گمراہ ہو جاؤں اور جب تمام قوم راہ راست

اختیار کرے گی تو میں بھی راہ راست پر ہو جاؤں گا۔

دعانی اخی، والخیل بینی وبینه
فلما دعانی لم یجدنی بقعدد
اخ ارضعتنی امّه من لبانها
بثدی صفاء بیننا لم یجدد
نجئت الیه والرماح تنوشه
کوقع الصیاصی فی النسیج الممدد

پھر مجھے میرے بھائی نے آواز دی اور یہ اس وقت جب کہ شہسوار میرے اور اس کے درمیان حائل ہو چکے تھے۔ تاہم جب اس نے مجھے بلایا تو میں نے بزدلی کا اظہار نہ کیا۔ وہ میرا ایسا بھائی تھا جس کی ماں نے مسلسل مجھے اور اسے اپنے پاک سینہ سے دودھ پلایا تھا، اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جب میں اس کے پاس پہنچا تو نیزے اس کے بدن میں اس طرح پیوست ہو چکے تھے جیسے جلاہے کے آہنی کنگھے اپنے جانے والے پھیلائے ہوئے کپڑے میں پیوست ہوتے ہیں۔

وکنت کذات البوّ ریعت فاقبلت
الے قطع من جلد بوّ مجلد
نطاعنت عنهُ الخیل حتی تنہنہت
وحتی علانی خالك اللون اسود
قتال امرئ آسی اخاهُ بنفسه
ویعلم ان المرء غیر مخلّد

اس وقت میری مثال اونٹنی کی سی تھی جس کے مردہ بچہ میں بھس بھر دیا گیا ہو اور وہ گھبرا کر پھر اسی بھوسہ بھرے بچہ کی طرف مائل ہو جائے، چنانچہ میں نے اپنے بھائی کی مدافعت میں شہسواروں سے اس طرح جم کر نیزہ بازی کا مقابلہ کیا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ میں اپنے بھائی کو اپنی جان کی طرح عزیز رکھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آدمی ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں زندہ نہیں رہتا بالآخر وہ شہسوار پیچھے ہٹ گئے اور جنگ سے باز آگئے۔ یہ سلسلہ رات کی تاریکی کے چھا جانے تک جاری رہا۔

تنادوا فقالوا أردت الخیل فارسًا
نقلت أعبد الله ذلکم الردی
فان یك عبد الله خلّی مکانه
فما کان وقافا ولا طائش الید
ولا برمًا اما الریاح تناوحت
برطب العضاه والضریع المعضّد

یکا یک لوگوں کی آوازیں ٹکرائیں، وہ کہہ رہے تھے "سواروں نے ایک شہسوار کو مار گرایا" تو میں نے کہا "کہیں وہ بچھڑ جانے والا شہسوار عبداللہ تو نہیں؟" کیا ہوا اگر آج عبداللہ نے اپنی جگہ خالی کر دی ہے تو ہر ایک کے لیے ناگزیر ہے لیکن وہ ذلیل موت نہیں مرا کیونکہ وہ نہ تو بزدل تھا جو جنگ میں پشت دکھاتا ہو، نہ اناڑی اور ناتجربہ کار تھا۔ سخت سردی اور قحط کے زمانہ میں جب تند و تیز ہوائیں سخت جان خار دار درختوں کو بھی جھنجھوڑ ڈالتی ہیں وہ سخاوت نہ چھوڑتا تھا۔

وتخرج منه صرة القر جرأة
وطول السرى دری عضب مهند
كميش الازار خارج نصف ساقه
صبور على الضراء طلاع انجد
قليل تشكيه المصيبات ذاكر
من اليوم أعقاب الاحاديث في غد
اذا هبط الارض الفضاء تزينت
لرؤيته كالمأتم المتلبد

سخت ٹھٹھرتی سردیوں کے قحط کے زمانہ میں بھی وہ جانور ذبح کرتا تھا اور لمبے سفروں میں اس کی رفیق، تیز تاب ناک ہندوستانی تلوار تھی۔ وہ نہایت چاق چوبند اور مستعد تھا، تہ بند سے اس کی آدھی پنڈلی باہر رہتی تھی۔ مصائب پر بڑا صابر، مہمات امور اور بلند چوٹیاں سر کرنے والا تھا۔

مصیبتوں کا شکوہ اس نے کبھی نہ کیا، دور اندیشی کی وجہ سے کل رونما ہونے والی باتوں کے انجام کا آج ہی سے لحاظ رکھتا تھا۔ جب وہ کسی کھلے میدان میں پڑاؤ ڈالتا تو وہاں اس کے ملاقاتیوں کی وجہ سے اس قدر زینت اور چہل پہل ہو جاتی، کہ جنگل میں منگل ہو جاتا۔

وكم غارة بالليل واليوم قبله
تداركها مني بسيد عمرد
سليم الشظى عبل الشوى شنج النسا
طويل القرا نهد اسيل المقلد
يفوت طويل القوم عقد عذاره
منيف كجذع النخلة المتجرد

اس سے قبل روز و شب میں ہونے والے بہت سے حملوں میں اس نے نہایت جرأت و بہادری سے میرا ساتھ دیا، وہ اپنے مضبوط، توانا، لمبی پشت، بھرے سینہ والے گھوڑے پر سوار ہوتا جس کی ران کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ قوم کا لمبے قد والا بھی اس کی کلغی باندھنے کے لیے اس تک ہاتھ پہنچا سکتا، وہ اس کھجور کے درخت کی مانند لمبا تھا جس کی شاخیں کاٹ لی گئی ہوں۔

وكنت كانى واثق بمسدّد
يمشّى باكناف الجبيل فثهمد
له كلّ من يلقى من الناس واحدا
وان يلق مثنى القوم يفرح ويزدد
وهوّن وجدى انني لم اقل له
كذبت ولم أبخل بما ملكت يدى

اُس کی وجہ سے مجھے ایسا اطمینان تھا جیسے میں اس شیر کی پناہ میں ہوں جو جبیل و ثہمد کے اطراف میں پھر رہا ہو، جب کوئی اکیلا اس سے ملتا تو وہ خوش ہوتا، اور جب وہ جماعتوں سے ملتا تو اس کی خوشی میں اور بھی اضافہ ہوتا، میرا رنج و غم ہلکا ہو جاتا ہے اور مجھے صبر سا آ جاتا ہے جب میں یہ یاد کرتا ہوں کہ میں نے اسے کبھی جھوٹا نہیں کہا یعنی ہر بات میں اس کا ساتھ دیا اور اس کے لیے اپنی دولت خرچ کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

۴۔ علقمہ بن عبدۃ تمیمیؒ[1] کے اشعار:۔

طحابك قلب فى الحسان طروب
بُعيد الشباب عصرحان مشيب
يكلّفنى ليلى، وقد شط وليها
وعادت عواد بيننا وخطوب
منعّمة ما يستطاع كلامها
على بابها من أن تزار رقيب
اذا غاب عنها البعل لم تفش سره
وترضى اياب البعل حين يؤوب

جوانی کے ذرا ختم ہو جانے کے بعد جب کہ بڑھاپے کی آمد آمد ہوتی ہے، تجھے تیرا بے ہوش و بدمست دل حسینوں میں لیے لیے آوارہ پھر رہا ہے، لیلیٰ میری تکلیفوں اور پریشانیوں کا سبب ہے حالانکہ اس کا وصل بعید ہو چکا ہے اور ہمارے درمیان بہت سے موانع اور مشکلات حائل ہو چکے ہیں۔ لیلیٰ پروردۂ ناز و نعم ہے اس سے ہمکلام ہونا استطاعت سے باہر ہے۔ اس کے دروازہ پر نگران رہتا ہے جو اس کی ملاقات کی راہ میں حائل ہے، جب اس کا شوہر سفر میں گھر سے دور چلا جاتا ہے تو وہ اس کے راز کو فاش نہیں کرتی، اور جب بھی شوہر واپس ہوتا ہے وہ اس کی خوشی کا موجب بنتی ہے۔

فلا تعدلى بينى وبين مغمّر

---

[1] یہ امرؤالقیس کا ہمعصر اور اس کا ہم مرتبہ جاہلی شاعر ہے، اسلام سے بہت پہلے ہی اس کا انتقال ہو چکا تھا۔

سقتك روايا المزن حين تصوب
سقاك يمان ذو حبي و عارض
تروح به جنح العشي جنوب

خدا تجھے آسودہ اور خوش رکھے! پانی سے بھرے ہوئے بھاری بادل جن کو جنوبی ہوا کھینچ لائی ہو تجھ پر برسیں اور تیری زمین سیراب کریں۔ اے محبوبہ! دیکھ تو مجھے اور ذلیل و ناکارہ آدمی کو برابر نہ سمجھنا۔

وما انت ام ما ذکرها ربعیۃ
یخط لھا من ثرمداء قلیب
فان تسألونی بالنساء فاننی
بصیر بأدواء النساء طبیب
اذا شاب رأس المرء او قل مالہ
فلیس لہ من ودھن نصیب
یردن ثراء المال حیث علمنہ
و شرخ الشباب عندھن عجیب

اے علقمہ! تو اور اس کی یاد کیا معنے؟ وہ قبیلہ ربیعہ کی ہے اور اس کے لیے ثرمداء میں ایک کنواں خاص ہے۔ اگر تم عورتوں کے بارے میں میری رائے دریافت کرنا چاہتے ہو تو یقین کرو کہ میں عورتوں کی بیماریوں کو بخوبی جانتا ہوں اور اُن کی نفسیات کا ماہر ہوں۔ جب مرد بوڑھا ہونے لگے یا اس کی مالی حالت کمزور ہو جائے تو ایسے مرد کے لیے عورتوں کی محبت اور دوستی میں سے کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ اسی طرف جھکتی ہیں جہاں مال و دولت کی فراوانی ہو۔ اور عنفوانِ شباب تو ان کی سب سے پسندیدہ چیز ہے۔

فدعھا وسل الھم عنک بجسرۃ
کھمک فیھا بالرداف خبیب
الی الحارث الوھاب اعملت ناقتی
بکلکلھا والقصریین وجیب

تو لیلیٰ کی یاد کو چھوڑ دے، اور اپنے غم و افکار کو دور کرنے کے لیے ایک مضبوط قد آور اونٹنی کے ذریعہ سفر کر جو سوار کو لے کر تیری فکر کی تیزی سے دوڑے، میں نے اپنی اونٹنی کو سخی اور مخیر حارث (ممدوح) کے پاس پہنچنے کے لیے تیز دوڑایا ہے اس کا سینہ اور بالائی پسلیاں تیز دوڑنے کی وجہ سے دھڑک رہی ہیں۔

۵۔ عبد یغوث حارثی یمنی[1] کے اشعار:-

---

[1] یہ بہادر شہسوار شاعر ہے، اپنی قوم کے شرفاء میں سے تھا، جنگ کلاب میں بنی تمیم قبیلہ نے قید کر لیا تھا۔

الا لا تلوماني كفى اللوم مابيا
فما لكما في اللوم خير ولا ليا
الم تعلما ان الملامة نفعها
قليل وما لومي اخي من شماليا
فيا راكبا اما عرضت فبلغا
ندا ماي من نجران ان لا تلاقيا
ابا كرب والايهمين كليهما
وقيسا بأعلى حضرموت اليمانيا

اے میرے ساتھیو! مجھے ملامت نہ کرو کہ مجھ پر جو گذری ہے وہ ملامت ہی کافی ہے ، مزید ملامت میں نہ میرے لیے کچھ فائدہ ہے نہ تمہارے لیے ۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ملامت سے فائدہ کم ہوتا ہے ۔ اور میری عادت نہیں کہ اپنے بھائی کو ملامت کروں ۔ اے سوار! اگر تو سرزمین حجاز پہنچے تو میرے نجرانی رفقاء کو یہ پیغام پہنچا دینا کہ اب ہمارے ملنے کی قطعاً کوئی سبیل نہیں ہے ۔ یہ پیغام ابوکرب دونوں ایہموں اور یمنی حضرموت کے بالائی علاقہ میں قیس کو پہنچا دینا ۔

جزى الله قومي بالكُلاب ملامة
صريحهم والآخرين المواليا
ولو شئت نجتني من الخيل نهدة
ترى خلفها الحو الجياد تواليا
ولكنني احمي ذمار ابيكم
وكان الرماح يختطفن المحاميا

خدا میری قوم کے آزاد اور غلاموں کو واقعۂ کلاب کے بدلہ میں ملامت دے ۔ اگر میں اس موقع پر چاہتا تو مجھے مضبوط و تیز رفتار گھوڑا وہاں سے بھگا کر نجات دلا دیتا اور میں اکیلا ہی نہ جاتا بلکہ تم میرے گھوڑے کے پیچھے لگاتار سیاہ عمدہ گھوڑے جاتے ہوئے دیکھتے ، لیکن میں تمہارے بزرگوں کی عزت کی حفاظت کر رہا تھا ، اور ایسے محافظ کو نیزے اچک رہے تھے ۔

أقول وقد شدّوا لساني بنسعة
أمعشر تيم اطلقوا عن لسانيا
أمعشر تيم قد ملكتم فاسجحوا
فان اخاكم لم يكن من بوائيا
فان تقتلوني تقتلوا بي سيداً
وان تطلقوني تحرِبوني بماليا

انہوں نے میری زبان تسمے سے کس کر باندھ رکھی تھی اور میں اس حال میں ان سے کہہ رہا تھا کہ اے خاندان تیم! میری زبان تو کھول دو، اے خاندان تیم! تم نے مجھ پر قابو پالیا ہے اب تو نرمی اور مہربانی کا سلوک کرو، تمہارا (مقتول) بھائی میرا ہم پلہ نہ تھا، اگر تم مجھے قتل کروگے تو ایک سردار کو قتل کروگے اور اگر مجھے چھوڑ دوگے تو مجھ سے میرا مال چھین لوگے (فدیہ میں)

أحقًّا عباد الله ان لست سامعا

نشید الرعاء المعزب بین المتالیا

وتضحك مني شیخة عبشمیة

كأن لم ترى قبلی اسیرا یمانیا

اے بندگانِ خدا! کیا یہ حقیقت ہے کہ اب بستی سے دور نکلنے والے چرواہوں کے ہم آہنگ راگ میں کبھی نہیں سن سکوں گا؛ عبدشمس قبیلہ کی بوڑھی مجھے دیکھ کر ہنستی ہے۔ جیسے اس نے مجھ سے پہلے کبھی یمنی اسیر دیکھا ہی نہیں۔

وقد علمت عرسی مُلَیْكَةُ انّنی

انا اللیث معدوًّا علیّ وعادیا

وقد كنت نحّار الجزور ومُعمل

المطی وامضی حیث لا حی ماضیا

وانحر للشرب الكریم مطیتی

واصدع بین القینتین ردائیا

میری بیوی ملیکہ جانتی ہے کہ جب مجھ پر حملہ ہوتا یا میں حملہ کرتا تو میں شیر ہوتا تھا، میں ضیافت اور مدادکے لیے) اونٹوں کو بہت ذبح کرتا تھا اور اپنی سواری کو تیز دوڑاتا تھا اور وہ کچھ کر گذرتا تھا جو کوئی زندہ نہ کرتا تھا، میں اپنے ہم پیالہ ساتھیوں کے لیے اپنی سواری تک ذبح کر دیتا تھا، اور اپنی چادر دو گانے والیوں کے درمیان پھاڑ کر بانٹ دیتا تھا۔

وكنت اذا ما الخیل شمّصها القنا

لبیقا بتصریف القناة بنانیا

وعادیة سوم الجراد وزعتها

بكفّی وقد انحوا الیّ العوالیا

كانّی لم اركب جوادا ولم اقل

لخیلی كُرّی، نفّسی عن رجالیا

ولم اسبأ الزق الرویّ ولم اقل

لا یسار صدق اعظموا ضوء نادیا

جنگ کے اس موقع پر جب گھوڑوں کو نیزے بھڑکا اور بدکا رہے ہوں میں نیزہ بازی میں پورا ہوشیار اور ماہر تھا۔ بہت سے لشکروں کو جو ٹڈی دل کے مانند حملہ آور ہوتے تھے اور ان کے نیزے مجھے نشانہ بنانا چاہتے تھے میں نے اپنے ہاتھ سے انہیں قابو میں کر لیا اور ان کے ارادہ سے انہیں پھیر دیا لیکن اب اس حالت میں مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے میں کبھی گھوڑے کی پشت پر سوار ہی نہیں ہوا اور کبھی میں نے دستہ کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنے آدمیوں کی مدافعت میں حملہ آور ہونے کا حکم ہی نہیں دیا، اور جیسے میں نے کبھی شراب کے بھرے ہوئے خم خریدے ہی نہیں، اور کبھی اپنے مخلص ہوئے باز ساتھیوں سے یہ نہیں کہا کہ (مسافروں کی رہنمائی کے لیے) تم میری آگ کی روشنی کو زیادہ تیز اور اونچا کر دو۔

۷۰۔ ذوالاصبع عدوانی کے اشعار:۔

لِي ابنُ عمٍّ على ما كانَ من خُلُقٍ
مختلفانِ فأقليهِ ويَقليني
أزرى بنا أننا شالَت نَعامتُنا
فخالني دونهُ وخلتُهُ دوني
يا عمرو إلا تدع شتمي ومنقصتي
أضربك حتى تقول الهامةُ اسقوني

میرا ایک چچا زاد بھائی ہے جس کے اخلاق کے باعث ہم دونوں ایک دوسرے سے بگڑے ہوئے ہیں، وہ مجھ سے دشمنی رکھتا ہے اور میں اس سے۔ ہمیں جس چیز نے خوار کیا ہے وہ ہمارا انتشار و افتراق ہے، اب وہ مجھے اپنے سے گھٹیا خیال کرتا ہے اور میں اسے اپنے سے کمتر سمجھتا ہوں۔ اے عمرو! اگر تو مجھے گالیاں دینا اور حقیر کرنا نہیں چھوڑے گا تو میں تیری جان لے لوں گا اور پھر تیرا کوئی پرسان حال اور حمایتی نہ ہوگا۔ اور عربوں کے عقیدہ کے مطابق، تیری کھوپڑی سے نکلنے والا الو بے چین ہو کر چلاتا رہے گا کہ مجھے سیراب کر دو!

عربوں کا خیال تھا کہ جب کسی کو اس طرح قتل کر دیا جائے کہ اس کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس مقتول کی کھوپڑی سے ایک الو کی قسم کا پرندہ نکلتا ہے اور وہ بے چین و بے قرار رہتا اور یہ چلا کر کہتا رہتا ہے کہ مجھے سیراب کرو (یعنی خون کا بدلہ لو)۔

لاهِ ابنُ عمك لا أفضلت في حسبٍ
عني ولا أنت دياني فتخزوني
ولا تقوت عيالي يوم مسغبةٍ
ولا بنفسك في العزاء تكفيني

اے میرے چچا زاد بھائی! خدا کے لیے سوچ کہ آخر یہ زیادتی کیوں؟ نہ تو تجھے حسب میں مجھ پر

کوئی تفوق و برتری حاصل ہے اور نہ تو میرا آقا و نگران ہے کہ مجھے رسوا کرتا ہے، نہ تو میرے بال بچوں کو بھوک میں کھانا کھلاتا ہے، نہ تو سخت موقع آن پڑنے پر میری کوئی مدد کرتا ہے۔

انی لعمرك ما بابی بذی غلق
عن الصدیق ولا خیری بممنون
ولا لسانی علی الادنی بمنطلق
بالفاحشات ولا فتکی بمامون
ثم بؤس اذا ما خفت من بلد
هونا فلست بوقاف علی الهون
عنی الیك فما امی براعیة
ترعی المخاض وما رأیی بمغبون

اے برادر! تیری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ میرا دروازہ کبھی دوست کے لیے بند نہیں ہوا۔ اور نہ میں کسی کے ساتھ بھلائی کرکے اس بات پر احسان جتاتا ہوں۔ نہ میری زبان کبھی ادنی اور کمزوروں پر دشنام کے ساتھ کھلی ہے۔ لیکن بایں ہمہ جب کبھی میں اچانک گرفت کرتا ہوں تو اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا جا سکتا۔ میں بڑا خوددار و پاکباز ہوں لوگوں کی دولت پر میری نظر نہیں رہتی، جب ایک جگہ مجھے عزت پر حرف آتا نظر آتا ہے تو میں قطعاً ذلت برداشت نہیں کرتا اور اس جگہ نہیں ٹھہرتا۔ جاؤ مجھے چھوڑ کر الگ ہو جاؤ۔ میری ماں قریب الولادت حاملہ اونٹنیاں چرانے والی نہیں تھی۔ اور نہ میری رائے کمزور و ناقص ہے۔

کلُّ امرئ راجع یومًا لشیمته
وان تخلّق اخلاقًا الی حین
انی ابیّ ابیّ ذو محافظة
وابن ابیّ ابیّ من ابیّین
وانتم معشر زید علی مائة
فاجمعوا امرکم کلًّا فکیدونی
فان علمتم سبیل الرشد فانطلقوا
وان جهلتم سبیل الرشد فاتونی

ہر شخص ایک دن بالضرور اپنی حقیقی عادتوں کی طرف لوٹ آتا ہے خواہ وہ ایک مدت تک ریاکاری اور مصنوعی اخلاق اپناتا رہے۔ میں نہایت خود دار، اور اپنی عزت، اور ناموس آباء کا محافظ، ذمہ داریوں کا پابند ہوں اور نہایت خود دار باپ کا بیٹا اور خود داروں میں کا ایک خود دار ہوں۔ تمہارا اگروہ سو سے زیادہ ہے، اٹھو! اپنے آپ کو متحد و متفق کرکے میرے خلاف جو کچھ کر سکو۔

کر ڈالو۔ اگر تمہیں راہ راست مل جائے تو اس پر چل پڑو، لیکن اگر تمہیں ٹھیک معاملہ کا علم نہ ہو سکے تو میرے پاس آکر معلوم کر لینا۔

ماذا عليّ وان كنتم ذوي كرم
الّا اُحبكم اذ لم تحبوني
لو تشربون دمي لم يرو شاربكم
ولا دماؤكم جمعا تروّيني
الله يعلمني والله يعلمكم
والله يجزيكم عني ويجزيني
قد كنت اُوتيكم نصحي وامنحكم
ودّي عليّ مثبت في الصدر مكنون
لا يخرج الكره مني غير مأبية
ولا الين لمن لا يبتغي ليني

مجھے کیا؛ تم خواہ کتنے ہی صاحب خیر و شرف کیوں نہ ہو، اگر تم مجھ سے محبت نہ کرو تو میں بھی تم سے محبت نہیں کروں گا۔ اگر تم میرا خون پیو گے تو تمہارے پینے والے کو میرا خون سیراب نہیں کرے گا۔ اسی طرح تم سب کا خون مل کر بھی میری پیاس نہیں بجھائے گا۔ اللہ مجھے بھی جانتا ہے اور تمہیں بھی جانتا ہے۔ جیسا تم میرے ساتھ کر رہے ہو، اللہ اس کا تمہیں بدلہ دے گا اور جیسا میں کر رہا ہوں اس کا مجھے بدلہ دے گا۔ باوجود دل میں جمی ہوئی عداوت وکدورت کے میں نے تمہاری خیر خواہی کی تھی اور تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ جبر و اکراہ کا جواب میرے پاس خودداری و انکار کے سوا کچھ نہیں ملے گا، اور جو میرے ساتھ نرمی نہیں چاہتا میں بھی اس کے لیے نرم نہیں ہوتا۔

۷۔ اَفوَہ اَوْدِی کے اشعار:۔

البيت لا يُبتنى الّا له عمد
ولا عماد اذا لم ترس اوتاد
فان تجمّع اوتاد واعمدة
وساكن بلغوا الامر الذي كادوا
لا يصلح الناس فوضى لا سراة لهم
ولا سراة اذا جهالهم سادوا

خیمہ بغیر بانس بلیوں کے نہیں بنایا جا سکتا، اور ستون جم نہیں سکتے جب تک کہ میخیں نہ گاڑی جائیں اور جب میخیں اور بانس بلیاں مہیا ہو جائیں، اور خیمہ میں رہنے والا بھی ہو، تو مقصد

پورا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا وہ گروہ جو بے نظم اور بے سردار ہو اس کے معاملات سدھر نہیں سکتے، اور جب معاملات سے بے خبر اور ناتجربہ کار سردار بن جائیں تو بھی سمجھ لو کہ ان کا کوئی سردار نہیں۔

تُهدی الامور باهل الرأی ماصلحت
فان تولت فبالا شرار تنقاد
اذا تولی سراۃُ الناس امرهم
نما علی ذالك امرالقوم فازدادوا

معاملات جب تک صحیح رخ پر چلتے ہیں سمجھ لو کہ وہ ارباب عقل و بصیرت کے ہاتھ میں ہیں، اور جب وہ بگڑ جاتے ہیں تو پھر شریروں ہی سے وہ زیر ہوتے ہیں اور جب لوگوں کے معاملات کا نظم و نسق شریف سرداروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو قوم کے حالات سدھرتے ہیں اور اس کی نشوونما اور ترقی ہوتی ہے۔

۸۔ وداک ثُمیل مازنی کے اشعار:۔

رویدا بنی شیبان بعض وعیدکم
تُلاقوا غدًا خیلی علی سفوان
تُلاقوا جیادًا لاتحید عن الوغی
اذا ماغدت فی المأزق المتدانی
علیها الکُماۃ الغُرُّ من آل مازن
لیوث طعان عند کل طعان
تُلاقوهم فتعرفوا کیف صبرهم
علی ماجَنَتْ فیهم ید الحدثان
مقادیم وصالون فی الروع خطوهم
بکل رقیق الشفرتین یمان
اذا استُنجِدُوا لم یسألوا من دعاهم
لایّة حرب أم بأیّ مکان

اے بنو شیبان! ذرا اپنی دھمکیاں کم کرو کل مقام صفوان میں تم میرے جنگجو سواروں سے مقابلہ کرو گے۔ تم ایسے نسلی گھوڑوں سے ملو گے جو میدان کارزار میں جنگ سے گریز نہیں کرتے۔ ان گھوڑوں پر آل مازن کے مشہور بہادر جنگجو سوار ہوں گے جو نیزہ بازی کے مرد میدان اور جنگ میں شیر ہیں۔ ان سے مقابلہ پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ زمانہ کی دست درازیوں پر وہ کیسے صابر ہیں۔ وہ جنگ میں جرأت سے پیش قدمی کرنے والے ہیں، اور تیز یمنی دو دھاری تلواروں کے ساتھ اپنے قدموں کو ملا کر چلتے ہیں۔ جب ان سے مدد مانگی جاتی ہے تو وہ یہ نہیں پوچھتے کہ کون انہیں بلا رہا ہے۔

نہ یہ دیکھتے ہیں کہ کس جنگ کے لیے یا کس جگہ انہیں جانا ہے۔

۹۔ زہیر بن ابی سُلمٰی، ہرم بن سنان کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

وأبیض فیاض یداہ غمامة — علی معتفیه ما تُغبُّ فواضله

اخی ثقة لا یهلك الخمر ماله — ولکنه قد یهلك المال نائله

تراه اذا ما جئته متهللا — كأنك تعطیه الذی أنت سائله

(ممدوح) شریف و فیاض ہے۔ سائلین کے لیے اس کے ہاتھ (دولت کو) بادل کی طرح برساتے ہیں۔ اس کے انعامات و احسانات کا سلسلہ کبھی نہیں رکتا۔ بہادر و خود اعتماد ہے۔ شراب اس کی بخششیں اس کا مال ختم کر دیتی ہیں جب بھی تم اس کے پاس آؤ گے تم اسے خنداں و فرحاں پاؤ گے۔ تمہیں ایسا معلوم ہو گا کہ جیسے تم خود اسے وہ کچھ دے رہے ہو جو تم اس سے مانگ رہے ہو۔

ایضاً :۔

وفیهم مقامات حسان وجوههم

واندیة ینتابها القول والفعل

اذا جئتهم الفیت حول بیوتهم

مجالس قد یُشفی بأحلامها الجهل

علی مکثریهم رزق من یعتریهم

وعند المقلین السماحة والبذل

ان میں خوش رو جماعتیں ہیں اور ایسی مجالس شوریٰ ہیں جہاں قول و فعل یکے بعد دیگرے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جب تم ان کے پاس جاؤ گے تو ان کے گھروں کے اردگرد ایسی مجلسیں منعقد پاؤ گے جو اپنی فہم و بصیرت سے جہالت کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ ان میں جو مہمان جاتا ہے اُس کی مہمانی ان کے آسودہ حال طبقہ کے ذمہ ہوتی ہے اور جن کی مالی حالت خستہ ہے، ان کے ذمہ مہمانوں کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا اور ان کی خاطر و تواضع کرنا ہے۔

سعی بعدهم قوم لکی یدرکوهم

فلم یفعلوا ولم یُلیموا ولم یألوا

فما کان من خیر اتوه فانما

توارثه اباء اباؤهم قبل

وهل ینبت الخطیّ الا وشیجه

وتغرس الا فی منابتها النخل

ان کے بعد دوسرے لوگوں نے ان کا مقام پانے کی کوشش کی، مگر وہ ایسا نہ کر سکے، باوجودیکہ انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن بایں ہمہ ان کو ملامت بھی نہیں کی جا سکتی۔ ان میں جو خیر و فضیلت

ہے وہ تو آبائی ہے جو موروثی طور پر ان کو ملتی چلی آتی ہے۔ اور بھلا بتاؤ تو نیزہ کے درخت کے علاوہ کوئی درخت بھی نیزہ پیدا کرسکتا ہے؟ اور کیا کھجور کے درخت موزوں زمین کے سوا بھی کہیں لگائے جاسکتے ہیں؟

۱۰۔ اعشیٰ کے محلق کی مدح میں کہے ہوئے اشعار:-

لعمری لقد لاحت عیون کثیرۃ — الی ضوء نار بالیفاع تحرق

تشب لمقرورین یصطلیانها — وبات علی النار الندی والمحلق

رضیعی لبان ثدی امّ تقاسما — باسحم داج عوض لا نتفرق

تری الجود یجری ظاهرا فوق وجهه — کما زان متن الهندوانیّ رونق

یداه یدا صدق فکف مبیدۃ — وکف اذا ما ضنّ بالمال تنفق

میری عمر کی قسم! اس آگ کی روشنی کو بہت سی آنکھوں نے دیکھا جو بلند ٹیلہ پر جل رہی ہے۔ وہ دو سردی کے ماروں کے لیے بھڑکائی گئی ہے جس پر وہ تاپ رہے ہیں، اور آگ پر دو (دو) رات گذارنے والے (ایک تو) سخاوت تھی اور (دوسرا) محلق (ممدوح) یہ دونوں ایک ماں کے دودھ شریک بھائی ہیں جنھوں نے تاریک شب میں باہم حلفیہ عہد باندھا ہے کہ ہم ہرگز کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ جود وسخا کی رونق تم اس طرح ممدوح کے چہرے پر جھلکتی ہوئی پاؤگے جیسے تلوار کو اس کی آب وتاب اور چمک دمک زیب دیتی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ہی سخاوت میں پختہ و جری ہیں۔ ایک ہاتھ تو مسلسل مال کو اڑاتا ہی رہتا ہے اور دوسرا قحط کے زمانہ میں جب لوگ مال کو چھپا کر رکھتے ہیں، مال خرچ کرتا ہے۔

۱۱۔ تابط شرًا اپنے چچازاد بھائی کی مدح میں وہ صفات شعر میں بیان کررہا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں قابل مدح سمجھی جاتی تھیں:-

انی لمهد من ثنائی فقاصد

به لابن عم الصدق شمس بن مالك

اهزّ به فی ندوۃ الحیّ عطفه

کما هزّ عطفی بالهجان الاوارك

قلیل التشکی للمهمّ یصیبه

کثیر الهوی شتّی النوی والمسالك

یظل بموماۃ ویمسی بغیرها

جحیشا ویعروری ظهور المهالك

میں اپنی مدح وستائش کا تحفہ لے کر اپنے وفاکیش چچازاد بھائی شمس بن مالک کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میں اس مدح کے ذریعہ قبیلہ کی مجلس میں اسے اسی طرح مسرور وشاد کروں گا جیسے اس نے مجھے نسلی فربہ اونٹ دے کر شاداں کیا ہے۔ ممدوح ان مشکلات میں جو اسے پیش آتی ہیں بڑا صابر ہے اور

مصائب کا شکوہ نہیں کرتا۔ اس کے شوق و میلانات کثیر، مقاصد مختلف، اور راہیں نئی نئی ہیں۔ دن وہ ایک جنگل ہیں۔ تن تنہا وہ ہلاکت انگیز و پر خطر مقامات میں گھس پڑتا ہے۔

ویسبق وفد الریح من حیث ینتحی
بمنخرق من شدۃ المتدارک
اذا حاص عینیہ کری النوم لم یزل
لہ کالئٌ من قلب شیحان فاتک
ویجعل عینیہ ربیئۃ قلبہ
الی سلّۃ من حدا خلق مائک
اذا ھزّہ فی عظم قرن تھلّلت
نواجذ افواہ المنایا الضواحک
یری الوحشۃ الانس الانیس ویھتدی
بحیث اھتدت اُمّ النجوم الشوابک

اپنی تیز رفتار اور مسلسل دوڑ سے وہ ہوا کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ نیند کے باعث جب اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو اس کا چوکنا اور بیدار دل ہر وقت اس کی حفاظت و نگرانی کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کو اپنے دل کا پیش رو بناتا ہے تا وقتیکہ وہ چکنی خوں آشام تلوار کو میان سے نہ نکال لے۔ جب یہ (ممدوح) اس تلوار کو حریف مقابل کی ہڈی میں مارتا ہے تو موت کی باچھیں خوشی سے کھل جاتی ہیں۔ ممدوح وحشت ہی کو انس انیس خیال کرتا ہے اور اس بلند مقام کی راہ پا لیتا ہے جہاں کہکشاں کے گتھے ہوئے تارے پہنچے ہیں۔

۱۲۔ عمرو بن ہدیل عبدی کے اشعار:۔

ولا ترج خیرا عند باب ابن مسمع
اذا کنت من حیّیْ حنیفۃ او عجل
نحن اتممنا امر بکر بن وائل
وانت بشاج ما تُمِرُّ وما تحلی
وما تستوی احساب قوم تورثت
قدیما واحساب نبتن مع البقل

اگر تم حنیفہ یا عجل کے قبیلہ سے ہو تو ابن مسمع کے دروازہ سے کسی خیر کی امید نہ رکھنا۔ ہم نے ہی بکر بن وائل کے معاملہ کو استوار کیا، اور تو مقام "شاج" میں نہ کسی کے برے میں شریک نہ بھلے میں۔ یاد رکھو اس قوم کا حسب جو قدیم و موروثی شرافت کی مالک ہو اور اس نو پود قوم کا حسب جو گاجر مولی کی طرح اُگ آئی ہوں برابر نہیں ہو سکتا۔

۱۳۔ لبید بن ربیعہ نعمان کے مرثیہ میں کہتا ہے۔

الا تسألان المرء ماذا یحاول
أنحب فیقضی ام ضلال و باطل؟
اری الناس لایدرون ما قدر امرهم
بلیٰ، کل ذی لب الی الله واسل
الا کل شیٔ ما خلا الله باطل
و کل نعیم لا محالة زائل
و کل أناس سوف تدخل بینهم
دويهية تصفر منها الانامل
و کل امرئ یوما سیعلم غیبه
اذا حصلت عند الاله المحصائل

اے دوساتھیو! تم انسان سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ آخر وہ کس چیز کے لیے کوشاں ہے؟ کیا کوئی مقصد یا نذر ہے جسے وہ پورا کرتا ہے یا محض ضلال و باطل ہی ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اپنے معاملہ کے انداز سے ناواقف ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر ذی عقل اللہ سے لو لگاتا ہے۔ یاد رکھو! اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے اور ہر نعمت و آسائش یقیناً زائل ہونے والی ہے اور ہر انسان پر ایسی آفت آئے گی جس سے اس کی انگلیاں زرد ہو جائیں گی۔ اور ہر شخص ایک دن — جب خدا کے حضور اعمال کے نتائج جمع ہوں گے — اپنی پوشیدہ زندگی کو معلوم کرے گا۔

اذا المرء اسری لیلة خال انه
قضی عاملاً والمرء مادام عامل
فقولا له ان کان یقسم امره
الما یعظک الدهر؟ أمك هابل
فتعلم ان لا انت مدرك ما مضی
ولا انت مما تحذر النفس وائل
فان انت لم ینفعك علمك فانتسب
لعلك تهدیك القرون الاوائل
وان لم تجد من دون عدنان والدا
و دون معد فلتزعك العواذل

انسان جب رات بھر چلتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ اس نے کام پورا کر لیا ہے، حالانکہ انسان جب تک دم میں دم ہے مسلسل عمل میں لگا ہوا ہے۔ میرے رفیقو! ذرا اس آدمی سے جو اپنے معاملات کا نظم و نسق کرنے میں لگا ہوا ہے یہ کہو کہ تیری ماں تجھے روئے، کیا ابھی تک زمانہ نے (اپنے گذشتہ واقعات)

تجھے نصیحت آموز سبق نہیں دیا؟ تاکہ تجھے اتنا معلوم ہو جاتا کہ جو کچھ گذر چکا تو اسے نہیں پا سکتا، اور نہ تو اس (موت کے) کھٹکے سے جو تیرے دل کو لگا ہوا ہے، نجات پا سکتا ہے۔ پھر اگر تجھے تیری معلومات اور تجربات فائدہ نہیں پہنچاتے تو (کم از کم تاریخ ہی سے سبق حاصل کر اور) ذرا اپنے آبائی سلسلۂ نسب پر غور کر شاید اقوام ماضی تجھے راہ راست دکھلا دیں، اور جب تم معد اور عدنان سے اوپر اپنے صحیح آبائی نسب کو نہ پا سکو (تو پھر یقین ہو جانا چاہیے کہ دنیا فانی ہے) اور ان حوادث زمانہ سے عبرت حاصل کر لینی چاہیے۔

۱۴- عدیؔ بن زید عبادی:-

ايها الشامت المعيّر بالدّهر
أأنت المبرأ الموفور؟
أم لديك العهد الوثيق من الايا
م ام انت جاهل مغرور
من رايت المنون خلّدن أم من
ذا عليه من أن يضام خفير
اين كسرى، كسرى الملوك ابوسا
سان ام اين قبلهٗ سابور؟
و ابو الحضر اذ بناه واذ دجلة
تجبى اليه والخابور
شاده مرمراً و جلله كلْ
ساً فللطير فى ذراه وكور

اے دوسرے کے برے پر خوش ہونے والے! اور زمانہ کی گردشوں کے مارے کو عار دلانے والے! کیا تو اسی طرح آسودہ اور زمانہ کی دست درازیوں سے سالم محفوظ رہے گا؟ یا تو نے زمانہ سے کوئی پختہ عہد لے لیا ہے (کہ وہ تجھے نہ چھیڑے گا) یا پھر تو فریب خوردہ اور نادان ہے؟ تو نے کسے دیکھا ہے کہ موت نے اسے ہمیشہ کے لیے باقی چھوڑ دیا ہو یا پھر کون ایسا ہے کہ جسے آفات و مصائب سے کوئی بچانے والا ہو؟ شاہان ایران میں سے ابوساسان یا اس سے قبل سابور اب کہاں ہیں؟ اور حضر کا مالک جس نے اس کو تعمیر کیا کہاں ہے؟ جس کے پاس دریائے دجلہ و خابور کا محصول جمع ہوتا تھا۔ جس نے اسے مرمر سے پختہ تعمیر کیا تھا۔ اس کے اوپر چونے کا پلاسٹر چڑھایا تھا، آج اس کے کنگروں اور بالائی سروں پر پرندوں کے گھونسلے ہیں۔

وتبيّن رب الخورنق اذ اشـ
رف يوماً وللهدى تفكير
سرّهٗ حاله وكثرة ما يملـ
ـك والبحر معرضاً والسدير

فارعوى قلبه فقال وما غبـ
طة حيّ الى الممات يصير؟
ثم بعد الفلاح والملك والامّة
وارتهم هناك القبور
ثم أضحوا كأنهم ورق جف
فألوت به الصبا والدبور

اور قلعہ خورنق کے مالک کا حال معلوم کرو جب وہ ایک دن بلندی پر پہنچا، اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے غور و فکر ضروری ہے۔ اسے اس کے حالات، نیز کثرت مال و دولت قلعہ سدیر، اور وسط سلطنت میں بہنے والے دریا نے مطمئن اور مسرور کو رکھا تھا۔ آخر (ایک دن) اس کا دل حقیقت کی طرف پلٹا اور اس نے کہا کہ ایک مستعار زندگی پر جو بالآخر فنا ہونے والی ہے، خوشی کے کیا معنیٰ! اور پھر کامرانی و کامیابی، حکومت و سلطنت اور مدت معینہ کے بعد بالآخر انہیں قبروں نے چھپا لیا، اور بالآخر وہ ان سوکھے پتوں کی طرح ہو گئے جنہیں پروا اور پچھوا ہوائیں الٹ پھیر کر اپنے ساتھ اُڑائے لیے پھرتی ہیں۔

۱۵- امرؤ القیس اپنے مشہور معلقہ میں شب ہجر کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :-

وليل كموج البحر ارخى سدوله
علىّ بانواع الهموم ليبتلى
فقلت له لما تمطّى بصلبه
واردف اعجازاً وناء بكلكل
ألا ايها الليل الطويل الا انجلى
بصبح، وما الاصباح منك بأمثل
فيا لك من ليل كان نجومه
بكلّ مغار الفتل شدّت بيذبل

اور رات جو (درازی و ہیبت میں) سمندر کی موج کی طرح تھی اس نے انوع واقسام کی فکروں اور پریشانیوں کے ساتھ مجھے آزمانے کے لیے مجھ پر اپنے پردے لٹکا دیے پھر جب اس رات نے انگڑائی لے کر اپنی پیٹھ کو لمبا کیا اور اپنے پچھلے حصہ کو ساتھ لے کر بدقت اپنا سینہ اٹھایا (یعنی بہت آہستہ رفتاری کے ساتھ لمبی ہوئی) تو میں نے اس سے کہا، "اے رات! صبح لے آ، لیکن صبح بھی تو تجھ سے کچھ زیادہ آرام دہ اور اچھی نہیں۔ تو بھی کیا رات ہے جس کے تارے اپنی جگہ ایسے جمے ہوئے ہیں جیسے انہیں کوہ یذبل سے مضبوط رسیوں کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔"

نیز اسی قصیدہ میں وہ اپنے گھوڑے کے وصف میں کہتا ہے :-

وقد اغتدی والطیر فی وکناتھا
بمنجرد قید الأوابد ھیکل
مکر مفر مقبل مدبر معاً
کجلمود صخر حطه السیل من عل
له ایطلا ظبی وساقا نعامة
وارخاء سرحان وتقریب تتفل

صبح دم جب پرند ابھی اپنے گھونسلوں ہی میں ہوتے ہیں، میں اپنے کم بالوں والے مضبوط گھوڑے پر سوار ہوکر نکل جاتا ہوں جو جنگلی جانوروں کو قید کر لیتا ہے۔ یہ گھوڑا نہایت بہادر، جنگ میں کر و فر سے واقف، بیک وقت آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے پر قادر ہے۔ صبا رفتاری کا یہ عالم ہے جیسے وہ چٹان جسے سیلاب نے اوپر سے گرا دیا ہو۔ اس کی کمر ہرن کی طرح ہے، پنڈلیاں شتر مرغ کی ٹانگوں سے مشابہ، بھیڑیے کی دوڑ اور لومڑی کے بچہ کی چال اسے ملی ہے۔

۱۶۔ طرفہ بن العبد کشتی کے وصف میں کہتا ہے :-

کأن حدوج الما لکیة غدوة
خلایا سفین بالنواصف من دد
عدولیة او من سفین ابن یامن
یجور بھا الملاح طوراً ویھتدی
یشق حباب الماء حیزومھا بھا
کما قسم الترب المفایل بالید

مالکیہ کی زنانہ سواریوں کے ہودے صبح کے وقت ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے وہ بڑی بڑی کشتیاں ہوں جو مقام "دد" کی پہاڑی وادیوں سے گذر رہی ہوں۔ یہ کشتیاں قدیم وضع کی (عدول مقام کی ساختہ) ہیں یا مشہور ملاح ابن یامن کی کشتیاں ہیں، جنہیں ملاح کبھی سیدھے راستہ پر اور کبھی موڑ کے راستے سے لیے جا رہا ہے۔ اس کشتی کا سینہ پانی کی موجوں کو اس طرح چیرتا چلا جا رہا ہے جیسے مٹی کی ڈھیریوں میں چیز چھپانے والا اپنے ہاتھ سے مٹی کو دو حصوں میں بانٹتا ہے۔

۱۷۔ ابو صعترہ بولانی محبوبہ کے لعاب دہن کا وصف کر رہا ہے :-

ما نطفة من حب مزن تقاذفت
به جنبتا الجودی واللیل دامس
فلما اقرته اللصاب تنفست
شمال لأعلی مائه فھو قارس
باطیب من فیھا وما ذقت طعمه
ولکنني فیما تری العین فارس

تاریک شب میں جودی پہاڑ کے دونوں پہلوؤں پر برسنے والے اولوں کا پاک اور ستھرا پانی جو بہہ کر پہاڑ کے کھڈوں میں جمع ہوگیا ہو، پھر بادِ شمالی اس پانی کی بالائی سطح پر چلی ہو اور وہ بہت ٹھنڈا ہوگیا ہو، یہ پاک صاف اور ٹھنڈا شیریں پانی بھی لذت میں محبوبہ کے لعابِ دہن سے پاکیزہ و خوش گوار نہیں ہوگا۔ (یہ کوئی تجربہ کی بات نہیں کہہ رہا) کیونکہ میں نے اس کا مزہ چکھا ہی نہیں لیکن میری آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے میں اس کا اندازہ لگانے میں بڑا ہوشیار ہوں۔

۱۸۔ اعشیٰ کے اشعار:۔

ما روضة من رياض الحَزْن مُعشِبة
خضراء جاد عليها مسبل هطل
يضاحك الشمسَ منها كوكب شرِق
مؤزّر بعميم النبت مكتهل
يوما بأطيب منها نشر رائحة
ولا بأحسن منها اذ دنا الأُصُل

سخت زمین کا سرسبز گھنی گھاس والا گلستان جس پر موسلا دھار برسنے والا بادل برسا ہو، اس کے کھلے ہوئے تر و تازہ پھول سورج کی طرح گلستان میں اجالا کر رہے ہوں اور ہر قسم کے بھرپور اور خوشنما پودوں سے اس کی زمین ڈھکی ہوئی ہو (یہ گلستان اپنے تمام حسن و زیبائی، نکہت و خوشبو کے باوجود بھی) محبوبہ کی مہکتی ہوئی خوشبو سے کسی طرح زیادہ خوشگوار خوشبو والا نہیں، نہ شام کے وقت (جب کہ باغ حسن کے شباب پر ہو) یہ محبوبہ سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔

۱۹۔ اپنے قصیدے میں متلمس جریر بن عبد العزّیٰ کہتا ہے:۔

وكنا اذا الجبّار صعّر خدّهٗ
أقمنا لهٗ من خدّهٖ فتقوّما
لذي الحلم قبل اليوم ماتقرع العصا
وما عُلِّم الانسان الا ليعلما
ولو غير اخوالي أرادوا نقيصتي
جعلت له فوق العرانين ميسما

ہم وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی جبار و متکبر غرور و نخوت کا اظہار کرتا ہے تو ہم اس کی ساری اکڑ نکال کر اسے سیدھا کر دیتے ہیں۔ آج سے پہلے ہوشیار اور سمجھدار کے لیے کبھی عصا نہیں کھڑکھڑایا گیا، اور انسان کو اسی لیے سکھایا پڑھایا جاتا ہے کہ وہ ہوشیار ہو جائے اور جان لے۔ اگر میرے ماموؤں کے سوا کوئی اور میری توہین کا ارادہ کرتا تو میں اس کی ناک پر داغ لگا دیتا (اسے ذلیل کر دیتا)۔

وما كنت الّا مثل قاطع كفّه
بكفّ لهُ اُخرى فاصبح اجذما
فلما استقاد الكف بالكف لم يجد
له دركا فی ان تبينا فاحجما
يداه اصابت هذه حتف هذه
فلم تجد الاخرى عليها مقدّما
فاطرق اطراق الشجاع ولو يرٰى
مساغا لنابيه الشجاع لصمّما

اور میری مثال اس شخص کی ہو گئی جو اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو کاٹ کر ٹنڈا ہو جائے، پھر جب دوسرے ہاتھ سے پہلے ہاتھ کا قصاص لینا چاہا تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ دونوں جدا ہو جائیں، لہذا وہ اس حرکت سے باز رہا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سے ایک نے دوسرے کو ختم کر دیا تو دوسرا اس کے خلاف پیش قدمی نہ کرسکا، (ور رہے بسی ہے) اس نے سانپ کی طرح گردن جھکالی، لیکن اگر وہ سانپ اپنے نکیلے دانتوں کے گاڑنے کی گنجائش پاتا تو وہ ضرور کاٹ لیتا۔ (یعنی اپنوں سے بدلہ لینے میں اپنا ہی نقصان ہوتا ہے)۔

چوتھی فصل

زمانۂ جاہلیّت کے شعرا اور ان کے طبقات

عرب میں ہر قبیلہ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس میں شاعر لیڈر اور مقرر پیدا ہو۔ لیکن ان تینوں میں سے اسے سب سے زیادہ محبوب شاعر ہی ہوتا تھا۔ اور جب کسی قبیلہ میں کوئی بلند پایہ و کامل شاعر پیدا ہو جاتا تو وہ دعوتیں کرتے، جشن مناتے اور دیگر قبائل اسے مبارک باد دیتے، اور تہنیت کے پیغام بھیجتے۔ اس لیے کہ شاعر ہی وہ لوگ تھے جو بلا اجرت و معاوضہ اپنے کلام سے اپنی قوم کی قیادت اور اجتماع کے موقع پر ان کی حمایت و مدافعت کرتے۔ ان کی تاریخ اور ان کے روشن کارناموں کو حیات جاوید بخشتے اور قوم کے دل و دماغ میں اس کے مفاخر و مکارم نقش کرتے۔ بے شک ان میں سے بعض شاعروں نے شاعری کو پیشہ اور کمائی کا ذریعہ بھی بنا لیا تھا جس سے ان کے مرتبہ میں تو فرق آ گیا تھا لیکن ان کی شاعری اپنی جگہ بلند ہی رہی۔ مثلاً نابغہ نعمان سے، زہیر، ہرم بن سنان سے، اعشیٰ بادشاہوں اور حامیوں سے[1] مدد

---

[1] اعشیٰ مختلف ممالک میں روزی کی تلاش میں نکلتا تھا، حتیٰ کہ وہ عجمی بادشاہوں کے دربار میں بھی پہنچتا تو اسے انعام و اکرام دیتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں وہ کہتا ہے:- (باقی حاشیہ صفحہ ۸۵ پر)

لیتے رہتے تھے۔ ہر شاعر کے ساتھ ایک راوی اسی طرح لگا رہتا تھا جس طرح استاد کے ساتھ شاگرد۔ یہ راوی اپنے شاعر کے طریقہ کا پیرو کار ہوتا اور اس کی شاعری کو عوام میں پھیلاتا تھا۔ تمام بلند پایہ شعراء نے ایک زمانہ تک راوی بن کر تربیت پائی اور باقاعدہ مشق کی چنانچہ امرؤالقیس ابوداؤد کا راوی تھا، اور زہیر اوس بن حجر کا اور اعشیٰ مسیب بن علس کا۔

زمانہ کے لحاظ سے شعراء کے چار طبقے ہیں:۔

(۱) جاہلی شعراء: یہ وہ شعراء ہیں جو اسلام سے قبل زندہ رہے یا اسلام کا زمانہ انہیں ملا لیکن اس زمانہ میں انہوں نے قابل ذکر شاعری نہیں کی مثلاً امرؤالقیس، زہیر، اُمیۃ بن ابی الصلت اور لبید وغیرہ۔

(۲) مخضرم شعراء:۔ وہ شعراء ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کی وجہ سے زمانۂ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں شہرت و مقبولیت پائی مثلاً خنساء، حسان بن ثابت وغیرہ۔

(۳) اسلامی شعراء: وہ شعراء جو زمانۂ اسلام میں پیدا ہوئے اور عربی زبان کے لحاظ سے وہ قدیم پختہ اسلوب پر کاربند رہے۔ یہ عہد بنی امیہ کے شعراء ہیں۔

(۴) مولد شعراء: وہ شعراء ہیں جن کی لسانی قوت بگڑ گئی تھی اور انہوں نے صنعتوں (مصنوعی فن کاری) کے ذریعہ اپنی لسانی کمی کو پورا کیا۔ یہ عہد عباسیہ کے شعراء ہیں۔

کلام کی عمدگی اور خوش اسلوبی کے لحاظ سے ان شعراء کے تین طبقے ہیں:۔

امرؤالقیس، زہیر، نابغہ، پہلے طبقہ کے شعراء ہیں۔ اعشیٰ، لبید، طرفہ دوسرے طبقہ کے۔ عنترہ، درید بن الصمہ، امیۃ بن ابی الصلت تیسرے درجہ کے شعراء ہیں۔ لیکن اختلاف ذوق۔ اور قدماء کے اصول تنقید سے لاعلمی کے باعث یہ تقسیم کسی طرح بھی غلطی دھاندلی بازی اور یکطرفہ فیصلہ سے خالی نہیں ہو سکتی۔

۱۔ اِمرُؤالقیس

پیدائش اور زندگی کے حالات: ملک الضلیل، ذوالقروح حندج بن حجر کندی، یہ معزز خاندان کا نجیب الطرفین بچہ تھا۔ اس کا باپ بنو اسد کا بادشاہ اور شاہان کندہ کی نسل سے تھا۔ ماں کلیب و مہلہل کی بہن تھی۔ بچپن نہایت نازونعم میں گذرا۔ سرداری کے ماحول میں بڑھا۔ آگے بڑھ کر اس کی عادتیں بگڑ گئیں اور مے نوشی، عشق بازی، کھیل کود اور شعروشاعری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۴ کا)

وجوّبت للمال آفاقه عمان وحمص و اور یشلم
اتیت النجاشی فی ارضه وارض النبیط و ارض العجم

یعنی میں نے طلب مال کے لیے آفاق کے چکر لگائے۔ عمان گیا، حمص اور اوریشلم پہنچا، حبشہ میں نجاشی کے پاس پہنچا، عراق میں نبطیوں کے پاس گیا اور عجمی ممالک میں بھی گیا۔

میں لگ گیا۔ آوارگی و دل لگی بازی اپنا شیوہ بنا لیا اور جد و سرد ی ن کے بلند کا موں میں حصہ لینے سے گریز کرنے لگا۔ چنانچہ باپ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنے باپ کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ گھر سے نکلنے پر اس نے آوارہ گردوں اور اوباشوں کے گروہ میں شرکت کر لی، جو باغوں اور تالابوں کی تلاش میں پھرتے تھے۔ جہاں تالاب ملتا وہاں خیمہ ڈال دیتے۔ کھیلتے کودتے، شراب کا دور چلاتے، شکار کرتے اور جب پانی خشک ہو جاتا، گھاس ختم ہو جاتی تو وہ بھی دوسرے علاقہ کا رخ کر لیتے اپنے انہیں ڈھنگوں میں وہ یمن کے ایک علاقہ دمون میں پہنچا، یہاں اسے اپنے باپ کے مرنے کی اطلاع ملی، جسے بنو اسد نے اس کے ظالمانہ رویہ کی بنا پر قتل کر ڈالا تھا۔ اپنے باپ کی موت کی خبر سن کر امرؤ القیس نے کہا: "میرے باپ نے کم سنی میں تو مجھے گھر سے نکال دیا اور بڑا ہونے پر اپنا خون مجھ سے اٹھوایا۔ آج ہوش نہیں اور کل کا نشہ نہیں۔ آج شراب اور کل معاملہ کی بات"۔ پھر قسم کھائی کہ جب تک اپنے باپ کے عوض بنو اسد کے سو آدمیوں کو قتل نہ کر لوں اور سو کے سر مونڈ کر ان کو ذلیل نہ کر لوں اس وقت تک نہ گوشت کھاؤں گا نہ شراب پیوں گا، نہ سر میں تیل ڈالوں گا۔ رات کو جب تاریکی چھائی اور اس نے دور کہیں بجلی کوندتے دیکھی تو کہا:-

آرِقْتُ لبرق بلیل اهل ۔۔۔ یضیئ سناه باعلی الجبل

أتانی حدیث فکذبته ۔۔۔ بأمر تزعزع منه القلل

بقتل بنی اسد ربهم ۔۔۔ الا کل شیئ سواه جلل

میں اس بجلی کے لیے بیدار رہا جو رات میں کوندی اور جس کی روشنی پہاڑ کے بالائی حصے کو روشن کر رہی ہے۔ مجھے ایک ایسی خبر پہنچی ہے جس سے پہاڑ کی چوٹیاں لرز جائیں، لیکن میں نے اس کی تصدیق نہیں کی وہ خبر یہ ہے کہ بنو اسد نے اپنے آقا کو قتل کر دیا ہے۔ یہ اتنی اہم خبر ہے کہ اس کے بعد تمام دوسری چیزیں بے وقعت و حقیر ہیں۔

اگلے روز اس نے اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لیے اپنے ننھیالی خاندان بکر و تغلب سے مدد مانگی اور بنی اسد کی طرف کوچ کیا اور ان پر حملہ بول دیا۔ اور اس پر بنو اسد نے اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے باپ کے عوض اُن میں سے سو معزز آدمی بطور فدیہ قبول کر لے لیکن وہ نہ مانا اور جنگ پر مصر رہا۔ تب بنو تغلب و بنو بکر نے بھی اس کی مدد چھوڑ دی۔ ادھر منذر بن ماء السماء نے اپنی دیرینہ عداوت کی وجہ سے امرؤ القیس کا پیچھا لیا، جس پر امرؤ القیس کی حامی جماعتیں منذر کے ڈر سے منتشر ہو گئیں اور وہ بے یار و مددگار عرب کے مختلف قبائل میں مدد مانگنے کے لیے پھرنے لگا۔ لیکن اسے کہیں پناہ نہ مل سکی۔ بالآخر اس نے سموءل بن عادیاء کی پناہ لی۔ اس کے پاس اپنی زرہیں امانت رکھوائیں اور اس سے شمر غسانی کے نام سفارشی خط لکھوایا تاکہ وہ اسے قیصر تک پہنچا دے۔ اس زمانہ میں قیصر شاہ روم مقام قسطنطنیہ میں تھا۔ جب امرؤ القیس وہاں اس کے پاس پہنچا تو اس نے نہایت گرم جوشی اور احترام سے اس کو خوش آمدید کہا۔ قیصر کا خیال تھا کہ امرؤ القیس کو اپنا بنا لے۔ اس کے بعد عربوں میں وہ اپنی قوت بڑھا کر ایرانی حکومت کا زور توڑ سکے گا۔ چنانچہ

اس نے ایک بڑا لشکر امرؤ القیس کے ساتھ روانہ کر دیا لیکن بعد میں خیال بدل جانے کی وجہ سے قیصر نے اس لشکر کو واپس بلا لیا۔ اس اثنا میں امرؤ القیس کسی بلدی بیماری میں مبتلا ہو گیا جس کی وجہ سے اس کے بدن میں زخم پڑ گئے اور گوشت گل گیا۔ مؤرخوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جب امرؤ القیس لشکر لے کر چلا گیا تو طماح اسدی نے قیصر سے امرؤ القیس کے خلاف شکایتیں کیں اور اُسے اُس کے خلاف ورغلایا۔ تاکہ اس طرح طماح امرؤ القیس سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکے۔ چنانچہ قیصر نے امرؤ القیس کو ایک زہرآلود کارچوبی جوڑا بھیجا امرؤ القیس اس وقت انقرہ پہنچ چکا تھا اور اس جوڑے کے پہننے کے بعد اس کی وہ حالت ہوئی جو اوپر بیان کی گئی۔ اس سلسلہ میں مؤرخین امرؤ القیس کے مندرجہ ذیل اشعار سے استدلال کرتے ہیں:-

لقد طمح الطماح من نحو ارضه
ایلبسنی من دائه ما تلبسا
وبدلت قرحا دامیا بعد صحة
فیالك نعمی قد تحولت ابؤسا
فلو انها نفس تموت سویة
ولكنها نفس تساقط أنفسا

طماح اپنے وطن سے اس لیے آیا کہ اپنی الجھن اور مصیبت مجھ پر ڈال دے، اور میں صحت کے بعد خونی زخموں میں مبتلا ہو جاؤں۔ افسوس اس نعمت و خوش حالی پر جو تکالیف و شدائد میں تبدیل ہو جائے۔ اگر میری جان صرف ایک اکیلے آدمی ہی کی موت ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن یہ تو ایسی جان ہے جو بہت سی جانیں لے ڈوبے گی۔

موت کی مدہوشی میں اس کی زبان پر یہ کلمات رواں تھے "کتنے لبریز پیالے، نیزوں کے تیز طعنے اور فصیح و بلیغ خطبے کل انقرہ میں رہ جائیں گے!" پھر اس نے جان دے دی۔ وہ ۵۶۰ء[1] میں جبل عسیب میں دفن ہوا۔

اُس کی شاعری:

امرؤ القیس گو یمنی تھا، لیکن اس کی تربیت و پرورش نجد میں ہوئی تھی۔ وہ خاندان بنو اسد کے خالص عربی ماحول میں پروان چڑھا اور جوان ہوا۔ اس نے شعر سنے اور اور ان کی روایت کی۔ اسے شعر و شاعری سے بڑا شغف اور شاعروں سے مقابلہ کرنے کا بھی شوق تھا۔ بچپن ہی سے شعر کہنے لگا تھا۔ طبیعت کا تیز اور ذہین تھا۔ اس کی شاعری میں الفاظ کی شوکت، مشکل الفاظ کی کثرت شعروں کی عمدہ بندش، ندرتِ خیال، حسن تشبیہ پائی جاتی ہے۔ مسلسل سفروں، خطرات کے مقابلوں، اور مختلف معاشروں میں اختلاط نے اس کے دماغ کو کھول کر تیز کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ نئے نئے معانی و مضامین پیدا کرتا۔ انوکھے اور جدید اسالیب اختیار کرتا۔ اس کی شہرت و برتری، غیر معمولی ذہانت اور بلند مرتبہ کی وجہ

---

[1] ہمارا زمانۂ جاہلیت کے شعراء و خطباء کی تاریخ وفات کو معین کر کے بتانا غلو ہے اس لیے کہ ان لوگوں کو اس وقت تاریخ عیسوی یا دوسری تاریخوں کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ اپنے مشہور حوادث و وقائع سے تاریخ یاد رکھتے تھے۔

سے اس کے زمانہ کے بہت سے دوسرے لوگوں کے اشعار بھی اس کی شاعری میں جگہ پا گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا شاعر ہے جس نے لبوب کے کھنڈروں پر کھڑے ہونے اور رونے کی رسم ایجاد کی۔ شاعری میں عورتوں سے عشق کیا، انہیں نیل گایوں اور ہرنیوں سے تشبیہ دی۔ پیہم سفروں اور گھوڑے کی سواری کرتے رہنے کی وجہ سے اس نے رات اور گھوڑے کا وصف نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ آپ کو اس کی شاعری میں اس کی پوری زندگی اور اس کے اخلاق عادات کی زندہ تصویر نظر آئے گی۔ اس میں شاہی شوکت وسطوت، فقیرانہ تواضع ومسکنت، قلندرانہ مستی، بپھرتے شیر کی حمیت، آوارگی کی ذلت، دبے حیائی زخم خوردہ کے شکوے اور نالے سب ہی یک جا ملیں گے۔ امرؤ القیس کے متعلق تمام راویوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر تمام جاہلی دور کے شاعروں کا امام و قائد تھا۔

اُس کی شاعری کا نمونہ:- اس کی منقولہ شاعری کا سب سے بہترین حصہ وہ معلقہ ہے جو لوگوں میں ضرب المثل کی طرح مشہور ہو چکا ہے۔ یہ معلقہ اس نے اپنی چچازاد بہن عنیزہ کے مشہور واقعہ پر نظم کیا تھا۔ پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے رات کا وصف، گھوڑے کی تعریف، اپنی آوارگی اور شکار کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے:-

قفا نبك من ذكرى حبيب و منزل

بسقط اللوى بين الدخول فحومل

اے رفیقو! ذرا ٹھہرو، تاکہ ہم دخول وحومل کے درمیان سقط اللوی میں اپنے محبوب اور اس کے مکان کی یادیں رولیں۔

اس معلقہ کا کچھ حصہ پچھلے صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے جہاں ہم نے جاہلی شاعری کے نمونے دیے ہیں۔ اس معلقہ میں تغزل کا نمونہ:-

أفاطم مهلاً بعض هذا التدلل

وان كنت قد أزمعت صرمى فأجملى

اغرك منى أن حبك قاتلى

وأنك مهما تأمرى القلب يفعل

وما ذرفت عيناك الا لتضربى

بسهميك فى اعشار قلب مقتل

فان كنت قد ساءتك منى خليقة

فسلى ثيابى من ثيابك تنسل

تسلت عمايات الرجال عن الصبا

وليس فؤادى عن هواك بمنسل

اے فاطمہ! ذرا اپنی کج ادائیاں اور اس قسم کے ناز وانداز کم کردے، اور اگر تو نے

مجھ سے جدا ہونے کا عزم مصمم ہی کر لیا ہے تو اس کے لیے بھی کوئی خوشگوار و موزوں طریقہ اختیار کر۔ تیری اس بے نیازی کی وجہ یہی ہے ناکہ تجھے اس بات کا غرہ ہے کہ میں تیری محبت کا قتیل ہوں اور میرا دل تیرے اشارہ پر ناچتا ہے، اور تیری آنکھ کا ہر آنسو اس لیے گرتا ہے کہ وہ (تیری آنکھوں کے) دو تیروں سے میرے دل مقتول کے دس ٹکڑوں کو لوٹ لے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ میرے رویہ سے تجھے تکلیف پہنچی ہے تو پھر تو اپنا دل میرے دل میں سے نکالنے کی کوشش کر۔ اس طرح تو مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ لوگوں کی شوخیاں اور بچپن کے کھیل سمجھ آ جانے پر چھوٹ جاتے ہیں، لیکن عجیب ماجرا ہے کہ میرا دل تیری محبت سے کنارہ کش نہیں ہوتا۔

ایک قصیدہ میں اپنے اس سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے جس میں وہ عمرو بن قمیئہ کے ساتھ قیصر کے پاس گیا تھا کہتا ہے:-

اذا قلت هذا صاحب قد رضيته
وقرت به العينان بُدّلت آخرا
كذلك جدّى، لا أُصاحب واحدا
من الناس الّا خانني وتغيّرا
تذكرت اهلى الصالحين وقد أتت
على جمل بنا الركاب واعفرا

جب میں کہتا ہوں کہ یہ میری مرضی کے مطابق میرا ساتھی ہے اور اس سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے تو وہ مجھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا آ جاتا ہے، میری قسمت میں ایسے ہی دوست ہیں، جب بھی میں کسی کو ساتھی بناتا ہوں وہ وفا نہیں کرتا اور بدل جاتا ہے۔ پھر جب ہمارا قافلہ "جمل" اور "اعفر" پہنچا تو مجھے میرے اچھے اہل و اقربا یاد آئے۔

ولما بدت حوران والآل دونها
نظرت فلم تنظر بعينيك منظرا
تقطع اسباب اللبانات والهوى
عشية غادرنا حماة وشيزرا
بكى صاحبى لما رأى الدرب دونه
وايقن أنا لاحقان بقيصرا
فقلت له: لا تبك عينك انما
نحاول ملكا او نموت فنعذرا

اور جب حوران کی بستی نظر آنے لگی اور "آل" اس سے ورے تھا تو تو نے نظر دوڑائی لیکن کوئی منظر تیری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ جس شام کو ہم نے حماۃ و شیزر کو خیرباد کہا ہے اس شام ہمارے

عشق و محبت کے تمام رابطے بھی کٹ چکے تھے۔ میرے ساتھی نے جب اپنے ورے مملکت روم داخل ہونے کا پھاٹک دیکھا تو وہ رو پڑا اور اسے یقین آگیا کہ ہم قیصر سے جا ملیں گے۔ میں نے اس سے کہا۔ تو نہ رو، ہم یا تو حکومت حاصل کرنے کے لیے جد وجہد کریں گے یا اپنی جانیں دے دیں گے تاکہ کوئی ہم پر الزام نہ دھر سکے۔

۲۔ نابغہ ذبیانی

پیدائش اور حالاتِ زندگی: اس کا پورا نام ابو امامہ زیاد بن معاویہ ہے۔ چونکہ اس نے کامل تجربہ اور مہارت حاصل کر لینے کے بعد شعر کہنا شروع کیا اس لیے اس کا لقب "نابغہ" پڑ گیا (جس کے معنے ہیں غیر معمولی ذہانت و قابلیت کا مالک) پھر وہ اس طرح اچانک اپنی شاعری کا جو لامتناہی سرچشمہ تھا اس کی بنا پر نابغ (بہتے چشمہ) سے اسے تشبیہ دی گئی اور نابغہ نام رکھا گیا۔ وہ بنی ذبیان کے شرفاء و رؤسا میں سے ایک تھا، لیکن شاعری کو ذریعہ کسب بنانے کی وجہ سے اس کی عزت کچھ کم ہوگئی، اور اس کے بلند مرتبہ میں فرق آگیا۔ وہ نعمان بن منذر سے جا ملا تھا جس نے اُسے اپنے خواص و مقربین میں شامل کر لیا اور اسے ہر قسم کی آسائش و آسودگی سے نوازا تا آنکہ وہ اس کے انعامات و اکرامات کی وجہ سے سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتا پیتا تھا۔ وہ اسی طرح مسلسل خوش حالی و آسودگی سے متمتع ہوتا رہا حتی کہ بعض حاسدوں نے ان دونوں کے تعلقات خراب کرنے کے لیے نعمان سے چغلیاں کھائیں اور ثبوت کے طور پر اس کا وہ قصیدہ پیش کیا جس میں اس نے نعمان کی بیوی متجردہ کا وصف بیان کیا تھا۔ اس چغلی کا بادشاہ کے دل پر اثر ہوگیا۔ اور اس نے نابغہ کو دھمکی دی، چنانچہ وہ جان بچا کر سرزمین شام کی طرف بھاگ نکلا اور وہاں حارث اصغر کی پناہ لی، جہاں وہ عزت و اطمینان سے آسودہ زندگی گذارنے لگا۔ اس پر نعمان کے کینہ کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی کیونکہ وہ اس کے دشمن اور مدمقابل کی پناہ میں چلا گیا تھا۔ نابغہ عرصہ تک بنی غسان میں رہا جہاں وہ اُن کی مدح میں قصائد کہتا اور وہ اس کو سونے چاندی سے بدلہ دیتے رہے۔ حتی کہ اسے نعمان کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی، تو اس نے سفارشی کے ذریعہ نعمان تک پہنچنا اور اپنی براءت کا اظہار کرنا چاہا۔ اپنے سفارشیوں کے ساتھ اس نے اپنے وہ قصائد بھی پیش کیے جو معذرت خواہی کے موضوع میں آپ اپنی نظیر اور لافانی شاہکار ہیں۔ چنانچہ ان قصائد نے نعمان کے دل کی رنجش دور کر دی اور نابغہ نے اس دربار میں اپنا پہلا مقام پا لیا، وہ نعمان کے ساتھ نہایت خوش حالی کے دن گذارنے لگا تا آنکہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کے بدن میں رعشہ ہوگیا، وہ چلنے پھرنے سے معذور اور زندگی سے عاجز آگیا، اور اس نے یہ شعر کہے:۔

المرءُ یأمل ان یعیش ۔۔۔ وطول عیش ما یضره
تفنی بشاشته ویبقی ۔۔۔ بعد حلو العیش مره
وتخونه الایام حتی ۔۔۔ لا یری شیئا یسره

ءم شامت بي ان هلكت د تاسل الله دتة

آدمی زندگی کی آرزو کرتا ہے حالانکہ لمبی عمر اس کو نقصان ہی پہنچاتی ہے، اس کی تر و تازگی ختم ہو جاتی ہے اور پر کیف زندگی ختم ہو کر تکلیف دہ زندگی باقی رہ جاتی ہے۔ زمانہ اس کے ساتھ بے وفائی کرنے لگتا ہے، حتیٰ کہ اسے کوئی بھی مسرت انگیز چیز نظر نہیں آتی میرے مرنے پر کتنے ہی سینوں میں ٹھنڈک پڑ جائے گی اور کتنے ہی کہیں گے "کتنا اچھا آدمی تھا وہ، خدا اس کا بھلا کرے۔"

اس کی وفات ۱۸ قبل ہجری میں ہوئی۔

اُس کی شاعری: نابغہ ان تین بلند پایہ شاعروں میں سے ایک ہے جن کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچا جا سکتا اور جن کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ وہ تین شعراء ہیں امرؤالقیس دوسرا وہ خود (یعنی نابغہ) اور تیسرا زہیر۔ اپنے دونوں ساتھیوں سے جو چیز اسے شاعری میں ممتاز کرتی ہے وہ ہے کنایہ میں جدت و ندرت، اشارہ میں حسن و نزاکت، مضمون کی صفائی و وضاحت، تکلف و تصنع کی قلت، پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس کی شاعری دل کے میلانات و خواہشات سے ہم آہنگ ہے اور یہی وجہ ہے کہ دور جاہلیت اور صدر اسلام میں جس قدر اس کی شاعری کو مقبولیت عوام حاصل ہوئی ہے اور جتنا وہ گائی گئی ہے کسی دوسرے کی شاعری کو وہ مقام نہ مل سکا۔ اس نے جس حسن و خوبی کے ساتھ خوفزدہ کی شب، مجرم کی معذرت خواہی منعم کی مدح سرائی کے موضوعات کو بیان کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ البتہ اس کی شاعری میں کہیں کہیں اقواء[1] کا عیب پایا جاتا ہے۔ جس کے متعلق وہ کہتا تھا "میرے شعر میں نقص ہے جو میں نہیں جانتا۔" پھر ایک دفعہ جب کسی گویے سے اس نے اپنے چند اشعار سنے جن میں اقواء کا عیب تھا تو وہ اپنے شعروں کا عیب سمجھ گیا اور پھر اس نے کبھی یہ نقص اپنی شاعری میں نہ آنے دیا۔ عرب کے تمام شعراء شاعری میں اس کے بلند مرتبہ کے معترف ہو گئے تھے۔ چنانچہ عکاظ کے میلے میں اسے پیش پیش رکھتے اور ادبی مباحثوں اور جھگڑوں میں اس سے فیصلہ کراتے، اس کا فیصلہ صحیح ہوتا اور تسلیم کیا جاتا تھا۔

اس کی شاعری کا نمونہ: اپنے ایک قصیدہ میں عمرو بن حارث غسانی کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:-

كليني لهم يا أميمة ناصب
وليل أقاسيه بطئ الكواكب

---

[1] اقواء شاعری میں ایک عیب ہے جس میں قافیوں کی حرکت مختلف ہو جاتی ہے، ایک قافیہ میں پیش اور دوسرے میں زیر۔ دیکھیے نابغہ کے مندرجہ ذیل دو شعروں کہ آخری حرف "د" کی حرکتوں کا اختلاف:-

سقط النصيف ولم ترد اسقاطه
فتناولته واتقتنا باليدِ

بمخضب رخص كان بنانه
عنم يكاد من اللطافة يعقد

وصدر اراح الليل عازب همه
تضاعف فيه الحزن من كل جانب

اے امیمہ! مجھے تھکا دینے والی فکروں نیز اس لمبی اور دشواری سے کٹنے والی رات کے لیے چھوڑ دے جس کے تارے آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور اس سینہ کی تکلیفیں برداشت کرنے کے لیے چھوڑ دے جس میں شب غم نے دور و دراز کی فکروں اور پریشانیوں کو لاکر پناہ گزیں کر دیا ہے اور جس میں ہر سو سے رنج و غم بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

علیّ لعمرو نعمة بعد نعمة
لوالده ليست بذات عقارب
وثقت له بالنصر اذ قيل تذ غزت
كتائب من غسان غير أشائب
إذا ما غزوا بالجيش حلق فوقهم
عصائب طير تهتدى بعصائب

عمرو کے والد کے بعد میرے اوپر عمرو کے ایسے احسانات ہیں جن میں تکلیفوں کی آمیزش نہیں ہے۔ جب مجھ سے کہا گیا کہ غسان کی خالص فوج نے حملہ کر دیا ہے تو مجھے اس کی فتح پر کامل یقین آ گیا، جب وہ لشکر لے کر حملہ کرتے ہیں تو ان کے اوپر پرندوں کے جھنڈ کے بعد دیگرے منڈلاتے رہتے ہیں۔

فهم يتساقون المنية بينهم
بايديهم بيض رقاق المضارب
ولا عيب فيهم غير أن سيوفهم
بهن فلول من قراع الكتائب
لهم شيمة لم يعطها الله غيرهم
من الجود والاحلام غير عوازب

وہ آپس میں ایک دوسرے کو موت کے جام پلاتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں چمکدار تیز دھاروں والی تلواریں ہیں ان کے لشکر میں اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ ان کی تلواریں لشکروں سے نبرد آزما ہونے کی وجہ سے کند ہو گئی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سخاوت، عاقبت اندیشی اور زود فہمی کی کچھ ایسی عادتیں بخشی ہیں جو ان کے سوا دوسروں کو عنایت نہیں کیں۔

رقاق النعال طيب حُجزاتهم
يحيّون بالريحان يوم السباسب
ولا يحسبون الخير لا شرّ بعده
ولا يحسبون الشرّ ضربة لازب

ان کے جوتے نرم چمڑے کے ہیں (خوش حال و آسودہ ہیں) ان کے نیفے پاک ہیں (عفت مآب و پاک باز ہیں) تہواروں کے موقع پر انہیں خوشبودار پھولوں کے گلدستے پیش کیے جاتے ہیں (اس لیے کہ یہ شاہی خاندان سے ہیں) خوش حالی میں کبھی یہ نہیں سمجھتے کہ اس کے بعد کبھی بدحالی اور تکلیف کا زمانہ نہیں آئے گا اسی طرح تکلیف و تنگی کو یہ خیال نہیں کرتے کہ بس اب اس سے چھٹکارا ہی ناممکن ہے۔

۳۔ زہیر بن ابی سلمیٰ

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات: زہیر بن ابی سلمیٰ ربیعہ بن رباح مزنی نے اپنے باپ کے رشتہ داروں (بنوغطفان) میں تربیت پائی، اور ایک زمانہ تک شامہ بن غدیر اپنے باپ کے ماموں کی صحبت میں رہا جو صاحب فراش مریض تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی، وہ نہایت دانشمند شخص تھا۔ اصابت رائے، بلند پایہ شاعری، اور کثرت مال کی وجہ سے وہ ناموری حاصل کر چکا تھا، چنانچہ زہیر نے شاعری میں اس کی خوشہ چینی کی، اس کے علم و حکمت سے متاثر ہوا جس کا بین ثبوت اس کی شاعری کے وہ جواہر حکمت بہم پہنچاتے ہیں جن سے اس نے اپنی شاعری کو مرصع کیا ہے۔ جب مرہ قبیلہ کی دو با اثر شخصیتوں، حارث بن عوف اور ہرم بن سنان، نے عبس و ذبیان میں صلح کرانے کی کوشش کی، اور انہوں نے دونوں قبیلوں کے مقتولین کی دیتیں (خون بہا) جن کا مجموعہ تین ہزار اونٹ ہوتا تھا اپنے ذمہ لے کر جنگ کی آگ کو فرو کر دیا تو شاعر پر ان سرداروں کی عالی ظرفی نے عالم وجد طاری کر دیا، چنانچہ اس نے اپنے مشہور معلقہ کے ذریعہ ان کی مدح کی، اور بعد میں بھی برابر ہرم بن سنان کی مدح میں لمبے لمبے قصائد کہتا رہا۔ ہرم بن سنان نے بھی قسم کھائی کہ جب بھی زہیر اس کی مدح میں کچھ کہے گا، یا اس سے کچھ مانگے گا یا اس کو دعا سلام کرے گا، تو وہ اسے ایک غلام یا لونڈی یا گھوڑا ضرور بخشے گا، حتیٰ کہ زہیر اس کی بے شمار بخششوں کو قبول کرتے کرتے شرما گیا اور بعد میں جب وہ ہرم کو کسی مجمع میں دیکھتا تو کہتا: "ہرم کے سوا تم سب بخیر رہو اور مبارک دن گذارو" پھر کہتا کہ جس کو میں نے دعا میں شریک نہیں کیا ہے وہ تم سب سے بہتر ہے۔ عمر بن الخطاب رضؓ نے ہرم کے کسی لڑکے سے کہا "اپنے باپ کی تعریف میں زہیر کے کچھ اشعار تو سناؤ" جب وہ سنا چکا تو حضرت عمرؓ نے کہا: "زہیر تم لوگوں کی مدح میں خوب شعر کہتا تھا" لڑکے نے کہا: "خدا کی قسم! اور ہم لوگ اس کو دیتے بھی خوب تھے" حضرت عمرؓ نے کہا "تم نے جو کچھ اسے دیا تھا وہ تو ختم ہو چکا اور اس نے جو کچھ تم کو دیا وہ باقی ہے" دولت و ثروت کے باوجود زہیر خوش اخلاق، نرم مزاج، بردبار، صائب الرائے، پاکباز، صلح پسند، خدا اور روز قیامت پر کامل ایمان رکھنے والا تھا۔ معلقہ کے ان اشعار سے اس امر کا ثبوت مہیا ہوتا ہے:-

فلا تكتمن الله ما في صدوركم
ليخفى و مهما يكتم الله يعلم
يؤخر فيوضع في كتاب فيدخر
ليوم حساب أو يعجل فينقم

خدا سے اپنے دلوں کا حال چھپانے کی کوشش مت کرو کیونکہ اس پر تو ہر پوشیدہ چیز آشکارا ہے۔ اگر اسے بدلہ لینے میں تاخیر منظور ہوتی ہے تو عمل نامہ میں لکھ کر قیامت کے دن پر اسے ملتوی کر دیتا ہے اور اگر جلدی منظور ہوتی ہے تو دنیا ہی میں بدلہ لے لیا جاتا ہے۔

زہیر نے سو سال سے زیادہ لمبی عمر پائی، جیسا کہ اس کے شعر سے معلوم ہوتا ہے۔

بدا لی أنی عشت تسعین حجة

تباعا و عشراً عشتها و ثمانیا

مجھ پر یہ ظاہر ہو چکا کہ میں لگا تار نوے سال پھر دس سال اور آٹھ سال (یعنی ایک سو آٹھ برس) زندہ رہ چکا ہوں۔

ہجرت سے گیارہ سال قبل اس کا انتقال ہوا، اس کے دونوں لڑکے کعب اور بجیرؓ مسلمان ہو گئے تھے۔

اُس کی شاعری: شاعری میں یہ خانوادہ ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا باپ، دونوں بہنیں سلمٰی اور خنساء، دونوں لڑکے کعب اور بجیر، قابل ذکر شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں، اور یہ ایسی خصوصیت ہے جو کسی دوسرے شاعر کو میسر نہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا، زہیر جاہلیت کے تین مایۂ ناز شعراء میں سے ایک ہے۔ بعض لوگ تو اسے نابغہ اور امرؤ القیس سے بھی بڑھا دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کا کلام غریب الفاظ، پیچیدہ عبارت، بیہودہ خیالات اور فحشیات سے منزہ، اختصار و جامعیت نیز راست گفتاری اور حکمت سے پر، ہونے کے باعث دیگر شعراء کے کلام سے ممتاز و ارفع ہے۔ یہ ان شاعروں میں سے ایک ہے جنہیں مدح، کہاوتیں، اور حکیمانہ مقولے، نظم کرنے میں کامل دسترس حاصل تھی۔ زہیر شاعری کے ان غلاموں میں سے ایک ہے جنہوں نے شاعری کو سیکھا اور جو بڑی دماغ سوزی اور غور و فکر کے بعد شعر کہا کرتے تھے۔ اس کے قصیدے ''حولیات'' یعنی یکسالہ کاوشوں کے نتیجے کہلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک قصیدہ چار مہینہ میں نظم کرتا، پھر چار مہینہ تک اسے کاٹ چھانٹ کر درست کرتا رہتا، اس کے بعد چار مہینہ تک اساتذۂ فن کے سامنے اسے پیش کرتا تھا، اور عوام میں ایک برس سے قبل اسے پیش نہیں کرتا تھا۔

اُس کے معلقہ کا مختصر تجزیہ: جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے اس کے معلقہ کا موضوع مرہ قبیلہ کے دو شخصوں — حارث بن عوف اور ہرم بن سنان — کی مدح ہے جنہوں نے قبائل عبس و ذبیان میں صلح کرانے کی کوششیں کیں لیکن جاہلی شعراء کے دستور کے مطابق اس نے اپنے معلقہ کی ابتداء محبوبہ کے مکان کے آثار پر ٹھہرنے، انہیں سلام و دعا دینے، اور ان کا وصف بیان کرنے سے کی ہے۔ وہ کھنڈروں کو دیکھ کر پرانے زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے، چونکہ ام اوفی کی اقامت گاہ کے ان ویران اور مٹے ہوئے کھنڈروں پر وہ بیس برس کے بعد آکر کھڑا ہوا تھا اس لیے بمشکل وہ ان کی شناخت کر سکا۔

فلما عرفت الدار قلت لربعها

الا عم صباحا أیها الربع و اسلم

جب میں نے مکان کو پہچان لیا تو اس سے کہا: "اے گھر تیری صبح بخیر ہو اور تو سلامت رہ!"
پھر اس کے تصور میں محبوبہ کے قافلہ کا وہ منظر آیا جب وہ گلابی حاشیہ کے باریک پردے والے ہودوں میں سوار ہو کر کوچ کر رہی تھیں، اور وہ والہانہ اپنی غمناک نگاہیں کوچ کرنے والی سواریوں پر جمائے ہوئے تھا۔ پھر وہ ان راستوں اور منزلوں کا بیان شروع کرتا ہے جہاں سے اس قافلہ کو گذر کو پہنچنا ہے، وہ نہایت دلکش پیرایہ میں ان مناظر کی اپنے ذہن میں تصویر کھینچتا ہے گویا وہ سواریاں اس کی نظروں کے سامنے ان مقامات سے گذر رہی ہیں، اور اگر اس کا دوست ذرا غور سے دیکھے تو وہ بھی ان سواریوں کو دیکھ لے گا۔

تبصّر خليلي هل ترى من ظعائن
تحمّلن بالعلياء من فوق جرثم
علون بأنماط عتاق وكلّة
وراد حواشيها مشاكهة الدم
بكرن بكورًا واستحرن بسحرة
فهن لوادي الرس كاليد للفم

اے میرے دوست! غور سے دیکھ کیا تجھے وہ سواریاں نظر آ رہی ہیں جو جرثم کے بالائی علاقہ علیاء سے کوچ کر رہی ہیں، ان کے اوپر صاف رنگ کے باریک پردے اور چادریں پڑی ہوئی ہیں جن کے کنارے خون کی طرح گلابی ہیں، ان سواریوں نے صبح تڑکے سفر شروع کیا ہے اور اب وہ "وادی الرس" سے اس طرح قریب جا پہنچی ہیں جیسے منہ کے لیے ہاتھ۔

وفيهن ملهى للصديق ومنظر
أنيق لعين الناظر المتوسم
فلما وردن الماء زرقا جمامه
وضعن عصيّ الحاضر المتخيم

ان سواریوں میں عاشق مزاج کی دلبستگی و تفریح کا سامان ہے اور صاحب ذوق و اہل نظر کے لیے دلکش و حسین منظر ہے، جب ان سواریوں کا پڑاؤ نیلے گہرے پانی پر ہوا تو انہوں نے وہاں خیمے تان کر اقامت اختیار کر لی۔

یہاں سے شاعر گریز کرتے ہوئے ان دو شخصیتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جنھوں نے اپنی مساعی سے صلح و امن قائم کر کے قبیلوں کو خون بہانے سے روک لیا تھا۔ وہ ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:-

يمينا لنعم السيدان وجدتما
على كلّ حال من سحيل ومبرم

تدارکتما عبسا و ذبیان بعدما
تفانوا ودقوا بینهم عطر منشم
وقد قلتما ان ندرک السلم واسعا
بمال و معروف من القول نسلم
فاصبح یجری فیهم من تلادکم
مغانم شتٰی من افال مزنم

بخدا! ہر موقع کے لحاظ سے شدت ہو یا نرمی آپ دونوں سردار نہایت بلند مرتبہ ثابت ہوئے، آپ نے عبس و ذبیان کی لڑائی کا خوب تدارک کیا حالانکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو فنا کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ آپ دونوں نے کہا تھا کہ اگر مال و دولت اور قاعدہ کے مطابق بھلی بات سے صلح کی کوئی بھی مناسب شکل نکل سکی تو ہم ضرور جانوں کو بچالیں گے۔ پھر آپ کے مویشیوں میں سے مقتولین کے اولیاء کو نوجوان اونٹ (خون بہا) دیئے جانے لگے۔

پھر مدح سے عارضی طور پر گریز کرکے لڑنے والی جماعتوں کو نرمی و مہربانی سے صلح کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن جنگ کا تصور دماغ میں آتے ہی پھر کچھ سختی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ لوگوں کو جنگ کی وجہ سے جو ہولناک جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں ان کا تذکرہ کرتا ہے۔

وما الحرب الا ما علمتم و ذقتم
وما هو عنها بالحدیث المرجّم
متی تبعثوها تبعثوها ذمیمة
و تضر اذا ضرّیتموها فتضرم
فتعرککم عرک الرّحٰی بثفالها
و تلقح کشافا ثم تنتج فتتئم
فتغلل لکم مالا تغلّ لاهلها
قرًی بالعراق من قفیز و درهم

جنگ کا نتیجہ تم کو معلوم ہو گیا، اور اس کا مزہ تم نے چکھ لیا اور یہ جو کچھ بھی جنگ کے متعلق کہا جارہا ہے اٹکل پچو نہیں ہے۔ جب بھی تم جنگ کو چھیڑوگے اس کے نتائج برے ہی پاؤ گے اور جب تم جنگ کو کسی کے پیچھے لپکاؤ گے تو وہ بھپا لے لیگی، پھر اس کی آگ بھڑکتی ہی جائے گی اور وہ تم کو اس طرح رگڑ کر پیس دے گی جیسے چکی مائیں کو رگڑ دیتی ہے جو کپل کی جڑ میں لپٹا ہوا ہوتا ہے، وہ سال میں دو مرتبہ حاملہ ہوگی اور جب جنے گی تو ایک جھول میں دو دو بچے دے گی پھر وہ تمہارے لیے اس قدر مصائب و مشکلات پیدا کر دے گی کہ عراق کے علاقہ میں اتنا غلہ اور دولت بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد وہ پھر اپنے دو ممدوحوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ان کی تعریف کرتا ہے کہ انہوں نے

ایک ایسی قومی مشکل کو حل کیا جس کو پیدا کرنے میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، پھر جنگ بھڑکانے کا تمام تر جرم ہم بن ضمضم پر لگاتے ہوئے کہتا ہے :-

وکان طوی کشحا علی مستکنة

فلا هو أبداها ولم یتجمجم

وقال سأقضی حاجتی ثم أتقی

عدوی بألف من ورائی ملجم

اس میں کینہ اور انتقامی جذبہ کی آگ چھپی ہوئی تھی جسے نہ تو وہ کھولتا تھا نہ مبہم طور سے بتاتا تھا، اس نے دل میں سوچا کہ میں اپنا منصوبہ پورا کر لینے کے بعد ان ہزار سواروں کی پناہ میں پہنچ جاؤں گا جو میرے پیچھے مجھے دشمن سے بچانے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔

فشد ولم تفزع بیوت کثیرة

لدی حیث ألقت رحلها أم قشعم

لدی أسد شاکی السلاح مقذف

له لبد أظفاره لم تقلم

پھر اس نے حملہ کر دیا، اور دوسرے بہت سے گھروں کو خوفزدہ کیے بغیر اس طرف کا رخ کیا جہاں موت نے اپنا پالان ڈالا تھا، جہاں جری ہتھیار بند شیر رہتا تھا جس کی گردن کے بال گھنے اور ناخن کٹے ہوئے تھے۔

رعوا ما رعوا من ظمئهم ثم أوردوا

غمارا تسیل بالرماح وبالدم

فقضوا منایا بینهم ثم أصدروا

الی كلأ مستوبل متوخم

انہوں نے جب تک چاہا اپنے جانوروں کو چرایا (یعنی امن کے زمانہ میں)، پھر ایسے گھرے پانی (میدان جنگ) پر انہیں اتارا جو خون اور نیزوں سے بہ رہا تھا، پھر انہوں نے اپنی اپنی موتیں پوری کرلیں اور اس چراگاہ میں واپس چلے گئے جس کی گھاس نہایت ثقیل اور بدانجام تھی۔

بعد ازاں شاعر پر انسانیت اور اپنی فلسفیانہ طبیعت کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ وہ ایک فلسفی کی طرح ناپائیدار زندگی سے اکتا کر موت کے فلسفہ پر غور کرنے لگتا ہے۔ اور اپنے بیتے ہوئے تجربوں کی بنا پر نصیحت کرتا ہے :-

رأیت المنایا خبط عشواء من تصب

تمته ومن تخطئ یعمر فیهرم

ومن هاب أسباب المنایا ینلنه

ولو نال أسباب السماء بسلم

ومن يجعل المعروف من دون عرضه
يفره ومن لا يتق الشتم يشتم

میری نظر میں موت اس بوکھلائی ہوئی اندھی اونٹنی کی طرح ہے جو اندھا دھند پاؤں مارتی ہے، اس کی ٹانگیں جس کو لگ جاتی ہیں وہ مرجاتا ہے اور جسے چھوڑ دیتی ہیں وہ بڑی عمر پاتا اور کھوسٹ ہو جاتا ہے۔ اور جو موت کے پھندوں سے ڈرتا ہے وہ اگر سیڑھی کے ذریعہ آسمان پر بھی چڑھ جائے تو موت اسے ضرور گرفتار کرلے گی جو اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے مال و دولت خرچ کر دیتا ہے وہ اپنی عزت و آبرو کو بچا لیتا ہے، اور جو سب وشتم سے باز نہیں رہتا اسے گالیاں سننا پڑتی ہیں۔

ومن يجعل المعروف في غير أهله
يعد حمده ذمًا عليه ويندم
ومهما تكن عند امرئ من خليقة
وان خالها تخفى على الناس تعلم
وكائن ترى من معجب لك شخصه
زيادته أو نقصه في التكلم

جو نااہلوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے اس کی بھلائی بھی برائی بن جاتی ہے اور اسے اپنے کیے پر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ تم اپنی عادت کو لوگوں سے خواہ کتنا ہی چھپانا چاہو وہ ایک دن لوگوں پر ظاہر ہو ہی جائے گی۔ لیکن فضیلت و منقصت کا دار و مدار جسامت پر نہیں وہ تو گفتگو میں پنہاں ہے۔

لسان الفتى نصف ونصف فؤاده
فلم يبق الا صورة اللحم والدم
وان سفاه الشيخ لا حلم بعده
وان الفتى بعد السفاهة يحلم

انسان کا آدھا حصہ اس کی زبان ہے آدھا حصہ اس کا دل ہے، باقی تو گوشت اور خون کا ڈھانچہ ہے اور کچھ بھی نہیں، بوڑھے کی حماقتیں ختم ہونے اور اس کے سنجیدہ و بردبار بننے کا امکان نہیں ہے لیکن نوجوان اپنی حماقت و نادانی کو چھوڑ کر بردبار ہو سکتا ہے۔

۴۔ اعشیٰ

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ ابو بصیر میمون بن قیس بن جندل ان ماہر اور اساتذۂ فن شعراء میں سے ایک ہے جنھوں نے شاعری کو کمائی کا ذریعہ بنایا اور شاعری کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی۔ یمامہ میں

منفوحہ نامی بستی میں پیدا ہوا ہے۔ اپنے ماموں مسیب بن علس کا راوی بن کر شاعری میں درک حاصل کیا۔ جب عقل پختہ ہوئی اور زبان میں زور پیدا ہوا تو تلاش معاش میں ملکوں ملکوں پھرتا رہا، بادشاہوں کے درباروں میں پہنچ کر ان کی مدح کرتا، ان سے بخششیں مانگتا، شاہان نجران بنو عبدالمدان کے پاس پہنچا، جنہوں نے اسے نہایت عزت و احترام سے اپنا مہمان بنایا، اور گرانقدر عطیے دیے۔ انہیں کی صحبت کے اثر نے اسے مےخواری کا عادی بنا دیا۔ نیز وہ ان کے خیالات و افکار سے بھی کسی حد تک متاثر ہوا جس کی جھلک اس کی شاعری میں ملتی ہے اس ضمن میں شراب کا وصف خاص طور پر قابل ذکر ہے اس کی عمر کافی لمبی ہوئی، حتیٰ کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی جاتی رہی تھیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا سنا تو آپ کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ کہا، اور حجاز پہنچ کر آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ قریش کو اس کے مسلمان ہو جانے کے ارادہ پر بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ ابوسفیان نے کہا "خدا کی قسم اگر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلا گیا تو اپنی شاعری سے عرب کی آگ کو بھڑکا دے گا" چنانچہ سب نے چندہ کر کے سو اونٹ اس کی مدد کے لیے جمع کیے، اعشیٰ نے وہ اونٹ قبول کر لیے، اور واپس گھر کی راہ لی۔ راستہ میں یمامہ کے قریب وہ اپنی اونٹنی پر سے گرا اور اونٹنی نے اس کی گردن کچل دی۔

اس کی شاعری: بعض راوی اور شاعری کو پرکھنے والے اصحاب نظر، اعشیٰ کو امرؤالقیس، زہیر اور نابغہ کا پوتھا ساتھی قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بہترین شاعر امرؤالقیس ہے جب وہ سوار ہو اور زہیر جب وہ شوق کرے اور نابغہ جب وہ خوفزدہ ہو، اور اعشیٰ جب وہ مست و مدہوش ہو۔ اس بیان میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن بایں ہمہ اس میں شاعر کی بلندی کا ثبوت ملتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کے کلام میں رعنائی حسن، خوبی بیان، شراب کی تعریف میں کمال و مہارت، باوجود تطویل کے خوش بیانی، وہ امتیازی صفات ہیں جن کی مثال دوسرے شاعروں کے کلام میں نہیں ملتی اس کے زوردار اشعار سن کر کان گونج اٹھتے ہیں، دلوں پر ہیبت سی چھا جاتی ہے۔ لوگوں پر ان کا اثر ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کا لقب صناجۃ العرب (عرب کا چنگ بجانے والا) پڑ گیا۔ اپنی شاعری کے ذریعہ اس نے بہتوں کو عزت دی اور بہتوں کو ذلیل و خوار کیا۔ محلق کا واقعہ[1] نیز قریش کا اس کے اسلام قبول کرنے سے خطرہ محسوس کرنا اس امر کی بین دلیلیں ہیں۔

---

[1] محلق عرب کے گمنام اور مفلس لوگوں میں سے ایک شخص تھا۔ جس کی سات جوان لڑکیاں گھر بیٹھی تھیں۔ باپ کی گمنامی اور مفلسی کی وجہ سے انہیں کوئی مانگنے نہیں آتا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے یہ رائے دی کہ وہ اعشیٰ کی مہمانی کر کے اس کے سامنے اپنی مشکل بیان کرے تاکہ وہ اپنے شعروں میں اس کی تعریف کرے اور اس طرح اس کی لوگوں میں شہرت ہو جائے۔ بیوی کی تجویز کے مطابق محلق نے شاعر کی مہمانی کی اور باوجود تنگدستی کے ایک اونٹنی ذبح کر دی۔ اعشیٰ نے اس سخاوت پر ایک پورا قصیدہ اس کی مدح میں کہہ دیا، جس کا کچھ حصہ پہلے نمونوں میں گذر چکا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ: اس کے منتخب شعروں میں وہ لامیہ قصیدہ ہے جسے کچھ لوگ معلقات میں شمار کرتے ہیں، جس کا مطلع :-

ودّع هريرة ان الركب مرتحل   وهل تطيق وداعا أيها الرجل؛

ہریرہ کو الوداع کہو کہ قافلہ کوچ کر رہا ہے۔ اور شخص! کیا تو الوداع کی طاقت بھی اپنے اندر پاتا ہے! اس قصیدہ کے کچھ دوسرے اشعار :-

أبلغ يزيد بني شيبان مألكة
أبا ثبيت أما تنفك تأتكل
ألست منتهياً عن نحت أثلتنا
ولست ضائرها ما أطّت الابل
كناطح صخرة يوماً ليوهنها
فلم يضرها وأوهى قرنه الوعل

بنی شیبان کے یزید کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ اے ابوثبیت! کیا تو سدا ہم سے جلا بھنا رہے گا! کیا ہمارے خاندان کی آبرو لینے سے تو باز نہیں آئے گا! حالانکہ رہتی دنیا تک تو اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا، تیری مثال مضبوط چٹان سے ٹکرانے والے بارہ سنگے کی سی ہے جو اسے کمزور کرنا چاہتا ہے، مگر اس کا تو کچھ نہیں بگاڑتا اُلٹا وہ اپنے سینگوں کو ہی کمزور کر لیتا ہے۔

لقد زعمتم بأنا لا نقاتلكم
انا لأمثالكم يا قومنا قتل
قالوا الطراد فقلنا تلك عادتنا
أو تنزلون فانا معشر نزل

تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے۔ اے قوم! ہم تمہارے جیسوں کے لیے تو بڑے خونخوار اور جلاد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم مشترکہ حملہ کریں گے، ہم نے کہا یہ تو ہماری عادت ہے یا اگر تم ایک ایک کر کے مقابلہ میں اترو تو ہم لوگ اس طریقہ سے بھی واقف ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جو مدحیہ قصیدہ تیار کیا تھا اس کے کچھ اشعار :-

ألم تغتمض عيناك ليلة أرمدا
وبت كما بات السليم مسهدا
وما ذاك من عشق النساء وانما
تناسيت قبل اليوم خلة مهددا

کیا آشوب چشم کی وجہ سے رات بھر تیری آنکھ لگنے نہ پائی اور تو اس شخص کی طرح رات بھر بے خواب رہا جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو، اور تیری یہ بے خوابی عورتوں کے عشق کی وجہ سے نہیں، کیونکہ آج سے بہت

پہلے ہی تونے مہدد (محبوبہ) کی دوستی کو بھلا دیا تھا۔

ولكن ارى الدهر الذى هو خائن
اذا اصلحت كفاى عاد فأفسدا
شباب و شيب، و افتقار و ثروة
فلله هذا الدهر كيف تردّدا

لیکن زمانہ مجھے بے وفا و پر دغا معلوم ہوتا ہے جب میری حالت سدھرتی ہے وہ پلٹ کر پھر اسے بگاڑ دیتا ہے۔ جوانی، بڑھاپا، مفلسی اور تونگری، خدا اس زمانہ کو سمجھے کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے؟

فآليت لا ارثى لها من كلالة
ولا من وجىً حتى تلاقى محمدا
متى ما تناخى عند باب ابن هاشم
تُراحى و تلقى من فواضله ندآى

میں نے قسم کھائی ہے کہ اونٹنی کے تھکنے اور اس کے پیروں کے زخمی ہونے پر ترس نہیں کھاؤں گا تاوقتیکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ پہنچ جائے۔ جب ابن ہاشم کے دروازہ پر تو جا کر بیٹھے گی تب تجھے آرام ملے گا اور اس کی بخششوں سے تجھے فیض پہنچے گا۔

نبيّ يرى مالا يرون و ذكره
أغار لعمرى فى البلاد و أنجدا
له صدقات ما تُغِبُّ و نائل
و ليس عطاء اليوم يمنعه غدا

وہ ایسا نبی ہے جو ان چیزوں کو دیکھ لیتا ہے جنہیں لوگ نہیں دیکھتے، اور ملکوں ملکوں اس کی شہرت کا چرچا ہو چکا ہے۔ ان کی بخششیں اور انعامات مسلسل و لامتناہی ہیں اور آج کی بخششیں کل دی جانے والی بخششوں سے اس کو باز نہیں رکھتیں۔

۵۔ عنترہ عبسی

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات: یہ ابو المغلس عنترہ بن شداد عبسی ہے اس کا باپ شریف النسل تھا اور ماں زُبیبَہ نامی ایک حبشن تھی۔ اس کا شمار عرب کے بدنسلوں اور غیر عربوں میں ہوتا ہے۔ جب وہ پیدا ہوا تو اس کے باپ نے جاہلی دستور کے مطابق اپنی لونڈی کے پیٹ کے بچہ کو اپنا بچہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خود یہ لڑکا بھی اپنی غلامی سے متنفر و بیزار رہا، اس نے جنگی تربیت حاصل کی، سپہ گری اور شہسواری کی خوب مشق کر لی اور ایک دن بالآخر وہ مرد میدان اور سالار لشکر ہو گیا۔ ایک مرتبہ عرب کے کچھ قبیلوں نے عبس پر حملہ کیا اور ان کے اونٹ لے بھاگے، عبسیوں

نے ان حملہ آوروں کا تعاقب کیا، عنترہ بھی ان میں شریک تھا۔ اس کے باپ نے کہا "اے عنترہ! آگے بڑھو اور حملہ کرو!" باپ کے غلام بنائے رکھنے کی وجہ سے وہ جلا ہوا تو تھا ہی، فوراً جواب دیا "غلام حملہ کرنے میں ہوشیار نہیں ہوتا، وہ دودھ دوہنا اور تھن باندھنا خوب جانتا ہے"۔ باپ نے کہا "حملہ کر! تو آزاد ہے!" وہ حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا اور جی توڑ کر لڑا، حملہ آوروں کو شکست ہوئی، لوٹے ہوئے اونٹ ان سے واپس لے لیے گئے، تب اس کے باپ نے اسے اپنا بیٹا تسلیم کر لیا۔ اسی دن سے اس کا نام مشہور ہوتا چلا گیا، حتیٰ کہ بہادری، پیش قدمی اور بے باکی و جرأت میں وہ ضرب المثل بن گیا۔ اپنی بہادری اور ناموری کی جو معقول توجیہ اس نے کی ہے، اسے یہاں بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ کسی نے اس سے دریافت کیا "کیا آپ سب سے زیادہ دلیر و بہادر ہیں؟" اس نے جواب دیا "نہیں" اس نے پوچھا "تو پھر لوگوں میں یہ بات کیوں مشہور ہو گئی؟" اس نے کہا "میں جب آگے بڑھنے میں مصلحت دیکھتا تو پیش قدمی کرتا، اور جب پیچھے ہٹنے میں احتیاط اور ہوشیاری دیکھتا تو پیچھے ہٹ جاتا۔ اس جگہ کبھی نہیں گھستا جہاں داخل ہو جانے کے بعد واپسی کا راستہ نظر نہ آتا ہو۔ بزدل اور کمزور کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھتا، اور پوری طاقت سے اس پر وار کرتا جسے دیکھ کر بہادر کے اوسان خطا ہو جاتے، پھر پلٹ کر اس بہادر کو بھی مار ڈالتا"۔

داحس وغبراء کی مشہور لڑائی میں عنترہ نے نہایت عمدگی سے عبس کے فوجی دستوں کی سالاری کے فرائض انجام دیے، اور سرداری کے بلند مقام پر پہنچ گیا۔ اس نے بڑی عمر پائی بڑھاپے کی وجہ سے اس کی ہڈیاں کمزور اور کھال لٹک گئی تھی، تقریباً ۶۱۵ء میں قتل کیا گیا۔

اس کی شاعری۔ غلامی کے دوران میں نہ تو اس کے اچھے شعر منقول ہیں نہ برے، اس لیے کہ غلامی دل پر زنگ چڑھاتی، اور آتش جذبات کو سرد کرتی ہے۔ مگر جب باپ نے اسے اپنا بیٹا تسلیم کر لیا، حملہ میں فتح حاصل ہوئی، اور عبلہ کی محبت نے اس کے دل میں ہلچل مچا دی تو شاعری کا طوفان اس کے سینے میں موجیں مارنے لگا اور وہ نہایت عمدہ و پرجوش شعر کہنے لگا اس کی شاعری میں تشبیب و تغزل کی چاشنی اور سنجیدہ فخر کی آمیزش ہے، لیکن اس کی شاعری کا بیشتر حصہ مصنوعی ہے جسے اس کی شاعری سے بجز اس کے کوئی نسبت نہیں کہ وہ طرز بیان اور موضوع میں اس کے اشعار سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی خالص اور غیر مخلوط شاعری میں اس کا وہ شاہکار معلقہ ہے جسے اس نے اپنی شاعری کا سکہ جمانے اور اپنی فصاحت کی دھاک بٹھانے کے لیے نظم کیا تھا۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ عبس خاندان کے ایک فرد نے اس سے بدکلامی کی۔ ماں کی طرف بدنسل اور سیاہ ہونے کا طعنہ دیا۔ عنترہ نے اس سے کہا "میں جنگ میں حصہ لیتا ہوں، مجھے مال غنیمت میں سے پورا حصہ دیا جاتا ہے، دست سوال بڑھانا ناپسند کرتا ہوں، اپنے مال سے سخاوت کرتا ہوں، اہم مواقع پر آگے بڑھایا جاتا ہوں" بدکلامی کرنے والے نے کہا "میں تجھ سے بہتر شاعر ہوں!" عنترہ نے کہا "یہ بھی جلدی ہی تم کو معلوم ہو جائے گا"۔ پھر صبح ہی لوگوں کے سامنے اپنا مشہور قصیدہ "مُذَهَّبَہ" پیش کیا جس نے اس کے حریف کا منہ بند کرکے اس کی بڑی بات کو نیچا دکھا دیا۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔

اس کے معلقہ کے کچھ اشعار:۔

ولقد شربت من المدامة بعدما
رکد الهواجر بالمشوف المعلم
فاذا سكرت فانني مستهلك
مالي و عرضي وافر لم يكلم
واذا صحوت فلا أقصر عن ندىً
وكما علمت شمائلي و تكرمي

دوپہریوں کی تپش کم ہونے کے بعد میں نے ٹھپہ لگے ہوئے چمکدار دیناروں کے عوض شراب پی ہے جب پینے کے بعد میں مست و مدہوش ہوتا ہوں تو اپنے مال کو بیدریغ اڑاتا ہوں، اور میری آبرو صحیح وسالم ہوتی ہے اس میں کوئی بٹہ نہیں لگتا۔ جب میرا نشہ اتر جاتا ہے اور میں ہوش میں آتا ہوں تب بھی سخاوت میں کمی نہیں کرتا، اور میری عادتیں اور شرافت تو خوب جانتی ہے!

ومدجج كره الكماة نزاله
لا ممعن هربا ولا مستسلم
جادت يداي له بعاجل طعنة
بمثقف صدق الكعوب مقوم
فشككت بالرمح الأصم ثيابه
ليس الكريم على القنا بمحرم
فتركته جزر السباع ينشنه
يقضمن حسن بنانه والمعصم

وہ ہتھیار بند جنگجو جس کے مقابلہ میں اترنے سے بڑے بڑے سورما گھبرا جاتے ہیں جو میدان کارزار سے نہ تو بھاگتا ہے نہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کرتا ہے، میرے ہاتھوں نے پھرتی سے مضبوط سیدھا نیزہ اس میں گھونپ دیا، پھر میں نے اس کا بدن نیزہ میں پرو دیا، اور کوئی شریف انسان نیزہ پر حرام نہیں کیا گیا ہے، میں نے اس بہادر کو مار کر درندوں کی خوراک بنا کر چھوڑ دیا جو اس کا گوشت نوچ رہے تھے اور اس کی کلائی اور ہڈیوں کے حسین جوڑ چبا رہے تھے۔

لما رأيت القوم أقبل جمعهم
يتذامرون كررت غير مذمم
يدعون عنتر والرماح كأنها
أشطان بئر في لبان الأدهم
ما زلت أرميهم بثغرة نحره
ولبانه حتى تسربل بالدم

جب میں نے دیکھا کہ لوگوں کی جماعتیں ایک دوسرے کو جنگ پر ورغلا رہی ہیں تو میں نے بھی بہادری سے قابل تعریف حملہ کیا، لوگ پکار رہے تھے اے عنترہ! آگے بڑھو! اور میرے سیاہ گھوڑے کے سینے میں کنویں کی رسیوں کی طرح لمبے لمبے نیزے گھسے ہوئے تھے میں برابر گھوڑے کے سینوں کو دشمنوں کی جانب بڑھائے چلا جارہا تھا حتی کہ اس کا اگلا حصہ خون سے اس طرح ڈھک گیا جیسے اس نے خون کا قمیص پہن لیا ہو۔

فازور من وقع القنا بلبانه
وشكا الى بعبرة و تحمحم
لو كان يدرى ما المحاورة اشتكى
ولكان لو علم الكلام مكلمى

اپنے سینے پر نیزوں کی ماروں سے لہولہان ہو کر اس (گھوڑے) نے اپنی گردن موڑی اور آنسو بہا کر، ہنہناتے ہوتے ہوئے مجھ سے فریاد کی، اگر وہ جانتا کہ گفتگو کیا ہوتی ہے تو وہ اپنی زبان سے شکایت کرتا، اور اگر وہ بات کرنا جانتا تو ضرور مجھ سے بات کرتا۔

ولقد شفى نفسى و أبرأ سقمها
قيل الفوارس ويك عنتر أقدم
والخيل تقتحم الغبار عوابسا
من بين شيظمة و أجرد شيظم

اس وقت جب کہ کم بالوں والے لمبے گھوڑے منہ بگاڑے ہوئے نرم ریتلی زمین میں داخل ہو رہے تھے میرے دل کو شہسواروں کے اس نعرہ نے مسرت بخشی اور تمام کدورت کو ختم کر دیا کہ اے عنترہ آگے بڑھو! شاباش عنترہ!

اس کے کچھ اور اشعار:۔

بكرت تخوفنى الحتوف كأننى
أصبحت عن غرض الحتوف بمعزل
فأجبتها أن المنية منهل
لا بد أن أسقى بكأس المنهل
فاقنى حياءك لا أبالك و اعلمى
أنى امرؤ سأموت إن لم أقتل
ان المنية لو تمثل مثلت
مثلى اذا نزلوا بضنك المنزل

وہ مجھے موت سے اس طرح ڈرانے لگی گویا کہ میں موت کے نشانہ سے بچ کر ایک محفوظ گوشہ میں پہنچ گیا ہوں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ موت تو ایسا گھاٹ ہے جس کا ایک پیالہ مجھے ضرور پلایا جائے گا، تو

ذرا ہوش میں آ، اپنے دامن حیا کو تھامے رہ، اور سمجھ لے کہ میں ایک انسان ہوں اگر مجھے قتل نہ کیا گیا تو ایک دن بالآخر اپنی موت مرجاؤں گا۔ گھمسان کے رن میں اگر موت کسی شخص کا روپ دھار کر سامنے آتی تو وہ میری ہی شکل میں آتی۔

انی امرؤ من خیر عبس منصباً
شطری، و أحمی سائری بالمنصل
و اذا الکتیبة أحجمت و تلاحظت
ألفیت خیرا من معمّ مُخول
و الخیل تعلم و الفوارس أننی
فرّقت جمعهم بضربة فیصل
و الخیل ساهمة الوجوه کانما
تسقی فوارسها نقیع الحنظل

میرا آدھا نسب عبس کے اعلی خاندان سے ملتا ہے، اور تلوار سے میں اپنے پورے نسب کی حفاظت کرتا ہوں، اور جب لشکر پیچھے ہٹ جائے اور خوف کی وجہ سے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھنے لگے تو میں وہاں شریف چچاؤں اور ماموؤں والوں سے بہتر پایا جاؤں گا، سواروں کے دستے اور شہسوار سب جانتے ہیں کہ میں ان کی جمعیت کو فیصلہ کن وار سے تتر بتر کر دیتا ہوں، اور گھوڑے اس طرح منہ بگاڑے ہوتے ہیں گویا ان کے سواروں کو پانی میں اندرائن گھول کر پلایا جا رہا ہے۔

ولقد أبیت علی الطوی و أظلّه حتی أنال به کریم المأکل

میں شریفانہ اور باعزت خوراک حاصل کرنے کے لیے دن و رات متواتر بھوکا رہ جاتا ہوں۔

۴۔ طرفۃ بن العبد

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات: طرفۃ بن العبد بن سفیان بکری، یتیم پیدا ہوا تھا۔ اس کے چچاؤں نے اس کی پرورش کی لیکن انہوں نے اس بچہ کی تربیت میں لاپروائی برتی اور اسے بے ادب اور بے ڈھنگا بنا دیا، جوان ہوا تو بیکاری، آرام پرستی کھیل کود اور مے نوشی کی عادت پڑ چکی تھی۔ لوگوں کو بے آبرو کرنے کا چسکا لگ چکا تھا۔ جوانی کی ترنگ میں آکر بادشاہ عمرو بن ہند کی ہجو کر ڈالی، حالانکہ وہ بادشاہ کی خوشنودی و عطیات کا محتاج تھا۔ اس کی ہجو کی وجہ سے عمرو کے دل میں اس کے خلاف کینہ جم گیا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ اپنے ماموں ملتمس (جس نے خود بھی بادشاہ کی ہجو کی تھی) کے ہمراہ امداد طلب کرنے کے لیے بادشاہ کے پاس گیا، تو بادشاہ ان سے بظاہر نہایت تپاک سے ملا، تاکہ وہ دونوں اس کی طرف سے مطمئن ہو جائیں پھر ان کے لیے انعام کا فرمان جاری کیا، ساتھ ہی انہیں دو خط اپنے بحرین کے گورنر کے نام لکھ کر دیے اور کہا کہ اپنا انعام پورا پورا وہاں جا کر گورنر سے

وصول کرلیں، ابھی وہ گورنر کی طرف جانے والے راستہ ہی پر تھے کہ متلمس کے دل میں خط کی طرف سے کچھ شک پیدا ہونے لگا، اس نے ایک پڑھنے والے کی تلاش کی، جس نے خط اسے پڑھ کر سنایا، اس میں لکھا تھا: "باسمک اللھم! یہ خط عمرو بن ہند کی طرف سے مکعبر کو لکھا جا رہا ہے۔ جونہی تمہیں متلمس کے ہاتھ سے یہ خط ملے تم اس کے چاروں ہاتھ پیر کاٹ کر زندہ دفن کر دینا"۔ اس نے وہ خط نہر میں ڈال دیا، پھر طرفہ سے کہا "بخدا! تمہارے خط میں بھی یہی بات لکھی ہے" اس نے کہا "ہرگز نہیں! میرے لیے ایسا نہیں لکھے گا"، اور اپنے راستہ پر ہو لیا۔ جب بحرین کے گورنر کے پاس پہنچا تو اس نے اسے قتل کر دیا، اس وقت وہ چھبیس سال کا تھا۔[1]

اس کی شاعری۔ بچپن ہی سے وہ نہایت ذہین و طباع، حساس اور زود فہم تھا۔ بیس برس کا بھی نہ تھا کہ شاعری میں کمال حاصل کر لیا، اور اس کا شمار بلند پایہ شاعروں میں ہونے لگا۔ لیکن عمرو بن کلثوم کی طرح اس کی شہرت بھی اس کے معلقہ کی وجہ سے ہوئی، ممکن ہے اس کے اور بہت سے اشعار بھی ہوں جو راویوں کے علم میں نہ آسکے ہوں۔ کسی چیز کے وصف میں مبالغہ چھوڑ کر راست بیانی سے کام لینا اس کی خصوصیت ہے۔ اس کے اشعار میں پیچیدہ ترکیبیں، نامانوس الفاظ اور مبہم مضامین پائے جاتے ہیں، اور یہ سب آپ کو اس کے معلقہ میں نظر آجائے گی جس کی ابتداء اس نے تغزل سے کی ہے۔ پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے نہایت انوکھے انداز سے پینتیس شعروں میں اپنی اونٹنی کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد اپنے ذاتی کمالات پر مشتمل فخریہ شاعری ہے۔ جو نہایت پر مغز اور بلیغ ترین شاعری ہے۔ ذیل میں ہم مختصراً اس کے معلقہ کا تجزیہ کرتے ہیں:۔

اس کے معلقہ کا مختصر تجزیہ۔ معلقہ کی ابتداء اس نے اپنی محبوبہ خولہ کے کھنڈروں کے ذکر سے کی ہے۔ وہ ان کھنڈروں کے آثار کو ہاتھوں میں گدے ہوئے دھندلے نقوش سے تشبیہ دیتا ہے، پھر تھوڑی دیر وہاں کھڑے ہو کر محبوبہ کے قافلہ کے ان گنبد نما ہودوں کا تصور کرتا ہے۔ جو صبح کے وقت کوچ کر رہے تھے۔ اور بالاختصار نہایت خوبی کے ساتھ اس سماں کو بیان کرتا ہے۔ پھر بڑے پیارے انداز سے تو محبوبہ کی تعریف کرنے لگتا ہے جس سے اس کے سینہ میں غم عشق ابھر آتا ہے، پھر وہ اس کی یاد سے گریز کرتے ہوئے اپنی اونٹنی کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ اس کے اعضاء اور اس کی ایک ایک حرکت کو طول دے کر نہایت خوش اسلوبی سے نرالے انداز میں بیان کرتا ہے:۔

---

[1] اس کا ثبوت شاعر کی بہن خرنق کے مرثیہ کے ذیل کے اشعار ہیں:۔

عددنا له ستا و عشرين حجة ... فلما توفاها استوى سيدا ضخما

فجعلنا به لما رجونا ايابه ... على خير حال لا وليدا و لا قحما

اس کی عمر چھبیس (۲۶) سال کی ہوئی تھی اور وہ گرانقدر سردار ہو گیا تھا، اس کی موت کا صدمہ اس وقت ہمیں پہنچا جب ہم یہ امید کر رہے تھے کہ وہ بخیر و خوبی واپس آئے گا اور اس وقت جب وہ نہ تو لڑکا تھا نہ بڑی عمر کو پہنچا تھا۔

وانی لأمضی الھم عند احتضاره
بھوجاء مرقال تروح و تغتدی
تباری عتاقاً ناجیات و أتبعت
وظیفاً وظیفاً فوق مور معبّد
صھابیة العثنون موجدة القرا
بعیدة وخد الرجل موارة الید
وأتلع نھاض اذا صعدت به
کسکان بوصی بدجلة مصعد

جب غم و فکر مجھے گھیر لیتے ہیں تو میں انہیں تیز رفتار صبح شام سفر جاری رکھنے والی سانڈھنی پر سوار ہو کر دور کرتا ہوں یہ اونٹنی تیز رفتار نسلی سانڈھنیوں سے مقابلہ میں آگے نکل جاتی ہے۔ وہ پٹے ہوئے راستہ پر دوڑتے وقت پچھلے پاؤں کے نشانوں پر رکھتی ہے، اس کی ٹھوڑی کے بال صہاب نسل کے اونٹوں کی طرح بھورے ہیں، پیٹھ مضبوط ہے، اس کے قدم کا فاصلہ لمبا ہوتا ہے، اور ہاتھ بہت پھرتی سے چلتے ہیں اس کی گردن لمبی اور اوپر اٹھی رہتی ہے، جب وہ اسے اونچا کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ دجلہ کی چڑھائی میں چلنے والی کشتی کے اگلے سرے پر رخ پھیرنے کا پنکھا ہو۔

بعد ازاں اس کا موضوع سخن اپنی ذات کی مدح سرائی کی طرف پلٹ جاتا ہے وہ زمانۂ امن میں خود کو کھیل کود اور تفریحوں کا عادی اور ایام جنگ میں اپنے آپ کو خطروں میں ڈالنے خوگر بتاتا ہے:۔

اذا القوم قالوا من فتی؟ خلت أننی
عنیت فلم أکسل ولم أتبلد
ولست بحلال التلاع مخافة
ولکن متی یسترفد القوم أرفد
فان تبغنی فی حلقة القوم تلقنی
وان تلتمسنی فی الحوانیت تصطد

جب قوم کہتی ہے "کہ ہے کوئی بہادر جوان مرد؟" تو میں خیال کرتا ہوں کہ اس آواز سے میری ہی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، پھر میں نہ تو سستی کرتا ہوں نہ بدحواس ہوتا ہوں، میں (میزبانی کے خوف سے) چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر پڑاؤ نہیں ڈالتا، بلکہ جب لوگ مجھ سے امداد طلب کرتے ہیں تو میں ان کی مدد کرتا ہوں، اگر تم میری تلاش قومی مجلسوں میں کروگے تو وہاں مجھے پاؤ گے، اور اگر مے خانوں میں مجھے ڈھونڈو گے تو وہاں بھی مجھے شکار کر لوگے۔

وما زال تشرابی الخمور و لذتی
وبیعی وانفاقی طریفی و متلدی

الی أن تحامتنی العشیرة کلّها
و أُفردت افراد البعیر المعبّد
رأیت بنی غبراء لا ینکروننی
ولا أهل هذاك الطراف المُمَدّد

میری آرام دوستی، شراب نوشی، موروثی اور ذاتی مال کو فروخت کرنے اور اسے بے دریغ خرچ کرنے کی عادتیں مجھ سے نہ چھوٹ سکیں تاآنکہ تمام خاندان مجھ سے برگشتہ ہوگیا، اور میں اس خارشتی اونٹ کی طرح تنہا کر دیا گیا جسے کول تار مل کر گلہ سے نکال دیا جاتا ہے۔ میں مقبول عوام و خاص ہوں، خاک نشیں قلندر بھی مجھے جانتے ہیں اور شاندار اونچے خیموں میں رہنے والے (امیر) بھی میرے احسان و شرف کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرتے۔

ألا أیّهذا الزاجری أحضر الوغی
و أن أشهد اللذات هل انت مخلدی؟
فان کنت لا تستطیع دفع منیّتی
فدعنی أبادرها بما ملکت یدی

اے مجھے جنگ میں شرکت کرنے ...... اور دلچسپیوں میں مصروف رہنے پر ملامت کرنے والے! کیا تو مجھے ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھ لے گا؟ اگر تو میری موت کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر مجھے موت سے پہلے میرے مال سے فائدہ اٹھا لینے دے۔

پھر نہایت سچائی اور بے باقی سے یہ اعلان کرتا ہے کہ دنیا میں اس کے صرف تین مقاصد ہیں، مے نوشی عشق و محبت، اور ہمدردی و جوانمردی اور اگر یہ تین محبوب مشغلے نہ ہوتے تو اسے نہ زندگی کی تمنا ہوتی نہ موت کا خطرہ:۔

ولولا ثلاث هن من عیشة الفتی
لعمرك لم احفل متی قام عودی
فمنهن سبقی العاذلات بشربة
کمیت متی ما تعل بالماء تزبد
وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب
ببهکنة تحت الخباء المعمد
وکری اذا نادی المضاف محنّبا
کسید الغضا ذی السورة المتورّد

اور اگر وہ تین مشغلے نہ ہوں جو جوان مرد کے لیے سامان زیست ہیں تو تیری عمر کی قسم مجھے میرے پرسان حال تیمار داروں کی کوئی پرواہ نہ ہوتی کہ کب وہ (مایوس ہوکر) کھڑے ہوتے ہیں (یعنی مجھے اپنے

مرنے کی کوئی فکر نہ ہوتی) ان میں سے ایک تو صبح اٹھتے ہی ــ جبکہ ملامت کرنے والیاں بھی نہ جاگی ہوں ــ ایسی ارغوانی تیز شراب کا دور چلانا ہے کہ جب اس میں پانی ملایا جائے تو وہ جھاگ مارنے لگے۔ دوسرا مشغلہ نازک خوش اندام معشوقہ کے ساتھ اونچے ستونوں والے خیمہ میں گھٹا چھائے ہوئے دن کو عیش سے گذار کر چھوٹا کرنا ہے۔ اور گھٹا سب ہی کو بھلی لگتی ہے۔ اور تیسرا مشغلہ یہ ہے کہ میں خوفزدہ کی فریاد پر اس کی مدد کے لیے اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر اس قدر تیزی سے پہنچوں جیسے غضبناک بھیڑیا جو پانی پر اتر رہا ہو اور اسے چونکا دیا جائے۔

پھر مختصر و ناپائیدار زندگی میں جلدی جلدی مزے اٹھا لینا، موت سے پہلے اپنے دل کے ارمانوں کو، بیدریغ مال خرچ کرنا، اور خطروں میں کود پڑنا، اسے بخل اور موت کے فلسفہ کی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ کہتا ہے۔

أرى قبر نحّام بخيل بماله
كقبر غويّ في البطالة مفسد
أرى الموت يعتام الكرام ويصطفي
عقيلة مال الفاحش المتشدّد
أرى العيشَ كنزًا ناقصًا كُلَّ ليلة
وما تنقص الأيام والدهر ينفد

مجھے تنگ دل بخیل، اور آوارہ و فضول خرچ آدمی کی قبریں ایک جیسی نظر آتی ہیں میں دیکھتا ہوں کہ موت شریف اور سخی انسان کو چن لیتی ہے اور حد سے زیادہ بخیل کے چھینے مال کو بھی پسند کر لیتی ہے، میری نظر میں زندگی ایک ایسا خزانہ ہے جو ہر رات کے گذرنے سے گھٹتا رہتا ہے، دن اور رات کا یہ چکر چلتا رہتا رہے گا اور ہمارا زمانہ ختم ہو جائے گا۔

لعمرك ان الموت ما اخطأ الفتى
لكا لطول المرخى وثنياه باليد
متى ما يشأ يوما يقده لحتفه
ومن يلك في حبل المنية ينقد

تیری زندگی کی قسم! موت سے انسان کے بچ رہنے کی مثال ایسی ہے جیسے ڈھیل چھوڑی ہوئی لگام جس کے دونوں کنارے (سوار کے) ہاتھ میں تھمے ہوئے ہوں، جب بھی وہ چاہے تو اسے موت کی طرف ہانک کر لے جاسکتی ہے، اور جو موت کی رسیوں میں بندھا ہوا ہو وہ ضرور کھنچتا چلا جائے گا۔

پھر شاعر اپنے چچا کے بیٹے پر غصہ ہوتا ہے، اپنی قوم کی حق تلفی کا شکوہ کرتا ہے، اور اپنی ثابت قدمی داولوالعزمی کی تعریف کرتا ہے۔

تمالى ادانى و ابن عمى مالكا
متى أدن منه ينأ عنى و يبعدا
و ظلم ذوى القربى اشدّ مضاضة
على المرء من وقع الحسام المهنّد
أرى الموت أعدادالنفوس ولا أرى
بعيدا غداً ما اقرب اليوم من غد

یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ میرا چچازاد بھائی مالک جب میں اس سے قریب ہوتا ہوں تو وہ مجھ سے کھنچتا ہی چلا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ رشتہ داروں کا ظلم اور ان کی بے رخی دل پر تیز تلوار کے گھاؤ سے بھی زیادہ گراں گذرتی ہے۔ میں موت کی تعداد انسانوں کی تعداد کے برابر پاتا ہوں آنے والا کل مجھے دور نظر نہیں آتا، امروز و فردا کس قدر ملے ہوئے اور قریب ہیں!

أنا الرجل الضرب الذى تعرفونه
خشاش كرأس الحية المتوقد
اذا ابتدرالقوم السلاح وجدتنى
منيعاً، اذا بلّت بقائمه يدى

میں ہی وہ مستعد شخص ہوں جسے تم جانتے ہو جو سانپ کے متحرک پھن کی طرح ہر وقت ہوشیار رہتا ہے، جنگ کے موقع پر جب لوگ تیزی سے ہتھیاروں کو اٹھاتے ہیں، تم مجھے دیکھو گے کہ تلوار کے دستہ کو ہاتھ میں مضبوط پکڑ کر میں محفوظ و بے خوف ہو جاتا ہوں، میرا ہاتھ اس کے دستہ کی گرفت سے پسینہ سے تر ہو جاتا ہے۔

فلو كنت وغلاً فى الرجال لضرّنى
عداوة ذى الأصحاب والمتوحد
ولكن نفى عنى الرجال جراءتى
عليهم واقدامى وصدقى و محتدى
ستبدى لك الأيام ماكنت جاهلاً
ويأتيك بالاخبار من لم تزود

ہاں اگر میں کوئی بن بلایا مہمان (حقیر شخص) ہوتا تو اس وقت مجھے ان لوگوں کی دشمنی سے نقصان پہنچتا جن کے ساتھ جماعت ہے یا جو اکیلے ہیں۔ لیکن میری بے باکی، دلاوری و پیش قدمی، راست بازی، اور خاندانی عزت و بزرگی ایسی چیزیں ہیں جو لوگوں کو میرے مقابلہ میں آنے سے ہٹا دیتی ہیں، زمانہ خود بخود وہ باتیں تمہارے سامنے کھول کر رکھ دے گا جن سے تم بے خبر تھے، اور وہ شخص تم کو اطلاعات پہنچائے گا جس کو تم نے کبھی توشہ (صلہ) بھی نہیں دیا۔

۷۔ عمرو بن کلثوم

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات

عمرو بن کلثوم بن مالک تغلبی نے جزیرہ فرات میں قبیلۂ تغلب کے معزز و باحسب لوگوں میں پرورش پائی، جوان ہونے پر وہ بڑے لوگوں کی طرح خود دار، غیور، بہادر اور فصیح و خوش گفتار ہوگیا، پندرہ برس کا بھی نہ ہوتے پایا تھا کہ اپنی قوم میں معزز اور قبیلہ کا سردار بن گیا۔ بسوس کی وجہ سے بکر و تغلب کے دو خاندانوں میں لڑائیاں ہوتی تھیں ان میں یہی روح رواں تھا، جس نے پوری مستعدی و جانبازی سے ان لڑائیوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ بالآخر دونوں قبیلوں نے متفقہ طور پر آل منذر کے شاہان حیرہ میں سے ایک بادشاہ عمرو بن ہند کے ہاتھ پر صلح کر لی، مگر یہ صلح کچھ زیادہ مدت تک باقی نہ رہی اور جلد ہی ان کے سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی ان کی رگ حمیت پھڑ کنے لگی، حتیٰ کہ انہوں نے عمرو بن ہند کے دربار ہی میں جھگڑنا شروع کر دیا۔ بکر قبیلہ کا مشہور شاعر حارث بن حلزہ کھڑا ہوا، اور اپنا شہرہ آفاق معلقہ وہاں پڑھ کر سنایا۔ جس کی وجہ سے بادشاہ کی نظر عنایت اس کی قوم کی طرف ہوگئی، حالانکہ پہلے وہ تغلبیوں کا طرف دار تھا، اس پر عمرو بن کلثوم بادشاہ سے ناراض ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ بادشاہ نے اپنے خاص درباریوں سے پوچھا۔ عرب میں کوئی ایسا شخص تم بتا سکتے ہو جس کی ماں میری خدمت کرنا ذلت و عار سمجھے؟" انہوں نے جواب دیا "عمرو بن کلثوم کی ماں لیلیٰ کے سوا ہمیں ایسی کوئی عورت نظر نہیں آتی، اس لیے کہ اس کا باپ مہلہل بن ربیعہ ہے، چچا کلیب وائل ہے، شوہر کلثوم بن عتاب عرب کا جوان مرد شہسوار ہے اور اس کا بیٹا عمرو بن کلثوم اپنی قوم کا مایۂ ناز سردار ہے"۔ اس پر عمرو بن ہند نے عمرو بن کلثوم......... کو بلوایا اور یہ کہلا بھیجا کہ میری ماں سے اپنی ماں کی ملاقات کراؤ۔ چنانچہ عمرو تغلب کی ایک جماعت کے ہمراہ اپنی ماں کو لے کر جزیرہ سے عمرو بن ہند کی ملاقات کے لیے پہنچا، بادشاہ نے فرات و حیرہ کے درمیان شامیانے تنوائے، اپنی حکومت کے امراء و رؤساء کو بھی بلوایا اور وہ سب وہاں جمع ہوگئے۔ ادھر عمرو بن ہند نے اپنی ماں کو سکھا دیا تھا کہ تم لیلیٰ بنت مہلہل سے کوئی کام کرنے کے لیے کہنا۔ جب لیلیٰ شامیانہ میں جا کر اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ گئی تو بادشاہ کی ماں نے اس سے کہا "وہ سینی مجھے اٹھا کر لا دو"۔ لیلیٰ نے عزت و وقار برقرار رکھتے ہوئے کہا "جسے کوئی کام ہو وہ اپنا کام خود کرے"، جب بادشاہ کی ماں نے زیادہ اصرار کیا تو لیلیٰ چلائی "ہائے میری ذلت!!" یہ آواز اس کے بیٹے نے سن لی اور وہ برافروختہ ہو کر اٹھا اور عمرو بن ہند (بادشاہ) کو وہیں بھرے دربار میں قتل کر دیا، پھر فوراً ہی جزیرہ واپس چلا گیا، وہاں پہنچ کر اپنا مشہور معلقہ (قصیدہ) کہا، اس قصیدہ کی ابتداء تغزل اور ذکر مے سے کی ہے، پھر عمرو بن ہند کے ساتھ جو کچھ گذرا اس کا بیان ہے ساتھ ہی اپنی اور اپنی قوم کی عزت اور بڑائی کا فخریہ تذکرہ ہے، یہ قصیدہ مجلسوں میں کثرت سے پڑھا گیا اور زبان زد خاص و عام ہوگیا۔ خاص طور پر خاندان تغلب میں اس قصیدہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور انہوں نے اسے خوب گایا، اور عوام میں پھیلایا۔ اس کی شہرت و مقبولیت کو دیکھتے

ہوئے ایک شاعر نے کہا ہے:۔

ألهى ابنى تغلب عن كل مكرمة　　قصيدة قالها عمرو بن كلثوم

يفاخرون بها مذ كان أولهم　　يا للرجال لشعر غير مسئوم

عمرو بن کلثوم کے قصیدہ نے خاندان تغلب کو اس درجہ سرفراز کر دیا ہے کہ اب ان کو مزید کسی قسم کے کارنامے انجام دینے کی ضرورت نہیں ہے، اس قصیدہ کے ذریعہ خاندان تغلب اپنے جد اعلیٰ پر فخر و ناز کرتے رہیں گے۔ اے لوگو! دیکھو یہ ہے وہ شاعری جس سے کبھی دل برگشتہ اور سیر نہیں ہوتا۔

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں اس کا انتقال ہوا۔

اس کی شاعری:۔ عمرو بن کلثوم برجستہ گو شاعر تھا، اس کا طرز بیان اور مضمون نہایت پاکیزہ و بلند ہوتا ہے۔ یہ کم گو شاعر ہے۔ اس نے شاعری کی بہت سی صنفوں میں طبع آزمائی نہیں کی۔ نہ اپنی فطری قابلیت کو آزاد چھوڑا، نہ اپنی خداداد طبیعت کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ اس کی شاعری کی کل کائنات ایک تو اس کا یہی مشہور معلقہ ہے۔ باقی کچھ دوسرے قطعات ہیں جن کا موضوع معلقہ کے موضوع سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ

اس کے معلقہ کے کچھ اشعار:۔

أبا هند فلا تعجل علينا　　وأنظرنا نخبرك اليقينا

بأنا نورد الرايات بيضاً　　ونصدرهن حمرا قد روينا

ورثنا المجد عن عليا معد　　نطا عن دونه حتى يبينا

كأن سيوفنا منا ومنهم　　مخاريق بأيدى لاعبينا

اے ابو ہند! ہمارے خلاف فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرو۔ اور ہمیں مہلت دو تاکہ تمہیں حقیقت حال سے مطلع کریں۔ ہم لوگ سفید جھنڈے لے کر میدان جنگ میں اترتے ہیں، اور انہیں خون پلا کر (سرخ رنگ میں رنگ کر) واپس لاتے ہیں، ہم نے عزت و شرافت خاندان معد کے بزرگوں سے ورثہ میں پائی ہے، اور ہم اس عزت و شرافت کو باقی رکھنے کے لیے پوری طاقت سے مدافعت کریں گے تا آنکہ وہ سب پر آشکارا ہو جائے۔ ہماری تلواریں میدان جنگ میں اس طرح چلتی ہیں جیسے کھلاڑیوں کے ہاتھوں میں کاٹھ کی تلواریں۔

ألا لا يجهلن أحد علينا　　فنجهل فوق جهل الجاهلينا

بأى مشيئة عمرو بن هند　　تطيع بنا الوشاة وتزدرينا

فان قناتنا يا عمرو أعيت　　على الاعداء قبلك أن تلينا

خبردار! ہمارے ساتھ کوئی نادانی اور حماقت کرنے کی جرأت نہ کرے ورنہ ہم اس سے بڑھ چڑھ

کر اس کے ساتھ نادانی کریں گے۔ اے عمرو بن ہند! ہمارے چغلخوروں کی بات تو کیوں مان لیتا ہے اور ہمیں حقیر کیوں کرتا ہے؟ اے عمرو! ہماری مستحکم شرافت و بزرگی نے تجھ سے پہلے دوسرے دشمنوں کو بھی تھکا کر عاجز کر دیا مگر اس میں کوئی خلل نہ آیا۔

وقد علم القبائل من معد　　اذا قبب بأبطحها بنينا
بأنا المطعمون اذا قدرنا　　وأنا المهلكون اذا ابتلينا
وأنا المانعون لما أردنا　　وأنا النازلون بحيث شينا
وأنا التاركون اذا سخطنا　　وانا الآخذون اذا رضينا

معد کے قبیلے جانتے ہیں کہ جب ریگزاروں میں خیمے تانے جاتے ہیں تو ہم ہی غلبہ پانے کے بعد لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، اور ہم ہی جنگ میں جب ہم سے نبرد آزمائی کی جاتی ہے تو اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اور ہم جس چیز کو چاہتے ہیں سب پر پابند کر دیتے ہیں اور ہم جس زمین میں جانتے ہیں سب پر بند کر دیتے ہیں اور ہم جس زمین میں چاہتے ہیں، پڑاؤ ڈال دیتے ہیں اور ہم جس سے ناراض ہو جاتے ہیں اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور جس سے خوش ہو جاتے ہیں اسے مضبوط تھام لیتے ہیں۔

ونشرب ان وردنا الماء صفوا
ويشرب غيرنا كدراً وطينا
اذا ما الملك سام الناس خسفاً
أبينا أن نقر الذل فينا
لنا الدنيا ومن امنحى عليها
ونبطش حين نبطش قادرينا
ملأنا البر حتى ضاق عنا
وماء البحر نملأه سفينا
اذا بلغ الفطام لنا صبي
تخر له الجبابر ساجدينا

ہم جب گھاٹ پر اترتے ہیں تو صاف پانی پیتے ہیں اور ہمارے سوا دوسرے لوگ مٹی ملا ہوا گدلا پانی پیتے ہیں۔ جب کوئی بادشاہ لوگوں پر ظلم وستم ڈھاتا ہے تو ہم سختی سے اس کا ظلم برداشت کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ دنیا اور دنیا کے تمام باشندے ہمارے لیے ہیں، اور ہم جب کسی کی گرفت کرتے ہیں تو پوری قوت سے کرتے ہیں۔ خشکی کو ہم نے بھر دیا ہے حتیٰ کہ وہ ہماری گھنی آبادی کی وجہ سے تنگ ہو گئی ہے اور سمندر کے پانی کو ہم کشتیوں سے بھر دیتے ہیں۔ جب ہمارا بچہ دودھ چھوڑنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو بڑے بڑے سرکش و متکبر اس کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں۔

۸۔ حارث بن حلّزہ

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ ابو ظلیم حارث بن حلزہ یشکری بکری، کو خاندان بکر میں وہی مرتبہ و مقام حاصل تھا جو عمرو بن کلثوم کو خاندان تغلب میں۔ اس کی شہرت کا باعث وہ مشہور قصیدہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے وہ قصیدہ بادشاہ کے سامنے فی البدیہ کہا تھا، تاکہ اس کے ذریعہ بادشاہ کی ہمدردی و تائید اسے حاصل ہو جائے اور ان الزامات کا ازالہ بھی ہو جائے جو اس کی قوم پر لگائے گئے تھے۔ اس قصیدہ کے کہنے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بکر و تغلب کے قبیلوں نے عمرو بن ہند کے سامنے ہتھیار ڈال کر یہ طے کیا کہ وہ دونوں قبیلوں سے ضمانتیں لے کر مظلوم کو ظالم سے حق دلائے۔ اس موقع پر دونوں قبیلے ایک دوسرے پر الزامات اور تہمتیں لگانے لگے۔[1] تغلب قبیلہ نے بکر قبیلہ پر غداری کا الزام لگایا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ فریقین عمرو بن ہند کے سامنے زبانی جھگڑے سے بڑھ کر ہاتھا پائی پر اتر آئے، بادشاہ تغلبیوں کی جانب مائل تھا اس جانبداری نے شاعر کے جذبات کو ابھارا، جو اس مجلس میں حاضر تھا، ایک دم وہ کھڑا ہوا اور اس نے برجستہ اپنا قصیدہ سنانا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ اپنی کمان سے ٹیک لگائے ہوئے تھا، کہتے ہیں کہ جوش غضب میں وہ اس قدر بے خود ہو گیا تھا کہ اس کا ہاتھ کٹ گیا اور اسے احساس تک نہ ہوا، قصیدہ میں اس نے بادشاہ کی مدح اس عمدگی سے کی کہ اسے اپنا ہم خیال بنا کر اپنے قبیلہ کا طرفدار بنا لیا، اور اس کے دل میں قبیلہ بکر کے سردار نعمان بن ہرم کی جلد بازی سے جو کینہ پیدا ہو چکا تھا اسے بھی فرو کر دیا۔ حارث نے بڑی لمبی عمر پائی حتی کہ اصمعی کا خیال ہے کہ اس قصیدہ کو سناتے وقت وہ ایک سو پینتیس (۱۳۵) برس کا تھا۔

اس کا پورا کلام جو ہمیں دستیاب ہو سکا ہے، اس میں معلقہ کے علاوہ چند قطعات ہیں، جن سے نہ تو اس کی ناموری کا سبب معلوم ہوتا ہے نہ اس کے طبقہ کا تعین کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا اس کی مثال اس بارے میں طرفہ اور عمرو بن کلثوم کی سی ہے۔ اس کا لمبا قصیدہ حسن ترتیب، سلاست اور نیرنگی مضامین کی بناء پر خوب مقبول ہوا۔ بالخصوص ایک ہی جگہ پر اس قدر طویل قصیدہ برجستہ کہے جانے کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا۔ ابو عمرو شیبانی کا تو کہنا ہے کہ اگر وہ اس قصیدہ کو ایک برس میں بھی کہتا تب بھی قابل ملامت نہ ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ کوڑھ میں مبتلا ہونے کی

---

[1] الزامات کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے تغلب کے ایک قافلہ کو اپنے کسی کام کے لیے روانہ کیا تھا اور وہ قافلہ تباہ ہو گیا، تغلبی کہتے تھے کہ ہمارے آدمی بکر قبیلہ کے کسی گھاٹ پر اُترے تھے جہاں سے ان کو بکر لوگوں نے بھگا کر جنگل میں پہنچا دیا اور وہ پیاسے مر گئے۔ بکر قبیلہ کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے ان کو پانی پلایا اور راہ پر لگا دیا تھا، لیکن وہ راستہ بھٹک گئے اور تباہ ہو گئے۔

وجہ سے حارث نے یہ قصیدہ پردہ کے پیچھے کھڑے ہو کر سنایا تھا، لیکن بادشاہ نے اس کی عزت افزائی اور شاعری کی داد دیتے ہوئے حکم دیا کہ درمیان سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ اس قصیدہ کی ابتدا اس نے تغزل سے کی ہے۔ بعد ازاں اپنی اونٹنی کی تعریف کی ہے۔ پھر تغلبیوں کو ان لڑائیوں کا طعنہ دیا ہے جن میں خاندان بکر ان پر غالب رہا۔ عرب کے قابل ذکر واقعات بھی بیان کیے ہیں، پھر عمرو بن ہند کی مدح کی ہے اور آخر میں بادشاہ کے سامنے اپنی قوم کی بڑائی اور اس کے بلند کارناموں کا فخریہ ذکر کیا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:

اپنے معلقہ میں وہ کہتا ہے:۔

ان اخواننا الأراقم یغلون
علینا فی قیلهم احفاء
یخلطون البریٔ منابذی الذنب
ولا ینفع الخلی الخلاء
ایها الناطق المرقش عنا
عند عمرو وهل لذاك بقاء؟
لا تخلنا علی غراتك انا
قبل ما قد وشی بنا الأعداء
فبقینا علی الشناءة تنمینا
حصون و عزة قعساء

ہمارے تغلبی بھائی ہم پر زیادتیاں کرتے ہیں اور اپنی بات پر بضد ہیں۔ ہمارے بے گناہ لوگوں کو وہ مجرموں میں شامل کر دیتے ہیں اور بری کا بے قصور ہونا اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ اے ہماری باتو کو بڑھا چڑھا کر رنگین کر کے عمرو بن ہند کے پاس بیان کرنے والے! کیا یہ حرکتیں زیادہ عرصہ تک باقی رہ سکتی ہیں؟ یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری باتیں لگانے کی وجہ سے ہم تم سے ڈر جائیں گے، تم سے پہلے بھی بہت سے دشمنوں نے ہماری شکایتیں اور چغلیاں کھائی ہیں، اور ان کی دشمنی کا ہم پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ سربلند عزت اور مضبوط قلعہ ہماری عزت و شوکت کو بڑھاتے ہی رہے۔

ملك مقسط و أفضل من یمشی
ومن دون ما لدیه الثناء
أیما خطة أردتم فأدّو
ها الینا تسعی بها الأملاء

فاتركو الطيخ والتعاشي واما
تتعاشوا نفي التعاشي الداء
واذكروا حلف ذي المجاز وماقدم
فيه العهود والكفلاء

وہ عادل بادشاہ ہے، زمین پر جتنے چلنے والے ہیں ان میں سب سے افضل و برتر ہے، اس کی جس قدر مدح و ستائش کی جاتی ہے وہ اس کی شان سے کمتر ہے۔ ہر وہ مشکل اور اہم مسئلہ جو تم چاہتے ہو ہمارے پاس لاؤ، شرفاء کی جماعتیں اس کے لیے کوشش کریں گی۔ غرور و تکبر اور تغافل چھوڑ دو اور اگر تم تغافل سے کام لوگے تو اس کا انجام برا ہوگا، اور ذوالمجاز کا معاہدہ یاد کرو نیز ان تمام عہدوں اور ضمانتوں کا خیال کرو جو وہاں پیش کیے گئے تھے۔

واعلموا اننا وایاکم فیما اشترطنا یوم اختلفنا سواء
اعلینا جناح کندة ان یغنم غازیهم ومنا الجزاء

اور جان لو کہ لڑائی کے دن فریقین اپنی شرطوں (کے توڑنے) میں برابر کے مجرم تھے، کیا کندہ قبیلہ کے اس جرم کا بدلہ کہ ان کا حملہ کرنے والا مال غنیمت لے جائے یہ ہے کہ ان کی بجائے ہم سے بدلہ لیا جائے۔

اپنے معلقہ میں کوچ کی تیاریوں کا منظر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:۔

اجمعوا امرهم عشاء فلما اصبحوا اصبحت لهم ضوضاء
من مناد ومن مجیب ومن تصهال خیل خلال ذاك رغاء

انہوں نے شام ہی کو اپنے سفر کا پختہ عزم کر لیا اور تیاریاں کر لیں، جب صبح ہوئی تو ایک ہنگامہ بپا تھا، کوئی آواز دے کر پکار رہا تھا کوئی جواب دے رہا تھا، گھوڑے ہنہنا رہے تھے اور انہی کے بیچ میں اونٹوں کے بڑبڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اس کے معلقہ کے دیگر اشعار:۔

لا یقیم العزیز بالبلد السهل ولا ینفع الذلیل النجاء
لیس ینجی موائلا من حذار رأس طود وحرة رجلاء

معزز بلند مرتبہ شخص نرم و نشیبی علاقہ میں اقامت نہیں کرتا، اور ذلیل کو بھاگ کر بچ نکلنا کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا، خوف و خطر سے چھٹکارا سے چاہنے والے کو نہ تو پہاڑ کی چوٹی میں پناہ مل سکتی ہے اور نہ دشوار گذار سیاہ کنکریوں والے میدان میں۔

۹۔ لبید بن ربیعہ

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ پورا نام ابوعقیل لبید بن ربیعہ عامری ہے۔ اس نے جود و سخا اور جنگی ماحول میں پرورش پائی۔ اس کا

باپ ربیعہ پریشان حالوں کا ملجا و ماویٰ تھا۔ اس کا چچا ملاعب الاسنہ (نیزوں سے کھیلنے والا) قبیلہ مضر کا نامور و بہادر شہسوار تھا۔ اس کے شعر کہنے کا سبب یہ ہوا کہ ربیع بن زیاد جو عبس (شاعر کے ننھیالی خاندان) کا سردار تھا، نعمان بن منذر کے دربار میں گیا اور وہاں بنو عامر (شاعر کی قوم) کا برے الفاظ سے ذکر کیا، چنانچہ جب بنو عامر کا وفد ملاعب الاسنہ کی زیر قیادت بادشاہ کے دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے اس وفد کو بلند مقام نہ دیا، اور ان سے بے رخی برتی۔ اس سلوک سے بنو عامر کو سخت صدمہ پہنچا، اس زمانہ میں لبید کم سن تھا۔ اس نے وفد کے اراکین سے درخواست کی کہ وہ اپنے معاملہ میں اسے بھی شریک کرلیں، لیکن کم سنی کے باعث انہوں نے اسے اپنا شریک بنانے سے انکار کر دیا مگر جب وہ بار بار اصرار کرتا رہا تو ان لوگوں نے اس کی درخواست قبول کرلی، اس نے وفد سے عہد کیا کہ وہ ربیع کی ایسی سخت ہجو کہے گا جس کے بعد بادشاہ اسے اپنی مجلس میں شامل نہ کرے گا۔ لوگوں نے کہا "ہجو کہنے سے قبل ہم تمہاری قوت بیان کا امتحان لیں گے۔" اس نے کہا "وہ کیسے؟" انہوں نے کہا "پہلے تم اس بوٹی کی برائیاں بیان کرو" اس وقت ان کے سامنے ایک باریک شاخوں، کم پتوں والی زمین پر بچھی ہوئی تربہ نام کی بوٹی تھی۔ چنانچہ اس نے فوراً کہا "یہ تربہ بوٹی نہ آگ جلانے کے کام آتی ہے نہ گھر میں لگائی جاتی ہے، نہ کسی کے لیے مسرت کا باعث ہے، اس کی لکڑی کمزور ہے، اس کے فوائد کم ہیں، شاخیں چھوٹی، چاروں میں سب سے بدتر چارہ، اور مشکل سے اکھڑنے والی ہے۔" اس پر انہوں نے لبید کو ہجو گوئی کی اجازت دے دی چنانچہ اس نے ایک نہایت تیز چبھتی ہوئی ہجو یہ رجز کہی جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے:۔

مهلاً ، ابيت اللعن ، لا تاكل معه

بادشاہ سلامت! ذرا ٹھہریے اور غور فرمایے، خدا آپ کو بلند اقبال کرے، اس کے ساتھ کھانا نہ کھایے۔

اس رجز کو سننے کے بعد بادشاہ ربیع سے دل برداشتہ ہوگیا، اسے اپنے دربار سے نکال دیا اور عامریوں کو اعزاز و احترام سے نواز کر اپنا مقرب بنا لیا۔ کہتے ہیں یہی لبید کی وہ پہلی رجز تھی جو اس کی شہرت کا باعث بنی۔ بعد ازاں لبید قطعات اور طویل منظومات کہتا رہا تا آنکہ دعوت اسلام ظاہر ہوئی اور وہ اپنی قوم کے ایک وفد میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے قرآن مجید حفظ کیا اور شاعری ترک کر دی، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس نے اسلام لانے کے بعد صرف ایک ہی شعر کہا تھا اور وہ یہ ہے:۔

الحمد لله اذ لم يأتني أجلي

حتى لبست من الاسلام سربالا

خدا کا نہایت احسان و شکر کہ اس نے مجھے جامۂ اسلام سے ملبوس کیے بغیر نہ مارا۔

یہی سبب ہے کہ وہ اسلام کے بعد طویل عمر پانے کے باوجود جاہلی شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کی خلافت میں جب کوفہ کا شہر بسایا گیا تو لبید وہاں چلا گیا اور وہیں مقیم ہوگیا۔ اس کی

وفات معاویہؓ کی خلافت کے اوائل ۴۱ھ میں ہوئی اور جیسا کہ مشہور ہے اس نے ایک سو پینتالیس برس کی عمر پائی تھی۔ خود اس کا شعر ہے :۔

ولقد سئمت من الحیاة وطولها
وسؤال هذا الناس کیف لبید؟

حقیقت یہ ہے کہ میں زندگی اور اس کے طول سے اکتا گیا ہوں اور لوگوں کے بار بار یہ پوچھنے سے (تنگ آگیا ہوں) کہ لبید کا کیا حال ہے ؟

لبید بڑا فیاض، نہایت دانا، شریف النفس، پیکر و مہر و مروت، اور بہادر تھا۔ یہی اس کے اخلاق و جذبات ہیں جو اس کی شاعری میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ اس کی شاعری فخریہ شاعری اور شرافت و کرم کا مرقع ہے۔ اس کی نظم کی عبارت پر شوکت، الفاظ کی ترتیب خوشنما ہے، جس میں بھرتی کے الفاظ نہیں۔ وہ حکمت عالیہ، موعظت حسنہ اور جامع کلمات سے مزین ہے، ہمارا خیال ہے کہ مرثیہ نگاری اور صابر و محزون کے جذبات کی عکاسی کے لیے جو مناسب الفاظ اور پر اثر اسلوب وہ اختیار کرتا ہے اس میں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

اس کے معلقہ کے الفاظ پر زور ہیں اور اسلوب پختہ، وہ بدوی زندگی اور بدویوں کے اخلاق و عادات کی منہ بولتی تصویر ہے۔ نیز اس میں عاشقوں کی شوخیوں اور اور اولوالعزم لوگوں کے بلند مقاصد کا وصف بھی ہے۔

اس نے اپنے معلقہ کی ابتدا کھنڈروں کے وصف اور محبوبہ کی یاد سے کی ہے۔ پھر طرفہ کی طرح اپنی اونٹنی کا طویل وصف کیا۔ پھر اپنی زندگی، اپنے پسندیدہ مشاغل، تفریحات، فیاضی و شجاعت کا ذکر کرتے ہوئے معلقہ کو اپنے قومی فخر پر ختم کر دیا۔ لیکن اس تمام تفصیل میں راستی، خلوص اور اعتدال کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

اس کی شاعری کا نمونہ :۔

اس کے معلقہ کے اشعار :۔

انا اذا التقت المجامع لم یزل
منا لزاز عظیمة جشامها
ومقسم یعطی العشیرة حقها
ومغذمر لحقوقها هضامها
من معشر سنّت لهم اباؤهم
ولکل قوم سنّة و امامها

جب مختلف جماعتیں باہم ملتی ہیں تو اہم معاملات کو ذمہ داری سے اٹھانے والا اور بڑے کام

کا حریف ہمیشہ ہمیں میں سے ہوتا ہے، ہمیں میں عادل سردار بھی ہوتا ہے جو قبیلہ کو اس کا حق عطا کرتا ہے اور ہمیں میں سے وہ مطلق العنان وخودرائے اور تند خو سردار ہوتا ہے جو قبیلہ کے حقوق غصب کر لیتا ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں جن کے بزرگوں نے ان کے لیے ایک طریق کار بنا دیا ہے اور ہر قوم کا ایک طریق کار، دستور اور رہنما ہوتا ہے۔

لا یطبعون ولا یبور فعالهم
اذ لا تمیل مع الهوی احلامها
فاقنع بما قسم الملیك فانما
قسم الخلائق بیننا علامها

ہم وہ لوگ ہیں جو عیب ونقائص سے مبرا ہیں اور جن کے کارنامے کبھی فنا نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ ہماری عقلیں خواہشات (نفس امارہ) کے تابع نہیں ہیں خدا نے جو تقسیم کر دی ہے اس پر قانع رہو اس لیے کہ ہمارے درمیان اخلاق وعادات کی یہ تقسیم بڑے دانا وبینا نے کی ہے۔

واذا الأمانة قسمت فی معشر
اوفی بادفر حظنا قسامها
فبنی لنا بیتاً رفیعاً سمکه
فسما الیه کهلها وغلامها
وهم السعاة اذا العشیرة أُفظعت
وهم فوارسها وهم حکامها
وهم ربیع للمجاور فیهم
والمرملات اذا تطاول عامها

اور جب لوگوں میں امانت کی گئی تو ہمیں قسام ازل نے ہمارا پورا پورا حصہ دیا۔ چنانچہ اس نے ہمارے لیے (مجد وسروری کا) بلند چھت والا مکان بنایا اور ہمارا نوعمر اور ادھیڑ عمر فرد اس بلندی سے سرفراز ہوا۔ جب قبیلہ کو خوف وخطر درپیش ہوتا ہے تو وہی اس کے درد کا درماں ہوتے ہیں۔ وہی اس کے جانباز شہسوار اور وہی اس کے فرماں روا ہوتے ہیں، قحط کے زمانہ میں جب مصیبت کے ایام کاٹے نہیں کٹتے پناہ گزینوں اور رانڈوں بیواؤں کے لیے ان کا وجود فصل بہار کی طرح وجہ شادابی بنتا ہے۔

اپنے بھائی اربد کے مرثیہ میں کہتا ہے:-

بلینا وما تبلی النجوم الطوالع
وتبقی الدیار بعدنا والمصانع
وقد کنت فی اکناف جار مضنّة
ففارقنی جار باربد نافع

فلا جزع ان فرق الدهر بيننا
فكل امرئ يوما به الدهر فاجع

ہم مرٹے لیکن روشن ہونے والے تارے جوں کے توں چمکتے رہیں گے۔ ہم نہیں ہوں گے لیکن ہمارے بعد ہمارے گھر اور بستیاں، کارخانے وغیرہ باقی رہ جائیں گے۔ میں ایک جان سے عزیز پڑوسی کے سایۂ عاطفت میں تھا اور اربد کی جدائی کے باعث مجھ سے میرا فائدہ پہنچانے والا پڑوسی جدا ہوگیا۔ اگر ہمارے درمیان زمانہ نے جدائی ڈال دی ہے تو میں گھبرا کر ہمت ہارنے والا نہیں کیونکہ زمانہ تو ایک نہ ایک دن ہر ایک کو نیست و نابود کرکے دکھ پہنچائے گا۔

وما الناس الا كالديار واهلها
بها يوم حلوها وراحوا بلاقع
وما المرء الا كالشهاب وضوئه
يحور رمادا بعد اذهو ساطع
وما المال والأهلون الا ودائع
ولابد يوماً ان ترد الودائع
وما الناس الاعاملان فعامل
يتبرما يبني وآخر رافع
فمنهم سعيد آخذ بنصيبه
ومنهم شقي بالمعيشة قانع
لعمرك ما تدري الضوارب بالحصى
ولا زاجرات الطير ما الله صانع

دنیا میں انسانوں کی مثال گھروں میں رہنے والوں کی سی ہے کہ جب وہ گھروں میں بستے ہیں تو آبادی ہو جاتی ہے اور جب وہ گھروں کو خالی کرکے وہاں سے چلے جاتے ہیں تو وہ کھنڈر بن جاتے ہیں آدمی کی مثال شرارے اور اس کی روشنی کی سی ہے جو ابھر کر چمکنے کے بعد راکھ بن جاتا ہے۔ مال وعیال تو صرف امانتیں ہیں اور امانتوں کو بہر حال ایک دن ضرور واپس کر دیا جائے گا۔ دنیا میں دو قسم کے انسان پائے جاتے ہیں ایک وہ جو عمارت کو ڈھاتا ہے اور دوسرا وہ جو عمارت کو بلند کرتا ہے ۔ ان میں خوش نصیب ہیں جو اپنا حصہ پورا لے لیتے ہیں اور بد نصیب ہیں جو معمولی گذران پر قانع رہتے ہیں۔ تیری عمر کی قسم! کنکری مار کر یا پرندوں کو اڑا کر فال اور شگون لینے والیاں یہ نہیں جانتیں کہ اللہ تعالے کیا کرنے والا ہے؟

۱۰۔ حاتم طائی

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات: حاتم بن عبد اللہ بن سعد بن حشرج طائی، ابھی بچہ ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اس کی تربیت اس کی ماں نے کی، جو بہت مالدار ہونے کی ساتھ نہایت سخی بھی تھی۔ وہ اپنے مال میں سے کچھ باقی نہ چھوڑتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کے بھائیوں نے اس کے تمام مال کو روک لیا اور اسے سال بھر تک قید میں رکھا تاکہ اس طرح فاقہ اور تنگی کا مزہ چکھا کر اسے مال کی صحیح قدر و قیمت بتا دیں، پھر جب انہوں نے اسے چھوڑ کر اس کے مال کا کچھ حصہ اسے دے دیا اور اس کے پاس قبیلۂ ہوازن کی ایک عورت امداد طلب کرنے کے لیے آئی تو اس نے وہ تمام مال اسے دے دیا، اور اس سے کہا "بھوک کی تکلیف کا تجربہ ہونے پر میں نے قسم کھا لی ہے کہ سائل سے کوئی چیز بھی بچا کر نہ رکھوں گی"۔

اس فیاض ماں کی تربیت نے سخاوت کا دودھ پلا کر اسے بڑا کیا اور اسی خصلت کو اسے میراث میں دیا۔ جوان ہو کر وہ بڑا سخی ہو گیا، سخاوت ہی اس کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھی۔ سخاوت میں وہ اس درجہ حد سے متجاوز ہو گیا کہ وہ جنون کی حد پر پہنچ گئی۔ بچپن میں جب وہ اپنے دادا کے ساتھ رہتا تو اپنا کھانا لے کر باہر نکل جاتا، اگر کوئی ساتھ کھانے والا مل جاتا تو اس کے ساتھ کھانا کھا لیتا ورنہ کھانا پھینک آتا۔ کھانے کی یہ بربادی اس کے دادا کو بری لگی اور اس نے اس کے ذمہ اونٹوں کی نگرانی کا کام لگا دیا۔ ایک دن عبید بن الابرص، بشر بن حازم، نابغہ ذبیانی، نعمان کے پاس جاتے ہوئے راستہ میں اس کے پاس سے گذرے اور اس سے مہمانی کرنے کے لیے کہا۔ حاتم ان میں سے کسی کو نہ پہچانتا تھا، تاہم اس نے ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک اونٹ ذبح کر دیا۔ پھر جب انہوں نے اسے اپنے نام بتائے اور تعارف کرایا تو اس نے اپنے تمام اونٹ جو تقریباً تین سو تھے ان میں بانٹ دیے، اور نہایت خوش خوش اپنے دادا کے پاس آ کر کہا: میں نے لافانی عزت و سرداری کا ہار آپ کے گلے میں ڈال دیا ہے"۔ پھر اپنے دادا کو تمام قصہ سنا دیا۔ دادا نے یہ کارنامہ سن کر کہا بس اب سے تم میرے ساتھ نہیں رہو گے"۔ حاتم نے کہا "مجھے اس کی کوئی پروا نہیں"۔ پھر یہ اشعار کہے:۔

وانی لعف الفقر مشترك الغنی
وتارك شكل لا يوافقه شكلی
واجعل مالی دون عرضی جُنّته
لنفسی واستغنی بما كان من فضلی
وما ضرّنی ان سار سعد باهله
وافردنی فی الدار لیس معی اهلی

میں مفلسی و ناداری میں لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہوں اور تونگری و آسودگی میں ان کے ساتھ مل جل کر رہتا ہوں اور اس شکل کو چھوڑ دیتا ہوں جو مجھ سے ہم آہنگ نہیں ہوتی، میں اپنی آبرو کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے مال اپنے لیے سپر بنا لیتا ہوں اور جو بچ رہتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی دکھ نہیں پہنچا کہ سعد (دادا) اپنے گھر بار کو لے کر چلا گیا اور مجھے گھر میں تن تنہا چھوڑ دیا۔

حاتم کی سخاوت کے چرچے گھر گھر عام، اور اس کی فیاضی کی داستانیں ضرب المثل ہوگئیں اس سلسلہ میں اس کے عجیب و غریب قصے بیان کیے جاتے ہیں جن میں سے اکثر زیب داستان کے لیے بڑھا لیے گئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے راویوں نے امیہ کے اشعار دین میں عنترہ کے فخر و حماسہ میں، ابوالعتاہیہ کے زہد و ورع میں ابو نواس کے بے باکی و بے حیائی اور مزاح میں گھڑ لیے ہیں۔ وہ پہلے کسی بنا پر کچھ شعر موزوں کر لیتے اور پھر اس شاعری کے مضامین جس شاعر کے کلام سے مناسبت رکھتے انہیں اس شاعر کی طرف منسوب کر دیتے[1]

---

[1] ان قصوں میں سے ایک قصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں جو حاتم طائی کی ایک بیوی نوار یا ماویہ سے منسوب ہے۔ بلاغت تعبیر اور خوبیٔ عکاسی اس واقعہ کی مابہ الامتیاز صفات ہیں۔ یہ کہانی ہوگو کے دیوان "رفتار زمانہ" کی اس نظم سے ملتی جلتی ہے جس کا عنوان ہے "مفلس لوگ"۔ قصہ بیان کرنے والی کہتی ہے:۔

ایک سال ایسا سخت قحط پڑا کہ زمین سوکھ کر پھٹ گئی۔ فضا گرد آلود ہوگئی۔ اونٹوں کے پیٹ پسلیوں سے لگ گئے۔ ماؤں کی چھاتیاں سوکھ گئیں اور وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے میں بخل کرنے لگیں۔ قحط سالی نے جانوروں کا صفایا کر ڈالا۔ ہمیں اپنی تباہی اور موت کا یقین آ چکا تھا، ایک انتہائی سرد رات میں جو قحط کی وجہ سے لمبی معلوم ہو رہی تھی ہمارے بچے عبداللہ، عدی اور سفانہ بھوک سے بلبلانے لگے۔ حاتم دونوں لڑکوں کو، اور میں بچی کو، بہلانے لگے۔ بخدا رات کا معتد بہ حصہ گذرنے کے بعد بچے بمشکل خاموش ہو سکے۔ پھر حاتم اپنی باتوں سے میری دلبستگی کا سامان کرنے لگا۔ میں اس کا مقصد سمجھ گئی اور جھوٹ موٹ سو گئی۔ جب رات کا بڑا حصہ گذر چکا تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے خیمہ کا ایک پردہ اٹھایا پھر چھوڑ دیا۔ حاتم نے کہا "کون ہے؟" عورت کی آواز آئی "میں آپ کی فلاں پڑوسن، اپنے بچوں کو بھوک کی وجہ سے بھیڑیوں کی طرح چیختا چلاتا چھوڑ کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ ابو عدی! مجھے تیرے سوا ان بچوں کا کوئی آسرا نظر نہ آیا"، حاتم نے کہا "جا، اپنے بچوں کو لے آ، خدا نے تیرا اور تیرے بچوں کے پیٹ بھرنے کا سامان مہیا کر دیا ہے۔" عورت دو بچوں کو اٹھائے اور چار کو اپنے ارد گرد لیے اس طرح آئی جیسے شتر مرغ کے ارد گرد اس کے بچے، حاتم نے اٹھ کر اپنے گھوڑے کو ذبح کر ڈالا، اس کی کھال ادھیڑی، پھر چھری عورت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا، اپنا کام شروع کر دو۔ پھر ہم سب گوشت کے پاس جمع ہو گئے، اسے بھون کر کھانے لگے، اور وہ قبیلہ کے گھر گھر پہنچا، سب کو دعوت دی "لوگو! اٹھو اور آگ کے پاس پہنچو" بالآخر سب جمع ہو گئے اور وہ اپنے کپڑوں میں لپٹا ہوا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ بخدا! اس نے اس گوشت میں سے ایک بوٹی بھی نہ چکھی حالانکہ ہم سب سے زیادہ وہ بھوکا تھا۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۴۳ پر)

ابن الاعرابی کے بیان کے مطابق "حاتم بڑا فتح مند اور قسمت کا دھنی تھا۔ جب بھی جنگ کرتا تو فتح اسی کی ہوتی، جب کسی مقابلہ میں شریک ہوتا تو وہی بازی لے جاتا، اور جب جوا کھیلتا تو جیت اسی کی ہوتی۔ جب ماہ رجب کا چاند نظر آتا۔ اور اس مہینہ کو خاندان مضر محترم و باعظمت خیال کرتے تھے۔ تو وہ ہر روز دس اونٹ ذبح کرتا اور لوگوں کو کھلاتا اور لوگ بھی اس کے پاس آ کر جمع ہو جاتے تھے۔"

حاتم نے پہلے نوار سے شادی کی پھر ماویہ بنت عفزر سے جو یمن کے کسی بادشاہ کی بیٹی تھی۔ ان دونوں بیویوں سے اس کے تین بچے تھے۔ عبد اللہ، عدی، اور سفانہ، مؤخر الذکر دونوں نے اسلام کا زمانہ پایا اور مشرف باسلام ہوئے۔

حاتم برابر اپنے دستور کے مطابق کھانا کھلانے اور مال لٹانے میں لگا رہا تا آنکہ وہ ۶۰۵ء میں اس دار فانی سے رخصت ہوگیا۔

حاتم طائی کے اخلاق وعادات: حاتم نہایت بلند اخلاق تھا اور زمانۂ جاہلیت میں اس کے اخلاق کی نظیر نہیں ملتی، وہ خاموش طبیعت، نرم دل اور نہایت درجہ بامروت تھا۔ اس نے اپنی ماں کے اکلوتے بیٹے کو کبھی قتل نہیں کیا۔ اور اپنے کمزور چچازاد بھائی پر ظلم روا نہ رکھا، اس ضمن میں وہ کہتا ہے:۔

فانی وجدی ربی واحد امّه
اجرت فلا تقتل علیه ولا أسر
ولا اظلم ابن العم ان کان اخوتی
شهودا وقد اودی باخوته الدهر

میری عمر کی قسم! کتنے ہی اپنی ماں کے اکلوتے بیٹوں کو میں نے پناہ دی، پھر نہ اسے قتل کیا اور نہ قید کیا، اور میں کبھی اپنے چچیرے بھائی پر اس شکل میں ظلم نہیں کرتا کہ میرے بھائی تو موجود ہوں اور اس کے بھائیوں کو زمانہ ختم کر چکا ہو۔

حاتم کی بیٹی سفانہ جب قیدیوں کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے اپنی رہائی کی درخواست کرتے ہوئے اپنے باپ کے اوصاف اس طرح بیان کیے:۔

میرا باپ قیدی کو آزاد کراتا تھا، اپنے حقوق کی حفاظت، اور متعلقین کی حمایت کرتا تھا۔ مہمان نواز اور مصیبت زدہ کا درمان تھا۔ کھانا کھلاتا اور سلام کو عام کرتا تھا، اس نے کبھی کسی ضرورت مند کو نامراد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲ کا) صبح ہوتے ہوتے اس گھوڑے کا سوائے ہڈیوں اور سموں کے کچھ باقی نہ رہا۔
لیکن اس قصہ میں مشکل یہ آن پڑی ہے کہ گھوڑا ذبح کرایا گیا ہے، حالانکہ حاتم کے متعلق مستند طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ گھوڑے اور ہتھیاروں کے سوا سب کچھ سخاوت کر دیتا تھا۔

نہ پلٹایا۔"

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے یہ اوصاف سن کر فرمایا "اے لڑکی! یہ تو مومن کی صفات ہیں۔ اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس پر اللہ کی رحمت بھیجتے۔" پھر فرمایا اسے آزاد کر دو کہ اس کا باپ مکارم اخلاق پسند کرتا تھا۔"

اُس کی شاعری:۔ بلاشبہ زبان دل کی ترجمان اور شاعری آئینہ احساسات ہے اوپر ہم نے حاتم کے جو اخلاق بیان کیے ہیں آپ وہی اخلاق اس کی شاعری میں اثر انداز اور چلتے پھرتے پائیں گے۔ اس کے الفاظ سہل و نرم، اسلوب پختہ و محکم، اور موضوع اعلیٰ و برتر ہے جس کی مثال ہمیں بدوی شاعروں کے کلام میں نہیں ملتی۔ شاید اسی لیے ابن الاعرابی نے کہا تھا " اس کی سخاوت اس کی شاعری سے مشابہ ہے،" جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شاعری بحر زخار ہے۔ جس میں جود وسخا اور اس بارے میں ملامت کرنے کے موضوعات پر امثال وحکم کا بیش بہا خزانہ جوش مار رہا ہے۔ اس میں دائمی شہرت اور باقی رہ جانے والے ذکر کا بیان حسین پیرایہ میں مذکور ہے اور مختلف انداز سے جود وسخا کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اس کی شاعری میں جو تفاوت و اختلاف نظر آتا ہے وہ اس لیے کہ اس میں بہت سے موضوع اشعار داخل کر دیے گئے ہیں جو ناجائز طور سے اس کی طرف منسوب ہو گئے ہیں۔ یہ دوسرے طبقہ کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کا مجموعہ دیوان کی شکل میں لندن اور بیروت سے شائع ہو چکا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ اپنے ایک قصیدہ میں وہ کہتا ہے:۔

اماوِیّ انّ المال غادٍ و رائحٌ
ویبقی من المال الأحادیث والذکر

اماوِیّ امّا مانعٌ فمبیّن
واما عطاءٌ لا ینهنهه الزّجر

اماوِیّ مایغنی الثراء عن الفتی
اذا حشرجت یوما وضاق بها الصدر

اماوِیّ ان یصبح صدای بقفرة
من الارض لاماء لدیّ ولا خمر

تری ان ما انفقت لم یك ضرّنی
وانّ یدی ممّا بخلت به صفر

اماوِیّ انّ المال امّا بذلته
فاوّله شکر و آخره ذکر

وقد علم الأقوام لو انّ حاتما
اراد ثراء المال کان له وفر

اے ماویہ! دھن دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن، لیکن مال خرچ کرکے جو شہرت وناموری حاصل کی جاتی ہے وہ لافانی ہے۔ اے ماویہ! یا تو بالکل کھل کر بخل شیوہ کرلینا چاہیے یا پھر بخشش کا ایسا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے جو کسی کے روکے نہ رکے۔ اے ماویہ! جب جان گلے میں اٹک رہی ہوگی اور سینہ میں پھنس رہی ہوگی اس وقت یہ دھن دولت کس مصرف میں آئے گی؟ اے ماویہ! جب میں بے آب وشراب ویرانہ میں بے جسم وبے جان پڑا ہوں گا اس وقت تجھے معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ میں نے خرچ کیا ہے اس سے مجھے نقصان نہیں پہنچا، اور جو کچھ میں بخیلی سے بچا رکھوں گا وہ بھی میرے ہاتھ میں نہیں بچے گا۔ اے ماویہ! میرے خرچ کیے ہوئے مال کے دو فائدے ہیں ایک تو زندگی ہی میں لوگ میرے شکر گزار رہیں گے اور دوسرا پس مرگ، کہ میری نیک نامی اور ذکر خیر باقی رہے گا۔ اور یہ تو لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ اگر حاتم کو مال و دولت کا شوق ہوتا تو اس کے پاس وافر دولت ہوتی۔

ایضاً:-

تحلم عن الادنين واستبق ودهم
ولن تستطيع الحلم حتى تحلما
ونفسك أكرمها فانك ان تهن
عليك فان تلقى لها الدهر مكرما
أهن في الذي تهوى التلاد فانه
يصير اذا ما مت نهبا مقسما
تايلذ به ما يحمدنك وارث
اذا ساق مما كنت تجمع مغنما
متى ترق اضغان العشيرة بالأنى
وكف الاذى يحسم لك الداء محسما
وعوراء قد اعرضت عنها فلم تضر
وذي اود قومته فتقوما
واغفر عوراء الكريم ادخاره
واعرض عن شتم اللئيم تكرما
ولن يكسب الصعلوك حمدا ولا غنىً
اذا هو لم يركب من الامر معظما
لحا الله صعلوكا مناه وهمه
من العيش ان يلقى لبوسا ومطعما

بردباری کے ساتھ اپنی قریبی اعزہ سے پیش آؤ اور ان کی محبت باقی رکھنے کی کوشش کرو، اور

بردباری اسی وقت تم سے ممکن ہے جب کہ اس کے لیے اپنی طبیعت کو ذرا آمادہ بھی کرتے رہو۔ اور اپنے نفس کی آپ عزت کرو، اگر تم آپ اپنی نظر میں حقیر ہو جاؤ گے تو پھر رہتی دنیا تک کوئی تمہاری عزت نہیں کرے گا، جس کے لیے تم مال و دولت جمع کرنے کی خواہش کرتے ہو اس کو اتنی رفعت و اہمیت نہ دو۔ یہ مال و دولت تمہارے مرنے کے بعد مال غنیمت بن جائے گا جسے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ جب وارث تیرے جمع کیے ہوئے مال کو مال غنیمت سمجھ کر بانٹ لے جائیں گے تو وہ تیری تعریف نہیں کریں گے۔ جب تو قبیلہ کی باہمی رنجشوں اور عداوتوں کا نرمی و رواداری، ہمدردی و غمگساری کے منتر سے علاج کرے گا تو دلوں کی تمام بیماریاں جڑ سے ختم ہو جائیں گی۔ بہت سی نازیبا باتوں سے میں نے اعراض کیا تو میرا کچھ نہ بگڑا، بہت سے کج خلقوں کو میں نے ٹھیک کیا تو وہ سیدھے ہو گئے۔ میں شریف کی لغزش پر اسے معاف کرتا ہوں تاکہ اسے اپنا ہمدرد بنا لوں، اور اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے کمینہ کے منہ نہیں لگتا۔ وہ مرد فقیر جو کسی بڑے کام میں ہاتھ نہ ڈالے یا بڑا خطرہ مول نہ لے کبھی مجد و سرداری اور دولت و ثروت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ خدا اس گداگر و قلندر کو غارت کرے جس کی آرزو اور فکر کا منتہیٰ یہ ہو کہ تن کو کپڑا اور پیٹ کو روٹی مل جائے۔

اس کا ایک شعر جو حسین مضمون پر مشتمل ہے:۔

اذا کان بعض المال ربّاً لاھلہ

فانّی بحمد اللہ مالی معبّد

اگر کسی سرمایہ داری کی دولت اس کے لیے اس کی رب بنی ہوئی ہو اور وہ سرمایہ پرستی کرتا ہو تو اسے مبارک رہے لیکن میں تو بحمد اللہ اپنے مال کو اپنا غلام اور تابعدار ہی رکھتا ہوں۔

امیّہ بن ابی الصلت

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ ابو عثمان امیہ بن ابی الصلت ثقفی نے اپنی تمام زندگی تجارتی کاروبار میں گذاری تجارت کے سلسلہ میں کبھی شام کا سفر کرتا کبھی یمن کا، وہ فطرتاً دیندار واقع ہوا تھا۔ اپنے بعض سفروں میں چند پادریوں اور راہبوں سے ملا، قدیم دینی کتابوں کے کچھ حصے سنے، اور صحیح دین کی تلاش میں لگا رہا۔ ٹاٹ پہننے لگا شراب پینا چھوڑ دی، بتوں پر اعتقاد نہ رہا، اور خود نبی بننے کی ہوس بھی کرنے لگا۔ دین ابراہیمی کے متعلق کہتا ہے:۔

کل دین یوم القیامۃ عند اللہ الّا دین الحنیفۃ زور

قیامت کے دن اللہ کے پاس دین حنیفی کے سوا ہر دین باطل ہو گا۔

جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تو بڑے چکر میں پڑ گیا، اور حسد کی وجہ سے آپ پر ایمان نہ لایا۔ اور کہا "مجھے تو امید تھی کہ نبوت مجھے ملے گی!" اس پر قرآن مجید میں یہ آیت نازل

ہوئی۔" واتل علیھم نبأ الذی اتیناہ ایاتنا فانسلخ منھا، فأتبعہ الشیطان فکان من الغاوین ــ انہیں آپ اس شخص کا واقعہ بتایے جسے ہم نے اپنی نشانیاں دیں پھر وہ ان کو چھوڑ بیٹھا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ اس طرح گمراہ ہوگیا" اس کے بعد وہ لوگوں کو آں حضرتؐ کی مخالفت پر اکساتا رہا، اور غزوہ بدر کے مشرک مقتولین کا مرثیہ کہتا رہا۔ آں حضرتؐ نے اسی وجہ سے اس کے اشعار پڑھنا ممنوع قرار دے دیے تھے۔ جب آں حضرت اس کے توحید میں ڈوبے ہوئے شعر سنتے تو فرماتے: "اس کی زبان مومن تھی اور دل کافر" پھر امیہ اپنی بیٹی کو لے کر یمن کی آخری حدود میں بھاگ گیا، وہاں سے پھر طائف آ گیا جہاں وہ مرگیا۔ دم نکلنے سے کچھ دیر پہلے جب ہوش آیا تو کہنے لگا میں حاضر ہوں تم دونوں کی خدمت میں، لو، میں یہ رہا تم دونوں کے پاس، نہ مال مجھے چھڑا سکتا ہے نہ کنبہ مجھے بچا سکتا ہے۔ اللہ میاں! اگر آپ بخشیں تو تمام گناہ بخش دیجیے گا، اور آپ کا کونسا بندہ ایسا ہے جو گنہگار نہیں ہے۔ پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگا:-

کل عیش وان تطاول دھرا
منتھی أمرہ الی ان یزولا
لیتنی کنت قبل ماقد بدالی
فی ردس الجبال ارعی الوعولا
اجعل الموت نصب عینیك واحذر
غولۃ الدھر ان للدھر غولا

زندگی خواہ کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو جائے بالآخر ایک دن اس کا انجام زوال وفنا ہے، کاش میں اپنی اس حالت کے رونما ہونے سے پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں میں بارہ سنگھوں کو چرایا کرتا۔ تو موت کو اپنا نصب العین بنا اور زمانہ کی ناگہانی آفتوں سے ڈرتا رہ، اس لیے کہ زمانہ کی گرفت اچانک ہوا کرتی ہے۔

اس شاعر کے حالات کا بیشتر حصہ راویوں کے من گھڑت اور ناقابل اعتبار قصوں سے پر ہے۔

اس کی شاعری: اس کا طبعی رجحان دینی مضامین کی طرف تھا، اور اسی سلسلہ میں اس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہی دینی رنگ اس کی شاعری پر چڑھا ہوا ہے وہ اللہ اور اس کے جلال کا وصف بیان کرتا ہے، حشر اور اس کے بھیانک واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ جنت جہنم اور فرشتوں کے حالات بتاتا ہے، تورات کے واقعات مثلاً سدوم کا خرابہ اور حضرات اسحٰق و ابراہیم علیہما السلام کے قصے نظم کرتا ہے۔ شاعری میں وہ ایسے جدید موضوعات و اسالیب پیدا کرتا ہے جن سے دیگر شعراء نامانوس تھے۔ زبان میں ایسے الفاظ و تراکیب استعمال کرتا ہے جن سے .... اہل عرب ناواقف تھے۔ ان میں سے کچھ تو عبرانی سے ماخوذ اور کچھ خود ساختہ ہوتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو سلطیط و تغرور اور آسمان کو صاقورہ و حاقورہ کہا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چاند، گہن کے وقت ایک غلاف میں چلا جاتا ہے اور اس غلاف کا نام ساہور ہے۔ انہی وجوہ کی بناء پر علماء اس کی

شاعری کو سند نہ سمجھتے۔

امیہ نے اپنی شاعری میں جو طرز اختیار کیا تھا وہ اس کے ہم عصر شعراء میں سے کسی دوسرے میں نہیں پایا جاتا۔ اسی لیے علماء جب کوئی شعر اس کے مخصوص طرز کا پاتے اور اس کے کہنے والے کو نہ جانتے تو اسے امیہ کی طرف منسوب کر دیتے۔ ناقلین شعر اس کو پہلے طبقہ کا شاعر مانتے ہیں مگر ہمارے پاس اس کا جس قدر کلام ہے وہ اس خیال کی تائید نہیں کرتا اس لیے کہ اس کی شاعری کے بیشتر الفاظ انگھڑ بے جوڑ، بندشیں کمزور اور قافیے قاعدہ سے ہٹے ہوئے ہیں یہ اور بات ہے کہ زمانہ نے اس کی عمدہ شاعری کو ختم کر دیا ہو۔ حجاج نے ایک مرتبہ ممبر پر کہا تھا: "وہ لوگ گئے جو امیہ کے اشعار پہچانتے تھے، اور کلام کے تلف ہونے کا یہی طریقہ ہوا کرتا ہے۔"

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ اپنے نافرمان بیٹے پر عتاب کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

غذوتُك مولوداً ومُنتُك يافعاً
تعلّ بما أجنى عليك وتنهل
أذا ليلة نابتك بالشجو لم أبت
لشكواك الا ساهراً أتململ
كأنّي أنا المطروق دونك بالذي
طرقت به دوني، فعيني تهمل

پیدائش کے وقت سے میں نے تجھے پالا پوسا اور جب تو نوجوان ہوا تو تیری ضرورتوں کو پورا کیا اور میری کمائی سے تو خوب دل بھر کر سیر ہوتا رہا۔ جب رات کو تجھے کوئی تکلیف ہوتی تو میں رات بھر تیری شکایت کی وجہ سے بے خواب اور بے کل رہتا، گویا تیری تکلیف تجھے نہیں، بلکہ مجھے پہنچی ہے اور میری آنکھ آنسو بہاتی رہتی۔

تخاف الردى نفسي عليك وانني
لأعلم ان الموت حتم مؤجّل
فلما بلغت السن والغاية التي
اليها مدى ما كنت فيك أؤمل
جعلت جزائي غلظة وفظاظة
كأنك انت المنعم المتفضل

مجھے تیری موت کا کھٹکا لگا رہتا تھا حالانکہ میں جانتا ہوں کہ موت وقت مقرر پر ضرور آ کر رہے گی۔ جب تو اس عمر اور اس حد کو پہنچ گیا جس پر تیرے پہنچنے کا میں انتہائی آرزومند تھا، تو تو نے مجھے میری خدمات کا صلہ درشتی و سنگدلی سے دیا گویا آپ ہی تو میرے کرم فرما و محسن رہے ہیں؟!

اس کے دیگر اشعار یہ ہیں:

الحمد للہ ممسانا و مصبحنا
بالخیر صبحنا ربی و مسانا
ربّ الحنیفۃ لم تنفد خزائنہ
مملوءۃ طبق الآفاق سلطانا
الا نبی لنا منا فیخبرنا
ما بعد غایتنا من رأس محیانا
وقد علمنا لو ان العلم ینفعنا
ان سوف یلحق اخرانا بأولانا

ہماری تمام تعریفیں صبح و شام خدا کے لیے ہیں۔ جو ہماری صبح و شام بخیر کر رہا ہے۔ پروردگار دین ابراہیمی ہے۔ اس کے خزانے معمور ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ہمارے جہان پر اسی کی فرمانروائی ہے۔ کیا کوئی پیغمبر نہیں جو ہمیں بتائے کہ ہماری زندگی کی ابتدا اور انتہا میں کتنا فاصلہ ہے؟ یہ ہم معلوم کر چکے ہیں — بشرطیکہ علم کچھ سود مند ہو — کہ ہمارے پچھلے ہمارے اگلوں سے عنقریب مل جائیں گے۔

سرزمین عرب میں کتابت کی ابتداء

کتابت تمدن و تہذیب کے مظاہر میں سے ایک مظہر اور اجتماعی و تجارتی آثار میں سے ایک اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فینیقی اور مصری قومیں اس فن میں سب سے زیادہ پیش پیش ہیں اور غیر متمدن خانہ بدوش اس فن میں سب سے زیادہ پیچھے ہیں۔ عرب میں صرف وہی علاقہ اس فن سے واقف تھا جہاں تمدن پھیل چکا تھا اور آبادی ترقی پر تھی جیسے ملک یمن۔ یمنی اپنی تحریروں میں ایک رسم الخط استعمال کرتے تھے جسے وہ اپنی زبان میں "مسند" کہتے تھے۔ وہ اس کے حروف جدا جدا لکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ رسم الخط ہوڈ کے کاتب پر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے، لیکن آثار قدیمہ کی تحقیقات اور زبانوں کے باہمی تعلقات دریافت کرنے کے علم نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تمام سامی خطوط، فینیقی رسم الخط سے نکلے ہیں۔ نیز یہ کہ آرامی اور مسند رسوم الخط اپنی تمام اقسام کے ساتھ[1] اسی فینیقی رسم الخط سے مشتق ہیں۔ خط آرامی سے حوران میں خط نبطی اور عراق میں سطرنجیلی سریانی نکلا، اور یہی دونوں خط عربی رسم الخط کی جڑ ہیں۔ اول الذکر رسم الخط سے خط نسخ پیدا ہوا اور ثانی الذکر سے خط کوفی جو اسلام سے قبل حیرہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے "حیری" کہلاتا تھا، اول الذکر رسم الخط عرب والوں نے انبار سے سیکھا۔ یہ رسم خط بشر بن عبد الملک کندی برادر اکیدر بن عبد الملک کندی دومۃ الجندل والے

---

[1] خط مسند کی قسمیں شمالی عرب میں صفوی، ثمودی اور لحیانی ہیں اور جنوبی عرب میں حمیری ہے۔

نے سیکھا تھا۔ وہ جب مکہ گیا تو معاویہ کے دادا حرب بن امیہ کا داماد بن گیا۔ اور وہاں قریش کی ایک جماعت کو یہ رسم الخط سکھایا۔ چنانچہ وہاں اس رسم الخط میں لکھنے والوں کی خاصی تعداد ہو گئی۔ جب کوفہ بسایا گیا[1] اور یہ رسم الخط عام طور پر مساجد و محلات پر لکھی جانے والی تحریروں کے لیے استعمال ہونے لگا تو اس خط میں ایک خاص حسن و ترتیب پیدا ہو گئی اور اسے خط کوفی کہا جانے لگا۔ اگلے صفحہ کے نقشہ سے آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ رسوم الخط کیونکر ایک دوسرے سے پیدا ہوئے اور ان میں باہمی تعلق کیا ہے؟

---

[1] حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ مدائن و دجلہ کی آب و ہوا عربوں کو موافق نہیں آتی اور وہ لاغر و کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں تو سعد بن ابی وقاصؓ کو حکم دیا کہ وہ ایسی ساحلی جگہ تلاش کریں جہاں ان کے اور عربوں کے درمیان کوئی پل یا دریا حائل نہ ہو، چنانچہ انہوں نے کوفہ کے علاقہ کو پسند کیا۔ محرم ۱۷ھ میں وہاں عرب آ کر جمع ہو گئے پھر خلیفہ کے ارشاد کے مطابق بانسوں کے گھر بنائے گئے، بعد میں ان کو جلا کر ان کی جگہ اینٹوں کی پختہ عمارتیں بنا دی گئیں۔ اسی سال بصرہ میں بھی عمارتیں بنائی گئیں جہاں ۱۴ ہجری میں مسلمان آباد ہو چکے تھے۔ اسی وقت سے یہ دونوں شہر تجارتی اور جنگی مرکز بن گئے اور تاریخ اسلام و ادب میں ان کو نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔

مصری مقدس تصویری رسم الخط	مصری خواص کا قدیم رسم الخط	مصری عوام کا قدیم رسم الخط	آرامی رسم الخط	فینیقی رسم الخط	سطرنجیلی رسم الخط	نبطی رسم الخط	حیری یا کوفی رسم الخط	عربی جدید رسم الخط
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ا
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ب
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ج
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	د
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ه
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	و
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ز
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ح
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ط
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ی
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ک
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ل
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	م
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ن
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]		س
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ع
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ف
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ص
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ق
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ر
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ش
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ت

دوسرا باب

آغاز اسلام اور عہد بنی امیہ

اسلامی ادب

ادب اسلامی کے عوامل و مصادر نیز اس کی قسمیں اور اس کے رجحانات: زمانۂ جاہلیت کو ہم اس حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ جزیرہ عرب کا پیٹ آتش حیات سے اس طرح جوش مار رہا تھا جس طرح منہ بند برتن میں کھولتا ہوا پانی۔ جزیرہ کے پیٹ سے ہمارا مطلب سرزمین حجاز ہے، اس لیے کہ جنوبی عرب میں یمن پر ایرانی قبضہ کے بعد، اور شمالی عرب میں عراق سے لخمیوں کی فرمانروائی کو بے دخل کرنے کے بعد ہر دو علاقوں کی تمام سرگرمیاں بند ہو گئی تھیں۔ اور انقلاب عرب کی تحریک کے تند و تیز سیلاب کا رخ حجاز کے شہروں کی طرف پلٹ گیا اور وہ وہاں زور پکڑنے لگا، بالخصوص مکہ میں کہ وہ خانۂ کعبہ کی وجہ سے لوگوں کی زیارت گاہ تھا۔ ریگستانی بنجر علاقہ میں ہونے کی وجہ سے بیرونی ریشہ دوانیوں سے مامون عربوں کے لیے ایک پناہ گاہ اور جنوب سے ہندوستان و یمن کا سامان مصر و شام لے جانے والے تجارتی قافلوں کے راستہ میں واقع ہونے کی وجہ سے وہ مال و دولت کا مخزن بنا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے کہ ایک تجارتی منڈی اور مذہبی نیز تفریح گاہ تھا، جہاں جزیرہ کے تمام علاقوں سے عرب آتے، وہاں سے دیسی اور بدیسی سودے خریدتے، ارکان حج ادا کرتے، عکاظ کے میلہ میں شرکت کرتے اور حرام مہینوں کے ظل عافیت میں دیوان کا عام طور پر مقدس امن کا زمانہ تھا، امن و سلامتی کی نعمت سے خوب بہرہ ور ہوتے۔ حملوں اور جنگوں میں جن تعلقات کو نیزوں سے منقطع کرتے تھے اس امن کے زمانہ میں انہیں پھر سے جوڑتے تھے۔ ان تمام دینی، اقتصادی اور اجتماعی سرگرمیوں کی رہنمائی قریش کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی، عکاظ کے میلہ کے منتظم، اور تجارتی کاروبار میں سب کے نگران و سربراہ تھے۔ تجارتی سفروں میں سہولت حاصل ہونے کی وجہ سے وہ آسودہ حال تھے۔ دیس دیس پھرے ہوئے اور تجربہ کار تھے۔ مختلف اقوام سے ان کے تعلقات قائم تھے۔ الغرض مذہب، عزت و شرف، اور مال و دولت میں اقتدار کامل حاصل ہونے کی وجہ سے تمام عرب ان کے سامنے سرنگوں تھے۔ انہوں نے قریش کی زبان اور ان کے ادب کو اپنے اوپر لازمی قرار دے رکھا تھا۔ ان کے اس اقتدار و شرف کا اثر تھا کہ عربی زبان کے متفرق لہجے متحد، اور ان کی رہنمائی کی وجہ سے تمام دل ایک مقصد کی طرف متوجہ ہوتے جا رہے تھے۔ ادھر مدینہ و یمن میں یہودی اپنی صنعتی و زراعتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سود خواری کو رواج دے رہے تھے نیز تورات کی تعلیمات اور پیشگوئیاں پھیلا رہے تھے، عیسائیوں کے پوپ پادری انجیل کی خوشخبری سنا کر، لوگوں کو آخرت کی طرف بلا رہے تھے۔ یہ لوگ یونان و روم کے فلسفہ و قانون سے متاثر تھے اور لوگوں کے ذہنوں کو خدا کی باتوں کے

یے تیار کر رہے تھے۔ شعراء مسلسل ایک میلہ سے دوسرے میلہ ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ جاتے، فخر و حماسہ کے گیت قبائلی عصبیت کے سازوں پر گاتے جس سے ایک طرف تو وہ قبیلوں میں باہمی عداوت و تنازع کی آگ بھڑکاتے، لیکن دوسری طرف اخلاق و عادات اور زبان میں وحدت کے اسباب پیدا کر رہے تھے۔ گویا وہ بے تاب و مجبور انسانوں کے لیے اس منزل مقصود تک پہنچنے کی راہ ہموار کر رہے تھے جس کی طرف خدائے تعالیٰ انہیں بلانے والا تھا۔ عرب خانہ بدوشوں کو آب و گیاہ گھاٹیوں میں جہالت، قحط سالی اور جنگ مارے ڈال رہی تھیں۔ اس پر بڑے سرداروں کا جبر و استبداد، مشائخ اور پیروں کی خود غرضی، امن کا فقدان، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مقولہ کے مطابق دولت کی تقسیم، مستزاد تھی۔ اور ان سب سے زیادہ ناقابل برداشت وہ مشکلات تھیں جو انہیں حد سے بڑھتے ہوئے سود، حرام خوری، ناپ تول کی کمی، اور زمانہ کی اذیتوں سے برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ اس بھیانک مادہ پرستی، تنگ دلی و تنگ ظرفی، اور فاسد نظام کا یہ اثر ہوا کہ سلیم طبیعتیں از خود ایک ایسی شائستہ اور ترقی یافتہ زندگی کے لیے تیار ہوگئیں جو ان کی موجودہ زندگی کے لیے تیار ہوگئیں جو ان کی موجودہ زندگی کے معیار سے ارفع و اعلیٰ ہو۔ لیکن ابن خلدون کے قول کے مطابق عرب: "درشتی و خودداری بلند ہمتی، سرداری و سیاست کے لیے باہمی کشمکش کی بنا پر بہت مشکل سے آپس میں ایک دوسرے کی ماتحتی قبول کرنے والی قوم تھی۔ ان کے اغراض و مقاصد میں اتحاد و ہم آہنگی بہت کم ہوتی تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر کوئی طاقت ان پر اقتدار کلی حاصل نہیں کر سکتی تھی تاوقتیکہ وہ دینی رنگ میں رنگی ہوئی نہ ہو۔ وہ خواہ نبوت و ولایت ہو یا کوئی دوسری دینی کشش۔" اور واقعی اسی اصلاحی ذریعہ سے عرب و اتے اقوام عالم میں نکلے تاکہ دنیا کو پیغام رسالت پہنچا کر اس پر حکمرانی کریں۔ اس وقت ظہور اسلام ان حالات کا ایک لازمی نتیجہ، اور اس زندگی کا ایک واضح ردعمل تھا۔ اس چیز کی وضاحت بخوبی قرآن کے دیے ہوئے نام سے ہوتی ہے۔ وہ دین کو "اسلام" اور اس سے پہلے کے زمانہ کو "جاہلیت" کہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ نام دونوں زندگیوں اور ذہنیتوں کی ابتدا و انتہا کے پورے فرق ظاہر کرتے ہیں۔ جہالت کے معنے ہیں حماقت، نادانی، خود پسندی و تکبر، بخل اور عصبیت و حمیت، اور انہیں عادتوں پر جاہلیت میں دار و مدار تھا۔ اسلام کے معنی ہیں سلامتی، صلح پسندی، رواداری اور خدا کی تابعداری اور یہی خصلتیں اس نئے مذہب کی روح رواں ہیں جو کہتا ہے "وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا، و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما: اور خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر وقار و طمانیت سے چلتے ہیں، اور جب ان سے جاہل لوگ ہم کلام ہوتے ہیں تو وہ سیدھی صلح پسند بات کہتے ہیں" یہی معنے عمرو بن اہتم کے اس قول کے ہیں جو اس نے حضرت عمرؓ کے سامنے مفاخرت کرتے ہوئے خود کو احنف بن قیس پر ترجیح دینے کے لیے اپنی تعریف میں کہا تھا جبکہ وہ دونوں سرداری کے مقابلہ میں امیدوار تھے، "جب ہم تم زمانہ جاہلیت میں تھے تو اس وقت برتری جہالت کرنے والے کے لیے تھی، چنانچہ اس وقت ہم نے تمہارے خون بہائے تمہاری عورتوں کو قید کر کے لونڈیاں بنایا، اور آج ہم اسلام میں ہیں جس میں تفوق و برتری بردباری اور تحمل کرنے والے کے لیے ہے سو میری دعا ہے کہ خدا تمہیں اور ہمیں بخش دے"، اور اس طرح وہ احنف

کی خود ستائی و فخر کے مقابلہ میں بازی لے گیا۔ اندریں صورت یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ اسلام نے عربی ذہنیت اور طرز و فکر میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ جاہلیت پر پوری قوتوں سے ہلہ بول کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور سماج کے سامنے کچھ ایسے بلند اصول پیش کیے جو ان کے سابقہ متداول اصولوں کے مخالف اور ان کے مسلمہ اقدار کے مناقض تھے۔

بہادری، جرأت و جانبازی، فضول خرچی اور بربادی تک پہنچا دینے والی سخاوت، قبیلہ کی بہی خواہی و وفاداری میں مرمٹنا، بدلہ لینے میں سنگ دلی، خویش و اقارب میں سے کسی پر قولی یا عملی زیادتی کرنے والے سے انتقام لے کر چھوڑنا، یہی وہ اوصاف ہیں جو زمانہ جاہلیت میں معیار فضیلت و برتری تھے، لیکن اسلام نے بنی نوع انسان کے لیے جو بلند اخلاقی معیار پیش کیا، اس کے اہم عناصر خدا کے سامنے جھکنا، گڑگڑانا، فروتنی، بے بسی اور عاجزی کا اظہار کرنا، اس کے احکام تابعداری کرنا، قناعت و خاکساری ہوس دولت سے اجتناب، فخر و غرور سے احتراز، اور صبر و شکر، ہیں۔ خدائے تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم: تم میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم سب سے زیادہ پرہیزگار اور قانون خداوندی کا نگہبان ہے۔" آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کی تقریر میں فرمایا "اللہ تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت کے غرور تکبر، اور آباو اجداد پر فخر کرنے کا خاتمہ کر دیا ہے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو، اور آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے تھے، کسی عربی کو عجمی پر برتری حاصل نہیں ہے مگر صرف پرہیزگاری اور تقویٰ اشعاری کی بنا پر۔"
اس طرح قومی و نسلی تعصبات ختم ہو گئے اور حکومت و ریاست نسب و نسل سے نکل کر دین کے ہاتھوں میں آگئی۔ محبت و اخوت تعصبات سے پاک ہو کر خدا واسطے کی ہونے لگی۔ اس ذہنی انقلاب کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ذہنوں سے نکلنے والے افکار و اقوال بھی بدل گئے۔ وہ شعراء جو اپنی بدروحوں سے آپس میں فخر کرتے، کشیدگی کو بڑھاتے اور ہجویہ مضامین بذریعہ وحی حاصل کرتے تھے۔ وہ مقررین جن کی زبانوں سے عداوت و بغض کا زہر ٹپکتا تھا۔ وہ جنگجو بہادر جو رات دن قتل و غارت گری میں مصروف رہتے تھے۔ وہ سردار جو امیرانہ ٹھاٹھ اور امتیازی شان سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ وہ سرمایہ دار جو تجارت کے ذریعہ غریبوں کا خون چوسا کرتے تھے۔ سب کے سب خاموشی سے اسلام کی آواز پر ہمہ تن گوش ہو گئے، وہی کچھ کہنے اور کرنے لگے جو خدا کا فرمان ہوتا یا جسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم لازمی قرار دیتے، قرآن و حدیث تمام قوم کا دستور العمل بن گئے وہی قوانین تھے اور وہی اخلاقی اقدار مقرر کرتے اور وہی اخلاق و آداب کو شائستہ بناتے اور وہی ان کے مشرک اور گناہ گار دلوں میں کلمۂ توحید اور نیکی کی حقیقت کو جاگزیں کرنے والے تھے۔ قرآن و حدیث نے ان میں ایک ایسے جدید عائلی اور قومی نظام کا اضافہ کر دیا جو عرب کے پہلے نظام سے بالکل مختلف و جداگانہ تھا، اور جو ان کی مستقبل کی زندگی کے دوش بدوش چل رہا تھا۔ تعصب ختم ہونے، اور دینی روح کے زور پکڑنے کی وجہ سے عہد رسالت مآب میں دائرۂ شاعری تنگ ہو گیا۔ خطابت، کی وسعتیں سمٹ سمٹا کر قرآن مجید کے جھنڈے تلے آگئیں اور قوت اب قرآن مجید کی طرف دعوت دینے اور آنے والے وفود پر قرآن مجید کی تعلیمات پیش کرنے میں کام آنے

لگی۔ الغرض خطابت و شاعری قرآن کی روشنی سے مستنیر اور اسی کے بنائے ہوئے راستہ پر گامزن ہوگئیں۔
اس عظیم الشان قرآنی دعوت کا ایک لازمی تقاضا خط وکتابت کے سلسلہ کا جاری کرنا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ جدید طرز پر رونما ہوگیا۔ مذہبی کاموں میں نوشت وخواند کی ضرورت، جنگ بدر کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تعلیم وتعلم کی حوصلہ افزائی۔ نیز عربی کے دفتری زبان بن جانے کی وجہ سے ناخواندگی کم ہوگئی۔ دوسری طرف دشمنان دین، قرآن مجید کے بارے میں مناظرے اور بحثیں کرنے لگے جس کے جواب میں حامیان دین نے قرآن مجید کی حفاظت وتعلیم کا سلسلہ عام کرنا شروع کر دیا۔ پھر اسلام کی روز افزوں ترقی نے مجبور کیا کہ دینی تعلیمات کے سرچشموں سے اصول احکام کا استنباط کیا جائے، اور غیر منصوص احکامات میں رائے اور قیاس سے کام لے کر اجتہاد کیا جائے ....

... چنانچہ عربی زبان کی غیر معمولی خداداد وسعتیں اور منطقی صلاحیتیں اُن فیصلوں سے آشکارا ہونے لگیں جنہیں حضرات علی، عمر، زید بن ثابت، عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب، اور معاذ بن جبل رضوان اللہ علیہم نے صادر فرمائے۔ منطقی فقہ کی یہ روح حضرت علی رض ومعاویہ رض کے باہمی مناقشات کے بعد علویوں، امویوں اور خوارج کے درمیانی تنازعات سے اور زیادہ نکھر کر سامنے آگئی۔ تاہم ہمارا یہ دعوی مبالغہ ہوگا کہ تعلیمات اسلامی ہر شخص کے دل میں راسخ یا ہر نفس میں اس درجہ متمکن ہو چکی تھیں کہ عربی ذہنیت پوری طرح بدل چکی تھی۔ یہ دعوی اگر مہاجرین وانصار کے سابقین اولین (فتح مکہ سے قبل کے مسلمانوں) پر صادق آتا ہے تو فتح کے بعد اسلام لانے والوں پر صادق نہیں آتا۔ نہ ان خانہ بدوش عربوں پر جو فطرتاً ہر قسم کی پابندیوں کے خلاف بغاوت کے عادی تھے، خواہ وہ پابندیاں مذہبی ہوں یا حکومت وقانون کی، اور جو اپنے اجڈپن اور سنگ دلی کی وجہ سے کفر ونفاق پر شدت سے جمے ہوئے، اور اللہ ورسول کی مقرر کردہ حدود سے بہت زیادہ بیگانے تھے، جن کے کچھ سربرآوردہ رہنما قیس بن عاصم کی طرح دین کو برحق سمجھتے ہوئے نہیں، بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی جانشینی کے خیال سے اسلام لے آئے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدائے تعالیٰ نے مجھے جو ہدایت وعلم دے کر بھیجا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو ایک ایسی زمین پر برسے جس کا ایک قطعہ قابل کاشت اور زرخیز ہو، جو پانی اپنے اندر جذب کرے پھر وہاں سبزہ ونباتات بکثرت پیدا ہو جائے، دوسرا قطعہ سخت پتھریلا نشیبی ہو جہاں پانی بھر جائے اور اس پانی سے خدا لوگوں کو فائدہ پہنچائے کہ وہ اس میں سے خود پئیں نیز اپنے جانوروں اور کھیتوں کو سیراب کریں، اور ایک قطعہ زمین بالکل سپاٹ اور چٹیل ہو جس میں نہ پانی رکے، نہ گھاس اگے"۔ اس حدیث کی صداقت مسلم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خانہ بدوش عربوں میں ہجو گوئی، تعصب، حمیت بے جا اور مے خواری کی عادتیں باقی رہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ہی ارتداد رونما ہو گیا، اور حجاز کے شہروں میں رندی، مے نوشی، عشقبازی، موسیقی، غنا وسرود عام ہونے لگا۔ قحطانی وعدنانی ہاشمی واموی جھگڑوں کی شکل میں جاہلیت کے خاندانی تعصبات کا سر اٹھانا بالخصوص عہد بنی امیہ میں سختی سے ان کا عود کر آنا بھی اس کے بین ثبوت ہیں۔ اور یہ سب کچھ ہمیں بتا رہا ہے کہ دور اموی کی شاعری

اسلامی روح سے متاثر ہوئے بغیر بڑی حد تک جاہلی دور کی شاعری کے طرز پر ہی جاری رہی۔ اس لیے کہ بیشتر شعراء دیہاتی علاقوں سے آتے اور مختلف قبائل و اجتماعات میں اپنے تعصب بھرے جذبات بیان کرتے رہتے۔

اسلام نے عربی ذہنیت اور اس کے ادبی فنون پر جو اثر ڈالا وہ صرف اسلامی عقیدہ و شریعت اور اسلامی روح کے ذریعہ ہی نہیں ڈالا، بلکہ اس اثر اندازی میں فتوحات اور امامت کے باہمی جھگڑوں کا بھی ہاتھ تھا۔ عربوں کا اپنے جزیرہ کو چھوڑ کر باہر نکلنا، متفرق ممالک میں پھیلنا، قیصر و کسریٰ کی حکومتوں پر قابض ہونا، مختلف قوموں اور نسلوں سے اختلاط، متفرق تہذیبوں اور ذہنیتوں سے اثر فتوحات ہی کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے عراق کو فتح کیا جو ایک قدیم تمدن کا حامل تھا۔ بڑی بڑی قوموں اور مختلف عقیدوں کا مرکز رہ چکا تھا۔ یہاں انہوں نے بصرہ و کوفہ آباد کیے۔ انہوں نے ایران کو زیرنگین کیا، جو ان دو حکومتوں میں سے ایک تھا جنہوں نے قدیم دنیا پر اس زمانہ میں نہ صرف فرمانروائی کی تھی بلکہ اس کی فکر و عقل پر اثر انداز بھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے شام کو فتح کیا جہاں اس وقت رومی تہذیب اور عیسائی مذہب کا دور دورہ تھا، اور جہاں سے پہلے فینیقی، کنعانی، مصری، یونانی اور غسانی اپنے آداب و اطوار، اعتقادات اور طرز حکومت کے نمایاں آثار باقی چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے مصر فتح کیا جو تمدن و فنون کا گہوارہ اور یونانی و رومی تہذیبوں کا سنگم تھا، اور جہاں مشرقی و مغربی فلسفے آکر مل گئے تھے۔ انہوں نے مغرب میں جبل الطارق تک اور ماوراء النہر میں کاشغر تک کے تمام علاقے فتح کر لیے تھے۔ ان تمام مفتوحہ ممالک کے باشندے سامی، حامی اور آریہ نسلوں سے تعلق رکھتے تھے، اور مختلف سماوی و ارضی مذاہب پر عمل پیرا تھے۔ وہ فارسی، قبطی، عبرانی، سریانی، یونانی، لاطینی زبانیں بولتے تھے۔ عربوں نے ایک طرف تو ان اقوام کو اپنی فتوحات سے مادی طور پر سرنگوں کیا، اور زبان و مذہب کی طاقت سے ان پر ادبی و روحانی غلبہ حاصل کیا، دوسری طرف وہ خود عقلی و نسلی اعتبار سے ان کے زیر اثر آ گئے۔ ان میں بود و باش، شادی بیاہ کے تعلقات اور لونڈی غلام بنا کر ان کے تمدن ذہنیت اور نسل کو اپنانے لگے۔ اس باہمی امتزاج کا نتیجہ علوم شرقیہ، فنون ادبیہ اور تمدن اسلامی کی اس شکل میں پیدا ہوا جس نے روئے زمین کو اپنے احاطہ میں لے لیا اور جس نے جدید انسان کی ترقی کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

یہ تو فتوحات کا اثر تھا۔ اب امامت کے اختلافات کا سنیے، جن کا اثر ان چار فرقوں کے باہمی بحث و مناظرے اور جنگ و جدل کی شکل میں رونما ہوا جنہوں نے حضرت علی رضؓ و معاویہ کی خلافت میں اختلافات کی وجہ سے جنم لیا، اور یہی وہ بحثیں تھیں جن سے ذہن عربی کے مطلع پر دلائل و ثبوت فراہم کرنے اور نئے نئے مسائل استنباط کرنے کی قوتیں چھا گئی تھیں، کیونکہ ان بحثوں کا تمام تر دار و مدار قرآن مجید کی تاویلات اور وضع احادیث پر ہوتا تھا، اور اس ضمن میں تعصبات کو پیدا کرنے اور ہوا دینے کے لیے شاعری ہی کو آلۂ کار بنایا جاتا۔ سیاسی مسائل اور دینی تعلیمات کے لیے پرزور و مدلل تحریریں شائع کی جاتیں، مناظروں اور خطیبوں سے کام نکالا جاتا۔ حجاز میں ابن الزبیر کے حامیوں کی جماعت تھی۔ شام میں بنو امیہ کے جاں نثار و

کی ٹولی تھی، عراق میں شیعہ تھے جو اہل بیت کی طرف دعوت دیتے تھے، ان سب سے الگ خوارج تھے۔ جو ان تمام فرقوں کے باغی اور ان سب کے منکر تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ان میں سے ہر جماعت خلافت کے بارے میں اپنی الگ رائے، جداگانہ نظریہ، کتاب و سنت سے علیحدہ علیحدہ دلیلیں، اور خطبات و شاعری کا معتدبہ مواد رکھتی تھی۔ اگر آپ ان کی کچھ بحثیں اور مناظرے طبری، عقد الفرید، شرح النہج لابن ابی الحدید اور کامل مبرد میں پڑھیں تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ اس اختلاف نے عربی ذہن پر کیا اثر پیدا کیا نیز فنون ادبیہ پر ان کا افکار کا کیا نتیجہ مرتب ہوا۔

مندرجہ بالا تمام بحث سے ہم یہ خلاصہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ادب اسلامی کے اہم عوامل یہ ہیں :-

عہد رسالت مآبؐ میں جاہلانہ عصبیت کا خاتمہ اور بنو امیہ کے دور میں اس کی دوبارہ واپسی، روح دینی کا نشو و نما، عربی ذہنیت میں انقلاب، اجتماعی و اقتصادی حالات کی خوشگواری و بہتری، سیاسی جماعتوں کا ظہور، اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہونا، غیر اقوام کا اپنی زبانوں، عادتوں، عقیدوں اور آداب کے ذریعہ اثر انداز ہونا، قرآن و حدیث کے اسالیب، اور جاہلی شاعری و امثال کی صحیح و مستند روایتیں۔

ہم نے یہاں ان عوامل کو مختصر طور پر اس لیے بیان کیا ہے کہ آئندہ جب ہم ہر فن پر جداگانہ بحث کریں گے تو حسب ضرورت وہاں ان کی تفصیل بھی بیان کی جائے گی۔ اب ہم اس بحث کو ختم کر کے ادب اسلامی کے سرچشموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ادب اسلامی کے سرچشمے

ہم ان سرچشموں کو قرآن مجید، حدیث شریف، جاہلی ادب اور غیر ملکی ادب سے منقول مواد میں محدود کر سکتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید

قرآن مجید عربی زبان کی سب سے پہلی مرتب و مدون کتاب ہے۔ تاریخ ادب کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ چھٹی صدی عیسوی کے اواخر اور ساتویں صدی کے اوائل میں عربوں کی عقلی و ادبی زندگی کا ایک عظیم مظہر ہے۔ یہی فنی نثر کا بانی مبانی ہے اور یہی ان علوم و معانی و اسالیب کا سرچشمہ ہے جو اس زمانہ کے ادب میں عام ہوئے۔ یہ ایسے اسلوب بدیع میں نازل ہوا کہ لوگوں کے ذہن اور کان اس کی نظیر سے قطعاً نامانوس تھے۔ یہ نہ تو موزوں و مقفی ہے نہ ایسی سجع بندی ہے جس میں ایک بات کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے چند جملوں میں ادا کیا جائے۔ نہ ایسی غیر موزوں و غیر مقفی عبارت ہے جس کا طرز بیان بغیر ٹوٹے اور بغیر سجع بندی کے مسلسل چلا گیا ہو۔ اس کے برخلاف اس میں جدا جدا آیتیں ہیں جن میں باہدگر مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہر آیت پر پہنچ کر آواز رک جاتی ہے۔ ذہن

اس کی معنویت نیز قاری کی روح و وجدان سے ہم آہنگی کے باعث سکون محسوس کرتا ہے۔ عرب جو شاعری کے امام اور قوت بیان میں لاثانی تھے، اس کلام کو سننے کے بعد محو حیرت ہو گئے۔ انہوں نے اسے نہایت عظیم اور بڑی عجیب چیز قرار دیا۔ وہ حیران و پریشان تھے کہ کلام کی مروجہ اقسام میں سے اسے کس صنف میں شمار کریں۔ شک اور اضطراب میں کبھی انہوں نے اسے شاعری بتایا، کبھی جادو اور کبھی کاہن کی سجع بندی، بہرصورت ان کا قرآن مجید کو ان اصناف کلام میں شمار کرنے پر اتفاق کر لینا جو عقل کو مسحور و مفتون کرتی ہیں خود اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ اس نے ان کے دلوں پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔

قرآن مجید اس لحاظ سے کہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے پختہ و محکم کر دی گئی ہیں اور پھر انہیں جدا جدا کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اس عظیم و بلند مقام پر ہے کہ انسانی فن تنقید کو اس کے اردگرد پر بھی مارنے کی مجال نہیں ہے۔ نیز اس اعتبار سے کہ یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور معجزہ دیا گیا تھا اور اس کے مانند ایک سورت لانے کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عرب کو مقابلہ کی دعوت دی تھی تمام مسلمان اس کی طرز تحریر کی نقل تک کرنے سے بھی گریز کرتے تھے کہ کہیں ان پر قرآن کی نظیر بنانے یا اس کا مقابلہ کرنے کا الزام نہ لگ جائے، نیز اس طرح وہ احتیاطاً کلام خالق کو کلام مخلوق سے جدا رکھنا چاہتے تھے۔ بے شک کچھ مشرکوں اور نبوت کے مدعیوں نے قرآن مجید کی حجت ختم کرنے اور اس کے اسلوب بیان کی نقل پیش کرنے کے لیے اس کے مقابلہ میں اپنا کلام پیش کیا، مثلاً مسیلمہ سے منقول ہے: یاضفدع بنت ضفدعین نقی ماتنقین، فلا الماء تکدرین ولا الشارب تمنعین: "اے مینڈک کی جننا ٹرا کے ٹرائے جا۔ تو نہ پانی کو گدلا کرے گی نہ پینے والے کو روکے گی۔" لیکن راوی اس قسم کی عبارتوں کو یا تو توقف خدا کی بنا پر یا پوچ اور بیچ سمجھتے ہوئے نظر انداز کر گئے ہیں جیسا کہ انہوں نے ابن المقفع، متنبی، ابو العلاء کی مقابلہ میں پیش کردہ تحریروں کے ساتھ کیا (بشرطیکہ ان حضرات کے متعلق یہ روایات درست ہوں) کچھ متاخرین اہل قلم نے بھی اسلوب قرآن کی دلکشی کے باعث اس کی پیروی کی کوشش کی، لیکن اولاً تو اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے وہ قرآن کے بلند مرتبہ تک نہ پہنچ سکے، ثانیاً لوگوں کی طرف سے سوائے مضحکہ و مذاق اڑانے اور پریشانیاں مول لینے کے کچھ نتیجہ نہ پایا، اور بالآخر ہار کر اپنی حرکتوں سے باز آ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے فن انشاء پردازی میں کوئی ایسا مسلک نہیں پیدا کیا جس کی لوگ اتباع کرتے اور جس پر فن تنقید کا دار کارگر ہوتا۔ بہرحال اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ نثر قدیم طرز کے چھوٹے چھوٹے مسجع جملوں سے ہٹ کر ایک عمدہ و شستہ شکل میں نظر آنے لگی جیسے ہم احادیث، خطبات و مکتوبات نبوی نیز خطبات و رسائل صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین، میں دیکھتے ہیں جس کے جملے مربوط و موزوں، الفاظ چیدہ، ترتیب خوشنما، تشبیہ پسندیدہ، مضمون مدلل و منطقی اور عقل و دل کی تہ میں اتر جانے والا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید نے قصہ نویسی، وصف، قانون سازی منطقی استدلال، موعظہ حسنہ، نئے اصطلاحات و الفاظ، جدید تراکیب و مضامین کے اضافہ سے جن کو پہلے اہل عرب نہیں جانتے تھے، عربی نثر میں بڑا اثر ڈالا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ صدیاں گذرنے کے باوجود

بھی اس کی آیتیں مقرروں کے لیے قوت اور ادیبوں کے لیے زینت ہیں۔ وہ انہیں جا بجا اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں جہاں وہ اپنے خصوص انداز اور رونق و صفا کی وجہ سے اسی طرح ممتاز ہوتی ہیں جیسے مصنوعی موتیوں کے ہار میں اصلی موتی۔

قرآن مجید کا اسلوب: قرآن مجید تیئیس برس کی مدت میں، پیش آنے والے واقعات کی مناسبت سے قسط وار نازل ہوا۔ جن میں سے تیرہ برس مکہ میں گذرے۔ اس اثناء میں ترانوے سورتیں نازل ہوئیں۔ اور دس برس ہجرت کے بعد مدینے میں، جن میں اکیس سورتیں نازل ہوئیں۔ بہت سے واقعات و مسائل کے بارے میں ایک یا چند آیتیں نازل ہوئی تھیں اور بعض کے متعلق پوری سورت نازل ہوئی تھی۔ صحابہ کرامؓ جو کچھ نازل ہوتا اسے اپنی جگہ پورا کا پورا حفظ کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید قانون تالیف کے مطابق وحدت موضوع و وحدت اسلوب اور مختلف مضامین کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ باب باندھنے کا پابند نہیں ہے۔ اپنی موجودہ شکل میں وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اکٹھا کر کے مدون کیا گیا۔ لکھنے والے جس حصہ کو پہلے پاتے خواہ وہ سینہ میں محفوظ ہوتا یا قلمبند، اسے نقل کر لیتے۔ ترتیب میں نزول و موضوع کی رعایت نہیں رکھی گئی بلکہ چھوٹی اور بڑی سورتوں کے لحاظ سے مرتب کیا گیا۔[1] بعض قصے متشابہ اسباب و احوال یا بدعملی کے خوفناک انجام سے ڈرانے کے لیے تاکیداً مکرر بیان ہوئے ہیں۔ طویل مدت، مختلف اوقات اور الگ الگ مقامات میں نئے نئے مقاصد و اغراض کے تحت نازل ہونے کی وجہ سے موضوع و اسلوب کی وحدت باقی نہیں رہی۔ اور اس لحاظ سے قرآن مجید کا اسلوب تورات و انجیل کے اسالیب سے مختلف ہے۔

مکی سورتیں — جو دو تہائی قرآن ہیں — اصول دین پر، اور مدنی سورتیں اصول احکام پر مشتمل ہیں۔ اصول دین کا تمام تر انحصار خدا اس کے رسول اور آخرت کے دن پر ایمان لانے، نیک کام کرنے اور برے کاموں سے بچنے پر ہے۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو وجدان اور جذبات و عواطف سے متعلق ہیں، لہٰذا ان امور کی طرف دعوت دینا، اور شوق دلانا ایسے پختہ شاعرانہ طرز بیان کا متقاضی ہے جو اپنے نصیحت آمیز قصوں، موثر و دل نشیں حکمتوں، عمدہ مثالوں، دلکش وعدوں، مرعوب کن دھمکیوں اور دلکش وصف کی بناء پر دل میں اثر انداز ہو۔ اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ ان سورتوں میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے اس میں چھوٹی چھوٹی آیتیں، مسجع جملے، عمدہ تشبیہیں، زوردار استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔

عبادت و معاملات کے بارے میں اصول احکام مدنی سورتوں کا موضوع ہے، اور ان کو بیان کرنے کے لیے نہایت متین اور پختہ و سنجیدہ طرز بیان درکار ہے اور اس طرز بیان کے لیے لمبے لمبے

---

[1] اس سلسلہ میں ہمارا مطالعہ مولف سے مختلف ہے۔ احادیث صحیحہ اور مستند تاریخ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنی موجودہ شکل و ترتیب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی جمع کرا دیا تھا۔ (مترجم)

جلے۔ کھلی اور واضح آیتیں، مطلب و مقصد کی وضاحت، لازمی امور ہیں۔ قرآن مجید قانون سازی کے لیے فقہی اسلوب یا قانونی اصطلاحات سے کام نہیں لیتا، بلکہ وہ تبلیغ و ہدایت کے ضمن میں احکام بھی بیان کرجاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصد اولیں توحید، اشاعت دین، گمراہی جہالت اور شرک کی پلیدیوں سے دلوں کو پاک صاف کرنا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نبی حکومت عہد نبوی میں اس درجہ وسیع و ہمہ گیر نہیں ہوئی تھی کہ تفصیلی قانون بنانے کی ضرورت ہوتی۔

قرآن مجید کا اعجاز: تمام دلیلیں اور علماء کے متفقہ فیصلے اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ قرآن مجید معجزہ ہے۔ لیکن ان کے درمیان سبب اعجاز مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ کوئی موضوع و مقصد کی بلندی و پاکیزگی، نیرنگی مضامین و مطالب اور پیشگوئیوں کی موجودگی کو سبب اعجاز بتاتا ہے۔ اور کوئی دلکش فصاحت، حیرت انگیز بلاغت، صاف و واضح مسلک اور پرزور و مدلل طرز بیان کو سبب اعجاز قرار دیتا ہے۔ ہم بھی موخرالذکر خیال کے حامی ہیں۔ کیونکہ وہ قوم جسے اس کلام کے مقابلہ کی دعوت دی گئی تھی فلسفی یا فقیہ نہ تھی کہ ان کا اس کلام کی مثال نہ لاسکنا معجزہ ہو جاتا۔ دراصل وہ قوم خوش بیان، اظہار مافی الضمیر پر پوری قادر، پرزور مقرر اور بلند پایہ شاعر تھی۔ اور قرآن مجید کی تشبیہ و تمثیل کی باریکیاں، اجمال و تفصیل کا دلنشیں پیرایہ، طرز بیان کی دلکشی، اور قوت استدلال ہی وہ اوصاف ہیں جو ماورائے قدرت انسانی ہیں۔ اور یہی انہی کی وہ امتیازی صفات ہیں جو مقابلہ کرنے والے کو گونگا بہرا بنا کر لاجواب کر دیتی ہیں۔

قرآن مجید کی زبان: قریش کی زبان ہی قرآن مجید کی اصلی زبان ہے۔ اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی خاندان میں پیدا ہوئے اور اسی میں رسول بنا کر بھیجے گئے۔ نیز سوتی حلاوت پاکیزگی ساخت اور حسن ترتیب کے لحاظ سے یہ زبان عرب کی تمام زبانوں پر فوقیت رکھتی تھی، اور اس کو بولنے والا قبیلہ خانہ کعبہ کے ہمسائیگی، حاجیوں کی سقائی، خانہ کعبہ کو آباد کرنے اور اس کی خدمت کرنے کی وجہ سے تمام قبائل سے زیادہ معزز و باشرف تھا، لیکن اسی طرح قرآن مجید بنی سعد بن بکر کی زبان میں بھی نازل ہوا، کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاندان میں دودھ پیا، اور یہ زبان قبائل ہوازن[1] کی زبانوں میں سے ایک فصیح ترین زبان تھی، اسی لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں عرب کا سب سے زیادہ فصیح البیان شخص ہوں، اس لیے کہ میں قریشی ہوں، اور بنی سعد میں پلا ہوں"۔

ان زبانوں کے علاوہ قرآن مجید میں عربوں کی دوسری مقامی زبانوں کے بھی کچھ الفاظ آتے ہیں، جیسے "لا یلتکم من اعمالکم" : (وہ کمی کرے گا تمہارے اعمال میں سے) میں "یلتکم"، بنی عبس کی زبان کا لفظ ہے۔ پھر غیر عربی الاصل الفاظ بھی سو (۱۰۰) سے اوپر آئے ہیں، جو فارسی، رومی، نبطی، حبشی، عبرانی، سریانی اور قبطی زبان کے ہیں۔ مثلاً الجبت (بت، صنم) الاستبرق (زربفت، کمخواب) السندس (ریشمی کپڑا) القسطاس

---

[1] ان قبائل کو علیا ہوازن بھی کہتے ہیں، یہ سعد بن بکر، تلفزین معاویہؓ، اور ثقیف پر مشتمل ہیں۔ انہی کے متعلق ابو عمرو بن العلاء کا قول ہے "عرب کے فصیح ترین قبائل علیا ہوازن اور سفلی تمیم ہیں۔"

(ترازو) الزنجبیل (ادرک) جنہیں عربوں نے اپنی زبان میں شامل کر لیا، اور انہیں اپنی زبان کے مروجہ اوزان کے مطابق ڈھال لیا تھا، جس کے باعث وہ عربی زبان کے الفاظ بن گئے تھے۔

قرآن مجید کے مقاصد مضامین اور موضوعات:- یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ مکہ میں اور کچھ مدینہ نازل ہوا۔ مکی سورتیں ان اہم موضوعات پر مشتمل ہیں جن کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ ان میں اللہ کی توحید، اس کی صفات اور اس کی نشانیوں کی عظمت و بزرگی کا بیان ہے۔ مخالفین و معاندین کو چیلنج دینے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کی گئی ہے۔ پچھلے لوگوں کے واقعات بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ بتوں اور ان سے متعلق جملہ رسوم و اعتقادات کا انکار کیا گیا ہے۔ روز قیامت اور اس سے متعلق جنت و جہنم، خوشخبری اور ڈراوے، برحق ثابت کیے گئے ہیں۔ اور آخر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین سے جہاد بالسیف کی اجازت دی گئی ہے۔

مدنی سورتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں غزوات، ان کے اسباب وعلل، نیز مسلمانوں کے لیے ان معرکوں سے پیدا ہونے والے عبرتناک نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ دینی عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکات اور حج، اجتماعیات مثلاً انفرادی ذمہ داری معاشرتی تمدنی معاملات، عدالتی قوانین اور ان سے متعلقہ قصاص وحدود کا بیان ہے۔ اور یہ سب کچھ اس خوبی کے ساتھ کہ آپ ہر جگہ اس بیان میں الفاظ کو معانی کا ہم آہنگ، اور معانی کو مقاصد سے اس طرح متفق پائیں گے کہ فن و منطق اس کے مقابلہ میں بہت نیچے رہ جاتے ہیں اور اس کے اوپر خدا کی قدرت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

قرآنِ مجید کی تاثیر: مسلمان قرآن مجید میں پوری یکسوئی سے ہمہ تن منہمک ہو گئے چنانچہ وہی مسجد میں ان کی دعا، گھر میں ان کا نظام، باہر عملی دنیا میں ان کا لائحہ عمل، اور ان کی حکومت کا سیاسی دستور بن گیا۔ قرآن مجید کی تعلیمات ان کی روح رواں، اور اس کی وحی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی۔ اس نے ان کی زبانوں، دلوں، اور نظاموں میں ایسا عظیم الشان اثر کیا کہ کسی دوسری آسمانی کتاب نے اپنے ماننے والوں میں اس جیسا اثر نہیں کیا۔ زبان و ادب پر اس کی تاثیر (جو یہاں ہماری غرض وغایت ہے) یہ ہوئی کہ اس نے قوم کے سخت اور بے رحم دلوں میں جاگزیں ہو کر انہیں نرم کر دیا۔ ان کے درشت اور تند مزاجوں میں پہنچ کر ان میں مروت و محبت پیدا کر دی۔ ان کی ہلکی اور سطحی عقلوں میں داخل ہو کر انہیں وزنی اور ٹھوس بنا دیا۔ چنانچہ قرآن مجید کے اس عمل نے ان کی زبان میں حسن الفاظ، خوبی تراکیب، نزاکت اسلوب، قوت منطق، زور استدلال، نیرنگی معانی، کثرت مضامین و مطالب، پیدا کر دی۔ زبان کے دائرہ کو نئے دینی الفاظ تراش کر مثلاً الصلواۃ، الزکوٰۃ الصیام، الرکوع، السجود، الوضوء، المؤمن، الکافر، الخ وسیع کیا۔ بہت سے جدید علوم کی ضرورت پیدا کر دی، مثلاً زبانی خامیوں کے سدباب کے لیے علم نحو و صرف و اشتقاق، قرآنی اعجاز کو ثابت کرنے کے لیے معانی بیان و بدیع نئے الفاظ کی شرح اور مشکل الفاظ کی توضیح کے لیے لغت و ادب، احکام شرعیہ کے استنباط کے لیے حدیث، اصول، فقہ و تفسیر وغیرہ۔ اور یہی قرآن مجید ہے جس نے گذشتہ چند صدیوں میں ان تمام علوم کو باقی رکھا، اور انہیں دور درا

کے نامعلوم خطوں میں پھیلایا، جس سے اس فرمان خداوندی کی تصدیق ہوتی ہے انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون: بے شک ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان و محافظ ہیں۔

قرآن مجید کو پڑھنے کے طریقے (قرائتیں)

نور اسلام کے ضوفشاں ہونے کے وقت عربی کی مختلف مقامی زبانوں کا باہمی امتزاج اور لہجوں کا باہمی اتحاد مکمل نہ ہونے پایا تھا۔[۱] بلکہ لوگوں کی زبانوں پر مختلف لسانی خامیاں باقی رہ گئی تھیں مثلاً فتح و امالہ، اظہار و ادغام مد و قصر، ہمزہ کو جھٹکے یا تخفیف سے ادا کرنا، حرف کو باریک یا پُر نکالنا، علیھم اور الیھم کی "ھ" اور "م" کو پیش دینا وغیرہ۔ جب قرآن مجید قریش کی زبان اور ان کے لہجے میں نازل ہوا تو عرب کے دوسرے قبیلے قلیل مدت میں اپنی زبانی خصوصیت اور مادری لہجہ کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور انہوں نے قرآن مجید کو اپنی لسانی خامیوں کے مطابق پڑھنا شروع کر دیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کی سہولت اور قرآن مجید کی تلاوت کو آسان بنانے کے لیے ان کے تمام پڑھنے کے طریقوں (قراءتوں) کو برقرار رہنے دیا۔[۲]

---

[۱] اس کا ثبوت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تقریروں سے ملتا ہے جو آپ نے دوسرے علاقوں سے آنے والے وفود کے سامنے فرمائیں۔ قریشی زبان سے اس کا اختلاف اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وفد بنی نہد سے خطاب کرتے ہوئے سنا تو کہنے لگے "یا رسول اللہ! ہم ایک باپ کی اولاد ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ عرب کے آنے والے وفود سے ایسی زبانوں میں ہمکلام ہوتے ہیں کہ ان کا بیشتر حصہ ہم نہیں سمجھتے"۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے میرے پروردگار نے ادب سکھایا ہے اور اس نے میری بہت اچھی تربیت کی ہے"۔

[۲] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہشام بن حکیم کو سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ میں ان کی قراءت کو بغور سننے لگا، میں نے دیکھا کہ اپنی تلاوت میں بہت سے ایسے تلفظ انہوں نے ادا کیے جو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھائے تھے، میں نماز ہی میں ان پر ٹوٹ پڑتا، لیکن میں نے ان کے سلام پھیرنے تک صبر کیا، جب انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے ان کا گریباں پکڑ لیا اور کہا: تمہیں یہ سورت کس نے پڑھائی جو میں نے ابھی تم کو پڑھتے ہوئے سنی ہے؟" انہوں نے جواب دیا "مجھے یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی ہے" میں نے کہا "تم جھوٹ بولتے ہو۔ بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مجھے یہ سورت پڑھائی ہے"۔ پھر میں ان کو لیکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "اس شخص کو میں نے اپنے طریقہ کے خلاف سورہ فرقان پڑھتے ہوئے سنا ہے، حالانکہ مجھ کو آپ ہی نے سورہ فرقان پڑھائی ہے"۔ اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ہشام تم سورہ فرقان پڑھ کر سناؤ"۔ انہوں نے اسی طریقہ سے پڑھ کر سنائی جیسے کہ میں نے انہیں پڑھتے سنا تھا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسی طرح یہ نازل کی گئی ہے"۔ پھر فرمایا "اے عمر تم پڑھو"۔ تو میں نے اس طریقہ سے پڑھا جس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو پڑھائی تھی، آپ نے فرمایا "اسی طرح یہ نازل کی گئی ہے"۔ پھر فرمایا "یہ قرآن سات احرف میں نازل ہوا ہے ان میں سے جو حرف بسہولت ادا ہو سکے پڑھ لو۔ احرف سے مراد یہاں وہ مقامی زبانیں ہیں جن کے تلفظ اور لب و لہجہ میں عرب والوں میں اختلاف تھا۔

مفتوحہ علاقوں کے وسیع ہونے، عربوں کے ممالک میں منتشر ہونے اور نئے نئے فرقوں کے پیدا ہونے سے جب زبانیں حد سے زیادہ خراب ہو گئیں، فطری صلاحیتیں بگڑنے لگیں، اور دلوں میں کجی پیدا ہو گئی تو ہجے سے ناواقفیت، لہجوں اور ادائیگی حروف میں سخت اختلاف نیز کج بحثوں جھگڑالوؤں کی دخل اندازی وجسارت سے کچھ ایسی قرائتیں بھی ظہور پذیر ہو گئیں جنہیں نہ تو عربی زبان کی تائید حاصل تھی نہ صحت سند کی، نہ ہی مصحف کے رسم الخط کی۔

پہلی صدی میں ایک جماعت نے تمام قراءتوں کو قلمبند کرنے، ان کے وجوہ پوری طرح شمار کرنے اور ان کے مذاہب کو بیان کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور ان قراءتوں کو ایک مستقل فن بنا دیا، جیسا کہ انہوں نے اس زمانہ میں حدیث و تفسیر کے ساتھ کیا تھا۔ اس جماعت اور اس کے بعد کے طبقہ میں سے سات اشخاص بہت زیادہ مشہور ہو گئے ہیں جن کی طرف آج تک یہ قرائتیں منسوب کی جاتی ہیں۔ اور وہ اشخاص یہ ہیں:-

(۱) ابوعمرو بن العلاء ۱۵۴ھ (۲) عبداللہ بن کثیر ۱۲۰ھ (۳) نافع ابن نعیم ۱۶۹ھ (۴) عبداللہ بن عامر ۱۱۸ھ (۵) عاصم بن بہدلہ اسدی ۱۲۸ھ (۶) حمزہ بن حبیب الزیات ۱۵۶ھ (۷) علی بن حمزہ کسائی ۱۸۹ھ اور یہی وہ سات قرائتیں ہیں جن کی صحت پر تمام ائمہ کا متفقہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ تین قرائتیں اور بھی ہیں جو صحت و تواتر میں ان کے بعد کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ (۱) ابوجعفر مدنی ۱۳۲ھ (۲) یعقوب بن اسحٰق حضرمی ۱۸۵ھ اور (۳) خلف بن ہشام کی قرائتیں ہیں، ان دس کے علاوہ باقی تمام قرائتیں شاذ اور بے قاعدہ ہیں۔

جمع و تدوین قرآن مجید:- جیسا کہ ہم نے بتایا قرآن مجید تیئیس سال میں بالاقساط اہم واقعات اور ضروری حالات کی مناسبت سے اترتا رہا۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین ماہ قبل ۱۰ھ میں جبکہ اس کی آیتیں باقاعدہ ترتیب دے دی گئیں تھیں، اور سورتیں مکمل ہو چکی تھیں اس نے اپنے ختم ہونے کا اعلان کیا۔ لیکن یہ تمام سورتیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں کی گئی تھیں[۱] اور جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تو قرآن مجید یا تو کھجور کی شاخوں، سفید پتلے پتھروں اور شانہ کی چوڑی ہڈیوں پر لکھا ہوا تھا[۲] یا صحابہ کرام رض کی زبانوں پر رواں تھا، غزوۂ یمامہ میں جب ستر قاریئن قرآن شہید ہو گئے تو مسلمانوں میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور حضرت ابوبکر رض کے سامنے جمع قرآن مجید کا مسئلہ پیش کیا۔ حضرت ابوبکر رض کچھ تامل کرتے ہوئے کہا "میں وہ کام کیسے کروں

---

[۱] یہ صحیح نہیں کیونکہ صحیح البخاری میں ہے کہ آپ نے "مابین الدفتین" یعنی قرآن مجید کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا، اس سے ثابت ہوا کہ آپ نے قرآن مجید جمع شدہ شکل میں چھوڑا تھا۔ (مترجم)

[۲] اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید ان تمام چیزوں پر بھی لکھا جاتا تھا کیونکہ اس زمانہ میں عام طور پر یہی کچھ سامان ہر ایک کو بآسانی مل سکتا تھا، لیکن اس کے علاوہ "رق منشور"، "صحف منشرۃ" بھی تھے یعنی باریک جھلیاں، پھیلے ہوئے صفحات وغیرہ (مترجم)

جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، نہ ہیں اس کے متعلق کوئی ہدایت فرمائی! لیکن حضرت عمرؓ پھیر پھیر کر یہ مسئلہ بار بار ان کے سامنے پیش کرتے رہے حتیٰ کہ انہیں اس کام پر آمادہ کر لیا، اور انہوں نے یہ خدمت زید بن ثابت رضہ کو سونپ دی جو کاتبین وحی میں سے ایک تھے اور انہوں نے آخری مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید پڑھ کر سنایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں سے لکھا ہوا اور حفظ کیا ہوا سب اکٹھا کیا، اور اسے ان اوراق میں لکھ دیا جو حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمر رضہ کے پاس رہے۔ خلافت عثمان رضہ کے زمانہ میں یہ صفحات حضرت حفصہ بنت عمر رضہ (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ) کے پاس تھے۔ جب حکومت کا رقبہ بڑھا، اور قرآن مجید کے حفاظ متفرق مقامات میں بٹ گئے تو انہوں نے اپنے اپنے لب و لہجوں کے اختلاف کے مطابق قرآن مجید پڑھنے میں بھی اختلاف کرنا شروع کر دیا، اور وہ ایک دوسرے پر صحیح روایت اور عمدہ قرارت میں فخر بھی کرنے لگے، تو حضرت عثمانؓ نے خطرہ محسوس کیا کہ لوگ قرارت کے اختلاف کی طرح قرآن مجید سے استدلال کرنے میں بھی اختلاف کرنے لگیں۔ چنانچہ انہوں نے زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو اس خدمت پر مامور کیا۔ تب ان حضرات نے ان لکھے ہوئے کاغذات کو ایک مصحف میں نقل کر دیا، اور اس کی سورتوں کو طول و اختصار کی مناسبت سے ترتیب دے دیا۔ زبانوں میں قریش کی زبانوں پر قناعت کی اس لیے کہ قرآن مجید قریشی زبان میں نازل ہوا تھا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اس مصحف سے چند نسخے نقل کرنے کا حکم دیا اور ہر گوشۂ مملکت میں اس کا ایک نسخہ بھیج دیا۔ یہ سات نسخے تھے۔ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں سے ہر جگہ ایک ایک نسخہ بھیجا، اور ایک نسخہ مدینہ میں روک لیا، جو مصحف عثمان رضہ اور "الامام" کے نام سے مشہور ہے، پھر حضرت عثمان رضہ نے اس کے علاوہ تمام قرآنی تحریروں کو یکجا کرنے کا حکم دیا۔ اور وہ جلا دی گئیں۔

نورِ قرآن کی ایک جھلک

خدائے تعالیٰ فرماتا ہے:-

اتأمرون الناس بالبر و تنسون انفسکم؟ عسی ان تکرھوا شیئا و ھو خیر لکم۔ کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللہ و اللہ مع الصابرین۔ قول معروف و مغفرة خیر من صدقة یتبعھا اذی۔ و مثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھول جاتے ہو؟۔ ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ کتنی مرتبہ چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے غالب ہوئی ہے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ بھلی بات کہہ دینا اور درگذر کر دینا اس خیرات و صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد ایذا ہو۔ ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال کو خدا کی رضا جوئی کے لیے نیز اپنے نفس کو حق

مرضات الله وتثبيتا من انفسهم
كمثل جنة بربوة اصابها وابل
فاتت اكلها ضعفين فان لم
يصبها وابل فطل، والله بما تعملون
بصير۔ لن تنالوا البر حتى تنفقوا
مما تحبون۔ ولو كنت فظا غليظ
القلب لا نفضوا من حولك۔
ان ينصركم الله فلا غالب لكم و
ان يخذلكم فمن ذا الذي ينصركم
من بعده؟ من يعمل سوءاً يجز
به ولا يجد له من دون الله وليا ولا
نصيرا۔ قل لا يستوي الخبيث والطيب
ولو اعجبك كثرة الخبيث۔ ما
على المحسنين من سبيل۔ ان الله
لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما
بانفسهم۔ قل كل يعمل على
شاكلته۔ لله الامر من قبل
ومن بعد۔ ما جعل الله لرجل
من قلبين في جوفه۔ ولا يحيق
المكر السيئ الا باهله۔
انما بغيكم على انفسكم۔
فمن نكث فانما ينكث
على نفسه ومن اوفى بما
عاهد عليه الله فسيؤتيه
اجرا عظيما۔ لا تستوي
الحسنة ولا السيئة، ادفع
بالتي هي احسن، فاذا الذي
بينك وبينه عداوة
كانه ولي حميم۔

پر جمانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اس باغیچہ کی
سی ہے جو مرتفع زمین پر ہو، اس پر موسلا دھار
بارش برسے اور وہ اپنے پھل دو چند پیدا کرے،
اگر موسلا دھار بارش نہ بھی برسے تو پھوار ہی
پڑنے سے، اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے دیکھتا
ہے۔ تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ
چیزیں سے خرچ نہ کرو۔ اگر آپ درشت مزاج، سنگدل ہوتے
تو لوگ آپکے گرد جمع نہ ہوتے۔ اگر خدا تمہاری مدد کرے تو کوئی
تم کو زیر نہیں کر سکتا، اور اگر تم کو بے مدد چھوڑ دے
تو اس کے بعد پھر کون ہے جو تمہاری مدد کرے
گا؟ - جو بدعملی کرے گا، اس کا بدلہ پائے گا،
اور وہ اللہ کے سوا اپنے لیے کوئی حمایتی اور
مددگار نہیں پائے گا۔ آپ کہہ دیجئے: خبیث و
طیب برابر نہیں ہوتے، اگرچہ خبیث کی فراوانی
تم کو بھلی کیوں نہ معلوم ہو۔ - اچھا کام کرنے
والوں پر (گرفت کی) راہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ
کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ
آپ اپنے کو نہیں بدلتے۔ آپ کہہ دیجئے، ہر
ایک اپنی سرشت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اول
و آخر فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔
بری چال کا انجام بد اسی کو پہنچتا ہے جو اس کا
اہل ہوتا ہے۔ تمہاری سرکشی کا وبال تمہاری
جانوں پر ہوگا۔ جو اپنے عہد و پیماں سے پھرے گا
وہ اپنے نفس کا برا کرے گا، اور جو اللہ سے
کیے ہوئے عہد کو وفا کرے گا تو اللہ اس کو
بڑا بدلہ دے گا۔ نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتیں۔
احسن طریقہ سے معاملہ کو چکاؤ، ایسا کرنے سے
جو تمہارا دشمن ہوگا وہ گہرا دوست بن جائیگا۔

كل نفس ذائقة الموت ـ كل نفس بما
كسبت رهينة ـ تحسبهم جميعا
وقلوبهم شتى ـ كل حزب بما لديهم
فرحون ـ واذا رايتهم تعجبك
اجسامهم وان يقولوا تسمع لقولهم
كانهم خشب مسندة ، يحسبون كل
صيحة عليهم ـ فمن يعمل
مثقال ذرة خيرا يره ، ومن
يعمل مثقال ذرة شرا يره ـ
وقضى ربك ان لا تعبدوا الا
اياه وبالوالدين احسانا ، اما
يبلغن عندك الكبر احدهما او
كلاهما فلا تقل لهما اف ولاتنهرهما
وقل لهما قولا كريما ، واخفض
لهما جناح الذل من الرحمة و
قل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا ،
ربكم اعلم بما في نفوسكم ان
تكونوا صالحين فانه كان
للاوابين غفورا ، وآت ذاالقربى
حقه والمسكين وابن
السبيل ولا تبذر تبذيرا ،
ان المبذرين كانوا اخوان
الشياطين وكان الشيطان
لربه كفورا ، واما تعرضن
عنهم ابتغاء رحمة من
ربك ترجوها فقل
لهم قولا ميسورا ، ولا
تجعل يدك مغلولة الى
عنقك ولا تبسطها كل البسط

ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے ۔ ہر جان اپنے
اعمال کے عوض رہن رکھی گئی ہے ۔ آپ
ان کو متحد خیال کرتے ہیں حالانکہ ان کے دل
جدا جدا ہیں ۔ ہر جماعت اپنے پاس کی چیز پر
شادماں ہے ۔ اور جب آپ ان کو دیکھیں گے
تو ان کے بدن آپ کو بھلے معلوم ہوں ہے، اور
اگر وہ کہیں کہ آپ ان کی بات سن لیجئے ، تو ایسا
معلوم ہوگا کہ وہ سہارے سے کھڑی ہوئی لکڑیاں
ہیں ۔ ہر شور اور پکار کو وہ اپنے اوپر (عذاب)
سمجھتے ہیں ۔ جو شخص ذرہ برابر بھلائی کرے گا وہ
اسے دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر برائی
کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا ۔ تیرے رب نے
یہ فرمان جاری کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی
کی عبادت نہ کرو ، اور ماں باپ کے ساتھ
اچھا برتاؤ کرو ، اگر تمہاری موجودگی میں ان میں
سے ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو ان سے
اف نہ کہنا ، نہ ان کو جھڑکنا اور دونوں سے
ادب و شرافت سے بات کرنا ۔ ان دونوں
کے سامنے مہربانی سے اپنے اطاعت کیش بازو
جھکا دو ، اور یہ دعا کرو کہ اے پروردگار!
جیسے بچپن میں انہوں نے مجھے پالا ہے ، ان
دونوں پر اپنی رحمت و مہربانی نازل فرما ۔
تمہارا رب تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے
اس سے بہت زیادہ واقف ہے ، اگر تم
نیکوکار ہو تو وہ رجوع کرنے والوں کے
لیے بہت بخشنے والا ہے ۔ رشتہ دار کو اس
کا حق دے دو نیز مسکین و مسافر کو ، اور بے جا
صرف نہ کرو ، بے جا صرف کرنے والے شیطان
کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا

فتقعد ملوما محسورا ، ان
ربك يبسط الرزق لمن يشاء
ويقدر ، انه كان بعباده
خبيرا بصيرا ، ولا تقتلوا
اولادكم خشية املاق
نحن نرزقهم واياكم ،
ان قتلهم كان خطأ كبيرا ،
ولا تقربوا الزنى انه
كان فاحشة وساء سبيلا ،
ولا تقتلوا النفس التي
حرم الله الا بالحق ،
ومن قتل مظلوما فقد
جعلنا لوليه سلطانا ،
فلا يسرف في القتل ، انه
كان منصورا ، ولا تقربوا
مال اليتيم الا بالتي هي
احسن حتى يبلغ اشده ،
واوفوا بالعهد ، ان العهد
كان مسئولا - واوفوا الكيل
اذا كلتم ، وزنوا بالقسطاس
المستقيم ، ذلك خير واحسن
تأويلا ، ولا تقف ما ليس
لك به علم ، ان السمع
والبصر والفؤاد كل اولئك
كان عنه مسئولا ، ولا تمش
في الارض مرحا ، انك لن
تخرق الارض ولن تبلغ
الجبال طولا ، كل ذلك كان
سيئه عند ربك

نا فرمان ہے۔ اور اگر آپ اپنے رب کی رحمت
چاہنے کے لیے ان سے رخ پھیر لیں تو ان سے
نرم اور آسان بات کیجئے گا۔ اپنے ہاتھ کو
گردن سے جکڑ کر نہ رکھو اور نہ اسے پوری
طرح پھیلاؤ، کہ تم ملامت کیے ہوئے اور
عاجز بن کر بیٹھ جاؤ بے شک تمہارا رب جس
کے لیے چاہتا ہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور
جس کے لیے چاہتا ہے اندازہ سے دیتا ہے،
بلاشبہ وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان
کو دیکھتا رہتا ہے۔ اپنی اولاد کو مفلسی کے
ڈر سے مار نہ ڈالو ہم ہی ان کے روزی رساں
ہیں اور تمہارے بھی، ان کو مار ڈالنا بڑی غلطی
ہے۔ اور زنا کے پاس بھی نہ جانا اس لیے کہ
یہ فحش کاری اور بدترین طریقہ ہے۔ اور کسی
جان کو جسے اللہ نے حرام کر دیا ہے نہ مارو
مگر حق سے، اور جو ناحق مارا جائے تو ہم نے اس کے
ولی کو بدلہ کا حق دے دیا ہے۔ اسے چاہیے کہ قتل
(کا بدلہ لینے) میں زیادتی نہ کرے، وہ مدد
کیا جائے گا۔ اور یتیم کے مال کو ہاتھ نہ لگانا
مگر اچھے طریقہ سے، تا آنکہ وہ سن بلوغ کو
پہنچ جائے۔ اور عہد و پیمان کو وفا کرو، اس
لیے کہ عہد و پیمان کے بارے میں جواب طلب
کیا جائے گا۔ جب ناپو تو پورا پورا ناپو، اور
سیدھی ڈنڈی تولو اس کا نتیجہ بہتر اور عمدہ
ہوگا۔ اور جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے
پیچھے نہ لگو۔ اس لیے کہ سمع و بصر اور دل میں سے
ہر ایک کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اور
زمین میں اترا کر مت چلو! تم زمین کو ہرگز نہیں
پھاڑو گے اور پہاڑ کے برابر لمبے نہیں ہو جاؤ گے،

مکد دھا: یہ تمام برے کام تمہارے رب کو ناپسند ہیں۔

۲۔ حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا آپ کے کسی فعل کی حکایت یا آپ کے متعلق صحابہ کرامؓ کی باتیں حدیث کہلاتی ہیں۔ قرآن مجید کے بعد دینی و ثقافتی امور میں اس کا دوسرا درجہ ہے۔ عبادات وحقوق کے متعلق قوانین بنانے میں یہی سب سے بڑا ماخذ ہے۔ قرآن مجید سمجھنے کے لیے یہی سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے حدیث ہی مشکلات قرآن کی وضاحت، اس کے اجمال کی تفصیل، اطلاق کی تقیید اور عموم کی تخصیص و تعیین کرتی ہے۔ ان احادیث کی تعداد جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بصحت سند مروی ہیں، کم ہے۔ تاہم ان پر فصاحت و فیضان سماوی اور خدا داد صلاحیت کی مہریں ثبت ہیں اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں پیدا ہوئے۔ بنی سعد، عربوں کے فصیح ترین قبیلہ میں دودھ پیا۔ نیز آپؐ قرآن مجید کی زبانیں پر کامل عبور، عربوں کی زبان پر وسیع اطلاع، نئے نئے بلند اسالیب کی ایجاد میں کامل دسترس رکھتے تھے، اور دینی وفقہی مطالب کے لیے نئے نئے الفاظ وضع فرما لیتے تھے۔ بایں ہمہ احادیث کی لسانی قدر و منزلت، اور ان کی تاریخی رہنمائی سند ہونے میں قرآن مجید کی بلندیوں تک نہیں پہنچی اس لیے کہ قرآن مجید کو کاتبین وحی، نزول کے وقت ہی قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ اور کلام اللہ ہونے کی وجہ سے اس کے متن کی حفاظت و نگرانی بموجب فرمان الٰہی "فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ" یعنی جو شخص بھی اس کو سننے کے بعد اسے بدلے گا تو اس کا گناہ بدلنے والوں پر ہوگا (قرآن مجید) مسلمانوں کا فریضہ ہو گیا تھا۔ لیکن حدیث کی تدوین دوسری صدی ہجری کے وسط میں ہوئی، اور اس سے پہلے وہ محض حافظہ سے بیان کی جاتی تھی، اور حافظہ اکثر دھوکہ دے جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں جاہلی شاعری سے بھی زیادہ لفظی تبدیلیاں اور روایتی اختلافات رونما ہوئے۔ اس پر اضافہ یہ ہوا کہ علماء نے سالہائے دراز تک زبانی روایت کی بناء پر حدیث کے الفاظ بعینہ یاد رکھنے کو محال قرار دیتے ہوئے اپنے الفاظ میں احادیث کے مفہوم و مطلب کی روایت کو جائز کر دیا۔ ادھر کچھ سیاسی جھگڑے اٹھے، نئی نئی جماعتیں نکلیں، تو خواہش کے بندوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹی روایتیں بیان کرنے کو بھی جائز قرار دے دیا۔ اس طرح انہوں نے ہزاروں حدیثیں اپنی دعوت کی تائید اور اپنے میلان کی ترجیح میں بنا ڈالیں۔ ایک دوسری جماعت نے اصول دین سے موافق اور خیر پہ مائل کرنے کے لیے فضائل اعمال پر مشتمل احادیث بنا لینے کی اجازت دے دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ لوگ قرآن مجید کے نص صریح یا سنت سے منقول عبارت کے علاوہ کسی چیز کو قابل عمل نہیں سمجھتے۔ چنانچہ انہوں نے ترغیب و ترہیب (نیکی کا شوق دلاتے اور بدی سے ڈرانے) کی حدیثوں سے دفتر کے دفتر پر کر دیے۔ اور یہاں تک بڑھے کہ بعض شخصوں، شہروں اور سورتوں کی فضیلت میں بھی کسی سیاسی تحریک، خاندانی عصبیت، یا دینی غرض و غایت کی بناء پر حدیثیں گھڑ لیں۔ مثلاً تمام عرب پر قریش کی فضیلت کی حدیثیں، عجم پر عرب کی فضیلت، بعض صحابہ

پر بعض کی برتری کی احادیث۔ یا جس طرح بعض تفسیروں میں قرآن مجید کی تلاوت کا شوق دلانے کے لیے سورتوں کی فضیلتیں درج کی گئی ہیں اس لیے کہ اس زمانہ میں فقہ و سیرت میں انہماک کی وجہ سے لوگوں نے قرآن مجید کا مطالعہ ترک کر دیا تھا۔ اس وضع حدیث کے ذریعہ انہوں نے عربی کہاوتوں، دانشمندانہ مقولوں اور عجمی افکار و آراء کا بڑا حصہ حدیث میں شامل کر دیا، جس نے تقریر و خطابت بحث و مناظرہ اور شاعری میں غیر معمولی اثر کیا۔

حضرت عمرؓ اور بعض صحابہ موضوع حدیثوں کے خطرہ سے بچنے، اور کتاب اللہ کی محبت کو پیش نظر رکھنے کی بناء پر زیادہ حدیثیں بیان کرنے کے مخالف تھے تاکہ جعلی حدیثوں کی وجہ سے قرآن مجید میں اختلاف نہ ہو سکے اور لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹنے نہ پائے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے قرظہ بن کعب اور ان کی معیت میں عراق جانے والے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم ایسی آبادی میں پہنچو گے جہاں کے باشندوں کی آوازیں قرآن مجید کی تلاوت سے شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں، تم انہیں حدیثوں میں ڈال کر ان سے قرآن مجید نہ چھڑا دینا، قرآن مجید کو اچھی طرح پڑھو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنے میں کمی کرو" اور ہمارا خیال ہے کہ اسی خطرہ نے انہیں قرآن مجید کے جمع کرنے کا اشارہ کرنے کی طرح احادیث جمع کرنے کا اشارہ کرنے سے روک دیا تھا، تاکہ قرآن مجید کے ساتھ کوئی دوسری ایسی کتاب نہ ہو جس کی طرف لوگوں کی توجہ منعطف ہو جائے۔ زہری نے عروہ بن زبیر سے ایک خبر بیان کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب احادیث لکھنے کا ارادہ کیا اور صحابہ کرام رضؓ سے اس سلسلہ میں رائے طلب کی تو ان کی اکثریت نے اس ارادہ کی حمایت کی۔ آپ ایک ماہ تک اس معاملہ میں اللہ سے استخارہ کرتے رہے اور کوئی قطعی فیصلہ نہ کیا، ایک دن صبح جبکہ اللہ تعالیٰ نے حقیقت ان پر واضح کر دی تو فرمایا "تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے احادیث لکھنے کا ارادہ تم پر ظاہر کیا تھا، لیکن بعد میں مجھے یاد آیا کہ تم سے پہلے اہل کتاب نے کتاب اللہ کے ساتھ دوسری کتابیں لکھیں اور کتاب اللہ کو چھوڑ کر ان لکھی ہوئی کتابوں پر جھک گئے، اور بخدا میں کتاب اللہ کو کسی دوسری چیز سے خلط ملط نہیں کروں گا۔"

اسی اندیشہ نے وہ ابتری و بدنظمی پیدا کر دی جس نے مذہب کے جمال کو بدنما کر دیا، اور تاریخی حقائق پر پردہ ڈال کر فتنہ بڑھانے میں مدد کی۔ اور جب لوگوں کو اس ابتری کے ختم کرنے کا خیال آیا تو اس وقت خرابی حد سے گذر چکی تھی، اور معاملہ ہاتھوں سے نکل چکا تھا، اور یہ بیماری لاعلاج ہو چکی تھی۔

ایک ادیب یہ کام نہیں کہ فقیہ، لغوی، نحوی اور مؤرخ کی طرح وہ حدیثوں کے اختلافات اور تبدیلیوں کو زیر بحث لائے۔ نہ اس کا یہ کام کہ محدثین پر جو جرح و تعدیل ہوئیں ان کی تحقیق کرے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے وہ سچی اور جھوٹی حدیثوں کو اسی نظر سے دیکھے گا کہ وہ کلام کے طریقوں میں سے ایک طریقہ اور معانی و مطالب کے سرچشموں میں ایک سرچشمہ ہیں اور یہی وہ دو چیزیں ہیں جو ادب پر گہرا اثر

ڈالتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلوب بیان کی نقل کرتے تھے اور آپ ہی کے الفاظ و اصطلاحات استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تاکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سچی اور جھوٹی نسبت کے سوا بیشتر احادیث میں کوئی فرق باقی نہ رہ جائے۔ یہ تو احادیث کا لفظی پہلو ہے۔ معنوی لحاظ سے صحیح حدیثیں علم و ہدایت کا راستہ اور جعلی حدیثیں قیاس و اجتہاد کی راہ ہیں۔ اس لیے کہ یہ شخصی اجتہادی آراء تھیں جنہیں جعل ساز آں حضرت ﷺ کی طرف منسوب کر دیتے تھے تاکہ انہیں مقبولیت حاصل ہو۔ اس طرح یہ احادیث فقہ کو پھیلانے، اخلاق کو سدھارنے، ثقافت کو عام کرنے، اور قانون سازی میں سنت صحیحہ کے دوش بدوش اجتہادی رائے پیدا کرنے کا ذریعہ تھیں۔

حدیث کا طرز بیان: حدیث (بات یا گفتگو) جیساکہ اس کا نام بتا رہا ہے، روزمرہ کی اس عام فہم گفتگو کی قسم سے خارج نہیں ہے جو ہر مجلس میں ہوتی رہتی ہے اور ہر موضوع پر مشتمل ہوتی ہے۔ برجستگی، غور و فکر کی کمی، مقامات و احوال کے بدلنے سے ان میں اختلاف رونما ہوجانا اس کی لازمی تقاضے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر باوجود برجستگی کے فیضان سماوی کا اثر، غیر معمولی صلاحیت کا نشان اور بلاغت و دلنشینی کی مہر نظر آتی ہے۔ اور ان کا طرز بیان قرآن مجید کے اسلوب کی نسبت زمانۂ نبوت کے طرز بیان سے قریب تر ہے۔ تاہم وہ اپنی ظاہری چمک دمک، عبارت کی ترتیب و روانی، واضح و معین غرض و غایت کو بیان کرنے کے لیے سلجھے ہوئے مناسب الفاظ لانے، بیان کے حسب حال ہونے، اور جس سے گفتگو کی جائے اس کی بولی کے مطابق ہونے کی وجہ سے مابہ الامتیاز ہیں۔ دوسری زبانوں سے مطابقت ایسی شکل میں بہت زیادہ نمایاں ہوجاتی تھی جب آپ باہر سے آنے والے وفود سے مخاطب ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غریب الفاظ استعمال کرتے، مقفی عبارت کا التزام کرتے، اور وفود سے گفتگو کرنے کے لیے ایسے متروک الفاظ بولتے تھے جو ان کی زبانوں میں مستعمل تھے۔ اسی سلسلہ میں آپ کی وہ باتیں ہیں جو آپ نے طہیہ ابن ابی زہیر نہدی اور لقیط بن عامر بن منتفق کے ساتھ کیں۔ جن سے آپ کی خوش خلقی، اعلیٰ تربیت، زور بلاغت اور قوت اثر اندازی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے[1]۔

بیشتر احادیث پر روانی طبع کا جمال، نبوت کا جلال اور رونق فصاحت نمایاں ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تشبیہ و تمثیل، حکیمانہ کلام، اور حسن جواب پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ اور یہ آپ سے قبل آنے والے رسولوں بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی یہی خصوصیت تھی۔ اس لیے کہ انبیاء کرام بمنزلۂ اساتذہ ہوتے تھے، اور تعلیم میں سب سے زیادہ مفید و کارگر طریقہ تمثیل و خوش بیانی کا طریقہ ہے، جس کی مثال آں حضرت ﷺ کے یہ ارشادات ہیں:۔

---

[1] دیکھئے عقد الفرید جلد (۲) صفحہ: ۱۸۱،

ان المنبت لا ارضا قطع
ولا ظهرا ابقى - المومن
هين لين كالجمل الانف، ان
قيد انقاد وان انيخ على
صخرة استناخ - اصحابي
كالنجوم ، بايهم اقتديتم
اهتديتم - لو توكلتم على الله
لرزقكم كما يرزق الطير،
تغدو خماصا وتعود بطانا.
مثل المؤمن كالنحلة،
لا ياكل الا طيبا ولا يطعم
الا طيبا - انكم لن تسعوا
الناس باموالكم فسعوهم
باخلاقكم - المؤمن الف
مألوف ولا خير فى من لا يألف
ولا يؤلف - ان احبكم الى
واقربكم منى مجالس يوم
القيامة احاسنكم اخلاقا.
الموطأون اكنافا الذين
يألفون ويؤلفون وان
ابغضكم الى وابعدكم منى
مجالس يوم القيامة، الثرثارون
المتشدقون المتفيهقون.
اياكم وخضراء الدمن،
المرأة الحسناء فى المنبت
السوء- المرأة كالضلع،
ان قومتها كسرتها.
الناس كلهم سواسية كاسنان
المشط - جنة الرجل

سواری کو تیز دوڑا کر قافلہ سے کٹ جانے والا
نہ مسافت طے کرتا ہے نہ سواری ہی کو بچاتا ہے۔ مومن
نکیل پڑے ہوئے اونٹ کی طرح نرم خو اور اطاعت
شعار ہوتا ہے، اگر اسے ہانکا جائے تو چلنے لگتا ہے اور
اگر اسے چٹان پر بٹھایا جائے تو وہ بیٹھ جاتا ہے۔
میرے صحابی تاروں کی طرح ہیں، ان میں سے جن کا
طریقہ بھی تم اختیار کروگے۔ راہ پالوگے۔ اگر تم خدا پر
بھروسہ کرو تو وہ پرندوں کی طرح تم کو روزی پہنچائیگا،
کہ صبح کو وہ خالی پیٹ نکل جاتے ہیں اور شام کو
پیٹ بھر کر لوٹ آتے ہیں۔ مومن شہد کی مکھی کی طرح ہے
جو خوش ذائقہ چیز کھاتا ہے اور خوش ذائقہ چیز ہی
کھلاتا ہے تم تمام انسانوں کو اپنے مال سے خوش
نہیں کرسکتے لہذا اپنے اخلاق سے ان کو خوش کرو۔
مومن ملنسار اور ہردلعزیز ہوتا ہے اور جو شخص
ملنسار و خلیق نہ ہو وہ کسی کام کا نہیں۔ تم میں
سب سے زیادہ مجھ کو پیارے، اور قیامت
کے دن مجھ سے قریب تر بیٹھنے والے وہ ہیں
جو خلیق و ملنسار، نرم مزاج اور مہمان نواز
ہیں جو لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور لوگ ان
سے محبت کرتے اور تم میں سب سے زیادہ مبغوض
اور روز قیامت سب سے زیادہ مجھ سے
دور بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو بہت باتونی
غپ شپ کرنے والے، مسخرے اور چبا
چبا کر باتیں کرنے والے ہیں۔ بچو! گھورے
کی سبزی سے بچو! یعنی اس حسینہ سے جو
خراب ماحول میں پلی ہو۔ عورت پسلی کی
ہڈی کی طرح ہے، اگر تم اسے سیدھا کروگے
تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ تمام انسان کنگھی کے
دانتوں کی طرح برابر ہیں۔ مرد کی جنت اس کا

دارہ - ان قوما رکبوا سفینة فاقتسموا فصار لکل رجل منھم موضع فنقر رجل منھم موضعه بفأس، فقالوا له "ما تصنع؟ قال ھو مکانی اصنع فیه ما اشاء، فان اخذوا علیٰ یدہ نجا ونجوا وان ترکوہ ھلك وھلکوا"

گھر ہے - کچھ لوگ ایک کشتی پر سوار ہوئے، ہر ایک نے اپنی جگہ تقسیم کی اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ گیا، ان میں سے ایک شخص اپنی جگہ پر کلہاڑی مارنے لگا، لوگوں نے پوچھا "یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے جواب دیا "یہ میری جگہ ہے اس میں جو میرا دل چاہے گا کروں گا، اب اگر لوگ اس کا ہاتھ پکڑ لیں تو یہ بھی بچ جائے گا اور وہ بھی، اور اگر اسے چھوڑ دیں گے تو یہ بھی ہلاک ہو جائے گا اور لوگ بھی"

آں حضرت کے اسلوب کا اثر صحابہ کرام کی گفتگو اور ان کی تقریروں میں بکثرت موجود ہے - بالخصوص ان صحابہ کے طرز بیان میں جو آں حضرتؐ کی صحبت میں زیادہ رہے یا جنھوں نے آں حضرتؐ کی احادیث زیادہ بیان کیں مثلاً امام علیؓ اور ابو ہریرہؓ - حضرت امام کرم اللہ وجہہ کا قول ہے "لوگو! گناہوں کی مثال ان منہ زور گھوڑوں کی سی ہے جن پر گناہگار سوار ہیں، اور وہ بے لگام ہیں وہ انہیں لے کر آگ میں کود پڑے - تقویٰ اور خدا ترسی کی مثال سدھائے ہوئے اطاعت کیش گھوڑوں کی سی ہے جن پر خدا ترس و نیکوکار سوار ہیں - جن کے ہاتھوں میں ان گھوڑوں کی باگیں دے دی گئی ہیں اور وہ انہیں لے کر جنت میں چلے گئے - یہاں حق و باطل کی کش مکش ہے اور ہر ایک کے کچھ حمایتی ہیں - جس کے سامنے جنت و جہنم ہوں وہ بڑی مشکل میں ہے - تیز دوڑنے والا کامیاب ہے سست رفتار امیدوار کی نجات کے بھی امکانات ہیں لیکن کوتاہی کرنے والا آگ میں گرے گا - دائیں بائیں گمراہ کن راستے ہیں اور درمیانی راستہ سیدھا اور صاف ہے"

سب سے زیادہ احادیث رسول بیان کرنے والے صحابی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں - ان کی بیان کردہ روایات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چہتر تک پہنچتی ہے - ان روایات کے الفاظ اور طرز بیان کا بڑا حصہ خود ان کا اپنا ہے اگرچہ وہ احادیث کے اسلوب کے مطابق ہیں - بکثرت روایات بیان کرنے کی وجہ سے بعض صحابہؓ کو ان پر شک ہوا تو انہوں نے کہا "تم لوگ خیال کرتے ہو کہ ابو ہریرہ آں حضرتؐ سے بہت زیادہ احادیث کی روایت کرتا ہے - اللہ کے یہاں ایک دن ضرور جانا ہے - میں نادار شخص تھا، صرف پیٹ بھر کھانے پر آں حضرتؐ کی خدمت کیا کرتا تھا، مہاجرین تجارت کی وجہ سے بازاروں میں مشغول رہتے تھے اور انصار اپنے مویشیوں اور زمینوں کے انتظام میں لگے رہتے تھے، لیکن میں بہر صورت آں حضرتؐ کے ساتھ لگا رہتا تھا - لہذا جب اور لوگ غائب ہوتے تو بھی میں موجود رہا کرتا، اور جب دوسرے بھول جاتے تو میں یاد کر لیتا"

۳ - زمانہ جاہلیت کی شاعری

عربی نثر کو قرآن مجید و حدیث شریف کی بدولت ایک ابلتا چشمہ اور نیا طریق فکر میسر ہوا جنہیں

وہ اپنا رہبر و معاون بنا کر تدریجی ارتقا، تکمیل اور آزادی کی راہ پر گامزن ہو گئی۔ عربوں کے ساتھ
ان کی شاعری کا رخ بھی اسلام کی طرف پھر گیا۔ لیکن اسلام نے شاعری میں تعصب و جاہلیت کے مہلک
جراثیم کی وجہ سے، جن سے مسلمانوں کے اتحاد اور عربی کی باہمی الفت کے ختم ہو جانے کا اندیشہ
تھا، شاعری کا کھلے دل سے استقبال نہ کیا، نہ اس کو مقبول ہونے کا موقع دیا، چنانچہ وہ بھی عرب کے
خانہ بدوشوں کی طرح منافقت سے کام لینے لگی۔ اس کا طبعی رجحان اسی جاہلی خانہ بدوش زندگی کی
طرف تھا جس سے وہ اپنے خیالات، طریقے اور اشکال اخذ کرتی تھی۔ ان حالات میں ہم اس وقت
تک اسلامی شاعری نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم اس کے اصلی منبع و ماخذ کی طرف رجوع نہ کریں اور
ہم پچھلے صفحات میں جاہلی شاعری پر کافی بحث کر آئے ہیں جسے یہاں دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے،
لہٰذا اب ہم چوتھے سرچشمہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۴۔ غیر ملکی ادب

جزیرۂ عرب دنیا کی دو بڑی تہذیبوں کے درمیان واقع ہے اور وہ ہیں مشرقی سمت میں ایرانی
تہذیب اور مغربی سمت میں رومی تہذیب۔ ان دونوں کے درمیان قدیم زمانہ سے عربوں کا میل جول
تھا۔ جس نے مادی و معنوی تبادلہ کی وجہ سے زبان و ادب میں کچھ آثار چھوڑ دیے تھے۔ لیکن بعد
میں جب یہ دونوں حکومتیں اسلامی مفتوحہ علاقوں میں شامل ہو گئیں تو یہ میل جول بڑھ کر ایک شدید
امتزاجی شکل اختیار کر گیا، جس میں زبانیں اور افکار و عقائد باہم اس قدر گھل مل گئے کہ یہ آمیزہ
بھی ادب کے سرچشموں میں سے ایک پرجوش سرچشمہ بن گیا۔ ان حکومتوں کے باشندوں نے دین الٰہی قبول
کر لیا۔ ان کے بہت سے قیدی (غلام لونڈی بن کر) عرب کے خاندانوں میں شامل ہو گئے۔ اور وہ سب
عربی زبان سیکھنے اور بولنے پر مجبور ہو گئے۔ البتہ ان لوگوں نے اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں نے اپنی
زبانوں کے علاوہ کسی دوسری چیز کو نہیں بدلا۔ ان کے تخیلات و تصورات، اسلوب بیان سب اپنی پہلی
جبلت پر باقی رہے۔ وہ فارسی یا رومی زبانوں میں سوچتے تھے، اور بولنے یا لکھنے میں عربی زبان استعمال
کرتے تھے۔ ان کی زبانوں کے قواعد مرتب، ادب صاف اور سلجھا ہوا نیز تہذیبوں کے تمام گوشے
روشن تھے، لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ عربی آداب، عجمی آداب اور آریہ ذہنیت سے
متاثر ہوتے، اور یہ اثر سب سے زیادہ نمایاں طور پر زبان، قانون سازی، اخلاق، شاعری، خطوط و
رسائل، اور قصص و حکایات پر ہوا۔

زبان کا حلقہ ان فارسی الفاظ کے شامل کرنے سے وسیع ہوا جنہیں دفاتر کی کارروائی، حکومت
کی تنظیم و ترتیب، ملکی سیاست، تمدنی ضروریات مثلاً اوزار، غذا، اور آرائشی سامان کے اظہار کے لیے
استعمال کیا گیا۔ اس لیے کہ عرب کے خانہ بدوش ان چیزوں سے واقف نہ تھے۔ عربی زبان کے قواعد سریانی
نحو کے طریقہ پر بنائے گئے اور ان کی ترتیب و تالیف عجمیوں نے کی۔ سیوطی نے اپنی کتاب "المزہر" میں

ایک فصل باندھی ہے جس میں ان الفاظ کا بیان ہے جو عربوں نے فارسی، رومی، سریانی اور قبطی زبانوں سے لیے ہیں، لیکن لغت مرتب کرنے والوں نے ان زبانوں سے لاعلمی کی بنا پر اس سلسلہ میں بہت کچھ التباس پیدا کر دیا ہے۔ بہت سے الفاظ ان زبانوں کی طرف منسوب کر دیے جو ان زبانوں کے نہ تھے۔
ادھر ایرانیوں نے جہالت و تعصب کی بنا پر بہت سے معرب کلمات کو اپنی زبان کا بتانے میں انتہائی مبالغہ آمیزی سے کام لینا شروع کر دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فارسی زبان میں گفتگو فرمائی تھی۔ اس بارے میں وہ دو حدیثیں بھی بیان کرتے ہیں، جن میں سے ایک "ان جابراً صنع لکم سودا" ہے، جس میں "سور" بمعنی ضیافت ہے۔ اور دوسری "العنب دو، والتمریک" ہے یعنی انگور دو دو کھاؤ اور کھجور ایک ایک۔ حالانکہ یہ دونوں حدیثیں علماء کی تحقیق کے مطابق بے بنیاد ہیں۔
جاحظ نے لکھا ہے کہ مدینہ میں ایرانیوں کے آنے کی وجہ سے مدینہ والے کچھ فارسی الفاظ جاننے لگے تھے۔ اور وہ "بطیخ" (خربوزہ) کو خُربُز اور "سمیذ" (آٹا، سوجی) کو سمیط اور روزق کہنے لگے تھے۔ اہل کوفہ "مسحاۃ" (پھاوڑا) کو بال (بیل) اور "سوق" کو بازار کہنے لگے تھے جو تمام فارسی الفاظ ہیں۔ ابو مہدیہ اعرابی نے بعض غیر عربی الفاظ نقل کیے ہیں جو اس کے زمانہ میں عام طور پر مستعمل تھے پھر ان کو غلط قرار دیا ہے۔ ان میں سے بطور مثال کچھ الفاظ ان اشعار میں پیش کیے ہیں:-

يقولون لي شنبذ ولست مشنبذاً
طوال الليالي ما أقام ثبير
ولا قائلا زوداً ليعجل صاحبي
وبستان في قولي على كبير
ولا تاركاً لحني لاتبع لحنهم
ولو دار صرف الدهر حيث يدور

مجھے لوگ شنبذ (مستجاب الدعوات) کہتے ہیں حالانکہ میں رہتی دنیا تک شنبذ (مستجاب الدعوات) نہیں ہو سکتا، نہ میں اپنے ساتھی سے پھرتی اور جلدی چاہنے کے لیے "زود" کا لفظ استعمال کرنے والا ہوں اور اپنی زبان میں بستان (باغ) کہنا مجھ پر گراں گذرتا ہے، اور میں اپنے لب و لہجہ اختیار نہیں کرونگا خواہ وہ زمانہ کی گردش کوئی بھی رخ اختیار کرلے۔

قانون سازی اپنی تفصیلات میں رومی فقہ سے متاثر ہوئی اور اخلاق کا زیادہ تر دارومدار ان یونانی دانشمندانہ مقولوں پر ہوا جو سریانی زبان کے ذریعہ نقل کیے گئے۔ ہمسایہ ملکوں کے آزاد کردہ غلاموں (موالی) کی ایک جماعت نے شاعری و نثر نگاری کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ جیسے زیاد اعجم، اور ابو العباس اعمی، موسی شہوان، اسماعیل بن یسار شاعروں میں، اور ہشام کے آزاد کردہ غلام سالم، ان کے شاگرد عبدالحمید ابن یحیٰی اور ان کے دوست ابن المقفع نثر نگاروں میں ہیں۔ ابو ہلال عسکری کا قول ہے "جو کسی زبان میں فن بلاغت سیکھ کر دوسری زبان پر اختیار کرے تو اسے اس زبان پر بھی وہی قدرت حاصل ہو جاتی ہے جو پہلی زبان

پر تھی۔ مشہور انشاء پرداز عبدالحمید نے انشاپردازی کے کچھ قواعد فارسی زبان میں لکھے پھر ان کو عربی زبان میں منتقل کر دیا۔"

قصص سے مراد بطور ارشاد و نصیحت، تفسیر، تاریخ و وقائع کا بیان ہے۔ اس میں "علم اول" کا کچھ حصہ بھی شامل ہے۔ جس میں وہ معلومات مراد لی جاتی ہے جو پہلی امتوں کی سرگذشت اور انبیاء کے واقعات نیز پہلے زمانہ کے ڈراووں اور پیشگوئیوں پر مشتمل ہو جسے اسلام قبول کرنے والے اہل کتاب بیان کریں مثلاً "عبداللہ بن سلام" جو ہجرت کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری کے وقت اسلام لائے، اور "کعب الاحبار" جو خلافت عمرؓ میں مسلمان ہوئے۔ یا ہمسایہ غلام اقوام (موالی) کے ذریعہ "مثلاً وہب بن منبہ" جو ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے یمن میں رہ کر یہودیوں کی تاریخ اور حبشیوں سے راہ و رسم بڑھا کر عیسائیوں کی سرگذشت معلوم کی۔ مزید برآں وہ یونانی زبان سے بھی واقف تھے جس سے ان کی معلومات اور وسیع ہو گئی تھی۔ یہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام میں انبیاء کے قصے لکھے۔ انہیں لوگوں میں "طاؤس بن کیسان" تابعی اور موسیٰ بن سیار اسواری" ہیں۔ مؤخر الذکر کے متعلق جاحظ کا قول ہے کہ وہ دنیا کی حیرت انگیز شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ عربی و فارسی زبان کی فصاحت پر ان کو یکساں عبور حاصل تھا۔ وہ اپنی مشہور مجلس میں ایک خاص مقام پر بیٹھتے جہاں ان کے دائیں جانب عرب، اور بائیں جانب ایرانی بیٹھا کرتے تھے۔ پھر وہ قرآن مجید کی ایک آیت پڑھ کر عربوں کے لیے اس کی شرح عربی میں بیان کرتے اور بائیں جانب منہ پھیر کر فارسی میں ایرانیوں کے لیے اس کی تفسیر بیان کرتے، اور یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس زبان میں زیادہ خوبی سے تفسیر بیان کرتے ہیں۔

ان ہمسایہ غلام اقوام کے ادب کی تاثیر ادب عربی میں یونان و روم کے ادب سے زیادہ شدید اور واضح طور پر ہوئی۔ اس لیے کہ یونان و روم کے باشندوں نے نہ اسلام قبول کیا نہ عربی زبان اختیار کی کہ عربی ادب بلا واسطہ ان سے متاثر ہوتا۔ یہ اقوام خود مختار ہیں۔ انہوں نے اقتصادی تعلقات کے علاوہ عربوں سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ عربوں نے تہذیب سے دوری، زبانوں سے لاعلمی، فتوحات اور لڑائی جھگڑوں میں انہماک، نیز اپنے آداب میں تعصب کی بناء پر ان اقوام میں سے کسی کے ادب کو اپنی زبان میں لانے کے مسئلہ پر غور نہیں کیا مگر ایرانیوں نے جو ذاتی، معنوی اور وطنی طور پر عربوں میں مدغم ہو رہے تھے از خود براہ راست اور بلا درخواست عربوں کے دین اور ان کی زبان پر اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ عربوں کی تمام تر توجہ حکومت چلانے اور فوجی نظام قائم کرنے میں لگی ہوئی تھی، اور ان دونوں شعبوں سے انہوں نے مفتوح قوم کو دور رکھا تھا۔ لہذا ان قوموں نے شرعی علوم اور ادبی فنون کی تحصیل شروع کر دی۔ چنانچہ حدیث کے راوی، فقہ کے حامل، دفاتر کے منشی و محرر، شاعر، نحو و لغت کے عالم، سب انہیں میں سے ہونے لگے۔ اور اس طرح وہ ہمارے رشتہ میں منسلک ہو گئے۔ اور ان کا ادب ہمارے ادب میں اس طرح گم ہو گیا جس طرح بارش کی چھڑیاں سمندر کے وسعتوں میں گم ہو جاتی ہیں۔

ادب اسلامی کی قسمیں

شاعری

ظہور اسلام کے وقت عربوں کی زندگی میں کٹر جاہلیت ، اکھڑ ذہنیت اور فرقہ وارانہ تعصب مستحکم تھا۔ شاعری ان جذبات وصفات کو ظاہر کرنے اور ابھارنے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ جب آں حضرتؐ نے دلوں کو جوڑنے اور عربوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ان اخلاق فاسدہ کے خلاف اعلان جنگ کیا تو لازمی طور پر یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ شاعری کی جڑ اکھاڑ کر اس کو بے توقیر کیا جائے۔ شاعروں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔ "الشعراء یتبعھم الغاؤن۔ نیز وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ" یعنی "شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ اور ہم نے اس (نبی) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ شاعری اس کے شایان ہے" اور حدیث شریف میں ہے "اگر تم میں سے ایک شخص کا پیٹ پیپ سے بھر کر سڑ جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اس کا منہ شعر و شاعری سے بھرے" چنانچہ عام مسلمانوں نے شعر گوئی اور شاعری کو بیان کرنے سے پہلوتہی کر لیا ، حالانکہ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ مذہب کلی طور پر شاعری کا مخالف نہیں ہے بلکہ وہ محض شاعری کی اس قسم کو ناپسند کرتا ہے جو اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کرتی ہے اور دلوں کے پوشیدہ بغض وعداوت کو برانگیختہ کرتی ہے۔ پھر تمام عرب والے عظیم الشان دعوت میں مشغول ہو گئے کوئی اس دعوت کا حامی تھا کوئی مخالف۔ رسول اللہؐ اور قریشیوں میں سخت جھگڑے ہونے لگے۔ قریشیوں نے آپ کی مخالفت میں کھلم کھلا زبانوں اور نیزوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شعرائے عرب غیر جانبداری سے دور کھڑے ہو کر حق و باطل ، توحید و بت پرستی ، جمہوریت و ملوکیت یعنی محمدؐ اور قریش کے درمیان ہونے والے معرکہ کے انجام کا انتظار کر رہے تھے۔ اس جھگڑے میں قریشی شاعروں کے سوا کسی نے حصہ نہیں لیا۔ اسلام سے قبل تمدنی و تجارتی مصروفیتوں کے سبب سے قریش میں شاعروں کی کمی تھی ، لیکن اسلام کے بعد جھگڑے مخالفت اور مباحثہ کی وجہ سے ان کی کثرت ہو گئی۔ اس حملہ کی پہل قریشیوں میں سے عبداللہ بن الزبعری ، عمروبن العاص ، اور ابوسفیان نے کی۔ انہوں نے آں حضرتؐ اور ان کے متبعین کو دل خراش ہجو کے ذریعہ سخت اذیت پہنچائی جس سے مسلمانوں میں بھی جذبۂ شاعری بھڑک اٹھا اور انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں مخالف شاعروں کے جواب میں شاعری کرنے کی اجازت دے دیں۔ اور کچھ مدت بھی نہ گذری کہ آں حضرتؐ نے ان سے فرمایا "جن لوگوں نے اللہ و رسول کی اپنے ہتھیاروں سے مدد کی ہے ان کو کیا چیز روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے ان کی مدد نہیں کرتے؟" چنانچہ صحابہ کی ایک جماعت قریشیوں کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئی۔ جن میں حسان بن ثابتؓ کعب بن مالکؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ قابل ذکر ہیں۔ یہ شاعرانہ جنگ بالکل جاہلانہ طرز پر تھی۔ جس میں نہ تو حملہ آور بت پرستی کی فضیلتیں بیان کرتے تھے۔ نہ مدافعت کرنے والے اسلامی فضائل ، جس کے باعث ہمیں یہ کہنے کا موقع ملتا کہ شاعری نے فنی اعتبار سے اس زمانہ میں کوئی

نیا قدم بڑھایا، بلکہ آپس میں ہجو کرنے کے لیے انہوں نے اپنا وہی پرانا جانا بوجھا طرز اختیار کیا تھا جس میں حسب و نسب پر فخر ہوتا، سرداری دبزرگی کی ڈینگیں ماری جاتیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حسان بن ثابت رضؓ سے یہ فرمانا کہ ابوبکرؓ کے پاس جاؤ اس لیے کہ وہ قریش کے عیوب اور کمزور پہلو خوب جانتے ہیں، نیز یہ فرمانا کہ تم ان کی ہجو کیونکر کرو گے حالانکہ میں بھی انہی میں سے ہوں، اور اس پر حسان بن ثابت رضؓ کا یہ جواب کہ میں آپ کو اس طرح صفائی سے نکال دوں گا جس طرح گندھے ہوئے آٹے میں سے بال، ہمارے مذکورہ بالا قول پر حجت و دلیل ہیں۔

لہذا اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد نبوت میں شاعری اپنے جاہلی طریقہ پر رہی۔ اور ایک مدت کے بعد جب قریش اور تمام اہل عرب نے نئے مذہب کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو تمام بدزبانیں گونگی ہوگئیں اور جاہلی شاعری دوبارہ بھاگ کر صحراء میں پناہ گزین ہوگئی۔ مسلمان حفظ کلام اللہ، روایت احادیث اور جہاد مشرکین میں مشغول ہوگئے۔ اس لیے محرکات شاعری میں کمی واقع ہونے کی وجہ سے شاعری کی آواز مدھم پڑگئی، ہاں وقتاً فوقتاً حقیقی مدح یا سچا مرثیہ کہنے کے لیے وہ نمودار ہو جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعری کے سننے میں رواداری کا سلوک برتا، بعض شاعروں کو انعام دیے، اور شاعری کے بارے میں ارشاد فرمایا "بے شک بعض شاعری دانشمندی و حکمت ہوتی ہے"۔

یہ تھی عہد نبوت میں شاعری کی حالت، اور اس کے بعد تو مقابلہ و مباحثہ کے خاتمہ، خلفاء کی شعراء کے خلاف سخت "ادبی کارروائی" اور عربوں کے فتوحات میں انہماک نے شاعری کی حالت اور زیادہ ناقابل التفات اور بے وقعت بنا دی۔ لیکن دوسری طرف دین نے لوگوں کے دلوں میں اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ تمدن کی روشنی ذہنوں میں پہنچ رہی تھی، جس کا دھندلا سا اثر مخضرمین[1] کی شاعری میں نمودار ہونے لگا تھا۔ مثلاً کعب بن زہیر، حطیئہ، معن بن اوس اور نابغہ جعدی۔ لیکن یہ اثر چند اسلامی الفاظ مثلاً معروف، منکر، صلاۃ، زکاۃ، جنت، نار، مہاجرین اور انصار سے آگے نہ بڑھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مخضرمین کو جدا گانہ طبقہ قرار دینا مبالغہ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی شاعری، جاہلی مسلک ہی پر باقی رہتے ہوئے اسلام سے خفیف سی متاثر ہوئی تھی۔ جیسے حضرت حسان رضؓ کی شاعری میں کمزور اسلوب یا لبید کی طبیعت میں کم گوئی، یا جیسے حطیئہ اور نابغہ جعدی کے کلام میں کثرت و فراوانی۔ لیکن حق وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا کہ عربی شاعری جاہلیت و اسلام میں اپنے ظاہر و باطن اور اپنی قسم کے اعتبار سے اواخر عہد بنی امیہ تک ایک ہی طریقہ پر رہی۔ ہمسایہ مغلوب اقوام، سیاست، تمدن اور مذہب کے اثر نے اس کو کسی نئے راستہ پر نہیں موڑا۔ البتہ ان چیزوں نے اس کے بہت سے گوشوں کو اجاگر اور معانی و مضامین کو وسیع تر کر دیا، جس سے شاعری کے بعض موضوعات مثلاً ہجو کو تقویت پہنچی اور بعض میں کوئی نمایاں خصوصیت پیدا ہوگئی مثلاً غزل۔ بھلا شاعری میں جدت طرازی کا امکان کس طرح ہوتا جب کہ تمام شعراء دیہاتوں اور جنگلوں سے آتے تھے، خود خلفاء بھی صحرا نوازی کے تعصب میں مبتلا تھے۔ رادی، ادیب

---

[1] مخضرم اس شاعر کو کہتے ہیں جو اسلام و جاہلیت، دونوں زمانے پائے۔

اور نغوی سب ہی شعر و لغت جنگلوں اور دیہاتوں میں جاکر حاصل کرتے ۔ مزید برآں عرب فطرتاً تقلید پسند واقع ہوئے تھے اور قدیم سیادت و اخلاق و ادب و روایات کا احترام کرتے تھے ؛ ہم اس لاحاصل بحث میں پڑنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ پہلی صدی ہجری میں شاعری کا ایک ایسا جدید مسلک رونما ہو چکا تھا جو کسی جدید ادب عربی کی بنیاد کی حیثیت رکھنے کے قابل تھا ۔ اس لیے کہ "عمر بن ابی ربیعہ" کے تغزل کا انداز وہی ہے جو "امرؤالقیس" کے تغزل کا ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "عمر بن ابی ربیعہ" کے تغزل میں کچھ شہری خیالات اور تمدنی ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح "جریر" "فرزدق" نے ہجو میں جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ "حطیئہ" اور "شماخ" کے طریقہ سے مختلف نہیں ، صرف ان کے کلام میں کچھ سیاسی مضامین و معانی کا اضافہ ہے ۔ لہذا اب ہم عہد بنی امیہ میں عراق و حجاز کی شاعری کی تحریک کے تجزیہ ، اس کی اہمیت اور عربوں کے لیے عقلی مواد کی فراہمی میں اس کی گراں قدر تاثیر کا ذکر شروع کرتے ہیں ۔

قحطانیت ، عدنانیت ، علویت ، بکریت ، ہاشمیت ، امویت ، عربیت اور قومیت کی آگ مسلمانوں میں کوہ آتش فشاں کے لاوے کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی ۔ لیکن یہ اندرونی آگ حکام کی سیاست اور ان کے نظام حکومت کے لحاظ سے ہلکی اور تیز ہوتی رہتی تھی ۔ قبائل عرب تعصب کی اسی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے متفرق شہروں میں بستے تھے ۔ خود بصرہ و کوفہ اسی خیال کے ماتحت بسائے گئے تھے ۔ ایران ، شام ، عراق اور اندلس سے اس خیال کی مخالفت ہو رہی تھی ، اور اس تمام تگ و دو کا مدعا حصول قیادت و امامت تھا ۔ جو شخص زمانۂ جاہلیت میں سردار تھا وہ اسلام میں بھی سردار بننا چاہتا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اس نئے مذہب کو اس کے سوا کچھ نہ سمجھا کہ یہ بھی ان کے اقتدار حاصل کرنے کا ایک طریقہ ، نیز غلبہ ، سرمایہ اور حکومت تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس ! شاید آپ کو یاد ہو گا کہ بعض قبائلی سرداروں نے جیسے قیس بن عاصم اور احنف بن قیس ، آں حضرت ؐ کے یہ پیشکش کی تھی کہ وہ دین اللہ میں داخل ہونے کے لیے تیار ہیں ، اس لیے نہیں کہ وہ دین حق ہے بلکہ اس لیے کہ آپ کے بعد حکومت و اقتدار ان کو مل جائے ۔

قبائلی تعصب کی یہ روح خلافت ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانے میں ان کے حسن و تدبیر و عدل ، نیز عربوں کے جہاد اور غنیمت و فتوحات میں لگے رہنے کی وجہ سے دبی رہی لیکن جب اقتدار حضرت عثمانؓ کو حاصل ہوا ، تو دست کار فرما کمزور پڑ گیا اور اسے دوسرے ہاتھ نے سہارا دیا ۔ خیالات میں اختلاف ہونے لگا ۔ اب صرف خلیفہ ہی رائے دینے والا نہ تھا ، اس کے خاندان نے بھی عربی قومیت کو چھوڑ کر اموی تعصب کو ہوا دیتے ہوئے حکومت شروع کر دی ، یہ زمانہ تھا جب فتوحات کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس بے حد مال و دولت آ رہی تھی ۔ چنانچہ یہ فتنہ جاگ اٹھا اور ایک انقلاب برپا ہو گیا جس کا خاتمہ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت پر ہوا ۔ اس کے بعد ہی حضرت علی رضؓ و معاویہ رضؓ کے درمیان نیا جھگڑا چھڑ گیا ۔ حضرت امام شہید کر دیے گئے ۔ نظام حکومت درہم برہم ، اور اتحاد اسلامی پارہ پارہ ہو گیا ، عرب بجائے دشمنوں سے

جہاد کرنے کے آپس میں زبان اور تلواروں سے لڑنے لگے ۔ وہ متفرق جماعتوں میں بٹ گئے جن میں سے بعض دیندار اور بعض دنیا دار تھیں ۔ شام میں بنو امیہ کے مؤید بن تھے جو ان کے لیے امارت و حکومت کی داغ بیل ڈال رہے تھے ۔ حجاز میں ابن الزبیر کے حامیوں کی جماعت تھی جو ان کے دعوی کی تائید اور ان کی آواز کی حمایت کرتی تھی ۔ عراق میں اہل بیت کے ماننے والے تھے جو خلافت میں ان کا حق طلب کرتے تھے ۔ ایک جماعت جمہوریت پسند تھی جو تمام جماعتوں کی مخالف اور تمام لیڈروں کو کافر بتاتی تھی ۔ وہ خلافت میں عوام کے مشورہ کی قائل تھی ۔ مذکورۂ بالا چار جماعتوں میں تمام مسلمانوں کے خیالات و آراء منقسم تھے ۔ صرف ایک مختصر سی جماعت مرجئہ غیر جانبدار رہ گئی تھی جو ان جھگڑنے والوں کا فیصلہ روز قیامت خدا پر چھوڑے ہوئے تھی ۔ ان جماعتوں میں جھگڑے ہوتے رہے ، جھگڑنے والوں نے آپس میں تشدد اور سختی سے کام لیا ۔ البتہ معاویہ رض نے حکومت پر پورا قبضہ کر لینے کے بعد ہوشیاری و دانشمندی ، بخشش و انعام درگذر و چشم پوشی ، اور حسن تدبر سے کام لیا ، جس کی وجہ سے ان کی زندگی تک حکومت منظم طور پر چلتی رہی اور کہیں کہیں صرف خوارج نے بدنظمی پیدا کی ، لیکن ان کے انتقال کے بعد ہی ان کی سیاست کا دم ختم جو ان کے دشمنوں کو بے حس کیے ہوئے تھا کافور ہو گیا اور انہوں نے ان کے تخت و حکومت کو ہلا ڈالا اور جب وہ کمزور ہو گیا تو مروان اور اس کے لڑکوں نے اسے سنبھال لیا اور اس کو بچھا کر اس پر بیٹھ گئے ۔ عبدالملک کے زمانہ میں جھگڑوں نے پھر نازک شکل اختیار کر لی اور لڑائیاں ہونے لگیں ۔ خلافت کے دعویدار بڑھتے گئے ۔ اور عربوں کا دائرہ اقتدار وسیع ہوتا گیا ۔ مال غنیمت کی ریل پیل ہو گئی اور اس نئی نسل کا شباب کمال پر پہنچ گیا جس نے زمانۂ اسلام میں جنم لیا اور فتوحات کے پھلوں سے غذا حاصل کی ۔ جو تمدن سے بہرہ ور ہوئی ۔ متفرق قوموں کے درمیان رہی اور جس نے اپنے ہاتھ اور زبان سے ان فتنوں میں حصہ لیا ۔ یہ اسباب تھے جن کی بناء پر ادب عربی اپنے عروج کی انتہائی منزل کمال پر پہنچ گیا تھا ، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ شاعری اس پُر ہنگامہ زندگی ، تعصب پرستی ، جنگجو جماعتوں اور متضاد خیالوں کے اثر سے بچی رہتی حالانکہ عربی شاعری پروردہ جنگ و جدال ہے ، جسے فرقہ پرستی ابھارتی ، جنگ قوت بخشتی ، اور جدائی ڈالنے والے شیاطین اس کے مضامین شعراء کے دلوں میں ڈالتے ہیں ؟ سچ پوچھو تو شاعری ہی ان فتنوں کا ایندھن اور ان فرقوں کی زبان تھی اور ان جھگڑنے والوں نے شاعری سے وہی خدمت لی تھی جو ہمارے اس زمانہ میں اخبارو اور رسالوں سے لی جاتی ہے شاعری ہی اپنے لیڈروں کی مدافعت اور ان کے افکار و خیالات کی حمایت کرتی تھی اور وہ اس عقیدہ کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی جس کی وہ حامی و داعی ہوتی تھی ۔ اب جبکہ آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ تمام عرب نے ان جھگڑوں میں حصہ لیا اور عربوں کی اکثریت شاعر ہے ، خاص طور پر ایسے انقلابی ہنگاموں میں ۔ پھر یہ بنو امیہ نے مال کے ذریعہ شاعروں کو اپنا طرفدار بنانا شروع کر دیا تھا ، اور شاعروں میں باہمی مقابلہ اور ہجو کی آگ بھڑکا دی تھی ، نیز یہ کہ شاعری اس وقت ایک جداگانہ پیشہ بن گئی تھی جس پر بہت سے لوگوں کا گذارہ تھا ، تو آپ کو عبدالملک کے زمانہ میں شاعری کی کثرت اور شعراء کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ معلوم ہو جائے گی ۔ اس وقت وہاں نامور و بلند پایہ شاعروں کی تعداد سو تک پہنچ چکی تھی ۔ اس میں

شک نہیں کہ شاعری اپنے پرانے انداز و مزاج ہی پر قائم رہی، تاہم وہ اس نئی زندگی سے بھی مضامین و مقاصد اخذ کرنے میں نمایاں طور پر متاثر ہوئی، لیکن یہ زندگی صرف سیاسی جھگڑوں اور دینی بحثوں ہی میں محدود نہ تھی کہ اس کا اثر اسی حد پر پہنچ کر ختم ہو جاتا، بلکہ اس زندگی کے دوسرے پہلو بھی تھے جن کو شاعری کے اثرات بیان کرنے سے قبل بتا دینا بہتر ہوگا۔

ان سیاسی و اجتماعی اختلافات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عربی راجدھانیوں میں اس زندگی کے مظاہر بھی مختلف ہوں، عراق جو قدیم زمانہ سے اپنی زرخیزی شادابی کی وجہ سے عربوں کی تلاش معاش کا مرکز بنا ہوا تھا، جس کے گرد و نواح میں اسلام سے پیشتر بھی وہ پناہ گزین ہو چکے تھے اور جہاں ایرانیوں کی زبان اور ان کا ہاتھ کارفرما تھے اور انہوں نے مناذرہ کی حکومت بنائی تھی۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں جب عربوں نے اسے فتح کیا تو وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر وہاں بسنے لگے اور انہوں نے دیہاتی سرحدوں پر کوفہ و بصرہ کو آباد کیا۔ عراق میں پچھلی قوموں کے علم و ادب اور دین کا وافر ترکہ موجود تھا، لیکن عراق کو مصر کی طرح اسے ہضم کرنے اور پچانے کی قوت نہیں ملی تھی جس کے ذریعہ وہ اپنے باشندوں کو ایک قوم اور ایک ذہنیت کا بنا دیتا اور اسی چیز نے وہاں کے باشندوں کے خیالات کو پراگندہ اور دلوں کو ایک دوسرے سے بیگانہ بنا دیا تھا۔ خود عرب بھی وہاں نزاری اور یمنی تعصبات.... لے کر پہنچے۔ پھر اسی سرزمین میں عظیم الشان اسلامی واقعات رونما ہوئے۔ مثلاً جنگ جمل، ائمہ و قائدین کی شہادتیں، جن کی وجہ سے شیعہ و خوارج وجود میں آئے اور بنو امیہ کی سخت مخالفت، نیز بصریوں اور کوفیوں کا سیاسی، دینی اور علمی مسالک میں شدید اختلاف، جس میں بصرہ عثمانی اور کوفہ حضرت علیؓ کے وہاں قیام کرنے کے بعد علوی ہو گیا تھا۔ جزیرہ فراتیہ میں عیسائی آباد تھے یا خارجی، اس لیے کہ وہ خاندان ربیعہ کا مسکن تھا جو بقول اصمعی ہر فتنہ کی جڑ تھا۔ اور اسی خاندان سے بنو تغلب تھے جن کے متعلق حضرت علیؓ نے فرمایا تھا، "اے عرب کے خنزیرو! اگر میں نے اس حکومت پر قابو پالیا تو تم پر جزیہ لگا دوں گا"۔ عراقی شاعری اسی باہمی منافرت اور پریشان انقلابی زندگی کی تصویر ہے۔ اسی لیے پرزور اور سخت متشدد ہے۔ فخر و ہجو کی اس میں کثرت ہے، قبائلی تعصب، وطنی مذہبی اور قومی جماعت بندیاں نئے نئے روپ بھر کر اس میں نمودار ہوئی ہیں۔ اور اسلامی تعلیمات سے زیادہ اس پر جاہلانہ میلانات، بدویانہ ماحول اور اموی انعامات میں پرورش پانے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ شاعری پھلی پھولی اور اس نے اتنی وسعت اختیار کی کہ ہر زبان اس کی طرف متوجہ ہوئی اور ہر جگہ جا پہنچی اور ہر اصول و مقصد کی ترجمانی کی۔

منبع اسلام حجاز دریائی چشموں سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ وہاں سے خاموشی اور نرمی کے ساتھ صاف پانی پھوٹ رہا تھا، لیکن جوں جوں وہ دور پہنچتا جا رہا تھا راہ میں آبشاروں کے ملنے اور طوفانی امواج کے پیدا ہونے سے اس کا پاکیزہ اور میٹھا پانی گدلا ہونا شروع ہو رہا تھا اور اس کا زور و شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر وہ منتشر ندیوں نالوں میں گیا جن میں سے بعض بنجر زمینوں میں تھے اور بعض زرخیز علاقوں میں، چنانچہ کچھ علاقوں کو سیراب کر دیا اور کچھ کو تہ آب کر دیا۔ خلافت، باہمی مخالفت اور علم

یہاں سے منتقل ہو کر عراق و شام پہنچ گئے اور حجاز پہلے کی طرح جیسا کہ وہ آج بھی ہے باقی رہ گیا۔ جو ہر علاقہ سے مال و امداد قبول کرتا ہے۔ بنو امیہ نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت وہاں ہاشمی نوجوانوں کو نظر بند کر دیا تھا، جہاں سے وہ بلا اجازت حجاز نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ انہیں عیش و آرام کے وسائل مہیا کر کے مال و دولت میں بہلا کر حکومت سے بیگانہ کر کے عیش کوشی کا خوگر بنا دیا تھا، ان تمام آسائشوں کے ساتھ انہیں اپنے مجاہد آباؤ اجداد سے مال غنیمت اور لونڈی غلام میراث میں ملے تھے، مزید برآں طبعی طور پر اہل حجاز میں خوش مذاقی، ظرافت، نرم دلی، نزاکت احساس، قوت گویائی کھیل کود اور تفریحی مشاغل کی محبت موجود تھی۔ چنانچہ وہ عیش و آرام میں مست ہو کر بے فکری سے مزے اڑانے لگے اور اپنے دن رنگین صحبتوں اور خوش گپیوں میں گذارنے لگے۔ ہنسی مزاق اور تفریحی زندگی کا کوئی کوچہ ایسا نہ رہا جہاں ان کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ حج انہیں حسین عورتوں اور گانے والیوں سے ملانے کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس صورت حال نے تمام گانے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ حکومت کے تمام علاقوں سے کھنچ کر مکہ و مدینہ میں پہنچ گئے، حتیٰ کہ بقول ابوالفرج اصفہانی ایک وقت میں وہاں ذیل کے گانے والے جمع ہو گئے تھے

"ابن سریج، غریض، معبد، حنین، ابن محرز، جمیلہ، ہیت، طویس، دلال، برد الفواد، نومۃ الضحیٰ، رحمۃ، ہبۃ اللہ، مالک، ابن عائشہ، ابن طنبورہ، عزۃ المیلاء حبابۃ، سلامہ، بلبلہ، لذۃ العیش، سعیدہ، زرقاء ابن مسجح" اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ گانا لوگوں کے کاروبار اور دوسرے رجحانات پر بھی غالب ہو گیا۔ حضرت امام مالکؒ نے اپنا ایک قصہ بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں "جب میں بچہ تھا تو گویوں کے پیچھے لگا رہتا تھا، ان سے گانا سیکھتا تھا۔ ایک دن مجھ سے میری ماں نے کہا بیٹا! اگر گویا بدشکل ہوتا ہے تو اس کا گانا مقبول نہیں ہوتا۔ لہٰذا تم گانا چھوڑ دو اور فقہ سیکھو۔ اس لیے کہ فقہ کے ساتھ بدشکلی کچھ نقصان نہیں پہنچاتی۔ اس پر میں نے گویوں کی صحبت چھوڑ دی اور فقہاء کے پاس رہنے لگا۔ چنانچہ خدا نے مجھے اس مرتبہ پر پہنچا دیا جس پر تم مجھے اس وقت دیکھ رہے ہو۔" یہی اسباب تھے جن کی بناء پر حجاز کے شہروں میں عشق و محبت کا چرچا عام ہو گیا تھا، اور ان کے جذبات میں نزاکت ترقی کر رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے غزل کو شائستہ نازک اور سچے راستوں پر چلایا، یہاں تک کہ شاعری کی یہ صنف ان کو جدت نگاری و نیرنگی اسالیب کی بناء پر ان ہی سے شروع ہوئی اور ان ہی پر ختم ہو گئی۔

شام کا علاقہ بنو امیہ کے زیر نگیں ہو کر ان کا مخلص و فادار اور پر زور موید بن گیا تھا، اس لیے وہ ذاتی جھگڑوں اور سیاسی ہنگاموں سے بچا رہا۔ نہ اس میں حجاز کی طرح آتش شوق و جذبات بھڑک رہی تھی نہ عراق کی طرح وہ مختلف رجحانات و پراگندہ خیالات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ خلفاء نے بھی بے خطر سمجھتے ہوئے اس علاقہ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اور کسی کے خلاف اس کے تعصب کو بیدار نہ کیا۔ نہ مال و دولت سے اس کے جذبہ طمع کو بھڑکایا۔ چنانچہ یہاں کی شاعری خاموش پڑی رہی نہ کسی محرک نے اسے ابھارا، نہ اس کے مطالعہ اور اشاعت کی طرف کسی محقق نے زیادہ توجہ کی۔ یہاں شاعری کا بیشتر حصہ عراق و حجاز کے وہ شاعر لائے تھے جنہیں قصر شاہی کی سخاوت یا حکمت عملی کھینچ لاتی تھی، یا پھر وہ ادباء

جنہیں کسی مشکل لغوی نحوی یا ادبی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے خلفاء بلاتے تھے۔

عراقی شاعری کی خصوصیات

شاید عراق کی اسلامی شاعری خانہ بدوش غیر متمدن زندگی کی سب سے زیادہ سچی عکاس اور نفسیات عرب کی سب سے زیادہ صحیح ترجمان ہے۔ اس لیے کہ وہ — ہمارے قول کے مطابق اگرچہ جاہلی شاعری کے طریقہ پر ہی باقی تھی۔ اُسی کا زور اسے متحرک کیے ہوئے تھا، اور اُسی کے چشموں سے وہ پھوٹ رہی تھی — زمانہ تدوین علوم سے قرب اور سیاسی ذرائع و تاریخی واقعات سے اتصال کی بناء پر جملوں کی پاکیزگی، اسباب و وجوہ کی وضاحت اور نسبت کی صحت میں بہت زیادہ مکمل تھی۔ اور وہ اس ابتدائی تمدنی زندگی کا مظہر تھی جو اسلام نے پہلی مرتبہ عربوں کے لیے فراہم کی تھی۔ اس نے منتشر جماعتوں میں ایسی یکانگت پیدا کر دی تھی جو بظاہر جمعیت و محبت نظر آتی تھی لیکن بباطن عداوت و فرقہ بندی تھی۔ یہ شاعری آپس میں ایک دوسرے کی ہجو گوئی، جماعتوں کے باہمی مقابلہ و مباحثہ، قبیلوں کے درمیان فخر و مباہات اور زعماء و خلفاء کی مدح و ستائش پر مشتمل ہے اور یہ ایسے موضوعات ہیں جن کو ادا کرنے کے لیے فصیح الفاظ، پختہ اسلوب، طویل بحر اور بدویانہ انداز لازمی ہیں۔ اور طبعی طور پر ہجو گوئی میں اس کا دار و مدار باپ دادا کے عیوب مثلاً بخل، بزدلی، اقلیت دکمزوری اور ذلت پر ہوگا۔ اسی طرح مدح و فخریں اپنے گذشتہ خونی واقعات کے بیان اور اپنے باپ دادا کے غلبہ اور لوٹ مار کے ذکر پر ہوگا۔ ہجو گوئی کی خاص و عام اقسام کے اعتبار سے اس زمانہ میں عراق تقریباً مرکز بن گیا تھا۔ اس لیے کہ آپس میں لڑنے والے قبائل وہاں جمع تھے۔ نئے نئے مذاہب وہاں پیدا ہو رہے تھے۔ اور وہاں کے باشندوں پر بدویت، نخوت و تکبر کا غلبہ تھا۔ لہٰذا وہاں کے شعراء ہجو گوئی سے ابتداء کرتے، اسی میں نئے نئے طریقے نکالتے اور اسی پر گذارہ کرتے تھے۔ ہجو گوئی ان کے یہاں نئے نئے اسباب و ذرائع اختیار کرتی رنگ برنگ کے کپڑے پہن لیتی۔ وہ شخصی، خاندانی، وطنی، دینی اور سیاسی شکل میں رونما ہوتی، لیکن فی الواقع اس کی تہ میں ایک ہی کارفرما طاقت تھی اور وہ تھی ان کی موروثی عصبیت اور قدیمی دشمنی۔

وقد ینبت المرعی علی دمن الثری   وتبقی حزازات النفوس کما ھیا

"گھاس کبھی نمناک زمین کے گھوروں پر بھی اُگ جاتی ہے، مگر دلوں کی کدورتیں اور عداوتیں اپنی حالت پر باقی رہتی ہیں"

یہ شعر غیاث بن غوث اخطل کا ہے جو جزیرہ کی آواز، تغلب کی زبان، عیسائی ادیب اور بنو امیہ کا شاعر تھا۔ جس نے اپنی شاعری کی ابتداء ہجو گوئی کے ذریعہ کی کمسنی میں اس نے اپنے باپ کی ہجو کی، جوان ہو کر تغلبی شاعر کعب بن جعیل کی ہجو میں شعر کہے اور اس کو بے عزت و بے آبرو کیا۔ اسی گستاخی اور نامعقولیت کے باعث جوانی میں ہی اسے "اخطل"، یعنی احمق کا خطاب مل گیا تھا۔

پھر وہ ان جھگڑوں کو نظم کرنے لگا جو اس کے ساتھ ہوتے یا اس کے قبیلہ سے دیگر قبائل کے ساتھ ہوتے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ یزید بن معاویہ ولی عہد اور عبدالرحمٰن بن حسان انصاری کے درمیان بحث و تکرار ہوئی تو یزید نے انصار کی ہجو کہنے کے لیے کعب بن جعیل کو بلایا، لیکن انہوں نے آں حضرت ؐ کو پناہ دینے والی اور آپ ؐ کی مدد کرنے والی قوم کی مذمت کرنا اور ہجو کہنا مناسب نہ سمجھا اور کہا کہ میں آپ کو ایک پختہ کار بدکار شاعر کی نشان دہی کرتا ہوں (یعنی اخطل)۔ چنانچہ اخطل نے انصار کی ہجو میں اشعار کہے جن میں انصار کو کاشتکاری، کمینہ پن اور شراب نوشی کے طعنے دیے۔ اور اپنے رائیہ قصیدہ میں قریش کو انصار پر فضیلت و ترجیح دی۔ اگر یزید کی مدد نہ ہوتی تو اپنی اس حرکت کی وجہ سے وہ بڑی مشکل میں پڑ جاتا۔ بنو امیہ نے بہت زیادہ اس کا اعزاز و احترام کیا اور اس نے بھی اپنی طرف سے ان کی حمایت و مدافعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انصار کے بعد وہ زبیریوں کے مقابلہ میں بولنے لگا۔ پھر قبائل قیس کا رخ کیا اور پھر اپنے اس ہجویہ قصیدہ کے ذریعے جس کا مطلع درج ذیل ہے ان کے ایک ایک قبیلہ کا پردہ چاک کر ڈالا:-

أَلا یا اسلمی یا ھند ھند بنی بکر ۔۔۔ و ان کان حیانا عدی آخر الدھر

"اے ہند! بنی بکر کی ہند! تو سلامت رہنا! باوجودیکہ ہمارے قبیلے رہتی دنیا تک ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔"

اس لیے کہ ایک طرف تو اس قبیلہ نے امویوں سے ٹکر لے رکھی تھی، دوسرے وہ جزیرہ میں شاعر کی قوم پر تسلط جمائے ہوئے تھے۔ پھر اس نے اپنی زندگی فرزدق کی حمایت اور جریر کی ہجو کرنے میں ختم کر دی۔ خلفاء سے گہرے مراسم کے باوجود اخطل عیسائی مذہب کا سختی سے پابند تھا۔ پادری لامنس نے اس کے متعلق ایک فصل لکھتے ہوئے بیان کیا ہے "اخطل کے دین میں عیسائیت کا رنگ ہلکا سا ہے، اور اس کی عیسائیت غیر مہذب قوموں کے دینی عقائد کی طرح سطحی ہے"، وہ دین کی آڑ لے کر مستقل شراب پیا کرتا، خلیفہ کی پناہ میں آکر خوب ہجو کہتا، تغلب کی پشت پناہی میں تمام قبیلوں پر حملے کرتا، لیکن اس کی ہجو کے الفاظ پاکیزہ و مہذب ہوتے جن میں نہ مبالغہ آمیزی ہوتی نہ اخلاقی حدود سے تجاوز۔

ابو فراس ہمام بن غالب فرزدق دارمی ثم تمیمی بھی معزز و آسودہ گھرانے کا شریف النفس فرد ہونے کے باوجود بصرہ میں ہجویہ شاعری کرتے ہوئے بڑا ہوا بدخلقی اور تندی طبع کے باعث وہ اپنے خاندان والوں کی ہجو کیا کرتا تھا۔ جب لوگ اس کے باپ سے اس کی شکایت کرتے تو باپ اسے مارتا، پھر وہ لوگوں کی ہجو کرنے میں اس حد تک تجاوز کر گیا کہ لوگ اس کی شکایت زیاد کے پاس لے گئے جو عراق میں امیر معاویہ ؓ کے گورنر تھا۔ اس نے فرزدق کو طلب کیا تو وہ بھاگ کر عراق کے دوسرے شہروں اور قبیلوں میں چلا گیا۔ پھر مدینہ جاکر پناہ لی، اور زیاد سے بچنے کے لیے وہاں کے گورنر سعید بن العاص سے پناہ کا طالب ہوا، جنہوں نے اسے پناہ دے دی۔ جب زیاد کا انتقال ہو گیا تو شاعر اپنے وطن واپس آگیا، اور معاویہ و یزید کی موت کے بعد وہاں جو لڑائیاں اور فسادات رونما ہوئے ان میں حصہ لیا تاآنکہ مقدر نے اسے جریر

کے ساتھ ہجو گوئی کا مشغلہ دے دیا، جس نے اس کی تمام توجہ اپنی طرف کھینچ لی، اس کی زندگی کو مصروف بنایا اور شاعری کو چپکا دیا۔ چالیس سال سے زیادہ مدت تک یہ سلسلہ عوام کے لیے ایک تفریحی مشغلہ، ارباب سیاست کے لیے سامان دلبستگی، اور ادب عربی کے لیے عظیم الشان سرمایۂ شاعری بنا رہا۔ جو فحش کلامی اور سفلہ پن کے باوجود حکمت سے خالی نہیں ہے۔

جریر بن عطیہ خطفی تمیمی نے بھی کم سنی ہی میں اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح شاعری شروع کر دی تھی، اور ان دونوں کی طرح ہجویہ شاعری کی۔ لیکن گلہ بانوں کے دستور کے مطابق اس نے شاعری کی ابتدا رجز سے کی۔ کیونکہ وہ خود بھی چرواہا تھا۔ اس کے قبیلہ کی گمنامی، خاندان کی پستی، باپ کی ناداری اور اخلاق کی درشتی، وہ اسباب، تھے جنہوں نے شاعری میں کمال، اور ہجو گوئی میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے اس کی طبیعت کو مدد دی۔ میدان ہجو میں سب سے پہلا شخص جس کی اس نے ہجو کی اور اسے زیر کیا غسان سلیطی ہے، جس کی قوم کی اس نے ہجو کی تھی۔ سلیطی نے بعیث سے اس ہجو کے جواب میں مدد مانگی، چنانچہ بعیث نے اس کی مدد کی اور جریر کی ہجو میں اشعار کہے، جس کے جواب میں جریر نے سخت قسم کی چبھنے والی ہجو کہی۔ فرزدق نے جو جریر سے کسی شکایت کی وجہ سے جلا بیٹھا تھا بعیث کی حمایت میں جریر کی ہجو کہی۔ اور پھر دونوں تمیمی شاعروں میں باہمی ہجو گوئی کا زوردار مقابلہ شروع ہو گیا۔ اخطل نے قیس کی مدافعت، یا محمد بن عمیر سے رشوت لینے کی وجہ سے فرزدق کو اس مقابلہ میں برتر و افضل بتایا۔ اس پر جریر نے اس کی ہجو بھی کہہ ڈالی، پھر تو چاروں طرف سے اس پر ہجو کی بوچھاڑ ہونے لگی، حتیٰ کہ ہم عصروں سے اسّی شعراء اس کے مقابلہ میں آئے جن میں سے سوائے فرزدق اور اخطل کے سب پر وہ غالب آگیا۔ صرف یہ دونوں اس کے مقابلہ میں ڈٹ کر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جریر و فرزدق کے اس مقابلہ میں لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ اپنے شاعر کی حمایت کرتا۔ فرزدقیوں اور جریریوں میں باہم اسی قسم کی تکرار رہتی تھی جس طرح علویوں اور بنو امیہ میں تھی۔ ان میں سے ہر فریق پروپیگنڈے، تشدد، لالچ خوف اور مددگاروں کے ذریعہ فریق مخالف پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ فرزدق کے حامی مربد (مقام) میں اور جریر کے ماننے والے بنو حصن کے مقبرہ میں جمع ہوتے تھے۔ ہر دو شاعر اپنی جماعتوں میں اپنا کلام سناتے تھے جسے لوگ لکھ لیتے۔ بعد ازاں راوی اس کلام کو لوگوں میں عام کرتے اور ادباء و امراء ان کے کلام میں موازنہ کرتے، اس کو پرکھتے اور اس کے متعلق فیصلہ کرتے تھے۔ انصار، شعراء کو رشوت دیتے، علماء کو اپنا طرفدار بناتے، اور اس کوشش میں لگے رہتے کہ وہ اس جھگڑے میں اپنا فیصلہ ان کے شاعر کی موافقت میں دیں۔ اغانی میں یہ واقعہ درج ہے کہ ان میں سے ایک نے چار ہزار درہم اور ایک گھوڑا اس شخص کو پیش کر دیا تھا جس نے جریر پر فرزدق کو ترجیح دی تھی۔ ان دونوں شاعروں کے معاملہ میں لوگوں کی دلچسپی اور اہتمام نیز ان کی شاعری کے متعلق فیصلہ کرنے میں اختلاف پر اس سے زیادہ کوئی چیز بھی دلالت نہیں کر سکتی کہ دو بالمقابل لشکر تھوڑی دیر تک لڑنا بند کر کے اس بات کی خواہش کرنے لگے کہ خارجی ادیبوں میں سے ایک ان دو مہلب کے آدمیوں میں فیصلہ کر دے جو جریر و فرزدق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔

ابن سلام نے لکھا ہے کہ مہلب کے لشکر کے دو آدمی جریر و فرزدق کے بارے میں جھگڑنے لگے حالانکہ فرزدق خوارج کے بالمقابل تھا۔ جب وہ اس کے پاس گئے تو اُس نے اپنی جان بچانے کے لیے کہا کہ میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، البتہ تمہیں ایک ایسا شخص بتاتا ہوں جو ان دونوں کی ناراضی کو بآسانی برداشت کرے گا یعنی "عبید بن ہلال" جو اس دن "قطری بن فجاءۃ" کے لشکر میں تھے۔ چنانچہ وہ دونوں لشکرگاہ کے پاس جاکر کھڑے ہوئے اور اسے آواز دی۔ وہ اس خیال سے کہ کوئی اسے مقابلہ کے لیے بلا رہا ہے نیزہ گھسیٹتے ہوئے نکلا، جب قریب پہنچا تو دونوں نے دریافت کیا "فرزدق زیادہ بڑا شاعر ہے یا جریر؟" اس نے کہا "تم پر اور ان دونوں پر خدا کی لعنت ہو" ان دونوں نے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے سوال کا جواب دیدیں، پھر ہم ادھر چلے جائیں گے جدھر آپ چاہتے ہیں"

اس نے کہا کہ بڑا شاعر وہ جو کہتا ہے:۔

وطوى القياد مع الطراد بطونها
طيّ التجار بحضر موت برودا

"پیہم سفروں اور لگاتار تعاقب نے ان کے پیٹوں کو اس طرح دوہرا کر دیا ہے جس طرح حضرموت میں تاجر چادروں کو تہ کرتے ہیں"

انہوں نے کہا "یہ تو جریر کا شعر ہے" اس نے کہا "بس تو وہی ان دونوں میں بڑا شاعر ہے"

عراقی شاعروں میں ایک گروہ عبید راعی، ابوالنجم عجلی اور راجز کی طرح تھا۔ جس نے شاعری سے ناخنوں اور نکیلے دانتوں کا کام لے کر لوگوں کی آبرو کو چیر پھاڑ ڈالا اور عوام میں بیہودہ فحشیات کو رواج دیا۔ لیکن ان میں سے ایک بھی بلند پایہ شاعری یا ناموری میں جریر، فرزدق اور اخطل کے برابر نہیں پہنچا، اس لیے کہ بقول ابوعبیدہ ان (تینوں) کو شاعری کا وہ حصہ دیا گیا تھا جو اسلام میں کسی اور کو نہیں دیا گیا۔ ان لوگوں نے جن کی تعریف کی انہیں معزز و سربلند کر دیا۔ جن لوگوں نے ان کی ہجو کہی ان کے جواب نے ہی انہیں اٹھا کر بلند کر دیا اور جن کو بے وقعت سمجھتے ہوئے جواب نہ دیا وہ محض ان کی بے التفاتی کی وجہ سے گر گئے۔

ہجونگاری میں ان شعرا کا مسلک:۔ ہجو میں ان کا وہی پرانا تقلیدی مسلک اور عام مروجہ انداز تھا جو پہلے سے چلا آرہا تھا، البتہ شاعروں کے طبقہ، ماحول اور طبیعت کے اختلاف سے ان کی ہجو میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے۔

اخطل اپنی قوم کا سردار، شریف النسب، پاک طینت تھا۔ وہ شراب پیتا تھا۔ بادشاہوں کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ اگرچہ وہ کامل عابد و زاہد نہ تھا تاہم مذہب کا احترام کرتا تھا اور مذہب کی خاطر پادری کی مار اور قید و بند کی تکلیف برداشت کرتا تھا۔ مندرجۂ بالا وجوہ کی بنا پر ہجو میں اس کی زبان جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا تو اس کی زبان تھی جس میں نہ تو معیار سے گرے ہوئے گندے الفاظ ہوتے تھے نہ شرمناک عریاں مضامین سے مدد حاصل کی جاتی تھی، بلکہ وہ اپنے حریف کی مردانہ صفات پر حملہ کرتا اور یہ بتاتا کہ وہ سخاوت

بہادری، شرافت اور راستبازی سے خالی ہے۔ مثلاً تیم (قبیلہ) کے متعلق وہ کہتا ہے :۔

وكنت إذا لقيت عبيد تيم
وتيما قلت أيهما عبيد؟
لئيم العالمين يسود تيماً
وسيدهم وإن كرهوا مسود

"جب میں تیم کے غلاموں اور ان کے سرداروں سے ملتا ہوں تو کہتا ہوں ان میں سے غلام کون سے ہیں (اور سردار کون سے ہیں) ؟ زمانہ بھر کا کمینہ تیم کا سردار بنتا ہے اور ان کا سردار باوجود ان کی ناپسندیدگی کے غلام ہی رہتا ہے"

اور کلیب بن یربوع کے متعلق وہ کہتا ہے :۔

بئس الصحاب وبئس الشرب شربهم
إذا جرى فيهم المزاء والسكر
قوم تناهت إليهم كل مخزية
وكل فاحشة سبّت بها مضر
الآكلون خبيث الزاد وحدهم
والسائلون بظهر الغيب ما الخبر؟
وأقسم المجد حقاً لا يحالفهم
حتى يحالف بطن الراحة الشعر

"یہ لوگ بدترین ساتھی ہیں اور جب شراب ان کے رگ و پے میں دوڑنے تو یہ لوگ بدترین شرابی ہیں، ایسے لوگ ہیں کہ ذلت و رسوائی کا تمام سلسلہ ان پر ختم ہو گیا ہے اور جو گالی بھی خاندان مضر کو دی گئی ہے وہ ان پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ یہ لوگ خراب غذا اور وہ بھی تنہا کھانے والے ہیں اور دور دور ہی دور سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیا خبر ہے ؟ اور شرافت نے بجا طور پر قسم کھا لی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں رہے گی تا آنکہ ہتھیلی پر بال اُگ آئیں"

اور شاید اس کی عریاں ترین ہجو وہ ہے جو جریر کی قوم کے بارے میں اس نے کہی ہے :۔

قوم إذا استنبح الضيفان كلبهم
قالوا لأمهم بولي على النار
فتمنع البول شحاً أن تجود به
ولا تجود به إلا بمقدار
والخبز كالعنبر الهندي عندهم
والقمح خمسون أردباً بدينار

"ایسی قوم ہے کہ جب مہمان، ان کے کتوں کی آواز سے، ان کی اقامت گاہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو یہ اپنی ماں سے کہتے ہیں کہ آگ پر پیشاب کر دے اور ان کی ماں بھی بخل سے پیشاب زیادہ نہیں نکالتی بلکہ ایک انداز سے پیشاب کرتی ہے۔ روٹی ان کے یہاں ہندوستانی عنبر کی طرح کمیاب ہے، حالانکہ گیہوں کی ارزانی کا یہ عالم ہے کہ) ایک دینار میں پچاس اردب (تقریباً ۸۰ من) ملتے ہیں۔"

تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے حریف کو دکھ پہنچانے اور عار دلانے میں بھی اس کے مخصوص عیوب اور ذاتی برائیوں کی گرفت نہیں کرتا، بلکہ بلند کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے اور مقابلہ کی دوڑ میں سبقت لے جانے پر وہ اپنے مخالف کے پورے قبیلہ سے اپنے قبیلہ کا مقابلہ کرتا ہے اور انہی مضامین میں وہ اپنے لیے کافی و شافی مواد پاتا ہے۔ وہ جریر کی طرح درماندہ و مجبور ہو کر جلدی کے چھوٹے راستہ کے ذریعہ ذلیلانہ غلبہ حاصل کرنے کے لیے معمولی چھوٹی چھوٹی باتیں بیان نہیں کرتا۔ اس کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے وہ جریر سے کہتا ہے:۔

يا ابن المراغة إن عمي اللذا
قتلا الملوك وفككا الاغلالا
واخوهم السفاح ظمأ خيله
حتى وردن جبي الكلاب نهالا
فانعق بضأنك يا جرير فانما
منتك نفسك في الخلاء ضلالا
منتك نفسك أن تكون كدارم
أو أن توازي حاجباً وعقالا

"اے ابن مراغہ[1]! میرے دو چچا وہ ہیں جنہوں نے بادشاہوں کو قتل کیا اور قید و بند کھول ڈالے اور ان کا بھائی سفاح جس نے اپنے گھوڑوں کو پیاسا رکھا یہاں تک کہ وہ سیرابی کے لیے کلاب کے حوض پر پانی پینے اترے۔ اے جریر! تو اپنی بھیڑوں کے گلے کو آواز دے اس لیے کہ تنہائی میں تیرا دل تجھے شیخ چلی کی سی بیہودہ و گمراہ کن آرزوئیں دلاتا ہے، وہ تجھے یہ آرزو دلاتا ہے کہ تو دارم کی طرح بلند رتبہ ہو جائے یا حاجب و عقال کا مرتبہ پالے۔"

اور ان اشعار کو دیکھئے جو وہ جریر کے لیے کہتا ہے:۔

---

[1] مراغہ اس گدھی کو کہتے ہیں جو نر کی زیادہ خواہش رکھے۔ اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں جانور لوٹ پوٹ ہوتے ہیں۔ شاعر اس نام سے جریر کو اس لیے طعنہ دیتا ہے کہ اس کی قوم گدھے پالتی تھی۔ جریر کی ماں کو بھی مراغہ کہا جاتا تھا اس لیے کہ وہ جانوروں کے لوٹنے کی جگہ پیدا ہوئی تھی۔

(مترجم)

ولقد شددت على مراغة سرجها
حتى نزعت وانت غير مجيد
وعسرت نطفتها لتدرك دارما
هيهات من امل عليك بعيد
واذا تعاظمت الامور لدارم
طأطأت رأسك عن تبائل صيد
واذا عددت بيوت قومك لم تجد
بيتا كبيت عطارد ولبيد

"تونے مراغہ پر اس کی زین کس دی، حتیٰ کہ تونے اس کو ہٹایا اور تو ذلیل و بے عزت ہی رہا اور دارم کے مرتبہ کو پہنچنے کے لیے تونے اس کے نطفہ کو نچوڑا، لیکن افسوس یہ تیری آرزو پوری ہونا بڑی مشکل اور نا ممکن ہے۔ جب معاملات دارم پر مشکل اور گراں ہو جاتے ہیں اس وقت تو بہادر قبیلوں کے سامنے اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ اور اگر تو اپنی قوم کے گھرانوں کے کارنامے شمار کرے گا تو عطارد اور لبید کے گھرانوں کی طرح کا کوئی گھرانہ بھی تجھے ان میں نہ ملے گا"

تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے ہجویہ اشعار منافرت و فخر کے مضامین بیان کرنے میں مقصد سے بہت زیادہ قریب ہیں اور صاف ظاہر ہے کہ یہ پاکیزہ و بلند ہجو باوجود چبھنے اور ایذا رسانی کے جریر کی ہجو کے ساتھ ایک میدان میں نہیں دوڑ رہی ہے، نہ ان دونوں کے ہجویہ اشعار عوام کی نظر میں مساوی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ ہوتا کیسے جب کہ ان چیزوں کے ساتھ اخطل کے جذبات بڑھاپے کی وجہ سے سرد تھے اور جریر میں جوانی کا ولولہ و جوش بھی تھا۔ خود جریر نے آخری مقابلہ میں اپنے حریف کی کمزوری و ناتوانی کو اس کے بڑھاپے پر محمول کرتے ہوئے کہا "جب میرا اس سے مقابلہ ہوا تو اس کے ایک کچلی رنکیلا دانت) تھی، اگر دو کچلیاں ہوتیں تو وہ مجھے کھا جاتا۔" جب اخطل نے فرزدق کو اس پر ترجیح دی تو جریر نے اپنے نونیہ قصیدہ میں اخطل کی ہجو کرتے ہوئے اس سے کہا:-

جاریت مطلع الرهان بنابه
روق شبيبته وعمرك فان

(ترجمہ) اے مرد میدان تو اس زیرک سے مقابلہ کر رہا ہے جس کی جوانی ابھی اٹھان پر ہے اور تیری عمر ختم ہونے والی ہے۔

اگر ہم اخطل کی ہجویہ شاعری میں سے جریر کی ہجو کا حصہ نکال دیں تو بقیہ تمام ہجویہ قصائد قومی یا سیاسی اغراض کے ماتحت پائیں گے اور انہی ہجویہ قصائد میں وہ دو قصیدے ہیں جو اس کے مسلک کا خلاصہ اور اس کی فنی تصویر پیش کرتے ہیں۔ پہلا قبائل قیس کی ہجو میں ہے اور اس کا مطلع یہ ہے:-

ألا يا اسلمي يا هند هند بني بكر
وان كان حيانا عدى آخر الدهر

دوسرا عبدالملک بن مروان کی مدح اور اس کے مخالفین کی مذمت میں ہے اور اس کا مطلع یہ ہے:-

خف القطين فراحوا منك أو بكروا
وأزعجتهم نوى في صرفها غير

ٹھہرنے والوں نے سفر کرنا شروع کر دیا اور صبح یا شام کو وہ تیرے پاس سے کوچ کرنے لگے اور ان کو منزل مقصود کے غیر متعین ہونے نے پریشان کر دیا۔

اس قصیدہ کے دیگر اشعار:-

بني أمية اني ناصح لكم
فلا يبيتن منكم آمناً زفر
فان مشهده كفرو غائلة
وما يغيب من اخلاقه دعر
ان العداوة تلقاها وان كمنت
كالعر يكمن حيناً ثم ينتشر

(ترجمہ) اے بنو امیہ! میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ دیکھو زفر تم سے بے خوف ہو کر رات نہ گذارنے پائے اس لیے کہ اس کی موجودگی کفر اور آفت ہے اور اس کے اخلاق جو پوشیدہ ہیں بہت ہی نازیبا اور وارشت ہیں، دشمنی خواہ کتنی ہی پوشیدہ رہے ایک وقت ضرور ظاہر ہو جاتی ہے جس طرح کھجلی ایک زمانہ تک دبی رہنے کے بعد پھر پھیل ہی جاتی ہے۔

بني امية قد ناضلت دونكم
أبناء قوم هم اووا وهم نصروا
وقيس عيلان حتى أقبلوا رقصاً
فبايعوك جهاراً بعد ما كفروا
ضجوا من الحرب اذا عضت غواربهم
وقيس عيلان من أخلاقها الضجر

(ترجمہ) اے بنو امیہ! میں نے تمہاری وجہ سے اس قوم کی اولاد سے لڑائی لی ہے جس نے آنحضرتؐ کو پناہ دی اور آپؐ کی مدد کی اور قیس عیلان سے مقابلہ کیا حتی کہ وہ ناچتے ہوئے آئے اور آپ سے علی الاعلان بیعت کی حالانکہ پہلے انہوں نے انکار کر دیا تھا، جب ان کے کاندھوں پر جنگ کی مصیبت آن پڑی تو وہ اس سے گھبرا کر چیخ اٹھے اور اس خاندان کی عادت میں گھبراہٹ اور اکتاہٹ داخل ہے۔

اپنی عیسائیت کی بنا پر اخطل اسلام سے کوئی ذریعہ فخر یا ہجو کا مواد پیدا نہ کر سکا، لہٰذا اس نے اپنے باپ دادا کی خوبیوں اور اپنے دشمنوں کی برائیوں کے ذکر پر کفایت کی۔ اس کے باوجود کبھی کبھی وہ ان اعمال کو بھی ہجو میں شامل کر لیتا ہے جنہیں اسلام برا بتاتا ہے، حالانکہ وہ اپنی ذات سے ان کو جائز سمجھتا تھا۔

مثلاً وہ انصار کی شراب نوشی کو عیب شمار کرتا ہے :۔

قوم اذا هدر العصير رأيتهم

حمراً عيونهم من المسطار

یہ قوم ایسی ہے کہ جب شراب جوش مارے تو تم ان کی آنکھوں کو مدہوش کرنے والے نشہ کی وجہ سے سرخ دیکھو گے۔

اور اسی طرح وہ کلیب بن یربوع کے متعلق کہتا ہے :۔

بئس الصحاب و بئس الشرب شربهم

اذا جرت فيهم المزاء والسكر

یہ لوگ بدترین ساتھی ہیں اور ان کے مے نوش جب ان میں شراب اثر کرے تو بدترین شرابی ہیں۔

فرزدق بھی اخطل کی طرح اپنی قوم کا سربرآوردہ شخص تھا، لیکن وہ چھپ کر نہیں برملا دشمنی کرتا تھا۔ بے قید و بے جھجک ہنسی مذاق کرتا، نہایت بے شرمی و عریانی سے آوارگی و بدکاری کی باتیں کرتا، اور تندمزاجی کی وجہ سے قطعاً کوئی نرمی یا رعایت نہ کرتا تھا۔ اپنی ہجو میں وہ شرمناک باتیں بیان کرتا، کھلے اور ننگے لفظوں میں نام لے لے کر ذلیل و عریاں مضامین وہ اس طرح نظم کرتا کہ ایک شرمیلی لڑکی کا تو ذکر ہی کیا، نوجوان مرد بھی اسے سنانے میں شرما جائے۔ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس عریاں، گستاخ اور بازاری ہجوگوئی کے تمامتر اسباب صرف بدویت، کج خلقی و بدزبانی اور بدطینتی ہی تھے۔ اس لیے کہ حطیئہ اور اس کے پیش رو شاعروں نے کبھی ان عادتوں کے باوجود اس قدر عریاں بیانی سے کام نہیں لیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس عریاں بیانی میں اس زمانہ کی عراقی زندگی کا بڑا اثر تھا، اس لیے کہ عرب کے محکم اخلاق کی بندشیں دیہات سے نکل کر شہر میں پہنچنے اور عربوں کے عجمیوں میں اختلاط کے بعد ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ دینی بندشیں متفرق فرقوں کے غلبہ پانے اور حمیت دینی کے ختم ہونے کی وجہ سے کمزور پڑ گئی تھیں۔ بصرہ کا سیاسی اقتدار شعراء و قبائل کے ان مذاقیہ اور طنز آمیز کھیلوں سے اپنی آنکھیں بند کیے منہ پھاڑ کر قہقہے مار رہا تھا۔ میں قبائل اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہر قبیلہ اپنے شاعر کے پیچھے تھا۔ اور اس کی فتح کے لیے مال و دولت، جنگ اور پروپیگنڈے کے ذریعہ ہر امکانی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اور کبھی تو ایسا ہوتا کہ قبیلہ کا ہر آدمی دو تین شعر کہہ کر بطور مدد اپنے شاعر کو پیش کرتا تھا، جیسا کہ قبیلہ تیم نے اپنے شاعر عمر بن لجأ کے ساتھ کیا تھا جو جریر کی ہجو کا جواب دیتا تھا۔ فحش ترین ہجو وہ ہے جو جریر کے بارے میں فرزدق نے کہی، جس میں وہ اسے ذلیل النسب، لاچار و بے حیلہ، بکریاں پالنے والا، اور اونٹوں کو چرانے والا بتا کر حقیر کرتا ہے اور اس پر گدھیوں سے بدفعلی کرنے کی تہمت لگاتا ہے۔ ان مضامین کو وہ عجیب طریقوں سے طول دے کر بیان کرتا ہے اور ہر قصیدہ میں یہی عیوب متفرق شکلوں اور نئے نئے طریقوں سے دوہراتا ہے، اور بسا اوقات جس کی ہجو کرتا ہے اس کو دکھ دینے اور اس کا پورا مذاق

اڑانے کے لیے جھوٹے مضحکہ خیز واقعات گھڑ لینے میں بھی کسی طرح جھجک محسوس نہیں کرتا۔

یہ وہ انتہائی حد ہے جہاں آسودگی وعیاشی کے زمانہ میں ہجوگو اور قصہ گو پہنچ جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ حیران کن امر تو یہ ہے کہ اپنے حریف کو ایسی حقیر گالی دی جائے جس کو لوگ باور نہ کر سکیں اور نہ سچ جانیں۔ اس طرح کے رکیک جملے اس وقت کیے جاتے ہیں جب کسی کی انتہائی تذلیل وتحقیر اور بدنامی مقصود ہو جیسا کہ عموماً نچلے طبقہ کے لوگ کرتے ہیں۔ اور یہ اوچھے ہتھیار ہیں جو اس زمانہ سے پہلے کی ہجویہ شاعری میں کبھی استعمال نہیں کیے گئے۔ اس لیے کہ پہلے کا شاعر کسی شخص کی خوبیاں دیکھتا تو اس کی مدح کرتا، برائیاں دیکھتا تو اس کی مذمت کرتا، اور دونوں حالتوں میں وہ سچا ہوتا تھا۔

ہجوگوئی میں فرزدق اس قدر گر گیا کہ انسانیت اس پستی کو گوارا نہیں کر سکتی، وہ اس مرثیہ کا جواب جو جریر نے اپنی بیوی کے لیے کہا تھا[1] نہایت دلخراش ہجو سے دیتا ہے۔ وہ اس جواب میں میت کی حرمت، عورت کی آبرو کا پاس قطعاً ملحوظ نہیں رکھتا، وہ کہتا ہے :۔

کانت منافقة الحياة وموتها
خزى علانية عليك وعار
فلئن بكيت على الأتان لقد بكى
جزعاً غداة فراقها الاعيار
تبكى على امرأة وعندك مثلها
قعساء ليس لها عليك خمار

(ترجمہ) تیری بیوی زندگی میں منافق تھی اور اس کی موت تیرے لیے علانیہ رسوائی اور باعث ننگ وعار ہے، اگر تجھے گدھی پر رونا آیا تو کونسی نئی بات ہے اس کی جدائی کے صدمہ سے بے چین ہو کر بہت سے گدھے بھی رو رہے ہیں۔ تو عورت پر روتا ہے حالانکہ تیرے پاس اس کی جیسی ایک تنے ہوئے سینہ والی موجود ہے جس کے دوپٹہ کا بھی تجھ پر بار نہیں۔

وليكفيك فقد زوجتك التى
هلكت موقعه الظهور قصار
ان الزيادة فى الحياة ولا ارى
ميتا اذا دخل القبور يزار

---

[1] جس کا مطلع ہے :۔

لولا الحياء لهاجنى استعبار
ولزرت قبرك والحبيب يزار

(ترجمہ) اگر حیا دامنگیر نہ ہوتی تو آنسوؤں کا بہنا مجھے بے خود کر دیتا، اور میں تیری قبر کی زیارت کرتا، اور محبوب سے تو ملاقات کی ہی جاتی ہے۔

(ترجمہ) تیری بیوی کی بجائے تجھے پست قد کی سنی ہوئی ہتھیوں والی سواریاں کفایت کریں گی (زیارت تو زندگی میں ہوا کرتی ہے اور میں نے نہیں دیکھا کہ مردے سے قبر میں دفن کرنے کے بعد بھی ملاقات کی جاتی ہو۔

عورت کے متعلق فرزدق کی رائے اس کی سرد مہری اور بے حمیتی پر دال ہے۔ اس سے زمانہ کی عربی سوسائٹی میں عورت کی منزلت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یہ استنباط ہم ان اشعار سے نہیں کر رہے ہیں جو اس نے جریر کی بیوی کے بارے میں کہے ہیں، کیونکہ اس خراب رائے میں ان کے باہمی جھگڑے کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔ ہم تو یہ استنباط کر رہے ہیں جو خود فرزدق نے اپنی بیوی کے مرنے پر کہے:

یقولون زر حدراء والترب دونها
وکیف بشیٔ وصله قد تقطعا
ولست وان عزّت علی بزائر
ترابا علی مرموسه قد تضعضعا

(ترجمہ) لوگ کہتے ہیں کہ حدراء سے ملاقات کرو، حالانکہ اس پر پڑی ہوئی مٹی ہمارے درمیان حائل ہے، اور اس چیز کو کیونکر حاصل کیا جا سکتا ہے جس تک پہنچنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہو۔ اور میں باوجودیکہ وہ مجھ کو پیاری تھی اس مٹی کی زیارت کرنے والا نہیں ہوں جو اپنے مردے پر دھنس گئی ہو۔

واھون مفقود اذا الموت ناله
علی المرء فی اصحابه من تقنّعا
یقول ابن خنزیر بکیت ولم تکن
علی امرأة عینی اخال لتدمعا
واھون رزء لامریٔ غیر عاجز
رزیة مرتج الروادف افرعا

(ترجمہ) مرد کو اپنے ساتھیوں میں جس کے مرنے کا سب سے کم افسوس ہوتا ہے وہ اس کے پردہ نشین ساتھی ہیں (یعنی عورت)۔ ابن خنزیر کہتا ہے کہ تو رو گیا، حالانکہ میرا خیال ہے کہ کسی عورت پر میری آنکھ آنسو بہانے والی نہیں ہے، جو مرد معذور و لاچار نہ ہو اس کے لیے سب سے آسان مصیبت لمبے بالوں اور موٹے کولھوں والی (عورت) کی موت ہے۔

جریر کے ساتھ ہجو گوئی میں مقابلہ کی عادت، عوام میں مقبولیت و فوقیت پانے کی خواہش، طویل مدت تک ہجو گوئی کی وجہ سے اعلیٰ مضامین کا ذخیرہ ختم ہو جانا، مذمت کا خوگر ہونے کے باعث احساس عزت نفس کا فقدان، وہ اسباب ہیں جنہوں نے رفتہ رفتہ فرزدق کو جریر کی طرح ناگوار خاطر اور عریاں ہجو گوئی پر مائل کر دیا، حتیٰ کہ ان دونوں کی باہمی جوابی ہجو باوجود عمدگی و پختگی کے عوام الناس کی نظر میں عام معیار سے گر گئی تھی۔ بایں ہمہ آوارگی و عریانی، فرزدق شیعہ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی مذہب کا احترام

کرتے ہوئے شاعری سے توبہ کر لیتا، لوگوں کی ہجو سے باز آجاتا اور اپنے آپ کو قرآن مجید حفظ کرنے پر لگا دیتا تھا۔ وہ کہتا ہے:-

ألم ترنی عاهدت ربی و اننی
لبین رتاج قائما و مقام
علی قسم لا أشتم الدهر مسلماً
ولا خارجاً من فیّ سوء کلام

کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے اپنے رب سے پھاٹک اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر یہ حلیفہ عہد کر لیا ہے کہ عمر بھر کسی مسلمان کو گالی نہ دوں گا نہ میرے منہ سے کوئی بری بات نکلے گی۔

یا کبھی خاندانی روایات کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ہجو گوئی سے خودداری و شرافت نفس کے ساتھ عہدہ برآ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کی ہجو کے مضامین بلند اور الفاظ پاکیزہ ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ اشعار جو اس نے معاویہ کی ہجو میں کہے تھے جبکہ معاویہ نے اس کے کسی چچا کا ترکہ اس کی وفات کے بعد ضبط کر لیا تھا۔

ابوك وعمی یا معاوی أورثا
تراثا فیحتاز التراث أقاربه
فما بال میراث الحتات اخذته
و میراث حرب جامد لك ذائبه
فلو کان هذا الامر فی جاهلیة
علمت من المرء القلیل حلائبه

(ترجمہ) اے معاویہ! تیرے باپ اور میرے چچا دونوں نے ترکہ چھوڑا اور دستور یہ ہے کہ میت کے قریبی رشتہ داروں کو اس کا ترکہ ملتا ہے، پھر یہ کیا بات ہے کہ حتات (میرے چچا) کا ترکہ تم نے لے لیا اور حرب (تمہارے دادا) کا پورا پورا ترکہ بھی تمہارا ہی ہو گیا! اگر یہ واقعہ زمانہ جاہلیت میں ہوتا تو تمہیں معلوم ہوتا کہ کس کے حمایتی کم ہیں۔

پھر کہتا ہے:-

وما ولدت بعد النبی وأهله
کمثلی حصان فی الرجال یقاربه
وکم من أب لی یا معاوی لم یکن
اغرّ یباری الریح ما ازورّ جانبه
نمته فروع المالکین ولم یزل
أبوك الذی من عبد شمس یخاطبه

آں حضرت ؐ اور آپ ؐ کے خاندان کے بعد میرا جیسا بچہ کسی پاکبازہ خاتون نے پیدا نہیں کیا جیسے آپ ؐ سے زیادہ قرب حاصل ہو، اے معاویہ! میرے خاندان میں بہت سے ایسے با عزت بہادر سردار گذرے ہیں جو بغیر پہلو موڑے ہوا کا مقابلہ کرتے تھے (یعنی سخی اور بہادر تھے) جنہیں مالک خاندان کے شریفوں نے بڑھایا اور بلند کیا تھا اور تیرا باپ جو عبدشمس میں سے تھا ان سے ہمکلام بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

سب سے بڑی آفت جریر ہے اس لیے کہ وہ بے لگام اور منہ پھٹ تھا۔ نہ کوئی بندش اسے روکتی تھی نہ کوئی لگام اسے کھینچتی تھی۔ وہ نہ اخطل کی طرح سیاسی تھا نہ فرزدق کی طرح مذہبی! نہ ان دونوں کی طرح خاندانی شرافت کا وارث، وہ ایک بازاری چرواہا تھا۔ جسے قدرت نے تیزی ذہن، نزاکت بیان اور بدزبانی عطا کردی تھی۔ تکرار و حجت بازی کی عادت نے اس میں تندی مزاج، کثرت تخیل اور اس کی شاعری میں زور اور قافیہ میں روانی کا اضافہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے شخصی و خاندانی ہجو کو تکلیف دہ اور قابل قبول بنانے اور اسے مضبوط کرنے میں انتہائی حد پر پہنچا دیا۔ بلکہ وہی پہلا شخص کہا جا سکتا ہے جس نے ہجویہ شاعری کو عامیانہ اور متبذل اسالیب قبول کرنے پر مجبور کیا، مثلاً زنا کی شرم ناک باتیں، آبرو ریزیاں، جس کے باعث اس کے مخالفین بھی مجبور ہو گئے کہ اس کی زبان میں بات کریں اور اس کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر لڑیں۔ حتیٰ کہ بعد ازاں اس نجاست سے ملوث ہوئے بغیر کوئی ہجو عوام کے دلوں پر کچھ اثر نہ کرتی تھی چنانچہ بشار و حماد کی باہمی ہجویہ شاعری محض جریر و فرزدق کی ہجویہ شاعری کا ایک پرتو تھا۔

اپنے ماحول، عامیانہ پن نیز فرزدق کی بحث میں بیان کردہ وجوہ، کی بناء پر جریر ہجو گوئی میں نئے نئے حیرت انگیز طریقے ایجاد کیا کرتا تھا۔ وہ "اخطل" کو بے ختنہ ہونے، سور کا گوشت کھانے اور شراب پینے کا طعنہ دیتا ہے۔ "بعیث" کو اس کی ماں کی وجہ سے متہم کرتا ہے جو سجستانی لونڈی تھی۔ فرزدق کو اس کی دادی کی وجہ سے چھیڑتا ہے اور یہ الزام لگاتا ہے کہ تیری دادی نے جبیر نامی لوہار سے بدفعلی کی تھی۔ اس کی بہن جعثن پر یہ الزام لگاتا ہے کہ اس سے بنی منقر ناجائز تعلق رکھتے تھے، کیونکہ فرزدق نے قیس بن عاصم کی پوتی ظمیا دبنت طلبہ سے بوس و کنار کیا تھا، اور عمرو بن جرموز سے زبیر کے قتل کے بارے میں عہد شکنی پر اس کی قوم کو عوام میں رسوا کرتا ہے۔ پھر وہ اس کے چھوٹے چھوٹے عیوب اور معمولی معمولی لغزشوں کی گرفت کرتا اور انہیں مبالغہ آمیزی سے پیش کرتا ہے۔ مثلاً رومی کو مارنے میں تلوار کا اچٹنا اور نوار سے اس کی مرضی کے خلاف شادی کرنا۔

ہجو گوئی میں فرزدق نے اپنے بزرگوں پر فخر کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ ان کی فاتحانہ لڑائیوں، اور قدیم قابل فخر کارگذاریوں کو گنتا ہے، مگر جریر اس میدان میں اس کے ساتھ نہیں دوڑ سکتا، لہذا وہ اس کے فخر و آبائی شرف کا جواب انتہائی تلخ، تیز مذاق، اذیت پہنچانے والی فحش کلامی سے دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب جریر اس پر اتر آئے تو پھر اس کا مقابلہ مشکل ہے۔ مثال کے طور پر فرزدق کا وہ قصیدہ پڑھیے جس کا مطلع ہے :-

ان الذی سمک السماء بنی لنا
بیتنا دعائمہ أعز و اطول

جس ذات نے آسمان بلند کیا اس نے ہمارے لیے ایسا گھر (خاندان) بنایا جس کے ستون (افراد) بڑے اونچے اور باعزت ہیں۔

اس شعر کے بعد ہم اسے یہ کہتے ہوئے پاتے ہیں :۔

بیتاً زرارة محتب بفنائه
و مجاشع و ابوالفوارس نهشل
لا یحتبی بفناء بیتک مثلهم
ابدا اذا عدّالفعال الافضل

ایسا گھر جس کے صحن میں زرارہ، مجاشع اور ابوالفوارس نہشل جیسے معزز اسلاف گھٹنے باندھے آرام سے بیٹھے ہیں، لیکن جب شرافت و بزرگی کے کارنامے شمار کیے جائیں تو تیرے گھر میں ان بزرگوں کی طرح کے معزز لوگ کبھی بیٹھے نظر نہ آئیں گے۔

جریر اپنے تردیدی قصیدے میں اس کا جواب یوں دیتا ہے :۔

اخزی الذی سمک السماء مجاشعا
و بنی بناءک فی الحضیض الاسفل
بیتاً یحمم قینکم بفنائه
دنسا مقاعده خبیث المدخل
قتل الزبیر و انت عاقد حبوة
تبّاً لحبوتک التی لم تحلل
و اتاک غدرک بالزبیر علی منی
و مجر جعثنکم بذات الحرمل
بات الفرزدق یستجیر لنفسه
و جعثن کالطریق المعمل

جس نے آسمان کو بلند کیا اس نے مجاشع کو ذلیل و خوار کر دیا اور تیرے گھر کی عمارت پست زمین میں بنائی، ایسا گھر ہے کہ اس کے صحن میں تمہارا لوہار بیٹھا بھٹی جلا رہا ہے اور اس گھر کی نشست گاہیں گندی ہیں، اس میں داخل ہونے کا راستہ پلید ہے۔ زبیر قتل کر دیے گئے اور تو گھٹنے باندھے بیٹھا رہا، تف ہے تیری اس گھٹنے بندھی بیٹھک پر جو کھلی نہیں۔ تو نے زبیر کے ساتھ منٰی میں بدعہدی کی، اور تمہاری جعثن ذات الحرمل (مقام) میں بے آبرو ہوتی رہتی ہے، فرزدق اپنی جان کی امان طلب کرنے میں رات بھر کوشاں رہا اور جعثن کی شرم گاہ آباد راستہ کی طرح چالو رہی۔

فرزدق کہتا ہے :-

حلل الملوك لباسنا فی اهلنا
والسابغات الی الوغی نتسربل

اپنے گھروں میں ہماری پوشاکیں شاہانہ لباس ہیں، اور جنگ میں ہم بھرپور زرہیں پہنتے ہیں۔

جریر اس کا جواب دیتا ہے :-

لا تذکروا حلل الملوك فانکم
بعد الزبیر کحائض لم تغسل

تم بادشاہوں کی پوشاکوں کا ذکر بھی مت کرو اس لیے کہ زبیر کے بعد تم اس حائضہ کی طرح ہو جو نہا کر پاک نہ ہوئی ہو۔

فرزدق کہتا ہے :-

احلامنا تزن الجبال رزانة
وتخالنا جنًّا اذا ما نجهل
فادفع بکفك ان اردت بناءنا
ثهلان ذوالهضبات هل یتحلحل
خالی الذی غصب الملوك نفوسهم
والیه کان حباء جفنة ینقل
انا لنضرب رأس کل قبیلة
وأبوك خلف اتانه یتقمل

ہماری عقلیں پہاڑوں کے برابر وزنی ہیں اور جب ہم بگاڑ پر مائل ہو جائیں تو تم ہم کو جن بھوت خیال کرو گے۔ اگر تم چاہتے ہو تو اپنے ہاتھ سے ہماری عمارت کو دھکا دو، ٹیلوں والا ثہلان پہاڑ کیا وہ ہل جائے گا؟ میرا ماموں وہ ہے جس نے بادشاہوں کی جانیں لے لیں، اور اسی کے پاس جفنہ قبیلہ کے تحائف پیش کیے جاتے تھے۔ ہم ہر قبیلہ کے سردار کو مار ڈالتے ہیں، اور تیرا باپ اپنی گدھی کے پیچھے جوئیں مارتا ہے۔

جریر اسے جواب دیتا ہے:-

کان الفرزدق اذ یعوذ بخاله
مثل الذلیل یعوذ تحت القرمل
وافخر بضبة ان امك منهم
لیس ابن ضبة بالمعمّ المخول
ابلغ بنی وقبان ان حلومهم
خفت فلا یزنون حبة خردل

أزرى بحلمهم الفياش فانتم
مثل الفراش غشين نار المصطلی

جب فرزدق اپنے ماموں کی پناہ لیتا ہے تو اس کی مثال اس ذلیل کی سی ہوتی ہے جو قرل (نازک پودے) کی آڑ میں پناہ لیتا ہو، تو ضبہ پر فخر کر کہ تیری ماں انہی میں سے ہے، اور ابن ضبہ شریف چچاؤں اور ماموؤں والا نہ تھا، بنی دقیان کو بتا دو کہ ان کی عقلیں ہلکی ہوگئیں اور وہ رائی برابر بھی وزنی نہیں۔ ان کے نمائشی رکھ رکھاؤ نے ان کے حلم کو نقصان پہنچایا، اور تم ان پروانوں کی طرح ہو جو آگ کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

فرزدق کہتا ہے:۔

وهب القصائد لی النوابغ اذ مضوا
و ابو یزید و ذو القروح و جرول

مجھے بلند پایہ اساتذۂ فن شعراء نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنی شاعری بخش دی اور ابو یزید، ذوالقروح (امرؤالقیس) اور جرول نے بھی۔

پھر وہ باکمال شاعروں کو نام بنام گنا تا ہے اور کہتا ہے:۔

دفعوا الی کتابهن وصية
فورثتهن کانهن الجندل

انہوں نے اپنے قصائد کا دفتر بطور وصیت مجھے دے دیا اور میں کنکریوں کی طرح لاتعداد قصائد کا وارث بن گیا۔

جریر اس کو جواب دیتا ہے:۔

أعددت للشعراء سماً ناقعاً
فسقیت آخرهم بكاس الاول
لما وضعت على الفرزدق ميسمى
وضغى البعيث جدعت أنف الاخطل
حسب الفرزدق ان يسبّ مجاشع
ويعد شعر مرقش و مهلهل

میں نے شاعروں کے لیے سم قاتل تیار کیا ہے اور جس گلاس سے پہلے شاعر کو پلایا اسی سے آخری کو، جب میں نے فرزدق پر اپنی داغنے کی سلاخ رکھی اور بعیث نے چپ سادھ لی اور اخطل کی ناک کاٹ لی، فرزدق کو یہی بس ہے کہ مجاشع کو تو گالی دی جا رہی ہو اور وہ بیٹھا مہلہل و مرقش کی شمار کرتا رہے۔

تو آپ دیکھیں گے کہ جریر آسان راستہ پسند کرتا ہے، وہ حرارت سنجیدگی کو خنکی مذاق سے مارتا

ہے، ایک مسلح حملہ آور جنگجو کے مقابلہ میں وہ اپنی معمولی پوشاک اور مضحکہ خیز انداز کے ساتھ کود پڑتا ہے۔
جریر کو اپنے حریف کی نجی اور عام دونوں زندگیوں کے حالات معلوم کرنے میں کمال قدرت حاصل تھی۔ وہ رفتہ رفتہ اس کے حالات سے آگاہی حاصل کرتا اور ان میں سے قابل اعتراض واقعات کو چن لیتا۔ پھر مخالف کو بدنام اور رسوا کرنے کے لیے ان واقعات کو علی الاعلان اپنے شعروں میں بیان کر ڈالتا۔

فرزدق حدراء بنت زیق بن بسطام سے لڑکی کے باپ کی مرضی پر شادی کرتا ہے اس پر جریر کہتا ہے :-

یا زیق قد کنت من شیبان فی حسب
یا زیق و یحك من أنكحت یا زیق
أنكحت ویلك قیناً فی استه حمم
یا زیق ویحك هل بارت بك السوق
یا رُبَّ قائلة بعد البناء بها
لا الصهر راض ولا ابن القین معشوق

اے زیق تو بنی شیبان میں باحسب تھا، اے زیق افسوس تجھ پر، کس سے بیاہ دیا تو نے؟ اے زیق! تباہ ہو گیا تو، تو نے ایک لوہار کو لڑکی دے دی جس کے چوتڑ سیاہ ہیں۔ اے زیق صد افسوس کیا بازار میں تیرے مال کی کھپت نہ تھی؟ بہت سی کہنے والیوں نے اس شادی کے بعد کہا کہ نہ داماد خوش ہے نہ لوہار کا بیٹا پیارا ہے۔

اپنی بدنامی اور بے آبروئی کے خوف سے حدراء کے رشتہ دار جریر کے پاس جاتے اور کہتے کہ وہ تو مر گئی (اب اس کا ذکر چھوڑ دو)، لیکن جریر باز نہ آتا اور اپنے شعر میں حقیقت حال کو یوں کھول کر بیان کرتا ہے :-

وأقسم ما ماتت ولكنما التوى
بحدراء قوم لم یروك لها أهلا

اور میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ مری نہیں، بلکہ حدراء کو اُن لوگوں نے اپنے پاس روک لیا ہے جو تجھے (اے فرزدق) اس کے قابل نہیں سمجھتے۔

مدینہ میں فرزدق جوانی کی بدمستی میں کوئی حرکت کر بیٹھتا ہے اور ذیل کے شعر میں اس کا اعتراف کرتا ہے :-

هما دلتانی من ثمانین قامة
كما انقض باز اقتم الریش كاسره

ان دونوں نے اسی (۸۰) قد کی دوری سے مجھے اس قدر تیزی سے اپنے دام فریب میں لے

یا جس طرح بھورے پروں والا تیز عقاب جھپٹتا ہے۔

اس پر جریر اس سے کہتا ہے:-

تلاليت تزني من ثمانين قامة

وتقصرت عن باع العلا والمكارم

زنا کاری کے لیے تو اسّی (۸۰) قد کی دوری سے تیزی سے پہنچ گیا، لیکن بلندی و شرافت کا ایک ہاتھ بھر مرحلہ طے کرنے میں بھی تو پیچھے رہ گیا۔

فرزدق سلیمان بن عبدالملک کے سامنے رومی کو تلوار سے مارتا ہے، لیکن اس کی تلوار اچٹ جاتی ہے، اس پر جریر اس سے کہتا ہے:-

بسيف أبي رغوان سيف مجاشع

ضربت ولم تضرب بسيف ابن ظالم

تو نے ابو رغوان مجاشع کی تلوار سے مارا اور ابن ظالم کی تلوار سے نہیں مارا۔

اس قسم کے واقعات اپنی طرفگی و جدت کے باعث دلوں پر نقش اور زبانوں پر رواں ہو جاتے ہیں اور اسی لیے آج کل متفرق جماعتوں کے اخبارات اپنے مخالفین کی روزمرہ کی زندگی سے اپنے لیے جھگڑوں کا موضوع اور تنقید و اعتراض کا مواد فراہم کر لیتے ہیں۔ ہجو گوئی میں طویل مشق و مہارت اور جھگڑوں میں دلیرانہ اقدام کے باعث جریر انتہائی طنز نگار، عریاں بیان اور بری طرح بھد اڑانے والا ہو گیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب مربد میں جریر کا کوئی قصیدہ پڑھا جاتا تو فرزدق کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا اور وہ بے کل ہو جاتا تھا۔ غور کیجئے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور چبھنے والا طنز اور کیا ہو گا؟

يا تيم ان بيوتكم تيمية

تعس العماد قصيرة الاطناب

قوم اذا حضر الملوك وفودهم

نتفت شواربهم على الابواب

اے خاندان تیم! تمہارے خیمے بھی تیمی ہیں، ان کی بلیاں خم خوردہ اور طنابیں چھوٹی ہیں۔ تم ایسی قوم ہو کہ جب بادشاہوں کے دربار میں تمہارے وفود جاتے ہیں تو ذلت کے باعث پہلے دروازوں پر ان کی مونچھیں نوچ لی جاتی ہیں۔

اور جریر کا یہ شعر:-

زعم الفرزدق أن سيقتل مربعاً

أبشر بطول سلامة يا مربع

فرزدق خیال کرتا ہے کہ وہ مربع کو قتل کر دے گا، اے مربع! خوش ہو جا! تو بہت زمانہ تک سلامت رہے گا۔

اور اس کا شعر:۔

والتغلبی اذا تنحنح للقریٰ
حکّ استه و تمثّل الامثالا

اور تغلبی جب مہمانی سے بچنا چاہتا ہے تو وہ اپنے چوتڑ کھجاتا ہے اور گھبرا کر اُلٹی سیدھی ہانکتا اور
نئی نئی شکلیں بدلتا ہے۔

اور اس کے یہ شعر:۔

فخلّ الفخر یا ابن ابی خلید
وادّ خراج راسك كل عام
لقد علقت یمینك راس ثور
وما عقلت یمینك باللجام

اے ابن ابی خلید! فخر و خودستائی چھوڑ دے اور ہر سال (غلامی کی وجہ سے) اپنا جزیہ ادا کرتا رہ
کہ تیرے ہاتھ نے بیل کا سر پکڑا ہوگا لیکن اس نے لگام نہیں پکڑی ہوگی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہجو گوئی جریر کی سرشت میں داخل ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے وہ لوگوں پر
ذرا ذرا سی بات میں بلا جان پہچان کے الزامات لگانا شروع کر دیتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ولید بن عبدالملک
کے دربار میں پہنچا وہاں عدی بن رقاع عاملی بھی بیٹھے تھے۔ خلیفہ نے جریر سے پوچھا کیا تم انہیں پہچانتے ہو؟"
اس نے برجستہ کہا "اے امیرالمومنین! نہیں" خلیفہ نے کہا "یہ عاملہ خاندان کے فرد ہیں"، جریر نے برجستہ کہا
جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "عاملة ناصبة۔ تصلی نارا حامیة" کام کرنے
والے تھکنے والے، دھکتی ہوئی آگ میں جلیں گے" اور ایک نہایت بیہودہ شعر پڑھا، جس کا ویسا ہی جواب
عدی نے بھی دے دیا۔ اس پر جریر نے ایک قصیدہ اس کی ہجو میں کہہ ڈالا، جس کا مشہور شعر یہ ہے:۔

وابن اللبون اذا ما لزّ فی قرن
لم یستطع صولة البزل القناعیس

رسی سے بندھا ہوا دو سالہ اونٹ کا بچہ، پختہ عمر کے مضبوط اونٹ کی طرح حملہ نہیں کر سکتا۔

اور شاید فحش گوئی و ایذا رسانی کی اس عادت میں وہ اپنی ماں کی طبیعت پر گیا تھا، جو اپنے بیٹے
کی بھی اپنی سی طبیعت دیکھنا چاہتی تھی، کہتے ہیں کہ اس کی یہ آرزو اسے خواب میں بھی دکھائی گئی، ایام حمل
میں اس نے خواب دیکھا کہ ایک رسی اس میں سے نکل کر لوگوں پر کودنے لگی اور ایک ایک کا گلا گھونٹنے لگی،
جب اس نے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کی تو اس سے کہا گیا کہ تیرے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو شعراء اور عوام
الناس کی ہجو کیا کرے گا اور ان کے لیے آفت و ابتلاء ہوگا۔ اسی لیے اس نے لڑکے کا نام جریر (رسی) رکھ
دیا۔ خواہ اس کی ماں نے یہ خواب دیکھا ہو یا اپنے دل سے گھڑ لیا ہو بہرحال اس میں شک نہیں کہ بچپن سے
اس کی طبیعت کو ادھر مائل کرنے میں اس کی ماں کا بڑا دخل رہا۔

مجموعی اعتبار سے جریر کا ہجو کا فخریہ پہلو کمزور ہے۔ اس لیے کہ اس موضوع میں خاندانی شرف سے محرومی کے باعث اسے دور کی کوڑی لانی پڑتی ہے۔ یہی اس کا کمزور پہلو تھا۔ لہذا فرزدق اپنی فخریہ شاعری کے علاوہ جریر کو کہیں زیر نہ کر سکا۔ اور اس کا جریر سے یہ کہنا بالکل بجا ہے:۔

غلبتك بالمفقا و المعنی
و بیت المحتبی و الخافقات

میں تجھ سے "المفقا" اور "المعنی" اور "المحتبی" اور "الخافقات" والے قصیدوں میں بازی لے گیا ہوں۔

المفقا یا المفقی سے وہ اپنے اس شعر کی طرف اشارہ کرتا ہے:۔

و لست و إن فقأت عينك واجداً
أباً لك ان عُدّ المساعی کدارم

اور تو اگر اپنی آنکھ پھوڑ لے تب بھی شرافت کے کارنامے شمار ہوتے وقت اپنے خاندان میں کوئی دارم جیسا باپ نہیں پا سکتا۔

اور "المعنی" سے وہ یہ شعر مراد لیتا ہے:۔

و انك ان تسعی لتدارك دارماً
لأنت المعنّی یا جریر المكلّف

اور اگر تو دارم کے بلند رتبہ پر پہنچنے کی کوشش کرے گا تو اے جریر تو بڑی مشکلات و تکالیف میں خود کو ڈالے گا۔

اور "المحتبی" سے وہ اپنا یہ شعر مراد لیتا:۔

بیتاً زرارة محتب بفنائه
و مجاشع و ابو الفوارس نهشل

ایسا گھر جس کے صحن میں زرارہ، مجاشع اور ابو الفوارس نہشل گھٹنے باندھے آرام سے بیٹھے ہیں۔
اور "الخافقات" سے اپنا یہ شعر:۔

و أین تقضّی المالكات أمورها
بحق و أین الخافقات اللوامع

اور مالکات اپنے معاملے انصاف کے ساتھ کہاں طے کریں گے؟ اور لہرانے والے جھنڈے کہاں نصب ہوں گے؟"

فرزدق اپنے ان شعروں سے ان قصیدوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں یہ اشعار ہیں اور یہی وہ قصائد ہیں جن میں اس کی اعلیٰ اور ٹھوس فخریہ شاعری موجود ہے۔

فخریہ شاعری میں جریر کی کمزوری باعتبار مضمون ہے نہ باعتبار اسلوب، اس لیے کہ حسن عبارت، کمال

بلاغت، پاکیزگی لفظ اور نزاکت طرز بیان کے لحاظ سے وہ اپنے تمام حریفوں سے بڑھا ہوا تھا۔ ان سب سے زیادہ تنوع پیدا کرتا تھا۔ مشکل الفاظ کی کمی اور آسان ہونے کی وجہ سے اس کی شاعری علماء اور راویوں میں کم، البتہ عوام اور شعراء میں خوب مقبول ہوئی۔

اگر ہم ان تینوں ہم عصر شعراء کی ہجو میں سے نئے مضامین، سخت لب ولہجہ، عمدہ عکاسی کو نکال دیں تو ان کی یہ ہجو مخیل فریبی، حسان بن ثابت اور حطیئہ جیسے اساتذہ کی ہجو کے دائرہ سے نکلی نہ ہو گی۔ جس کی ابتداء پرانے کھنڈروں کے وصف اور تشبیب سے ہوتی ہے اور جس کا مدار مفاخرت و منافرت پر ہوتا ہے۔ ماضی کے پوشیدہ عیوب تلاش کیے جاتے ہیں، اور دفعۃً ایک مضمون کو چھوڑ کر دوسرا موضوع اختیار کرلیا جاتا ہے۔ جریر و فرزدق کی ہجو کو جس چیز نے سب سے زیادہ بدنما کر دیا وہ کثرت تکرار ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا یہ دونوں اپنے مخالف کے چند واقعات اور کچھ عادتیں لے بیٹھتے ہیں اور کہیں بھی وہ ان کو چھوڑتے ہوئے نظر نہیں آتے، نہ ان میں دوسرے عیوب کا اضافہ کرتے، بلکہ وہی گنے چنے عیوب اپنے ہر قصیدہ اور تردید جواب میں نئے نئے طریقوں اور جداگانہ قافیوں میں دوہراتے رہتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم ان دونوں کے قصائد میں سے ایک ایک قصیدہ پڑھنے کے بعد ان کے دوسرے قصیدے نہ پڑھیں تو ہمیں کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر ہم اخطل، فرزدق اور جریر کی ہجو کا مطالعہ کرلیں تو گویا ہم نے اس دور کی تمام ہجویہ شاعری کا مطالعہ کرلیا۔ اس لیے کہ وہ تمام تر اسی مواد سے تیار کی گئی ہے اور اسی نمونہ کے مطابق ڈھالی گئی ہے۔

البتہ جماعتی ہجو میں عراقی شعراء کے طریقے شخصی ہجو سے مختلف تھے جہاں شخصی ہجو میں وہ بے باکانہ جھوٹ اور آزادانہ بدکلامی سے کام لیتے ہیں وہاں آپ انہیں جماعتی ہجو میں جاہلی شعراء کے مسلک پر گامزن پائیں گے۔ وہ باہم اپنے آباء و اجداد پر فخر کرتے ہیں۔ کثرت تعداد و فراوانی دولت میں مقابلہ کرتے ہیں۔ شریفانہ الفاظ اور پاکیزہ اسلوب کو ترجیح دیتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ فخریں وہ غلو کرتے ہوئے مذہب، حکومت، علم اور وطن کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔

دیکھئے اعشٰے ہمدان کے اشعار جو ابن اشعث کے مددگاروں میں سے ہے:۔

اکسع البصری ان لا قیته
انما یکسع من قلّ و ذل
واجعل الکوفیّ فی الخیل ولا
تجعل البصریّ الا فی النفل

اگر بصری سے تمہاری مٹ بھیڑ ہو تو اسے لات مار کر نکال دو، اس لیے کہ جو ذلیل اور اقلیت میں ہو وہ ذلت کے ساتھ دھتکارا جاتا ہے کوفی کو گھوڑے سواروں میں رکھو اور بصری کو اوپری خدمت کے علاوہ کسی کام کے لیے نہ رکھو۔

واذا فاخرتمونا فاذكروا
ما فعلنا بكم يوم الجمل
بين شيخ خاضب عثنونه
وفتى أبيض وضاح رفل
جاءنا يخطر في سابغة
فذبحناه ضحى ذبح الحمل
وعفونا فنسيتم عفونا
وكفرتم نعمة الله الأجل

جب تم ہم سے فخر ومباہات میں مقابلہ کرو تو جو کچھ ہم نے جنگ جمل میں تمہارے ساتھ کیا تھا اسے یاد کر لیا کرو۔ ان بڑے میاں کے ساتھ جن کی داڑھی رنگی ہوئی تھی اور اس نوجوان کے ساتھ جو من چلا خوبصورت اور دامن لٹکا کر چلنے والا تھا، جب وہ ہمارے پاس بھرپور زرہ میں جھومتے ہوئے آیا تو ہم نے اسے صبح کے وقت بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا اور ہم نے تم کو معاف کر دیا لیکن تم نے ہماری معافی کو بھلا دیا اور اللہ تعالی کی عظیم الشان نعمت کو ٹھکرا دیا۔

اور دیکھئے اسی شاعر کی حجاج کے بارے میں مذہبی وسیاسی رجزیہ ہجو:-

شطت نوى من داره بالايوان
إيوان كسرى ذي القرى والريحان
ان ثقيفاً منهم الكذابان
كذابها الماضي وكذاب ثان
أمكن ربي من ثقيف همدان
انا سمونا للكفور الفتان

جس کا گھر بستیوں والے آسودہ حال کسری کے ایوان میں ہو اس کی منزل مقصود بہت دور ہے، ثقیف قبیلے میں دو بڑے نمبری جھوٹے ہیں ایک تو گذر گیا اور یہ دوسرا جھوٹا ہے، خدا نے ہمدان کو ثقیف قبیلہ پر مسلط کر دیا اور ہم نے اس بڑے کافر اور فتین پر غلبہ حاصل کر لیا۔

حين طغا بالكفر بعد الايمان
بالسيد الغطريف عبدالرحمن
سار بجمع كالدبى من قحطان
نقبل لحجاج ولي الشيطان
يثبت لجمع مذحج وهمدان
فانهم ساقوه كأس الذيفان
وملحقوه بقرى ابن مروان

جب اس نے فیاض سردار عبدالرحمن کی اطاعت سے سرتابی کی اور اس کو مان لینے کے بعد اس سے انکار کیا۔ اور وہ سردار اپنی ٹڈی دل قحطانی فوج لے کر چلا۔ شیطان کے حمایتی حجاج سے کہہ دو کہ وہ مذحج اور ہمدان کی فوج سے لڑنے کے لیے جم کر کھڑا ہو جائے یہ فوج اسے زہر کا جام پلانے والی ہے اور اس کو ابن مروان کی بستیوں میں پہنچا دینے والی ہے۔

ہجو کی یہ قسم بوگس، کم چلنے والی ناپائدار ہے۔ اس میں ظاہر داری و منافقت زیادہ ہے، کیونکہ شعراء، خلفاء سے انعام و بخشش کی لالچ، اور جان کی سلامتی کو عقیدہ کی حفاظت پر ترجیح، کی وجہ سے ایسے شعر کہا کرتے تھے۔ اور یہ جماعتی ہجویہ شاعری اور سیاسی شاعری کی شکلوں میں سے ایک شکل تھی جو اس زمانہ میں عام طور پر رواج پا گئی تھی۔ سیاسی شاعری کے نام سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی شعراء نے شاعری کے کسی جدید غرض و غایت رکھنے والے مسلک کو اختیار کر لیا تھا۔ اس لیے کہ شاعری میں مقابلہ کا سلسلہ تو زمانۂ جاہلیت اور عہد نبوت میں بھی جاری تھا۔ سیاسی شاعری سے ہمارا مقصد وہ جدید موضوعات ہیں جنہیں جماعتوں کے اختلاف آراء اور لیڈروں کی سیاسی کشمکش نے شاعروں کے ذہن میں القاء کر دیا تھا، یہ نئے موضوعات پرانے انداز سے متفرق صورتوں میں نمودار ہوئے، ہم انہیں چار صنفوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک صنف تحریض و تعریض آمیز مدح کی ہے۔ جیسے ابوالعباس اعمیٰ کے اشعار:-

أبني أميّة لا أرى لكم
شبهاً إذا ما التقت الشيع
سعة و أحلاما إذا نزعت
أهل الحلوم فضرّها النزع

اے بنو امیہ! جس وقت متفرق جماعتیں مل کر یکجا ہوتی ہیں، اور دانشمندوں کو اپنے باپ دادا کی مشابہت نقصان پہنچاتی ہے اس وقت مجھے فراخ دلی اور دانشمندی میں تمہاری مثال نہیں ملتی۔

ابني أميّة غير أنكم
والناس فيما أطمعوا طمعوا
أطمعتمو فيكم عدوكمو
فسما بهم في ذاكم الطمع
فلو أنكم كنتم لقومكم
مثل الذي كانوا لكم رجعوا
عما كرهتم أو لردّهم
حذر العقوبة، إنها تزع

اے بنو امیہ! تم نے اپنے دشمنوں کو اپنے معاملہ میں جری کر دیا اور لوگوں کا قاعدہ ہے کہ انہیں جس چیز کی لالچ دلائی جاتی ہے وہ اس کی خواہش کرنے لگتے ہیں، لہذا تمہارے دشمنوں کو بھی تمہارے

معاملہ میں کچھ امید اور لالچ پیدا ہو گئی، اگر تم اپنے دشمنوں کے ساتھ وہ رویہ اختیار کرتے جو ان کا تمہارے ساتھ ہے تو وہ تمہاری مخالفت سے باز آ جاتے، یا سزا کا خطرہ ان کو باز رکھتا، کیونکہ سزا جرم کرنے سے روکتی ہے۔

اور جس طرح کمیت کے یہ اشعار ہیں:۔

بنی ہاشم رهط النبی فاننی
بهم ولهم ارضی مراراً واغضب
خفضت لهم منی جناحی مودة
الی کنف عطفاه أهل ومرحب
وأرمی وأرمی بالعداوة اهلها
وانی لاوذی فیهم وأؤنب

بنو ہاشم خاندان نبیؐ ہیں میں ان سے وابستہ ہوں اور ان کی خاطر دوسروں سے بار بار خوش ہوتا اور لڑتا رہوں گا۔ میں نے اپنی دوستی کے بازو ان کے لیے ایسے مقام میں بچھا دیے ہیں جس کے دونوں کنارے فرحت بخش اور کشادہ ہیں۔ میں ان کے دشمنوں سے دشمنی کروں گا اور وہ مجھ سے اور ان کی محبت میں مجھے ایذائیں دی جائیں گی اور ملامتیں کی جائیں گی۔

اس قسم کی شاعری میں امویوں کا پلڑا جھکا ہوا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس للچانے کے لیے مال، ڈرانے کے لیے حکومت، اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے مختلف اسباب و ذرائع موجود تھے۔ چنانچہ ان کے زمانہ کے اکثر شعراء نے یا تو ان کے عذاب سے اپنی جانیں چھڑانے کے لیے یا مال و دولت کی حرص میں آ کر ان کی تائید و مدح سرائی کی۔ حتیٰ کہ زبیریوں اور علویوں میں سے وہ لوگ جنہوں نے ان کے مخالفین کی طرف داری کی تھی شاہی محل کی بخششوں کے سامنے اپنی خودداری کو قائم نہ رکھ سکے۔

سیاسی شاعری کبھی ہجو کی شکل میں ہوتی ہے جس کی مثالیں پہلے گذر چکیں، اور جیسے کہ اعشے ربیعہ نے عبدالملک سے متوجہ ہو کر کہا:۔

آل الزبیر من الخلافة کالتی
عجل النتاج بحملها فأحالها
أو کالضعاف من الحمولة حملت
مالا تطیق فضیعت احمالها
قوموا الیهم لا تناموا عنهم
کم للغواة أطلتم أمهالها
ان الخلافة فیکمو لا فیهم
ما زلتم أرکانها وثمالها

أمسوا على الخيرات قفلاً مغلقاً
فانهض بيمنك فافتتح أقفالها

بار خلافت اٹھانے میں آل زبیر کی مثال اس اونٹنی کی سی ہے جس کا بچہ حمل کی پوری مدت سے پہلے ساقط ہو جائے اور اسے خالی پیٹ چھوڑ دے، یا ان کمزور بار بردار جانوروں کی سی جن پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادا جائے اور وہ اپنا بوجھ گرا کر اسے ناکارہ کر دیں۔ تم ان کا بندوبست کرو، ان سے غافل نہ رہو، سرکشوں کو بہت زیادہ مدت تک تم مہلت دے چکے۔ خلافت تمہارے اندر رہنی چاہیے ان کے اندر نہیں، تم ہی سدا سے خلافت کے ستون اور اس کے ملجا و ماوی رہے ہو، یہ لوگ کارِ خیر کے دروازوں پر بند تالے بن گئے ہیں، آپ اٹھیے اور اپنی سعادتمندی سے ان تالوں کو کھول دیجئے۔

اور کبھی سیاسی مصلحت کی بنا پر کوئی تجویز پیش کرنے یا عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ جیسے مسکین دارمی کے اشعار، جس سے معاویہ نے اشارۃً ایک تجویز پیش کرنے کے لیے کہا تھا جس میں وہ معاویہ کے بعد اس کے بیٹے یزید کو صاحب بیعت قرار دیئے جانے کی تحریک کرتے تاکہ معاویہ اس مسئلہ میں اپنی قوم کی رائے معلوم کر لے:-

اليك امير المومنين رحلتها
تثير القطا ليلاً و هن هجود
الا ليت شعرى ما يقول ابن عامر
و مروان أم ماذا يقول سعيد
بنى خلفاء الله مهلا فانما
يبوئها الرحمن حيث يريد
اذا المنبر الغربي خلاه ربه
فان امير المومنين يزيد

اے امیرالمومنین! اس اونٹنی کو میں آپ کے پاس تیز چلا کر لایا ہوں، یہ رات کو سوتے ہوئے قطا (پرندوں) کو بھڑکاتی ہوئی آئی ہے، کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ ابن عامر کیا کہے گا اور مروان و سعید کی کیا رائے ہے؟ اے خلفاء اللہ کے بیٹو! ذرا ٹھہرو، خدا خلافت کو انہی لوگوں میں رکھے گا جن میں وہ چاہتا ہے۔ جب مغربی ممبر کو اس کا مالک خالی چھوڑ جائے گا تو امیرالمومنین یزید ہو گا۔

جب وہ اپنے یہ اشعار سنا چکا تو معاویہ نے کہا: "اے مسکین تمہاری پیش کردہ تجویز پر ہم غور کریں گے اور خدا سے استخارہ کریں گے۔"

اور اسی طرح کا ایک واقعہ عبدالملک کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جب انہوں نے اپنے بھائی عبدالعزیز

کو ولی عہدی سے ہٹا کر اپنے بیٹے ولید کو خلافت دینا چاہی تو نابغہ شیبانی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کرے، چنانچہ اس نے کہا:-

لا بنك اولی بملك والده
و نجم من قد عصاك مطرح
داود عدل فاحكم بسيرته
ثم ابن حرب فانهم نصحوا
وهم خيار فاعمل بسنتهم
واحى بخير واكدح كما كدحوا

تیرا بیٹا اپنے باپ کی حکومت کا زیادہ حقدار ہے اور تیری بات نہ ماننے والے ذلیل ہوں گے، داؤد منصف تھے ان کی سیرت کے مطابق فیصلہ کر، پھر ابن حرب (معاویہ) کیونکہ یہ لوگ مصلح و خیرخواہ تھے یہ بہترین (اسلاف) تھے ان کی راہ پر چلنا، تم بسلامت رہو، اور ان کی طرح جانفشانی سے خدمات انجام دینا۔

یہ سن کر عبدالملک مسکرائے اور خاموش ہو گئے، جس سے لوگ سمجھ گئے کہ یہ تجویز ان کے حکم سے پیش کی گئی ہے۔

کبھی یہ سیاسی شاعری اختلاف رائے یا نئے مسلک کے اظہار کے لیے ہوتی ہے، سیاسی اختلاف کی مثال وہ واقعہ ہے جو کعب بن جعیل اور نجاشی کے درمیان علیؓ و معاویہ میں سے ایک کو افضل بتانے میں ہوا، کعب کے اشعار یہ ہیں:-

ارى الشام تكره ملك العرا
ق واهل العراق لهم كارهينا
وكل لصاحبه مبغض
يرى كل ما كان من ذاك دينا
وقالوا على امام لنا
فقلنا رضينا ابن هند رضينا
وقالوا نرى ان تدينوا لهم
فقلنا لهم لا نرى ان ندينا

شامی، عراقی حکومت کو ناپسند کرتے ہیں، اور عراقی ان کو برا سمجھتے ہیں، ہر ایک اپنے مخالف سے بغض و عداوت رکھتا ہے اور اس دشمنی کو مذہبی فریضہ تصور کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں علی ہمارے امام ہیں، ہم کہا کہ ہم ابن ہند (معاویہ) پر رضا مند ہیں، انہوں نے کہا کہ تم ان کے سامنے سرتسلیم خم کر دو، ہم نے کہا کہ ہم ان کی اطاعت اپنے اوپر ضروری نہیں سمجھتے۔

و کلّ یسر بما عنده
یری غثّ مانی یدیه سمینا
و ما فی علیّ بمستعتب
ینال سوی ضمّه المحدثینا
و لیس براض ولا ساخط
ولا فی النهاة ولا الآمرینا
ولا هو ساء ولا هو سر
ولا بدّ من بعد ذا ان یکونا

اور ہر ایک اپنی چیز پر شاداں ہے ، اپنے ہاتھ کی لاغر چیز کو موٹا سمجھتا ہے ، علی میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں سوائے اس کے کہ وہ نئے نئے آدمیوں کو اپنی جماعت میں شامل کر لیتے ہیں ! وہ نہ خوش ہونے والوں میں ہیں نہ خفا ہونے والوں میں ، نہ منع کرنے والوں میں ہیں نہ حکم دینے والوں میں ، نہ وہ کسی کو دکھ پہنچانے والوں میں ہیں نہ خوش کرنے والوں میں ، لیکن یقیناً اس کے بعد کچھ ہوگا !
جب امام علی رض نے یہ اشعار سنے تو نجاشی کو اس کا جواب دینے کا حکم دیا ، چنانچہ اس نے کہا :-

د عیّ معاوی مالم یکونا
لقد حقّق الله ما تحذرونا
اتاکم علی باهل العراق
و اهل الحجاز فما تصنعونا ؟
یرون الطعان خلال العجاج
و ضرب الفوارس فی النقع دینا
هموا هزموا الجمع جمع الزبیر
و طلحة والمعشر الناکثینا

اے معاویہ ! جو نہیں ہوا اسے چھوڑ دو ، جس کا تمہیں اندیشہ تھا وہ اللہ نے سچ کر دکھایا ، علی عراق و حجاز کے باشندوں کو لے کر تمہارے مقابلہ کے لیے آیا ہے اب تم کیا کروگے ؟ وہ ایسے لوگ ہیں جو جنگ کے غبار میں نیزہ بازی اور بہادروں کی گردنیں مارنا اپنے مذہب سمجھتے ہیں ، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے زبیر و طلحہ کی فوج اور باغیوں کی جماعت کو ہرایا۔

فان یکره القوم ملك العراق
فقدماً رضینا الذی تکرهونا
فقولوا لکعب اخی وائل
و من جعل الغثّ یوماً سمینا

جعلتم علیًا و اشیاعه
نظیر ابن هند الا تستحونا

اگر عراقی حکومت تم لوگوں کو ناپسند ہے تو پرانے زمانے سے تمہاری ناپسندیدہ چیز ہیں بھاتی رہی ہے، وائل کے بھائی کعب سے کہہ دو، جس نے لاغر (ناکارہ) کو موٹا (کارآمد) سمجھ لیا، تم نے علی اور ان کی جماعت کو ابن ہند (معاویہ) کے برابر کر دیا، کیا تم کو شرم نہیں آتی؟

اظہار مذہب کے سلسلہ میں کُثَیّر عاشق عزّہ کے یہ اشعار ہیں جن میں وہ امامت کے بارے میں شیعہ عقیدہ کی تشریح کرتا ہے:-

الا ان الائمة من قریش
ولاة الحق اربعة سواء
علی و الثلاثة من بنیه
هم الاسباط لیس بهم خفاء
فسبط سبط ایمان و بر
و سبط غیبته کربلاء
و سبط لا یذوق الموت حتی
یقود الخیل یقدمها اللواء
تغیب لا یری فیهم زمانا
برضوی عنده عسل و ماء

لوگو! جان لو کہ والیان برحق ائمہ قریش ہی سے ہوں گے، وہ ٹھیک چار ہیں، علی رضؓ اور ان کے تین بیٹے جو (حضور کے) نواسے ہیں، ان کے متعلق اس میں کوئی راز نہیں ہے، ایک نواسا تو نیک، اور ایماندار ہے، اور ایک نواسے کو کربلا نے غائب کر دیا، اور ایک نواسا اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ وہ گھوڑے سواروں کی قیادت نہ کرے جن کے آگے جھنڈا ہوگا، وہ پوشیدہ ہے اور ایک زمانہ تک لوگوں میں نمودار نہیں ہوگا، اس کی اقامت رضوی (پہاڑ) میں ہے جہاں اسے شہد اور پانی ملتا رہتا ہے (یعنی محمد بن حنفیہ)۔

یا جیسے ثابت قطنہ کے اشعار ہیں جو اموی شعراء میں سے ہے جن میں وہ مرجئہ کے مذہب کی تفصیل بیان کرتا ہے:-

یا هند فاستمعی لی ان سیرتنا
أن نعبد الله لم نشرك به أحدا
نرجی الامور اذا كانت مشبهة
و نصدق القول فیمن جار أو عندا

المسلمون على الاسلام كلهم
والمشركون استنبوا فی دینهم شددا
ولا أری أن ذنباً بالغ احدا
فی الناس شرکا اذا ما وحدوا الصمدا

اے ہند! میری بات سن، ہمارا طریقہ صرف خدا کی عبادت کرنا اور اس کا کسی کو شریک نہ کرنا ہے، ہم شک و شبہ والے معاملات کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دیتے ہیں اور ظالم و سرکش کے بارے میں سچی اور صحیح بات کہہ دیتے ہیں، تمام مسلمان اسلام پر ہیں اور مشرکوں نے اپنے دین میں نئی نئی جماعتیں بنالی ہیں، اور میرا خیال ہے کہ کوئی گناہ لوگوں کو شرک تک نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کے قائل ہیں۔

اسی قصیدہ میں آگے چل کر وہ کہتا ہے :-

کل الخوارج مخطی فی مقالته
ولو تعبد فیما قال واجتهدا
اما علی وعثمان فانهما
عبدان لم یشرکا بالله مذعبدا
الله أعلم ما قد یحضران به
وکل عبد سیلقی الله منفردا

ہر خارجی اپنے دعوی میں خطا کار ہے خواہ وہ اپنے دعوی کے مطابق خوب عبادت و اجتہاد کرتا رہے۔ رہ گئے علی رض و عثمان رض سو وہ اللہ کے موحد بندے تھے، اللہ بہتر جانتا ہے کہ خدا کے سامنے کیا اعمال لے کر وہ پہنچیں گے اور ہر بندہ اللہ سے تن تنہا ملے گا۔

یہی وہ مضامین ہیں جنہیں سیاسی حالات نے شاعری میں پیدا کر دیا تھا اور ان مثالوں سے آپ یہ رائے بھی قائم کر سکیں گے کہ ان میں سے بیشتر کی بندش ڈھیلی، قافیہ بے ڈول اور مضمون میں آورد ہی آورد ہے جو بعض صورتوں میں اس نظم سے مشابہ ہے جس میں نثر کو نظم کر دیا گیا ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شاعری کا وجدان سے بہت معمولی تعلق ہے اور اس کا بیشتر حصہ طبیعت پر جبر یا خوشامدانہ احساس یا مردہ طبیعت کا نتیجہ تھا۔ مذکورہ بالا شاعری اور اخطل و فرزدق و جریر کی شاعری میں وہی فرق ہے جو اپنے قلبی احساسات و شعور کی ترجمانی کرنے والوں نیز اپنی اور اپنے قبیلوں کی مدافعت کرنے والوں میں اور ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی زبان دوسرے کے دل کی ترجمانی کرتی ہے اور جو کرایہ کے ٹٹو اور طمع کی وجہ سے اپنی جماعت کو چھوڑ کر دوسروں کا ساتھ دیتے ہیں۔

اس کے باوجود فرقہ پرست شعراء میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے دینی عقائد، نفسی جذبات، تعصبی میلانات کے زیر اثر شاعری کی، جس کے باعث ان کی شاعری میں جمال خلوص، جلال یقین اور قوت حقیقت پیدا ہو گئی اور یہ شیعہ و خوارج شعراء ہیں۔ لہذا اس جگہ جہاں ہم عراقی شاعری پر بحث کر رہے ہیں یہ ضروری

ہے کہ تھوڑی دیر ان فرقوں کے اشعار کا بھی مطالعہ کریں تاکہ اس ذریعہ سے ان کے مذاہب و افکار معلوم کر سکیں۔

شیعہ شاعری:- حضرت علی رضؓ اپنی پیدائش و تربیت کی وجہ سے مناقب نبوت، مواہب رسالت، بلاغت وحی، دلنوازی مومن اور شجاعت مجاہد کے وارث تھے۔ ان سے محبت اور ان کا احترام کرنے میں تمام مسلمان متفق و یک زبان ہیں، حتیٰ کہ یورپ کے باشندوں میں سے جن لوگوں نے ان کے حالات لکھے وہ بھی اس جذبہ میں مسلمانوں کے شریک ہیں۔ انگریزی کے مشہور مصنف کارلائل نے ان کے متعلق لکھا ہے: "لیکن ہم اس مرد علی سے تم محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اللہ نے بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں شرافت رکھ دی تھی اور عمر بھر ان کے اخلاق میں سخاوت جلوہ گر رہی، پھر ان کی سرشت میں قوت عمل، اور اولوالعزمی اور بے باکی ودیعت فرمائی گئی۔ انہیں شہسواری کا کمال، شیر کی سی جرأت عنایت ہوئی۔ ان خوبیوں کے ساتھ رقت قلب، صدق و ایمان اور پاکیزگی عمل مستزاد ہیں جو مسیحی جوان مردی کے شایان شان ہیں" پھر ان اخلاق کی روشنی میں حضرت علی رضؓ اپنے جھگڑے اور اپنی خلافت سیاست کے مرحلے طے کرنے لگے۔ انہوں نے نہ تو خود غرضی سے کام لیا نہ فرقہ بندی کی کوشش کی نہ موقع کی تلاش میں رہے، نہ جذبۂ تعصب کو برانگیختہ کیا، نہ مال و دولت سے للچایا۔ وہ حضرت ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ کے ساتھ نیک نیتی سے پیش آئے اور حضرت عثمان رضؓ کو خیر خواہی سے مخلصانہ مشورے دیتے رہے۔ انہوں نے معاویہ کے سامنے دلیل کے ساتھ اپنی صفائی پیش کر دی، لیکن ان کے زمانہ کی مفتوحہ دنیا سادہ و زہد پسند دین سے انجان ہوتی جا رہی تھی اور محض دینی سیاست کے بس سے باہر تھا کہ وہ شام میں معاویہ کے مال اور عراق میں سرمایہ داروں کی دولت سے مسحور لوگوں کی بد اعتدالیوں کو روکتی۔ چنانچہ حضرت علی رضؓ کی سیاست درہم برہم ہو گئی اور ان کی قبائے خلافت چاک ہو گئی، وہ اپنے محراب میں ناحق شہید کر دیئے گئے اور ان کی حیات و موت ایک ستائی ہوئی فضیلت اور ایک شہید نفس مطمئنہ کی خونی تاریخ بن گئی۔ پھر انہوں نے اپنا پر جوش و انقلابی عزم اور اپنا بخت نارسا اپنے بیٹوں کو میراث میں دے دیا۔ چنانچہ حضرت حسن رضؓ کو خفیہ طور پر زہر کے گلاس نے موت کی نیند سلا دیا اور حضرت حسینؓ اس بیدردی سے شہید کیے گئے کہ زمانہ اس واقعہ کی دہشت و ہیبتناکی سے ہمیشہ لرزہ براندام رہے گا۔

اموی آفتوں کا سلسلہ متواتر جاری رہا۔ زید و یحییٰ قتل ہوئے۔ تاک میں لگی رہنے والی موت نے اولاد علی رضؓ کو مٹانے کے لیے نت نئے حربے اختیار کیے۔ لیکن وہ جوان مردی، صبر اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے ان ظاہری و باطنی ناگہانی آفتوں کا مقابلہ کرتے رہے، تا آنکہ ان کے چہروں کے اردگرد معصومیت و تقدس کے آثار نمایاں ہو گئے اور ان کی محبت تمام مسلمانوں بالخصوص شیعہ حضرات کے دلوں میں جاگزیں ہو گئی۔ شیعہ حضرات کو آل علی رضؓ کے بے مدد چھوڑنے پر جو شرمندگی اور ان پر ظلم و ستم ہوتے دیکھنے سے جو اذیت ہوئی۔ اس نے ان کے دلوں میں ان کی محبت عبادت کے درجہ تک پیدا کر دی تھی۔ پھر یہ محبت عقائد کی شکلوں میں نمودار ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے "وصیت" کے عقیدہ کو

امامت کو اصول دین بنا کر اسے حضرت علی رضؓ اور ان کی اولاد میں منحصر کر دیا۔ حضرات ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ کی امامت میں نکتہ چینیاں شروع کر دیں، مگر چونکہ انہیں قوت و اقتدار نصیب نہ ہو سکا اس لیے انہوں نے نوحہ و بکار، مصائب و آلام کی تصویر کشی اور اعلان فضائل کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو مسخر اور نرم کرنا شروع کیا اور اس طرح ان کی شاعری پر گہرے رنج و غم، دردناک مرثیہ گوئی، عاجزانہ مدح و ستائش اور سخت عصبیت کا رنگ غالب ہو گیا۔ لیکن یہ رنگ پہلے زمانہ کی شیعہ شاعری میں اس قدر نمایاں نہیں جس قدر آخر زمانہ کی شاعری میں اس لیے کہ اس خیال کا بنیادی عقیدہ کی شکل اختیار کرنا اور ارباب حکومت کا آل بیت کو سزا دینا اور ان پر ظلم و ستم ڈھانا رفتہ رفتہ سنگین شکل اختیار کرتا رہا۔ مزید برآں شیعہ شعراء کی اس زمانہ میں قلت تھی اس لیے کہ امویوں نے لوگوں کی ضمیروں کو سونے (کی لالچ) اور لوہے (تلوار کے خوف) سے بگاڑ دیا تھا۔ لہذا شیعہ شاعری کی ابتداء سچی محبت و ہمدردی، خالص مدح اور تلخ ہجو سے ہوئی اور بعد میں سخت ہو کر اس نے ایک دوسرے کو افضل بتانے میں باہمی مقابلہ، سخت مباحثہ و مناظرہ، فقہی نکتہ چینی اور جماعتی پروپگنڈے کی شکل اختیار کر لی۔ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا اور جو مثالیں اب ہم ذیل میں بیان کریں گے ان سے یہ حقیقت آپ پر آشکارا ہو جائے گی۔

سادہ و پرزور جذبہ کی ترجمانی کے سلسلہ میں ابوالاسود دؤلی کے یہ اشعار ہیں:۔

يقول الارذلون بنو قشير
طوال الدهر لا تنسى عليا
بنو عم النبي و أقربوه
أحب الناس كلهم اليا
أحبهم كحب الله حتى
أجيء اذا بعثت على هويا
فان يك حبهم رشدا أصبه
و لست بمخطئ ان كان غيا

رذیلے بنو قشیر کہتے ہیں کہ تو عمر بھر علی رضؓ کو نہیں بھولے گا! حضور صلعم کے چچا کے بیٹے اور آپ ص کے رشتہ دار مجھے تمام لوگوں سے زیادہ پیارے ہیں، میں ان سے اللہ کی سی محبت رکھتا ہوں حتیٰ کہ قیامت کے دن بھی میں اپنے اسی اعتقاد پر اٹھوں گا، اگر ان کی محبت راہ راست ہے تو میں کار ثواب کر رہا ہوں۔ اور اگر گمراہی ہے تو میں خطا کار نہیں ہوں۔

مدح اور ایک دوسرے پر فضیلت دینے میں ایمن بن خزیم اسدی کے یہ اشعار ہیں:۔

نهاركم مكابدة و صوم
و ليلكم صلاة و اقتراء
أأجعلكم و اقواما سواء
و بينكم و بينهم الهواء

وهم أرض لأرجلكم وأنتم
لأرؤسهم وأعينهم سماء

تمہارا دن راہ حق میں جہاد اور روزہ میں گذرتا ہے اور تمہاری شب نماز وتلاوت میں کٹتی ہے۔ کیا میں تم کو اور تمہارے مخالفوں کو برابر کر دوں حالانکہ تمہارے اور ان کے درمیان بڑا فاصلہ ہے، وہ تمہارے قدموں کے لیے زمین ہیں اور تم ان کے سروں اور آنکھوں کے لیے آسمان ہو۔

ہجو میں ابن مفرغ حمیری کے یہ اشعار:۔

ألا أبلغ معاوية بن صخر
مغلغلة من الرجل اليماني
أتغضب أن يقال ابوك عفّ
وترضى أن يقال ابوك زاني؟
فاشهد أن رحمك من زياد
كرحم الفيل من ولد الاتان
وأشهد انها ولدت زيادًا
وصخر من سمية غير داني

معاویہ بن صخر کو یمنی شخص کا یہ پیغام پہنچا دو "کیا وجہ ہے کہ تیرے باپ کو پاکباز وعصمت مآب کہا جائے تو تو بگڑ جاتا ہے اور اگر اسے زناکار کہا جائے . . . . تو تو خوش ہو جاتا ہے؟ میں گواہی دیتا ہوں کہ زیاد سے تیرا ایسا ہی رشتہ ہے جس طرح ہاتھی کا گدھے سے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ زیاد کو اسی عورت نے جنا ہے؛ لیکن صخر سمیہ کے قریب بھی نہیں پھٹکا۔

اور عبد اللہ بن ہشام سلولی کے یزید بن معاویہ کی ہجو میں کہے ہوئے اشعار:۔

حُشيتا الغيظ حتى لو شربنا
دماء بني أمية ما روينا
لقد ضاعت رعيتكم وأنتم
تصيدون الارانب غافلينا

ہم آتش غیظ وغضب سے اس قدر بھرے ہوئے ہیں کہ اگر تمام بنو امیہ کا خون پی ڈالیں تب بھی ہماری پیاس نہ بجھے گی اور ہم سیراب نہ ہو سکیں گے۔ تمہاری رعیت تباہ حال ہوتے جا رہی ہے۔ اور تم بے فکری سے خرگوشوں کا شکار کر رہے ہو۔

مناظرانہ نکتہ چینی کے سلسلہ میں کمیت کے یہ اشعار ہیں جن میں وہ خلافت پر بحث کر رہا ہے:۔

يقولون لم يورث ولولا تراثه
لقد شركت فيه بجيل وأرحب

ولا انتشلت عضوين منها يحابر
وكان لعبد القيس عضو مؤرّب
فان هي لم تصلح لحيّ سواهم
اذن فذوو القربى أحقّ وأقربا
فيالك امراً قد تشتّت جمعه
وداراً ترى أسبابها تتقضّب
تبدلت الاشرار بعد خيارها
وجدّ بها من أمّة وهي تلعب

لوگ کہتے ہیں کہ آپؐ نے میراث نہیں چھوڑی، اور اگر آپؐ کی میراث نہ ہوتی تو بجیل اور "ارحب" (قبائل) بھی اس میں حصہ دار ہوتے، اور دو حصے "یحابر" قبیلہ بھی اس میں سے مار لیتا اور "عبد القیس" کے لیے بھی ایک جداگانہ حصہ ہوتا، لیکن اگر یہ خلافت ان لوگوں (قریش) کے سوا کسی کے لیے موزوں نہیں ہے تو پھر قریبی رشتہ داروں کا زیادہ حق ہے۔ قابل تعجب ہے یہ معاملۂ خلافت! کہ اس کا شیرازہ ابتر ہو گیا اور یہ خیمۂ خلافت! کہ جس کے اطناب ٹوٹتے نظر آ رہے ہیں شریر لوگ نیکوں کے جانشین ہو گئے۔ اور خلافت کا معاملہ قوم کے لیے نازک شکل اختیار کر رہا ہے مگر قوم کھیل میں لگی ہوئی ہے۔

کمیت بن زید اسدی اپنے قصائد "ہاشمیات" کی وجہ سے تقریباً بنو ہاشم کا بے نظیر شاعر تھا۔ اس نے ان کی مدح کی۔ ان کی موافقت و حمایت میں دلیلیں پیش کیں۔ سچی زبان، پرخلوص اعتقاد، بیباک دل، پرجوش و رواں طبیعت سے ان کی مدافعت و حمایت کی، لیکن جب ہشام بن عبد الملک نے اس کے قتل کا حکم دے دیا تو اس نے شیعہ مسلک کے مطابق تقیہ کی پناہ لی۔ اور ہشام کی مدح کرتے ہوئے اپنے ایک قصیدہ میں کہا:-

فالآن صرت الى امية
والامور الى المصائر
يا ابن العقائل للعقا
ئل والجحاجحة الاخاير
من عبد شمس والاكا
بر من أمية فالاكابر
لكم الخلافة والالا
ف برغم ذي حسد وداغر

اب میں امیہ کا طرفدار ہو گیا ہوں اور تمام کام اپنے انجام کی طرف لوٹتے ہیں۔ اے شرفا زادے! شرفاء و رؤسا "عبد شمس" میں سے ہیں اور بڑے بڑے لوگ بنو امیہ میں سے، خلافت

اور دوستی و وفاداری تمہارا حق ہے، خواہ کینہ ور اور حاسد برا مانیں۔

کمیت خواہ کچھ بھی کہے لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے شیعہ شاعروں کا جذبہ طمع و خوف کی وجہ سے دبا ہوا تھا، حتیٰ کہ عہد عباسیہ میں سید حمیری، دعبل خزاعی، دیک الجن، مطیع بن ایاس، ابو الشیص، عکوّک وغیرہم کی شاعری کے ذریعہ ان کے غصہ کا دھواں، درد کی آہیں اور غم کے آنسو پھوٹ ہی نکلے۔

خوارج کی شاعری:- باقی رہے خوارج — جن کی اکثریت خانہ بدوش، غیر مہذب اور سادہ لوح تھی — سو یہ لوگ اپنے خیال میں پختہ، مطالبہ پر بضد اور مصر، حکومت و فیصلہ میں ظلم و زیادتی کے قائل، دین میں متشدد، عبادت میں انتہا پسند، معاملات میں سخت گیر، اور جنگ پر بھروسہ کرنے والے، تھے۔ ان لوگوں نے تحکیم (انسانوں کو فیصلہ کا حق دینے اور حکم بنانے) سے قبل تک حضرت علی رضؓ کا ساتھ دیا، بعد تحکیم ان سے کہنے لگے "آپ نے انسانوں کو فیصلہ کا حق دے دیا، حالانکہ خدا کے سوا کوئی فیصلہ کا حق نہیں رکھتا" پھر انہوں نے حضرت علی رضؓ کے خلاف بغاوت شروع کر دی، اور اس وقت تک ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا جب تک کہ وہ خود کو کافر مان کر معاہدہ کو توڑ نہ ڈالیں۔ لیکن حضرت علی رضؓ نے ان کے مطالبہ کو نہ مانا، اور نہروان (مقام) کی لڑائی میں ان کو خوب مارا، جس سے ان کی ناراضی اور مخالفت میں اور اضافہ ہو گیا۔ پھر انہوں نے حضرت علی رضؓ کے بارے میں باہم مشورہ کیا اور بے خبری میں ان کو مار ڈالا۔ خلفاء کے اعمال اور عوام الناس کے عقائد کا جائزہ لیا اور ان میں سے بعض کو مجرم اور بعض کو کافر بتایا۔ پھر ان کی یہ رائے ہوئی کہ خلافت غیر قریشی و غیر عربی سب میں درست ہے، اور یہ کہ عمل ایمان کا جزء ہے۔ چنانچہ انہوں نے تمام زور ارکان دین کی ادائیگی اور کبائر سے اجتناب پر صرف کر دیا، اور پہاڑی علاقوں میں پناہ لے کر اپنے مذہب کا کھلے بندوں بغیر تقیہ کے، بلا رو رعایت پروپگنڈا کرنے لگے۔ دینداری میں ان کی حالت خود ان کے ایک ساتھی ابو حمزہ شاری کی زبانی یوں ہے۔

"یہ لوگ عبادت کرتے کرتے دبلے ہو گئے ہیں، شب بیداری کی وجہ سے نڈھال اور کمزور ہیں، جور ایام کے ستائے ہوئے ہیں، لیکن راہ خدا میں یہ ان تمام تکالیف کو آسان سمجھتے ہیں، دم جہاد جب موت کی گرج سے لشکروں میں شور بپا ہوتا ہے یہ لوگ وعید الٰہی کے مقابلہ میں لشکر کی وعید کو ہیچ گردانتے ہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان آگے بڑھا حتیٰ کہ اس کی ٹانگیں اس کے گھوڑے کی گردن میں پہنچ گئیں، اس کا چہرہ خون سے لتھڑ گیا، پھر جب نیزہ اس کے آرپار ہو گیا تو وہ اپنے قاتل کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑا:

"وعجلت الیک رب لترضیٰ۔ یعنی میں نے تیرے پاس آنے میں جلدی کی اے پروردگار! تاکہ تو خوش ہو جائے" اس شدید ریاضت اور انتہائی خدا ترسی کے باوجود وہ اپنے مخالفوں کے ساتھ سنگ دلی سے پیش آتے تھے۔ عورت کی کمزوری، بچہ کی معصومیت، بڑھاپے کی ناتوانی، رشتہ داری کے تعلقات میں سے کسی چیز پر وہ رحم نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے کہ اپنے خیال کے مطابق انہوں نے اپنی جان و مال کو جنت کے عوض خدا کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ زندگی کی تمام دلچسپیاں ختم کر دی تھیں۔ دنیوی جذبات کو مار ڈالا تھا۔ اور اس مقصد و مذہب کی راہ میں مارنے مرنے لگے۔

ٹھیٹ بدویت، کٹر عصبیت، خالص عقیدہ، اور اپنے مذہب کی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ بحث و مناظرہ کی ضرورت کے باعث ان کی گفتار نہایت سلیس، کلام شائستہ، اور شاعری نہایت متین ہوگئی تھی۔ لیکن ان لوگوں میں شاعری کو خطابت (تقریر) کے بعد ثانوی درجہ حاصل تھا، اس لیے کہ ان کی تبلیغ کا دارومدار اپنے نظریہ کو دل نشین کرانے، اور آیات قرآنی و احادیث رسول کے ذریعہ بحث و مجادلہ کرنے پر تھا۔ اور اس خدمت کے لیے شاعری بہت کم سودمند ہوتی ہے۔ البتہ جب بھی کوئی خارجی، دشمن سے نبرد آزما ہوتا، یا موت کا مقابلہ کرتا، یا قید ہو جاتا، تو اس کی طبیعت میں پرزور رجز یا پختہ قصیدہ جوش مارنے لگتا، جس میں وہ جنگ کی تعریف، جہاد کے لیے بے قراری، زندگی سے بیزاری، موت کی تحقیر، شہادت کا شوق، جنت کی تمنا وغیرہ، مناسب الفاظ اور دل نشین پیرایہ میں بیان کرتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے موضوع ان کی شاعری میں کمیاب ہیں۔ رجز میں ام حکیم کہتی ہے:۔

احمل راسا قد سئمت حمله
وقد مللت دهنه وغسله
الا فتی یحمل عنی ثقله

میں ایسا سر اٹھائے ہوئے ہوں جس کے بوجھ سے عاجز آگئی ہوں، میں اسے دھونے اور تیل لگانے سے اکتا گئی ہوں، کیا کوئی نوجوان نہیں جو مجھ سے میرے اس بار کو اٹھالے۔

معاذ بن جوین بحالت اسیری اپنی قوم کو جوش دلاتے ہوئے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:۔

الا ایها الشارون قد حان لامرئ
شری نفسه لله ان یترحلا
اتمتم بدار الخاطئین جهالة
وکل امرئ منکم یصاد لیقتلا
فشدوا علی القوم العداة فانها
اقامتکم للذبح رأیا مضللا

اے جان فروشو! اب ان لوگوں کے لیے وقت سفر آگیا ہے جنہوں نے اپنی جانیں اللہ کو بیچ دی ہیں، تم نادانی سے گناہ گاروں کی بستی میں ٹھہرتے رہے، اور تم میں سے ہر شخص قتل ہونے کے لیے شکار کیا جاتا ہے، دشمن قوم پر حملہ کردو کیوں کہ انہوں نے اپنے غلط خیال کے مطابق تم کو ذبح کرنے کے لیے ٹھہرا رکھا ہے:۔

الا فاقصدوا یا قوم للغایة التی
اذا ذکرت کانت ابر واعدلا
فیا لیتنی فیکم علی ظهر سابح
شدید القصیری دارعا غیر اعزلا

فيا رب جمع قد فللت ، وغارة
شهدت ، وقرن قد تركت مجندلا

اے جانباز قوم ! اس مقصد کو پانے کی کوشش کر کہ جب اس کا تذکرہ کیا جائے تو وہ نہایت نیک اور منصفانہ ہو۔ کاش تیز رفتار گھوڑے پر سوار ، زرہ میں ملبوس ، ومسلح ، میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ بہت سے لشکروں کو میں نے شکست دی تھی ۔ بہت سے حملوں میں میں نے شرکت کی تھی ، اور بہت سے حریفوں کو میں نے زمین پر تڑپتا چھوڑ دیا تھا۔

اور طرماح بن حکیم کے یہ اشعار:۔

لقد شقيت شقاء لا انقطاع له
ان لم أفز فوزة تنجي من النار
والنار لم ينج من لهيبها أحد
الا المنيب بقلب المخلص الشاري
أو الذي سبقت من قبل مولده
له السعادة من خلاقها الباري

میں نہ ختم ہونے والی بدبختی میں گھر جاؤں ، اگر مجھے ایسی کامیابی نہ ہو جو جہنم کی آگ سے بچا دے اور اس آگ کے شعلوں سے سوائے اس شخص کے کوئی نہیں بچ سکتا جو خلوص دل سے خدا کی طرف رجوع کرنے والا اور اپنی جان اللہ کے حوالے کر دینے والا ہو ، یا وہ شخص جس کی سعادت مندی کا خالق کونین نے اس کی پیدائش سے قبل ہی فیصلہ کر دیا ہو۔

اور اسی شاعر کے یہ اشعار:۔

وأمسي شهيداً ثاوياً في عصابة
يصابون في فج من الارض خائف
فوارس من شيبان ألف بينهم
تقى الله ، نزالون عند الزواحف
اذا فارقوا دنياهمو فارقوا الاذى
وصاروا الى ميعاد ما في المصاحف

اور میں اس جماعت میں رہ کر شہید ہو جاؤں جو زمین کی پرخطر گھاٹی میں مارے جاتے ہیں ، وہ قبیلہ شیبان کے بہادر شہسوار ہیں جنہیں خدا ترسی کے جذبہ نے باہم ملا دیا ہے ، جنگوں میں یہ لوگ دنیا سے جدا ہوتے ہیں تو تمام مصائب سے چھوٹ جاتے ہیں اور اس مآل پر پہنچ جاتے ہیں جس کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔

فلم أر يوماً كان اكثر مقعصا
يمج دماً من فائظ وكليم

وضاربة خداً كريماً على فتى
أغر نجيب الامهات كريم
أصيب بدولاب ولم تك موطناً
له أرض دولاب ودير حميم

اس واقعہ سے زیادہ میں نے کہیں خون اگلنے والے، دم توڑنے والے، زخمی مقتولین کو تڑپتا نہیں دیکھا، نہ اتنی شریف عورتوں کو بہادر سخی اور شریف نوجوانوں پر روتے پیٹتے دیکھا جو دولاب میں مارے گئے، حالانکہ ان کا حقیقی مقام و وطن دولاب کی زمین یا دیر حمیم نہیں ہے۔

فلو شهدتنا يوم ذاك وخيلنا
تبيح من الكفار كلّ حريم
رأت فتيةً باعوا الاله نفوسهم
بجنات عدن عنده ونعيم

اگر اس دن وہ ہمیں اور ہمارے گھوڑے سواروں کو دیکھتی جو کافروں کی عزت و آبرو اور ہر حرمت غیر محفوظ قرار دے رہے تھے تو واقعتہً وہ ان جوانوں کو دیکھتی جنہوں نے اپنی جانوں کو خدا کے ہاتھ دائمی جنتوں اور آسائشوں کے عوض فروخت کر دیا تھا۔

خوارج، شاعری سے مباحثہ یا ہجو گوئی میں مقابلہ کا کام بہت کم لیتے تھے۔ اس لیے کہ مباحثہ و مناظرہ کے لیئے ان کے پاس قوت گویائی اور جنگ میں مقابلہ کے لیے تلوار تھی۔ اسی بہت کم حصہ میں ان کے کسی شاعر کے یہ مناظرانہ اشعار ہیں جو اس موقع پر کہے گئے جب چالیس خارجیوں نے ابن زیاد کے دو ہزار سپاہیوں کو مار بھگایا تھا:۔

أألفا مؤمن فيما زعمتم
ويقتلكم بآسك اربعونا
كذبتم ليس ذاك كما زعمتم
ولكن الخوارج مومنونا
هي الفئة القليلة قد علمتم
على الفئة الكثيرة يُنصَرونا

کیا تم اپنے خیال خام کے مطابق دو ہزار مومن تھے؟ اور تم کو مقام آسک میں صرف چالیس نے مار بھگایا! تم جھوٹے ہو اور تمہارا خیال غلط ہے۔ درحقیقت خوارج مومن ہیں اور تمہیں معلوم ہو چکا کہ یہی وہ تھوڑی جماعت ہے جو بڑی جماعت پر غالب آ جاتی ہے۔

عمران بن حطان حضرت علی رض کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

لله درّ المرادىّ الذى سفكت
كفّاه مهجة شرّ الخلق انسانا

أمسى عشيّة غشّاه بضربته
مما جناه من الآثام عريانا

شاباش ہے اس مرادی پر جس کے ہاتھوں نے بدترین خلائق انسان کا خون بہایا، اپنے اس حملہ کی وجہ سے وہ اس رات کو اپنے تمام کردہ گناہوں سے پاک ہوگیا۔

اس ہجو کی وجہ یہ تھی کہ شاعر بڑھاپے کی وجہ سے جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہ تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی دانست میں زبانی جہاد کیا۔

اموی شاعری کے نمونے

بہادری:۔ قطرہ بن فجارۃ کے اشعار:۔

أقول لها وقد طارت شعاعًا
من الابطال ويحك لن تراعي
فانك لو سألت بقاء يوم
على الاجل الذي لك لن تطاعي
فصبرًا في مجال الموت صبراً
فما نيل الخلود بمستطاع
ولا ثوب البقاء بثوب عزّ
فيطوى عن اخي الخنع اليراع

میں اپنے نفس سے کہہ رہا تھا جب کہ وہ بہادروں کے خوف سے پراگندہ ومنتشر ہونے لگا ''افسوس تجھ پر خوفزدہ نہ ہو۔ کیونکہ تو اگر معینہ مدت سے ایک دن بھی زائد جیتے رہنے کی خواہش کرے گا تو یہ نہیں ہوسکے گا۔ جولانگاہ موت (میدان جنگ) میں صبرو ثبات اور تحمل سے کام لے، کیونکہ دائمی زندگی پانا انسانی استطاعت سے باہر ہے۔ اور نہ لباس بقاء کوئی باعزت لباس ہے جو ذلیل و بزدل پر سے اتار لیا جائے۔

سبيل الموت غاية كلّ حيّ
فداعيه لأهل الارض داع
ومن لا يعتبط يسأم ويهرم
وتسلمه المنون الى انقطاع
وما للمرء خير في حياة
اذا ما عدّ من سقط المتاع

ہر ذی روح کی منزل آخر موت ہے اور داعی اجل تمام زمین کے باشندوں کو پکارنے والا ہے،

جو بلے روگ نہیں مرتا وہ بوڑھا ہو کر زندگی سے اکتا جاتا ہے، در بالآخر موت اس کو عدم کے حوالہ کر دیتی ہے، جب کسی انسان کا شمار متاع کاسد میں ہونے لگے تو اس کے لیے زندگی میں کوئی فائدہ نہیں رہتا۔

مدح:۔ قریش کے بارے میں عبداللہ بن قیس الرقیات کے اشعار:۔

حبذا العیش حین قومی جمیع
لم تفرق أمورها الأهواء
قبل أن تطمع القبائل فی ملك
قریش و تشمت الأعداء
أیها المشتهی فناء قریش
بید الله عمرها و الفناء
ان تودع من البلاد قریش
لا یکن بعدهم لحی بقاء

وہ زندگی کس قدر پیاری تھی جب میری قوم متحد تھی اور خواہشات نے ان کے کاموں میں ابتری نہیں ڈالی تھی، اس سے پہلے کی زندگی جب قریش کی حکومت میں دوسرے قبیلے طمع کرتے یا دشمن برے حال کو دیکھ کر اپنے دل ٹھنڈے کرتے۔ اے تباہی قریش کے خواہاں! اس کی آبادی و بربادی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر دنیا سے قریشی چلے جائیں تو پھر ان کے بعد کوئی قبیلہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔

بغیض بن لائی کی مدح کرتے ہوئے خطیئہ کہتا ہے:۔

تزور امرأ یؤتی علی الحمد ماله
و من یؤت أثمان المحامد یحمد
یری البخل لا یبقی علی المرء ماله
و یعلم أن البخل غیر مخلد
کسوب، و متلاف اذا ما سألته
تهلل فاهتز اهتزاز المهند
متی تأته تعشو الی ضوء ناره
تجد خیر نار عندها خیر موقد

تم ایسے شخص سے ملوگے جو تعریف سن کر اپنا مال دیتا ہے اور جو شخص مدح وثنا کی قیمت ادا کرتا ہے اس کی ستائش کی جاتی ہے، موصوف جانتا ہے کہ بخل کرنے سے انسان کا مال بچا نہیں رہتا اور یہ بھی کہ بخل انسان کو دائمی زندگی نہیں بخشتا، یہ بڑا کماؤ اور اڑاؤ ہے، جب اس سے مانگا جاتا ہے تو خوشی سے اس کا چہرہ ہندوستانی تلوار کی طرح چمکنے لگتا ہے، رات کو جب تم اس کی جلائی ہوئی آگ پر اس سے مدد مانگنے

کے لیے جاؤ گے تو تم وہاں بہترین آگ اور اس کے پاس بہترین آگ جلانے والے کو پاؤ گے۔
خنساء کہتی ہے :-

دلّ على معروفه وجهه
بُورك هذا هادياً من دليل
تحسبه غضبان من عزّه
ذالك من خلق ما يحول
ويلمّه مسعر حرب اذا
أُلقي فيها وعليه الشّليل

اس کا چہرہ اس کے فضل و کرم پر دلالت کرتا ہے، اس دلالت کرنے والے رہنما (چہرہ) پہ برکتیں نازل ہوں، باوقار و پر رعب ہونے کی وجہ سے تم اسے غضبناک خیال کرو گے حالانکہ یہ اس کی ہمیشہ کی عادت ہے، جانبازی کی وجہ سے وہ اپنی ماں کے لیے آفت ہے، اگر اس پر معمولی زرہ ہو اور اسے جنگ میں ڈال دیا جائے تو جنگ کی آگ کو تیز بھڑکا دیتا ہے۔
مسلمہ بن عبدالملک کی مدح کرتے ہوئے کمیت[1] کہتا ہے۔

فما غاب عن حلم ولا شهد الخنا
ولا استعذب العوراء يوماً فقالها

---

[1] کمیت بن زید اسدی، کی پیدائش کوفہ میں ۶۰ھ میں ہوئی۔ اپنی قوم بنو اسد میں پرورش پائی۔ زبان سیکھنے کے بعد ادب و علم انساب میں مہارت پیدا کی۔ دیہاتی عربوں میں بود و باش رہی۔ عرب کے واقعات اپنی دو دادیوں سے سنے جنہوں نے زمانہ جاہلیت پایا تھا۔ کمسنی میں شعر کہنے لگا۔ مگر عوام میں اپنی شاعری پیش کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔ ایک مرتبہ اپنے کچھ شعر فرزدق کو سنائے اور اس سے مشورہ کیا کہ آیا وہ اپنی شاعری سے لوگوں کو متعارف کرائے یا نہیں؟ اس نے عوام سے متعارف کرانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس نے اپنی شاعری عوام میں پھیلائی۔ اپنے ہاشمیات۔ وہ قصائد سنائے جن میں اولاد علی رض کی طرفداری اور ان کی مدافعت و حمایت کا اظہار کیا۔ جب یمنی شاعر حکیم کلبی نے اولاد علی رض کی ہجو کی تو کمیت نے اس کی اور جملہ یمنیوں کی ہجو کہہ ڈالی۔ اس پر خالد بن عُبداللہ گورنر عراق جو یمنی تھا بگڑ گیا، اور ہشام کے پاس اس کی شکایت کی، اور وہ اشعار پڑھ کر سنائے جن میں اس نے بنو امیہ کی مذمت اور بنو ہاشم کی مدح کی تھی۔ جنہیں سن کر ہشام نے اس کے قتل کا حکم دے دیا، اور وہ قید کر لیا گیا۔ لیکن کمیت قید سے بھاگ کر شام پہنچا۔ وہاں معاویہ بن ہشام کی قبر سے پناہ گیر ہوا جس پر خلیفہ نے جان بخش دی اور معاف کر دیا پھر کمیت متواتر بنو ہاشم کی مدح اور یمنیوں کی مذمت کرتا رہا۔ عدنانیوں اور قحطانیوں میں تعصب کے جذبات برانگیختہ کرتا رہا۔ اور ان دونوں قوموں کے دلوں میں عداوت کی پوشیدہ آگ بھڑکاتا رہا، جس کے باعث ان کے درمیان کی خلیج وسیع ہو گئی شیرازہ ابتر ہو گیا۔ اور یہ فتنہ اواسط عہد عباسیہ تک، جاری رہا۔ کمیت کی وفات ۱۲۶ھ میں ہوئی۔

وتفضل أيمان الرجال شماله
كما فضلت يمنى يديه شمالها

اس نے حلم اور بردباری کا دامن کبھی نہ چھوڑا، نہ برائی میں شریک ہوا، نہ تہذیب سے گری ہوئی بات کو اچھا سمجھ کر منہ سے نکالا۔ اس کا بایاں ہاتھ لوگوں کے داہنے ہاتھوں پر اسی طرح سبقت لے گیا ہے جس طرح اس کا داہنا ہاتھ اس کے بائیں پر۔

وما اجم المعروف من طول كره
وأمراً بافعال الندى وافتعالها
ويبتذل النفس المصونة نفسه
اذا ما رأى حقا عليه ابتذالها
بلوناك فى اهل الندى ففضلتهم
وباعك فى الأبواع قدما نطالها
وأنت الذى فيما ينوبك والندى
اذا الخود عدّت عقبة القدر مالها

متواتر احسانات کی تکرار کرنے، سخاوت کا حکم دینے، اور خود سخاوت کرنے سے اس کی طبیعت کبھی بیزار نہیں ہوتی، اور وہ اپنے معزز نفس کو حقیر کر دیتا ہے جب کہ اپنے لیے اسے بے توقیر کرنا ضروری خیال کرتا ہے۔ ہم نے ہمیشہ جب بھی سخی لوگوں سے آپ کا مقابلہ کیا تو آپ ان سب سے بڑھ گئے، اور پہلے جب کبھی آپ کا دست کرم ناپا تو تمام کرم فرما ہاتھوں سے لمبا رہا، آپ ہی سخاوت و احسان کے دھنی ہیں۔ اس نازک وقت میں بھی جب کہ قحط کی وجہ سے نازک عورت ہنڈیا کی بچی ہوئی ترکاری کو اپنا سرمایہ سمجھے۔

مرثیہ:- توبہ کے مرثیہ میں لیلی اخیلیہ کہتی ہے:-

لعمرك ما بالموت عار على الفتى
اذا لم تصبه فى الحياة المعاير
وما احد حى وان عاش سالما
بأخلد ممن غيبته المقابر
فلا الحى مما احدث الدهر معتب
ولا الميت ان لم يصبر الحى ناشر

تیری عمر کی قسم! مرنے سے انسان پر کوئی عیب نہیں لگتا، بشرطیکہ زندگی میں اس نے باعث ننگ و عار حرکات نہ کی ہوں، اور کوئی زندہ خواہ وہ زمانہ دراز تک بسلامت زندہ رہے قبر میں

مدفون مردہ سے زیادہ سرمدی زندگی نہیں پا سکتا، زمانہ کی گردشوں سے کسی زندہ شخص کا غصہ دور نہیں کیا جاتا، نہ زندہ شخص کی بے صبری سے مردہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

و کل جدید أو شباب الی بلی
و کل امرئ یوما الی الموت صائر
و کل قرینی الفة لتفرق
شتاتا و ان ضنا و طال التعاشر
فلا یبعدنک اللہ یا نوب ھالکا
اخا الحرب ان دارت علیک الدوائر
فآلیت لا أنفک ابکیک ما دعت
علی فنن ورقاء او طار طائر

ہر نئی چیز یا جوانی ایک دن پرانی اور فرسودہ ہو جائے گی، اور ہر شخص کا انجام ایک دن مرنا ہوگا، تمام محبت کے رشتہ میں منسلک جوڑے ایک دن جدا ہو جائیں گے، خواہ وہ ایک دوسرے کو کتنا ہی چاہیں اور طویل عرصہ تک باہم مل کر رہیں۔ اے نوبہ! خدا تجھے دور نہ کرے، تو ان مواقع پر جب آفات مصائب کے چکر تجھ پر آتے بڑا بہادر اور جنگ کا دھنی تھا۔ میں نے قسم کھا لی ہے کہ تجھ پر روتی رہوں گی اور تیرا ماتم اس وقت تک بند نہ کروں گی جب تک کبوتر پرسوز آوازیں نکالتا، اور پرند اڑنا نہیں چھوڑیں گے۔

ابو ذؤیب ہذلی اپنے ان پانچ لڑکوں کا مرثیہ کہتا ہے جو ہجرت کرکے مصر چلے گئے تھے اور وہاں ایک سال ہی میں سب کے سب مرگئے تھے:۔

أمن المنون و ریبھا تتوجع
والدھر لیس بمعتب من یجزع
قالت أمیمة ما لجسمک شاحباً
منذ ابتذلت ومثل مالک ینفع
فأجبتھا اما لجسمی انه
اودی بنیّ من البلاد فودّعوا
اودی بنیّ فاعقبونی حسرة
عند الرقاد و عبرة ما تُقلِع
فالعین بعدھم کان حداقھا
کحلت بشوک فھی عور تدمع
فغبرت بعدھم بعیش ناصب
و اخال انی لاحق مستتبع

سبقوا هوىّ واعنقوا لهواهم
فتخرّموا ولكلّ جنب مصرع

کیا موت اور زمانہ کی گردشوں سے تو دکھ اور تکلیف محسوس کر رہا ہے ؛ حالانکہ زمانہ گھبرانے اور پریشان ہونے والے کو کبھی مناتا نہیں ہے - امیہ (شاعر کی بیوی) مجھ سے کہتی ہے کہ جب سے تم نے غم وفکر کرنا شروع کیا ہے تم گھلے چلے جا رہے ہو حالانکہ تمہارے پاس جتنا مال ہے وہ تو فائدہ پہنچا سکتا ہے - میں نے اسے جواب دیا کہ میرا جسم اپنے بچوں کے فراق میں گھلا جا رہا ہے جو مر گئے اور میرے نصیب میں نیند اور آرام کے بجائے رنج وافسوس اور نہ تھمنے والے آنسو چھوڑ گئے - ان کے بعد آنکھ کا یہ حال ہے جیسے اس میں آشوب ہو اور اس کے ڈھیلوں میں کانٹے چبھے ہوئے ہوں اور اس سبب سے ان کے آنسو بہے چلے جا رہے ہوں ، ان کے بعد میں پر کوفت زندگی میں باقی رہ گیا ہوں اور مجھے یہ معلوم ہے کہ میں ان کے پیچھے پیچھے ان سے مل جانے والا ہوں - وہ میری خواہش پر سبقت لے گئے - اور اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے لیے تیز دوڑ گئے سو وہ مر گئے ، اور ہر پہلو کے لیے زمین پر گرنے کی ایک جگہ ہے -

ولقد حرصت بان أدافع عنهم
واذا المنيّة اقبلت لا تدفع
واذا المنيّة أنشبت اظفارها
الفيت كل تميمة لا تنفع
وتجلّدى للشامتين اريهم
انى لريب الدهر لا اتضعضع
حتى كانّى للحوادث مروة
بصفا المشقّر كل يوم تقرع

میں نے بہت چاہا کہ ان سے موت کو دور کر دوں لیکن موت جب آتی ہے تو پھر اسے ہٹایا نہیں جا سکتا - اور جب موت اپنے پنجے گاڑ دیتی ہے تو پھر تمہیں کوئی تعویذ سود مند نہیں ہوگا - اور یہ جو میں تکلف صبر وسکون کا اظہار کر رہا ہوں تو یہ اس لیے ہے کہ میں اپنے بدخواہوں کو یہ بتا دوں کہ میں زمانہ کی گردشوں سے لڑکھڑانے اور ڈگمگانے والا نہیں ہوں ، اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں حوادثِ زمانہ کے لیے صفا المشقر کا پتھر ہوں جس کو ہر روز ٹھوکا اور پیٹا جاتا ہے -

جریر اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے :-

قالوا نصيبك من أجر فقلت لهم
كيف العزاء وقد فارقت أشبالى
فارقتنى حين كفّ الدهر من بصرى
وحين صرت كعظم الرمة البالى

لوگ کہتے ہیں "صبر کرو خدا بدلہ دے گا" میں نے ان سے کہا "اب تسلی کی کون سی شکل ہے جب کہ میں اپنے بچوں سے جدا ہو گیا" بیٹا! تونے ایسے موقع پر مجھے داغ مفارقت دیا جب کہ زمانے نے میری بینائی چھین لی اور میں گلی ہوئی ہڈی کی طرح ہو گیا۔

ہجو:۔ ہجویہ شاعری میں مالک بن اسمار کے اشعار:۔

لو کنت أحمل خمراً یوم زرتکم
لم یشکر الکلب أنّی صاحب الدار
لکن انیت وریح المسك یفغمنی
وعنبر الهند اذکیه علی النار
فأنکر الکلب ریحی حین ابصرنی
وکان یعرف ریح الزّق والقار

جس دن میں نے تم سے ملاقات کی اگر میں شراب اپنے ساتھ لے گیا ہوتا تو تمہارا کتا ضرور مجھے پہچان لیتا کہ میں بھی گھر والا ہوں، لیکن مشک کی خوشبو اور ہندوستانی عنبر کی دھونی سے میں بسا ہوا تھا، اس لیے جب کتے نے مجھے دیکھا تو میری خوشبو اسے نئی اور بری معلوم ہوئی اور وہ مجھے نہ پہچان سکا کیونکہ وہ پانی کی مشک اور تارکول کی بو سے مانوس تھا۔

دوسرا شاعر کہتا ہے:۔

أقول حین أری کعباً ولحیته
لا بارك الله فی بضع وستّین
من السنین تولّاها بلا حسب
ولا حیاء ولا قدر ولا دین

جب میں کعب اور اس کی ڈاڑھی کو دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ خدا ساٹھ سے اوپر کی عمر میں برکت نہ دے، اتنی عمر کو پہنچ گیا لیکن نہ حسب ہے نہ شرم، نہ عزت ہے نہ دین۔

عبدالرحمٰن بن الحکم کے اشعار:۔

لحا الله قیساً قیس عیلان انها
أضاعت ثغور المسلمین وولّت
فشاول بقیس فی الطعان ولا تکن
اخاها اذا ما المشرفیّة سُلّت

خدا قیس عیلان (قبیلہ) کو غارت کر دے کہ اس نے مسلمانوں کی سرحدوں کو تباہ کر دیا اور بھاگ گئی، تم جنگ میں قیس کی مدافعت کرو اور جب تلواریں ننگی کی جائیں تو اس کے حلیف نہ بننا۔

"طرماح" بنوتمیم کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

تمیم بطرق اللؤم أهدى من القطا
ولو سلکت سبل المکارم ضلت
ولو أن برغوثاً على ظهر نملة
یکر على صفّی تمیم لولّت

بنوتمیم بدی کی راہیں قطا پرندسے بھی زیادہ پہچانتے ہیں (جو بے نشان لق و دق صحرا میں پانی کے مقامات خوب جانتا ہے) اور جب شرافت کے راستوں پر چلتے ہیں تو بھٹک جاتے ہیں۔ اگر کوئی پسو چیونٹی پر سوار ہو کر ان کی دو صفوں پر ہلہ بول دے تو یہ بھاگ کھڑے ہوں گے۔

وصف:۔ جندج بن جندج مرّی مقام "صول" کی رات کا وصف بیان کرتا ہے:۔

فی لیل صول تناهى العرض والطول
کأنما لیله باللیل موصول
لا فارق الصبح کفّی ان ظفرت به
وان بدت غرة منه وتحجیل
لساهر طال فی صول تململه
کأنه حیّة بالسوط مقتول
متى أرى الصبح قد لاحت مخایله
واللیل قد مزّقت عنه السراویل

صول کی رات کا عرض و طول انتہائی حد کو پہنچ گیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا وہ رات دوسری رات سے جوڑ دی گئی ہے، اگر مجھے صبح مل جاتی تو میرا ہاتھ اس کو کبھی نہ چھوڑتا، خواہ اس کی ابتدائی روشنی ہی نظر آتی، اس رات جاگنے والا بہت تڑپا کیا اس طرح جیسے وہ سانپ جس کو کوڑے لگا کر مارا جاتا ہو، کب میں صبح کے آثار نمودار ہوتے اور رات کی پوشاک پارہ پارہ ہوتے دیکھوں گا؟

لیل تحیّر ما ینحطّ فی جهة
کأنه فوق متن الارض مشکول
نجومه رکّد لیست بزائلة
کأنما هنّ فی الجوّ القنادیل

رات اپنا راستہ بھول کر ایک حالت پر ٹھہری ہوئی ہے کسی طرف نہیں جھکتی، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر زمین پر رکھ دیا گیا ہے، اس کے تارے بغیر ہلے اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں جیسے وہ آسمان میں لٹکے ہوئے جھاڑ فانوس ہیں۔

ما أقدر الله أن يدني على شحط
من داره الحزن ممن داره صول
الله يطوي بساط الارض بينهما
حتى يُرى الربع منه وهو مأحول

اللہ بڑی طاقت رکھتا ہے کہ حزن والوں کو باوجود طویل مسافت کے صول والوں سے قریب کردے، اللہ ان دونوں مقامات کے درمیان کی مسافت کو سمیٹ کر چھوٹا کر دے گا، حتی کہ حزن کے آباد مکانات نظر آنے لگیں گے۔

خنساء اپنے باپ اور بھائی کے درمیان ہونے والی دوڑ کے مقابلہ کا سماں بیان کرتی ہے:۔

جارى أباه فاقبلا وهما
يتعاوران ملاءة الحضر
حتى اذا نزت القلوب وقد
لزت هناك العذر بالعذر
وعلا هتاف الناس أيهما؟
قال المجيب هناك لا أدري

اس نے اپنے باپ کا دوڑ میں مقابلہ کیا، دونوں سامنے آئے اور وہ دوڑ میں مسابقت کر رہے تھے، حتی کہ جب دل تیزی سے اچھلنے لگے اور وہاں عذر سے عذر مل گیا اور لوگوں کا نعرہ بلند ہوا کہ کون آگے بڑھ رہا اور وہاں جواب دینے والے نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔

برزت صحيفة وجه والده
ومضى على غلوائه يجري
أولى فأولى أن يساويه
لولا جلال السن والكبر
وهما وقد برزا كأنهما
صقران قد حطا الى وكر

تو اس کے باپ کا چہرہ نمودار ہوا اور بیٹا اپنی جوانی کی مستی میں دوڑتا چلا جا رہا تھا، اس کی کیا مجال تھی کہ وہ باپ کے برابر ہوتا، اگر باپ پر سن رسیدگی اور بڑھاپے کا جلال نہ ہوتا، وہ دونوں اس طرح سامنے آئے گویا وہ دو باز ہیں جو ایک آشیانہ پر گر رہے ہوں۔

فرزدق اس بھیڑیے کا حال بیان کر رہا ہے جس سے وہ راستہ میں ملا اور اس نے اپنے کھانے میں اسے اپنا ساتھی بنایا۔

وأطلس عسال وما كان صاحباً
دعوت لناري موهناً فأتاني

فلما أتى قلت ادن دونك انني
وإياك في زادي لمشتركان
فبت أقد الزاد بيني وبينه
على ضوء نار مرة ودخان
وقلت له لما تكشر ضاحكاً
وقائم سيفي من يدي بمكان
تعش فان عاهدتني لا تخونني
نكن مثل من يا ذئب يصطحبان
وأنت امرؤ يا ذئب والغدر كنتما
أخيين كانا أرضعا بلبان
ولو غيرنا نبهت تلتمس القرى
رماك بسهم أو شباة سنان

خاکی رنگ کا بھیڑیا جو دوستی کے قابل نہ تھا، میں نے آدھی رات کو اسے اپنی آگ پر بلایا اور وہ میرے پاس آگیا، جب وہ آیا تو میں نے اس سے کہا "نزدیک ہو جا اور دیکھ میرے اس ناشتہ میں تو اور میں برابر کے حصہ دار ہیں"۔ رات کو کبھی آگ کی روشنی میں کبھی دھوئیں کی تاریکی میں وہ توشہ میں نے اپنے اور اس کے درمیان بانٹا، پھر جب اس نے ہنستے ہوئے اپنے دانت نکالے تو میں نے اپنی تلوار کا دستہ مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس سے کہا: "تو رات کا کھانا کھالے، پھر اگر تو نے مجھ سے بیوفائی نہ کرنے کا عہد کر لیا تو اے بھیڑیے ہم دونوں بے تکلف دوست ہو جائیں گے۔ لیکن اے بھیڑیے! تو اور بے وفائی دونوں ایک ماں کا دودھ پیے ہوئے دو بھائی ہیں، اگر تو مہمانی کی تلاش میں ہمارے علاوہ کسی کو جگاتا تو وہ تجھے تیر کا نشانہ بناتا یا تیز نیزہ کی نوک سے چھید ڈالتا!"

ایک حجازی شاعر اپنی بیوی کی اس کیفیت کو بیان کر رہا ہے جو اس پر سوت آنے کی اطلاع سے طاری ہوئی:۔

خبروها بأنني قد تزوجت
فظلت تكاتم الغيظ سراً
ثم قالت لأختها ولأخرى
جزعاً: ليته تزوج عشرا
وأشارت الى نساء لديها
لا ترى دونهن للسر سترا
ما لقلبي كأنه ليس مني
وعظامي كأن فيهن فترا؟

من حديث نما الى فظيع
خلت فى القلب من تلظيه جمرا

لوگوں نے اسے (میری بیوی کو) بتایا کہ میں نے دوسری شادی کر لی ہے، تو وہ بظاہر اپنا غصہ اندر ہی اندر چھپاتی رہی، پھر اس نے یکے بعد دیگرے اپنی بہنوں سے عالم اضطراب میں کہا "کاش وہ ایک نہیں دس شادیاں کر لیں" پھر اپنی خاص رازدار سہیلیوں سے چپکے سے کہنے لگی "میرے دل کو کیا ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے بدن میں ہے ہی نہیں اور میری ہڈیوں کو کیا ہو گیا جیسے وہ ٹوٹی جا رہی ہوں! یہ جانکاہ خبر جو مجھے پہنچی ہے، اس سے تو میرے دل میں آگ بھڑکتی معلوم ہو رہی ہے۔"

غزل:- عروہ بن اُذینہ کے غزلیہ اشعار:-

ان التى زعمت فؤادك ملّها
خلقت هواك كما خلقت هوى لها
بيضاء باكرها النعيم فصاغها
بلباقة فأدقّها و أجلّها
حجبت تحيتها فقلت لصاحبى
ما كان أكثرها لنا و أقلّها
و اذا وجدت لها وساوس سلوة
شفع الضمير الى الفؤاد فسلّها

جو یہ خیال کرتی ہے کہ تیرا دل اس سے برگشتہ ہو گیا ہے (اسے نہیں معلوم کہ) وہ تیرے لیے پیدا ہوئی ہے جس طرح میں اس کے لیے۔ وہ سیمتن، پروردہ ناز و نعم ہے، تنعم و آسائش کی زندگی نے اسے کمال مہارت سے سڈول بدن کے سانچے میں ڈھالا ہے کہیں سے پتلا رکھا ہے (مثلاً کمر) اور کہیں سے موٹا (جیسے کولہے اور سینہ) اس نے سلسلۂ دعا و سلام بھی بند کر دیا تو میں نے اپنے دوست سے کہا: "تم پر اس کے لطف و کرم کی کثرت تھی تو کس قدر اور اب قلت ہے تو کس حد تک"! اور جب اس کی یاد کو بھلانے کے فاسد خیالات دل میں ہوتے ہیں تو ضمیر، دل سے سفارش کرتی ہے اور دل ان خیالات کو نکال دیتا ہے۔

جمیل بن معمر کے اشعار:-

و انى لارضى من بُثَينَة بالذى
لو أبصره الواشى لقرّت بلابله
بلا، وبألا استطيع ، و بالمنى
و بالا مل المرجو قد خاب امله

و بالنظرة العجلی، و بالحول تنقضی
اواخره لا نلتقی و اوائله

یں بثینہ کے عشق میں اس حالت پر بھی راضی ہوں کہ اگر چغل خور اس حالت کو دیکھے تو اس کی پریشانیاں دور ہو جائیں، بثینہ کے "نہیں" اور "میں طاقت نہیں رکھتی" کہنے پر بھی اور صرف تمناؤں پر اور ناکام آرزو پر بھی، اس کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے پر اور اس سال پر بھی جس کے شروع اور آخر کا زمانہ بغیر وصال کے ختم ہو جائے۔

اسی کے دوسرے اشعار:۔

وما زلتم یا بثن حتی لو اننی
من الشوق استبکی الحمام بکی لیا
اذا خدرت رجلی و قیل شفاؤها
دعاء حبیب کنت انت دعائیا
وما زادنی النأی المفرق بعدکم
سلوا و لا طول التلاقی تقالیا
ولا زادنی الواشون الا صبابة
ولا کثرة الناهین الا تمادیا
لقد خفت ان القی المنیة بغتة
و فی النفس حاجات الیک کما هیا

اے بثینہ! تیری محبت کبھی زائل نہ ہوئی اور تیرے غم میں ڈوب کر میری یہ حالت ہے کہ اگر میں جذبِ عشق کی وجہ سے کبوتر کو رلانا چاہوں تو وہ بھی رو جائے۔ جب میرا پیر سن ہو جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ محبوب کا نام لینا اس کی دوا ہے تو میرے منہ پر تمہارا ہی نام ہوتا ہے۔ تمہارے بعد جدائی نے میرے سکون میں اضافہ نہیں کیا اور نہ وصال کے طویل زمانہ نے مجھے تم سے متنفر کیا، لگانے بجھانے والوں نے مجھے عشق و مستی میں اور بے باک بنا دیا اسی طرح ناصحوں کی کثرت نے اگر مجھ پر کوئی اثر کیا تو یہ کہ میں اپنی بے خودی میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں دل کے ارمان دل ہی میں نہ رہ جائیں اور میں اچانک مر جاؤں۔

یزید بن طثریہ کے اشعار:۔

بنفسی من لو مر برد بنانه
علی کبدی کانت شفاء انامله
و من هابنی فی کل امر و هبته
فلا هو یعطینی ولا انا سائله

میں قربان جاؤں اس پر جس کی انگلیوں کی ٹھنڈک اگر میرے جگر پر پھر جائے تو اس کی انگلیاں میری شفا دبن جائیں، اور جو ہر بات میں میرا لحاظ کرتا ہے اور میں اس کا لحاظ کرتا ہوں، اور اس وجہ سے نہ وہ مجھے کچھ دیتا ہے اور نہ میں اس سے کچھ مانگتا ہوں۔

قیس بن ذریح کہتا ہے :-

فان یحجبوها او یحل دون وصلها
مقالة واش او وعید امیر
فلم یمنعوا عینیّ من دائم البکا
ولم یذهبوا ما قد اجنّ ضمیری

اگر لوگوں نے اسے پردہ میں چھپا دیا ہے یا اس کے وصال کی راہ میں چغل خور کی چغلی، یا کسی حاکم کا خوف حائل ہے تو یہ لوگ نہ میری آنکھوں کو پیہم رونے سے روک سکتے ہیں، نہ میرے دل کی پوشیدہ محبت کو نکال سکتے ہیں۔

کُثیّر اپنے ایک قصیدہ عزّہ کی جدائی اور اپنی تسلی کو بیان کرتا ہے :-

وما کنت ادری قبل عزّة ما البکا
ولا موجعات القلب حتی تولّت
وکانت لقطع الحبل بینی وبینها
کناذرة نذرا فاوفت وحلّت
فقلت لها یا عزّ کلّ مصیبة
اذا وطّنت یوما لها النفس ذلّت
ولم یلق انسان من الحب میعةً
تعمّ ولا غمّاء الا تجلّت

عزّہ کی جدائی سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ رونا کسے کہتے ہیں اور دلی درد و کرب کیا ہوتا ہے اس نے ہمارے درمیانی رشتۂ الفت کو کاٹ کر اس طرح اطمینان کا سانس لیا جیسے کوئی نذر ماننے والی اپنی نذر پوری کرلے اور بار سے سبکدوش ہو کر بے فکر ہو جائے۔ تب میں نے اس سے کہا کہ اے عزہ! اگر دل کو آمادہ کیا جائے تو وہ ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اور کوئی انسان محبت میں سدا باقی رہنے والا جوش نہیں پاتا نہ ایسی مشکل جو ختم نہ ہو سکتی ہو۔

ارید الثواء عندها واظنها
اذا ما اطلنا عندها المکث ملّت
فما انصفت، امّا النساء فبغّضت
الیّ وامّا بالنوال فضنّت

یکلّفھا الغَیُوانُ شتمی وما بھا
ھوانی ولکن للملیك استذلّت
ھنیئًا مریئًا غیر داء مخامر
لعزّۃ من اعراضنا ما استحلّت

میں اس کے پاس ٹھہرنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ جب ہم اس کے پاس زیادہ رہتے ہیں تو وہ اکتا جاتی ہے۔ اس نے انصاف نہیں کیا، دوسری عورتوں کو تو میری نظر میں مبغوض بنا دیا اور خود وصال سے جی چرانے لگی۔ اس کا شوہر اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ مجھے گالیاں دے، حالانکہ وہ میری تذلیل نہیں چاہتی، لیکن اپنے آقا کے حکم کی تابعداری میں وہ میرے خلاف کچھ نہ کچھ کہہ دیتی ہے۔ بڑی خوشی سے وہ تمام بدسلوکیاں عزہ کو مبارک ہوں جنہیں وہ ہماری بے آبروئی کے سلسلہ میں روا رکھتی ہے۔

فو اللہ ما قاربت الا تباعدت
بھجر ولا اکثرت الا اقلّت
فان تکن العتبی فاھلاً و مرحبا
وحقّت لھا العتبی لدینا وقلّت
وان تکن الاخرٰی فانّ وراءنا
منادح لو سارت بھا العیس کلّت
اسیئی بنا او احسنی لا ملومة
لدینا ولا مقلیّة ان تقلّت

بخدا جب بھی میں اس سے قریب ہوا وہ دامن چھڑا کر دور ہو گئی اور جب میں نے زیادہ کی خواہش کی تو اس نے کم ہی دیا! اب اگر وہ خوش ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد، اور ہم سے خوش رہنا اس پر لازمی ہے اور سب سے معمولی بات ہے، لیکن اگر کوئی دوسری بات ہے تو ہمارے درمیان ایسے لق ودق جنگلات ہیں جن میں قافلے چلتے چلتے تھک جائیں گے، اے عزہ! تم ہمارے ساتھ برا سلوک کرو یا بھلا ہماری طرف سے تم کو ملامت نہیں کی جائے گی اور اگر تم دشمنی کرو تو بھی ہم تم سے دشمنی نہیں کرینگے۔

فما أنا بالداعی لعزۃ بالجوی
ولا شامت أن نعل عزۃ زلّت
فلا یحسب الواشون أن صبابتی
بعزۃ کانت غمرۃ فتجلّت
فواللہ ثم اللہ ماحلّ قبلھا
ولا بعدھا من خلّة حیث حلّت
فیا عجبا للقلب کیف اعترافه
وللنفس لما وطّنت کیف ذلّت!

میں عزہ کو آتش غم میں جلنے کی بد دعا دینے والا نہیں، نہ اس کے جوتے کے پھسلنے پر خوش ہونے والا، چغل خور یہ نہ سمجھیں کہ عزہ سے میری محبت ایک نشہ تھا جو کافور ہوگیا۔ واللہ! باللہ! اس کی محبت دل میں ایسی جگہ جاگزین ہے جہاں اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی کی محبت نہیں پہنچی۔ تعجب ہے دل پر کہ وہ کیسے یہ اعتراف کر رہا ہے اور حیرت ہے نفس پر کہ جب اس کو آمادہ کیا جاتا ہے تو وہ کیسے جھک جاتا ہے۔

وانی و تهیامی بعزة بعدما
تخلیت مما بیننا و تخلت
لکالمرتجی ظل الغمامة کلما
تبوأ منها للمقیل اضمحلت
فان سأل الواشون فیم هجرتها
فقل نفس حر سلّیت فتسلت

اس کے اور میرے ایک دوسرے کو چھوڑ دینے کے بعد، عزہ کی محبت میں میری بے چینی کا عالم اس شخص سے مشابہ ہے جو بادل کے سائے تلے آرام کرنا چاہے اور جب وہ لیٹنے کے لیے زمین ہموار کرے تو بادل چھٹ جائے، اگر چغل خور دریافت کریں کہ تو نے اسے کیوں چھوڑا تو کہہ دینا کہ شریف انسان کے نفس کو تسلی دی گئی تو اس کا دل بہل گیا۔

جریر یزید کی طرف سے کہتا ہے:۔

فأنت أبی مالم تکن لی حاجة
فان عرضت أیقنت أن لا أبا لیا
وانی لمغرور أعلّل بالمنی
لیالی أرجو أن مالك مالیا
بأی نجاد تحمل السیف بعدما
تطعت القوی من محمل کان باقیا؟
بأی سنان تطعن القوم بعدما
نزعت سنانا من قناتك ماضیا؟

آپ اس وقت تک میرے باپ ہیں جب تک مجھے کوئی ضرورت درپیش نہ ہو لیکن جب مجھے کوئی ضرورت ہو تو میں یقین کر لیتا ہوں کہ میرا کوئی باپ ہی نہیں ہے، جب میں یہ خیال کرتا تھا کہ تمہارا مال میرا مال ہے تو میں بڑے فریب میں مبتلا تھا اور تمناؤں سے دل بہلا رہا تھا، اپنے پرتلے کی باقی ماندہ لڑیاں کاٹ دینے کے بعد تم کس پرتلے میں تلوار لٹکاؤ گے؟ اور اپنے نیزہ کے تیز پھل کو نکال دینے کے بعد تم لوگوں کا مقابلہ کس نیزہ سے کرو گے؟

مالک بن اسماء عذر خواہی کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

لکل جواد عثرة یستقیلها
و عثرة مثلی لا تقال مدی الدهر
فهبنی یا حجاج أخطأت مرّة
و جرت عن المُثلی و غنّیْت بالشعر
فهل لی أذا ما تبت عندك توبة
تداركُ ما قد فات فی سالف العمر

ہر جوان مرد سے لغزش ہوتی ہے اور وہ اس پر معافی مانگتا ہے، لیکن میرے جیسے کی لغزش زندگی بھر ناقابل معافی ہے! اے حجاج! فرض کیجئے کہ ایک مرتبہ مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں اعلیٰ اخلاق سے ہٹ گیا اور کچھ شعر کہہ دیے، اب اگر میں آپ کے پاس آکر رجوع کر لوں تو میرے گذشتہ اعمال کی تلافی کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟

حطیئہ کے اشعار :۔

أتتنی لسان فکذ بتها
و ما کنت أحسبها أن تقالا
بأن الوشاة بلا حرمة
أتوك فراموا لدیك المحالا
فجئتك معتذرا راجیا
لعفوك أرهب منك النكالا
فلا تسمعن بی مقال العدی
و لا تؤكلنی هدیت الرجالا
فانك خیر من الزبرقان
أشد نكالا و خیر نوالا

مجھے ایک خبر ملی ہے جسے میں نے جھٹلا دیا حالانکہ مجھے خیال نہ تھا کہ وہ کہی جائے گی، وہ خبر یہ ہے کہ افتراء پردازوں نے عزت و آبرو کا لحاظ کیے بغیر آپ کے پاس آکر فریب دہی سے کام لیا، لہٰذا میں معذرت خواہی کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، اور آپ کی گرفت سے ڈرتا ہوں، میرے بارے میں دشمنوں کی باتیں نہ مانیئے نہ مجھے ان لوگوں کا نوالہ بنایئے۔ خدا آپ کی رہنمائی فرمایئے۔ آپ زبرقان سے بہتر ہیں۔ بڑے سخت گیر بھی ہیں اور نہایت فیاض بھی۔

اخلاق :۔ حسان بن ثابت کے اشعار :۔

أبمال يغشي رجالا لا طباخ بهم
كالسيل يغشي أصول الدِّندِن البالي
أصون عرضي بمالي لا أدنسه
لا بارك الله بعد العرض في المال
احتال للمال أن أودى فأجمعه
ولست للعرض ان أودى بمحتال
والفقر يزري بأقوام ذوي حسب
ويقتدى بلئام الأصل أنذال

نکمے اور بیوقوف لوگوں پر مال اس طرح چھا جاتا ہے جس طرح گلے ہوئے پودوں کی جڑوں میں سیلاب کا پانی گھس جاتا اور انہیں بہا کرلے جاتا ہے۔ میں اپنا مال خرچ کرکے اپنی آبرو بچاتا ہوں اور اس کو بگڑنے نہیں دیتا، خدا اس دولت میں برکت نہ دے جو آبرو کھو کر حاصل کی جائے، اگر مال ختم ہوجائے گا تو اس کو کمانے کے لیے میں بہت سے ذرائع اختیار کرلوں گا، لیکن عزت چلی گئی تو پھر اسے کسی ذریعہ سے واپس نہیں لا سکتا۔ فقر باحسب لوگوں کو ذلیل کردیتا ہے اور کمینہ سرشتوں بدمعاشوں کو (محض امیری کے باعث) رہبر اور لیڈر بنا لیا جاتا ہے۔

کثیر کے اشعار:۔

ومن لا يغمض عينه عن صديقه
وعن بعض ما فيه، يمت وهو عاتب
ومن يتتبع جاهدا كل عثرة
يجدها، فلا يسلم له الدهر صاحب

اور جو اپنے دوست کے ساتھ چشم پوشی سے کام نہیں لیتا، اور اس کی بعض خامیوں کو معاف نہیں کرتا وہ مرتے دم تک غصہ ہی رہے گا۔ اور جو شخص ہر عیب کی ٹوہ میں لگا رہے گا اور ہر لغزش پر گرفت کرے گا وہ تاحیات کسی کو اپنا مخلص دوست نہیں بنا سکے گا۔

لو كنت أعجب من شئ لأعجبني
سعي الفتى وهو مخبوء له القدر
يسعى الفتى لأمور ليس يدركها
والنفس واحدة والهمّ منتشر
فالمرء ما عاش ممدود له أمل
لا ينتهي العمر حتى ينتهي الأثر

اگر مجھے کسی چیز پر حیرت ہوتی ہے تو وہ انسان کی کوشش پر، حالانکہ اس کے لیے تقدیر پنہاں

"طرماح" بنوتمیم کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

تمیم بطرق اللؤم أھدی من القطا
ولو سلکت سبل المکارم ضلّت
ولو أن برغوثاً علی ظھر نملة
یکرّ علی صفّی تمیم لولّت

بنوتمیم بدی کی راہیں قطا پرندے سے بھی زیادہ پہچانتے ہیں (جو بے نشان لق و دق صحرا میں پانی کے مقامات خوب جانتا ہے) اور جب شرافت کے راستوں پر چلتے ہیں تو بھٹک جاتے ہیں۔ اگر کوئی پسو چیونٹی پر سوار ہو کر ان کی دو صفوں پر ہلہ بول دے تو یہ بھاگ کھڑے ہوں گے۔

وصف:۔ جندج بن جندج مرّی مقام "صول" کی رات کا وصف بیان کرتا ہے:۔

فی لیل صول تناھی العرض والطول
کأنّما لیلة باللیل موصول
لا فارق الصبح کفّی ان ظفرت به
وان بدت غرة منه و تحجیل
لساھر طال فی صول تململه
کأنه حیّة بالسوط مقتول
متی أری الصبح قد لاحت مخایله
واللیل قد مزقت عنه السراویل

صول کی رات کا عرض و طول انتہائی حد کو پہنچ گیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا وہ رات دوسری رات سے جوڑ دی گئی ہے، اگر مجھے صبح مل جاتی تو میرا ہاتھ اس کو کبھی نہ چھوڑتا، خواہ اس کی ابتدائی روشنی ہی نظر آتی، اس رات جاگنے والا بہت تڑپا کیا اس طرح جیسے وہ سانپ جس کو کوڑے لگا کر مارا جاتا ہو، کب میں صبح کے آثار نمودار ہوتے اور رات کی پوشاک پارہ پارہ ہوتے دیکھوں گا؟

لیل تحیّر ما ینحطّ فی جھة
کأنّه فوق سطح الارض مشکول
نجومه رکّد لیست بزائلة
کأنما ھنّ فی الجوّ القنادیل

رات اپنا راستہ بھول کر ایک حالت پر ٹھہری ہوئی ہے کسی طرف نہیں جھکتی، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر زمین پر رکھ دیا گیا ہے، اس کے تارے بغیر ہلے اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں جیسے وہ آسمان میں لٹکے ہوئے جھاڑ فانوس ہیں۔

ما أقدر الله أن يدني على شحط
من داره الحزن ممن داره صُول
الله يطوى بساط الارض بينهما
حتى يُرى الربع منه وهو مأحول

اللہ بڑی طاقت رکھتا ہے کہ حزن والوں کو باوجود طویل مسافت کے صول والوں سے قریب کردے ، اللہ ان دونوں مقامات کے درمیان کی مسافت کو سمیٹ کر چھوٹا کر دے گا ، حتی کہ حزن کے کے آباد مکانات نظر آنے لگیں گے ۔

خنساء اپنے باپ اور بھائی کے درمیان ہونے والی دوڑ کے مقابلہ کا سماں بیان کرتی ہے :-

جارى أباه فاقبلا وهما
يتعاوران ملاءة الحضر
حتى اذا نزت القلوب وقد
لزت هناك العذار بالعذار
وعلا هتاف الناس أيهما ؟
قال المجيب هناك لا أدرى

اس نے اپنے باپ کا دوڑ میں مقابلہ کیا ، دونوں سامنے آئے اور وہ دوڑ میں مسابقت کر رہے تھے ، حتی کہ جب دل تیزی سے اچھلنے لگے اور وہاں عذار سے عذار مل گیا اور لوگوں کا نعرہ بلند ہوا کہ کون آگے رہا اور وہاں جواب دینے والے نے کہا کہ میں نہیں جانتا ۔

برزت صحيفة وجه والده
ومضى على غلوائه يجرى
أولى فأولى أن يساويه
لولا جلال السن والكبر
وهما وقد برزا كأنهما
صقران قد حطا الى وكر

تو اس کے باپ کا چہرہ نمودار ہوا اور بیٹا اپنی جوانی کی مستی میں دوڑتا چلا جا رہا تھا ، اس کی کیا مجال تھی کہ وہ باپ کے برابر ہوتا ، اگر باپ پر سن رسیدگی اور بڑھاپے کا جلال نہ ہوتا ، وہ دونوں اس طرح سامنے آئے گویا وہ دو باز ہیں جو ایک آشیانہ پر گر رہے ہوں ۔

فرزدق اس بھیڑیے کا حال بیان کر رہا ہے جس سے وہ راستہ میں ملا اور اس نے اپنے کھانے میں اسے اپنا ساتھی بنایا ۔

وأطلس عسّال وما كان صاحباً
دعوت لنارى موهناً فأتانى

درپے ہو گئے۔ اس کے بھائی نے ازراہ شفقت اسے آں حضرت ص کے سامنے حاضر ہو کر اسلام قبول کر لینے، اور توبہ کرنے کا مشورہ دیا، تاکہ حضور ص خوش ہو کر معاف فرما دیں لیکن بے سود۔ جب کعب تمام پناہ دینے والوں اور حمایتیوں کی طرف سے مایوس ہو گیا، تو حضرت ابو بکر رض کو بیچ میں ڈال کر آں حضرت ص کے پاس پہنچا اور اسلام لے آیا۔ آپ ص کی مدح میں اپنا مشہور "لامیہ" قصیدہ کہا، جس پر آں حضرت ص نے اسے معاف کر دیا۔ اس کی جان بخش دی، اور اپنی چادر مبارک اتار کر اسے دے دی۔ یہ چادر اس کے خاندان ہی میں رہی تاآنکہ حضرت معاویہ رض نے چالیس ہزار درہم میں اسے خرید لیا، پھر وہ اموی و عباسی خلفاء میں رہی حتیٰ کہ جب خلافت بنو عثمان میں گئی تو وہ چادر بھی ان کے پاس چلی گئی۔

اس کی شاعری:- کعب نے گلستان شعر اور چمن نظم میں پرورش پائی۔ لہٰذا شاعری کا ملکہ اس میں پختہ ہو گیا۔ بچپن ہی سے شاعری کے آثار اس میں نمودار ہو گئے اور وہ پوری طرح جوان بھی نہ ہونے پایا تھا کہ شاعری کرنے لگا۔ اس کے باپ نے اس ڈر سے کہ کہیں اس کے ابتدائی بے معنی اشعار لوگوں میں پھیل کر ہمیشہ کے لیے باعث ننگ و عار نہ بن جائیں اسے شعر کہنے سے روکا، مگر وہ باز نہ آیا ادھر باپ اسے منع کرنے پر بضد رہا، حتیٰ کہ ایک مرتبہ باپ نے اس کا سخت امتحان لیا، جس نے اسے بیٹے کی پختہ صلاحیت اور سلامتیِ طبع کا اطمینان دلا دیا اور اس نے اسے شاعری کی اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ شاعری کی نگری میں داخل ہو کر اس کے متفرق کوچوں میں پھرا اور نہایت عمدہ و پسندیدہ اور پر زور شاعری کرنے لگا۔ اگر اس کی شاعری کے الفاظ میں غرابت، تراکیب میں پیچیدگی اور مطولات میں خامی نہ ہوتیں، جن عیوب سے اس کے باپ کی شاعری پاک ہے، تو وہ شاعری میں تقریباً اپنے باپ کے ہم پلہ ہو جاتا۔ شاعری میں کعب کی قدر و منزلت کا اس بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حطیئہ جو مشہور شاعروں میں سے ہے کعب سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کو مشہور کرنے کے لیے اپنی شاعری میں اس کا تذکرہ کرے۔ چنانچہ کعب اپنے شعروں میں کہتا ہے:-

فمن للقوافی شانها من يحوكها
اذا ما مضى كعب و فوز جرول
كفيتك لا تلقى من الناس واحداً
تنخل منها مثل ما نتنخل

شاعری کی سرپرستی کون کرے گا جب کعب چل بسے گا اور جرول (حطیئہ) وفات پا جائیگا؟ جو بھی ان کے بعد شاعری کرے گا وہ شاعری کو بدنما کر دے گا۔ میرے بعد تجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ جس طرح ہم نے شاعری کا پاکیزہ و پسندیدہ حصہ چن لیا ہے، کسی دوسرے کو تم شاعری کا اتنا بلند حصہ انتخاب کرتے ہوئے نہ پاؤ گے۔

اس کی شاعری کانمونہ:- اس کی پاکیزہ و بلند مرتبہ شاعری میں اس کا وہ قصیدۂ مدحیہ شامل ہے جو اس نے آں حضرت ﷺ کی مدح میں کہا ، یہ قصیدہ متفرق موضوعات پر مشتمل ہے ، اس کا مطلع ہے :-

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول
متیم إثرها لم یُفْدَ مکبول

"سعاد" جدا ہوگئی اس کے صدمہ سے آج میرا دل خستہ حال ہے اور اس کی محبت میں میرا دل اس قیدی کی طرح ہے جس کا فدیہ نہیں دیا گیا ہے اور وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

اس قصیدہ کے دیگر اشعار :-

وقال کلّ خلیل کنت آمله
لا الهینّك انی عنك مشغول
فقلت خلّوا سبیلی لا ابا لکم
فکلّ ما قدّر الرحمٰن مفعول
کلّ ابن أنثیٰ وان طالت سلامته
یوماً علی آلة حدباء محمول
أنبئت أن رسول الله أوعدنی
والعفو عند رسول الله مأمول
مهلا هداك الذی أعطاك نافلة
قرآن فیها مواعیظ وتفصیل
لا تأخذنّی باقوال الوشاة ولم
أذنب وقد کثرت فیّ الاقاویل

اور ہر دوست جس پر مجھے بھروسہ تھا اس نے مجھے کورا جواب دے دیا کہ تم میرے بھروسہ پر نہ رہنا ، میں تمہاری کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا ، تب میں نے کہا تمہارا باپ مرے ، میرا راستہ چھوڑ دو ، خدا نے جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا ، ہر ماں کا بیٹا خواہ وہ طویل مدت تک بسلامت زندہ رہے ، ایک دن جنازہ پر ضرور رکھا جائے گا ، مجھے خبر ملی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دھمکی دی ہے ، اور رسول اللہ ﷺ سے درگذر کرنے کی اُمید کی جاتی ہے ، ذرا ٹھہریے ! جس ذات نے آپ کو نصائح و تفصیلات پر مشتمل کتاب (قرآن) عطا فرمائی ہے — وہ آپ کی رہنمائی فرمائے۔ چغل خوروں کے کہنے پر میری گرفت نہ کیجئے ، میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اگرچہ میرے متعلق بہت سی افواہیں پھیل گئی ہیں۔

دیگر اشعار :-

السامع الذمّ شريك له
و مطعم المأكول كالآكل
مقالة السوء الى اهلها
اسرع من منحدر سائل
و من دعا الناس الى ذمّه
ذمّوه بالحق و بالباطل

برائی کو سننے والا برائی میں شریک ہے اور کھائی ہوئی چیز کو کھلانے والا کھانے والے کی طرح ہے۔ بری بات برے آدمی کی طرف نشیب میں گرنے والے پانی سے بھی زیادہ تیزی سے جاتی ہے، جو لوگوں کو اپنی مذمت اور برائی کرنے پر مجبور کرتا ہے تو لوگ حق و ناحق اس کی مذمت کرتے ہیں۔

۲ ۔ خنساء (وفات ۲۴ھ)

اس کی زندگی کے حالات: اس خاتون کا نام تُماضِر بنت عمرو بن الشرید سُلَیمیّہ ہے، خنساء اس کا لقب ہے جو بہت زیادہ مشہور ہو گیا، شرافت کے عالیشان محل میں اس نے جنم لیا اور گلستان فضیلت میں پھولی پھلی۔ اس کا باپ اور دو بھائی معاویہ و صخر، مضر کے قبیلہ بنو سلیم کے سردار تھے۔ یہ خاتون حسن و ادب میں کمال رکھتی تھی۔ دریدبن الصمہ قبیلہ ہوازن کے سردار اور خاندان جشم کے شہسوار نے اس کے لیے پیغام بھیجا، لیکن اس نے انکار کر دیا اور اپنی قوم میں شادی کرنے کو ترجیح دی۔ جب زمانہ کے ہاتھوں اس کے گھر کے دو ستون (معاویہ و صخر کی موت سے) گر گئے تو اس کو نہایت سخت صدمہ پہنچا اور ان کے رنج میں خوب دل کھول کر روتی اور نہایت پر اثر و دردناک مرثیے کہے، بالخصوص صخر کے لیے کیونکہ وہ بڑا محسن، بہت محبت کرنے والا اور دلیر تھا۔ پھر اپنی قوم کے ساتھ آں حضرت ؐ کے پاس آئی اور اسلام قبول کر لیا۔ حضورؐ کو اس نے اپنے اشعار سنائے تو آپ جھومنے لگے اور مزید سننے کا شوق یہ کہتے ہوئے ظاہر فرمایا "اور سناؤ اے خناس!" ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان ہونے کے بعد خنساء اپنے باپ اور بھائیوں پر بے صبری سے رونا دھونا بند کر دیتی اور دین سے صبر و تسلی پا کر جاہلیت کا راستہ چھوڑ دیتی۔ لیکن صخر کا صدمہ جانکاہ اس کے لیے صبر و سکون سے بالاتر اور ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ وہ برابر اس پر روتی اور مرثیے کہتی رہی، تا آنکہ کثرتِ رنج و غم سے اس کی بینائی جاتی رہی۔ وہ کہتی تھی کہ پہلے میں بدلہ لینے کے لیے اس پر روتی تھی اور آج میں اس کے جہنم میں جانے کی وجہ سے اس پر روتی ہوں۔ لیکن تقاضائے عمر، مرور ایام اور مذہب نے بالآخر اس کے زخم جگر کو مندمل کر دیا اور آپ دیکھیں گے کہ پیری میں خنساء خدا کی رحمت و مہربانی سے دل کو تسلی دے کر تمام رنج و غم بھلا چکی تھی۔ وہ نہایت صبر و سکون سے اپنے ان چار بیٹوں کے قتل ہونے کی خبر سنتی ہے جنہیں خود اس نے جنگ قادسیہ میں لڑنے پر آمادہ کیا تھا اور وہ شہید ہو گئے،

پھر اس سے زیادہ اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ "خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ان کی شہادت سے عزت بخشی اور میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے ان سے ملا دے گا۔" اس نے ۲۴ھ بادیہ میں وفات پائی۔

اس کی شاعری:۔ عرب کی شاعری عورتوں میں اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد کوئی ایسی عورت نہیں گذری جو متانت شعر، نزاکت لفظ اور حلاوت صوت میں خنساء سے بازی لے جاتی، بلکہ بسا اوقات وہ ان صفات میں مایۂ ناز شعراء سے مقابلہ کرتی ہے، نابغہ جریر اور بشار کا تو خیال ہے کہ وہ مردوں سے زیادہ بہتر شاعری کرتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی شاعری میں مردانہ زور بیان، اور زنانہ رقت و سوز و نزاکت یکجا ہیں۔ فخر و مرثیہ کا حصہ اس کی شاعری میں زیادہ ہے۔ فخر میں اس لیے کہ اس کا باپ قوم کا سب سے بڑا اور معزز شخص تھا، اور اس کے دونوں بھائی مضر قبیلہ کے بہترین فرد تھے۔ مرثیہ میں اس لیے کہ باپ اور بھائیوں کی موت نے اس کو سخت صدمہ پہنچایا، اور اس نے ان پر بہت زیادہ رنج و غم کیا، اور غم کا خاصہ ہے کہ وہ احساسات میں شدت اور جذبات میں نزاکت پیدا کر دیتا ہے، جب یہ ایک مرد کی طبیعت میں جوش و روانی پیدا کر دیتے ہیں، تو پھر ایک عورت کی طبیعت میں یہ کس درجہ اثر انداز نہ ہوں گے؛ اپنے بھائیوں کے قتل ہونے سے پہلے وہ دو یا تین شعروں سے زیادہ نہ کہتی تھی، لیکن جب وہ مارے گئے تو اس کی آنکھوں سے آنسو اور دل سے اشعار امڈنے لگے۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کے نہایت پرسوز، حیرت انگیز و بے نظیر مرثیے کہے۔ خنساء اپنی شاعری میں جاہلانہ و بدویانہ طرز ہی پر قائم رہی اور اسلام سے متاثر نہ ہوئی نہ تھوڑا نہ بہت۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ صخر کے مرثیہ میں وہ کہتی ہے:۔

اعینیّ جودا ولا تجمدا
الا تبکیان لصخر الندی؟
الا تبکیان الجرئ الجمیل
الا تبکیان الفتی السیدا!
رفیع العماد، طویل النجا
د، ساد عشیرته امردا

اے میری آنکھو! خوب آنسو بہاؤ اور خشک نہ ہو جاؤ، کیا مجسمۂ جود و سخا صخر کے لیے تم آنسو نہیں بہاؤ گی؟ کیا اس خوبصورت بے باک جوان مرد پر تم سوگ نہیں کرتیں؟ کیا اس نوجوان سردار پر تم نہیں روتیں؟ جس کے خیمہ کے ستون بلند تھے، قد آور ہونے کی وجہ سے جس کی تلوار کا پرتلہ لمبا تھا، اور جو ڈاڑھی نکلنے سے پیشتر ہی نوجوانی میں ہی اپنی قوم کا سردار بن چکا تھا۔

اذا القوم مدّوا ایادیهم
الی المجد مدّ الیه یدا

نثال الذی فوق ایدیهم
من المجد ثم انتمی مصعدا
یحمّله القوم ما عالهم
وان کان اصغرهم مولدا
وان ذُکر المجدُ الفیته
تأزّر بالمجد ثم ارتدی

جب لوگ، عزت و شرافت کو حاصل کرنے کے لیے اپنے اپنے ہاتھ بڑھاتے تو وہ بھی اپنا ہاتھ بڑھاتا، پھر سب لوگوں سے زیادہ شرافت و مجد پا لینے کے بعد بھی وہ اور اوپر ہی بڑھتا چلا جاتا، تمام قوم اپنے دشوار و اہم معاملے اس کے سپرد کر دیتی تھی حالانکہ وہ پیدائش کے لحاظ سے ان میں سب سے چھوٹا تھا، اور اگر کہیں عزت و سروری کا ذکر کیا جاتا تو تم دیکھتے کہ وہ سر سے پیر تک عزت و شرافت میں ملبوس ہوتا تھا۔

اسی صخر کے دوسرے مرثیہ میں وہ کہتی ہے :-

الا یا صخر ان ابکیت عینی
فقد اضحکتنی دهرا طویلا
دفعت بك الخطوب وانت حیّ
فمن ذا یدفع الخطب الجلیلا؟
اذا قبح البکاء علی قتیل
رأیت بکاءك الحسن الجمیلا

اے صخر! اگر میری آنکھوں کو تم رلا رہے ہو تو طویل زمانہ تک تم نے مجھے ہنسایا بھی تھا، جب تم زندہ تھے تو میں اپنی مصیبتیں تمہارے ذریعہ سے دور کرتی تھی، لیکن اب اس بڑی مصیبت کو کون دور کرے گا؟ جب کسی مقتول پر رونا برا مانا جائے، اس وقت بھی میں تجھ پر رونا اچھا اور پیارا کام تصور کروں گی۔

مرثیہ و فخر میں وہ کہتی ہے :-

تعرّقنی الدهر نهسا وحزّا
واوجعنی الدهر قرعا وغمزا
وافنی رجالی فبادوا معًا
فاصبح قلبی بهم مستفزّا
کان لم یکونوا حمی یتّقی
اذا الناس فی ذاك من عزّ بزّا

و خیل تکدّس بالدارعینا
و تحت العجاجة بجمزن جمزا
ببیض الصفاح و سمر الرماح
نبا لبیض ضربا و بالسمر وخزا
جززنا نواصی فرسانها
و کانوا یظنون الّا تجزّا

زمانہ نے تکا بوٹی نوچ کر میرا تمام گوشت کھا لیا اور مار کوٹ کر مجھے بہت دکھ درد پہنچائے (میرے آدمیوں کو تباہ کر دیا اور وہ سب ایک ساتھ مر گئے) انہی کی وجہ سے میرا دل بے چین اور بے قرار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسی لڑائی میں جب کہ غالب آنے والا ہال چھین لیتا ہے، وہ مرنے والے، پناہ گزینوں کے لیے کبھی جائے پناہ ہی نہ تھے۔ بہت سے گھوڑے جو شہسواروں کے بھاری بوجھ کو لے کر جنگ کے غبار میں چھلانگ مارتے اور تیز دوڑتے تھے۔ جن کے سواروں کے پاس چمکدار چوڑی تلواریں اور گندمی رنگ کے نیزے تھے، جو تلواروں سے دشمنوں کو کاٹتے اور نیزوں سے ان کو چھیدتے تھے، ہم نے ان سواروں کے پیشانی کے بال کاٹ دیے (ان کو ذلیل و مغلوب کر دیا) اور وہ خیال کر رہے تھے کہ ان کے بال نہیں کاٹے جائیں گے یعنی وہ کبھی مغلوب نہ ہوں گے۔

و من ظنّ ممّن یلاقی الحروب
بأن لایصاب فقد ظنّ عجزا
نعفّ و نعرف حق القرٰی
و نتخذ الحمد ذخراً و کنزا
و نلبس فی الحرب نسج الحدید
و فی السلم نلبس خزّاً و بزّا

اور جو جنگوں میں حصہ لے کر یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا تو وہ ناممکن چیز کا خیال کر رہا ہے، ہم باعث ننگ و عار امور سے پرہیز کرتے ہیں اور میزبانی کے فرائض خوب جانتے ہیں، لوگوں کی حمد و ثنا کو ذخیرہ و خزانہ سمجھ کر جمع کر لیتے ہیں، جنگ میں ہم لوہے کی بنی ہوئی پوشاک (زرہیں) پہنتے ہیں اور صلح و امن کے زمانہ میں ہم ریشم و کتان کا لباس فاخرہ زیب تن کرتے ہیں۔

اس کے دیگر اشعار:-

ان الزمان وما یفنی له عجب
أبقی لنا ذنباً واستؤصل الراس
إن الجدیدین فی طول اختلافهما
لایفسدان ولکن یفسد الناس

زمانہ اور اس کی لافانی گردشیں بھی عجیب کرشمے دکھاتی ہیں، انہوں نے ہمارے لیے دُم کو تو باقی چھوڑ دیا اور سر کو جڑ سے کاٹ دیا، یہ دن و رات باوجود بار بار آنے جانے کے نئے رہتے ہیں اور ان میں خرابی پیدا نہیں ہوتی لیکن لوگوں میں تغیر اور خرابی ہوتی ہے۔

۳۔ حسان بن ثابت (متوفی ۵۴ھ)

پیدائش اور حالاتِ زندگی: ابو الولید حسان رضؓ بن ثابت انصاری مدینہ میں پیدا ہوئے، زمانۂ جاہلیت میں پرورش پاکر بڑے ہوئے۔ شاعری کو پیشہ بنایا اور اسی کے سہارے زندگی بسر کی۔ یہ شاہان مناذرہ و غساسنہ کی مدح کرتے اور ان کے انعامات قبول کیا کرتے تھے، لیکن ملوک غسان میں سب سے زیادہ انہوں نے آل جفنہ کی مدح کی اور زیادہ تر انہی کے پاس مدد مانگنے کے لیے جاتے، وہ بھی دل کھول کر انہیں اپنی بخششوں سے نوازتے اور اپنے احسانات سے مالا مال کر دیتے۔ خود عیسائی مذہب پر رہتے اور حسان رضؓ کے اسلام قبول کر لینے کے باوجود بھی انہوں نے اپنے اس برتاؤ میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور ان کے قاصد قسطنطنیہ سے ہدیے اور تحائف لے کر حسان کے پاس آتے رہتے تھے۔ جب آں حضرت صؐ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو انصار کے ساتھ حسان رضؓ بھی مسلمان ہو گئے اور اپنی زندگی آں حضرت صؐ کی مدح و حمایت میں وقف کر دی۔ پھر جب آں حضرتؐ پر قریشیوں کی ہجو گراں گذرنے لگی تو آپ نے صحابہ رضؓ سے فرمایا "جن لوگوں نے اللہ و رسول کی مدد اپنے ہتھیاروں سے کی ہے انہیں کیا چیز روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے ان کی مدد نہ کریں؟" فوراً ہی حسان رضؓ نے کہا "میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں" پھر اپنی لمبی زبان کو ناک کی نوک پر مارتے ہوئے بولے اس زبان کے عوض اگر مجھے بصریٰ سے لے کر صنعاء کے برابر لمبی زبان ملے تو بھی اسے قبول نہ کروں، بخدا اگر میں اسے چٹان پر رکھ دوں تو اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں اور بالوں پر رکھ دوں تو یہ بال مونڈ ڈالے۔" اس پر آں حضرت صؐ نے فرمایا "مگر تم ان کی ہجو کیونکر کرو گے، میں بھی تو انہیں کے خاندان میں شامل ہوں؟" تو حسان رضؓ نے جواب دیا "میں آپ کو ان میں سے اس طرح صاف نکال دوں گا جس طرح گندھے ہوئے آٹے میں سے بال۔" آپ نے فرمایا "اب تم ان (کفار) کی ہجو کرو اور روح القدس تمہارے ساتھ ہیں" چنانچہ حسان نے ان کی ہجو کہہ کر انہیں سخت تکلیف پہنچائی اور ان کی زبانوں کو بند کر دیا۔ ان کے اشعار سے کفار کو وہی ایذا پہنچی جو اندھیرے میں لگنے والے تیروں سے پہنچتی ہے۔ کفار کی اس ہجو نے حسان کو بڑی مقبولیت و شہرت بخشی۔ ان کی وقعت بڑھ گئی اور انہوں نے اپنی بقیہ عمر نہایت عزت کے ساتھ گذاری۔ بیت المال سے ان کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، تا آنکہ ۵۴ھ میں ایک سو بیس برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ آخری عمر میں وہ بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔

ان کی شاعری: جاہلیت میں حضرت حسان رضؓ شاہی شاعر، زمانۂ نبوت میں شاعر رسالت مآب اور اسلام میں یمنیوں کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں فخر، حماسہ، مدح و ہجو

کا عنصر غالب ہے اور یہ تمام وہ موضوعات ہیں جن کو ادا کرنے کے لیے شوکت الفاظ اور متانت اسلوب درکار ہیں، لہذا ان کی شاعری میں کچھ غریب الفاظ اور نامانوس اسلوب کی ایک جھلک پیدا ہوگئی تھی، جو اسلام کی وجہ سے ختم ہوگئی۔ پھر مذہبی روا داری، کینوں کے خاتمہ اور بڑھاپے کی وجہ سے ان میں شاعری کے محرکات کمزور پڑ گئے اور صرف نبیؐ کی حمایت اور انصار کی مدافعت کے لیے یہ محرکات کبھی کبھی ابھر آتے تھے، لیکن اس صنف میں ان کی شاعری کا بیشتر حصہ غیر محکم ہے اس میں خامیاں زیادہ اور خوبیاں کم ہیں اور اس پر آسان پسندی کا رنگ غالب ہے، اصمعی کا تو یہ خیال ہے کہ ان کی شاعری شر پسند موضوعات میں زور دار تھی اور اسلامی خیر آنے کے بعد اس کا زور ختم ہوگیا تھا۔ قومی فخر اور خود ستائی کرنے میں ان کی شاعری باوجود ان کی بزدلی اور ڈرپوکی کے، ابن کلثوم کی شاعری سے مشابہ ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:- ان کی ہجویہ شاعری:-

الا ابلغ ابا سفيان عني
مغلغلة فقد برح الخفاء
بان سيوفنا تركتك عبدا
وعبد الدار سادتها الاماء
هجوت محمدا فأجبت عنه
وعند الله في ذاك الجزاء
اتهجوه ولست له بكفء؟
فشركما لخيركما الفداء

ابوسفیان کو میری طرف سے پیغام پہنچا دو، کہ راز آشکارا ہوچکا ہے، ہماری تلواروں نے تم کو ذلیل کر کے غلام بنا لیا ہے اور عبد الدار قبیلہ کی سیادت لونڈیوں کے ہاتھ میں ہے۔ تونے محمد کی ہجو کی، اور میں نے اس کا جواب دے دیا، اب اس کا بدلہ خدا کے ہاں ملے گا، کیا تو ان کی ہجو کرتا ہے حالانکہ تو ان کے برابر کا نہیں ہے؛ تم دونوں میں جو بدترین ہے وہ بہترین شخص پر قربان ہے۔

لنا في كل يوم من معد
سباب او قتال او هجاء
لساني صارم لا عيب فيه
وبحري لا تكدره الدلاء
فان ابي و والدتي و عرضي
لعرض محمد منكم وقاء

ہمیں ہر روز معد قبیلہ سے بد کلامی، جنگ یا ہجو گوئی میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے، میری زبان تیز ہے اس میں کوئی نقص نہیں ہے، اور میرے دریا کو ڈول گندا نہیں کرتے۔ میں، میرا باپ، میری ماں اور میری آبرو محمدؐ کی آبرو کو تمہاری دست درازیوں سے بچانے کے لیے ڈھال ہیں۔

بنو تمیم کا ایک وفد زبرقان بن بدر کی نیابت میں آں حضرت ؐ کے پاس آیا اور فخریہ شاعری میں مقابلہ کرنے لگا، جب وہ اپنے اشعار سنا چکے تو آپؐ نے حسان رضؓ کو جواب دینے کا حکم دیا، چنانچہ انہوں نے یہ اشعار کہے:-

ان الذوائب من فهر و اخوتهم
قد بيّنوا سنّة للناس تُتّبَعُ
قوم اذا حاربوا ضرّوا عدوّهم
او حاولوا النفع فی اشياعهم نفعوا
سجية تلك فيهم غير محدثة
ان الخلائق فاعلم شرّها البدع
لا يرتع الناس ما اوهت اكفّهم
عند الدفاع ولا يوهون ما رقعوا

خاندان فہر کے معزز افراد اور ان کے بھائیوں نے مل کر انسانوں کے لیے ایک قابل تقلید دستور بنا دیا ہے، یہ ایسی قوم ہے کہ جب جنگ کرتی ہے تو اپنے دشمنوں کو ضرر پہنچاتی ہے اور جب اپنے ساتھیوں کو فائدہ پہنچانا چاہتی ہے تو ان کو فائدہ پہنچا دیتی ہے، ان کی یہ عادت نئی یا مصنوعی نہیں ہے کیونکہ بدترین عادتیں وہ ہوتی ہیں جو نئی یا مصنوعی ہوں، ان کے ہاتھ جو کچھ بگاڑتے ہیں لوگ اسے سدھار نہیں سکتے اور جسے وہ سدھارتے ہیں لوگ اسے بگاڑ نہیں سکتے۔

ان كان فی الناس سبّاقون بعدهم
فكل سبق لأدنى سبقهم تبع
أعفّة ذكرت فی الوحی عفّتهم
لا يطبعون ولا يُزْرِی بهم طمع
لا يفخرون اذا نالوا عدوّهم
وان أصيبوا فلا خور ولا جزع

اگر ان کے بعد لوگوں میں کچھ سبقت لے جانے والے ہوں بھی تو ان کی تمام سبقتیں ان (ممدوحوں) کی معمولی سبقتوں کے پیچھے ہی رہیں گی۔ یہ (ممدوح) پاکباز و ایماندار ہیں قرآن میں ان کی پاکبازی کا ذکر ہے، ان کے اخلاق خراب نہیں ہوتے نہ طمع ان کو نقصان پہنچاتی ہے، اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچا کر یہ مغرور نہیں ہوتے، اور اگر دشمنوں کے ہاتھوں انہیں گزند پہنچتا ہے تو یہ گھبراہٹ اور

بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

جبلۃ بن الأیہم کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

لله درّ عصابة نادمتهم
يوماً بجلّق في الزمان الأوّل
يمشون في الحلل المضاعف نسجها
مشي الجمال الى الجمال البزّل
والخالطون فقيرهم بغنيّهم
والمشفقون على الضعيف المرمل
أولاد جفنة حول قبر أبيهم
قبر ابن مارية الكريم المفضل

خدا دمشق کی اس جماعت کو خوش رکھے جن کی صحبت پہلے زمانہ میں مجھے نصیب تھی، جو مضبوط دوہرے بنے ہوئے لباسوں میں اس طرح وقار سے چلتے تھے جیسے اونٹ سن رسیدہ اونٹوں کی طرف چلتے ہیں، یہ اپنے غریبوں کو امیروں کے ساتھ ملا دیتے ہیں اور ضعیف محتاجوں سے نرمی و محبت کا سلوک کرتے ہیں، یہ جماعت جفنہ کی اولاد ہے جو اپنے محسن و فیاض باپ (حارث) ابن ماریہ کی قبر کے اردگرد بیٹھی ہے۔

يسقون من ورد البريص عليهم
بردى يصفق بالرحيق السلسل
يسقون درياق الرحيق ولم تكن
تدعى ولائدهم لنقف الحنظل
بيض الوجوه كريمة أحسابهم
شمّ الأنوف من الطراز الأوّل
فلبثت أزماناً طوالاً فيهم
ثمّ ادّركت كأنني لم افعل

جو ان کے پاس جاتا ہے اسے وہ نہر بریص اور بردی (دمشق کی سب سے بڑی اور مشہور نہروں) کا پانی پلاتے ہیں جو صاف اور میٹھے پانی سے موجیں مار رہی ہے، وہ خالص عمدہ اور تیز شراب پلاتے ہیں، اور ان کی کنیزیں حنظل پھوڑنے کے لیے نہیں بلائی جاتی ہیں، (یعنی وہ بڑے آسودہ حال ہیں ان کے خدام بھی معمولی خدمات انجام نہیں دیتے) بڑے شریف اور معزز خاندانی لوگ ہیں پرانی وضع کے لوگوں کی طرح غیرت دار اور بہادر ہیں، میں ان کی صحبتوں میں مدتوں رہا ہوں۔ اور آج ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ گویا کبھی ان کے ساتھ رہا ہی نہیں۔

دیگر:-

وانّ امرأً یمسی ویصبح سالما
من الناس الّا ماجنی لسعیدا

جو شخص صبح سے شام تک لوگوں کے ظلم سے بچا رہے اور صرف اپنے کیے کو بھگتے وہ بڑا سعادتمند ہے۔

دیگر اشعار:-

رب حلم اضاعه عدام المال
و جهل غطّی علیه النعیم
ما اُبالی اَنبَّ بالحزن تیس
ام لحانی بظهر غیب لئیم

کتنے حلم ہیں جن کو فقر نے ضائع کر دیا اور کتنی حماقتیں ہیں جن پر دولت پردہ بنی ہوئی ہے، مجھے اس کی پروا نہیں کہ پہاڑی زمین میں کوئی بکرا بڑ بڑ اٹھے یا میری عدم موجودگی میں کوئی کمینہ مجھے گالیاں دے (یعنی میری نظر میں دونوں کے عمل مساوی ہیں)۔

۴۔ حُطیئہ (متوفی ۶۵۹)

پیدائش اور حالات زندگی: ابو ملیکہ جرول بن اوس علبسی، خاندان عبس میں مشکوک النسب پیدا ہوا۔ اس کا صحیح نسب نامعلوم ہے۔ شرافت و عزت سے کوئی رشتہ اسے نہیں ملا۔ بے نصیبی، مظلومی اور ذلت و خواری کے آغوش میں پرورش پائی۔ نہ گھر والوں کی مدد اس کے شامل حال رہی نہ قوم کا سہارا، مجبوراً کسب معاش اور لوگوں کے ظلم کو روکنے کے لیے شاعری کا پیشہ اختیار کر لیا تاکہ اس ذریعہ سے وہ اس سماج سے اپنا بدلہ لے جس نے اس کی حق تلفی کی اور اسے بے آسرا چھوڑ دیا۔ تمام شرپسند عناصر نے متحد ہو کر اس سے مصالحت کر لی اور اسے ایک پیکر معصیت بنادیا واقعۃً وہ اصمعی کی تعریف کے مطابق بدخلق، کمینہ سرشت، بددین، بھکاری، ھٹی حریص، بدی میں زیادہ بھلائی میں کم، کنجوس، بدشکل، پست قد، بدوضع اور بدنسلی کی وجہ سے قبائل میں ناقابل قبول تھا۔ اس کا کمینہ پن یہاں تک پہنچ گیا کہ اس نے اپنی ماں، بیوی، بچوں حتیٰ کہ خود اپنی بھی ہجو کہہ ڈالی۔ جب اسلام پھیلا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا۔ بعد میں مرتد ہو گیا، لیکن پھر غیر مستحکم عقیدہ کے ساتھ مسلمان ہو گیا، اور مذہب بھی اس کے پست نفس کو بلند نہ کر سکا، نہ اس کے بے باک و بے لگام زبان کی تندی کم کر سکا، اور اس کی زبان مسلسل لوگوں کی آبرو ریزی میں مشغول رہی۔ وہ برابر لوگوں کو دکھ دیتی رہی حتیٰ کہ رسول اللہؐ کے صحابی عمر بن الخطابؓ کے گورنر زبرقان بن بدر بھی باوجود اس پر احسان و اکرام، کے اس کی زبان سے محفوظ نہ رہ سکے، اور اس نے زبرقان کے دشمن بغیض بن لائی کا ساتھ دیا، بنو انف الناقہ کی مدح،

اور زبرقان کی ہجو کی، اس پر زبرقان نے امیرالمومنین حضرت عمرؓ سے فریاد کی، اور انہوں نے اسے قید کر دیا، پھر اس نے معافی مانگنے کے لیے اپنے اشعار بطور سفارش حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجے، تو حضرت عمرؓ نے اسے رہا کر دیا اور آئندہ ہجویہ شاعری کرنے سے منع کیا، تب حطیئہ نے کہا "ایسی شکل میں میرے بال بچے بھوکے مرجائیں گے، کیونکہ یہی میرا پیشہ اور ذریعہ معاش ہے" چنانچہ خلیفہ نے اسے تین ہزار درہم دے کر مسلمانوں کی آبروؤں کو اس کی دست درازیوں سے بچا لیا، اور وہ حضرت عمرؓ کی وفات تک اپنی ان حرکتوں سے باز رہا لیکن ان کے انتقال کے بعد ہی اس نے پھر اپنی پہلی عادت اختیار کر لی، وہ اپنے انہیں ڈھنگوں میں رہا حتی کہ ۵۹ھ میں موت نے اسے خاموش کر دیا۔

اس کی شاعری:- حطیئہ کی شاعری پرزور و متین، ہمہ گیر، خوش اسلوب اور رواں قافیہ والی ہے۔ شاعری کے متفرق موضوعات میں سے مدح، ہجو، نسب و فخر پر اس نے طبع آزمائی کی، اگر اس میں خست طبع، تنگ ظرفی، سوقیت اور اوچھاپن نہ ہوتا تو مخضرم شعراء میں سے کوئی بھی اس پر سبقت نہ لے جاتا، اس کی شاعری میں آپ ترتیب کی خامی، لفظی رکاکت یا قافیہ کی بے قاعدگی — جو اس کے علاوہ دوسرے شعراء میں بکثرت ہیں — نہیں پائیں گے۔ لیکن کلام کی عزت و قدر اس کے کہنے والے کی عزت و قدر پر منحصر ہے۔

حطیئہ بھی زہیر کی طرح غلامانِ شاعری میں شمار ہوتا ہے، جو اپنے اشعار میں بہت غور و فکر اور چھان بین کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں اس کا یہ مقولہ بھی بیان کیا جاتا ہے: بہترین شاعری وہ ہے جس کو ایک سال تک چھانٹنے اور پرکھنے کے بعد پیش کیا جائے" باوجود تلخی و تیزی کے اس کی ہجو میں آپ کو عریانی و فحش کلامی بہت کم ملے گی۔ حتی کہ زبرقان کی ہجو میں اس کا یہ شعر خود امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ کے لیے بھی چیستان بن گیا:-

دع المکارم لا ترحل لبغیتها
واقعد فانک انت الطاعم الکاسی

آپ بلند کارناموں کو چھوڑ دیجیے، ان کی تلاش میں سفر نہ کیجیے، اور آرام سے بیٹھئے کیونکہ آپ کے پاس کھانے اور پہننے کو سب کچھ ہے۔

اور وہ اس شعر میں جو طنز آمیز ہجو ہے اسے نہ سمجھ سکے، حتی کہ یہ نکتہ انہیں حضرت حسانؓ نے بتایا۔

اس کی شاعری کا نمونہ:- جب اسے زبرقان بن بدر کی بدمعاملگی کا خیال ہوا تو وہ اسے چھوڑ کر بغیض سے جا ملا، اور زبرقان کی ہجو میں یہ اشعار کہے:-

واللہ ما معشر لاموا امرأً جنبا
فی آل لأی بن شماس بأکیاس
ما کان ذنب بغیض لا ابا لکم
فی بائس جاء یحدو آخر الناس

وقد مدحتكم عمداً لارشدكم
كيما يكون لكم متحي و إمراسي
لما بدالي منكم عيب أنفسكم
ولم يكن لجرحي فيكم آسي
أزمعت يأساً مبيناً من نوالكم
ولن تُرى طارداً للحر كالياس

بخدا وہ لوگ جنہوں نے (مجھ) پردیسی کو خاندان لای بن شماس کی مدح سرائی پر برا بھلا کہا وہ خردمند نہیں، تمہارا باپ نہ رہے "بغیض" کا اس میں کیا جرم ہے کہ اس نے ایک اجنبی بے چارہ شخص کی مدد کی۔ اور میں نے تمہاری مدح عمداً اس لیے کی تھی کہ تمہیں یہ بتادوں کہ میرا ڈول ڈالنا اور کھینچنا تمام جدو جہد صرف تمہارے لیے ہے۔ مگر جب مجھے تمہاری خرابیاں نظر آئیں اور میرے زخموں کا کوئی معالج تم میں نظر نہ آیا تو میں تمہاری امداد و اعانت سے بالکل مایوس ہوگیا، اور شریف انسان کو ناامیدی سے زیادہ کوئی چیز دور بھگانے والی نہیں ہوتی۔

جار لقوم أطالوا هون منزله
وغادروه مقيما بين أرماس
ملّوا قراه، وهرّته كلابهم
وجرّحوه بانياب و اضراس
دع المكارم لا ترحل لبغيتها
واقعد، فانك انت الطاعم الكاسي
من يفعل الخير لا يعدم جوازيه
لا يذهب العرف بين الله والناس

(میں) ایسی قوم کا ہمسایہ رہا جنہوں نے اس کی بڑی توہین و تذلیل کی اور اسے قبرستان میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کی میزبانی سے عاجز آگئے، اور ان کے کتے بھی اسے بھونکنے لگے، اور انہوں نے اپنی کچلیوں اور ڈاڑھوں سے اس کو کاٹ کر گھائل کر دیا۔ تو شرافت کے کارناموں کو چھوڑ دے ان کی جستجو میں سفر مت کر، اور آرام سے بیٹھا رہ کیونکہ کھانے اور پہننے کو تمہیں ملا ہوا ہے۔ جو کار خیر کرے گا اس کا بدلہ پائے گا، احسان اللہ کے نزدیک اور لوگوں میں بے نتیجہ نہیں رہے گا۔

مدح میں وہ کہتا ہے:-

يسوسون احلاما بعيدا اناتها
وان غضبوا جاء الحفيظة والجد
اقلّوا عليهم لا ابا لابيكم
من اللوم او سدّوا المكان الذي سدّوا

اولئك قوم ان بنوا احسنوا البنا
وان عاهدوا اوفوا وان عقدوا شدوا

وہ ایسی عقلوں کا بندوبست کرتے ہیں جن سے نرمی و تحمل دور رہے، اور جب وہ غضبناک ہوتے ہیں تو ان میں حمیت اور سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے، تمہارا برا ہو۔ ان لوگوں کو ملامت نہ کرو، ورنہ اس جگہ کو پُر کرو جسے انہوں نے پُر کیا ہے، یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کسی کے ساتھ دوستی یا احسان کرتے ہیں تو اسے پوری طرح نباہتے ہیں اور اگر کسی سے عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں، اور اگر کوئی معاملہ کرتے ہیں تو اسے پختہ کرتے ہیں۔

وان كانت النعماء فيهم جزوا بها
وان انعموا لا كدروها ولا كدوا
مطاعين في الهيجا مكاشيف للدجى
بنى لهم اباؤهم وبنى الجد
ويعذلني ابناء سعد عليهم
وما قلت الا بالذي علمت سعد

اگر وہ آسودہ ہوتے ہیں تو دوسروں کو اپنی دولت سے نوازتے ہیں، اور اپنے سلوک کو احسان جتا کر مکدر نہیں کرتے، نہ اس کا عوض مانگ کر تکلیف پہنچاتے ہیں۔ جنگ میں وہ بڑے نیزہ باز ہیں، دانشمندی کی وجہ سے تاریکیوں کو روشن کرتے اور پیچیدگیوں کو حل کرتے ہیں یہ عزت و سربلندی ان کے آباؤ اجداد اور ان کے نصیب نے انہیں بخشی ہے۔ بنو سعد مجھے ان کی مدح کرنے پر ملامت کرتے ہیں حالانکہ میں نے وہی کہا ہے جسے خود بنو سعد بھی صحیح جانتے ہیں۔

اسلامی شعراء

۱۔ عمر بن ابی ربیعہ (پیدائش ۲۳ھ وفات ۹۳ھ)

پیدائش و زندگی کے حالات:۔ ابو الخطاب عمر بن ابی ربیعہ قریشی مخزومی عین اسی رات کو مدینہ میں پیدا ہوا جس رات حضرت عمرؓ نے انتقال فرمایا۔

لوگ کہا کرتے تھے: "کتنا بڑا حق اٹھ گیا، اور کونسا باطل اس کی جگہ آیا" وہ اپنے باپ عبداللہ کی نعمتوں میں پرورش پا کر بڑھا جو آں حضرتؐ اور ان کے بعد تین خلفاء کے گورنر اور آسودہ حال سردار تھے۔ اس لیے وہ مال و آسائش، آسودگی و فارغ البالی میں پلا، کاروبار سے بے فکری کے باعث وہ یکسوئی سے شعر و شاعری میں مشغول ہو گیا اور چھوٹی عمر میں ہی خاصی شاعری کرنے لگا، لیکن جریر و فرزدق جیسے بلند پایہ شاعروں میں سے کسی نے بھی اسے درخور اعتناء نہ سمجھا۔ وہ مسلسل شاعری کی مشق کرتا رہا اور

مشکلات شاعری کو آسان کرنے میں کوشاں رہا، حتیٰ کہ شاعری اس کے سامنے جھک کر اس کی تابع و مطیع ہو گئی اور جب جریر نے اس کا رائیہ قصیدہ سنا، جس کا مطلع ہے :۔

أمن آل نعم أنت غاد فمبكر

غداة غد، أم رائح فمهجر

کیا تو آل نعم کے پاس سے کل صبح تڑکے جانے والا ہے یا شام کو جلدی سے جانے والا ہے۔

تو اس نے کہا "یہ قریشی تو تک بندی کرتے کرتے اب عمدہ شاعری کرنے لگا ہے"۔ شاعری میں ابن ابی ربیعہ نے غیر مانوس و نا آشنا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے شاعری کو عورت، عورتوں ان کی باہمی ملاقات، آپس کی چھیڑ چھاڑ اور دل لگی بازی کے حالات بیان کرنے میں محدود کر دیا اور وہ ان مضامین کو نہایت خوشنما الفاظ اور انوکھے پیرایہ میں ادا کرتا ہے، چنانچہ گویتے، خوش مذاق لوگ اس کی شاعری کے دلدادہ ہو گئے، گانے والیاں اور بے نوشوں میں اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی عوام الناس میں اس کی شاعری خوب گائی اور سنائی جانے لگی، حتیٰ کہ غیر تمندوں اور زاہدوں نے اس کے خلاف شور مچا دیا۔ ابن جریج کا قول ہے کہ نوجوان لڑکیوں کے پردہ میں ابن ابی ربیعہ کی شاعری سے زیادہ مضرت رساں کوئی چیز داخل نہیں ہوئی۔ اس کی شرارت اسی حد پر ختم نہ ہوتی تھی، بلکہ وہ حج کرنے والی عورتوں کے پیچھے لگ جاتا، باعزت عورتوں، شہزادیوں سے شاعری میں اظہار محبت کرنے لگتا، اور طواف و احرام میں مصروف خواتین کے اوصاف بیان کرتا یہاں تک کہ اس کے خوف سے شریف خاندانوں کی عورتوں نے فریضۂ حج ادا کرنے میں کمی کر دی تھی۔ ارباب حکومت بردباری سے کام لے کر اس کی خاندانی عزت کی رعایت، اس کی پاکیزہ و بلند شاعری پر فخر اور اس کی توبہ کا انتظار کرتے ہوئے اس کی جہالت سے چشم پوشی کر لیتے تھے۔ لیکن خلیفہ عمر بن عبد العزیز اس کے اس اندھا دھند مذاق و تمسخر اور جہالت میں انہماک پر تاب ضبط نہ لا سکے اور اسے "دھلک" میں، جو یمن و حبشہ کے درمیان بحر احمر کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ ہے، جلا وطن کر دیا، جہاں خلفائے بنو امیہ مجرموں کو بھیج کر جلا وطنی کی سزا دیا کرتے تھے۔ پھر جب تک اس نے عشق بازی چھوڑنے کی پختہ قسم نہ کھائی اور خلوص دل سے توبہ نہ کی، وہ وہاں سے واپس نہ آیا۔ شاید اس کی قسم کو سچا کرنے میں بڑھاپے نے اس کی مدد کی اور اس نے زہد و راہبی کا طریقہ اختیار کر لیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عمر پاکباز و عفت مآب شخص تھا، وہ صرف کہتا تھا، کرتا نہ تھا۔ اوپر ہی اوپر منڈلاتا، لیکن اترتا نہ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ آخری مرتبہ جب وہ بیمار پڑا تو اس کا بھائی حارث بہت زیادہ گھبرانے لگا، عمر نے اس سے کہا "شاید تم میری بداعمالیوں کے خیال سے گھبرا رہے ہو۔ بخدا! مجھے نہیں معلوم کہ کبھی کوئی بدکاری مجھ سے سرزد ہوئی ہو" تو اس نے کہا "مجھے تمہاری طرف سے یہی خطرہ تھا، جسے تم نے مجھ سے دور کر دیا"۔

اس کی شاعری:- اس کی شاعری دل کے اندر پہنچ کر انتہائی رقت طاری کر دیتی ہے، اس لیے کہ وہ آسان ہے، اس کے الفاظ خوشنما، وصف عمدہ، بندش پختہ، اور مضامین زود فہم ہیں۔ جمال کی تعریف اور عورتوں کے وصف میں اس کی شاعری لوگوں کی طبیعتوں سے ہم آہنگ اور ان کی خواہشات کے مطابق ہے۔ وہ اپنے نسب، و شباب اور اپنی دولت و آسودگی کے باعث ایسی باتوں کے بیان کرنے میں کامیاب ہو گیا جنہیں کوئی دوسرا بیان کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ اس نے شاعری میں عشقیہ مضامین افسانوی رنگ میں پیش کیے، جن میں وہ عورتوں کے اوصاف بیان کرتا، ان کی باہمی گفتگو اور آپس کے مذاق کی تصویر کھینچتا اور ان کے ساتھ اپنے واقعات کو بیان کرتا ہے، چنانچہ عوام کے دل و دماغ پر وہ اس طرح چھا گیا کہ انہیں بالآخر قریش میں شاعری کا اعتراف کرنا ہی پڑا، حالانکہ پہلے وہ اس امر کے منکر تھے۔ شعراء پر اس نے اپنی دھاک بٹھا دی حتیٰ کہ جریر بول اٹھا "بخدا یہی وہ شاعری ہے جس کا تمام شاعر قصد کرتے ہیں لیکن اس تک پہنچ نہ سکے، اور محبوب کے مکانوں اور کھنڈروں میں الجھ کر رہ گئے"۔

اس کے باوجود اس کی شاعری میں جمیل وکثیر کی شاعری کی طرح گہرے احساسات اور محبت کا پاکیزہ وصف نہیں ملے گا۔ بلا شک وہ ایک عورت باز شخص تھا، جسے عورتوں میں رہنا اور ان سے باتیں کرنا اور دل بہلانا، اور ان سے لطف اندوز ہونا پسند تھا، لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی وہ اپنے دل میں جگہ نہ دیتا تھا، صرف ثریا بنت علی بن عبد اللہ بن حارث کے ساتھ اس کا جو معاملہ تھا وہ کچھ صحیح عشق و محبت سے مشابہ ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:- اپنے ایک غزلیہ قصیدہ میں وہ کہتا ہے:-

تحن الی نعم فلا الشمل جامع
ولا الحبل موصول ولا انت مقصر
تقی فانظری اسماء هل تعرفینه
أهذا المغيريّ الّذی کان یذکر؟
اهذا الذی اطریت نعتا فلم اکن
وعیشك انساه الی یوم اقبر
لئن کان ایّاه لقد حال بعدنا
عن العهد والانسان قد یتغیّر!

تو نعم کے وصال کا مشتاق ہے لیکن نہ تو جدائی ملانے والی ہے۔ نہ رسی جڑ سکتی ہے، اور نہ تو اس کی محبت کو چھوڑنے والا ہے، ٹھہرو! ذرا دیکھو اسماء کیا تم اس شخص کو پہچانتی ہو، کیا یہی وہ مغیری ہے جس کا چرچا کیا جاتا تھا؛ کیا یہی وہ شخص ہے جس کی تعریف میں تو نے مبالغہ آمیزی کی تھی اور جسے تیری عمر کی قسم،

ہیں مرتے دم تک بھول نہیں سکتی، اگر یہ وہی ہے تو ہمارے بعد اس کی حالت دگرگوں ہو گئی، اور انسان بدلتا رہتا ہے۔

رأت رجلا اما اذا الشمس عارضت
فيضحى و اما بالعشى فيخصر
اخا سفر، جوّاب ارض تقاذفت
به فلوات فهو اشعث اغبر
قليلاً على ظهر المطيّة ظلّه
سوى مانفى منه الرّداء المحبّر
و اعجبها من عيشها ظلّ غرفة
و ريّان ملتف الحدائق اخضر
و وال كفاها كل شئ يهمها
فليست لشئ اخر الليل تسهر

اس عورت نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جو دن بھر دھوپ میں تپتا ہے اور رات کو سردی مرتا ہے، جو پیہم سفر کرنے والا اور زمین کی مسافتیں طے کرنے والا ہے اور جنگلوں جنگلوں پھرنے کی وجہ سے اس کے بال پریشان و گرد آلود ہیں، اور سواری پر اس کو دھوپ سے بچانے کے لیے سوائے نقشین چادر کے سایہ کے کوئی دوسری چیز نہیں ہے، اس عورت کو جس چیز نے حیرت و تعجب میں ڈال دیا وہ اس کا آرام سے کمرے کے سائے میں رہنا، اور گھنے سرسبز درختوں والے باغات میں آسودہ زندگی بسر کرنا ہے، نیز اس نگران (شوہر) کی موجودگی ہے جو اس کی تمام ضرورتیں پوری کرتا ہے جس کے باعث وہ آخری رات تک کسی کام کے لیے نہیں جاگتی۔

و ليلة ذى دوران جشّمنى الكرى
و قد يجشم الهول المحبّ المغرّر
فبتّ رقيبا للرفاق على شفا
و لى مجلس لولا اللبانة اوعر
فقلت أباديهم فاما افوتهم
و اما ينال السيف ثاراً فيثأر
فلما فقدت الصوت منهم واطفئت
مصابيح شُبّت للعشاء و انور
وغاب قمير كنت ارجو غيوبه
و روّح رعيان و نوّم سمّر

و نفضت عنى النوم اقبلت مشية الـ

حباب و ركنى خيفة القوم ازور

اور شب ذی دوران میں مجھے نیند کے جھونکوں نے پریشان کر دیا، اور رخستہ حال عاشق خطرات کی دشواریاں برداشت کر لیتا ہے، رات کو ایک کنارے بیٹھ کر میں نے ساتھیوں کی نگرانی کی، اور اگر تقاضائے عشق نہ ہوتا تو یہ بیٹھنا مجھ پر گراں گذرتا۔ پھر میں نے کہا "میں ان سے مقابلہ کرتا ہوں یا تو میرا وار اکارت جائے گا یا تلوار انتقام لے لیگی"۔ پھر جب مجھے ان کی آواز سنائی نہ دی، اور وہ روشنیاں اور چراغ بھی بجھ گئے جو رات میں روشن کیے گئے تھے اور وہ چھوٹا سا چاند بھی ڈوب گیا جس کے ڈوبنے کا مجھے انتظار تھا، اور چرواہوں نے اپنے جانوروں کو آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا، اور شبانہ محفلیں بھی ختم ہو گئیں، تو میں اپنی نیند کو جھاڑتے ہوئے دبے پاؤں آگے بڑھا اور میں اس وقت لوگوں کے ڈر سے جھکا ہوا تھا۔

فحييت اذ فاجأتها فتولّهت

وكادت بمخفوض التحية تجهر

وقالت وعضّت بالبنان فضحتنى

وأنت امرؤ ميسور أمرك أعسر

أريتك ان هُنّا عليك ألم تخف

رقيبا وحولى من عدوّك حضّر؟

پھر جب اچانک میں اس (محبوبہ) کے پاس پہنچ گیا اور میں نے اسے سلام کیا تو وہ مجھ سے بچنے لگی، اور قریب تھا کہ وہ بلند آواز سے مجھے برا بھلا کہنے لگے، پھر حیرت سے انگشت بدنداں ہو کر مجھ سے بولی "تم نے تو مجھے رسوا کر دیا، اور تم ایسے شخص ہو کہ تمہارا آسان کام بھی سخت دشوار رہے، ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہارے لیے نرم بھی ہو گئے تب بھی کیا تم اپنے ان دشمنوں سے نہ ڈرے جو ہمارے ارد گرد نگرانی کرنے کے لیے موجود ہیں۔

فلما تقضّى الليل الا أقلّه

وكادت توالى نجمه تتغوّر

أشارت لأختيها أعينا على فتى

أتى زائرًا والأمر للامر يقدر

فأقبلتا فارتاعتا ثم قالتا

اقلّى عليك اللوم فالخطب ايسر

يقوم فيمشى بيننا متنكّرًا

فلا سرّنا يفشو ولا هو يظهر

فكان مجنّي دون من كنت أتّقي
ثلاث شخوص كاعبان ومُعصِر

جب رات ختم ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی، اور تارے ایک ایک کرکے ڈوبنے لگے، تو اس نے اپنی دو سہیلیوں سے خاموشی سے کہا تم اس نوجوان کی مدد کرو، جو ملاقات کے لیے آیا تھا، اور ایک بات کا دوسری بات سے اندازہ لگایا جاتا ہے۔ وہ دونوں آگے بڑھیں اور چونکیں، پھر کہنے لگیں، "تم فکرمند نہ ہو اور خود پر ملامت نہ کرو، یہ معاملہ تو بہت آسان ہے" یہ شخص کھڑا ہو جائے اور ہمارے درمیان انجان بن کر چلنے لگے، تو نہ ہمارا راز فاش ہوگا نہ اس کو کوئی دیکھے گا،" چنانچہ میں اس وقت تین شخصوں کی آڑ میں چھپا ہوا تھا دو تو ابھری چھاتیوں والی لڑکیاں تھیں اور ایک نوجوان بالغ عورت۔

فلمّا أجزنا ساحة الحيّ قلن لي
ألم تتق الاعداء والليل مقمر؟
وقلن أهذا دأبك الدهر سادراً
أما تستحي أو ترعوي أو تفكر!
اذا جئت فامنح طرف عينيك غيرنا
لكي يحسبوا أن الهوى حيث تنظر
هنيئًا لبعل العامرية نشرها
اللذيذ وريّاها الذي أتذكّر

جب ہم نے قبیلہ کا میدان طے کر لیا تو انہوں نے مجھ سے کہا "کیا عمر بھر تمہاری یہ مدہوشی اور لاابالی پن کی عادت ختم نہیں ہوگی، کیا تمہیں کبھی شرم نہیں آئے گی اور تم اپنی حرکتوں سے کبھی باز نہیں آؤ گے یا اپنی حالت پر غور و فکر بھی نہیں کرو گے؟ جب تم ہم سے ملنے آیا کرو تو اپنی آنکھوں سے دوسروں کی طرف دیکھا کرو تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ جدھر تم دیکھ رہے ہو انہیں سے تم کو محبت ہے۔ عامریہ کے شوہر کو اپنی بیوی کی عمدہ خوشبو اور وہ مہک مبارک ہو جسے میں اب تک یاد کرتا ہوں۔

اس کے دیگر اشعار:

ألا ليت أني يوم تقضي منيّتي
لثمت الذي مابين عينيك والفم
وليت طهوري كان ريقك كلّه
وليت حنوطي من مشاشك والدم
ألا ليت أم الفضل كانت قرينتي
هنا أوهنا في جنّة أو جهنم

کاش موت سے پہلے میں تیری آنکھوں اور منہ کے درمیانی جگہ (رخساروں) کو چوم لیتا، اور کاش

مجھے پاک کرنے کے لیے جس پانی سے غسل دیا جاتا وہ تمام کا تمام تیرا لعاب دھن ہوتا اور میری لاش کی حفاظت کے لیے خوشبودار مسالا لگایا جاتا وہ تیرا خون اور تیری نرم ہڈیاں ہوتیں۔ کاش! ام الفضل کسی صورت سے بھی میری رفیقہ بن جائے، یہاں یا وہاں، جنت میں یا جہنم میں۔

ثریا یمن میں تھی تو اس کو یہ اشعار لکھ کر بھیجے:۔

كتبت اليك من بلدي ‏ ‏ كتاب موله كمد
كئيب واكف العينين ‏ ‏ بالحسرات منفرد
يؤرقه لهيب الشوق ‏ ‏ بين السحر والكبد
فيمسك قلبه بيد ‏ ‏ ويمسح عينه بيد

میں نے اپنے شہر سے تم کو خط لکھا، جیسے محبت میں دیوانہ ہو جانے والا دلگیر شخص لکھتا ہے، جو غمگین ہے اور اس کی آنکھوں سے غم کے باعث اشک جاری ہیں۔ وہ تنہا ہے جسے پھیپھڑے اور جگر کے درمیان (دل میں) بھڑکنے والی آتش شوق بے خواب رکھتی ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے تو دل کو تھامے ہوتے ہے، اور دوسرے ہاتھ سے آنکھ کے آنسو پونچھتا جا رہا ہے۔

۲۔ اخطل (متوفی ۹۵ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات: ابو مالک غیاث بن غوث تغلبی اپنی قوم بنو تغلب میں بمقام "جزیرہ" اپنے قبیلہ کے اکثر افراد کی طرح عیسائی مذہب پر پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں اس کے سر پر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا تھا، لہذا اپنی سوتیلی ماں کے زیر تربیت رہا، جس نے اس کی اچھی تربیت نہ کی، اور وہ بڑا ہو کر منہ پھٹ، زبان دراز، بدنیت، اور شرابی بن گیا۔ اس کی شاعری کی ابتدا بچپن ہی میں ہو گئی تھی، چنانچہ اس نے قبیلہ تغلب کے شاعر کعب بن جعیل سے ہجویہ شاعری میں مقابلہ کیا، اور اسے گمنام کر دیا، جس کے باعث اس کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا۔ اور جب یزید بن معاویہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں انصار کی ہجو کہنے کے لیے کعب بن جعیل کو بلایا۔ اس لیے کہ عبدالرحمٰن بن حسان نے اپنی شاعری میں اس کی بہن کا پیچھا لے لیا تھا، تو کعب انصار کے انتقام سے ڈر گیا، اور اس نے یزید کو اخطل کا نام بتا دیا[1] اور کہا کہ وہ انصار کو خوب آڑے ہاتھوں لے گا، چنانچہ یہی سلسلہ اس کی بلند اقبالی و شہرت کا ذریعہ بن گیا۔ وہ یزید سے مل گیا اور انصار کی ہجو کی، جس پر انصار بگڑ گئے، اور معاویہ کے پاس فریاد لے گئے۔ معاویہ رضؓ نے اس جھگڑے کا ثالث انصار ہی کو بنا دیا۔ انہوں نے اس کی زبان کاٹ دینے کا مطالبہ کیا، لیکن یزید نے بیچ میں پڑ کر انصار کو منا لیا اور انہوں نے اسے معاف کر دیا۔ خلفاء بنو امیہ نے اس کے اس احسان کو نہ بھلایا، وہ ہمیشہ اس کو پیش پیش رکھتے اور اس کی عزت افزائی

---

[1] دیکھئے پچھلے صفحات میں عنوان "عراقی شاعری کی خصوصیات" اور عنوان "ہجو نگاری کا اسلوب"۔

کرتے تھے، بالخصوص عبد الملک بن مروان، کہ اس نے اخطل سے قبائل قیس اور ان کے شاعروں کا جواب دینے میں، جو عبد الملک کے دشمن اور آل زبیر کے حامی تھے، مدد حاصل کی تھی۔ اس نے اخطل کے دربار میں داخلہ پر بھی کوئی پابندی نہ رکھی تھی۔ اس سے بڑی مہربانی سے پیش آتا اور اسے اپنی بخششوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ اسے "شاعر خلیفہ" کا لقب دے دیا تھا۔ عبد الملک سے اس کی بے تکلفی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنی ریشمی عبا پہنے، گلے میں طلائی صلیب ڈالے، ڈاڑھی سے شراب ٹپکاتے ہوئے بلا اجازت اس کے دربار میں داخل ہو جاتا تھا۔

جریر و فرزدق کی باہمی ہجو میں اس کے حصہ لینے کا سبب یہ ہوا کہ جب اس سے دریافت کیا کہ ان دونوں میں سے کونسا بڑا شاعر ہے تو اس نے کنایۃً موخر الذکر افضل بتایا۔ جب جریر کو اس کے اس فیصلہ کی اطلاع ہوئی تو وہ غصہ ہوا، اور اخطل کی ہجو میں کچھ اشعار کہے جن میں سے ایک شعر یہ ہے:

يا ذا الغباوة ان بشرا قد قضى   ألا تجوز حكومة النشوان

اے ناسمجھ! بشر کا فتوی ہے کہ شرابی کا فیصلہ جائز نہیں ہے۔

سن رسیدگی اور طبیعت کی پژمردگی کے باعث اخطل نے اس کا جواب کچھ ڈھیلا سا دیا، جس کا جریر نے اپنے بیٹے سے یوں کہتے ہوئے اعتراف کیا ہے "جب میری اس سے مٹھ بھیڑ ہوتی تو اس کے منہ میں ایک کچلی تھی اگر دو کچلیاں ہوتیں تو وہ مجھے کھا جاتا"۔ اس کے بعد اخطل بنو امیہ کی نظر میں عزت و احترام سے دیکھا جاتا رہا حتی کہ عمر بن عبد العزیز نے اسے دیس باہر کر دیا۔ پھر اس نے اپنی بقیہ عمر کبھی دمشق اور کبھی اپنے وطن جزیرہ میں رہ کر گذار دی۔ خلافت ولید کے ابتدائی زمانہ ۹۵ھ میں وہ ستر برس کی عمر پاکر اس جہان سے رخصت ہو گیا۔

اس کی شاعری:- اخطل اپنے زمانہ کے تین اول درجہ کے کامیاب، بلند پایہ شاعروں میں سے ایک ہے، جن کا دوسرا جریر اور تیسرا فرزدق ہے۔ اس بات پر تو سب لوگ متفق ہیں کہ یہ تینوں اپنے زمانہ کے بہترین اور ناموز ترین شاعر ہیں۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ کوئی امتیازی صفت اور ایک مخصوص فضیلت رکھتا ہے۔

اخطل عمدہ مدح کرنے، شراب کا وصف بیان کرنے، ہجو میں کم فحش آمیزی کرنے، اور اپنے طویل قصائد میں بے ضرورت الفاظ کی بھرتی اور دیگر خامیوں کے نہ ہوتے، نیز اپنی طبیعت میں غور و فکر اور چھان بین کا مادہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے۔ بسا اوقات وہ اپنے بعض مدحیہ قصائد ایک سال تک روک رکھتا تھا، اور نوے (۹۰) شعروں کے قصیدہ میں سے کاٹ چھانٹ کے بعد صرف تہائی حصہ باقی رکھنے پر اکتفا کرتا تھا۔ اس کی شوخ و رندانہ طبیعت نے اسے کوئی مرثیہ نہ کہنے دیا۔ اور اگر یزید بن معاویہ کے مرثیہ میں کہے ہوئے چار شعر نہ ہوتے تو اس کا کوئی شعر مرثیہ کے سلسلہ میں بیان نہیں کیا جاتا۔ یہ بھی اس لیے کہ یزید ہی اس کی ناموری و آسودگی کا اصلی سبب تھا۔ اخطل بڑا خود ستا تھا، سوائے اعشی کے کسی کو اپنے سے بلند و برتر نہ سمجھتا تھا اور اسی لیے اس کے اسلوب کی پیروی کرتا تھا۔

اس کی شاعری کا نمونہ:- عبدالملک بن مروان کی مدح میں کہتا ہے:-

نفسی فداء أمیر المومنین اذا
ابدی النواجذ یوماً عارم ذکر
الخائض الغمرة المیمون طائرہ
خلیفة الله یستسقی به المطر
فی نبعة من قریش یعصمون بها
ما ان یوازی بأعلیٰ نبتها الشجر
حُشُدٌ علی الحق عیافوا الخنا اُنُفٌ
اذا ألمّت بهم مکروهة صبروا

میں قربان جاؤں امیرالمومنین پر جو اس وقت جنگ میں کود پڑتے ہیں جب کہ شدت جنگ کے باعث بڑا تند خو بہادر بھی مقابلہ کی سختی کی وجہ سے اپنی باچھیں کھول دیتا ہے، وہ بڑے مبارک اور بڑے بختاور ہیں، خلیفۃ اللہ ہیں جنہیں ساتھ لے کر لوگ بارش کی دعا مانگتے ہیں۔ خاندان قریش سے ہیں جس کی لوگ پناہ لیتے ہیں اور جس سے بڑھ کر کوئی معزز و عالی خاندان نہیں ہے۔ یہ لوگ حق کا ساتھ دیتے ہیں، تہذیب سے گری ہوئی باتوں کو ناپسند کرتے ہیں، نہایت درجہ خوددار و غیور ہیں، جب ان پر کوئی آفت آتی ہے تو صبر و ضبط سے کام لیتے ہیں۔

لا یستقل ذوو الاضغان حربهم ولا یُبیّن فی عیدانهم خَوَر
شُمس العداوۃ حتی یستقادلهم و اوسع الناس احلاما اذا قدروا
هم الذین یبارون الریاح اذا قل الطعام علی العافین او قتروا
بنی امیة نعماکم مجللة تمّت فلا منّة فیها ولا کدر

دشمن ان سے لڑنے کو کھیل نہیں سمجھتے اور ان کی قوتوں میں کسی قسم کی کمزوری نہیں پائی جاتی، جب تک ان کا انتقام نہ لے لیا جائے یہ لوگ بڑے کینہ ور اور جنگجو ہیں اور جب یہ قابو پا لیتے ہیں تو نہایت فراخ دلی اور بردباری سے کام لیتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو قحط سالی میں سرد ہواؤں کا مقابلہ کرتے ہیں جبکہ مانگنے والوں کو کھانا کم ملتا ہے اور وہ تنگ حال ہو جاتے ہیں۔ بنو امیہ! تمہارے احسانات عام اور بھرپور ہیں، نہ ان کو جتایا جاتا ہے نہ ان میں کسی قسم کا تکدر ہوتا ہے۔

انصار کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے:-

واذا نسبت ابن الفریعة خلته کالجحش بین حمارۃ و حمار
لعن الاله من الیهود عصابة بالجزع بین صلیصل و صرار
قوم اذا هدر العصیر رأیتهم حمراً عیونهم من المسطار

خذوا المكارم لستم من أهلها ... وخذوا مساحيكم بني النجار
ذهبت قريش بالمفاخر كلّها ... واللؤم تحت عمائم الانصار

ابن قریعہ کا نسب بیان کرتے وقت تم اس کو ایسا ہی پاؤ گے جیسے گدھے کا بچہ گدھی اور گدھے کے درمیان، خدا کی لعنت ہر یہود کی اس جماعت پر جو صلیصل و صرار کے درمیانی علاقہ میں رہتی ہے، یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب شراب جوش مارے تو تم ان کی آنکھیں تیز نشہ آور شراب پینے کی وجہ سے سرخ دیکھو گے۔ اے بنو نجار! اپنے پھاؤڑے اٹھاؤ اور عزت و شرافت کے بلند کارناموں کو چھوڑ دو کہ تم ان کے قابل ہی نہیں، تمام قابل فخر کام قریش کے حصہ میں آ گئے، اور ذلت و ندامت انصار کے پلہ پڑ گئی۔

دیگر:-

والناس همهم الحياة ولا أرى ... طول الحياة يزيد غير خبال
واذا افتقرت الى الذخائر لم تجد ... ذخرا يكون كصالح الاعمال

لوگوں کی تمام جد و جہد کا ماحصل یہ ہے کہ انہیں زندگی مل جائے، حالانکہ میری نظر میں لمبی عمر بجز نقصان و تباہی میں اضافہ کے اور کچھ نہیں۔ اور جب تمہیں ذخیروں کی ضرورت ہو گی تو نیک اعمال سے زیادہ قابل قدر کوئی ذخیرہ نہ پاؤ گے۔

۳ - فرزدق[1] (متوفی ۱۱۰ھ)

پیدائش اور حالات زندگی:- ابو فراس ہمام بن غالب تمیمی بصرہ میں پیدا ہوا اور وہیں ابتدائی زندگی گذاری۔ وہ آغوش ادب میں پلا، فصیح ماحول میں جوان ہوا، اس کا باپ اسے اشعار پڑھانے اور شاعری سکھانے لگا حتی کہ اس کی طبیعت شعر و شاعری کے لیے موزوں، اور زبان رواں ہو گئی۔ جنگ جمل کے بعد ایک دن اس کا باپ اسے نوعمری میں، عمدہ شاعری کرنے پر اظہار فخر کے لیے حضرت علی رضؓ کی خدمت میں لے گیا۔ حضرت علی رضؓ نے اس کے باپ سے کہا "اسے قرآن پڑھاؤ کہ وہ اس کے لیے بہتر ہے۔" یہ بات فرزدق کے ذہن میں بڑھاپے تک جمی رہی، اور اس نے حفظ قرآن کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اپنے پیروں میں بیڑی پہن لی، اور قسم کھالی کہ قرآن حفظ کرنے سے پہلے اسے نہ کھولے گا، اور واقعی اس نے اپنی قسم سچی کر دکھائی۔ بعد ازاں وہ کوفہ و بصرہ کے والیوں سے جا ملا، کبھی ان کی مدح کرتا کبھی ہجو، اور وہ بھی اسے کبھی اپنا مقرب بنا لیتے اور کبھی راندہ درگاہ۔ شام میں خلفاء بنی امیہ کی مدح کی، بالخصوص عبدالملک کی اور انہوں نے اسے انعام و اکرام دیے، لیکن آل علی کی حمایت و طرفداری کی وجہ سے وہ ان میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

---

[1] مزید معلومات کے لیے پچھلے صفحات میں عنوانات "عراقی شاعری کی خصوصیات" اور "ہجو نگاری کا اسلوب" ملاحظہ کیجیے۔

فرزدق جریر کا ہمعصر تھا، ان دونوں میں مقابلے، باہمی حسد کشمکش اور معاصرانہ چشمک کا سلسلہ جاری تھا، ابھی جریر میں اور ایک دوسرے بعیث نامی شاعر میں باہمی ہجو کا مقابلہ پورے زوروں پر بھی نہ ہونے پایا تھا کہ فرزدق بعیث کی صف میں مل کر اس کی مدد کرنے لگا۔ اس پر جریر برہم ہو گیا، اور اس نے فرزدق کی ہجو کہہ ڈالی۔ فرزدق نے بھی اُس کا جواب دیا، اور پھر ان کی اس باہمی ہجو کا سلسلہ دس سال تک جاری رہا، جس نے ان کے ذہنوں کو کھول دیا، ان کی زبانوں کو تیز کر دیا، ان کی برجستہ گوئی، مناظرہ اور صحت نظر کی قوت کو بڑھا دیا۔ ان دونوں شاعروں کے معاملہ میں عوام دو حصوں میں بٹ گئے تھے، ہر جماعت ان دونوں سے ایک شاعر کی حمایت کرتی تھی۔ حامیان فرزدق میں سے ایک شخص نے تو چار ہزار درہم اور ایک گھوڑا اس شخص کے لیے انعام مقرر کر دیا تھا جو اس کے شاعر کو جریر پر فضیلت و ترجیح دے۔ فرزدق بدکار، فحش کلام، عریاں ہجو گو، دینداری میں کمزور اور پاکباز عورتوں پر تہمت لگانے والا تھا۔ وہ اپنی خاندانی شرافت اور موروثی عزت کے شاندار محل میں پناہ لیتا تھا، اپنے تمام رذائل و فضائل سے کام لے کر اس نے جریر کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا لیکن پھر بھی نہ تو وہ اسے شکست دے سکا نہ ناکام بنا سکا۔

اولاد علی رض کی مدافعت و حمایت میں اس کے کچھ قابل تعریف کارنامے ہیں جن سے اس کے اخلاص اور صداقت و جرأت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً حج میں ہشام بن عبدالملک سے اس کی ملاقات کا واقعہ، جبکہ انہوں نے علی بن حسین کو لوگوں میں مقبول و باعزت دیکھ کر حقارت آمیز تجاہل سے کام لیتے ہوئے کہا "وہ کون ہے؟" تو فرزدق کو ان کا یہ سوال بہت برا لگا اور اس نے ان کے جواب میں ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:-

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته والبیت یعرفه والحلّ والحرم

یہ وہ شخص ہیں کہ سرزمین بطحا ان کے پیروں کی چاپ پہچانتی ہے اور خانہ کعبہ، حرم اور غیر حرم سب ہی مقامات ان کو جانتے ہیں۔

تو ہشام نے اس کو قید کر دیا، پھر جب اس نے ان کو ہجو کہہ دی تو ہشام نے اسے چھوڑ دیا، فرزدق نے ۱۱۰ھ میں تقریباً سو برس کی عمر پا کر بصرہ میں وفات پائی۔

اس کی شاعری:- فرزدق کو اپنی اصل پر بڑا فخر، اور اپنے خاندان پر بڑا ناز تھا۔ اسے اپنے آباء و اجداد کے بلند کارنامے سنانے کا بڑا شوق تھا، حتیٰ کہ وہ خلفاء کے سامنے بھی ان کو بیان کرنے سے باز نہ رہتا، یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں فخریہ عنصر غالب ہے۔ اور فخریہ کلام پُرشوکت الفاظ، شاندار اسالیب، غریب کلمات، نیز عربوں کے مشہور واقعات وانساب کا ذکر اور خانہ بدوشوں کے طرز ادا کی پیروی چاہتا ہے، یہی عناصر ہیں جن کی وجہ سے فرزدق کی شاعری کو راویوں نے پسند کیا، اور نحویوں نے اسے ترجیح دی، اور کہا "اگر فرزدق کی شاعری نہ ہوتی تو عربی زبان کا تہائی حصہ تلف ہو جاتا"۔ اس کے باوجود فرزدق کو خود اپنی شاعری کی درشتی سے دکھ ہوتا

تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اسے تو جریر کی رقت و نزاکت مل جائے کیونکہ وہ فحش کار ہے اور جریر کو اس کی درشتی و صلابت مل جائے، کیونکہ وہ پاکباز ہے۔ اس کی یہ آرزو اخطل کے اس فیصلہ کی تائید کرتی ہے جو اس نے ان دونوں کے بارے میں یہ کہہ کر کیا تھا "فرزدق چٹان میں سے شعر نزاشتا ہے اور جریر دریا سے چلو بھر کر نکالتا ہے"۔

علاوہ ازیں فرزدق ہجو گوئی میں بڑا سخت، وصف کرنے میں جدت طراز، مدح میں درمیانہ اور مرثیہ گوئی میں اچھا نہیں ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ فخر میں وہ کہتا ہے:۔

اذا اغبرّ آفاق السماء وكشفت ... بيوتا وراء الحي نكباء حرجف

وأصبح مبيضّ الصقيع كأنه ... على سروات النيب قطن مندّف

ترى جارنا فينا يخير وان جنى ... فلا هو مما ينطف الجار ينطف

(قحط سالی میں) جب آسمان کے کنارے گرد آلود ہو جائیں، قحط کے زمانہ کی تند و تیز آندھیاں اور ٹھنڈی ہوائیں قبیلوں کے خیموں کی چھتیں اڑا دیں، سفید پالا اونٹوں کی پیٹھوں پر دھنکی ہوئی روئی کی طرح معلوم ہونے لگے، تو تم ہمارے ہمسایوں کو خواہ وہ جرم بھی کریں، خوش حال ہی پاؤ گے، اور ان پر کوئی تہمت نہیں لگائی جائے گی جیسی عموماً پڑوسیوں پر لگائی جاتی ہے۔

وكنا اذا نامت كليب عن القرى ... الى الضيف نمشي بالعبيط ونلحف

لنا العزّة القعساء والعدد الذي ... عليه اذا عدّ الحصى يتخلّف

ترى الناس ان سرنا يسيرون خلفنا ... وان نحن أومأنا على الناس وقفوا

وانك ان تسعى لتدرك شأونا ... لانت المعنّى يا جرير المكلّف

جب خاندان کلیب مہمانوں کی میزبانی کرنے سے پہلوتہی کرتا ہے تو ہم تنومند جانور ذبح کر کے مہمانوں کے سامنے رکھتے ہیں اور باصرار ان کو مہمان بناتے ہیں۔ قابل فخر عزت و سروری ہمارے لیے ہے، اور ہماری تعداد اس قدر کثیر ہے کہ اگر ان کو کنکریوں پر شمار کیا جائے تو وہ بھی کم پڑ جائیں گی، جب ہم چلتے ہیں تو تم لوگوں کو ہمارے پیچھے چلتے ہوئے دیکھو گے اور اگر ہم ان کو اشارہ کر دیں تو وہ رک جائیں گے۔ اور اگر تو ہمارے عالی مرتبہ اور بلند مقصد کے حصول کی کوشش کرے گا تو اے جریر! تو بڑی پریشانیوں اور مصیبتوں میں اپنے آپ کو ڈال دے گا۔

دیگر فخریہ اشعار:۔

ومستنبح طاوي المصير كأنما
يساوره من شدة الجوع أولق

دعوت بحمراء الفروع كانما
ذری رایة فی جانب الجوّ تخفق
وانی سفیه النار للمبتغی القری
وانی حلیم الکلب للضیف یطرق
اذا متّ فابکینی بما انا اهله
لکلّ جمیل قلت فیّ یصدّق
وکم قائل مات الفرزدق والندی
وقائلة مات الندی والفرزدق

اور وہ امداد چاہنے والا جس کی آنتیں لپٹ گئی تھیں اور جو بھوک کی شدت سے باؤلا ہو گیا تھا، میں نے اس کو ایسی آگ جلاکر بلایا جس کے شعلے سرخ تھے گویا وہ فضا میں لہراتے ہوئے جھنڈیوں کے بالائی کنارے ہیں۔ جو یائے میزبانی کے لیے میری آگ بڑی تند و تیز ہے اور رات میں آنے والے مہمانوں کے لیے میرا کتا بڑا بردبار ہے۔ جب میں مرجاؤں تو میری شایان شان باتیں یاد کرکے مجھ پر رونا اور ہر عمدہ بات جو تو میرے لیے کہے گی لوگ اس کی تصدیق کریں گے۔ اس وقت بہت سے مرد اس طرح کہیں گے "فرزدق اور سخاوت مرگئے" اور بہت سی عورتیں کہیں گی "سخاوت اور فرزدق" مرگئے (گویا سخاوت و فرزدق لازم و ملزوم ہیں)

علی بن حسین کی مدح میں کہے ہوئے اشعار:۔

ھذا الذی تعرف البطحاء وطأته
والبیت یعرفه والحل والحرم
ھذا ابن خیر عباد الله کلهم
ھذا التقیّ النقیّ الطاھر العلم
ولیس قولك من ھذا بضائره
العرب یعرف من انکرت والعجم
اذا رأته قریش قال قائلها
الی مکارم ھذا ینتهی الکرم

یہ وہ شخص ہیں کہ سرزمین بطحاء ان کے پیروں کی چاپ پہچانتی ہے اور خانہ کعبہ، سرزمین حرم اور غیرِ حرم سب مقامات ان کو جانتے ہیں۔ یہ خدا کے تمام بندوں میں سب سے بہتر بندہ کے فرزند ہیں۔ یہ بڑے خداترس، صاف دل، پاکباز اور بلند مرتبہ شخص ہیں۔ تمہارا "یہ کون ہے" کا سوال ان کی قدر و منزلت کم نہیں کرسکتا۔ جسے تم نہ پہچان سکے تمام عرب و عجم اسے جانتے ہیں۔ قریشی لوگ انہیں دیکھ کر کہتے ہیں کہ تمام کرم و شرف ان کے بلند اخلاق پر پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔

يُغضِي حياءً و يُغضَى من مهابته
فلا يكلّم الّا حين يبتسم
يكاد يمسكه عرفان راحته
ركن الحطيم اذا ما جاء يستلم
ينشق نور الهدای عن نور غرّته
كالشمس ينجاب عن اشراقها القتم
من معشر حُبُّهم دين و بغضهم
كفر و قربهم منجی و معتصم

ان کی آنکھیں حیاء کے سبب سے نیچی رہتی ہیں۔ لیکن لوگوں کی آنکھیں ان کے سامنے رعب و جلال کی وجہ سے نیچی رہتی ہیں۔ اور ان سے صرف اسی وقت گفتگو کی جاتی ہے جب یہ مسکرا رہے ہوں۔ رکن حطیم بھی ان کی ہتھیلی کو پہچاننے کی وجہ سے جب یہ اسے بوسہ دیتے ہیں تو ان کو پکڑ لینا چاہتا ہے۔ ان کے چہرے سے نور ہدایت ضوفشاں ہے جس طرح سورج کے نکلنے سے تاریکی چھٹ جاتی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی محبت دین میں شامل ہے۔ اور جن سے بغض و عداوت کفر ہے۔ اور جن کا قرب پناہ و حفاظت گاہ ہے۔

اس کے مقبول عام اشعار:-

فیا عجبا حتی کلیب تسبّنی ۔ کأن أباها نهشل و مجاشع!

واہ! کس قدر تعجب خیز امر ہے کہ خاندان کلیب کے افراد بھی اٹھ اٹھ کر اب مجھے گالیاں دینے لگے، جیسے کہ نہشل اور مجاشع انہی کے باپ دادا تھے!۔

وكنا اذا الجبار صعّر خدّه ۔ ضربناه حتی تستقيم الأخادع

جب کوئی زبردست سردار غرور سے اپنا رخسار پھلاتا ہے تو ہم اسے اتنا مارتے ہیں کہ اس کی گردن کے پٹھے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی تمام اکڑ نکل جاتی ہے۔

ترجّی ربیع أن یجیئ صغارها ۔ بخیر و قد أعیا ربیعاً کبارها

ربیع (قبیلہ) اپنے چھوٹوں کی بسلامت واپسی کی امید لگائے بیٹھا ہے حالانکہ ان کے بڑوں کی سلامتی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

قوارص تاتینی و تحتقرونها ۔ و قد يملأ القطر الاناء فيُفعِم

طنز اور دکھ بھری باتیں مجھے پہنچ رہی ہیں اور تم ان کو بے وقعت سمجھ رہے ہو حالانکہ بوند ٹپکنے سے برتن پانی سے بھر کر چھلکنے لگتا ہے۔

أحلامنا تزن الجبال رزانة ۔ و تخالنا جنًّا اذا ما نجهل

ہماری عقلیں پہاڑوں کے برابر وزنی ہیں۔ اور جب ہم شرارت پر اتر آئیں تو تم ہمیں دیو اور جن

خیال کروگے۔

تری کلّ مظلوم الینا نرادہ　　　دیھرب منا جھدہ کلّ ظالم

تم دیکھو گے کہ ہر مظلوم بھاگ کر ہمارے پاس پناہ گزین ہوتا ہے اور ہر ظالم اپنی امکانی کوشش سے ہم سے دور بھاگتا ہے۔

۴- جریر[1] (متوفی ۱۱۰ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:- ابو حزرہ جریر بن عطیہ بن خطفی تمیمی یمامہ میں ستوانسا پیدا پیدا ہوا۔ دیہات میں پل کر بڑھا۔ اس لیے جوان ہوتے پر اس کی زبان فصیح، ضمیر صحیح اور طبیعت شعر و شاعری کے سانچہ میں ڈھل گئی تھی اور جب اس نے اپنے اندر شعر گوئی کی قوت اور اپنی شاعری کو لوگوں میں پیش کرنے کی جرأت پائی تو اہل جود و سخا سے مدد مانگنے کے لیے فرزدق کے وطن بصرہ جا پہنچا، بڑے بڑے لوگوں کی مدح و ستائش کرتا اور اس ذریعہ سے اپنے بال بچوں کی روزی حاصل کرتا، وہاں اس نے شاعری کی برکتوں سے فرزدق کی جو قدر و منزلت اور خوشحالی دیکھی اس نے اسے حیرت میں ڈال دیا اور گو وہ بھی اسی کی طرح تمیمی تھا، تاہم دل ہی دل میں اس سے حسد کرنے لگا اور یہ چاہنے لگا کہ وہ بھی خوشحالی و مالداری میں فرزدق کے برابر ہو جائے۔ اسی منافست و مزاحمت کے باعث ان میں باہمی ہجو گوئی کے اسباب پیدا ہو گئے اور جریر نے اپنے حریف کو قریب سے نشانہ بنا کر مارنا چاہا، لہٰذا بادیہ کی اقامت چھوڑ کر اس نے بصرہ میں سکونت اختیار کر لی، اور مربد[2] پر چھا گیا۔ وہ حجاج کے پاس پہنچا جہاں اس کی خوب عزت ہوئی۔ وہ قصائد جو اس نے حجاج کی مدح میں کہے بہت مشہور ہو گئے، حتیٰ کہ عبد الملک کو اس کی اطلاع پہنچی اور انہوں نے جریر کا حجاج کے پاس رہنا نامناسب سمجھا۔ حجاج خلیفہ کی نظر پہچان گیا اور شاعر کو اپنے بیٹے محمد کے ہمراہ دمشق روانہ کر دیا، وہاں پہنچ کر جب جریر نے عبد الملک کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی تو خلیفہ نے اجازت نہ دی اور سخت عتاب و برہمی کے لہجہ میں کہا "بس تم حجاج کے لیے ہو!" اس کے بعد وہ خلیفہ تک رسائی کے ذرائع پیدا کرنے میں لگا رہا اور لوگوں سے اپنے لیے سفارشیں کراتا رہا حتیٰ کہ اپنا اسے

---

[1] مزید معلومات کے لیے پچھلے صفحات میں "عراقی شاعری کی خصوصیات" اور "ہجو نگاری کا اسلوب" ملاحظہ کیجئے۔

[2] مربد بصرہ کی ایک منڈی تھی جو "اونٹوں کے بازار" کے نام سے بھی مشہور تھی بعد میں وہاں آبادی ہو گئی۔ بنو امیہ کے زمانے میں وہاں مشاعروں اور تقریروں کے لیے جلسے منعقد ہونے لگے۔ مباحثے اور باہمی فخر کے حلقے قائم ہو گئے۔ ادبی اور علمی مذاکرے ہونے لگے۔ شعراء، عمائدین شہر، راویان شعر متفرق طبقوں کے لوگ ہر روز وہاں منافرت و مناظرہ و محاکمہ اور شاعروں کے درمیان لڑائی کی آگ بھڑکانے کے لیے جاتے، باکمال شعراء کے لیے وہاں مخصوص حلقے تھے جن میں سے زیادہ مشہور فرزدق اور راعی کے حلقے ہیں۔

وہ قصیدہ عبدالملک کو سنانے کا موقع مل گیا جس کا مطلع ہے:-

أتصحو أم فؤادك غير صاح   عشية هم صحبك بالرواح؟

اس شام جس میں تیرے ساتھیوں نے کوچ کا تہیہ کر لیا ہے تو ہوش میں آئے گا یا تیرا دل مست وبے ہوش ہی رہے گا؟

جب وہ اپنے اس شعر پر پہنچا:-

ألستم خير من ركب المطايا   وأندى العالمين بطون راح؟

کیا آپ تمام سواروں میں سب سے بہتر اور تمام جہانوں میں سب سے زیادہ سخی ہاتھوں والے نہیں ہیں؟

تو عبدالملک مسکرائے اور کہا ہم ایسے ہی ہیں اور ایسے ہی رہیں گے۔" پھر اسے سو اونٹنیاں اور آٹھ چرواہے انعام میں دیے، اس قصیدہ کو سنانے اور اخطل کے مرجانے کی وجہ سے جریر تمام خلفاء کی نظریں بالعموم اور عمر بن عبدالعزیز کی نظریں بالخصوص تمام شعراء سے زیادہ وقیع و معزز ہو گیا تھا۔ لیکن اس اعزاز نے اس کے مخالفوں کے دلوں میں حسد و غیرت کی آگ بھڑکا دی۔ اور اور انہوں نے اس کے خلاف ہجویہ لڑائی کے حملے شروع کر دیے۔ جیسے سیاسی حالات، فرزدق کی اشتعال انگیزی، جریر کی کج خلقی۔ اور عوام میں مناظرہ بازی کے شوق نے خوب ہوا دی۔

ان ہمعصر شاعروں میں سے اسی (۸۰) شعراء جریر کے مقابلہ میں آئے، جن سے سوائے فرزدق واخطل کے وہ سب پر غالب آگیا اور یہ دونوں جم کر اس سے بازی لے جانے میں مقابلہ کرتے رہے۔ اور یہ باہمی ہجو، برابر کی طاقت سے ان میں جاری رہی حتیٰ کہ اخطل مرگیا۔ اور اس کے بعد جریر یکسوئی سے

جریر ان سب پر اپنی زبان کی قوت سے غالب آیا تھا۔ وہ نہ تو عالی نسب تھا کہ فخریں اپنے نسب سے مدد لیتا، نہ طاقتور برادری والا کہ لوگ اس سے مرعوب ہوتے۔ اور یہی اس کے تفوق کا راز اور اس کی برتری کا سبب ہے "الاغانی" کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے جریر سے پوچھا "سب سے بڑا شاعر کون ہے؟" تو اس نے کہا "اٹھو! اور میرے ساتھ چلو تاکہ میں تمہیں بتاؤں کہ وہ کون ہے۔" پھر اس کو ساتھ لے کر اپنے باپ عطیہ کے گھر پر گیا۔ جو ایک بکری کو باندھ کر اس کے تھن سے دودھ پی رہا تھا، دروازہ پر پہنچ کر جریر نے آواز دی "ابا جان باہر آئیے" فوراً ہی ایک بدشکل، خستہ حال بڑے میاں باہر آئے، ان کی داڑھی سے بکری کا دودھ ٹپک رہا تھا۔ جریر نے اس شخص سے دریافت کیا "کیا آپ انہیں پہچانتے ہیں؟" اس نے کہا "نہیں" جریر نے کہا "یہ میرے والد ہیں جو بکری کے تھن سے منہ لگا کر اس لیے دودھ پی رہے تھے کہ دوہنے کی آواز سن کر کوئی ان سے دودھ مانگنے نہ آجائے، اور سب سے بڑا شاعر وہ ہے جو ایسے باپ کے ہوتے ہوئے بھی فخر و مباہات میں اسی شاعروں کو زیر کر دے! اس باپ کو لے کر ان سے مقابلہ کرے اور ان سب کو مغلوب کر دے"

فرزدق کو جواب دینے کے لیے خالی ہو گیا۔ پھر ان دونوں کے درمیان ان مشہور نقائض[۱] کا سلسلہ چلتا رہا جسے عوام میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور جس نے شعراء کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ پھر کسی خیال سے فرزدق نے اس سلسلہ کو ختم کر دیا اور تادم مرگ عبادت میں مشغول رہا۔ اس کے کچھ ماہ بعد جریر نے بھی ملک عدم کی راہ لی اور ۱۱۰ھ میں یمامہ میں دفن ہوا۔

اس کی شاعری:۔ جریر میں نہ تو اخطل کی سی خباثت وے پرستی تھی نہ فرزدق کی سی درشتی و بدکاری۔ وہ پاکیزگی طبع، نزاکت احساس، عفت، صحیح دینداری، اور خوش خلقی کی صفات سے مزین تھا، جس کا اثر اس کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ حسن اسلوب، شیرینی غزل، تلخی ہجو، خوبی مرثیہ اور شاعری کے جملہ اصناف کو بحسن و کمال ادا کرنے میں وہ ممتاز ہو گیا، اور یہی وجہ ہے کہ وہ افق شاعری پر سب سے زیادہ درخشندہ اور شاعریت میں سب سے زیادہ کامل تھا اور اسی سبب سے اس کے ماننے والوں کی جماعت اخطل و فرزدق کی جماعت سے بڑی تھی۔ اس لیے کہ اول الذکر صرف مدح، ہجو اور خمریات میں عمدہ شاعری کرتا ہے اور دوسرا فخریہ شاعری کے علاوہ کسی موضوع میں کمال پر نہ پہنچ سکا۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ فرزدق کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

لقد ولدت ام الفرزدق مُقْرِفا
نجاءت بوزّاز قصير القوادم
يوصّل حبليه اذا جنّ ليله
ليرقى الى جاراته بالسلالم
تدليت تزنى من ثمانين قامة
و قصّرت عن باع العلى والمكارم
هو الرجس يا اهل المدينة فاحذروا
مداخل رجس بالخبيثات عالم
لقد كان اخراج الفرزدق عنكم
طهوراً لما بين المصلّى وواقم

فرزدق کی ماں نے بدنسل بچہ جنا ہے، وہ گناہوں سے دبا ہوا کوتاہ ہاتھ پیروں والا ایک بچہ لائی جو رات کے تاریک ہونے پر اپنی دونوں رسیوں کو ملاتا ہے تاکہ سیڑھیوں کے ذریعہ اپنی پڑوسنوں

---

[۱] ان جوابی قصائد کا نام نقائض اس لیے پڑا کہ جب ایک شاعر کوئی قصیدہ کہتا تو دوسرا اس کی تردید کرتا اور اس جواب میں وہ پہلے شاعر کے قصیدہ کے وزن و قافیہ کی پابندی بھی ملحوظ رکھتا تھا۔

کے پاس پڑھ کر پہنچ جائے، (اے فرزدق!) تو اسی (۸۰) قد کی بلندی پر زناکاری کے لیے لٹک کر چلا گیا اور بلندی و شرافت کے کاموں میں ایک ہاتھ کی بلندی بھی تجھ سے طے نہ ہوسکی۔ اے مدینہ والو! یہی پلید و بد معاش ہے، اس سے ہوشیار رہو، یہ پلیدی میں گھس جانے والا اور بدکاریوں کا ماہر ہے۔ تمہارا فرزدق کو اپنے پاس نکال دینا مصلّی (خانہ کعبہ) اور راقم (مدینہ) کے درمیانی علاقہ کو پاک کرنے کے مترادف ہوگا۔

ہجو میں اس کے عمدہ اشعار:-

تعالوا نحاکمکم و فی الحق مقنع
الی الغر من اھل البطاح الاکارم
فان قریش الحق لم تتبع الھوی
ولم یرھبوا فی اللہ لومۃ لائم
اذکرکم باللہ، من ینھل القنا
و یضرب کبشل الجحفل المتراکم؟
وکنتم لنا الاتباعَ فی کل موقف
و ریشُ الذّنابی تابع للقوادم
اذا عُدّت الایام اخزیت دارما
و تخزیک یا ابن القین ایام دارم
وما زادنی بعد المدی نَقصُّ مِرّۃ
و لا رقّ عظمی للضُّروس العواجم

آؤ! ہم تم اپنا جھگڑا فیصلے کے لیے بطحا کے معزز اور شریف باشندوں کے پاس لے جائیں، اور حق بات قابل قبول ہے، بلاشبہ (راستباز قبیلۂ قریش ہوا و ہوس کی پیروی نہیں کرتا اور خدا کی راہ میں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتا، میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں بتاؤ کون نیزوں کو خون پلاتا اور لشکر جرار کے جانباز افسر کو مار گراتا تھا؟ اور تم ہر موقع پر ہمارے پیچھے پیچھے رہنے والوں میں تھے، اور دم کے پر بازو کے پروں کے تابع ہی رہتے ہیں، جب نمایاں واقعات اور اہم کارناموں کا شمار ہوگا اس وقت تو دارم کو رسوا کرے گا، اور اے لوہار کے بیٹے (فرزدق)! تجھے دارم کے واقعات ذلیل و بے عزت کریں گے۔ درازی عمر نے میری طاقت میں کوئی خلل نہیں ڈالا نہ چابنے والی ڈاڑھوں کے لیے میری ہڈیاں نرم ہوئیں۔

عمر بن عبد العزیز کی مدح میں وہ کہتا ہے:-

انا لنرجو اذا ما الغیث اخلفنا — من الخلیفۃ ما نرجو من المطر
نال الخلافۃ اذ کانت لہ قدراً — کما اتی ربّہ موسی علی قدر

آ اذکر الجهد والبلوی التی نزلت ... ام تکتفی بالذی بلغت من خبری

جب بارش ہمارے ساتھ وفا نہیں کرتی تو ہم خلیفہ سے وہی امید کرتے ہیں جو ہمیں بارش سے امید ہوتی ہے، انہوں نے خلافت کو پالیا کیوں کہ وہ ان کے اندازکے مطابق تھی یا ان کی تقدیر میں تھی جس طرح حضرت موسیٰ ایک اندازکے مطابق اپنے رب کے پاس پہنچ گئے تھے، کیا میں ان مصیبتوں اور پریشانیوں کو بیان کروں جو مجھ پر پڑیں یا میرے وہ حالات کافی ہیں جو آپ کو پہنچے ہیں؟

مازلت بعدك فی دار تعرقنی	قد طال بعدك اصعادی ومنحدری
لاینفع الحاضر المجهود بادینا	ولا یجود لنا باد علی حضر
کم بالمواسم من شعثاء ارملة	ومن یتیم ضعیف الصوت والبصر
یدعوك دعوة ملهوف کان به	مساً من الجن اوزداءاً من البشر
ممن یعدك تکفی فقد والده	کالفرخ فی العش لم ینهض ولم یطر

آپ کے بعد میں ایسی جگہ رہا جس نے میرا گوشت نوچ ڈالا، اور آپ کے بعد میری زندگی کے اتار چڑھاؤ بہت زیادہ ہو گئے، تھکا ماندہ شہری ہمارے دیہاتی کو فائدہ نہیں پہنچاتا، اور بادیہ حضر کے کوئی دیہاتی ہمیں بخشش نہیں دیتا حج کے میلوں اور تہواروں میں بہت سے پراگندہ حال نادار لوگ اور بہت سے یتیم بچے جن کی آواز نہیں نکلتی اور جن کی نگاہیں کمزور ہیں، آپ کو اس غمزدہ کی طرح پکار رہے ہیں جیسے آسیب کا خلل ہو یا جو انسان کا ستایا ہوا ہو، یہ یتیم آپ کو اپنے باپ کی جگہ سمجھتے ہیں اور ان کی حالت پرندے کے ان بچوں کی سی ہے جو نہ اٹھتے ہوں نہ اڑتے ہوں۔

غزل میں اس کے بے نظیر اشعار:۔

ان العیون التی فی طرفها حور	قتلننا ثم لم یحیین قتلانا
یصرعن ذااللب حتی لاحراك به	وهن اضعف خلق الله انسانا

ان خوبصورت آنکھوں نے (جن کی سیاہی گہری سیاہ اور سفیدی خالص سفید ہے) نہایت بیدردی سے ہمیں مار ڈالا، اور پھر ہمارے مقتولین کو زندہ بھی نہ کیا، یہ اچھے بھلے خردمند کو اس طرح پچھاڑ دیتی ہیں کہ وہ بے حس و حرکت ہو جاتا ہے حالانکہ اللہ کے بنائے ہوئے انسانوں میں یہی سب سے کمزور و نازک صنف ہیں۔

فخریہ:۔

اذا غضبت علیك بنو تمیم ... حسبت الناس کلهم غضابا

جب بنو تمیم تجھ سے غصہ ہو جاتے ہیں تب تو یہ خیال کرتا ہے کہ ساری دنیا کے انسان تجھ سے بگڑے ہوئے ہیں۔

ہجو:۔

فغض الطرف انك من نمیر
فلا کعباً بلغت ولا کلابا

تو اپنی نظر جھکا لے کیوں کہ تو خاندان نمیر سے ہے، تیرا نسب نہ تو کعب تک پہنچتا ہے نہ نہ کلاب تک۔

طنزیہ:۔

زعم الفرزدق ان سیقتل مربعا ۔۔ أبشر بطول سلامة یا مربع!

فرزدق سمجھتا ہے کہ وہ مربع کو قتل کر دے گا۔ اے مربع! تجھے لمبی عمر تک سلامت رہنے کی خوشخبری ہو۔

اس کے عمدہ فخریہ اشعار:۔

ان الذی حرم المکارم تغلبا ۔۔ جعل الخلافة والنبوة فینا

مُضَرٌ ابی و ابوالملوک فھل لکم ۔۔ یا خزر تغلب من اب کابینا؟

ھذا ابن عمّی فی دمشق خلیفة ۔۔ لو شئتُ ساقکم الیّ قطینا

وہی ذات جس نے خاندان تغلب کو شرافت کے بلند کارناموں سے محروم کر دیا اسی نے خلافت و نبوت سے ہمارے خاندان کو سرفراز فرمایا، مضر میرا اور بادشاہوں کا باپ ہے، اور اے تغلبی تنگ نگاہو! کیا ہمارے باپ کی طرح تمہارا بھی کوئی باپ ہے؟ اور یہ دیکھو میرے چچا کا بیٹا دمشق میں خلیفہ ہے اگر میں چاہوں تو تم سب کو خدمت گذاری کے لیے میرے پاس بھیج دے۔

کہتے ہیں کہ جب یہ اشعار عبد الملک نے سنے تو کہا "ابن مراغہ (جریر) نے میری یہ قدر کی کہ مجھے سپاہی بنا دیا، اگر وہ "لو شئتُ" کی بجائے "لو شاء" (یعنی اگر وہ چاہے تو تم سب کو خدمت گذاری کے لیے میرے پاس بھیج دے) کہتا تو میں ان سب کو اس کے پاس بھیج دیتا۔"

۵۔ طرماح بن حکیم (متوفی ۱۰۰ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ طرماح بن حکیم طائی پہلی صدی کے نصف آخر میں دمشق میں پیدا ہوا، اور شام میں سن بلوغ تک گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ پھر بنو امیہ کے لشکروں میں وہ بھی کوفہ پہنچا اور وہاں قبیلہ تیم اللات بن ثعلبہ میں رہا۔ اس قبیلہ میں ازرقی جان فروشوں[1] میں سے ایک بزرگ تھے، جن میں ایک خاص وضع اور شان تھی۔

---

[1] جانفروشوں سے مراد خوارج ہیں یہ لوگ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے انہی لوگوں نے حضرت علیؓ کو معاویہؓ اور ان کے درمیان ثالث مقرر کرنے پر مجبور کیا تھا جس پر حضرت علیؓ نے اس تجویز کو منظور کر لیا، لیکن پنچوں کا فیصلہ ناحق ہونے کی وجہ سے حضرت علیؓ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا، تو یہ فرقہ ان کی مخالفت میں کھڑا ہو گیا، وہ کہتا تھا کہ آپ نے لوگوں کو ثالث کیوں مقرر کیا، حالانکہ فیصلہ کرنیکا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ خوارج کے بڑے بڑے چھ فرقے ہیں: ازارقہ، نجدات (باقی حاشیہ صفحہ ۲۷۱ پر)

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۷۱ پر)

چنانچہ وہ ان کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگا، انہوں نے اسے اپنا عقیدہ بتایا اور اپنے مسلک کی دعوت دی جسے اس نے قبول کر لیا، اور مرتے دم تک نہایت پختگی اور سچائی سے اس عقیدہ پر جما رہا۔ پھر اس کی ملاقات کمیت بن زید اسدی سے ہو گئی، اور دونوں میں باہم عہد وفا و محبت استوار ہو گیا، اور باوجودیکہ ان دونوں کے نسب، مذہب اور وطن الگ الگ تھے پھر بھی ان میں باہم بڑی گہری محبت قائم ہو گئی تھی۔ طرماح قحطانی، خارجی، شامی تھا اور کمیت عدنانی شیعہ، کوفی تھا۔ ایک دفعہ کسی شخص نے کمیت سے ان کے باہمی شدید اختلاف کے باوجود اس اتفاق کا راز دریافت کیا، تو اس نے جواب دیا "ہم دونوں عوام سے بغض رکھنے میں متفق ہیں۔ یہ جواب اس لاطینی مثل کی تائید و تصدیق کرتا ہے کہ تمام شعراء، چند سری حکومت (ارستقراطیت) کے قائل ہیں"۔ دوسرے شاعروں کی طرح طرماح نے بھی امیروں کے عطیوں پر زندگی گذاری۔ جو اسے دیتا اس کی مدح، اور جو نہ دیتا اس کی ہجو کرتا تھا، لیکن بایں ہمہ وہ غیور و خود دار شریف الطبع اور بلند ہمت تھا، گو اسے مال و دولت سے محبت لیکن نہ ایسی کہ وہ اسے ذلت و عاجزی پر آمادہ کر دے۔ ایک مرتبہ وہ اور کمیت، مخلد بن یزید مہلبی کے پاس گئے، اس نے دونوں کو عزت سے بٹھایا، اور شعر سنانے کے لیے کہا۔ پہلے طرماح سنانے کے لیے بڑھا تو مخلد نے کہا "تمہیں کھڑے ہو کر سناؤ" اس نے جواب دیا "ہرگز نہیں، شاعری کی عزت یہ نہیں کہ میں کھڑا ہو جاؤں اور وہ مجھے ذلیل کرے، اور میں اس کو اپنی عاجزی و بےبسی کی وجہ سے بے توقیر کر دوں، شاعری تو فخر کا ستون اور کارنامہ ہائے عرب کو دوام بخشنے کا ذریعہ ہے"۔ چنانچہ اس سے کہا گیا! "تم کمیت کے لیے جگہ خالی کر دو"۔ اور کمیت نے کھڑے ہو کر اشعار سنائے، اسے پچاس ہزار درہم انعام میں ملے، باہر نکل کر اس نے آدھے طرماح کو دے دیے اور اس سے کہا "اے ابوضبیبہ تم بہت خود دار و بلند ہمت ہو، اور میں موقع شناس ہوں اور وقت کے مطابق کام کرتا ہوں"۔

اس خود شناسی و خود داری کے ساتھ طرماح کو اپنی شاعری پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اس نے اور اس کے ساتھی کمیت نے جب ذوالرُّمّہ شاعر کے کچھ اشعار سنے تو کمیت نے طرماح کے سینہ پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بخدا یہ شاعری ریشم ہے، اور ہماری تمہاری طرح بنا ہوا کھادی نہیں ہے" اس پر طرماح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۰ کا) صفریہ، عجاردہ، اباضیہ، ثعالبہ، باقی تمام ان کی شاخیں ہیں، اور یہ سب، حضرت عثمان رضؓ و علیؓ سے برات و بیزاری میں متفق ہیں اور اپنے اس عقیدے کو تمام عبادتوں سے مقدم سمجھتے ہیں، کبیرہ گناہ کرنے والوں کو کافر بتاتے ہیں اور جب امام وقت سنت کی مخالفت کرے تو وہ اس کے خلاف بغاوت کرنا واجب سمجھتے ہیں۔ فرقہ ازارقہ جس کی طرف طرماح بھی منسوب ہے ان اعتقادات میں یہ اضافہ کرتا ہے کہ حضرت علی رضؓ کافر اور ان کا قاتل ابن ملجم نیکوکار ہیں وہ اس حد تک غلو کرتا ہے کہ صحابہ رضؓ اور تمام مسلمانوں کو کافر بتاتا ہے، اس فرقہ کا رہنما نافع بن الازرق تھا۔

نے کہا "میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا، اگرچہ مجھے اس شاعری کی عمدگی کا اعتراف ہے"!

طرماح دولت کا خواہاں اور تونگری کا آرزو مند تھا، اپنے شعر میں وہ کہتا ہے :-

أمختوى ريب المنون ولم انل ؛ من المال ما اعصى به و أُطيع!

کیا گردش زمانہ مجھے ہلاک کرنے والی ہے، حالانکہ ابھی تو مجھے اتنا مال بھی نہیں ملا جس سے میں بغاوت و اطاعت کروں!

اس نے مال و دولت کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کی اور اس کے حصول کے لیے امکانی جدوجہد کی، اس نے خدا سے دعا کی کہ وہ بستر پر نہ مرے بلکہ جد و جہد کرنے والوں اور مجاہدوں کی موت مرے تاکہ وہ شہید دنیا ہو یا شہید دین! اسی مضمون کو وہ اپنے ان اشعار میں بیان کرتا ہے :-

و انّی لمقتاد جوادی و قاذف ؛ به و بنفسی العام احدی المقاذف

لأكسب مالا او أؤدل الى غنى
من الله يكفيني عدات الخلائف
فيا ربّ ان حانت وفاتي فلا تكن
على شرجع يعلى بخضر المطارف
و لكن قبري بطن نسر مقيله
بجوّ السماء فى نسور عواكف
و أمسى شهيداً ثاديًا فى عصابة
يصابون فى فجّ من الارض خائف
فوارس من شيبان ألّف بينهم
تقى الله نزّالون عند التزاحف
اذا فارقوا دنيا همو فارقوا الاذى
وصاروا الى ميعاد ما فى المصاحف

اور میں اپنے تیز رفتار گھوڑے کو ہانک کر اسے اور خود کو امسال کسی پرخطر اور مہلک مہم میں ڈال دوں گا تاکہ میں دولت کماؤں یا اللہ کی مدد سے اس قدر آسودہ ہو جاؤں کہ خلیفوں کے نذرانے مجھے باقی نہ رہے۔ اے پروردگار! اگر میری موت کا وقت آن پہنچا ہے تو میں اس جنازہ پر نہ اٹھایا جاؤں جس پر ہری چادریں ڈالی جاتی ہیں۔ بلکہ میری قبر گدھ کا پیٹ ہو جو دوپہری بھر آسمان پر رہنے والے گدھوں میں ٹھہرا رہتا ہے اور میں اس جماعت کے لوگوں میں رہ کر شہید ہو جاؤں جو ایک پرخطر وادی میں مارے جارہے ہیں، یہ شیبانی شہسوار ہیں جن کو خدا ترسی نے ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے اور جو جنگ میں نہایت دلیری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ جب وہ اپنی دنیا چھوڑتے ہیں تو وہ ہر دکھ درد سے نجات پا لیتے ہیں۔ اور اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جس کا وعدہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔

لیکن اس کی یہ دعا بارگاہ ایزدی میں مقبول نہ ہوئی اور وہ بستر پر مرا، اور جنازہ پر اٹھایا گیا۔

اس کی شاعری:- طرماح شہری ماحول میں پلا، وہ نہ تو دیہات سے واقف ہوا، نہ خانہ بدوشوں میں مل جل کر رہا۔ اس نے کوفہ و بصرہ میں زندگی گذاری۔ وہاں اس نے تمام راویوں اور نحویوں کی زبانی سنا کہ جاہلی ادب کو برتری اور بدوی شاعری کو فضیلت اس لیے حاصل ہے کہ ان میں شواہد اور غریب الفاظ کی بہتات اور نامانوس الفاظ استعمال کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔ وہ بدویوں اور رجز خوانوں سے اشعار سن کر ان میں سے غریب و نادر الفاظ اخذ کر لیتا اور پھر ان کو بے جگہ استعمال کرتا تھا۔ عجاج کہتے ہیں "طرماح و کمیت مجھ سے غریب و نادر الفاظ دریافت کرتے، میں انہیں بتا دیتا، پھر وہی الفاظ میں ان کی شاعری میں بے جگہ مستعمل دیکھتا۔" اس سے کہا گیا کہ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ تو اس نے جواب دیا۔ "یہ دونوں شہری تھے اور نادیدہ چیزوں کا وصف بیان کرتے تھے۔" اور یہی وجہ تھی کہ اصمعی وابو عبیدہ اسلامی شعراء میں ان دونوں کی شاعری کو معیوب اور غیر مستند بتاتے تھے، جس طرح وہ عدی بن زید اور امیہ بن ابی الصلت کو جاہلی شعراء میں غیر مستند کہتے تھے۔ طرماح کے اس رجحان کا اثر آپ کو اس کی شاعری میں نمایاں نظر آئے گا۔ آپ کو جہاں اس کے اشعار میں نرم و نازک وشیریں اشعار ملیں گے وہاں کچھ بھدے، بے جوڑ، اور خام اشعار بھی نظر آئیں گے جن سے وہ اپنی شاعری کو بدنما اور اپنے دریا کو گدلا بنا لیتا ہے۔ ابن اعرابی سے طرماح کی شاعری میں اٹھارہ سوالات پوچھے گئے اور وہ ان میں سے ایک کو بھی نہ سمجھ سکا۔ بایں ہمہ طرماح کا شمار اسلامی باکمال شعراء میں ہے۔ ہجو میں اس کا ایک اپنا مخصوص و مشہور طرز ہے۔ وہ جس کی ہجو کرتا ہے اس کی توہین و تحقیر میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ از غیب اس کو مضامین سجھائے جاتے ہیں، اور کمیت جو اس کا ہم عصر و ہم مجلس تھا فضیلت کے بہت سے پہلوؤں میں اس کے کمال کا معترف تھا، ایک دن اس نے طرماح کا یہ شعر پڑھا:-

اذا قُبِضت نفس الطرماح أخلقتْ
عُرَی المجد واسترخی عنان القصائد

جب طرماح کی جان نکلے گی تو شرافت و سرداری کے کڑے کمزور پڑ جائیں گے اور قصائد کی باگ ڈھیلی ہو جائے گی۔

پھر کہنے لگا بخدا بالکل درست ہے، یہی نہیں بلکہ خطابت، روایت، فصاحت اور شجاعت کی باگ بھی!

اس کی شاعری کا نمونہ:- طرماح رزمیہ قصائد (ملحمات) کہنے والوں میں سے ہے، اس کا وہ رزمیہ آپ کو آمد کی روانی اور آورد کی دشواری کا فرق بتائے گا، جس کا مطلع یہ ہے:-

قلّ فی شطّ نهروان اغتماضی ودعانی هوی العیون المراض

نتطوبت للصبا ثم أد تفت ... رضی بالتقی ذو البرّ راضی
و أدانی الملیك رشدی وقدکنت ... أخا عُنجُهِیَّة و اعتراض
غیر ماریبة سوی ریّق الغرة ... ثم ارعویت بعد البیاض

میں نہرداں (عراق کی ایک نہر) کے کنارے کم سویا، اور مجھے نیم باز بیمار آنکھوں کی محبت نے اپنی طرف بلایا۔ پھر میں عشق سے بے خود ہو گیا مگر خدا ترسی و تقوی پر رضامندی کی وجہ سے میں نے اس عشق کو خیر باد کہہ دیا، اور نیکوکار تقوی پر رضامند ہو جاتا ہے۔ اور خدا نے مجھے میری بھلائی کا راستہ دکھا دیا حالانکہ پہلے میں بڑا دیوانہ، نڈر اور جوشیلا تھا، کسی بدکرداری کی وجہ سے نہیں بلکہ جوانی کی مستی کے باعث۔ پھر سفید بال آنے کے بعد میں نے ان سب حرکتوں کو چھوڑ دیا۔

اسی قصیدہ کے دیگر اشعار:۔

وجری بالذی أخاف من البین ... لعین تنوص کل مناص
صید حیّ الضُّحیٰ کأنّ نساہ ... حیث تجتثّ رجلہ فی أباض
سوف تدنیك من لمیس سبنتا ... ة أمارت بالبول ماء الکراض
فھی تودا انفجت صفصفٍ ذی دحاض ... عن زحالیف عضداھا

اور جدائی کی وجہ سے مجھے ہر دم بہنے والی آنکھ سے جو خطرہ تھا وہ پیش آ گیا۔ صبح کو اس کی آواز بہت بلند ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رگ "نسا" اس کی ٹانگ کی جڑ میں رسی سے بندی ہوئی ہے۔ جلد ہی تجھے لمیس (محبوبہ) سے وہ اونٹنی جا ملائے گی، جو مضبوطی کی وجہ سے) حاملہ نہیں ہوتی اور نر کے مادہ کو پیشاب کے ساتھ نکال دیتی ہے۔ اس کی پشت اور گردن لمبی ہے، اپنے بازوؤں کو وہ نشیبی ڈھلوان زمین پر چلتے وقت کشادہ کر لیتی ہے۔

اس قصیدہ کے آخری اشعار:۔

اننا معشر شمائلنا الصبـ ... ـر اذا الخوف مال بالأحفاض
نُصُرٌ للذلیل فی ندوۃ الحی ... مرائیب للثأي المنہاض
لم یفتنا بالوتر قوم وللضیم ... رجال یرضون بالإغماض
فسلِ الناس ان جھلت وان شئت ... قضی بیننا و بینك قاض

ہم وہ لوگ ہیں کہ جب خوف کی وجہ سے جھنڈے اٹھانے والے بھاگ جاتے ہیں اس وقت بھی ہماری عادتوں میں صبر و ثبات پایا جاتا ہے۔ قبیلہ کی مجلس میں ہم لاچار و کمزور کے حامی ہیں تباہ کن فساد کی اصلاح کرنے والے ہیں اور کوئی قوم ایسی نہیں جس سے ہم اپنا بدلہ نہ لے سکیں، ذلت و مظلومیت تو ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی بے عزتی و زبوں حالی پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ اے محبوبہ! اگر تجھے (ہمارے کارنامے) نہیں معلوم ہوں تو لوگوں سے دریافت کر لے اور اگر تمہیں منظور ہو تو ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی ثالث فیصلہ کر دے۔

دیگر:-

لقد زادنی حبًّا لنفسی أننی　　بغیض الیٰ کلّ امرئ غیر طائل
و أنی شقیٌ باللئام ولا تری　　شقیًّا بهم الا کریم الشمائل

مجھے اپنے آپ سے محبت اس لیے اور زیادہ ہوگئی کہ میں ہر ناکارہ انسان کا مبغوض ہوں اور اس لیے بھی میں کمینوں کی نظر میں بدبخت ہوں اور ان کی نظر میں خوش اخلاق شخص کے سوا کوئی بدبخت نہیں ہوتا۔

بنو تمیم کی ہجو میں اس کے اشعار:-

لو حان وِرْد تمیم ثم قیل لها　　حوض الرسول علیه الأزد لم ترد
أو أنزل الله وحیًّا أن یعذّبها　　ان لم تعد لقتال الأزد لم تعِد
لا عزّ نصر أمرئ أضحی له فرس　　علی تمیم یرید النصر من أحد
لو کان یخفی علی الرحمٰن خافیة　　من خَلْقه خَفِیَتْ عنه بنو أسد

اگر بنو تمیم کی پانی پر اترنے کی باری آجائے اور ان سے کہا جائے کہ آں حضرت کے حوض کوثر پر ازد (قبیلہ) ہے تو وہ اس حوض پر بھی کبھی نہ جائیں گے۔ یا اگر اللہ وحی فرمائے کہ اے بنو تمیم! اگر تم ازد سے جنگ نہ کروگے تو میں تم کو عذاب دوں گا تو بھی وہ ازد سے لڑنے کا وعدہ نہ کریں گے۔ وہ شخص جو تمیم کے خلاف مدد کا طالب ہو اور اس کے پاس گھوڑا ہو تو اس کی مدد مشکل نہیں ہے۔ اگر خدا کی مخلوق میں سے کوئی بے وقعتی کی وجہ سے خدا کی نظر سے پوشیدہ رہ سکتا ہے تو وہ بنو اسد ہی ہو سکتے ہیں۔

نثر

خطابت:- عظیم الشان دعوت کے ساتھ اسلام کا ظہور ایک بڑا سبب تھا جس نے فن خطابت کو اوج کمال پر پہنچا دیا، اور حکومت کی باگ ڈور مقررین کے ہاتھ میں دے دی۔ اس لیے کہ دعوت دین، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، استئصال فتنہ و فساد، تردید بدعات، لشکروں کو جنگ پر تحریض و ترغیب، یہی کچھ وہ چیزیں ہیں جو خطابت کے مقاصد و موضوعات ہیں، اور اس فن کے لیے قرآن کی آیات اور اس کے دلائل، نہ خشک ہونے والا چشمہ اور نہ ختم ہونے والی مدد بن گئے۔ شہادت عثمان رض کے بعد جب مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا اور متعدد جماعتیں بن گئی تو خطابت نے عظیم الشان ترقی کی، اس لیے کہ ہر فرقہ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور اپنی دعوت کی تائید کے لیے خطابت ہی پر اعتماد کرتا تھا۔

اس دور کی خطابت کی اہم خصوصیات حلاوت لفظ، متانت اسلوب، زور بیان، قوت تاثیر آیات قرآنی کے اقتباسات و حوالہ جات، مطلب سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کے لیے قرآن کے

طرز بیان کی پیروی، اور حمد و صلوٰۃ سے اس کی ابتدا ہیں۔

زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق تمام عرب تقریر کرتے وقت عمامہ باندھتے، عصا ہاتھ میں لیتے اور اونچی جگہ کھڑے ہو کر تقریر کرتے تھے، صرف ایک ولید بن عبد الملک ہیں جنہوں نے بیٹھ کر تقریر کی۔

مختصر یہ کہ زبان کے تمام ادوار میں کوئی دور ایسا نہیں جس میں اس دور کی طرح خطابت نے عروج حاصل کیا ہو اور مقررین کی اس درجہ کثرت رہی ہو، اس لیے کہ اس زمانہ میں عربوں کا رجحان شاعری سے ہٹ کر خطابت کی طرف ہو گیا تھا نیز دین و سیاست میں ان کا تمام تر دار و مدار اسی فن پر تھا۔

اس دور کے مشہور مقررین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین، سحبان وائل، زیاد بن ابیہ، حجاج بن یوسف اور قطری بن فجاءۃ ہیں۔

۱۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

آپ کی پیدائش، ابتدائی زندگی اور بعثت:-

سیدنا حضرت محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم قریشی مکہ میں ۹ یا ۱۲ ربیع الاول عام فیل مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء بوقت صبح یتیمی و ناداری کے عالم میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ چھ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ کی والدہ نے داعی اجل کو لبیک کہا جس کے بعد آپ کے دادا نے نہایت پیار و محبت سے دو سال تک آپ کی پرورش کی، اور اپنی وفات سے قبل انھوں نے آپ کی تربیت و نگرانی آپ کے چچا ابو طالب کے ذمہ کر دی، چنانچہ انھوں نے تنگدستی و کثرت عیال کے باوجود آپ کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ اگر طبعی حالات کے مطابق آپ پرورش پاتے تو آپ بھی یتیمانہ اخلاق اور جاہلانہ عادات کو اپنا کر جوان ہوتے، لیکن خدائے تعالیٰ نے آپ کی تہذیب و تربیت کا انتظام کر دیا، اور آپ کے اخلاق کی تکمیل پختہ عقل، نرم اخلاق، خوشگوار طبیعت، پر وقار حیا، متانت و بردباری، تسلی بخش صبر، مہربانی و درگذر، سچی زبان، قابل اعتماد ذمہ داری، مضبوط دل، اور جمعیت خاطر، بخش کر فرمائی اور آپ کو بت پرستی کی نجاستوں سے پاک رکھا۔ چنانچہ آپ نے نہ شراب پی نہ بتوں پر چڑھائے ہوئے جانوروں کا گوشت کھایا، نہ بتوں کے میلے مجلسوں میں حصہ لیا، بچپن ہی میں آپ کی طبع بلند کو کسب معاش کے لیے حیلہ و تدبیر کا شوق پیدا ہوا۔ آپ نے اپنے قومی رواج کے مطابق نہایت ہوشیاری و مستعدی سے تجارت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ لوگوں میں آپ کی راستبازی، ہوشیاری و امانتداری کا چرچا عام ہونے لگا۔ اس وقت خدیجہ بنت خویلد نے جو قریش کی مالدار و باعزت خاتون تھیں آپ کو اپنے مال کی تجارت کرنے کے لیے دعوت دی، آپ نے ان کے غلام "میسرہ" کے ساتھ شام کا سفر کیا، یہ سفر بہت کامیاب رہا اور اس تجارت میں بڑا نفع ہوا جب آپ مکہ واپس ہوئے تو نیک بی بی اس گراں قدر منافع اور کامیاب تاجر کی امانتداری دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور آپ سے شادی کرنا چاہی۔ اس وقت وہ چالیس سال کی تھیں اور آپ پچیس برس کے تھے۔ آپ نے بھی

اس رشتہ کو پسند فرمایا۔ پھر آپ ؐ کے چچا نے ان کے چچا کے پاس پیغام بھیج دیا، حضرت خدیجہ کی گرانقدر خدمات کے باعث اسلام کی ترقی میں ان کا نہایت کامیاب حصہ ہے۔ پھر آں حضرت ؐ اپنے اہل وعیال کی روزی کمانے، اور اپنی بیوی کی دولت بڑھانے کے لیے متفرق ممالک کی منڈیوں میں تجارت کرنے لگے۔ آپ ؐ کو دنیا کے سازوسامان اور زندگی کے آرام و آسائش سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لیے آپ ؐ کو نہ تو دولت

. . . .

جمع کرنے کی ہوس ہوئی، نہ کسی بلند منصب پر پہنچنے کی تمنا۔ آپ ؐ دنیا کے مشاغل سے فارغ ہوکر تخلیہ میں لمبی لمبی راتیں غار حرا میں بیٹھ کر عبادت اور غور و فکر میں گذار دیتے۔ اپنی پاکیزہ و لطیف روح کو عالم بالا کی طرف متوجہ کرتے، حتیٰ کہ اسی غار میں چالیس برس چھ ماہ (قمری سال) کی عمر ہونے پر آپ ؐ کو بذریعہ وحی رسالت دمعجزہ بخشا گیا۔ آپ ؐ گھبراتے ہوئے اپنی بیوی کے پاس تشریف لائے، انھوں نے آپ ؐ کو تسلی دی، اور کہا "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں خدیجہ کی جان ہے، خدا آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ ؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، راست گفتار و امانت دار ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں، مہمان نواز ہیں، مصیبتوں میں دوسروں کے کام آتے ہیں۔" اس کے بعد ایک مدت تک وحی کا سلسلہ بند ہوگیا، پھر روح الامین خدا کے پاس سے یہ آیات لے کر آپ ؐ کے دل پر نازل ہوئے "یا ایھا المدثر ہ قم فانذر ہ و ربك فكبر ہ" اے (لحاف میں) لپٹنے والے [1]، کھڑے ہو جاؤ اور بدعملی کے انجام بد سے لوگوں کو ڈراؤ، اور صرف اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔" چنانچہ آپ ؐ رسالت وتبلیغ کے بارگراں کو اٹھا کر تین سال تک خفیہ طریقہ سے تبلیغ دین فرماتے رہے۔ پھر آپ ؐ کو برملا دعوت حق دینے کا حکم ملا، چنانچہ آپ ؐ نے علی الاعلان قریش کو دعوت دین پہنچائی، ان کی عقلوں فکروں اور خیالوں پر تنقید کی۔ ان کے بتوں پر نکتہ چینی کی جس کا جواب کفار نے بھی کھلی دشمنی سے دیا۔ قسم قسم کی ایذائیں پہنچائیں، مکر و سازش کے جال بچھائے اور اس تاک میں رہے کہ زمانہ کی گردشیں آپ ؐ کو ختم کر ڈالیں، مگر آپ ؐ ان کی تمام سازشوں کا مقابلہ صبر کی ڈھال اور ایمان کے ہتھیاروں سے کرتے رہے۔ آپ ؐ کی پشت پناہی میں آپ ؐ کے چچا ابو طالب تھے جو آپ ؐ کی مدافعت و حمایت کرتے رہے۔ آپ ؐ کی نیک بیوی حضرت خدیجہ رضؓ تھیں جو آپ ؐ کو تسلی دیتیں اور تقویت بخشتی رہتی تھیں۔ حتیٰ کہ ان سخت پریشان حالیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دس سال گذر گئے۔ نبوت کے دسویں سال آپ ؐ کے مشفق و کریم چچا اور آپ ؐ کی مہربان و غمگسار بیوی یکے بعد دیگرے دو دن کے فاصلہ سے داغ مفارقت دے گئے۔ جس کا آپ ؐ کو بڑا رنج ہوا، ان دونوں کی وفات کے بعد آپ ؐ کا مکہ میں رہنا دوبھر ہو گیا چنانچہ آپ ؐ نے مکہ چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ مدینہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ جہاں اوس و خزرج

---

[1] المدثر کے یہ مالوف معانی ہیں ویسے ادثر کے ایک معنے کثیر دولت حاصل کرنے کے بھی ہیں اس لحاظ سے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اے وحی الٰہی کی عظیم دولت کے مالک!

کے کچھ لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ جب مشرکوں کو آپ ؐ کے اس ارادہ کا علم ہوا تو انھوں نے مل کر آپ ؐ کو شہید کرنے کی سازش کی۔ لیکن اسی رات جب وہ آپ ؐ کو شہید کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے آپ ؐ اپنے دوست ابو بکرؓ کے ہمراہ مدینہ کے لیے نکل گئے۔ ان کی نگہبانی و حفاظت نہ سونے والی آنکھ کر رہی تھی اور وہ طاقت جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ربیع الاول جمعہ کے دن اپنی پیدائش سے ترپن سال گذرنے پر مطابق ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء دونوں مدینہ پہنچے اور یہ مبارک ہجرت آپ ؐ کے بول بالا ہونے، آپ ؐ کی دعوت کے پھیلنے اور آپ ؐ کی کامیابی کے مکمل ہونے کا آغاز بن گئی۔ آپ ؐ لگاتار مشرکین سے جہاد کرتے رہے اور قرآن مجید کے احکام کے مطابق مقابلہ و مباحثہ اور تلوار سے جنگ کرتے رہے، حتیٰ کہ جہالت کا دور ختم ہو گیا۔ شرک کی بدلیاں چھٹ گئیں۔ دنیا میں توحید کا بول بالا ہو گیا اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی " الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی، و رضیت لکم الاسلام دینا: آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے بحیثیت دین اسلام کو پسند کر لیا" ابھی اس آیۂ کریمہ کے نزول کو تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ ؐ بخار میں مبتلا ہو گئے اور پیر کے دن ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۸ جون ۶۳۲ء رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

آپ ؐ کا حلیہ مبارک :- کسی دیکھنے والے نے آپ ؐ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ رسول اللہ ؐ نہایت عظیم شخصیت و وجاہت کے مالک تھے، آپ ؐ کا چہرہ ماہ شب چاردہم کی طرح روشن تھا۔ آپ ؐ درمیانہ قد سے لمبے اور بہت لمبے قد سے چھوٹے تھے۔ رنگ چمکدار، جبیں کشادہ، گھنی خم دار ابرویں جن کے درمیان فاصلہ تھا، اس فاصلہ میں ایک رگ تھی جو غصہ کے وقت پھول جاتی تھی۔ نوک دار ستوان ناک جس پر نور تھا اور غور سے نہ دیکھنے والے کو آپ ؐ کی ناک کھڑی معلوم ہوتی تھی۔ گھنی ڈاڑھی، آنکھیں بڑی اور پتلیاں سیاہ تھیں۔ گال لمبے نرم، منہ چوڑا، دانت چمکدار اور ان کے درمیان خلا تھا، سینہ سے ناف تک بالوں کی پتلی لکیر تھی، آپ ؐ کی گردن چاندی کی طرح صاف اور گڑیا کی گردن کی طرح خوبصورت تھی، بدن سڈول موٹا اور گٹھیلا تھا، سینہ اور پیٹ کی اونچائی برابر تھی۔ سینہ بہت چوڑا تھا۔ تمام جوڑ مضبوط اور موٹے تھے۔ کلائیوں کندھوں اور سینہ کے بالائی حصوں پر گھنے بال تھے۔ کلائی چوڑی اور ہتھیلی کشادہ تھی، ہاتھ اور پاؤں مضبوط اور سخت تھے۔ ٹانگیں اور ہاتھ لمبے اور خوبصورت تھے۔ پاؤں کے تلوے اندر بیٹھے ہوئے اور قدم اس قدر سپاٹ تھے کہ پانی ان پر پھسل جاتا تھا، اس طرح چلتے جیسے نشیبی زمین پر کوئی قدم جما جما کر چلتا ہے۔ قدم رکھتے وقت کچھ آگے جھکتے اور نہایت سکون و وقار سے چلتے۔ تیز رفتار تھے، جب چلتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا آپ ؐ بلندی سے نیچے کی طرف آ رہے ہیں۔ جب کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پورا بدن اس کی طرف پھیر لیتے۔ نگاہ نیچی رہتی تھی، آپ ؐ کی نظر آسمان سے زیادہ زمین کی طرف رہتی، آپ ؐ کی پوری نظر صرف کنکھیوں سے دیکھنا ہوتی تھی۔ اپنے ساتھیوں کو اپنے آگے چلاتے اور جس سے

ملتے اسے سلام کرنے میں پہل فرماتے۔ زیادہ تر خاموش، غموں سے دردمند اور غور و فکر میں محو رہتے تھے۔
بات پورے منہ سے کرتے اور مختصر و جامع باتیں بیان فرماتے۔ نہایت نرم مزاج و خوش اخلاق تھے۔
نہ تند و درشت تھے نہ عاجز و کمزور، جب اشارہ کرتے تو اپنے پورے ہاتھ سے کرتے۔ اظہار تعجب
کے لیے اپنے ہاتھ کو الٹ دیتے اور جب بات کرتے تو ہاتھ کو قریب لاکر داہنے ہاتھ کا انگوٹھا بائیں
ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے۔ جب غصہ ہوتے تو نفرت کرتے ہوئے اپنا منہ موڑ لیتے۔ خوشی میں اپنی نگاہیں نیچی
رکھتے، آپؐ کی پوری ہنسی صرف مسکراہٹ ہوتی جس سے موتیوں کی مانند خوبصورت دانت چمکنے لگتے تھے۔"

آپؐ کی فصاحت:- آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش زبان و شیریں بیان قبائل میں پرورش
پائی۔ آپؐ بنو ہاشم میں پیدا ہوئے، قریش میں بڑھے، بنو سعد میں دودھ
پیا، لہذا قدرتی طور پر آپؐ تمام عربوں سے زیادہ فصیح ہو گئے، خود آپؐ نے اپنے متعلق ایک دفعہ
سب سے زیادہ فصیح ہونے کا دعوی کیا اور کسی نے آپؐ کے اس دعوی کی نہ تردید کی نہ اس پر اعتراض
کیا۔ آپؐ کی فصاحت میں آمد ہی آمد تھی۔ وہ الہام سے زیادہ مشابہ تھی کیونکہ آپؐ اس کے لیے کوئی
اہتمام و تکلف، یا کسی قسم مشق و مزاولت نہ کرتے تھے۔ الفاظ و معانی از خود آپؐ کے لیے مطیع ہو جاتے
تھے، کوئی بھدا یا غیر موزوں لفظ آپ کی زبان سے نہیں نکلا، نہ آپؐ کے طرز بیان میں کوئی عبارت
ڈھیلی اور بے ڈول ہوئی۔ عربوں کی کوئی بولی آپؐ کے دائرہ علم سے باہر نہ تھی، نہ کوئی فکر آپؐ
کے ذہن رسا سے بچ کر نکلا، آپؐ کا کلام درحقیقت بقول جاحظ "ایسا کلام تھا جس کے حروف
کی تعداد کم اور معانی کی مقدار زیادہ تھی، جو صنعت و آورد سے بالاتر اور تکلف سے منزہ ہوتا
اس میں تفصیل کی جگہ تفصیل اور اجمال کی جگہ اجمال تھا۔ وہ بے قاعدہ، غریب و وحشی الفاظ سے خالی
نیز بازاری و عامیانہ الفاظ سے پاک صاف تھا، سرمایۂ حکمت سے لبریز نیز غلطیوں اور خامیوں سے
محفوظ و مصون تھا، جسے غیبی تائید و توفیق حاصل تھی۔ الغرض لوگوں نے آپؐ کے کلام سے زیادہ
مفید، سچا، مناسب و موزوں، خوش اسلوب و خوش معنی، پُر اثر و دلنشیں، آسان و زود فہم اور
اپنے مقصود و مطلوب کو کھول کر بوضاحت بیان کرنے والا کوئی کلام نہیں سنا۔"

زبان و ادب پر احادیث کی اثر اندازی[۵۱]:- اس روحانی بلاغت و الہامی فصاحت کا
زبان و ادب پر جو اثر ہوا وہ محتاج بیان نہیں۔
آپؐ میں قوت طبع، پاکیزگی احساس و فکر، تیزی ذہن، زبان پر پورے قابو نیز اعانتِ وحی کی وجہ
سے وہ صلاحیتیں جمع ہو گئی تھیں جو آپؐ کے سوا کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اپنے کلام
میں آپؐ اختصار و مجاز سے کام لیتے، بات میں بات نکالتے اور فن بیان کے طریقوں پر چلتے تھے۔
آپؐ نئی نئی ترکیبیں برجستہ بنا لیتے اور نہایت جامع اصطلاحی الفاظ وضع فرما لیتے تھے۔ حتی کہ جو کچھ

---

[۵۱] پچھلے صفحات میں عنوان "حدیث کا طرز بیان" ملاحظہ کیجیے۔

بھی آپ ؐ کی زبان سے نکلتا وہ فن بیان کے محاسن میں سے ایک حسن اور زبان کے اسرار میں سے ایک ایسا رمز بن جاتا جس سے زبان کے ذخیرہ میں اضافہ، اور ادب کا مرتبہ بلند ہو جاتا تھا۔

مثلاً آں حضرت ؐ کے یہ اقوال:۔

مات حتف انفہ[1]: وہ اپنی ناک سے دم توڑ کر مر گیا، یعنی طبعی موت مر گیا،

الآن حمی الوطیس: اب بھٹی کا تاؤ تیز ہوا ہے، یعنی جنگ زور دار ہوئی ہے۔

ھدنۃ علی دخن: اوپری صلح، وہ صلح جس میں بظاہر امن ہو لیکن عداوت و نفرت باقی رہے۔

یا خیل اللہ ارکبی: اے خدائی شہسوارو! سوار ہو جاؤ۔

لا ینتطح فیھا عنزان:۔ اس کے بارے میں دو بکریاں باہم ٹکریں نہیں ماریں گی یعنی کوئی جھگڑا یا اختلاف نہیں ہوگا۔

اور آپ ؐ کا عورتوں کی سواری چلانے والے سے یہ فرمانا:۔

رویدک رفقا بالقواریر: ذرا آہستہ، اُن نازک آبگینوں کو نرمی سے لے چلو!

اور جنگ بدر کے دن آپ ؐ کا یہ فرمانا:۔

ھذا یوم لہ ما بعدہ: یہ ایسا دن ہے جس پر مستقبل کا انحصار ہے۔

ان سب سے زیادہ حیرت انگیز و قابل ملاحظہ وہ دینی اسالیب اور شرعی الفاظ ہیں جو آپ ؐ نے وضع کیے ہیں اور قرآن مجید میں نہیں پائے جاتے۔

۲۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب

آپ رضؓ کی پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ ابو حفص عمر فاروق رضؓ بن خطاب قریشی آں حضرت ؐ کی پیدائش کے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے۔ انہوں نے قریشی نوجوانوں کی طرح پرورش پائی۔ بچپن میں مویشی چرائے، بڑے ہو کر تجارتی کاروبار اور جنگوں میں حصہ لینے لگے، پھر اپنی قوم کے شرفاء کی طرح اپنے اخلاق و عادات درست کیے۔ لکھنا سیکھا۔ جنوب میں یمن و حبشہ اور شمال میں شام و عراق، تجارتی کاروبار کے لیے جانے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کی عزت بڑھ گئی اور مرتبہ بلند ہو گیا۔ اور وہ قوم میں اپنی خوش بیانی، دلیری و بیباکی، حمیت و اولوالعزمی کی وجہ سے مشہور ہو گئے۔ قریش نے جنگ و امن میں انہیں اپنے اور قبائل

---

[1] حضرت علی رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے کوئی غیر معمولی کلمہ عربوں کے منہ سے ایسا نہیں سنا جو آں حضرت ؐ سے نہ سنا ہو، اور میں نے آں حضرت ؐ کو "مات حتف انفہ" کہتے سنا، اور آپ ؐ سے قبل کسی عرب کے منہ سے نہیں سنا" لہٰذا سموءل کے مشہور قصیدہ میں اس کلمہ کا استعمال اس امر کی دلیل ہے کہ وہ پورا یا اس کا کچھ حصہ مصنوعی ہے۔

عرب کے درمیان سفیر بنا لیا تھا۔ جب اسلام آیا تو آپ نے اس دعوت کی مخالفت و مزاحمت کی مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچائیں، ان کو برا کہنے لگے اور سختی سے جم کر اسلام کے خلاف لڑتے رہے۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد پینتالیس مرد اور تیرہ عورتوں سے زائد نہ تھی۔ اور وہ سب ارقم مخزومی کے مکان میں خفیہ طور پر جمع ہوتے تھے۔ حضور ص اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگا کرتے تھے کہ وہ اسلام کو عمر یا ابوجہل کے ذریعہ قوت و عزت بخشے۔ چنانچہ اللہ نے اس سعادت کے لیے حضرت عمر رض کو منتخب کیا۔ اور آپ کا دل اسلام کے لیے کھول دیا، واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے بہنوئی کو اسلام قبول کر لینے پر ڈانٹنے دھمکانے اور سزا دینے کے لیے گئے۔ ان کی بہن نے ان کو برا بھلا کہا، اور انہیں ایک صحیفہ لاکر دیا، جس میں سورۃ طٰہٰ کی کچھ آیتیں لکھی تھیں، جب انہوں نے اسے پڑھا تو ان کے دل پر بڑا اثر ہوا اور انہوں نے کہا "کیا اسی چیز سے قریش بھاگتے ہیں؟" پھر دریافت کیا "رسول اللہ کہاں ہیں؟" ان سے کہا گیا "ارقم کے مکان میں" عمر رض کہتے ہیں "میں فوراً ارقم کے مکان پر گیا، اور دروازہ کھٹکھٹایا، سب لوگ جمع ہو گئے، حمزہ رض نے ان لوگوں سے پوچھا "کیا بات ہے؟" انہوں نے جواب دیا "عمر ہیں" حمزہ رض نے کہا "ہونے دو عمر! ان کے لیے دروازہ کھول دو، اگر اسلام لے آئیں گے تو ہم ان کی عزت کریں گے، ورنہ قتل کر ڈالیں گے" یہ گفتگو آں حضرت ص نے سنی تو باہر تشریف لائے، پھر میں نے کلمۂ شہادت پڑھا جسے سن کر تمام گھر والوں نے اس قدر اونچی آواز سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ اس کی آواز مکہ والوں نے سنی۔ میں نے کہا "یا رسول اللہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں" آپ ص نے فرمایا "کیوں نہیں؟" میں نے کہا "تو پھر یہ پوشیدہ کارروائی کیوں ہے؟" پھر ہم دو صفوں میں نکلے ایک میں میں تھا، دوسری میں حمزہ رض اور خانۂ کعبہ میں داخل ہو گئے، جب قریش نے مجھے اور حمزہ رض کو دیکھا تو ان کو بڑا دکھ پہنچا، اور اسی دن رسول اللہ ص نے مجھے "فاروق" کا خطاب عطا فرمایا۔"

اس وقت ان کی عمر چھبیس برس کی تھی اور یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے بڑی تنگی اور ابتلاء کا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان مصائب میں سے اپنا حصہ لیا۔ خدا کی راہ میں اپنے دوست اور اقرباء سے دشمنی مول لی، یہ وقت تھا کہ مسلمان چھپ چھپ کر مدینہ جانے لگے تھے، لیکن جوان مرد و بے باک عمر نے اپنی ہجرت کو چھپانا نہ چاہا وہ اپنے گلے میں تلوار ڈال، شانہ پر کمان لٹکائے خانۂ کعبہ پہنچے۔ تمام قریشی اکابر خانۂ کعبہ کے صحن میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے طواف کیا، نماز پڑھی پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تمہاری صورتیں مسخ ہو جائیں، جو چاہتا ہے کہ اس کی ماں اسے روئے، اس کا بچہ یتیم اور اس کی بیوی رانڈ ہو جائے وہ مجھ سے اس گھاٹی کے پیچھے ملے" لیکن کسی نے بھی ان سے تعرض نہ کیا۔

اس کے بعد وہ مسلسل حضور ص کے ساتھ وفادار ساتھی کی طرح رہے۔ اپنی زبان اور اپنے نیزہ سے آپ کی حمایت و مدافعت کرتے اور آپ کو مشورے دیتے رہے، جن میں سے بعض مشوروں کی تائید خود قرآن مجید میں بھی کی گئی۔ جب آں حضرت ص انتقال فرما گئے اور آپ ص کے بعد خلیفہ کے تقرر میں انصار و مہاجرین کے درمیان جھگڑا ہونے لگا تو حضرت عمر رض نے ابوبکر رض کے خلیفہ بننے کی تائید کی اور اس کے

بعد ہی سب نے ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ ایک امانتدار مشیر اور منصف جج کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے تاآنکہ حضرت ابو بکرؓ کی وفات کا وقت آگیا اور انہیں عمرؓ کے علاوہ کوئی خلافت کا صحیح وارث نظر نہ آیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ مومن مخلص کی قوت، بہادر و جانبازی کی اولوالعزمی، جہاندیدہ بزرگ کی تجربہ کاری، فطری قابلیت رکھنے والے ہوشیار شخص کی زیرکی کے ساتھ تخت خلافت پر متمکن ہوئے، اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو زیر نگیں کر لیا۔ انہوں نے صرف اپنی انفرادی صلاحیتوں سے عرب کی اس وادی غیر ذی زرع کے اندر رہ کر وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو بڑی بڑی حکومتوں اور مجلسوں کے لیے بھی انتہائی دشوار تھے۔ گورنروں کا تقرر، ججوں کا انتخاب، فوجی افسروں کا چناؤ، لشکروں کی ترتیب و تنظیم، فوجی نقل و حرکت کے احکامات جاری کرنا، کمک بھیجنا، نقشے بنانا، شہروں کی حدیں کھینچنا، قانون سازی، تقسیم مال غنیمت، حدود و تعزیرات کا اجراء وغیرہ، الغرض یہ تمام خدمات آپ اپنی صوابدید، اصابت رائے، تیزی ذہن دوربینی و عزیمت سے انجام دیتے رہے۔ ان جلیل القدر خدمات کے ساتھ آپ خاک نشیں تھے، عوام کے ساتھ مل جل کر رہتے، پرانے کپڑے پہنتے، زیتون کا تیل اور سرکہ لگا کر روٹی کھاتے، اور آپ کا یومیہ وظیفہ بیت المال سے دو درہم سے زیادہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی خلافت کا زمانہ آج تک عدل و امن اور انتظام کے لحاظ سے دنیا کا اعلیٰ ترین مثالی دور مانا گیا ہے۔ مگر وہی عمرؓ جس نے خدا اور انسانوں کو اپنے عدل و احسان سے خوش کر لیا تھا، لولوہ نامی ایک مجوسی غلام کو مطمئن نہ کر سکا، اس لیے کہ انہوں نے اس غلام کو اپنے آقا مغیرہ بن شعبہؓ سے احسان کرنے کی نصیحت کی تھی نیز یہ کہ وہ دو درہم روزانہ اپنے آقا کو دینا بار نہ سمجھے جب کہ وہ نجاری، نقاشی اور لوہاری کے تین ہنر جانتا تھا۔ یہ فیصلہ اسے برا لگا، اور وہ صبح اندھیرے ہی جب کہ آپؓ لوگوں کو فجر کی نماز پڑھا رہے تھے مسجد میں گیا اور اپنے دو پھلے خنجر سے آپ پر لگاتار کئی وار کیے جن کی تاب نہ لا کر آپ بدھ کی شب کو ستائیس ذی الحجہ ۲۳ھ انتقال فرما گئے۔

آپ کا حلیہ اور خداداد قابلیتیں:۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ لمبے موٹے اور خوبصورت تھے۔ آپ کے رنگ میں سرخی زیادہ جھلکتی، سر گنجا اور بال سفید تھے۔ گالوں پر ہلکے ہلکے بال تھے۔ مونچھوں کی چونچیں بھوری اور لمبی تھیں۔ آپ بڑے مہربان اور نرم مزاج تھے۔ لیکن حق بات میں کوئی رعایت یا نرمی نہ کرتے تھے۔ بڑے بڑے صحابہ اور اشراف قبائل میں سے کم ہی ہوں گے جو ان کے کوڑے سے بچے ہوں۔ آپ صائب الرائے، پختہ کار مدبر، قوی الحجت، حد درجہ خدا ترس، نہایت پاکباز، وسیع العلم، خوش اندیش اور تفقہ فی الدین میں باکمال تھے۔ اگر حضرت علیؓ کی تعریف میں بلاغت لسان کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو آپ کے لیے بلاغت عقل کا استعمال بالکل درست ہے۔ اس امر کے ثبوت میں آپ کے ان عہد ناموں اور مکاتیب کا مطالعہ کافی ہے جو وقتاً فوقتاً آپ نے [illegible]، گورنروں اور فوجی افسروں کو لکھے تھے۔ جن میں آپ فقیہ مجتہد، ماہر منتظم اور تجربہ کار

سیاستدان کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ باعث حیرت یہ ہے کہ آپ میں یہ تمام خوبیاں نہ وحی کی وجہ سے تھیں نہ کسی استاذ کی تعلیم کے طفیل، نہ کسی کے اقتداء وتقلید کے باعث۔ یقیناً یہ اللہ کی دین تھی اور اس کا فضل، اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے۔

آپ کے عہدناموں اور خطبات کا نمونہ:- آپ کا وہ عہد نامہ جسے آپ نے ابوموسی اشعریؓ کو قاضی بناتے وقت بھیجا، یہی وہ عہدنامہ ہے، جسے تمام قاضی نظام و احکام قضاء کے لیے اساس و بنیاد خیال کرتے ہیں اور واقعۃً یہ ہے بھی اسی لائق:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم، یہ عہد نامہ اللہ کے بندے اور امیرالمومنین عمر کی طرف سے عبداللہ بن قیس کو بھیجا جارہا ہے، السلام علیکم۔ امابعد! قضاء ایک فریضۂ محکم اور قابل تقلید سنت ہے۔ جب تمہارے پاس فیصلہ کرانے کے لیے لوگ آئیں تو پہلے معاملہ کو خوب سمجھ لو، اس لیے کہ وہ حق جو قابل نفاذ نہ ہو اس کے متعلق گفتگو کرنا بے سود ہے۔ اپنی توجہ، اپنے عدل اور اپنی مجلس سے لوگوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرو، تاکہ کوئی شریف تم سے حق تلفی وظلم کی طمع نہ رکھے، نہ کوئی کمزور تمہارے عدل و انصاف سے مایوس ہوسکے۔ مدعی دلیل پیش کرے گا اور انکار کرنے والا قسم کھائے گا۔ مسلمانوں میں سوائے اس صلح کے ہر صلح جائز ہے جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کردے۔ آج تم جو فیصلہ کرو کل غور وخوض سے اگر تمہیں حق اس کے خلاف معلوم ہوجائے تو حق کی طرف رجوع کرنے میں کوئی چیز تم کو منع نہ کرے، کیونکہ حق قدیم ہے، اور حق کی طرف رجوع کرنا باطل میں سرگرداں پھرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ جس بات میں تمہارے دل کو تردد ہو اور قرآن وحدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو تم اپنی سمجھ اور فکر سے کام لو، پھر امثال ونظائر کو پہچانو، اور معاملات کا ان پر قیاس کرو، اور جو عنداللہ قریب تر اور حق سے زیادہ مشابہ ہو اس کو اختیار کرلو۔ جو شخص کسی غائبانہ حق کا دعویدار ہو اس کے لیے ایک آخری مدت مقرر کردو، جس پر وہ رک جائے، اگر وہ اپنی دلیل پیش کردے تو تم اس کا حق دلادو، ورنہ مقدمہ کو اس کے خلاف روا سمجھو، یہ طریقہ ازالۂ شک کے لیے زیادہ مناسب اور رفع ابہام کے لیے زیادہ موزوں ہوسکے گا۔ تمام مسلمان بجز سزا یافتہ شخص کے یا جسے جھوٹی شہادت دیتے ہوئے پکڑا گیا ہو، یا جس کی امانت دوفا یانسب میں تہمت لگائی گئی ہو، آپس میں معتبر اور قابل قبول گواہ ہیں۔ تمہاری اندرونی حالت کو اللہ بہتر جانتا ہے، اس نے تمہاری ذمہ داری کو دلیلوں اور قسموں کے ذریعہ تم سے ہٹا دیا ہے۔ خبردار! جھگڑنے والوں کی وجہ سے تمہارے اندر کسی قسم کی اکتاہٹ بددلی اور پریشانی پیدا نہ ہونے پائے، نہ جھگڑا فیصل کرنے وقت کچھ خلفی و برگشتگی ظاہر ہو کیونکہ حق کی جگھوں پر حق۔ سے کام لینے کا خدا بڑا اجر دیتا ہے اور اس کا نتیجہ اچھا ہوتا ہے۔ جس کی نیت درست ہو اور وہ اپنے نفس کا بھلا چاہے تو خدا اسے لوگوں سے بے نیاز کردیتا ہے اور جو شخص اللہ کے ناظر ہونے کے باوجود لوگوں سے اوپری اور بناوٹی اخلاق سے پیش آتا ہے تو اللہ اس کو ذلیل و رسوا کردیتا ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ غیراللہ کے اس ثواب کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو وہ خدا کی دی ہوئی دنیوی روزی اور اس کی رحمت کے

خزانوں سے بخشے ؛ والسلام

آپ کی تقریر: اے لوگو! ایک زمانہ میں میرا خیال تھا کہ جو قرآن پڑھتا ہے وہ اللہ کی خوشنودی اور اس سے بدلہ چاہتا ہے، لیکن اب مجھے کچھ ایسا نظر آرہا ہے کہ بہت سے لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور اس کے ذریعہ لوگوں سے مال و دولت چاہتے ہیں۔ خبردار! اپنی تلاوت اور اپنے اعمال سے صرف خدا کی رضا تلاش کرو۔ جب وحی نازل ہوتی تھی اور آں حضرتؐ ہم میں موجود تھے تو ہم دنیا داروں کو معلوم کرلیا کرتے تھے، مگر اب وحی کا سلسلہ بند ہوگیا ہے اور آں حضرتؐ اس دنیا سے رحلت فرماچکے ہیں۔ لہذا اب میں تمہیں اپنے اس معیار پر جانچ کر شناخت کروں گا کہ جو بظاہر ہمارے ساتھ خیر کرے گا ہم اس کے متعلق اچھا خیال کریں گے اور جو بظاہر ہمارا برا چاہے گا ہم اس کو برا سمجھیں گے اور اس کے عمل کی بناء پر اس سے بغض و عداوت رکھیں گے۔ اپنے دلوں کو ان کی خواہشات سے روکو کیوں کہ وہ بڑے شہوت پرست اور ادھر اُدھر جھانک تانک کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم ان کو نہ روکو گے تو وہ تم کو بدترین مقام پر لے جائیں گے۔ حق اگرچہ بھاری ہے مگر جلد ہضم ہو جاتا ہے اور باطل گو ہلکا ہے لیکن بدہضمی اور بیماری پیدا کرتا ہے۔ یاد رکھو! گناہ کو چھوڑ دینا توبہ کرتے رہنے سے بہتر ہے۔

۴۔ حضرت علی بن ابی طالب

پیدائش اور زندگی کے حالات: امیرالمومنین علیؓ بن ابی طالب ہجرت سے اکیس سال قبل پیدا ہوئے۔ ان کے والد پر سے بارِ عیالداری کو کم کرنے کے لیے ان کی پرورش آں حضرتؐ کے ساتھ آپ کے گھر میں ہوئی۔ جب آں حضرتؐ کو نبوت ملی تو حضرت علیؓ سن بلوغ کے قریب تھے۔ وہ آں حضرتؐ پر ایمان لے آئے اور آپؐ کی محبت دل میں لے کر جوان ہوئے اصول دین ابتدا ہی سے ان کے دل میں جاگزیں ہوچکے تھے۔ ہجرت کی رات انہوں نے رسول اللہؐ کی خاطر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے آپؐ کی تائید و نصرت میں بہت سی نمایاں خدمات انجام دیں۔ علاوہ "تبوک" کے تمام غزوات میں شریک ہوئے کیونکہ اس غزوہ میں آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے گھر والوں کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ جب آں حضرتؐ کا انتقال ہوا تو حضرت علیؓ آپؐ سے قریبی رشتہ داری اور دامادی کی بناء پر خود کو آپؐ کی جانشینی کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے، لیکن جب تمام مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کرلی اور ان کے بعد حضرت عمرؓ ان کے جانشین ہوئے اور پھر باہمی شوریٰ سے بھی ان کی بجائے حضرت عثمانؓ کے خلیفۂ ثالث منتخب ہوئے تو بڑی کشمکش کے بعد اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے انہوں نے یہ سب کچھ برداشت کرلیا۔ شہادت عثمانؓ کے بعد حجاز میں لوگوں نے ان سے بیعت کرلی، لیکن معاویہؓ اور ان کے ساتھ شام والوں نے بیعت نہ کی کیوں کہ وہ حضرت علیؓ سے حضرت عثمانؓ کے قتل اور قاتلین عثمانؓ کا بدلہ نہ لینے پر غصہ تھے۔ پھر اس فتنہ کا بازار گرم ہوگیا جس نے اخوت اسلامی

کی مضبوط گرہیں کھول کر مسلمانوں کی قوت کو کمزور بنا دیا اور انہیں دو ایسے گروہوں میں تقسیم کر دیا جو ایک طویل مدت تک آپس میں قتل و خونریزی کرتے رہے اور بالآخر ان دونوں میں سے کسی ایک کی خلافت مستحکم ہوئے بغیر یہ لڑائی ختم ہو گئی اور تین خارجیوں نے باہم یہ سازش کی کہ اس دور فتنہ کی روح رواں، تین بڑی شخصیتوں یعنی معاویہ، عمرو بن العاص رضؓ اور علی رضؓ کو ختم کر دیا جائے۔ امیرالمومنین ابن ملجم کے حصہ میں آئے، چنانچہ اس نے انہیں بے خبری کے عالم میں، کوفہ کی مسجد میں شہید کر دیا۔ یہ سن ۴۰ھ کا واقعہ ہے، اس وقت ان کی خلافت کو چار (۴) سال اور کچھ دن کم نو (۹) مہینے گذر رہے تھے۔

آپ کے اخلاق اور خداداد صلاحیتیں:۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ قوی ہیکل، گٹھیلے بدن والے، نہایت جنگجو اور دلیر تھے، وہ موت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے، فقہ میں ان کی ذات سند و حجت اور خدا ترسی و تقویٰ میں کامل اسوہ تھی۔ وہ حق کے بارے میں نہایت سخت اور بڑے خود اعتماد تھے۔ دین کے معاملہ میں وہ بڑے کھرے اور بے لاگ تھے۔ اسی طرح دنیوی کاموں میں بھی وہ کسی قسم کی نرمی اور لچک کے قائل نہ تھے۔ اور یہی وہ بلند کردار تھا جو حضرت علی رضؓ کی مخالفت میں تجربہ کار و ہوشیار معاویہ رضؓ کے لیے ممد و معاون ثابت ہوا۔ آں حضرت ؐ کے بعد سلف و خلف میں ہمیں حضرت علی رضؓ سے زیادہ کوئی فصیح و بلیغ نہیں ملتا۔ آپ وہ مرد دانا تھے جس کے بیان میں حکمت کے چشمے ابلتے تھے۔ ایسے مقرر تھے جس کی زبان سے بلاغت کا سیلاب امڈتا تھا۔ ایسے واعظ تھے جو کانوں اور دلوں کو موہ لیتے تھے۔ آپ کی تحریر دقیق اور پختہ دلائل سے پر ہوتی تھی۔ آپ جس موضوع پر چاہتے بول لیتے تھے۔ تمام لوگوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آپ مسلمانوں میں سب سے بڑے مقرر اور بلند ترین انشاء پرداز ہیں۔ جہاد کی ترغیب میں آپ کے خطبے، معاویہ رضؓ کو بھیجے ہوئے مکاتیب، موہ، چمگادڑ اور دنیا کا وصف، نیز اشتر نخعی سے آپ کا عہد نامہ (بشرطیکہ روایت صحیح ہو) ایسی بلند معیار تحریریں ہیں جن کا شمار زبان و ادب عربی کے معجزات اور بے نظیر شاہکاروں میں کیا جائے گا اور ہمارا خیال ہے کہ یہ استعداد ان میں آں حضرت ؐ کی طویل رفاقت و صحبت اور بچپن سے حضور ؐ کی املاء نویسی کی خدمت، نیز آپ ؐ کی حمایت میں تقریریں کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔

آپ کے کلام کا نمونہ:۔ امیرالمومنین کا کلام تین محوروں کے گرد گھومتا ہے خطبات و فرامین، خطوط و رسائل، حکم و نصائح، جن کو اسی ترتیب سے شریف رضی نے ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے اور اس کا نام "نہج البلاغہ" رکھا ہے، کیونکہ بقول اس کے یہ "کتاب اپنے پڑھنے والے کے لیے بلاغت کے دروازے کھولتی اور فصاحت تک پہنچانے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ اس میں عالم و متعلم، راغب و زاہد سب ہی کی ضروریات کا سامان ہے۔ اثنائے کلام میں جا بجا توحید و عدل پر ایسی پر مغز بحثیں ہیں جن سے ہر قسم کی تشنگی کو سیرابی حاصل ہو جاتی ہے اور تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے"۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کتاب کا بیشتر حصہ ان کی طرف غلط منسوب ہے اور بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔

اس سوال پر کہ آپ نے پہلے ہم کو ثالث مقرر کرنے سے منع کیا تھا اور پھر خود ہی اس کی اجازت بھی دے دی، اب ہم نہیں جانتے کہ آپ کی ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات زیادہ صحیح ہے؟"
انہوں نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے جواب دیا: "یہی بیعت سے پھر جانے والے کا بدلہ ہے، بخدا اس وقت جب میں نے تمہیں حکم دے کر اس ناپسندیدہ کام پر مجبور کیا تھا جس میں اللہ نے خیر رکھی تھی۔ اگر تم پختگی سے جم جاتے تو میں تمہاری رہبری کرتا، تم غلط راہ اختیار کرتے تو میں تم کو سیدھی راہ پر لے آتا، اگر تم نہ مانتے تو میں تمہارا تدارک کرتا۔ اور یہ نہایت پختہ شکل ہوتی۔ لیکن میں کس سے کہوں اور کیا کہوں؟ میں چاہتا ہوں کہ تم کو بطور دوا استعمال کروں، اگر تم تو میری بیماری بن گئے ہو۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے جو کانٹے کی کمزوری کو جانتے ہوئے بھی کانٹے کو کانٹے سے نکالے۔ خدا وندا! اس دیرینہ و مہلک مرض نے اطباء کو عاجز کر دیا ہے، اور ڈول کھینچنے والے کنویں کی لمبی رسیوں کو کھینچتے کھینچتے تھک گئے ہیں۔ وہ لوگ کہاں گئے جنہیں اسلام کی طرف بلایا جاتا تھا اور وہ اس کو قبول کر لیتے تھے، قرآن پڑھتے اور مضبوطی سے اس پر قائم رہتے تھے اور جب انہیں جنگ پر اکسایا جاتا تو وہ اس طرح بے قراری سے اس سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتے جس طرح بچہ والی اونٹنیاں اپنے بچوں سے ملنے کے لیے بے تاب ہوتی ہیں، پھر وہ اپنی تلواروں کو میانوں میں سے نکال لیتے اور زمین کے اطراف میں لڑنے کے لیے صف بصف نکل جاتے، کچھ مر جاتے اور کچھ بچ رہتے۔ انہیں نہ زندوں کے بچنے کی خوشی ہوتی نہ مرنے والوں کا غم، رونے کی وجہ سے ان کے چہروں پر زردی ہوتی، سراپا عجز و نیاز یہ ہے میرے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی صفت، ہمیں لازم ہے کہ ان کی یاد میں بے قرار ہو جائیں اور ان کی جدائی پر کف افسوس ملیں۔
شیطان اپنی راہیں تمہارے لیے آسان کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ تمہارے دین کی مضبوط گرہیں ایک ایک کر کے کھول ڈالے، جماعت بندی اور اتحاد کی جگہ تم میں تفرقہ ڈال دے۔ اس کی شرانگیزیوں اور بری چالوں سے بچتے رہو۔ اور جو تم کو نصیحت کرے اس کی بات مان لو اور اس نصیحت کو اپنے دلوں میں مضبوط گرہ باندھ کر رکھ لو۔"

آپ کا کچھ اور کلام:۔

گناہ منہ زور گھوڑے ہیں جن پر گناہ گار سوار ہیں، یہ گھوڑے بے لگام ہیں، جو گناہ گاروں کو لے کر جہنم کی آگ میں چلے جائیں گے۔ تقویٰ سدھائی ہوئی اطاعت شعار سواریاں ہیں جن پر نیک لوگ ان کی لگامیں تھامے سوار ہیں اور وہ انہیں لے کر جنت میں داخل ہو جائیں گی۔ یہاں حق و باطل ساتھ ساتھ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے حامی و مددگار ہیں۔ اگر باطل کی کثرت ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں کیونکہ پرانے زمانے سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے اور اگر حق کی قلت ہے تو یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز جا کر پھر آ جائے۔ جس کے سامنے جنت و جہنم ہیں، وہ بھلا یا گیا ہے۔ تیز رفتار بچ نکلا، آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے والا امیدوار ہوا، اور کوتاہی کرنے والا

جہنم کی آگ میں گرا، دائیں بائیں گمراہ کن راستے ہیں، درمیانی راستہ راہ راست ہے۔ اسی پر قرآن و حدیث کی بنیاد ہے وہی سنت کی گذرگاہ ہے اور اسی پر انجام کا انحصار ہے۔

۴۔ سحبان وائل (متوفی ۵۴ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ سحبان بن زفر بن ایاد نے زمانۂ جاہلیت میں ربیعہ کے خاندان وائل میں پرورش پائی جب اسلام پھیلا تو وہ مسلمان ہوگیا اور معاویہ رضہ سے جا ملا جہاں اس کی بڑی عزت ہوئی اور انہوں نے اسے اپنا خطیب بنالیا۔ سحبان برجستہ گو، پرزور و خوش بیان مقرر تھا۔ تقریر کے تمام طریقوں پر اسے کامل قدرت حاصل تھی۔ اس کی تقریر میں ایسی روانی ہوتی جیسے وہ رٹی ہوئی عبارت پڑھ رہا ہو، اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے وہ خوش بیانی میں ضرب المثل ہے۔

خراسان سے ایک وفد معاویہ رضہ کے پاس آیا تو انہوں نے سحبان کو بلوایا۔ وہ اپنے گھر میں نہ تھا، فوراً ہی اسے تلاش کے بعد حاضر کیا گیا۔ جب وہ آیا تو معاویہ رضہ نے کہا "تقریر کرو" اس نے کہا "میرے لیے عصا لاؤ" لوگوں نے کہا "امیرالمومنین کی موجودگی میں تم عصا سے کیا کروگے؟" اس نے جواب دیا "وہی جو موسیٰ اپنے رب سے باتیں کرتے وقت اپنے عصا سے کرتے تھے" معاویہ رضہ ہنسے اور اس کے لیے عصا لانے کا حکم دیا۔ جب عصا آیا تو اس نے اسے ناپسند کیا اور لات ماردی، چنانچہ لوگوں نے اسے اس کا عصا لاکر دیا۔ پھر اس نے ظہر کی نماز سے عصر کے وقت تک تقریر کی اور اس دوران میں نہ تو کھنکارا، نہ کھانسا، نہ کہیں اٹکا، نہ کہیں سوچنے کے لیے ٹھہرا، نہ کسی موضوع کو تشنہ و نامکمل چھوڑ کر آگے بڑھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر حاضرین حیرت میں رہ گئے۔ پھر معاویہ رضہ نے اسے ہاتھ سے تقریر ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ سحبان نے اشارہ سے کہا کہ مجھے نہ روکیے۔ معاویہ رضہ نے کہا "نماز کا وقت ہوگیا" اس نے کہا نماز میں دیر ہے، ہم حمد و صلوٰۃ اور وعد و وعید میں مشغول ہیں" معاویہ رضہ نے کہا "واقعی تم عرب کے سب سے بڑے خطیب ہو" سحبان نے کہا "نہ صرف عرب کا بلکہ عجم کا اور جن و انس کا بھی!" یہ واقعہ اس کی قوت و جرأت، وسعت معلومات اور قدرت خطابت پر دلیل ہے۔ لیکن اس کی شہرت کے اعتبار سے وہ خطبات جو اس سے منقول ہیں، نہایت کم ہیں۔ شاید جاہ و ریاست میں حصہ نہ لینا، جماعتوں اور سیاست سے دور رہنا، لمبی تقریریں اور ایک ہی موضوع پر بولتے رہنا وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے راویوں نے اس کے خطبات کو چھوڑ دیا۔ اس کی وفات ۵۴ھ خلافت معاویہ میں ہوئی۔

اس کی تقریروں کا نمونہ:۔ دنیا آخرت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور آخرت ہمیشہ رہنے کی جگہ اے لوگو! اپنی گذرگاہ سے دائمی اقامت گاہ کے لیے سامان لے لو، اور جس پر تمہارے بھید آشکارا ہیں اس کے سامنے اپنے پردے چاک نہ کرو۔ اپنے جسموں کے نکلنے سے پہلے دنیا سے اپنے دلوں کو نکال لو۔ تم اس دنیا میں جیتے ہو لیکن دوسری جگہ رہنے کے لیے پیدا کیے

گئے ہو۔ جب آدمی مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں "کیا چھوڑا ؟" اور فرشتے کہتے ہیں "کیا لایا ؟" لہٰذا کچھ اپنے لیے پیشگی روانہ کر دو اور سب یہاں نہ چھوڑ جاؤ کہ وہ تمہارے لیے وبال بن جائے۔

۵۔ زیاد بن ابیہ (متوفی ۵۳ھ)

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ حارث بن کلدہ ثقفی، طبیب عرب کی ایک داشتہ سُمَیّہ نامی تھی اور ایک عُبَید نامی غلام۔ اس نے عبید کی شادی سمیہ سے کر دی۔ ہجرت کے پہلے سال اس کے گھر میں لونڈی سے ایک بچہ پیدا ہوا جس میں دوسری نسل کے آثار تھے۔ یہ بچہ بڑھ کر شائستہ و زیرک ہو گیا۔ ابھی مسلمانوں کی حکومت کچھ بڑھنے اور منظم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس بچہ میں ہوشیاری و قابلیت کے جوہر نظر آنے لگے۔ ابو موسیٰ اشعری رضؓ نے جو حضرت عمر رضؓ کی طرف سے والی کوفہ تھے، اس کو اپنے دفتر میں منشی بنا لیا، جس سے اس کی صلاحیت و مہارت میں چار چاند لگ گئے۔ خلافت عمر رضؓ ہی میں کچھ ایسے معاملات پیش آئے کہ انہوں نے زیاد کو، خیانت اور نا اہلی کی بنا پر نہیں، بلکہ اس خوف سے کہ کہیں وہ اپنی ذہانت و تیزی عقل سے لوگوں میں اثر و رسوخ پیدا نہ کر لے، معزول کرنا چاہا۔ حالانکہ خود عمر رضؓ ہی بڑے بڑے ذمہ داری کے کام اس کے سپرد کر دیتے تھے اور وہ بغیر عجز و تقصیر انہیں انجام دے دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت عمر رضؓ کی موجودگی میں مہاجرین و انصار کے سامنے ایک بے نظیر تقریر کی تو عمرو بن العاص رضؓ نے کہا "سبحان اللہ کیا کہنے ہیں اس نوجوان کے! اگر اس کا باپ قریشی ہوتا تو یہ اپنے عصا سے عربوں کی قیادت کرتا"۔ ابو سفیان اسے اس درجہ چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے قریش کے بڑے بڑے لوگوں میں جن میں حضرت علی رضؓ بھی شامل تھے اس امر کا اعتراف کر لیا کہ زیاد ان کا بیٹا ہے اور یہ کہ جب وہ مشرک تھے تو زیاد کی ماں ان سے ملی تھی۔ لیکن حضرت عمر رضؓ کے خوف سے انہوں نے اسے اپنے سلسلۂ نسب میں داخل نہیں کیا۔ جب امیر المؤمنین حضرت علی رضؓ کو خلافت ملی تو انہوں نے زیاد کی تنظیمی صلاحیت، پختگی رائے اور فصاحت لسان کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے گورنر بنا دیا۔ انہوں نے فضا کو حضرت علی رضؓ کے لیے سازگار بنایا، سرحدوں کو مستحکم کیا اور سیاست میں حکمت عملی سے کام لیا۔ معاویہ رضؓ نے چاہا کہ انہیں اپنا طرفدار بنا لیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے، تا آنکہ حضرت علی رضؓ شہید کر دیئے گئے۔ اس وقت پھر معاویہ رضؓ نے یہ چاہا کہ ان کی ہمدردی اپنے ساتھ کر لے اور ان کو اپنے باپ کی طرف منسوب کر کے اپنا بھائی بنا لے۔ چنانچہ وہ اس کے بعد زیاد بن ابی سفیان کے نام سے پکارا جانے لگا، لیکن بہت سے لوگ اُس کے اس نسب کو تسلیم نہیں کرتے۔ پھر معاویہ رضؓ نے انہیں کوفہ و بصرہ کا گورنر مقرر کر دیا اور یہی پہلا شخص تھا جسے بیک وقت دونوں جگہوں کا گورنر بنایا گیا۔ وہ چھ ماہ بصرہ اور چھ ماہ کوفہ میں رہا کرتا۔ اس کی وفات ۵۳ھ میں طاعون سے ہوئی۔

اس کے اخلاق اور خدا داد صلاحیتیں:- زیاد بڑے دانشمند، ذہین، اور خوش بیان تھے۔ ان کے متعلق شعبی نے کہا ہے "میں نے جب کسی مقرر کو ممبر پر خوش بیانی کرتے سنا تو میرا جی چاہا کہ اب وہ خاموش ہو جائے، تاکہ کہیں زیادہ بولنے سے تقریر کا لطف نہ جاتا رہے، الا زیاد کہ وہ جتنا زیادہ بولتے تھے اتنا ہی بیان دلچسپ و رنگین اور عمدہ ہوتا جاتا تھا"

زیاد حکومت بنی امیہ کے سب سے مضبوط ستون تھے۔ معاویہ نے انہیں بڑے بڑے مشکل کاموں اور آزمائشوں میں ڈالا، مگر انہوں نے تمام ابتری دور کر کے حالات پر قابو پا لیا اور معاویہ رضہ کی قوت و اقتدار کو مستحکم کر دیا۔ انہوں نے سزا دینے میں بڑی سختیاں کیں محض تہمت کی بنا پر گرفت کر لیتے، اور صرف معمولی شبہ پر سزا دے دیتے۔ برمخالفت کرنے والے کو قتل کرڈالتے۔ اور خفیہ دشمنی کرنے والے سے ربط و تعلق قائم رکھتے۔ لوگ ان سے اس قدر مرعوب تھے کہ انہیں آپس میں ایک دوسرے کی شرارت کا قطعاً خوف نہ رہا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ اگر کسی شخص کے ہاتھ سے کوئی چیز گر پڑتی تو اسے کوئی نہ چھیڑتا تاآنکہ اس کا مالک خود ہی آکر اسے اٹھا لیتا تھا۔ امن و بے خوفی کی وجہ سے کوئی اپنا دروازہ بند نہ رکھتا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے اسلام میں جنگی قانون (مارشل لاء) کے نفاذ کا اعلان اپنے اس مشہور نامکمل خطبہ[1] میں کیا، جو انہوں نے بصرہ پہنچنے پر دیا تھا:-

اس کے کلام کا نمونہ نامکمل خطبہ: اما بعد، جاہلیت خالصہ، اندھی گمراہی، اور آگ میں لے جانے والی سرکشی، جس میں تمہارے نادان اور دانشمند سب پڑے ہوئے ہیں، وہ چیزیں ہیں چھوٹے تباہ ہو جاتے ہیں اور بڑے ان سے بچ کر نہیں نکلتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کتاب اللہ کا مطالعہ ہی نہیں کیا اور اللہ نے اطاعت شعار بندوں کے لیے جو اجر و ثواب اور نافرمانوں کے لیے جو سخت عذاب ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی میں رکھا ہے وہ نہیں سنا۔ تم میں سے ہر ایک کی آنکھ دنیا پر لگی ہوئی ہے۔ تمہارے کانوں میں خواہشات کی صدائیں گونج رہی ہیں، اور تم فانی حیات کو ابدی حیات پر ترجیح دے رہو۔ تم یہ بھولے ہوئے ہو کہ تم نے کمزور پر ظلم روا رکھ کر دن دھاڑے کمزور لوٹی ہوئی دکھیاری عورت کو بے مدد چھوڑ کر ـــ حالانکہ دشمن بکثرت اور متحد ہیں ـــ اسلام میں ایک ایسی بری مثال قائم کی ہے جس کی نظیر تم سے پہلے کہیں نہیں مل سکتی۔ کیا تم میں روک تھام کرنے والے نہیں جو سرکشوں اور راہوں کو شب خون کرنے اور دن میں لوٹ مار کرنے سے روکیں؟ تم نے رشتہ داری کا پاس رکھا، اور دین کو چھوڑ دیا ہے۔ بغیر کسی معقول وجہ کے تم معذرتیں پیش کرتے ہو، خلاف شرع اعمال اپنے سامنے ہوتے دیکھ کر چشم پوشی کرتے ہو۔ ہر شخص اپنے نادان و مجرم سے اس طرح بے توجہی برتتا ہے گویا اسے نہ عاقبت کا خوف ہے نہ قیامت کی امید۔ تم لوگ ارباب عقل نہیں۔ تم بے وقوفوں کی پیروی کرتے ہو، تم نے ان کو ڈھیل دے کر اس قدر دلیر کر دیا ہے کہ وہ اسلامی قوانین

---

[1] وہ خطبہ جو حمد و ثنا سے شروع نہ کیا جائے عربی میں "بتراء" کہلاتا ہے جس کے معنے نامکمل و ناقص ہوتے ہیں۔

کی خلاف ورزی کرنے لگے ہیں اور انہوں نے تمہاری آڑ لے کر بدمعاشی کے اڈے بنا لیے ہیں۔ مجھ پر اس وقت تک کھانا پینا حرام ہے جب تک میں ان سب اڈوں کو منہدم نہ کر دوں یا جلا نہ ڈالوں۔ میرا خیال ہے کہ اس حالت کا آغاز درست ہوئے بغیر انجام نہیں سدھرے گا۔ اس ابتری کو ختم کرنے کے لیے ہم ایسی نرمی برتیں گے جس میں ضعف نہ ہو، اور ایسی سختی جس میں بیجا جبر و تنگی نہ ہو۔ اور بخدا میں غلام کے عوض آقا کو، مسافر کے عوض مقیم کو مجرم کے عوض بری کو، بیمار کے عوض تندرست کو ضرور پکڑوں گا، حتیٰ کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی سے ملے گا تو وہ کہے گا کہ جس کو مرنا تھا وہ مر گیا، اب تم تو بچنے کی فکر کرو۔ حاکم کا جھوٹ بہت مضر اور جلد مشہور ہو جاتا ہے اگر تم میرا جھوٹ پکڑ لو تو تم کو میری نافرمانی جائز ہے، اور اگر تم مجھ سے کوئی جھوٹ سنو تو اس کی گرفت کرو، اس سلسلہ میں مجھ پر اعتراض کرو اور سمجھ لو کہ میرے پاس اس طرح کے اور بھی جھوٹ ہیں۔

تم میں سے جس کے گھر میں نقب لگے گی اس کے ضائع شدہ مال کا میں ذمہ دار ہوں۔ دیکھو میں راتوں کو چوری اور حملہ کرنے والوں کا سخت مخالف ہوں۔ جو بھی رات کو حملہ کرتے ہوئے پکڑا گیا اور میرے پاس آیا تو میں اس کو مار ڈالوں گا۔ اس سزا کے نافذ کرنے میں صرف اس قدر مہلت ہے کہ مخبر کوفہ پہنچ کر یہاں واپس آ جائے۔ اور دیکھو میں تمہیں جاہلیت کے تعصب بھرے نعرے لگانے سے منع کرتا ہوں، اور جس کو جاہلیت کے نعرے لگاتے ہوئے پاؤں گا اس کی زبان کاٹ دوں گا۔ تم نے بہت سی بدعتیں ایجاد کی ہیں، اور ہم نے بھی ان کی نئی نئی سزائیں مقرر کی ہیں، جو کسی قوم کو ڈبوئے گا ہم اسے ڈبو دیں گے، جو کسی قوم کو جلائے گا ہم اسے جلا دیں گے، جو کسی کے گھر میں نقب لگائے گا ہم اس کے دل میں نقب لگائیں گے، اور جو کسی کی قبر کھودے گا ہم اس قبر میں اس کو زندہ دفن کر دیں گے۔ تم اپنے ہاتھوں اور زبانوں کو مجھ سے روکو، میں بھی اپنے ہاتھ اور زبان کو تم سے روکوں گا۔ تم میں سے کسی میں عوام کے طریقہ کے خلاف کوئی شک نظر نہ آنے پائے ورنہ میں اس کی گردن مار دوں گا۔

میرے اور کچھ لوگوں کے درمیان قدیمی عداوتیں تھیں جنہیں میں نکال چکا ہوں، اور پیروں تلے روند چکا ہوں، اگر مجھے یہ معلوم ہوگا کہ تم میں سے کوئی میری دشمنی کی آگ سے اندر ہی اندر جل مرا تو بھی میں اس کا پردہ چاک اور راز فاش نہ کروں گا تا آنکہ وہ علی الاعلان میرے مقابلہ پر نہ اتر آئے، تب میں اسے نہ چھوڑوں گا۔ تم از سر نو اپنے کاموں کو شروع کرو، اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرو، بہت سے ناداز و غمگین ہمارے آنے سے خوش ہو جائیں گے اور بہت سے خوش حال کبیدہ خاطر۔

اے لوگو! ہم تمہارے نگران و فرمانروا بن گئے ہیں، ہم خدا کی عطا کردہ طاقت سے تم پر حکمرانی کریں گے اور اس کے بخشے ہوئے مال سے تمہاری مدافعت و حفاظت کریں گے۔ تمہارا فرض ہے کہ ہماری بات سنو، اور ہماری مرضی کی باتوں میں ہماری اطاعت کرو، اور ہمارا فرض ہے کہ تمہارے ساتھ عدل و انصاف کریں، لہٰذا ہمارے عدل اور مال کو ہم سے اشتراک عمل کر کے اپنے لیے واجب کر لو، اور بخدا تم میں سے بہت سے میرے ہاتھ سے مرنے والے ہیں، ہر شخص ڈرتا ہے کہ کہیں وہ میرے ہاتھ سے

قتل ہونے والوں میں نہ ہوتے۔

۶ - حجاج بن یوسف ثقفی (۴۱ - ۹۵ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات: ابو محمد حجاج بن یوسف ثقفی ۴۱ھ میں ناداری وگمنامی میں پیدا ہوا۔ بچپن کی تعلیم اپنے باپ کے ساتھ رہ کر طائف میں حاصل کی، لیکن اس کے پرشوق و بلند ہمت نفس نے اسے پستی سے بالاتر رکھا، اس کی ذکاوت وزیرکی کو دیکھ کر روح بن زنباع نے جو عبدالملک بن مروان کا مددگار تھا اسے اپنے سپاہیوں میں بھرتی کر لیا۔ خلیفہ نے اپنے لشکر میں ابتری دیکھی تو روح بن زنباع سے اس امر کی شکایت کی، اس وقت انہوں نے خلیفہ کو حجاج کا نام بتایا، اور خلیفہ نے اسے اپنی فوج کا افسر مقرر کر دیا۔ اس نے تمام فوج کو منظم کیا، اور اسے پوری طرح قابو میں لاکر مطیع کر لیا۔ پھر عبد اللہ بن زبیر سے لڑنے والی فوجوں کی قیادت کے باعث اس کی شہرت عام ہوگئی۔ اس نے عبد اللہ بن زبیر کو مکہ کا محاصرہ کر کے شہید کیا اور ان کی حکومت ختم کر دی، جس کی وجہ سے ان کی قابلیت مسلم اور عبدالملک کی نظر میں ان کا مرتبہ بلند ہوگیا۔ پھر انہوں نے حجاج کو عراق کا گورنر بنا دیا، جہاں شیعی فتنوں کے باعث ابتری کا دور دورہ تھا اور اندر ہی اندر خوارج کی بغاوت کا مواد پک رہا تھا، چنانچہ وہ عراقیوں کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آیا۔ اس نے ان کی گردنوں کو جھکا دیا، ان کی فتنہ انگیزیوں کو دبا دیا اور بالآخر ان کو جماعت کے دائرہ میں اس طرح لے آیا کہ وہ ان کی لاشوں کو ٹھکرا رہا تھا اور ان کے خون میں غوطے مار رہا تھا۔ پھر وہ بقیہ تمام عمر عراق میں عبدالملک اور اس کے بیٹے ولید کی حکومت کا بنیادی ستون بنا رہا۔ حکومت کا نظم ونسق برقرار رکھتا اور اس میں توسیع کرتا رہتا تاآنکہ اس نے شام اور چین کے درمیانی تمام علاقے سر کر لیے اور ۹۵ھ میں بمقام واسط انتقال کیا۔

حجاج سیادت پسند اور اقتدار کا دلدادہ تھا۔ اس نے ان دونوں خواہشوں کو حاصل کرنے کے لیے ظلم وتشدد کا راستہ اختیار اور فصاحت وقوت کو آلۂ کار بنایا۔ خدائے تعالیٰ نے اسے زور بیان اور قوت قلب کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ بالآخر اسے زبردست اقتدار اور کامل فرمانروائی حاصل ہوگئی۔ ایک دن عبدالملک نے اس سے کہا "ہر شخص اپنے عیبوں کو جانتا ہے، تم میرے سامنے اپنے عیوب بلاکم وکاست بیان کرو" اس نے کہا "میں بڑا ضدی، جھگڑالو، کینہ ور اور حاسد ہوں اور جب کسی حاکم بالادست میں یہ صفات ہوں تو وہ کھیتی اور نسل کو غارت کر دیتا ہے۔ الایہ کہ لوگ اس کے مطیع و فرمانبردار ہو جائیں"۔ وہ بڑا خوش بیان اور قوی الحجت تھا۔ اس کے ہم عصروں میں کوئی اس کی برابری نہ کر سکتا تھا۔ مالک بن دینار کہتے ہیں "میں نے حجاج سے زیادہ اثر انگیز وخوش بیان مقرر نہیں دیکھا۔ جب وہ ممبر پر کھڑے ہو کر عراقیوں کے ساتھ اپنے احسانات وعفو کا ذکر چھیڑتا اور اس کے مقابلہ میں عراقیوں کی زیادتیاں اور بدسلوکیاں بیان کرتا تو میں اسے سچا اور انہیں جھوٹا سمجھنے لگتا تھا، حالانکہ اس نے ان میں

سے ایک لاکھ بیس ہزار کو قید میں بند کر کے مار ڈالا تھا اور جب وہ مرا تو اس کے قید خانوں میں پچاس ہزار مرد اور تیس ہزار عورتیں قید تھیں۔"

اس کے خطبات کا نمونہ:۔ جب حجاج عراق کا گورنر بنا تو وہ سر پر عمامہ باندھ کر مسجد میں اس اس طرح پہنچا کہ اس کے چہرہ کا زیادہ حصہ عمامہ میں چھپ گیا تھا۔ اس کے گلے میں تلوار اور شانہ پر کمان لٹکی ہوئی تھی۔ وہ ممبر پر چڑھ گیا اور تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ لوگ آپس میں کہنے لگے، برا ہو بنو امیہ کا کہ انھوں نے ایسے (گونگے) شخص کو عراق کا گورنر بنایا۔ عمیر بن ضابی برجمی نے تو اسے پتھر مارنے کا ارادہ کیا مگر لوگوں نے نتیجہ معلوم کرنے کے لیے اسے روک دیا۔ جب حجاج نے تمام لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف اٹھتی دیکھیں تو اپنے چہرہ سے عمامہ ہٹاتے ہوئے کہا:۔

أنا ابن جلاء و طلاع الثنايا   متى اضع العمامة تعرفوني

میں بڑا مشہور اور تجربہ کار شخص ہوں۔ جب اپنا عمامہ اتاروں گا تو تم مجھے شناخت کر لوگے۔

اے کوفیو! میں دیکھ رہا ہوں کہ سروں کی کھیتی پک کر تیار ہو گئی ہے اور اب اس کو کاٹنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ میں اسے کاٹنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے عماموں اور داڑھیوں میں خون لگا ہوا نظر آ رہا ہے:۔

هذا أوان الشد فاشتدی زيم   قد لفها الليل بسواق حطم

ليس براعي ابل ولا غنم   ولا بجزّار على ظهر وضم

اے زیم (اونٹنی) یہ تیز دوڑنے کا وقت ہے، لہذا تیز دوڑ، رات میں اس کو ایک تیز ہانکنے والا ملا ہے جو بکریوں اور اونٹوں کو چرانے والا نہیں ہے نہ قصائی ہے جو کندے پر گوشت کاٹتا ہے۔

قد لفها الليل بعصلبي   اروع خراج من الدوي

مهاجر ليس بأعرابي

قد شمرت عن ساقها فشدوا   وجدت الحرب بكم فجدوا

والقوس فيها وتر عُرُدّ   مثل ذراع البكر او اشد

رات میں اس کو ایک سخت، ہوشیار، صحرائی گذرگاہوں سے باخبر ہانکنے والا ملا ہے جو مہاجر ہے اور عرب کا بدو نہیں ہے۔ جنگ تیز ہو گئی ہے۔ دوڑو! اور بہت نازک شکل اختیار کر گئی ہے لہذا تم بھی سنجیدگی سے جدوجہد کرو۔ سخت کمانیں چڑھی ہوئی ہیں جو نوجوان اونٹ کے ہاتھ کی طرح یا اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ اب جو سر پر آن پڑا ہے اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

اے عراقیو! مجھے کسی چیز سے خوفزدہ نہیں کیا جا سکتا نہ مجھ پر زور یا دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ میں بہت جانچ پڑتال کے بعد ہوشیار و لائق ثابت ہوا ہوں اور بڑے تجربہ کے بعد ڈھونڈ کر منتخب

کیا گیا ہوں۔ امیرالمومنین اطال اللہ بقاءہ نے اپنے ترکش کے تمام تیر نکالے پھر ان کی لکڑیوں کو جانچا اور مجھے سب سے زیادہ تلخ اور مضبوط لکڑی کا تیر پاکر تمہارے اوپر مسلط کر دیا کیونکہ تم فتنوں میں پیش پیش ہو اور گمراہیوں میں پڑے رہتے ہو۔

بخدا! میں تمہیں اس طرح گٹھڑی میں باندھ دوں گا جس طرح ببول کی لکڑیوں کا گٹھا باندھا جاتا ہے اور اس طرح بے دردی سے ماروں گا جس طرح پرائے اونٹوں کو مارا جاتا ہے۔ تمہاری مثال ان بستی والوں کی سی ہے جن کو ہر جگہ سے امن و اطمینان کے ساتھ رزق ملتا تھا لیکن انہوں نے خدا کے انعامات و احسانات کی قدر نہ کی تو اللہ نے ان کے اعمال کی سزا میں انہیں بھوک اور خوف میں مبتلا کر دیا۔

بخدا میں جو کچھ کہوں گا اسے پورا کروں گا، جس کا ارادہ کروں گا اسے پورا کر کے چھوڑوں گا اور جو کچھ کروں گا وہ ٹھیک اور مناسب کروں گا۔ امیرالمومنین نے مجھے حکم دے دیا کہ تمہارے وظیفے تم کو دے دوں اور تم کو تمہارے دشمنوں سے لڑائی کے لیے مہلب بن ابی صفرہ کے ساتھ بھیج دوں، بخدا جس کو میں وظیفہ وصول کرنے کے تین دن بعد اس کے گھر میں بیٹھا پاؤں گا اس کی گردن اڑا دوں گا۔

انشاپردازی

صدر اول کے عرب فرمانروا فطری طور پر انشاء پردانہ واقع ہوئے تھے۔ وہ جو مضمون چاہتے مختصر پیرایہ اور شستہ وسلیس عبارت میں املاء کرا دیتے یا خود لکھ دیا کرتے تھے۔ جب خلافت میں ترقی ہوئی اور آمدنی کے ذرائع بڑھے تو انہیں دفتری کارروائیوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور حضرت عمرؓ نے تمام آمد و خرچ کو قلمبند کرنے کے لیے دفاتر کا نظام جاری کیا۔ پھر خلفاء نے محرری کے لیے عربوں، موالیوں اور عربوں میں شامل ہونے والی دیگر قوموں سے مدد لی، اور ہر صوبہ میں محصول کا حساب کتاب وہاں کے باشندوں کی زبانوں میں ہوتا رہا۔ عراق و ایران میں فارسی، شام میں یونانی اور مصر میں قبطی زبانوں میں، تا آں کہ عربوں کی ایک جماعت اس فن کو بخوبی سیکھ گئی اور انہوں نے دفتری محرروں کی ضرورت کو پورا کر دیا۔[1] حتیٰ کہ عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید کے زمانہ تک تمام محصولات کا حساب کتاب عربی زبان میں ہونے لگا تھا۔[2]

پھر جب خلفاء پر حکومت کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں تو انہوں نے عربوں اور موالیوں میں سے ماہر انشاء پردازوں کی خدمات حاصل کیں جن میں سے بعض ایران و روم کے قواعد انشاء سے بھی واقف تھے، چنانچہ انہوں نے خطوط و رسائل نویسی کے لیے کچھ ایسے قواعد و ضوابط مرتب کیے جن سے رسائل نویسی ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کرنے لگا تھا۔

اس عہد کے طرز بیان میں پرشوکت الفاظ، بڑی بڑی ترکیبیں، موضوع کی پابندی، تطویل و تکلف نیز مبالغہ آمیزی سے اجتناب، ضمیروں کو قاعدہ کے مطابق استعمال کرنا، واحد متکلم و مخاطب کے لیے جمع کی ضمیریں نہ استعمال کرنا، بسم اللہ اور اس کے بعد من فلان الی فلان اور اما بعد (فلاں شخص کی طرف سے فلاں شخص کو، اما بعد) یا انی احمد الیک اللہ الذی لا الہ الا ھو (میں تیرے سامنے خدا کی تعریف بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) سے ابتداء اور والسلام (اور تم بسلامت رہو) یا والسلام علی من اتبع الھدی (جو ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلامتی ہو)

---

[1] یہاں دفتر سے مراد صرف محصولات کے دفتر ہیں کیونکہ فوجی دفاتر اور دیگر تحریری کاروبار سب ابتداء ہی سے عربی میں ہوا کرتے تھے۔

[2] عراق میں صالح بن عبد الرحمٰن نے حجاج کی گورنری کے زمانہ میں وہاں کے دفتر محصولات کو عربی زبان میں منتقل کیا اور شام میں خلافت ولید بن عبد الملک میں ابو ثابت سلیمان بن سعد رسائل نویس نے، اور بصرہ میں بھی خلافت ولید بن عبد الملک میں سب سے پہلے یہ عہدہ ابن بربوع فزاری حمصی نے حاصل کیا۔

پر خاتمہ شامل ہیں۔ جب ولید بن عبدالملک خلیفہ ہوئے تو انہوں نے خطوط کے کاغذات خوشنما بنانے، اعلیٰ اور پر تکلف القاب سے خطاب کرنے اور عامیانہ طرز تحریر سے اجتناب کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کے بعد یہ طریقہ رائج رہا تا آنکہ عمر بن عبدالعزیز اور ان کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوئے اور انہوں نے تقوائی شعاری و بدعت دشمنی کی بناء پر سلف کے قدیم طرز تحریر کو اختیار کر لیا۔

لیکن نظام کائنات اور طبع انسانی نے اس زمانہ میں یہ جمود و قدامت پرستی گوارا نہ کی اور عبدالحمید انشاء پرداز آیا، جس نے رسائل میں تطویل و پر نویسی، خوشنمائی اور پاکیزگی کی بناء ڈالی رسائل کے شروع اس نے حمد و ثناء کو طول دیا، چنانچہ اس کے بعد تمام انشاء پردازوں نے اس کے طرز تحریر کی تقلید کی۔ الغرض ابتدائی چالیس سال میں عربی نثر دین کی برکات و عنایات کے طفیل بہت آگے بڑھ گئی۔ وہ چھوٹے غیر مربوط مسجع جملوں اور مختصر و فرسودہ مضامین سے نکل کر اس جدید اسلوب میں تبدیل ہو گئی جس کے جملے کم، عبارت رواں، موضوعات مختلف اور انداز بیان پر اثر تھا، جس کی مثالیں آپ حضرت علیؓ کے رسائل و خطبات میں ملاحظہ کریں گے۔ اور یہ نثر کی ایسی تیز رفتار ترقی ہے جس کی نظیر شاعری میں نہیں ملتی۔

انشاء پرداز
عبدالحمید بن یحییٰ

پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ ابو غالب عبدالحمید بن یحییٰ شام میں غیر عربی نسل میں پیدا ہوا، قرابتداری کی بناء پر بنو عامر سے منسوب ہے۔ اس نے سالم سے انشاء پردازی سیکھ کر کمال حاصل کیا جو ہشام بن عبدالملک کے آزاد کردہ غلام اور پرائیویٹ سکریٹری تھے پھر وہ شہر شہر جا کر بچوں کو پڑھانے لگا، تا آنکہ مروان بن عبدالملک کو اس کی قابلیت کا علم ہوا اور انہوں نے اسے اپنی آرمینیا کی گورنری کے زمانہ میں اپنا سکریٹری بنا لیا۔ وہ اس کے خطوط و فرامین لکھتا رہا اور اس کی نظر میں بہت مقبول و باعزت ہو گیا حتیٰ کہ دونوں میں بڑی گہری دوستی ہو گئی۔ پھر جب مروان کو خوشخبری ملی کہ شامیوں نے خلافت کے لیے اس سے بیعت کر لی ہے تو اس نے اور اس کے تمام ساتھیوں نے سوائے عبدالحمید کے سجدۂ شکر ادا کیا۔ مروان نے اس سے کہا "تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟" اس نے جواب دیا "میں سجدہ کیوں کروں؟ کیا اس خوشی میں کہ آپ ہمارے ساتھ تھے اور اب ہم میں سے اُٹھ کر دور جا رہے ہیں؟" اس نے کہا "یہی بات ہے تو تم بھی میرے ہمراہ چلو۔" اس نے کہا "اب سجدہ بھلا معلوم ہوگا" اور فوراً سجدہ میں گر پڑا۔ پھر مروان نے اسے اپنی حکومت کا سکریٹری مقرر کر دیا اور جب (عباسی) سیاہ جھنڈوں کے لہرانے، ابو مسلم کے قریب آنے اور متواتر شکست نے اس کو خوفزدہ کر دیا تو اس نے عبدالحمید

سے کہا "مجھے ضرورت ہے کہ تم میرے دشمن سے جا ملو اور مجھ سے بے وفائی کا اظہار کرو، کیونکہ تمہارے علم و ادب سے ان کو دلچسپی اور تمہاری انشاء پردازی کی انہیں ضرورت، ایسی چیزیں ہیں جو ان کو تم سے خوش ظن کر دیں گی۔ اگر تم زندگی میں میری مدد کر سکو تو نبھا ورنہ میرے مرنے کے بعد تم میری عزت و حرمت کو ضرور بچا سکو گے۔ عبدالحمید نے کہا آپ نے مجھے جو مشورہ دیا ہے وہ ہر دو صورت میں آپ کے لیے بہت سودمند اور میرے لیے بہت تکلیف دہ اور بدنام کن ہوگا، اب میرے لیے سوائے صبر کے کوئی چارہ کار نہیں، تا آنکہ اللہ اس مشکل کو آپ سے دور کر دے یا میں بھی آپ کے ساتھ قتل کر دیا جاؤں اور یہ شعر پڑھا:-

أسر وفاء ثم اظهر غدرة ... فمن لی بعذر یوسع الناس ظاهره؟

بباطن آپ کا وفادار رہوں اور بظاہر آپ سے دغا کروں تو لوگوں کے سامنے میرے اس ظاہری عمل کا کون عذر پیش کرے گا؟-

پھر وہ مروان کے ساتھ ہی رہا، تا آنکہ وہ مصر میں قتل کر دیے گئے اور عبدالحمید بھاگ کر اپنے دوست ابن المقفع کے پاس بحرین میں پناہ گزین ہو گیا لیکن جب وہ اس کے گھر میں تھا اچانک کچھ سپاہی سمن لے کر آن پہنچے، سرکاری آدمیوں نے پوچھا "تم میں سے عبدالحمید کون ہے؟" ان میں سے ہر ایک نے اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے کہا کہ میں عبدالحمید ہوں، سپاہی ابن المقفع کو قتل ہی کرنے والے تھے کہ عبدالحمید چلایا ذرا ٹھہرو! ہم میں سے ہر ایک کی کچھ علامتیں ہیں لہذا تم میں سے کچھ ہماری نگرانی کریں اور کچھ اپنے ان افسروں کے پاس واپس جا کر ہماری علامتیں بیان کریں جنہوں نے تمہیں بھیجا ہے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور عبدالحمید کو شناخت کے بعد پکڑ کر ۱۳۲ھ میں قتل کر دیا گیا۔

عربی انشاء پردازی میں اس کی جدت و تاثیر:- عبدالحمید سے قبل انشاء پردازی محض سادہ طریقہ پر لکھی ہوئی بات ہوتی تھی جس کا کوئی قاعدہ مرتب نہ ہوا تھا، نہ اس نے فنی شکل اختیار کی تھی، نہ شریف پیشوں میں اس کا شمار تھا۔ جب عبدالحمید نے اس پیشہ کو سنبھالا تو حالات اور انسانی طبائع ایک جدید طرز انشاء کے لیے بالکل تیار تھے۔ مملکت کی وسعت، تمدن کا نشو و نما، نثر و خطابت کا عروج، عربی کا فارسی سے قرب، عبدالحمید کا سالم مولیٰ ہشام سے تعلیم حاصل کرنا اور ابن المقفع سے گہرے مراسم وہ چیزیں تھیں جنہوں نے عبدالحمید کے اسلوب میں یہ جدید طرز پیدا کیا۔ اس نے مخاطب کے حسب حال خطاب میں رعایتیں کیں، حالات کے مطابق مضمون میں طول و اختصار کو مدنظر رکھا اور مضمون کے ابتداء و انتہاء میں موضوع کی مناسبت سے نیرنگی پیدا کی۔ رسائل کے شروع میں حمد و ثناء کو طول دیا۔ مقبولیت کی بناء تمام رسائل نگاروں نے اس کے اسلوب کی پیروی کی جس سے انشاء پردازی ایک مرتب و منظم قاعدہ و با اصول فن بن گیا۔

اس کا اسلوب نگارش:- عبد الحمید کا طرز بیان نہایت شیریں، سلجھا ہوا، اور خوشنما ہے، جو جذبات و احساسات کو اپنی طرف مائل کر کے عقلوں پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ لوگ اس کی تحریر کے اثر کو خوب جانتے تھے، حتیٰ کہ ابو مسلم خراسانی نے اس کا وہ خط جو اس نے مروان کی طرف سے لکھا تھا اس خوف سے پڑھنا بھی گوارا نہ کیا کہ کہیں وہ اس کو پڑھ کر مروان کا حامی و طرفدار نہ بن جائے اور اسے بے پڑھے ہی جلا دیا، پھر ایک پرزہ پر اس کے جواب مروان کو یہ لکھ بھیجا:-

محا السيف أسطار البلاغة وانتحى عليك ليوث الغاب من كل جانب

بلاغت و فصاحت کی سطروں کو تلواریں مٹا دیں گی، اور کچھار کے شیر ہر سمت سے تجھ پر حملہ آور ہوں گے۔

اس کی نثر کا نمونہ:- جب وہ مروان کے ساتھ شکست کھا کر بھاگ رہا تھا تو اپنے گھر والوں کو یہ خط لکھا:-

"اما بعد، اللہ تعالیٰ نے دنیا کو تکلیف و آرام سے گھیر رکھا ہے۔ جس کی قسمت یاوری کرتی ہے وہ یہاں آرام سے رہتا ہے، اور جسے دنیا اپنے نکیلے دانتوں سے کاٹتی ہے وہ غصہ ہو کر اس کے نقائص و عیوب نکالتا اور گلے شکوے کرنے لگتا ہے۔ اس دنیا نے ہم کو بہت دنوں عیش و آرام میں رکھ کر اپنا دودھ پلایا، جسے ہم خوب مزے لے لے کر پیتے رہے۔ اور اب وہ ہم سے بگڑ کر متنفر ہو گئی ہے، ہم سے منہ پھیر کر ہمیں لات مار رہی ہے، اس کی خوشی رنج سے، اور نرمی درشتی سے بدل گئی ہے، اس نے ہمیں پردیس میں بے یار و مددگار کر دیا، گھر دور ہو گیا ہے اور حالات ناسازگار ہیں، میں خط لکھ رہا ہوں اور زمانہ ہمیں تم سے دور تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ تمہاری یاد دل کو بے چین و بے قرار کر رہی ہے، اگر یہ آفت سلامتی سے بدل کر ختم ہو گئی تو ہم تم ملیں گے، اور اگر دشمنوں کے نکیلے پنجوں نے ہمیں آن دبوچا تو ہم قید کی ذلت کے ساتھ تمہارے پاس واپس آئیں گے، اور ذلت بدترین ساتھی ہے۔ اس قادر مطلق سے جس کے ہاتھ میں ذلت و عزت ہے اور جسے وہ چاہتا ہے ذلیل یا باعزت کرتا ہے دست بدعا ہوں کہ وہ ہمیں اور تمہیں پر امن جگہ میں دین و بدن کی سلامتی کے ساتھ ملائے۔ وہی رب العلمین اور ارحم الراحمین ہے"

انشاء پردازوں کو مشورہ دیتے ہوئے اس نے جو کچھ کہا ہے اس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ مضمون نویسی اس زمانہ میں فنی شکل اختیار کر گئی تھی، اور تمام انشاء پرداز ایک جماعت بن گئے تھے:-

"........ خبردار! دیکھو تکبر، اوچھا پن، رکاکت اور بڑائی کے دعووں سے احتراز کرو کیونکہ یہ بلا سبب دشمنی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اپنے ہنر کی ترقی کے لیے سب مل کر خالصتاً لوجہ اللہ جدت کرو۔ اور اس کی ایسی خیر خواہی کرو جو تمہارے سلف کے اہل فضل و عدل و شرافت کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ اور اگر تم میں سے کسی شخص کے لیے زمانہ ناسازگار ہو جائے تو اس کے ساتھ تعاون

وہمدردی کرو، تاآنکہ وہ خوش حال ہو جائے۔ اور اگر بڑھاپے کے باعث تم میں سے کوئی مجبور ہو جائے اور احباب سے نہ مل سکے تو سب مل کر اس سے ملاقات کرو، اس کا احترام کرو، اور اس کے تجربہ اور پختہ معلومات سے استفادہ کرو!"

ایک شخص کی سفارش کرتے ہوئے اس نے لکھا:۔

میرے نامہ بر کا آپ پر وہی حق ہے جو اس کا مجھ پر ہے۔ اس نے آپ سے اپنی امید وابستہ کی اور مجھے اپنی حاجت برآری کا وسیلہ بنایا۔ میں نے اس کی ضرورت پوری کر دی۔ اب آپ بھی اس کی امید بر لائیے۔"

اس دور کی نثر کے نمونے

حکیمانہ مقولے: حضرت ابوبکرؓ کے حکیمانہ مقولے:۔

نیکیاں ذلت کی تباہیوں سے بچا لیتی ہیں موت اپنے بعد آنے والی شدتوں سے آسان اور اپنے پہلے گذرنے والی تکالیف سے زیادہ سخت ہے۔ یہ تین خصلتیں جس میں ہوں گی وہ اس کے لیے وبال ہوں گی۔ سرکشی۔ عہد شکنی اور مکاری۔

حضرت عمرؓ کے پر حکمت مقولے:۔

جو اپنے راز کو پوشیدہ رکھے گا اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں رہے گا۔ رشتہ داروں کو حکم دو کہ وہ باہم ملتے رہا کریں اور ہمسائیگی میں نہ رہیں۔ میں امانت دار کی کمزوری اور طاقتور کی بے ایمانی کا خدا سے گلہ کرتا ہوں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دانشمندانہ مقولے:۔

بزرگ شخص کی رائے نوجوان کی قوت سے بہتر ہے۔ لوگ جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ہر انسان کی قیمت اس کی خوبیاں ہیں۔

خطابت: رسول اللہؐ نے ایک دن تقریر فرمائی، پہلے خدا کی حمد و ثنا کی پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:۔

اے لوگو! تمہارے لیے کچھ ذرائع علم ہیں، انہی پر اکتفا کرو اور تمہارے لیے کچھ حدود ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ درحقیقت بندہ دو خطروں کے درمیان ہے، ایک خطرہ وہ مدت ہے جو گذر چکی اور اسے نہیں معلوم کہ اللہ اس کے بارے میں کیا کرنے والا ہے دوسرا خطرہ وہ مدت ہے جو آنے والی ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اللہ اس میں کیا فیصلہ کرنے والا ہے۔ بندہ کو اپنے نفس سے اپنی بھلائی کے لیے اپنی دنیا سے اپنی آخرت کے لیے اپنی جوانی سے بڑھاپے کے لیے، اپنی زندگی سے موت کے لیے کچھ بھلائیوں کا توشہ ہمراہ لے جانا چاہیے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے موت کے

کے بعد رضا جوئی مولیٰ کا کوئی موقع نہیں، نہ دنیا کے بعد جنت وجہنم کے سوا کوئی ٹھکانا!

سقیفہ کے دن جب مسئلہ خلافت پر مہاجرین و انصار میں باہم اختلاف ہوا تو حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوئے اور خدا کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:۔

اے لوگو! ہم وہ مہاجرین جنہوں نے خدا کے واسطے اپنا گھر بار چھوڑا ہم ہی سب لوگوں سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ سب سے زیادہ عربی النسل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے قریبی رشتہ دار ہیں۔ ہم تم سے پہلے اسلام لائے۔ قرآن میں بھی ہم کو تم سے پہلے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ خدائے تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے، والسابقون الاولون من المہاجرین و الانصار والذین اتبعوھم باحسان" (اور سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے مہاجرین وانصار اور وہ لوگ جنہوں نے حسن کارانہ ان کی پیروی کی) ہم مہاجر ہیں اور تم ہمارے دینی بھائی مال غنیمت میں ہمارے شریک اور دشمنوں کے مقابلہ میں ہمارے ممد ومعاون، تم نے ہمیں پناہ دی، ہمارے ساتھ برابری کا سلوک کیا۔ خدا تمہیں بہتر بدلہ عنایت فرمائے۔ ہم امیر ہیں اور تم وزیر۔ عرب اس قبیلۂ قریش کے علاوہ کسی دوسرے قبیلہ کی اطاعت نہیں کریں گے، لہذا اللہ نے جو برتری تمہارے مہاجر بھائیوں کو عطا کی ہے اس پر کبیدہ خاطر و بددل نہ ہو جاؤ۔

معاویہ رضؓ ممبر پر کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد کہا:۔

اے مدینے والو! میں نہیں چاہتا کہ تم عراقیوں کی طرح بن جاؤ، وہ جس کام کو برا کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک جماعت ہے۔ تم ہماری خامیوں کے باوجود ہماری اطاعت تسلیم کر لو، اس لیے کہ ہمارے بعد آنے والے تمہارے لیے ہم سے بھی بدتر ہوں گے۔ ہمارے اس زمانہ کا معروف (بھلا کام) پہلے زمانہ کا منکر (خراب کام) اور ہمارے زمانہ کا منکر آئندہ زمانہ کا معروف ہوگا، اور گو وہ وقت آچکا ہے، تاہم اصلاح فساد سے بہتر ہے، اور ہمارا کام بہرحال پہنچا دینا ہے، اور ذلت کی زندگی بے کار ہے۔

دیر جماجم کے بعد حجاج نے عراقیوں کے سامنے یہ تقریر کی:۔

اے عراقیو! شیطان تمہارے اندر گھس گیا ہے اور تمہارے گوشت خون، اعصاب، کانوں نگاہوں اور دلوں میں گھل مل گیا ہے۔ پھر تمہارے گودوں اور مساموں میں سرایت کر گیا ہے، پھر اس نے تم پر اپنا گھونسلا بنا لیا، اور اس میں انڈے بچے دے دیئے ہیں۔ اور تمہارے اندر نفاق وشقاق بھر دیا ہے تم نے اسے اپنا ہردلعزیز رہبر و قائد بنا لیا ہے اور اس کی پیروی کرتے ہو۔ وہی تمہارا حاکم اعلیٰ ہے جس سے تم مشورے لیتے ہو۔ اب تم کو تجربہ سے کوئی فائدہ یا کسی واقعہ سے نصیحت ہو تو کیونکر؟ اسلام تمہیں کیونکر روکے اور ایمان کس طرح باز رکھے؟ کیا تم "اہواز" میں میرے ساتھی نہ تھے جہاں تم نے مکاری و غداری کی کوشش کی تھی؟ اور تم یہ سمجھے تھے کہ اللہ اپنے دین اور خلافت کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔ تم میری آنکھوں کے سامنے سے کھسکتے جا رہے تھے، اور

شکست کھا کر تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ اور زادیہ کا دن! کون سا زادیہ کا دن؟ وہی جس میں تم نے شکست کھائی اور باہم جھگڑے، جہاں اللہ نے تمہاری حرکت سے بیزاری کا اظہار کیا، جب تم اپنے گھروں کو لوٹنے، اپنے ٹھکانوں پر پہنچنے کے لیے بیتاب و پریشان اونٹوں کی طرح سرپٹ بھاگے چلے جارہے تھے اور تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کو نہیں پوچھتا تھا، نہ کوئی بوڑھا اپنے بیٹے کی فکر کرتا تھا، تا آنکہ ہتھیاروں نے تم کو چبایا اور نیزوں نے تمہیں چھلنی کر دیا۔ پھر دیر جماجم کا دن! اور کیا ہے دیر جماجم! وہ جگہ جہاں بڑے زبردست معرکے اور لڑائیاں ہوئیں اور تلواروں نے سروں کو تن سے جدا کیا، دوست اپنے دوستوں کو بھول گئے، اے نافرمان بے وفا عراقیو! فتنہ پر فتنہ برپا کرنے والو! اگر میں تم کو سرحدوں پر بھیجتا ہوں تو تم حجت بازی اور خیانت کرتے ہو، اگر تم بے خوف ہوتے ہو تو شرارتیں کرنے لگتے ہو اور اگر خوفزدہ ہوتے ہو تو منافقت سے کام لیتے ہو، نہ تمہیں کسی کا خوف ہے نہ تم کسی کے احسان کا شکر ادا کرتے ہو کیا جب بھی کوئی بے وفا، تم کو بدراہی پر لگاتا اور کوئی گمراہ تم کو بلاتا اور کوئی ظالم تم سے مدد حاصل کرتا اور کوئی خود سر تم کو اپنا دوست بنانا چاہتا ہے تو تم اس پر اعتماد کر لیتے ہو؟ اس کو پناہ دے دیتے ہو، اس کی مدد کرتے اور اس پر رضامند ہو جاتے ہو؟ اور جب بھی کوئی فتنہ برپا کرتا ہے یا کوئی بدمعاش تباہی پھیلاتا ہے تو تم اس کے مددگار و حامی بن جاتے ہو؟ کیا نصیحتیں تمہیں بداعمالیوں سے باز نہیں رکھتیں اور واقعات تمہاری آنکھیں نہیں کھولتے!

پھر وہ شامیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا:۔

اے شامیو! میں تمہارے لیے اس شترمرغ کی طرح ہوں جو اپنے بچوں کی نگرانی کرتا، ان کے آس پاس سے ڈھیلے کنکریاں ہٹا کر ان کے لیے جگہ صاف کرتا اور بارش سے ان کی حفاظت کرتا ہے، اے شامیو! تم ہی سپر ہو اور تم ہی ہتھیار، تم ہی ساز و سامان ہو اور تم ہی پوشاک۔

رسائل و خطوط:۔

ابو عبیدة بن الجراح اور معاذ بن جبل نے امیرالمومنین عمر بن الخطاب رضؓ کو خیر خواہی نصیحت کرتے ہوئے لکھا:۔

از طرف ابو عبیدة بن الجراح و معاذ بن جبل بخدمت عمر بن الخطاب۔ السلام علیکم، ہم خدا کی تعریف کرتے ہیں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اما بعد! ہم نے آپ کے حالات کا اندازہ لگایا اور دیکھا کہ آپ پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ آپ اس امت کے سرخ و سیاہ (عرب و عجم) کے والی بن گئے ہیں آپ کے سامنے دوست دشمن، شریف ذلیل، ہر قسم کے لوگ بیٹھتے ہیں اور ہر ایک کے لیے انصاف و عدل کا ایک حصہ ہے۔ آپ دیکھئے کہ ایسے حالات میں آپ کا کیا رویہ ہو گا۔ ہم آپ کو اس دن سے ڈراتے ہیں جس میں چہرے جھک جائیں گے۔ دل دھڑکیں گے اور شہنشاہ حقیقی کی دلیل کے سامنے عاجز و بے بس، اس کی رحمت کی متمنی اور اس کے عذاب سے خوفزدہ ہو گی۔ تمام دلیلیں بے وزن ہو جائے گی۔ ہم یہ کہا کرتے تھے کہ آخری زمانہ میں اس امت کا یہ حال ہو جائے گا کہ لوگ بظاہر دوست

اور بباطن دشمن ہو جائیں گے۔ ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہمارا یہ خط آپ کے دل میں ہمارے مقصود کے علاوہ کوئی دوسرا خیال پیدا کرے۔ ہم نے تو یہ خط محض آپ کی خیر خواہی کی غرض سے لکھا ہے۔ والسلام۔

عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر نے اپنے کسی دوست کو اظہار ناراضی کرتے ہوئے لکھا۔

"اما بعد! مجھے شک و شبہ نے تمہارے بارے میں کوئی پختہ رائے قائم کرنے سے باز رکھا۔ اس لیے کہ شروع میں تم بغیر کسی جانچ پڑتال کے میرے ساتھ لطف وعنایت سے پیش آئے اور بعد میں بغیر کسی جرم کے تم نے مجھ سے بے وفائی برتی۔ تمہارے پہلے رویہ نے مجھے تم سے دوستی پیدا کرنے کی لالچ دلائی اور دوسرے برتاؤ نے مجھے تمہاری وفاداری سے مایوس کر دیا۔ اب نہ تو میں تم سے بالکل قطع تعلق پر تیار ہوں نہ آئندہ تم پر بھروسہ کرنے والا۔ وہ ذات پاک ہی اگر چاہے تو میرے اس شکی فیصلہ کو ہٹا کر تمہارے متعلق کوئی یکطرفہ واضح رائے پیدا کر دے۔ تاکہ ہم پھر باہم محبت سے ملیں یا لڑ کر جدا ہو جائیں۔ والسلام۔

وصیتیں اور نصیحتیں

حضرت علی رضؓ بن ابی طالب نے اپنے فرزند حضرت حسن رضؓ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے آٹھ باتیں لے کر انہیں حرز جان بنا لو، ان کی موجودگی میں جو کچھ بھی تم کرو گے اس سے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

سب سے زیادہ غنی اور بے نیاز کرنے والی دولت عقل ہے۔ اور سب سے بڑی محتاجی و ناداری حماقت ہے۔ سب سے بڑی وحشت، تکبر اور گھمنڈ ہے۔ خوش خلقی بزرگ ترین حسب ہے۔ اے میرے بیٹے! احمق کی دوستی سے کنارہ کرو کیونکہ وہ تمہیں فائدہ پہنچانا چاہے گا مگر نقصان پہنچا دے گا۔ اور بخیل کی دوستی سے بچو کہ جس قدر تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہو گی وہ تم سے دور ہوتا جائے گا اور بدکار سے دوستی نہ کرو کیونکہ وہ تمہیں حقیر چیز کے عوض بیچ ڈالے گا۔ اور دروغ گو سے بھی دوستی نہ کرو کیونکہ اس کی مثال سراب کی سی ہے، جو دور کی چیز کو تمہارے قریب اور قریب کی چیز کو تم سے دور بتائے گا۔"

دم مرگ قیس بن عاصم منقری نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی:۔

اے میرے بیٹو! میری تین باتوں کو یاد رکھنا، کیونکہ مجھ سے زیادہ تمہارا کوئی خیرخواہ نہیں ہے، جب میں مر جاؤں تو اپنے چھوٹوں کو نہیں بلکہ بڑوں کو سردار بنانا، ورنہ لوگ تمہارے بڑوں کو حقیر سمجھیں گے اور تم ان کی نظروں میں بے وقعت ہو جاؤ گے۔ مال و دولت کی حفاظت کرنا کہ یہ سخی کے لیے شہرت کا سبب، اور کمینوں سے مستغنی ہونے کا ذریعہ ہے۔ دیکھو کسی سے بھیک نہ مانگنا کہ یہ انسان کی سب سے ذلیل کمائی ہے۔"

زبان میں خامیاں اور عامیانہ زبان کی ابتدا

حج، میلوں، اور قریش کی سرداری کا یہ اثر ہوا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں تمام عربوں کی زبانیں یگانگت

اختیار کر گئی تھیں اور ان کے لہجے یکساں ہونے لگے تھے، اور چند جزئی خامیوں کے علاوہ زبان میں کسی قسم کے عیوب باقی نہیں رہے تھے۔ جب اسلام آیا اور قرآن مجید قریش کی زبان میں اترا، حضور صلعم اور آپ کے بعد خلفاء بھی اسی خاندان میں سے ہوئے تو یہ زبان پوری طرح دیگر زبانوں پر غالب آگئی۔ لوگوں کی زبانیں اس زبان کے سامنے جھک گئیں اور ان کے دل اس کی طرف مائل ہو گئے، تاآنکہ یہ زبان تمام اسلامی علاقوں میں نبوت و حکومت کی زبان اور تمدن و علم کے اظہار کا ذریعہ بن گئی، اور چونکہ اسلام ایک ایسا جلیل القدر انقلاب تھا جس نے اخلاق و طبائع بشری میں بڑے اثرات اور سیاسیات و اجتماعیات میں اہم تغیرات پیدا کیے تھے، لہذا زبان کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ بھی اس کے سامنے جھک جائے اور اس سے اثر پذیر ہو جائے۔ چنانچہ زبان کا سرمایہ بڑھا اور دینی عقائد، حکومت کے نظام و قواعد، تمدنی ضروریات نیز علمی اصطلاحات کو بیان کرنے کی وجہ سے اس کے مواد میں وسعت، موضوعات و اغراض میں ہمہ گیری پیدا ہوئی۔ اور لوگوں کی طبیعتوں میں قرآن کی بلاغت، اسلام کی ترو تازگی، جمال تمدن، نیز تمدنی مناظر کی نیرنگی کے اثر سے اس زبان کے الفاظ شستہ اور اسالیب پاکیزہ ہو گئے[1]۔

پھر اسی طرح اسلام نے عربوں کی زندگی میں یہ اثر ڈالا کہ تعصبات مٹا دیے، تمدنی امتیازات ختم کر دیے۔ سیادت و بزرگی کے پہلے معیاروں کو بدل کر ان کا دار و مدار عبادت و تقوی پر رکھا اور قبائلی انتشار کو ایک عقیدہ پر متحد اور ان کی منفرق جماعتوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ پھر اس جزیرہ نما سے اسلام عربوں کے ساتھ مشرکوں سے جہاد کرنے کے لیے قرآن اور تلوار لے کر نکلا اور ان کے ہاتھوں قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو زیرنگیں کرایا۔ انہیں زمین کے اطراف میں فتح و کامرانی سے داخل کیا تاآنکہ مشرق اقصیٰ و مغرب ادنیٰ میں انہوں نے اپنے جھنڈے نصب کر دیے اور اس دن سے عربی زبان صرف ایک ملک اور ایک قوم کی زبان نہ رہی بلکہ وہ حجاز و نجد کے دیہاتوں سے اسلام کے ساتھ نکل کر بصرہ، کوفہ، دمشق، بغداد، قرطبہ اور مصر جیسے متمدن علاقوں میں پہنچ گئی اور وہاں کے تمام عجمی و عربی مسلمانوں اور ان کے زیرنگین آنے والی اقوام کی زبان بن گئی[2]۔ مگر طبعی طور پر ان غیر ملکی

---

[1] عہد بنو امیہ میں عربی زبان کی تہذیب و اصلاح کے سلسلہ میں ایرانی و رومی تمدنوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں نے ریشمی گدے اور قالین استعمال کرنے شروع کر دیے تھے۔ ان کی ضروریات اور خانگی ساز و سامان میں اضافہ ہو گیا تھا جس کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی بڑھے اور ضروریات زندگی میں تنعم و آسودگی کی وجہ سے الفاظ میں بھی شستگی و پاکیزگی پیدا ہو گئی۔

[2] ابن خلدون نے لکھا ہے "جب دین نے تمام غیر عربی زبانوں کو چھوڑ دیا، مزید برآں اسلامی حکومت چلانے والے بھی عربی تھے تو تمام اسلامی ممالک میں غیر عربی زبانوں کو چھوڑ دیا گیا، کیونکہ لوگ حاکم وقت اور اس کے مذہب کے ماتحت رہا کرتے ہیں (باقی حاشیہ صفحہ ۳۰۳ پر)

اقوام میں عربی زبان کے بولنے کی وہ قدرت نہ تھی جو خود عربوں میں تھی، لہذا ان کی زبانوں میں غیر ملکی زبانوں کی آمیزش سے خامیاں اور غلطیاں پیدا ہو گئی تھیں جو عربوں اور موالیوں میں پرورش پانے والے کمزور عربوں کی زبانوں میں بھی جم گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ لسانی یا محاورہ کی غلطیاں زیادہ تر دارالحکومتوں اور بڑے شہروں میں نمودار ہوئیں اور دیہاتوں میں ان کا اثر نہ ہوا، چنانچہ چوتھی صدی کے آخر تک دیہاتوں میں خالص زبان باقی رہی۔ اس لسانی مرض کی ابتداء زمانۂ نبوت ہی سے ہو گئی تھی اور بعد میں جوں جوں اسباب میں اضافہ ہوا مرض بھی بڑھتا گیا تا آنکہ عہد بنی امیہ میں تو یہ مرض اس قدر ہمہ گیر ہو گیا کہ خلفاء اور خواص بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے اور خطرہ ہوا کہ کہیں قرآن پر یہ اثر انداز نہ ہو جائے، چنانچہ قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کے لیے نحوی قواعد مرتب کیے گئے۔ اس کی عبارتوں پر حرکات اور نقطے لگائے گئے، لیکن ان سب احتیاطوں کے باوجود بھی زبان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ نہ صرف و نحو کی فاش غلطیوں کا ازالہ ہو سکا۔ عوام نے بولنے میں اس قدر کثرت سے تصریف و تحریف کی کہ زبان کے دو حصے ہو گئے، ایک تحریر کی ادبی زبان دوسری گفتگو کی عوامی زبان اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

نحو

تمام مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ سب سے پہلے نحو کے قواعد ابوالاسود دؤلی متوفی ۶۹ھ نے وضع کیے۔ جس چیز نے اس کو قواعد مرتب کرنے پر مجبور کیا وہ زبان و محاورہ کی غلطیوں کا انتشار، عبارت میں گنجلک پن اور ابہام کی کثرت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ قصہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ زیاد کے پاس گیا جو کوفہ و بصرہ کا گورنر تھا اور کہا دخدا حضور کے کاموں کو سدھارے! میں دیکھ رہا ہوں کہ عربوں کے عجمیوں میں گھل مل کر رہنے کی وجہ سے ان کی زبانیں بگڑ گئی ہیں۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں ان کے لیے کچھ ایسے قواعد مرتب کر دوں جن کے ذریعہ وہ اپنی زبانوں کو درست کر لیں؟ تو زیاد نے اسے منع کیا، لیکن اس نے دوبارہ پھر اجازت مانگی تو جس سے زیاد نے پہلے منع کیا تھا اب اس کی اجازت نہ دے دی کیونکہ اس نے خود اپنے کانوں سے ایک شخص کو اس کے پاس آ کر یہ کہتے ہوئے سنا تھا "توفی ابانا و ترك بنون"[1]۔ چنانچہ ابوالاسود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۲ کا) اور عربی زبان کا استعمال آداب اسلامی اور عربوں کی وفاداری شمار ہونے لگا۔ چنانچہ تمام ممالک اسلامیہ کی اقوام نے اپنی اپنی زبانیں ترک کر دیں اور ان سب کی زبان عربی بن گئی حتیٰ کہ یہ زبان نہایت عمدگی و پختگی سے ان کے تمام ملکوں میں بولی جانے لگی اور اس کے علاوہ دیگر زبانیں اجنبی اور بدیسی شمار ہونے لگیں۔

[1] یہاں "ابانا" کی جگہ "ابونا" صحیح ہے اور بنون کی جگہ بنین بولنا چاہیے تھا۔ (مترجم)

نے "اوزان تعجب" کا ایک باب مرتب کیا اور اس کے بعد "فاعل ومفعول" کا باب اور پھر جب کبھی کوئی صرف ونحو کی غلطی سنتا تو اسے سدھارنے کے لیے ایک قاعدہ بنا دیتا۔ پھر اس کے بنائے ہوئے قواعد کو کوفہ و بصرہ کے ادیبوں نے لے کر ان کی تکمیل وتفصیل کی جسے ہم بعد میں بیان کریں گے۔ ہمارا گمان غالب یہ ہے کہ ابو الاسود نے عربی کی نحو اور نقطے اپنی طبیعت سے ایجاد نہیں کیے بلکہ وہ سریانی زبان جانتا تھا اور اس زبان کی نحو عربی کی نحو سے قبل ہی مرتب ہو چکی تھی، یا وہ سریانی زبان کے عالموں اور ادیبوں سے ملتا رہتا تھا جن کی صحبتوں نے اسے قواعد سازی میں مدد پہنچائی۔

عہد بنو امیہ میں علوم کی حالت

ابھی تک عربوں کی طبیعتیں علوم کے لیے تیار نہیں ہوئی تھیں نہ ان کی عقلیں علوم میں غور و بحث کے لیے پختہ ہوئی تھیں۔ بلکہ جذبات دینی، مشاغل فتوحات اور ادبی رجحانات نے ان کی تمام تر توجہات اپنی طرف مشغول کر رکھی تھیں اور انہوں نے صرف اشد ضروری اور موروثی علوم مثلاً طب ونجوم پر ہی کفایت کر رکھی تھی۔ جب لسانی غلطیوں نے ان کو بہت زیادہ پریشان کیا اور عجمیت ہر سمت سے ان پر حملہ آور ہو گئی۔ قسم قسم کے مقدمات آنے لگے تو انہوں نے قرآن کو ضبط کرنے کے لیے نحو، اس کے حل مشکلات کے لیے تفسیر، اس سے استنباط احکام کے لیے فقہ مرتب کی۔ حدیث کے تلف ہونے یا اس میں وضعی احادیث ملنے کے خطرہ کی وجہ سے انہوں نے احادیث کو مدون کیا۔

معاویہ رضؓ کی تجربہ کاری اور ان کے بعد آنے والے خلفاء کی حکمت عملی کا تقاضہ ہوا کہ وہ اپنی حکومت کو قوت پہنچانے اور اپنے اقتدار کو جمانے کے لیے ماضی کے تجربوں اور پیش رو حاکموں کے سوانح و وقائع سے مدد حاصل کریں[1] چنانچہ عُبَید بن شَرِیَہ نے معاویہ کے لیے "کتاب الملوک واخبار الماضین" تصنیف کی۔ دیگر مصنفین نے بھی اس قسم کی کچھ کتابیں تصنیف کیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ہم تک نہیں پہنچی۔ رہا غیر ملکی زبانوں سے ترجمہ، سو اس عہد میں اس کا کسی نے اہتمام نہیں کیا۔ البتہ خالد بن یزید، معاویہ کے پوتے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حکومت میں ناکامی کے بعد علوم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس نے اسکندریہ کے مدرسہ سے ایک جماعت کو بلوایا جنہوں نے اسے علم کیمیا سکھایا اور اس سلسلہ میں اس کے لیے کچھ ترجمے بھی کیے۔

---

[1] مسعودی نے بیان کیا ہے کہ معاویہ رضؓ ہر روز عشاء کے بعد سے تہائی رات تک تاریخی واقعات بیان کرنے والوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور وہ لوگ ان کے سامنے عرب وعجم کے بادشاہوں کے واقعات رعایا کے ساتھ ان کی سیاست اور ان کی جنگی چالوں کے قصے سناتے تھے۔ پھر وہ تہائی رات سو جاتے اور اُٹھتے تو ان کے پاس کچھ خادم کتابیں لے کر آتے جن کو پڑھنے اور یاد کرنے کا کام ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ ان کے سامنے ان کی کتابوں میں سے قدیم بادشاہوں کے چال چلن، جنگوں کے واقعات اور متفرق قسم کی سیاستوں کی تفصیلات پڑھ کر سناتے تھے۔

الغرض اس دور کے متعلق مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ادب جاہلیت پک کر تیار ہوا، علوم اسلامیہ نے نشو ونما پائی اور غیر ملکی علوم کے تراجم کی ابتدا ہوئی۔

اسلام کے بعد تحریر کی حالت

اسلام آیا تو قریشیوں، مدینہ والوں اور یہودی تاجروں میں صرف دس سے کچھ اوپر لکھنا جاننے والے تھے۔ جب اللہ نے بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کو قریش پر فتحیاب کیا اور ان کے کچھ لکھنا جاننے والے قید ہو کر آئے تو آں حضرت ؐ نے ان قیدیوں کے فدیہ میں یہ شرط منظور کر لی کہ ان میں سے ہر ایک دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھا کر رہائی حاصل کر لے۔ اور اس طرح مدینہ والوں میں لکھنے والوں کی کثرت ہو گئی۔ پھر آں حضرت ؐ کے حکم کی تابعداری اور قرآن لکھنے کا شوق نیز دفاتر میں جگہ حاصل کرنے کی لالچ سے عربوں میں لکھائی کا رواج عام ہو گیا اور ان کے ساتھ تمام مفتوحہ علاقوں میں پھیلتا چلا گیا۔

پہلے پہل عربی تحریر حرکات اور نقطوں سے خالی ہوتی تھی جس کی وجہ سے غلطیاں بہت زیادہ ہونے لگیں اور قرآن میں بھی غلطیوں کا خطرہ ہونے لگا۔ چنانچہ ابو الاسود نے معاویہ رض کے زمانہ میں قرآن کے لفظوں کے آخری حروف کو (اعراب ظاہر کرنے کے لیے) نقطوں کے ذریعہ ضبط کیا۔ انہوں نے "زبر" کی علامت حرف کے اوپر نقطہ "زیر" علامت حرف کے نیچے نقطہ اور "پیش" کی علامت حرف کے سامنے نقطہ رکھی۔ پھر لوگوں نے ان نقطوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا مگر ان نقطوں کے لیے وہ تحریر کے مخالف رنگ کی روشنائی استعمال کرتے تھے۔ پھر جب خط کی شکلیں بدلنے لگیں اور حروف باہم مشابہ ہونے لگے "ج ح" "د ذ" اور "س ش" میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا[۱] تو حجاج نے ابو الاسود کے دو شاگردوں نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر کو حکم دیا اور انہوں نے حروف کی شناخت میں سہولت کے لیے نقطے بھی

---

[۱] مثال کے طور پر اس بڑھیا کا واقعہ ہے جو فرزدق کے پاس آئی اور کہا "میں آپ کے باپ کی قبر کی پناہ مانگتی ہوں۔ فرزدق نے پوچھا کیا بات ہے؟" اس نے کہا "تمیم بن زید میرے بیٹے کو لے گئے ہیں اور اس کے سوا میرا کوئی بچہ ہے نہ کمانے والا" اس نے پوچھا "تمہارے بیٹے کا نام کیا ہے؟" بڑھیا نے کہا "خنیس" تو اس نے تمیم کو یہ اشعار لکھ بھیجے:-

تمیم بن زید لا تکونن حاجتی   بظهر فلا یعیا علی جوابها

وهب لی خنیسا واحتسب فیه منة   لعبرة ام لا یسوغ شرابها

اے تمیم بن زید! میری بات کو پس پشت نہ ڈالنا کہ اس کا جواب ملنا مجھے مشکل ہو جائے اور مجھے خنیس کو دے دو اور اس پر احسان کر کے اس کی ماں کے آنسو بند کر کے ثواب حاصل کرو جسے کچھ کھانے پینے میں مزا نہیں آتا"۔ چنانچہ تمیم کو خنیس نام میں شک ہوا اور اس نے اپنے تمام آدمیوں کے ناموں کو دیکھا تو ان میں خنیس خنیس اور حبیش وغیرہ کی قسم کے چھ نام، اس نام سے مشابہ ملے اور اس نے اُن سب کو فرزدق کے پاس بھیج دیا۔

اسی روشنائی سے لکھنے کا طریقہ نکالا جس سے عبارت لکھی جاتی تھی۔ پھر ان کے بعد خلیل بن احمد آئے اور انہوں نے حرکات کے نشانات کا یہ مشہور طریقہ نکالا جس کو ابوالاسود کے نقطوں کی سی مقبولیت حاصل ہوئی۔[1]

عہد عباسی میں ہر چیز کی طرح اس فن تحریر (خطاطی) نے بھی نشو و نما اور ترقی پائی، لکھنے والوں نے خوش نویسی میں مقابلہ کرنا شروع کیا اور اس میں نئے نئے طریقے نکالنے، کوفی اور بغدادی خطوں (طرز تحریروں) کو نئے نئے طریقوں سے لکھ کر مثلاً خط مرصع، خط نسخ اور خط ریاسی (جو اپنے موجد ذوالریاستین فضل بن سہل کی طرف منسوب ہے) کے ذریعہ جدا جدا کر دیا۔ پھر ان خطوں کی تعداد اور نیرنگیوں میں اضافہ ہوتا رہا حتی کہ خط کوفی کی شکلیں بیس سے زائد ہو گئیں اور خط نسخ عوام میں غیر سرکاری تحریروں کے لیے استعمال ہوتا رہا تا آنکہ ابو علی محمد بن مقلہ متوفی ۳۲۸ھ آئے اور انہوں نے اس خط کو اس درجہ خوبصورت اور خوشنما بنا دیا کہ وہ حسن و عمدگی میں اپنی اصل سے بھی ممتاز ہو گیا۔ نیز اسے قرآن کی تحریر، اور دفتر کارروائیاں لکھنے کے لیے منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد علی بن ہلال (المتوفی ۴۱۳ھ) آئے اور انہوں نے اس خط کو مہذب و حسین بنانے میں اضافہ کیا تا آنکہ یہ خط کوفی کا قائم مقام بن گیا۔ بعد ازاں خط نسخ میں کچھ اور تحریری طریقے نکلے مثلاً "طومار" جس میں قلم کے قط کا عرض خچر کے بیس بالوں کی موٹائی کے برابر (یعنی تین ملیمیٹر) تھا، نیز "ثلثین" جس کا عرض دو ملیمیٹر اور "نصف" جس کی پیمائش ڈیڑھ ملیمیٹر اور "ثلث" جس کی چوڑائی ایک ملیمیٹر تھا، پھر بتدریج قلم باریک تر ہوتا گیا چنانچہ "خفیف الثلث"، "لؤلؤ"، "توقیع"، "رقاع"، "محقق" "غبار" ایجاد ہوئے، موخر الذکر سب سے باریک اور اسی کے ذریعہ نامہ بر کبوتروں وغیرہ کے پیغام لکھے جاتے تھے، بعد ازاں خط عربی دستور ارتقاء کے مطابق مسلسل مختلف ادوار سے گذرتا رہا اور

---

[1] سامی اقوام نے اپنے رسوم الخط میں صوتی حروف (حروف علت) کو چھوڑ کر صرف بے صوتی حروف (حروف صحیح) پر اکتفا کی اور وہ "نصر" کو یونانیوں رومیوں اور آج کل کی یورپی اقوام کی طرح "ناصارا" نہیں لکھتے۔ ابتدائی زمانہ میں عربی رسم خط میں حرکات کو ظاہر کرنے کے لیے حروف پر نقطے لگا دیے جاتے تھے جیسا کہ ابوالاسود نے کیا تھا، لیکن خلیل بن احمد نے ــ بشرطیکہ اُس کا موجد حرکات کے لیے نقطوں کا استعمال نہیں کیا، بلکہ نقطوں کی بجائے صوتی حروف "الف"، "واو"، "ی"، "زبر" کی جگہ "الف"، "پیش" کی جگہ "واو" اور "زیر" کی جگہ "ی" کو استعمال کیا اور موجودہ حرکات بقول رازی حروف علت ہی کے بعض ٹکڑے ہیں۔ رہ گئیں دوسری علامتیں مثلاً "مد" "وصلہ" "تشدید" تو وہ عصر عباسی میں خلیل کے زمانہ کے بعد بنائی گئی ہیں اور یہ علامتیں بھی اُن الفاظ کے سروں سے بنائی گئی ہیں جن سے ان کے معنی نکلتے مثلاً مد کی علامت (~) "مد" سے اور وصلہ کی علامت (ص) "صل" سے اور تشدید کی علامت (ــّ) شدہ سے۔

اب تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے، چنانچہ بہت سی اسلام سے مشرف ہونے والی اقوام نے اپنی زبانوں کو اسی رسم الخط میں لکھنا شروع کر دیا، مثلاً ترکی، فارسی، افغانی، اردو، اور افریقہ کی مختلف زبانیں۔

تیسرا باب

عہدِ عباسی

اس عہد کی اہمیت اس کا اثر اور اس کے امتیازی خصوصیات

حکومت عباسیہ کا زمانہ اسلام کا وہ زریں عہد ہے جس میں مسلمان تمدن و تہذیب اور عمران و اقتدار کے لحاظ سے اس قدر بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ اس سے قبل یا اس کے بعد پھر کبھی اس بلندی پر نہ پہنچے۔ فنون اسلامیہ اس دور میں پھلے پھولے۔ آداب عربیہ نے نشو و نما پائی۔ غیر ملکی علوم کے ترجمے کیے گئے۔ عقل عربی پک کر تیار ہوئی۔ اور اس نے غور و فکر، بحث و تمحیص کے لیے ایک وسیع جولانگاہ پائی۔ اس حکومت کے فرمانروا، آں حضرت صلعم کے چچا حضرت عباسؓ کی طرف منسوب ہیں۔ جنہوں نے ایرانیوں کی مدد سے خلافت کو امویوں کے ہاتھ سے بزور و جبر چھین کر، اس کا پایہ تخت عراق بنایا۔ جہاں پانچ صدی سے کچھ زیادہ مدت میں ان کے سینتیس خلفاء تخت سلطنت پر باری باری بیٹھے تا آنکہ ہلاکو نے ۶۵۶ھ میں اس حکومت کا تختہ الٹ دیا، اور حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ اس کے تمدن و آداب میں بھی انحطاط ہوتا گیا، اور بالآخر حکومت کے ختم ہونے پر ان کے آداب و تمدن کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سیاسی و عمرانی حالات کے لحاظ سے جن کا ادب و زبان پر نمایاں اور پائیدار اثر ہوتا ہے یہ حکومت بنی امیہ کی حکومت سے مختلف تھی۔ بنی امیہ کی حکومت خالص عربی حکومت تھی۔ اموی حکومت عربی قوم اور عربی زبان و ادب کی حمایت میں جانبداری و تعصب سے کام لیتی تھی۔ اس نے اپنا پایۂ تخت دمشق بنایا تھا جو عربی دیہاتوں کی سرحدوں پر واقع ہے۔ اس کی فوج، کمانڈر، دفتری کلرک، گورنر اور جملہ دیگر اہم خدمات انجام دینے والے سب عرب ہی عرب تھے۔ اس لیے زبان کے ادب میں اس عہد نے سوائے اس اثر کے جو کثرت آبادی اور تمدن کی ترقی کے لیے لازمی تھا، کوئی پائدار اثر نہیں ڈالا۔

لیکن حکومت عباسیہ ایرانی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ کیونکہ اس کو ایرانیوں نے ہی بنایا

اس دور کی نسبت عباسیوں کی طرف ان کی اکثریت کی وجہ سے کر دی گئی ہے، کیونکہ اس دور میں انہی کا اثر و رسوخ زیادہ تھا، لیکن اس دور پر تبصرہ کے ضمن میں بغداد کے عباسیوں، ایران کے بویہیوں، شام کے حمدانیوں مصر و مغرب کے فاطمیوں اور اندلس کے امویوں کا تذکرہ بھی شامل ہے، یہ تمام ممالک باہمی اختلاف و بعد کے باوجود بغداد ہی سے اعانت و رہنمائی حاصل کرتے تھے، اس لیے ہم ان کے حالات کو محض سرسری طور پر بیان کریں گے۔

اور مضبوط کیا تھا[1] اس حکومت نے اپنا دار الخلافہ بغداد کو بنایا جو ایران سے بہت قریب ہے، اور عباسی خلفاء نے حلیفوں اور موالیوں کو حکومت کی سیاست میں آزادی سے حصہ لینے دیا، جس کی وجہ سے وہ خود مختاری کے ساتھ بلا شرکت غیرے حکومت کے انتظامات اور جملہ کارروائیوں پر قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے عربوں کو حقارت و توہین آمیز نظروں سے دیکھنا شروع کیا، جس کی وجہ سے عربی عصبیت کا جذبہ کمزور پڑ گیا، اور قومیتوں کا بول بالا ہو گیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی، ترکی، سریانی، رومی اور بربری عناصر حکومت کے نظم و نسق قائم رکھنے والوں میں شامل ہو گئے۔ ان میں شادی بیاہ اور رشتہ داریوں کے ذریعہ باہم میل جول پیدا ہوا۔ آریائی تہذیب، سامی تہذیب سے ملی، اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی زبان، اخلاق، عادات اور اعتقادات سے دوسری تہذیب پر اثرات ڈالے، بالخصوص اس عہد حکومت میں آزادی دین متعدد فرقوں کا ظہور[2] الحاد و سیاست میں متفرق خیالات و نظریات کی اشاعت، لونڈیوں اور غلاموں کی

---

[1] خراسانیوں اور مروان بن محمد کے درمیان زاب کی لڑائی اسی طرح غیر فیصلہ کن تھی جس طرح قادسیہ کی لڑائی عربوں اور ایرانیوں میں، کیونکہ ساسانی جن کے باعزت لوگوں کو فتح نے ذلیل کیا اور امویوں نے ذلت کے ساتھ ان کے شرفاء کو زیر کر لیا تھا، یہ طاقت نہ رکھ سکے کہ معاملات پر قابو پا کر اپنے اقتدار کو ازسرنو واپس لائیں۔ اس لیے کہ عربوں نے ان پر وہ اس قدر گہرے چھاپ لگا دیے تھے جو رہتی دنیا تک مٹ نہیں سکتے تھے اور وہ دین اور زبان کے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اموی تعصب کے انتقام میں اسی پر اکتفا کیا کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے نکال کر عباسیوں میں دے دی اور پھر من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔ بنو العباس ان کے اس احسان کو مانتے تھے۔ اور ان کی بے ضابطگی اور بے اصولی سے درگذر کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کی اس روز افزوں بے ضابطگی سے ابو جعفر منصور ڈرا اور اس نے ابو مسلم کو قتل کر کے اس خطرہ کو دور کر دیا، لیکن کچھ دن بھی نہ گذرے کہ رشید کے عہد حکومت میں یہ فتنہ پھر عود کر آیا، اور اس نے سخت نازک صورت اختیار کر لی، چنانچہ رشید نے برامکہ کے قتل کے ذریعہ اس فتنہ کا استیصال کیا۔ لیکن یہ فتنہ امین و مامون دونوں بھائیوں کے باہمی اختلاف، اور جنگ کے بعد ایرانیوں اور عربوں میں کشیدگی پیدا ہونے کی وجہ سے پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور عہد بنو بویہ میں کمال پر پہنچ گیا، اور ترکی سلجوقیوں کے سوا اس کا زور کوئی فرو نہ کر سکا نہ اس کی شدت میں کمی کر سکا۔ تاہم ان کا ادبی و عقلی اثر و رسوخ اس قدر دیرپا اور گہرا تھا کہ یہ سیاسی شکست اس کو کوئی گزند نہ پہنچا سکی، چنانچہ زبان، ادب، فقہ، فلسفہ اور اخلاق میں اس کا نہایت پختہ اثر ظاہر ہوا۔ اولاً تو اس اثر کی وجہ سے ثانیاً دیگر عوامل کی وجہ سے یہ عباسی تمدن اور اسلامی تہذیب ظہور پذیر ہوئے جس نے نیک و بد میں امتیاز پیدا کیا اور قدیم دنیا کو جدید دنیا سے ملا دیا۔

[2] امت مسلمہ میں اہل سنت کے علاوہ بہت سے دوسرے فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۹۰ پر)

فراوانی، آوارگی و پست ذوقی، ہنسی مذاق اور بیہودہ خیالات کا بے روک ٹوک اظہار، غذا اور لباس میں نزاکت پسندی و باریک بینی، عمارتوں اور خانگی ساز و سامان میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی خواہش، وہ مابہ الامتیاز امور ہیں جن کا زبان اور اس کے ادب پر نمایاں اثر ہوا ہے، جسے ہم آئندہ صفحات میں اجمالی طور پر بیان کریں گے۔

پہلی فصل

زبان اور اس پر فتوحات، سیاست اور تمدن کا اثر

عہد بنی امیہ کے آخری زمانہ میں عربوں نے اس زمانہ کی مشہور قدیم دنیا کا بیشتر حصہ فتح کر لیا تھا۔ مشرق میں ان کی حکومت ہندوستان اور چین تک پھیلی ہوئی تھی اور مغرب میں پیرانس کے پہاڑوں تک، ان ممالک میں بسنے والی اقوام پر عربوں کا اقتدار پھیل چکا تھا، ان کے دلوں پر عربوں کا مذہب قبضہ کر چکا تھا اور ان کی زبانوں پر عربی زبان غالب آگئی تھی، جس کے مختلف اقوام عربوں میں شامل ہو گئی تھیں اور ان مختلف عناصر میں امتزاج پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے فاتح قوم کا قرب حاصل کرنے، روزی کمانے اور دین سمجھنے کے لیے عربی زبان سیکھنی اور بولنی شروع کر دی، جس کی وجہ سے لسانی غلطیاں بکثرت ہونے لگیں اور یہ مرض جو اب تک بڑے بڑے شہروں میں محدود تھا بڑھ کر دیہاتوں میں پہنچنے لگا۔ اور باوجود علماء و ارباب حکومت کی روک تھام اور ناپسندیدگی کے جنہوں نے اس وبا کا مقابلہ کرتے ہوئے علوم لسان کو مدون کیا، عامیانہ بولی کی مذمت اور اسے بولنے والوں کی مخالفت کی، یہ عجمیت کی بیماری عوام اور صنعت پیشہ طبقہ میں حد سے زیادہ پھیلتی چلی گئی، حتیٰ کہ ہر ملک میں ایک عوامی زبان پیدا ہو گئی جو عربی زبان اور اس ملک کی وطنی زبان کی آمیزش سے بنی تھی۔

حکومت کو متمدن و مہذب بنانے اور فارسی، ہندی، یونانی علوم کو عربی میں منتقل کرنے کے لیے جن علمی اصطلاحات اور انتظامی، سیاسی، اقتصادی اور خانگی امور سے متعلق الفاظ کی ضرورت ہوئی ان کی وجہ سے زبان کا سرمایہ بہت بڑھ گیا[1] ماموں کے تاسیس کردہ "دار الحکومت"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۹ کا) جو آپس میں ایک دوسرے کو کافر بتاتے تھے۔ پھر ان فرقوں میں سے ہر فرقہ کئی فرقوں میں منقسم تھا جو اپنے سوا کسی کو حق پر نہیں سمجھتا تھا۔ ان میں سے مشہور فرقے یہ ہیں:۔ معتزلہ جن کے بیس فرقے تھے۔ شیعہ جن کے بائیس فرقے تھے۔ خوارج جن کے سات فرقے تھے، انہی میں جبریہ اور مشبہہ تھے، اور ہر فرقہ ایک خاص لقب سے پہچانا جاتا ہے۔

[1] ان بنائے ہوئے اور غیر زبانوں سے لائے ہوئے الفاظ کی تعداد اس قدر زیادہ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۹۱ پر)

کو ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تہذیب اور معرب اسماء کی تشریح میں بڑی فضیلت حاصل تھی۔ پھر قوم کے تہذیب و تمدن میں انہماک خوشحالی و آسودگی سے بہرہ ور ہونے ، موالیوں کے سہل الفاظ اور واضح اسلوب پسند کرتے ، صاف و واضح طرز ادا کو ترجیح دینے کی وجہ سے الفاظ میں ستھرا پن شستگی اور نزاکت و پاکیزگی پیدا ہو گئی ، اس لیے کہ ان موالیوں نے زبان کو محنت و مزاولت ، تعلیم و مطالعہ کتب کے ذریعہ ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے سیکھ کر مہارت حاصل کی تھی نہ کہ از خود مادری زبان کی حیثیت سے۔

عربی زبان نے فارسی الفاظ کے علاوہ اس کے بہت سے اسالیب بھی اپنے اندر لے لیے تھے مثلاً مرسل الیہ کو بڑے بڑے القاب لکھنا ، مخاطب سے تکلف و ادب سے گفتگو کرنا ، حضرت ، جناب اور مجلس کی طرف چیزوں کو منسوب کرنا ، خلفاء و وزراء ، معتمدوں اور فوجی افسروں کے لیے نئے نئے القاب و خطاب گھڑنا مثلاً سفاح ، منصور ، رشید ، ذوالریاستین اور رکن الدولہ ، الخ۔ عہد ناموں اور خطوط میں پرنویسی ، ایک مطلب کو بہت سے الفاظ اور مترادف جملوں میں ادا کرنا وغیرہ جس نے اگرچہ ایک حیثیت سے زبان کو خوشنما بنایا لیکن دوسرے پہلو سے اسے بدنما بھی کر دیا۔

بعد ازاں حکومت کے بڑھنے ، علم کے ترقی کرنے اور تمدن کے نشو و نما پانے کی وجہ سے زبان مسلسل وسعت اختیار کرتی گئی۔ وہ دین کی پناہ ، خلافت کے سایہ اور عربوں کے اقتدار میں متوکل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰ کا) بڑھ گئی کہ بعد میں ان کے لیے خاص طور پر ڈکشنریاں بنانے کی ضرورت لاحق ہوئی ، مثلاً کتاب التعریفات از جرجانی (۸۱۶ھ) - اور کشاف اصطلاحات الفنون از تھانوی (۸۵ ۱۱ھ) یہ اور اس سے پہلی کتاب وہ بہترین کتابیں ہیں جن سے جدید علمی اصطلاحات بنانے میں مدد حاصل کی جا سکتی ہے مثلاً دفتر مال گذاری کے لیے بنائے ہوئے الفاظ :- (حشری) وہ ترکہ جس کا کوئی وارث نہ ہو ، (اقطاع) جاگیر ، وہ زمین جو بادشاہ کسی کو دے دے اور اس کی پیداوار اسی کی ہو جائے ، (طعمہ) جائداد جو کسی کو عمر بھر کے لیے دے دی جائے اور وہ اسے آباد کرے اور اس کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور محصول ادا کرے ، (تریکہ) سالانہ لگان کا معاف کیا ہوا حصہ۔

فارسی کے الفاظ جو عربی میں داخل کیے گئے مثلاً (کوز) آبخورہ (جرۃ) مرتبان ، مٹکا (ابریق) لوٹا ، صراحی ، جگ (طشت) سینی (خوان) دسترخوان (طبق) طباق (خز) اون اور ریشم سے بنا ہوا کپڑا (دیباج) دیبا ، ریشم (یاقوت) لعل ، یاقوت (فیروزہ) فیروزہ (بلور) شیشہ (کعک) کیک (فالوذج) فالودہ (فلفل) مرچ (زنجبیل) سونٹھ ، ادرک (نرجس) نرگس (نسرین) نسرین (مسک) مشک (عنبر) عنبر (بستان) باغ (قرمز) قرمز ، گہرا سرخ رنگ ، (جوز) اخروٹ (لوز) بادام (دولاب) پہیہ ، چرخی (طیلسان) ہری چادر (فرسخ) فرسنگ سوا تین میل تقریباً الخ۔

یونانی الفاظ جو عربی میں لائے گئے (بقدونس) اجمود کی قسم کی بوٹی (زیزفون) ایک قسم کا پودہ (مصطگی) مصطگی (قیراط) قیراط ، ایک چھوٹا وزن (انبیق) آلہ کشید ، بھبکا ، قرنبیق ، (صابون) صابون ، (ہیولی) ہیولی ، مادہ ، جوہر مادی (فلسفہ) فلسفہ (مغنطیس) مقناطیس (اقلیم) ملک یا صوبہ ، (قانون) قانون ، دستور۔

علی اللہ کی خلافت ۲۳۲ھ تک پھیلتی اور ترقی کرتی رہی تا آنکہ ان ترکوں کی طاقت بڑھ گئی جنہیں معتصم نے ترکستان سے بلایا تھا۔ ان ترکوں نے عربوں پر غلبہ حاصل کرنا اور ایرانیوں پر جھپٹنا شروع کر دیا اور حکومت کو بجبر اپنے قبضہ میں لینا چاہا۔ ناموں کے غلبہ کے بعد حکومت موالیوں کے ہاتھوں میں آئی جو شیعہ تھے، متوکل نے آکر ترکوں کی مدد اور سنت کی حمایت کی۔ چنانچہ دونوں طاقتوں میں باہم جنگ اور مذہبی لڑائی ہو گئی، اور ان میں سے ہر ایک نے عربوں کو زیر کرنے اور خلفاء کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرنا چاہی۔ حتیٰ کہ لوگوں میں خلافت کا رعب وجلال باقی نہ رہا اور ان کے دلوں سے اس کی دھاک اٹھ گئی۔ گرد و نواح کے گورنروں نے خود مختاری کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ بنو بویہ اٹھے[1] اور انہوں نے ۳۳۴ھ میں حکومت بغداد کا نظم ونسق اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور تمام مشرقی اسلامی ممالک میں ان کا اثر و رسوخ بڑھ گیا، جس کی وجہ سے عربوں اور عربی زبان کا زور مشرق میں کم ہو گیا۔ اکاسرہ کے پوتے اور زمینداروں کے بیٹے بیدار ہوئے اور انہوں نے اپنے آباء و اجداد کی گم شدہ عزت کو از سر نو واپس لانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے ملکوں سے عربی زبان کے اثر کو ختم کرنے لگے اور انہوں نے اپنے دقیقی اور فردوسی جیسے شعراء سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے اسلاف کے کارناموں کی یاد تازہ کرنے کے لیے بیانیہ نظمیں اور قومی ترانے لکھیں۔ اور یہ امر نہایت تعجب انگیز ہے کہ ان کی یہ خواہش جلد ہی پوری ہو گئی۔ کیونکہ متنبی، جو چوتھی صدی کا شاعر ہے جب ایران کے علاقے شعب بوان میں پہنچا تو کہتا ہے:-

مغانی الشعب طیبا فی المغانی ... بمنزلۃ الربیع من الزمان

ولکن الفتی العربی فیھا ... غریب الوجہ والید واللسان

ملاعب جنۃ لو سار فیھا ... سلیمان لسار بترجمان

شعب بوان کے مکانات عمدگی وخوبصورتی میں تمام مکانوں سے اسی طرح بڑھے ہوئے ہیں جس طرح زمانہ کی تمام فصلوں میں فصل بہار سب سے عمدہ ہے، لیکن اس بستی میں ایک عرب، اپنے چہرہ، ہاتھ اور زبان کے لحاظ سے بالکل پردیسی اور اجنبی ہے، اور حالت یہ ہے کہ اگر سلیمان بھی جو جنات کو تابع

---

[1] یہ تین بھائی بویہ کی اولاد تھے، جو مچھلیوں کا شکار کرتا تھا۔ سعادت ان کی ہم رکاب اور سیادت ان سے ہمکنار ہوئی، چنانچہ انہوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کیے، اور بتدریج حکومت تک پہنچے، تا آنکہ ان بھائیوں نے عراق عجم، عراق عرب، ایران اور جزیرہ کو باہم تقسیم کر لیا، بڑا بھائی عماد الدولہ ابو الحسن علی ایران کا حاکم ہوا، منجھلے بھائی رکن الدولہ ابو علی الحسن کو عراق عجم ملا، چھوٹے بھائی معز الدولہ ابو الحسین احمد کو عراق عرب اور اہواز ملا، اور وہ بغداد کا خود مختار حاکم بن گیا۔ ان بھائیوں میں اور ان کی اولاد میں حکومت ۳۳۴ھ سے لے کر ۴۴۸ھ تک رہی۔

رکھتے تھے (اور پرندوں تک کی بولیاں سمجھتے تھے) اس علاقہ کا دورہ کریں تو انہیں بھی اپنے ساتھ ترجمان رکھنا پڑے گا۔

پھر ترکوں اور کردوں نے بھی اس سلسلہ میں ایرانیوں کی تقلید کی لیکن عربی زبان قرآن کے محفوظ قلعہ میں رہ کر ترک و ایران کے اس تند و تیز سیلاب کا مقابلہ کرتی رہی، تا آنکہ اس کے بولنے والوں میں اس کے حامی نہ رہے، تاتاری بغداد پر قابض ہو گئے، اور عربی زبان، ان ممالک میں بہت سے ایسے قوانین اور علوم و آداب چھوڑنے کے باوجود جو زمانہ کے مٹائے نہ مٹے، بالآخر بے بس ہو کر قدرت کے زبردست قانون کے سامنے جھک گئی۔

دوسری فصل

نثر

انشاپردازی

انشاپردازی مظہرعقل و آئینۂ فکر ہے۔ وہ ان تمدنی محرکات، علمی ترقیات، اور عمرانی مظاہر سے متاثر ہوتی ہے جو انسانوں کے احساسات وشعور تک رسائی کرتے ہیں۔

اس عباسی انقلاب کا لوگوں کی عقلوں اور ان کے رجحانات پر بڑا گہرا اثر پڑا، جو انشاپردازوں کے قلموں اور زبانوں پر ظاہر ہوا۔ انہوں نے معانی کے بہتے چشمے نکالے اور ایسے شائستہ و پاکیزہ الفاظ منتخب کیے جو نہ بھونڈے اور غیرمانوس تھے نہ بازاری و عامیانہ، انہوں نے نئے نئے اسالیب کے دروازے کھولے اور عبارت کو مرصع و مزین اور مرتب و موزوں بنانے کا اہتمام کیا۔

جب آبادی کی کثرت اور محصولات کی فراوانی ہوئی، حکومت کا دائرہ وسیع ہوا، تو انشاپردازی عہد بنی امیہ کی طرح صرف دفتری کاروبار اور خطوط نویسی تک محدود نہ رہی بلکہ اس حد سے نکل کر وہ تصنیف، ترجمے، مقالات، مقامات، عہد نامے، وصف، مناظرہ، بخشش و انعام دینے یا مانگنے، ملاقات سے قبل تعارف، شکریہ، عتاب و ناراضی، تعزیت و تہنیت، رضاجوئی وغیرہ قسم کے شہری و تمدنی موضوعات کے لیے بھی استعمال ہونے لگی، جن میں سے اکثر موضوعات کا اس زمانہ سے قبل وجود نہ تھا۔

پھر جذبات و خواہشات کی روک تھام، دشمنوں سے مدافعت، فتنوں کے استیصال اور دلوں کو باہم ملانے کے لیے انشاپردازی خطابت کے قائم مقام ہوگئی۔ نئے نئے محکموں کی وجہ سے محرروں (کلرکوں) میں بھی تنوع پیدا ہوا۔ ان محرروں میں سے کچھ آمد و خرچ کا حساب لکھنے والے تھے، کچھ عدالتی مقدمات اور فیصلوں کو قلمبند کرنے والے، کچھ فوج اور پولیس کے محکمہ میں کام کرنے والے، کچھ جاگیروں اور جائدادوں کا انتظام کرنے والے اور کچھ مضامین و خطوط لکھنے والے (معتمد) تھے۔ اور موخرالذکر طبقہ ہی بلاغت کا علم بردار، معانی و بیان کا ترجمان ہے اور یہی زبان و ادب کا موضوع ہے۔ اس لیے کہ ان کے علاوہ کسی کی انشاپردازی میں باریک بینی و نزاکت اور خوبی و نفاست کی ضرورت نہ تھی۔

دورعباسیہ کے آغاز میں انشاپردازی عبدالحمید کے اسلوب پر ہی باقی رہی جس میں اختصار کو مدنظر[1]

---

[1] عبدالحمید کے طرز نگارش کا موازنہ اگر اس کے مابعد کے اسالیب سے کیا جائے تو وہ مختصر ہے اور اگر اس کے ماقبل کے اسالیب سے کیا جائے تو وہ طویل ہوگا۔

اور مبالغہ و آرائش عبارت میں اعتدال کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ بالخصوص خطوط اور توقیعات (درخواستوں دستاویزوں وغیرہ کے نیچے لکھی ہوئی مختصر تحریروں) میں کیونکہ زیادہ تر یہ چیزیں خلفاء وزراء کے لیے ہوتی تھیں۔ انہی کے پاس سے وہ آتی تھیں اور انہیں کے پاس وہ جاتی تھیں۔ مختصر نویسی کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں جعفر بن یحییٰ کہا کرتے تھے "اگر تم اپنے پورے خطوط توقیعات کے طرز پر لکھ سکو تو ضرور لکھو۔"

جب عربوں میں خوشحالی و آسودگی آئی۔ اور ایرانیوں سے ان کا میل جول بڑھا، تو انہوں نے باریک بینی و پر نویسی اور تکلف سے کام لینا شروع کر دیا اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا وہ بھی اس طرز میں ترقی کرتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے قدماء کے اسالیب کو چھوڑ دیا۔ اور ایک مطلب کو بیان کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے کئی کئی جملے لکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ تکرار سے مطلب جلد واضح اور ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ وہ صدر اسلام اور اس کے بعد کے دور کی اختصار پسندی پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ مثلاً یزید کے اس قول پر جو اس نے مروان سے، بیعت کرنے میں ہچکچاہٹ دیکھ کر کہا تھا "میں تمہیں ایک ٹانگ آگے اور دوسری پیچھے رکھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ان میں سے جس ایک پر چاہو پختگی سے اعتماد کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" ابن قتیبہ "ادب الکاتب" میں لکھتا ہے: "یہ بات اگر آج کل کسی سے کہی جائے تو اس کا وہ مطلوبہ اثر نہ ہو گا، صحیح طریقہ یہ ہو گا کہ بات کو طول دے کر تکرار کے ساتھ کہا جائے۔ اور دوھرا کر پھر از سر نو شروع کیا جائے، اور زجر و توبیخ کی جائے۔" پھر وہ عبارت کو مسجع و موزوں بنانے اور اس میں اشعار و امثال کی آمیزش کرنے لگے۔ اور یہ سب از خود طبعی طور پر ہوتا تھا کیونکہ اس میں نفس مضمون کو عمدگی سے بیان کیا جاتا تھا اور لفظی تکلفات کی کمی ہوتی تھی۔

لیکن جب خلافت کو زوال ہوا اور حکومت کا انتظام نااہلوں نے سنبھالا، تو انشاء پردازی میں بھی کمزوری پیدا ہو گئی، انشاء پرداز اس کے مقصد سے غافل ہو گئے۔ انہوں نے انواع بدیع کے زیر اثر کلام کو خوشنما اور الفاظ کو حسین بنانا شروع کر دیا۔ اور اس سلسلہ میں اس قدر غلو کیا کہ ان کے الفاظ بھونڈے اور معانی خام رہ گئے۔ چنانچہ ان کی عبارت اس لکڑی کی تلوار کی طرح ہو گئی جو سونے کے میان میں ہو، بظاہر بھڑکدار اور آراستہ لیکن بباطن ناقص و بدنما۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ لوگ اس طرز ادا کو خطوط اور عہد ناموں تک ہی محدود رکھتے، مگر افسوس! ان لوگوں نے تو کتابوں کی تصنیف اور علوم کی تدوین میں بھی اسی اسلوب کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً "تاریخ العُتبی" اور "الفتح القدسی" وغیرہ میں۔

اس دور کے انشاء پرداز چار طبقوں میں منقسم ہیں، اور ہر طبقہ نے اس دور کے چار زمانوں[1] میں

---

[1] اپنے سیاسی و اجتماعی حالات کے لحاظ سے دور عباسیہ چار زمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، پہلا زمانہ عہد عباسیہ کی ابتداء سے متوکل کی خلافت ۲۳۲ھ تک، دوسرا متوکل کی خلافت سے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۹۶ پر)

سے ایک زمانہ میں کمال و عروج حاصل کیا تھا۔

پہلے طبقہ کے سردار ابن المقفع ہیں۔ ان کے اسلوب میں نیرنگی عبارت، جملوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں، توڑنا، الفاظ میں ہم آہنگی، سہل پسندی، معانی کا زیادہ اہتمام اور سجع بندی سے گریز شامل ہیں۔ . . . . بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں "بلاغت یہ ہے کہ جب جاہل اسے سنے تو سمجھے کہ وہ بھی اس طرح کی خوشنما عبارت بنا سکتا ہے"۔ ایک دوسرے انشاء پرداز سے انہوں نے کہا "دیکھو بلاغت کی ہوس میں غیر مانوس و غریب الفاظ کی جستجو میں نہ رہنا، کیونکہ یہی سب سے بڑی کمزوری ہے"۔ ایک دوسرے انشاء نگار سے انہوں نے کہا "تمہیں سوقیانہ الفاظ سے بچتے ہوئے سہل و فصیح الفاظ استعمال کرنے چاہئیں"۔ اس طبقہ کے انشاء پردازوں میں یعقوب بن داؤد، جعفر بن یحیٰی، حسن بن سہل، عمرو بن مسعدہ، سہل بن ہارون اور حسن بن وہب ہیں۔

دوسرے طبقہ کا رئیس جاحظ ہے، عبارت کے آسان اور پرشوکت ہونے میں اس کا اسلوب پہلے طبقہ سے زیادہ مشابہ ہے، لیکن اس طبقہ کے اسلوب کی خصوصیات میں ایک جملہ کو بہت سے مقفی یا غیر مقفی نقروں میں توڑنا، الفاظ اور جملوں میں اطناب، بات میں بات نکالتے چلے جانا، پڑھنے والے کی اکتاہٹ دور کرنے کے لیے سنجیدہ اور ٹھوس مضامین میں ہنسی مذاق کی آمیزش، مضمون کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنا۔ اور مطالب کو کھول کر بیان کرنا، عقل و منطق سے استدلال، اور اثنائے عبارت میں دعائیہ جملے لانا ہیں۔ اس طبقہ میں ابن قتیبہ، مبرد اور صولی ہیں۔

تیسرے طبقہ کے سردار ابن العمید ہیں اور ان کا اسلوب نہایت درجہ دلنشیں اور طبیعت کو موہ لینے اور وجدان پر قابو پالینے والا ہے۔ کیونکہ یہ بالکل شاعرانہ طریقہ ہے، جس میں وزن کے علاوہ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اور یہ طرز ادا اپنی لازمی قیود کی پابندی اور تمام اسالیب پر غالب آنے کی وجہ سے یورپ کے قدیم تقلیدی (مقبول عام) اسلوب سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔

اس اسلوب کے پیلے، چھوٹے چھوٹے مسجع جملے، تجنیس (متشابہ و ہم شکل الفاظ)، تاریخ اور دیگر علوم کے لطائف کی آمیزش، اثنائے عبارت میں شعروں سے استشہاد، نفس مضمون کی سلامتی و عمدگی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۵) بغداد میں بویہیوں کی حکومت کے قیام ۳۳۴ھ تک، تیسرا بویہیوں کے غلبہ سے بغداد میں سلجوقیوں کی آمد ۴۴۷ھ تک، چوتھا سلجوقیوں کی بغداد میں آمد سے حکومت کے (۶۵۶ھ میں) تاتاریوں کے ہاتھ میں جانے تک۔

[1] ابن ابی الاصبع نے "تحریر التحبیر" میں لکھا ہے: "متقدمین اپنی عبارتوں میں سجع کا اس طور پر اہتمام و التزام نہیں کرتے تھے، الا یہ کہ وہ ان کلام میں فصاحت سجع کی متقاضی ہوتی۔ اور وہ بلا قصد و تکلف کے بہم پہنچ جاتی۔ لیکن ان کے جملے باہمدگر موزوں، الفاظ مناسب، معانی واضح، عبارتیں خوشنما اور فصلیں متقابل ہوتی تھیں۔ اور یہی امام علی رضا اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ارباب قلم کا اسلوب ہے مثلاً ابن المقفع سہل بن ہارون، جاحظ اور دیگر علماء ذاد باد وغیرہ"۔

ساتھ تخیل و تشبیہ میں وسعت، لازمی قیود ہیں۔ اس اسلوب کو اپنانے والوں میں صاحب ابن عباد، الوزیر المہلبی، خوارزمی، بدیع، صابی اور ثعالبی ہیں مقامات اسی طبقہ کے آثار میں سے ہے۔

چوتھے طبقہ کے سردار قاضی فاضل ہیں۔ ان کے اسلوب کی بنیاد سجع بندی اور بدیع پسندی میں تیسرے طبقہ کے اسلوب کے مطابق ہے۔ لیکن توریہ (لفظی ہیر پھیر، ابہام) اور تجنیس میں انہوں نے اس قدر غلو کیا کہ اس کے زمانہ میں انشاء پردازی محض تصنع و تکلفات کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ جس کے الفاظ نہایت خوبصورت و خوشنما ہوتے، لیکن مضمون ناقص اور خیال نامکمل۔ اس طرز کے انشاء پردازوں میں "المثل السائر" کے مصنف ابن الاثیر اور کاتب اصفہانی ہیں۔

لیکن انشاء پردازوں کے اس عقیدہ نے کہ اسلاف سے منقول نثر کو حفظ کر لینا ثقافت و ادب کا لازمہ اور تفوق و برتری کا ذریعہ ہے، قلموں میں یگانگت باقی نہ رہنے دی۔ اور اسالیب کو جدا جدا کر دیا۔ جس کے باعث ایک ہی زمانہ میں انشاء پردازی کے کئی مختلف طریقے ہونے لگے۔ چنانچہ آپ کو جاحظ کے زمانہ میں ابن عبد ربہ کی طرح ابن المقفع کے مقلد، اور ابن العمید کے زمانہ میں شریف رضی کی طرح امام علی رض کے پیرو ملیں گے۔ لیکن بایں ہمہ تمام ہمعصر انشاء پردازی اپنے سیاسی و اجتماعی حالات کے سامنے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی انشاء پردازی میں ایک مخصوص انداز پیدا ہو جاتا ہے جو ان کو دوسرے زمانوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

خطابت (تقریر)

حکومت کے پایہ کو مستحکم کرنے، لشکر کو لڑائی پر ابھارنے اور وفود کا استقبال و خیر مقدم کرنے کے لیے اس دور کے آغاز میں خطابت کو بڑی منزلت اور لوگوں کے دلوں پر اس کو بڑا اقتدار حاصل تھا۔ پہلے خلفاء اور ان کا پروپگنڈا کرنے والوں مثلاً منصور، مہدی، رشید، مامون، داؤد بن علی[1] خالد بن

---

[1] داؤد بن علی بن عبد اللہ بن عباس نے اپنے بائیس بھائیوں کے ساتھ صوبہ عمان کی حمیمہ نامی بستی میں پرورش پائی جہاں ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں اس کے باپ کو جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے علم سیکھا اور لخم، غسان اور قیس کے قبیلوں میں رہ کر فصاحت حاصل کی۔ پھر وہ اپنی بہادری، حمیت، پختگی رائے، آزادی فکر اور قوت گفتار کی وجہ سے شہرت پا گیا۔ اور ابوالعباس نے اپنی بیعت کے سال ہی میں ان کو کوفہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں کا گورنر بنا دیا اور اسی سال حجاز، یمن اور یمامہ کی گورنری کا بھی اضافہ کر دیا۔ انہوں نے اپنے ماتحت علاقوں میں بنو العباس کی حکومت کا پایہ مستحکم کیا اور جو بنی امیہ کے آدمی وہاں تھے ان کو سزائیں دیں۔ پھر زمانہ حج کے بعد انہوں نے مدینہ میں اقامت کر لی اور وہیں ماہ ربیع الاول ۱۳۳ھ میں انتقال کیا۔

صفوان اور شبیب بن شیبہؔ[1] میں اس فن کی بڑی اہمیت اور اس کا بڑا ملکہ موجود تھا۔

لیکن جب حکومت کی باگ ڈور پوری طرح بنو عباس کے ہاتھ میں آگئی، حکومت کی سیاست اور لشکر کی قیادت کا انتظام موالیوں نے سنبھالا۔ نیزوں اور زبانوں سے مقابلہ بازی میں کمی ہوئی تو فن خطابت پر دست گاہ حاصل نہ ہونے اور اس کی ضرورت باقی نہ رہنے کی وجہ سے یہ فن زوال پذیر ہونے لگا۔ اور بڑے بڑے معاملات طے کرنے، آپس کی عداوتیں دور کرنے کے لیے مکاتیب اور شاہی فرامین نے تقریروں کی جگہ لے لی۔ خطبات صرف جمعہ، عیدین اور نکاح کے موقعوں تک محدود ہو گئے۔ تاہم خلیفہ راضی کے زمانہ تک خلفاء بذات خود تقریریں کرتے اور نمازیں پڑھاتے رہے۔ لیکن جب خاندان بویہ نے اپنے غلبہ کے بعد ان کے ہاتھ جکڑ کر انہیں ان کے گھروں میں نظر بند کر دیا تو خطابت و امامت کا منصب بھی انہوں نے قابل اور ہوشیار علماء کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ اس دور کے آخریں مقرروں اور ادیبوں کی ایک جماعت، خطیب بغدادی، خطیب تبریزی، جیسے حضرات پر مشتمل تیار ہو گئی تھی۔ پھر جب مسلمانوں میں عجمیت آگئی، واعظوں کی زبانوں میں قوت گویائی نہ رہی۔ اور ان میں مختلف موضوعات پر تقریریں کرنے کی طاقت مفقود ہو گئی تو انہوں نے ابن نباتہ مصری جیسے اسلاف کے خطبات سے مدد لینی شروع کر دی۔ اور معنی و مطلب کے سمجھے بغیر ان لکھے ہوئے خطبوں کو حفظ کر کے ممبروں پر پڑھ کر سنانے لگے۔ اور باوجود طویل صدیاں گذرنے کے آج تک وہ اسی رسوا کن طریقہ پر لگے ہوئے ہیں۔

نثر کے نمونے

توقیعات

وہ مختصر تحریریں یا نوٹ جو خلیفہ، وزیر یا امیر و رئیس اپنے سامنے پیش کی جانے والی عرضیوں

---

[1] شبیب بن شیبہ بن عبد اللہ منقری تمیمی نے بصرہ میں نہایت عزت و آسودگی کے ساتھ پاک ماحول میں پرورش پائی، ابھی جوان بھی نہ ہونے پائے تھے کہ تقریریں کرنا شروع کر دیں۔ جو نہایت شیریں سہل اور پر اثر ہوتی تھیں۔ وہ مسلسل ترقی کرتے رہے حتی کہ ہر موقع پر اپنی مختصر سی تقریر میں وہ ایسا اثر پیدا کر دیتے جو پر زور مقررین کی بڑی بڑی تقریروں سے بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک دن ان کے چچا خالد بن صفوان نے انہیں اپنی قوم میں تقریر کرتے ہوئے سنا تو کہا "اے میرے بیٹے! تمہاری خوش بیانی مجھے میری موت کا پیغام دیتی ہے۔ اس لیے کہ ہمارے خاندان کا خاصہ ہے کہ جب اس میں کوئی نیا مقرر پیدا ہوتا ہے تو پہلا مقرر مر جاتا ہے"۔ شبیب نے اس سے کہا "خدا آپ کو زندہ رکھے اور مجھے آپ پر قربان کر دے"۔ منصور کی خلافت سے قبل اور اس کے بعد شبیب منصور کے خواص میں تھا۔ اور منصور کے ولی عہد مہدی کے زمانہ میں بھی اس کا یہ بلند مرتبہ باقی رہا اور وہ مہدی کے بے تکلف مقربین میں رہا تا آنکہ ۱۷۰ھ میں اس نے وفات پائی۔

پر، یا دکھ درد اور شکایت کی درخواستوں کے نیچے لکھ کر آخر میں اس پر اپنی دستخط ثبت کر دیتے "توقیعات" کہلاتی ہیں۔ اس مختصر سی تحریر (توقیع) کی مابہ الامتیاز خصوصیات اختصار، حسن و زیبائش اور زور بیان ہیں کبھی "توقیع" صرف ایک آیت، یا ضرب المثل، یا ایک شعر بھی ہوتی تھی، مثالیں:۔

سفاح نے ابوجعفر (جو واسط میں ابن ہبیرہ "سفاح" سے لڑائی میں مصروف تھا) کے خط پر نوٹ دیا:۔ "تمہاری بردباری نے تمہارے علم کو بگاڑ دیا۔ اور تمہاری کاہلی نے تمہاری وفاداری کو مشکوک بنا دیا۔ تم اپنے آپ کو میرے لیے اور خود کو اپنی بھلائی کے لیے قدرے مشقت میں ڈالو"

(ابوجعفر منصور نے والی خراسان عبدالحمید کے خط پر یہ مختصر تحریر لکھی: "تم نے شکایت کی تو ہم نے تمہاری شکایت کو رفع کیا۔ تم ناراض ہوئے تو ہم نے تمہاری ناراضی کا ازالہ کیا۔ پھر تم نے عوام میں فتنہ فساد شروع کر دیا۔ لہٰذا امن و سلامتی سے جدائی کے لیے تیار ہو جاؤ!")

والی مصر نے اپنے ایک خط میں دریائے نیل کے محصول گھٹنے کا ذکر کیا تو اس نے خط پر یہ نوٹ لکھا "اپنے لشکر کو فساد سے پاک کرو پھر نیل تمہارے قابو میں آجائے گا!"

والی ہند کے خط پر جس میں اس نے بتایا تھا کہ لشکر نے اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور بیت المال کے تالے توڑ ڈالے ہیں یہ نوٹ دیا: "اگر تم عدل سے کام لیتے تو لشکر بغاوت نہ کرتا اور اگر تم پورا پورا دیتے تو فوج لوٹ مار نہ مچاتی"

ہارون رشید نے والی خراسان کو یہ توقیع لکھ کر بھیجی "اپنے زخم کا علاج کرو تاکہ وہ بڑھنے نہ پائے۔"

جعفر بن یحییٰ کی شامت اعمال پر یہ نوٹ لکھا "وفاشعاری نے اسے اگایا بڑھایا اور نافرمانی نے اسے کاٹ دیا!"

مامون نے رستمی کی زیادتی کے بارے میں جس پر اس سے فریاد کی گئی تھی یہ مختصر تحریر لکھی "شیوہ مردانگی یہ نہیں ہے کہ تمہارے برتن سونے چاندی کے ہوں اور تمہارا قرض خواہ خالی جیب اور ہمسایہ خالی پیٹ رہے۔"

اپنے بھائی ابوعیسیٰ کے ظلم کی شکایت پر اسے یہ آیت لکھی "فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساءلون: جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن ان کے درمیان کسی قسم کے نسب کام نہیں آئیں گے۔ اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے سوال ہی کر سکیں گے!"

ابراہیم بن مہدی نے انہیں ایک خط میں لکھا "اگر آپ بخش دیں تو آپ کا احسان ہے اور اگر آپ سزا دیں تو آپ کا عدل ہے" انہوں نے اسی کے خط پر نیچے یہ نوٹ لکھ دیا "غلبہ و اقتدار کے بعد غصہ ختم ہو جاتا ہے۔ ندامت توبہ کا ایک عنصر ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان خدا کا عفو ہے۔"

ایک خدمت گذار کے وردی مانگنے کی درخواست پر یہ نوٹ دیا "اگر تمہیں وردی درکار تھی

تو اپنی خدمت کو پابندی سے انجام دیتے لیکن تم نے نیند کو پسند کیا لہٰذا تمہاری قسمت میں خواب ہے۔"

ایک قیدی سے متعلق عرضی پر جعفر بن یحییٰ نے یہ نوٹ دیا: عدل نے اسے قید میں ڈالا تھا اور توبہ اس کو رہا کر رہی ہے۔"

ایک شخص کے خط پر جس میں اس نے، اس کے کسی عملدار کی شکایت کی تھی (عملدار کے لیے) یہ نوٹ لکھا "تمہاری شکایت کرنے والے بڑھ گئے اور شکر گذار کم ہو گئے۔ یا تو اعتدال پر آجاؤ ورنہ میں تمہیں برخواست کر دوں گا۔"

ایک سائل کی درخواست پر جسے کئی بار دیا جا چکا تھا یہ لکھا "تھنوں کو اپنے علاوہ دوسروں کے لیے بھی چھوڑو تاکہ ان کے لیے بھی ان میں سے اسی طرح دودھ نکلے جس طرح تمہارے لیے نکلا۔"

تقریریں

ابو مسلم کے قتل کے بعد منصور نے مدائن میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "اے لوگو! اطاعت شعاری کی پر امن زندگی سے نافرمانی کی پر خوف زندگی میں نہ جاؤ۔ اور اپنے دلوں میں امراء کے خلاف کوئی سازش پوشیدہ نہ رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کرنے اور حق کو بلند کرنے کے لیے اس شخص کی حرکتوں یا زبان کی لغزشوں سے اس عداوت کو آشکارا کر دے گا جسے وہ چھپانا چاہتا ہے۔ ہم ہرگز تمہارے حق میں کوئی کمی نہیں کریں گے، نہ دین کے حق میں کوئی کوتاہی کریں گے۔ درحقیقت جس نے ہم سے اس عبائے خلافت کے بارے میں رسہ کشی کی اسے ہم نے اس میان کی پوشیدہ چیز (تلوار) سے کاٹ ڈالا، بلاشک ابو مسلم نے ہم سے بیعت کی تھی۔ اور ہمارے لیے لوگوں سے یہ کہہ کر بیعت لی تھی کہ جو ہم سے عہد شکنی کرے گا اس کا خون جائز ہو جائے گا۔ پھر اس نے ہم سے بیوفائی کی تو ہم نے اس پر بھی وہی فیصلہ جاری کیا جو اس نے دوسروں کے لیے کیا تھا۔ اس کے حق کی رعایت نے ہمیں اس بات سے نہ روکا کہ ہم اس کے خلاف حق قائم کریں۔"

قید سے رہائی کے بعد عبدالملک بن سالم ہاشمی کی وہ تقریر جس میں اس نے اپنے اوپر رشید کے مظالم کا ذکر کیا:۔

"بخدا حکومت وہ چیز ہے جس کا نہ میں نے اپنے دل میں خیال کیا نہ تمنا کی، نہ میں نے اسے چاہا، نہ اس کی جستجو کی، اور اگر میں اسے چاہتا تو وہ میری طرف نشیبی زمین میں بہنے والے پانی اور عرفج کی سوکھی لکڑی کے جلنے سے بھی زیادہ تیزی سے آتی۔ میں ناکردہ گناہوں کے عوض پکڑا جاتا ہوں اور ان چیزوں کے بارے میں مجھ سے سوال کیا جاتا ہے جنہیں میں جانتا بھی نہیں ہوں۔ لیکن بخدا جب اس رشید نے مجھے حکومت کا زیادہ اہل اور خلافت کے لیے خطرہ پایا، اور میرے پاس ایسا ہاتھ دیکھا جو اگر بڑھایا جائے تو حکومت کو پا لے گا اور اگر پھیلایا جائے تو خلافت تک پہنچ جائے گا اور میرے پاس ایسا نفس دیکھا جو خلافت کی تمام عادتیں اپنے اندر پورے طور سے رکھتا ہے۔ اور اپنی خصلتوں کی

وجہ سے حکومت کا مستحق ہے — حالانکہ میں نے ان عادتوں کو نہ تو تصنعاً اپنایا، نہ اپنے لیے منتخب کیا، نہ میں نے پوشیدہ طور پر خود کو حکومت کا امیدوار بنایا، نہ کبھی کھلے طور پر میں نے اس کا کوئی اشارہ کیا۔ اور اس نے دیکھا کہ خلافت میرے لیے اس طرح بیتاب ہے جس طرح ماں اپنے بچے کے لیے، اور وہ مجھ پر اس طرح جھکی چلی آرہی ہے جس طرح شوہر کو دیکھ کر محبت سے بے قابو ہو جانے والی عورت، اور اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں خلافت پوری طرح میری گرویدہ و مشتاق، اور میری طرف متوجہ نہ ہو جائے، تو اس نے مجھے ایسی سزا دی جو خلافت کی تلاش میں شب بیداری کرنے والے، اس کی جستجو میں تھک جانے والے، یکسوئی سے اس کے حصول میں کوشاں رہنے والے اور اس کے لیے اپنی ہر امکانی قوت صرف کر دینے والے کو دینی چاہیے۔ اب اگر اس نے مجھے اس لیے قید کیا تھا کہ میں حکومت کے لیے موزوں ہوں اور حکومت میرے لیے، میں اس کے لائق ہوں اور وہ میرے لائق، تو یہ کوئی جرم نہیں جس سے میں توبہ کروں، نہ میں نے کبھی اس کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ اب اپنے ہاتھ کو اس سے کھینچ لوں، اور اگر وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی سزا دائمی ہے اور اس کے عذاب سے کبھی چھٹکارا نہ ملے گا تا آنکہ میں حکم و علم، اور حزم و عزم میں اس کا فرمانبردار نہ ہو جاؤں تو جس طرح ضائع کرنے والا، نگران نہیں ہو سکتا، اسی طرح عقلمند بے وقوف نہیں بن سکتا۔ اور اس کے لیے دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ وہ مجھے میری عقل پر سزا دے یا اس بات پر کہ لوگ میری اطاعت کرتے ہیں۔ اور اگر مجھے حکومت کی خواہش ہوتی تو اس کو غور و فکر کا موقع بھی نہ دیتا، نہ انتظام کرنے کی مہلت! اور جو مصیبت آتی ہے وہ بہت کم ہو جاتی، اور بہت تھوڑی محنت کرنی پڑتی۔

جس دن ابو العباس سے بیعت لی گئی، داؤد بن علی نے کوفہ کے ممبر پر یہ تقریر کی:۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے! بخدا ہم اس لیے نہیں نکلے ہیں کہ تمہاری بستیوں میں نہریں کھودیں اور محل تعمیر کریں، کیا دشمن خدا یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ اس کی لگام ڈھیلی کر دی گئی ہے لہٰذا اب ہم اس پر کبھی قابو نہ پا سکیں گے، تا آنکہ وہ خود ہی اپنی لٹکی ہوئی لگام سے الجھ کر گر پڑا؟ اور اب کہ معاملہ واقف کار کے ہاتھ میں آگیا، کمان تیر اندازوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی حکومت اپنے پہلے دستور کے مطابق نبوت و رحمت کے گھرانہ میں واپس آگئی۔ تمام عرب و عجم بے خوف ہو گئے۔ تمہارے لیے خدا کا ذمہ ہے، رسول اللہ کی ضمانت ہے۔ حضرت عباسؓ کا واسطہ ہے۔ نہیں! اس گھر کے رب کی قسم! (اپنے ہاتھ سے کعبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہم تم میں سے کسی کو بھی خوفزدہ اور پریشان نہیں کریں گے۔

شبیب بن شیبہ نے مہدی کی بیٹی کی وفات پر تعزیتی تقریر میں کہا:۔

اے امیر المومنین! خدا نے آپ کے لیے اس صدمہ کا اجر رکھا ہے جو آپ کو پہنچا۔ پھر اس کے بعد آپ کو صبر عنایت کیا ہے۔ خدا نے آپ پر اس صدمہ سے ناقابل برداشت آزمائش کا بار نہ ڈالا، نہ آپ سے کوئی نعمت چھینی۔ اللہ کا ثواب آپ کے لیے مرنے والی سے بہتر ہے اور اللہ کی رحمت، مرحومہ کے لیے آپ سے بہتر ہے، اور سب سے زیادہ صبر کی مستحق وہ چیز ہے جس کے دوبارہ پالینے

کی کوئی سبیل ہی نہ ہو۔

مکاتیب

احمد بن یوسف نے ابراہیم بن مہدی کو اس تحفہ کے بارے میں جسے انہوں نے تھوڑا خیال کیا یہ لکھا:۔

مجھے خبر ملی ہے کہ میرے مرسلہ تحفہ کو آپ نے حقیر سمجھا، لیکن ہمارے درمیان جو بے تکلف دوستی ہے اس نے یہ آسانی پیدا کر دی کہ ہم تحفہ دینے میں کم اہتمام کریں۔ لہذا ہم نے بے تکلف دوست کی حیثیت سے اس شخص کو تحفہ بھیجا جو محض اپنے مفاد کو مد نظر نہیں رکھتا۔

اور ان کی صحت یابی پر ان کو یہ تہنیت نامہ لکھا:۔

خدا نے بیماری کے دکھ درد کو دور کر دیا اور اس کے اجر و ثواب کو زیادہ اور کیا۔ آپ کے دشمن کو بیماری کے آغاز میں ہونے والی خوشی سے کئی گنا زیادہ بیماری کے خاتمہ پر کوفت اور اذیت پہنچائی۔

محمد بن عبد الملک زیات نے خلیفہ کی طرف سے کسی گورنر کو لکھا:۔

امابعد امیر المومنین کو جس قسم کی اطلاع پہنچی وہ انہیں ناگوار گذری اور تمہاری حالت ان دو صورتوں میں سے ایک ضرور ہے جن میں سے ایک میں بھی تمہارے پاس کوئی معقول عذر نہیں جو تمہاری برائت ثابت کر سکے۔ یا تو تم نے اپنے کام میں کوتاہی کی ہے جس نے تمہارے حزم و احتیاط میں خرابی اور فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی پیدا کر دی۔ یا تم نے غنڈوں کی مدد اور مجرموں کے ساتھ رعایت کی ہے۔ ہر دو صورت میں اگر امیر المومنین کی بردباری، ڈھیل، قانون کے تحت گرفت سزا سے قبل عفو و تنبیہ، تمہارے شامل حال نہ ہوتیں تو تمہاری اس حرکت کی وجہ سے تمہارے ساتھ سختی روا اور تم کو سزا دینی ضروری ہو جاتی۔ بہر حال جتنی بڑی تمہاری لغزش معاف کی گئی ہے اسی اندازہ سے تم کو اب اپنی کوتاہی اور بدعملی کی تلافی میں زیادہ کوشش کرنا چاہیے۔ والسلام۔

ابو الفضل بن العمید نے ابو عبد اللہ کو لکھا:۔

میں اس حالت میں یہ خط لکھ رہا ہوں کہ اگر آپ کی ملاقات کا اشتیاق اس کو بدمزہ نہ کر رہا ہوتا اور آپ کے دیدار کا شوق اس کے سرور و اطمینان میں خلل انداز نہ ہوتا تو میں اسے بہترین حالت خیال کرتا اور اس حالت پر خود کو بڑا خوش نصیب سمجھتا کیونکہ اس میں مجھے ہر قسم کی سلامتی اور مکمل آسودگی میسر ہے، میرے جسم کو توانائی اور میری مساعی کو کامیابی حاصل ہے۔ لیکن تم سے دور رہ کر میرے لیے زندگی میں کوئی مزا باقی نہیں رہا اور تمہاری عدم موجودگی میں مجھے بے فکری و طمانینت نہیں ملتی، تمہیں چھوڑ کر تنہا کھانا پینا میرے گلے سے نہیں اترتا۔ اور میں تمہارے بغیر ان لذتوں سے بہرہ ور ہونے کی خواہش کیونکر رکھوں جب کہ تم میرے ہی ایک جزء اور میری پراگندہ محبت کو ایک لڑی میں پرونے والے ہو۔ میں تمہارے دیدار سے محروم کر دیا گیا ہوں اور تمہاری محبت کھو چکا ہوں۔ کیا کوئی

پراگندہ خاطر جس کا نفس فکروں میں بٹا ہوا ہو، اطمینان وسکون سے رہ سکتا ہے؟ کیا بے نظم گھر میں دل لگانے سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے؟ میں نے آپ کا خط پڑھا۔ خدا مجھے تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کرے آپ کی خوش خطی اور تصرف لفظی میں غور و فکر کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ میں ان کی ستائش نہیں کرتا اس لیے کہ تمہاری تمام ادائیں میرے نزدیک قابل ستائش ہیں، نہ میں ان کی مدح کرتا کیونکہ تمہارا ہر کام میرے دل و نظر میں قابل مدح ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے معاملہ کی حقیقت میرے اندازہ کے مطابق ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو خوب ہے ورنہ تمہاری محبت نے (میری عقل پر) پردہ ڈال دیا ہے اور میری نگاہ کو اس نے فریب دے رکھا ہے۔

مقامات

بدیع ہمذانی کا حرزیہ مقامہ

عیسیٰ بن ہشام نے ہم سے بیان کیا کہ جب دیس بدیس کے سفر نے مجھے ابواب (مقام) کے دروازہ پر لا کھڑا کیا اور میں دھن دولت لانے کی بجائے محض جان بچا کر واپس آنے پر رضامند ہو گیا، تو اس مقام میں داخل ہونے سے پہلے ایک پرجوش اور تند و تیز موجوں والا دریا پڑتا تھا جس میں ایسی ظالم کشتیاں تھیں جو اپنے سواروں کو تباہ کر دیتی تھیں، تب میں نے اللہ سے واپسی کے لیے استخارہ کیا اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ جب ہم دریا کے وسط میں پہنچے اور رات کی تاریکی نے ہم کو چھپا لیا تو گھنگھور گھٹا ہمارے اوپر چھا گئی جو بادلوں کے پہاڑ اپنے اندر لیے تھی، اور موسلا دھار بارش برسانے لگی۔ ساتھ ہی اس قدر تند و تیز ہوا چلی جو پیہم موج کے بعد موج روانہ کر رہی تھی اور بارش کی ایک فوج کے پیچھے دوسری فوج بھیج رہی تھی اور ہم آسمان کی بارش اور دریا کے پانی کے درمیان، موت کے پنجہ میں پھنس گئے تھے، اس وقت ہمارے پاس بجز دعا کے کوئی سامان تھا نہ رونے کے علاوہ کوئی چارہ کار، نہ امید کے سوا کوئی پناہ، ہم نے وہ رات بصد دقت و ہزار مشکل گذاری، صبح ہوئی تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر رو رہے تھے اور باہم شکوہ شکایت کر رہے تھے۔ مگر ہم میں ایک شخص ایسا تھا جس کی آنکھ تر نہ ہوئی تھی، جو بڑی بے فکری اور کامل اطمینان سے مگن بیٹھا تھا، بخدا ہمیں اس پر انتہائی حیرت ہوئی اور ہم نے اس سے کہا کہ تم کو تباہی اور موت سے کس چیز نے بے خوف کر دیا ہے؟ اس نے کہا "ایک تعویذ نے، جس کو ساتھ رکھنے والا ڈوبتا نہیں اور اگر تم چاہو کہ میں تم میں سے ہر ایک کو اس میں کا ایک تعویذ دے دوں تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں، تب تو سب ہی اس پر ٹوٹ پڑے اور تعویذ مانگنے میں اس سے اصرار کرنے لگے، اس نے کہا میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا تا وقتیکہ تم میں سے ہر ایک مجھے اس وقت ایک ایک دینار نقد ادا کرے اور ایک ایک دینار بعد میں بسلامت ساحل پر اتر کر دینے کا وعدہ کرے"۔ عیسیٰ بن ہشام کہتے ہیں کہ ہم نے فوراً ہی اس کو مطلوبہ رقم دے دی اور آئندہ

باقی رقم دینے کا وعدہ کیا تو اس کا ہاتھ جیب میں گیا اور اس نے ایک ریشمی کپڑا نکالا جس میں ایک ہاتھی دانت کی ڈبیا تھی، اس کے اندر کچھ پرچیاں تھیں، چنانچہ ہم میں سے ہر ایک نے اس میں سے ایک ایک پرچی اٹھالی، جب کشتی بسلامت ساحل پر لگ گئی اور اس نے ہمیں شہر میں اتار دیا تو اس نے لوگوں سے وعدہ وفا کرنے کا تقاضا کیا اور سب نے اس کو واجب الادا رقم دے دی، جب میری باری آئی تو اس نے کہا "اسے چھوڑ دو" میں نے کہا "یہ لو اپنی رقم، مگر پہلے اپنا بھید بتاؤ" اس نے "میں اسکندریہ کا باشندہ ہوں" میں نے کہا "صبر نے تمہاری مدد کیونکر کی اور تمہیں بے مدد کس لیے چھوڑ دیا؟" تو وہ یہ اشعار پڑھنے لگا:۔

ویلک لولا الصبر ما کنت ملأت الکیس تبرا
لن ینال المجد من ضا ق بما یغشاہ صدرا
ثم ما اعقبنی السا عة ما أعطیتُ ضرّا
بل بہ اشتد أزری و بہ اجبر کسرا
ولو انی الیوم فی الغر قی لما کُلِّفتُ عذرا

افسوس تجھ پر اگر صبر نہ ہوتا تو میں کبھی سونے سے اپنی جیب نہ بھر پاتا، جاہ و سروری وہ شخص نہیں حاصل کرتا جو مشکلات سے گھبرا جائے، پھر اس وقت تک جو کچھ مجھے دیا گیا اس کے لیے مجھے کوئی تکلیف اٹھانی نہیں پڑی، بلکہ اس رقم سے مجھے تقویت حاصل ہوگی اور اس سے میں اپنی تنگدستی دور کروں گا۔ اور اگر میں آج ڈوبنے والوں میں ہوتا تو مجھے معذرت پیش کرنے کی تکلیف نہ دی جاتی۔

حریری کا بغدادی مقامہ

جس میں وہ ایک بخشش مانگنے والی بڑھیا کی ... رہا ہے۔

اے امیدواروں کے ٹھکانو! اور اے بے بسوں کے والیو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں قبیلوں کی بلند مرتبہ بیبیوں اور اونچے گھرانوں کی معزز خواتین میں سے ہوں، میرے کنبہ والے اور میرا شوہر ہمیشہ مجلس کے وسط میں بیٹھتے، اور لشکر کے قلب میں رہتے، جانوروں کی پیٹھوں پر سوار ہوتے اور لوگوں پر احسانات کرتے رہتے تھے۔ جب زمانہ نے یاروں مددگاروں کو تباہ کر دیا اور اولاد کی موت کا صدمہ پہنچایا اور وہ ہم سے دشمنی پر اتر آیا تو نگہبان نے بے رخی برتی، دربان نے جفاکاری کی، دولت چلی گئی، چین و آرام ختم ہوگیا، ناکامیاں نصیب ہوئیں، داہنا ہاتھ کمزور ہوگیا، بایاں ہاتھ جاتا رہا، گھر کا اثاثہ تلف ہوگیا اور ہمارے پاس نہ جوان اونٹنی بچی نہ بوڑھی، جب سے چین آرام کی زندگی میں خلل آیا اور محبوب زرد (سونے) نے منہ پھیر لیا، میرا سفید دن سیاہ ہوگیا اور میرے سر کے سیاہ بال سفید ہوگئے، حتیٰ کہ یہ نوبت آن پہنچی کہ میرا جانی دشمن بھی مجھ پر ترس کھانے لگا، کیا اچھا ہوتا کہ میں اپنے زندگی کے دن پورے کر چکی ہوتی۔

تیسری فصل

انشاء پرداز

۱۔ ابن المقفع (متوفی ۱۴۲ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ عبد اللہ بن المقفع ایرانی نژاد اور عرب میں پرورش یافتہ ہے، تقریباً ۱۰۶ھ میں پیدا ہوا اور بصرہ میں امیروں کے بچوں کی طرح اس نے پرورش پائی، اس کا باپ داذویہ آتش پرست تھا جو حجاج بن یوسف کی طرف سے ایران کا لگان وصول کرنے پر مقرر تھا۔ شاہی رقم میں سے کچھ غبن کرنے کی وجہ سے حجاج نے اسے اتنا مارا کہ اس کا ہاتھ ٹیڑھا ہو گیا اور اسی وجہ سے اس کا لقب مقفع (یعنی مڑے ہوئے ہاتھ والا) پڑ گیا، عبد اللہ کی تربیت بچپن ہی سے اسلامی طریقہ پر ہوئی۔ روزگار کی طرف سے بے فکری نے اسے تعلیم کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ وہ ابھی پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے فارسی و عربی دونوں زبانوں کی انشاء پردازی میں کامل مہارت حاصل کر لی، عہد بنی امیہ میں داؤد بن ہبیرہ نے اور عہد بنی عباس میں عیسی بن علی منصور کے چچا نے انہیں اپنا معتمد (سیکریٹری) مقرر کر لیا اور مؤخر الذکر کے ہاتھ پر ہی وہ بعد میں اسلام لائے۔ ایک دن عبد اللہ نے ان سے کہا "اب میرے دل میں اسلام جگہ کر چکا ہے اور میں تمہارے ہاتھ پر اسلام لانا چاہتا ہوں"، تو عیسے نے اس کے اسلام قبول کرنے کی تقریب پر لوگوں کو گواہ بنانے کے لیے اس سے کہا کہ تم بڑے افسروں اور فوجی سرداروں کے سامنے صبح آکر اسلام قبول کرنا، پھر اسی دن رات کو اس نے عیسے کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھایا اور وہ مجوسیوں کی عادت کے مطابق ناک سے آوازیں نکالتے ہوئے کھانے لگا، جب عیسے نے اس کی اس حرکت پر اعتراض کیا تو اس نے کہا "میں بے دینی کی حالت پر رات گذارنا پسند نہیں کرتا"۔ پھر صبح وہ عیسے کے پاس آیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کا نام عبد اللہ اور کنیت ابو محمد رکھی گئی، اس سے قبل اس کا نام روزبہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ دنیوی نفع کی خاطر اسلام لایا تھا۔ اس پر قرآن کا مقابلہ کرنے، زندیقوں کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے الحاد کا الزام لگایا گیا ہے۔ نیز اس لیے کہ ایک مرتبہ مجوسیوں کے آتشکدہ کے سامنے سے گذرنے پر اس نے احوص کے مندرجہ ذیل دو اشعار پڑھے تھے:۔

یا بیت عاتکة الذی أتعزل   حذر العدی وبه الفؤاد موکل

انی لامنحك الصدود واننی   قسما الیك مع الصدود لامیل

اے عاتکہ کے گھر! جس سے میں دشمنوں کے خوف کی وجہ سے کنارہ کشی کر رہا ہوں، حالانکہ دل اسی کے حوالے ہے، میں تجھ سے (بظاہر) بے رخی برت رہا ہوں، لیکن بخدا میں اس اعراض کے

ساتھ دبباطن، تجھے بہت زیادہ چاہتا ہوں۔

بعد ازاں ابن المقفع، عیسے اور سلیمان، منصور کے دو چچاؤں کی خدمت میں رہا تا آنکہ امان کی تحریر کے واقعہ میں جس کی اسے منصور کی طرف سے اس سے چچا عبداللہ کو لکھنے کی تکلیف دی گئی تھی، اس نے اپنی تحریر میں خلیفہ کے لیے یہ سخت الفاظ استعمال کیے تھے: "اور جب امیرالمومنین اپنے چچا عبداللہ سے غدر کریں گے تو ان کی بیویاں مطلقہ، ان کے مویشی ضبط اور غلام آزاد ہو جائیں گے، اور تمام مسلمان ان کی بیعت سے آزاد ہو جائیں گے۔" چنانچہ منصور اس پر بہت غصہ ہوا اور سفیان بن معاویہ مہلبی والی بصرہ کو اس کے قتل کا حکم دے دیا جو پہلے سے ابن مقفع پر جلا بیٹھا تھا اس لیے کہ وہ بصرہ کے معزز لوگوں کی موجودگی میں اس کا مذاق اڑاتا اور اس کی توہین کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ سفیان کی ناک بہت بڑی تھی، اس لیے جب کبھی ابن المقفع اس کے پاس جاتا تو کہتا "السلام علیکما" (تم دونوں پر سلام ہو) یعنی سفیان اور اس کی ناک۔ چنانچہ والی بصرہ نے اس موقع کو غنیمت شمار کیا اور اسے آگ میں جلا کر مار ڈالا، اس وقت اس کی عمر چھتیس (۳۶) برس تھی۔

اخلاق اور علمی قابلیت:

ابن المقفع نہایت ذہین، خوش گفتار اور عربی و فارسی ادب کا جید عالم تھا۔ بلاغت زبان، زور قلم، ترجمہ کی روانی و عمدگی، نئے نئے معانی و مضامین کی اختراع اور انوکھے کردار کی ایجاد میں وہ سب سے آگے تھا[1]۔" وہ علم کلام کو اپنانے کی کوشش کرتا تھا لیکن اس میں کچھ بھی حسن پیدا نہ کر سکا۔

کہا جاتا ہے کہ صحابہ زمنہ کے بعد عربوں میں خلیل اور عجمیوں میں ابن المقفع سے زیادہ ذہین کوئی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ ان دونوں دوستوں کی پہلی ملاقات ہوئی اور یہ تین دن تک آپس میں گفتگو کرنے کے بعد جدا ہو گئے۔ خلیل سے پوچھا گیا "تم نے عبداللہ کو کیسا پایا؟" انہوں نے کہا "تمہیں جس قدر علم و ادب درکار ہو وہ اس کے پاس ہے، البتہ اس کا علم اس کی عقل سے بہت زیادہ ہے۔" اور عبداللہ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے خلیل کو کیسا دیکھا؟ تو اس نے کہا "وہ علم و ادب سے پوری طرح آراستہ ہیں لیکن ان کی عقل ان کے علم سے بہت زیادہ ہے۔" ابن المقفع سے سوال کیا گیا "آپ کو تہذیب و ادب کس نے سکھایا؟" تو اس نے جواب دیا "میرے اپنے نفس نے، جب میں اپنے علاوہ کسی میں کوئی خوبی دیکھتا تو اس کو اپنے اندر پیدا کرتا اور اگر کوئی برائی دیکھتا تو اس سے باز رہتا۔" بہر حال ابن المقفع نہایت پاکباز، ادیب اور اپنے دوستوں کا وفادار تھا اور عبدالحمید کے ساتھ اس کا جو واقعہ ہوا وہ اس امر کا شاہد ہے[2]۔

---

[1] ابن المقفع کے متعلق یہ رائے جاحظ کی ہے جو اس نے "معلمین" کے موضوع پر لکھے ہوئے مضمون میں بیان کی ہے۔

[2] یہ قصہ مفصل طور پر عبدالحمید انشاء پرداز کے حالات میں گذر چکا ہے۔

اس کی نثر و نظم:- یہ پہلے طبقہ کے انشاء پردازوں کا سرگروہ ہے، اس نے انشاء پردازی میں فارسی و عربی کے اسالیب سے ایک ایسا جداگانہ اسلوب ایجاد کیا جو اس کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور صرف اسی کے ہاں ملتا ہے۔ ہم پچھلے صفحات میں نثر کی بحث کے تحت اسے بالتفصیل بیان کر آئے ہیں۔ اس کے اشعار کم لیکن عمدہ ہیں، حماسہ کے مولف نے ان میں سے یحییٰ بن زیاد کے مرثیہ کے یہ اشعار نقل کیے ہیں:-

رزئنا ابا عمرو ولا حیّ مثله　　فللّه ریب الحادثات بمن وقع

فان تك قد فارقتنا وتركتنا　　ذوی خلّة مافی انسداد لها طمع

فقد جرّ نفعا فقدنا لك اننا　　أمنّا علی كلّ الرزایا من الجزع

ہمیں ابو عمرو کی موت کا صدمہ پہنچا اور کوئی زندہ شخص اس کی طرح کا نہیں ہے، تعجب ہے زمانہ کی گردشوں پر کہ وہ کیسے شخص پر آئیں۔ اگر تم ہم سے جدا ہو گئے اور ہم میں ایسی کمی چھوڑ گئے جس کے پورا کرنے کی کوئی امید نہیں تو تمہاری موت نے ہمیں یہ فائدہ بھی پہنچایا کہ اب ہم (آیندہ کے لیے) دیگر تمام صدموں اور تکلیفوں پر گھبرانے اور پریشان ہونے سے بے خوف ہو گئے ہیں۔

اس کے تراجم و تصانیف:- ابن المقفع زبان پر کامل قدرت رکھنے والا مترجم تھا، اس کے ترجمہ میں غیر زبان کا کوئی اثر نہیں جھلکتا، نہ اس کے ترجمہ اور ذاتی تصنیف میں آسانی سے فرق کیا جا سکتا ہے، اس کی کتاب "کلیلہ و دمنہ"[۱] بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ کتاب ترجمہ ہی ہے، رہتی دنیا تک صحیح و بلیغ ترجمہ کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ رہے گی۔ ابن المقفع جیسا کہ قفطی نے کہا ہے، سب سے پہلا شخص ہے جس نے ملت اسلامیہ میں ابو جعفر منصور کے لیے منطق کی کتابوں کے ترجمہ کی طرف توجہ مبذول کی، چنانچہ اس نے منطق میں ارسطو کی تین کتابوں اور فرفوریوس صوری کی کتاب ایساغوجی کا ترجمہ کیا، ان کتابوں کا عربی ترجمہ اس نے فارسی کے ترجموں سے کیا تھا اس لیے کہ ارجح خیال یہی ہے کہ وہ فارسی کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتا تھا۔ اس نے نوشیروان کی سوانح عمری میں کتاب التاج کا ترجمہ کیا۔ اس نے اخلاقیات میں دو کتابیں "الادب الصغیر" اور "الادب الکبیر" اور اطاعت حاکم کے موضوع پر "کتاب الیتیمۃ" تصنیف کیں۔

اس کی نثر کا نمونہ:- وہ لکھتا ہے:-

"تمہیں نادان کی رشتہ داری ہمسائیگی اور محبت و پیار، اس کی شرارت و بدی سے بے خوف و مطمئن نہ کر دے۔ اس لیے کہ انسان آگ سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے اسی قدر اس سے زیادہ ڈرتا ہے، یہی حال نادان کا ہے، اگر وہ تمہاری ہمسائیگی میں رہے گا تو تم کو دق کر دے گا اور اگر وہ

---

[۱] "کلیلہ و دمنہ" کے متعلق تفصیل آگے قصوں اور کہانیوں کی بحث میں ملاحظہ کیجیے۔

تمہارا رشتہ دار ہوگا تو تم پر بہتان تراشے گا اور اگر وہ تم سے پیار و محبت کا اظہار کرے گا تو وہ تم پر تمہاری طاقت سے زیادہ بار ڈال دے گا اور اگر وہ تمہارے ساتھ رہے گا تو تم کو تکلیف دے گا اور ڈرائے گا۔ بایں ہمہ وہ بھوک میں خونخوار درندہ، پیٹ بھرا ہونے پر سنگدل بادشاہ اور دین میں ہم خیال ہونے پر جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ لہذا تمہیں اس نادان کی صحبت سے اس سے بھی زیادہ تیزی سے دور بھاگنا چاہیے جتنا کہ تم کالے سانپوں کے زہر، خوفناک آگ کی لپیٹ، زیر بار کر دینے والے قرض اور لاعلاج بیماری سے بھاگتے ہو!"

دوسری جگہ وہ لکھتا ہے :۔

"اگر تم اپنے آپ کو ہر مجلس، ہر مقام، ہر بات، ہر رائے اور ہر کام میں اپنے حقیقی مرتبہ سے کچھ نیچے گرا سکو تو ضرور گرا لو، کیونکہ لوگوں کا تم کو تمہارے نیچے درجہ پر سے اٹھا کر بلند کرنا اور مجلس میں تمہیں دور بیٹھے ہوئے کو اپنے قریب بلانا اور جتنی تم خود اپنی بات کی عزت نہیں کرتے اس سے زیادہ ان کا تمہاری باتوں کی عزت کرنا اور اپنی بات اور اپنے خیال کو جتنا تم عمدہ نہ بتاؤ اس سے زیادہ لوگوں کا اسے عمدہ بتانا، یہی در اصل جمال (اور مقبولیت) ہے۔"

ایک جگہ وہ کہتا ہے :۔

"میرا ایک دوست تھا جو میری نظر میں تمام لوگوں سے زیادہ محترم و معزز تھا۔ وہ اصل سبب جس نے اسے میری نظر میں بزرگ و محترم بنایا، یہ تھا کہ اس کی نظر میں دنیا حقیر تھی۔ وہ اپنے پیٹ کا غلام نہ تھا، اس لیے جو چیز وہ نہ پاتا اس کی خواہش نہ کرتا اور جب کوئی چیز پا لیتا تو زیادہ نہ لیتا۔ اس کی زبان مطلق العنان نہ تھی، اس لیے جو بات نہ جانتا اسے منہ سے نہ نکالتا اور جس بات کو جانتا اس میں اصرار اور جھگڑا نہ کرتا۔ اس پر جہالت کی حکومت بھی نہ تھی۔ لہذا جب تک اسے فائدہ کا پختہ یقین نہ ہو جاتا وہ کسی کام کو کرنے کے لیے آگے نہ بڑھتا۔ زیادہ وقت وہ خاموش رہتا لیکن جب بات کرتا تو تمام بولنے والوں سے سبقت لے جاتا، وہ کمزور تھا اور لوگ اسے بے یار و مددگار خیال کرتے تھے لیکن جب کوئی اہم معاملہ آن پڑتا تو وہ حملہ آور شیر تھا۔ وہ کبھی مقدمہ میں حصہ نہ لیتا، نہ جھگڑے میں شریک ہوتا، نہ کوئی دلیل و ثبوت پیش کرتا تا آنکہ وہ ہوشیار قاضی اور سچے گواہوں کو نہ دیکھ لیتا۔ وہ کسی کو ایسی حرکت پر ملامت نہ کرتا جس پر اس کے پاس کوئی عذر ہوتا تا وقتیکہ وہ اس کا عذر معلوم نہ کر لیتا۔ وہ اپنے درد کی شکایت صرف اسی سے کرتا جس سے اسے صحت یابی کی امید ہوتی۔ وہ کسی دوست سے مشورہ نہ کرتا تا وقتیکہ وہ اس سے خیر خواہی کی امید نہ رکھتا۔ وہ نہ اکتاتا، نہ غصہ ہوتا، نہ گلہ کرتا، نہ بہت سی چیزوں کی خواہش کرتا، نہ وہ دشمن سے بدلہ لیتا، نہ دوست سے غافل رہتا، نہ وہ اپنے دوستوں کو چھوڑ کر صرف اپنی ذات کے لیے، کسی قسم کی کوشش، چارہ سازی اور تدبیر و قوت کو خاص کرتا۔

اگر تم طاقت رکھتے ہو تو ان خصائل کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرو اور تم ہرگز یہ سب صفات اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے لیکن سب کچھ چھوڑ دینے سے تھوڑا سا لے لینا بہتر ہے۔

۲۔ جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ)

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ ابو عثمان عمر بن بحر، جاحظ بصرہ میں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پاکر بڑھا۔ ان دنوں بصرہ گہوارۂ علم و بزم ادب تھا، چنانچہ وہ پوری محنت سے سبق پڑھنے اور علم حاصل کرنے میں منہمک رہا۔ اس نے اصمعی اور ابوعبیدہ جیسے لغت و روایت کے بلند پایہ و ناقد علماء سے علم حاصل کیا۔ ابو اسحٰق نظام معتزلی سے علم کلام میں سند حاصل کی اور انہی کا ہم خیال ہوگیا۔ اپنی تحریروں میں بھی معتزلہ کے مذہب کی حمایت کرتا۔ عرب کے بہت سے انشاء پردازوں اور فارسی زبان سے ترجمہ کرنے والوں کے ساتھ رہا۔ ان سے روایتیں بیان کیں اور علمی استفادہ کیا۔ کتب بینی کا بڑا شوقین تھا۔ جو کتاب اس کے ہاتھ میں آتی اسے ختم کرنے اور اس کے جوہر کو پوری طرح اخذ کرنے سے قبل اسے ہاتھ نہ چھوڑتا۔ وہ کاتبوں اور کاغذ فروشوں کی دکانیں کرایہ پر لے لیتا اور ان میں بیٹھ کر مطالعہ میں مصروف رہتا حتیٰ کہ اسے بہت سے علمی مسائل ضبط اور ازبر ہو گئے متعدد علوم و فنون کے اسرار معلوم کیے اور ادب میں وہ بے نظیر عالم بن گیا۔

اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس نے بے فکری و آسودگی کے ساتھ اپنے پیدائشی وطن میں رہ کر تصنیف و تالیف میں گذارا۔ وہ اپنے خطوط و رسائل، مضامین و تصانیف کی وجہ سے گورنروں میں مقبول اور شہر کے باعزت لوگوں میں معزز تھا۔ پھر مامون، معتصم، واثق اور متوکل کے زمانوں میں تلاشِ معاش کے لیے بغداد کا سفر کرتا رہا، اس کے بعد محمد بن عبد الملک کی تینوں وزارتوں کے زمانہ میں وہ انہی کا ہو رہا، اور وزیر پر آفت آنے کے بعد اس نے بصرہ میں قیام کر لیا۔ آخری عمر میں اس کے آدھے جسم پر فالج کا حملہ ہوا اور یہ مرض بڑھتا گیا تا آنکہ ۲۵۵ھ میں تقریباً سو برس کی عمر پا کر دنیا سے رخصت ہوا۔

اس کا حلیہ اور اس کے اخلاق:۔ جاحظ بے ڈول بدن، بدشکل چہرہ اور بد وضع ابھری ہوئی آنکھوں والا تھا اسی وجہ سے اس کا لقب جاحظ (ابھری آنکھوں والا) پڑ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ متوکل نے جب اس کے علم و فہم کی تعریفیں سنیں تو اسے اپنے لڑکے کا اتالیق بنانے کے لیے "سرمن رأی"[1] میں اپنے پاس بلوایا۔ لیکن جب اس کی مکروہ شکل دیکھی تو اسے دس ہزار درہم دے کر واپس کر دیا۔ جاحظ طنز و مزاح کا خوگر نیز مروجہ رسومات و آداب کی ہنسی اڑانے کا عادی تھا۔ تاہم وہ نہایت سلیم الطبع، زندہ دل، شگفتہ مزاج، ظریف اور اپنے دوستوں کا سچا سمدرد تھا۔

اس کا علمی و ادبی مرتبہ:۔ اس مختصر سے بیان اور کوتاہ قلم میں یہ قوت نہیں کہ وہ نابغۂ عرب، اور مشرق کے والٹیر کے ادبی تاثرات کو قارئین کے سامنے بیان کر سکے۔

---

[1] بغداد کے قریب ایک شہر۔

ہمارے لیے صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ وفورِ علم، قوتِ استدلال، بحث کے تمام پہلوؤں پر احاطہ، مقابلہ میں شدت اور کلام کے دل نشیں و بلیغ ہونے کے باعث وہ اپنے تمام ساتھیوں سے سبقت لے گیا تھا۔ علم کلام میں اس کا مطالعہ بہت گہرا تھا اور اسی نے علم کلام کو یونانی فلسفہ سے ملایا تھا۔ عقیدۂ توحید میں اس نے تمام متکلمین کو چھوڑ کر اپنا ایک جداگانہ مسلک ایجاد کیا جس کی بہت سے متکلمین نے تائید کی اور ان تائید کرنے والوں کا نام "جاحظیہ" پڑ گیا۔ دیگر علوم میں وہ دوسرے علماء کا ہم خیال رہا اور ان تمام علوم میں وہ زبردست محقق عالم کی طرح سنجیدہ و مزاحیہ مضامین لکھتا رہا۔ اور یہی سب سے پہلا عربی عالم ہے جس نے سنجیدہ و مزاحیہ مضامین کی باہم آمیزش، اور گفتگو کے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔ بہت سی تصانیف چھوڑیں اور حیوانات و نباتات، اخلاقیات و اجتماعیات کے موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔

اس کی نثر و نظم: جاحظ انشاء پردازی کو پرانے طرز سے نکال کر اسے ایک نئے طرز اور جدید موضوع کی طرف لایا۔ اس نے خط نویسوں، مضمون نگاروں اور مصنفوں کے لیے انشاء پردازی میں ایک نیا راستہ کھولا جیسے ہم انشاء پردازی کے سلسلہ میں بیان کر آئے ہیں، لہٰذا یہاں اسے دھرانے کی ضرورت نہیں۔ بدیع کا قول ہے: "جاحظ کے کلام میں اشارہ کا بعد، عبارت کا قرب اور استعارہ کی قلت ہے"۔ یہ فیصلہ اگرچہ سخت ہے تاہم بہت جگہوں پر درست ثابت ہوتا ہے۔ رہی اس کی شاعری تو اس میں نہ کوئی دل کشی ہے نہ جمال۔ شاعری میں اس کا رجحان پرانے طرز کی طرف ہے، جدید تخلیقی اسلوب کی طرف نہیں۔ اس کے اشعار کم ہیں، جو اس کے خطوط و مضامین اور اس کی تصانیف میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً وزیر ابن عبدالملک کی شان میں کہے ہوئے اشعار:۔

بدا حين أثرى لإخوانه ... فقلل منهم شباة العدم
و ابصر كيف انتقال الزمان ... فبادر بالعرف قبل الندم

جب وہ مالدار ہوا تو اپنے دوستوں کے سامنے آیا اور ان کی ناداری و حاجتمندی کے زور کو توڑ دیا۔ اور اس نے دیکھ لیا کہ زمانہ کے تغیرات کیونکر رونما ہوتے ہیں لہٰذا اس نے پشیمانی سے پہلے ہی خیر و سخاوت کرنا شروع کر دی۔

اس کے دیگر اشعار:۔

لئن قُدِّمت قبلی رجال فطالما ... مشيت على رِسْلِي فكنت المقدّما
ولكن هذا الدهر تاتى صروفه ... فتبرم منقوضا و تنقض مبرما

اگر مجھ سے قبل بہت سے لوگ آگے بڑھا دیے گئے تو بسا اوقات میں اپنی معمولی رفتار سے چل کر بھی سب سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ لیکن اس زمانہ کے انقلابات و حوادث ڈھیلے اور کمزور کو مضبوط اور مضبوط کو کمزور کر دیتے ہیں۔

اس کی تصانیف: جاحظ کی تصنیفیں دو سو سے زائد ہیں۔ اور یہ تصانیف جیسا کہ استاذ ابن العمید نے کہا ہے "اولاً عقل اور ثانیاً ادب سکھاتی ہیں"۔ ان میں سے دو کتاب البیان والتبیین

ادب و انشاء اور خطابت ہیں۔ "کتاب الحیوان" جو اپنے موضوع پر عربی زبان کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اور "کتاب المحاسن والاضداد" "کتاب البخلاء" اور اس کے مضامین وخطوط کے مجموعہ کے علاوہ کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔

اس کی نثر کا نمونہ:- اپنے ایک دوست کو ملزم ٹھہراتے ہوئے وہ لکھتا ہے:-

اے بے وفا! بخدا اگر میرا جگر تیری محبت میں زخمی اور میری روح تیری وجہ سے گھائل نہ ہوتی تو میں بھی تیری اس کشیدگی کا ترکی بترکی جواب دیتا۔ اور تیرے ساتھ جدائی کی رسی کو ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ میں خدا سے امید کرتا ہوں کہ وہ میرے صبر کو تیری بے وفائی پر غالب کر کے تجھے پھر سے میری دوستی کی طرف اس حالت میں واپس لے آئے کہ دشمنی کا منہ کالا ہو۔ ہمیں ملے ہوئے بہت زمانہ گذر چکا ہے۔ شاید ملاقات کے وقت ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکیں گے۔

اپنے تربیع وتدویر والے خط میں، جو اس کا بلیغ ترین خط ہے، وہ لکھتا ہے:-

باوجود تمہاری محبت کے ہم تمہاری نافرمانی و مخالفت کے عادی ہو گئے ہیں۔ کبھی مذاق کے طور پر کبھی بھولے سے کبھی تمہارے عفو اور اس کریمانہ اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے جس کے تم زیادہ لائق ہو۔ بہرحال اگر ہم بھروسہ کریں اور اس پر جے رہیں بعد ازاں اس سے انکار کر جائیں تو آپ کے لطف وکرم میں اس قدر وسعت ہے کہ وہ ہماری غلطی کو چھپالے۔ اور آپ کی نوازش وعنایت میں اتنی گنجائش ہے کہ آپ ہماری لغزشوں سے چشم پوشی کر لیں۔ خاص طور پر اس شکل میں جب کہ ہم بھولے۔ اور پھر ہمیں یاد آگیا۔ ہم نے معافی مانگی اور طویل معذرت کرتے رہے۔ اب اگر تم اسے قبول کر لو تو تم نے اپنا حق پالیا اور اپنی ذات کا بھلا کیا۔ اور اگر نامنظور کرو تو جاؤ جو کچھ تم سے ہو سکے کرو۔ اور اگر تم ہم پر رحم کھاؤ تو خدا تم پر رحم نہ کھائے۔ اور اگر تم ہم سے درگذر کرو تو خدا تم سے درگذر نہ کرے۔ اور میں وہی شعر کہتا ہوں جو بنو منقر کے شاعر نے کہا تھا:-

فما بُقیا علیّ ترکتمانی   ولکن خفتما صدّ النبال

کچھ میرے اوپر احسان کرتے ہوئے تم نے مجھے نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ تم تیروں کی بوچھاڑ سے ڈر گئے۔

بخدا! اگر تم بجیلہ (قبیلہ) کو میرے مقابلہ پر لاؤ گے تو میں کنانہ (قبیلہ) کو تمہارے مقابلہ پر لے آؤں گا۔ اور اگر تم صالح بن علی کو میری مخالفت کے لیے کھڑا کرو گے تو میں اسماعیل بن علی کو لا کھڑا کروں گا۔ اگر تم سلیمان بن وہب کو ساتھ لے کر مجھ پر حملہ کرو گے تو میں حسن بن وہب کو ساتھ لے کر تم کو کچل ڈالوں گا۔ تمہارے لیے میں یہی رائے مناسب سمجھتا ہوں کہ امن وعافیت کو قبول کر لو۔ اور خدا سے سلامتی کے خواہاں رہو۔ سرکشی سے بچو! کہ اس کا انجام برا ہے۔ اور ظلم سے ڈرو کیونکہ اس کی چراگاہ بدہضمی پیدا کرنے والی ہے۔ اور خبردار! جریر سے جب کہ وہ ہجو پر مائل ہو، فرزدق سے جب کہ وہ فخر کی ترنگ میں ہو، ہرثمہ

سے جب کہ وہ نظم وتدبیر میں لگا ہو، قیس بن زہیر سے جب کہ وہ چال چل رہا ہو، اغلب سے جب کہ وہ پلٹ کر حملہ کر رہا ہو۔ طاہر سے جب کہ وہ چڑھائی کر رہا ہو، کبھی منہ نہ لگتا۔ اور جس نے اپنا رتبہ پہچان لیا اس نے اپنے دشمن کا مرتبہ بھی پہچان لیا۔ جس نے اپنے آپ کو نہ جانا اس نے دوسرے کا مرتبہ بھی نہ جانا۔ تم شاہراہ پر چلو اور پگڈنڈیوں کو چھوڑ دو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور بخدا تم طوعاً وکرہاً اور ہر علمی ذریعہ سے بخوبی جانتے ہو کہ میں تم سے جنگ میں زیادہ زبردست، چالبازی میں زیادہ ہوشیار، علم میں زیادہ حلم میں بھاری، زیادہ سلیم الطبع، زیادہ شریف الاصل، دھوکہ بازی میں کمتر، زیادہ خوش قد، زیادہ گہرا، زیادہ وجیہ وخوبرو، زیادہ خوش مذاق وخوش گفتار وخوش زبان وخوش بیان اور زیادہ خوش منظر وخوش وضع ہوں۔ اور تم ایسے شخص ہو جو شدید علم رکھتا ہو، اکا دکا خبریں جانتا ہو۔ اور اپنے آپ کو مصنوعی آرائش سے مزین کرتا، اپنے مرتبہ کو خود ہی بڑا بتاتا، کپڑے پہن کر بارعب بننا چاہتا، اور سواریوں پر بیٹھ کر عزت وشرافت حاصل کرتا، اور پرتپاک ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ علاوہ ازیں تمہارے پاس کچھ نہیں۔ اور کیا وجہ ہے کہ دریا نالوں سے، مادہ غیر مادہ سے، اور لامحدود، جزء لایتجزا سے مقابلہ کر رہا ہے؟ اور کون ہے جو نیزہ اور گیند، چکی اور تلوار کو برابر ٹھہراتا ہے؟ یکسانی توان دو چیزوں میں ہوتی ہے جو انتہائی بہتر یا انتہائی بدتر ہوں۔ اور ان میں آپس میں یگانگت قرب اور برابری ہو نہ کہ متفاوت ومختلف چیزوں میں۔ لیکن سرکہ اور شہد، کنکر اور پہاڑ، زہر اور عمدہ خوراک، فقیری اور امیری تو ایسی واضح چیزیں ہیں کہ ان میں نہ ذہن غلطی کر سکتا ہے نہ حس دھوکہ کھا سکتی ہے۔

۳۔ ابن العمید (متوفی ۳۶۰ھ)

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ ابوالفضل محمد بن حسین المعروف بہ ابن العمید فارسی الاصل اور قم نامی شہر کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ خوش بیان خط نویس تھا، جو نوح بن نصر فرمانروائے بخارا کا سکریٹری تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی پرورش ادبی ماحول میں کی، اسے انشاء پردازی کی مشق کرائی اور علم غذا بہم پہنچائی تا آنکہ وہ انشاء پردازی وخط نویسی میں ماہر ہو گیا، فلسفہ وعلم نجوم کا اس نے بہت زیادہ مطالعہ کیا تھا جس کے باعث اس کا نام استاذ اور لقب جاحظ ثانی پڑ گیا تھا۔

جب وہ پوری طرح زیور علم سے آراستہ ہوا اور اس کی علمی استعداد پختہ ہوئی تو بخارا چھوڑ کر وہ بلاد جبل میں خاندان بویہ کی مملکت میں چلا گیا، جہاں اس کو سرکاری نوکریاں ملیں اور وہ برابر ترقی کے زینہ پر چڑھتا اور بلندی کے مدارج طے کرتا رہا، تا آنکہ ۳۲۸ھ میں وہ رکن الدولہ (ابو علی حسن) بن بویہ کا وزیر بن گیا، اس نے پوری قابلیت اور مستعدی سے وزارت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا اور حکومت کے انتظامات کی دیکھ بھال کی۔ جود وسخاوت میں اس نے خاندان برمک کے طریقہ کی پیروی کی، جس کی وجہ سے بغداد، شام اور مصر کے شعراء وعلماء اس کے پاس جوق درجوق مدد مانگنے

کے لیے آنے لگے۔ اس طرح وہ، صاحب بن عباد اور وزیر مہلبی اس زمانہ کی علمی تحریک کی روح اور ادبی دائرہ کے محور بن گئے تھے۔ خود متنبی باوجود اپنے بلند مرتبہ کے اس کی تعظیم کرتا اور اس سے خائف رہتا تھا۔ اس کی شان میں متنبی کے بہت سے مدحیہ قصائد ہیں، جن میں سے وہ قصیدہ بھی ہے جس کا مطلع ہے:-

باد هواك صبرت أم لم تصبرا ۔۔۔ و بُكاك ان لم يجر دمعك أوجرى

تو صبر کرے یا بے صبری سے کام لے بہر حال تیرا عشق آشکارا ہو کر رہے گا اور خواہ تو آنسو بہائے یا نہ بہائے تیرا رونا ظاہر ہو جائے گا۔

آگے چل کر اسی قصیدہ میں وہ کہتا ہے:-

من مبلغ الأعراب أنى بعدها ۔۔۔ شاهدت رسطاليس والاسكندرا

وملت نحر عشارها فاضافنى ۔۔۔ من ينحر البدر النضار لمن قرى

وسمعت بطليموس دارس كتبه ۔۔۔ متملكا متبديا متحضرا

ولقيت كل الفاضلين كأنما ۔۔۔ رد الاله نفوسهم والاعصرا

کون ہے جو دیہاتی عربوں کو یہ خبر پہنچا دے کہ ان کو چھوڑنے کے بعد میں نے ارسطو و سکندر (یعنی ممدوح) سے ملاقات کی، میں اونٹنیوں کے ذبح کرنے سے اکتا گیا تھا تو میں نے ممدوح کو وہ شخص پایا جو مہمان کے لیے سونے کی تھیلیوں کے منہ کھول دیتا ہے۔ اور میں بطلیموس کو اپنی کتابیں پڑھتے سنا اور اسے حکومت کرتے دیہات و شہر میں گھومتے پھرتے دیکھا۔ اور ممدوح سے مل کر میں نے گویا تمام فاضلوں سے مل لیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے تمام باکمال لوگوں کی روحوں اور ان کے زمانوں کو پھر سے دنیا میں بھیج دیا ہے۔

لیکن ابن العمید کو چین اور اطمینان کی زندگی کم نصیب ہوئی، قسم قسم کی بیماریوں نے اس کا پیچھا لے لیا اور یکے بعد دیگرے قولنج اور گٹھیا کے حملے ہوتے رہے، تا آنکہ ۳۶۰ھ میں اس نے اپنی جان خدا کے حوالے کر دی۔

اس کی نظم و نثر: ابن العمید کا زمانہ تکلف و باریک بینی، نزاکت و آرائش اور تخیل و شاعری کا زمانہ تھا۔ چنانچہ اس کی طبیعت نے اسے ایک ایسے جدید اسلوب وضع کرنے کی طرف رہنمائی کی جس کے فقرے متناسب و موزوں، عبارت خوشنما نظم و ترتیب میں ندرت اور معنی میں جدت تھی۔ اس کے تمام ہم عصروں نے زمانہ کے ذوق کا ساتھ دینے، اور وزیر کے فضل و مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے اسالیب کو اس کے اسلوب کے مطابق بنا لیا تھا، لیکن وہ اپنے تمام معاصرین سے زیادہ نازک طبع، مکثر سجع بندی کرنے والا، اثنائے عبارت میں سب سے زیادہ اشعار و امثال اور حکیمانہ مقولے لانے والا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان صفات میں بدیع کے علاوہ کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، ابن العمید انشاء پردازی کے تمام گروں سے بخوبی واقف، اور خط نویسی کی تمام

قسموں میں گوئے سبقت لے گیا تھا۔ حتیٰ کہ لوگوں میں کے متعلق یہ مقولہ مشہور ہو گیا تھا کہ انشاء پردازی عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہو گئی۔

رہ گئی اس کی شاعری سو اس پر حسن و جمال غالب ہے، جیسے وہ طبیعت کے چشمہ سے سیراب کرتا ہے، البتہ مجموعی طور پر اس کی شاعری اس کی نثر سے ہلکی اور کمزور ہے۔

اس کے کلام کا منتخب نمونہ:

جب ابن بلکا نے رکن الدولہ کی نافرمانی کی تو اسے اپنے ایک خط میں یہ لکھا۔

میں یہ خط لکھ رہا ہوں اور میرا حال یہ ہے کہ میں تم سے امید کرنے اور تمہاری طرف سے ناامید ہونے، تمہارا خیال کرنے اور تم سے بے رخی برتنے میں پس و پیش کر رہا ہوں۔ تم اپنی پچھلی عزت و حرمت پر ناز کرتے اور اپنی گذشتہ خدمت کا واسطہ دیتے ہو جن کا معمولی حصہ بھی موجب رعایت و مقتضی عنایت و مہربانی ہے۔ پھر تم نے ان دونوں خوبیوں کو غبن اور خیانت سے ملا دیا۔ اور ان کے تعاقب میں موجودہ مخالفت و نافرمانی کو بھیج دیا، جن کی تھوڑی سی مقدار بھی تمہاری تمام خدمتوں کو اکارت، اور تمہارے ساتھ کی ہوئی تمام رعایتوں کو برباد کر دیتی ہے۔ بلاشبہ میں تم پر رحم کرنے اور تمہارے خلاف قدم اٹھانے میں مذبذب ہوں۔ ایک پیر تم کو مٹانے کے لیے آگے بڑھاتا ہوں اور دوسرا تم کو باقی رکھنے کے لیے، ایک ہاتھ تم کو ختم کرنے اور اکھاڑ پھینکنے کے لیے بڑھاتا ہوں اور دوسرا تم کو بچانے اور تمہاری اصلاح چاہنے کے لیے کھینچ لیتا ہوں۔ اس لیے کہ عقل کبھی غیر حاضر ہو جاتی ہے اور پھر پلٹ آتی ہے۔ دماغ کبھی غائب ہو جاتا ہے اور پھر حاضر ہو جاتا ہے۔ حزم و احتیاط کبھی انسان سے چھوٹ جاتے ہیں اور پھر واپس آ جاتے ہیں۔ ارادہ کبھی بگڑ جاتا ہے اور پھر سدھر جاتا ہے۔ صحیح رائے گم ہو جاتی ہے اور پھر اس کو پا لیا جاتا ہے۔ انسان کبھی مست و بے خود ہو جاتا ہے لیکن پھر ہوش میں آ جاتا ہے۔ پانی کبھی گدلا ہو جاتا ہے اور پھر صاف ہو جاتا ہے۔

اسی خط کا کچھ اور حصہ:۔ تمہارا خیال ہے کہ تم فرمانبرداری کے وسط میں چلنے کے بعد اب اس کے ایک کنارے پر آ گئے ہو۔ اگر واقعتہً تمہارا یہی حال ہے تو تم فرمانبرداری کی دونوں حالتوں کو جان گئے، اور اس کے نفع نقصان کو پہچان گئے ہو۔ میں تمہیں خدا کی قسم دلا کر کہتا ہوں کہ میرے ان سوالات کا صحیح جواب دینا۔ تم نے جس چیز کو چھوڑا اسے کیسا پایا؟ اور جس روش کو اختیار کیا ہے اسے کیسا پاتے ہو؟ کیا پہلی صورت میں تم گھنے آرام دہ سایے، ہوا کے ٹھنڈے اور نمناک جھونکے، سیراب کرنے والے پانی، نرم و آرام دہ بچھونے، محفوظ و مامون آرام گاہ، بلند و باعزت مرتبہ، اور محفوظ قلعہ میں نہ تھے۔ جس کے باعث تم نے ذلت سے عزت، قلت سے کثرت، پستی سے بلندی، تنگی سے فراخی اور ناداری سے تونگری پائی؟ اب تم کس حال میں ہو؟ جس چیز کو تم نے چھوڑا اس کا کیا عوض ملا؟ اور جب تم نے فرمانبرداری سے اپنے آپ کو نکالا، اس سے اپنے

ہاتھ جھاڑے اور نافرمانی میں اپنے آپ کو ڈبویا تو اس میں کوئی نفع پایا؟ اطاعت شعاری کے سایہ کے چھوٹ جانے کے بعد تمہیں کس چیز نے سایہ دیا؟ کیا (جہنم کے) تین شاخوں والے دھوئیں نے جو نہ سایہ کرتا ہے نہ تپش سے بچاتا ہے؟ کہو! کہ ہاں یہی حال ہے ....

اسی خط کا کچھ اور حصہ:- میرے اس فیصلہ کن خط کے بعد اپنی حالت پر غور کرو۔ تم ضرور اپنی حالت کو برا سمجھوگے۔ اور اپنے بدن کو چھو کر دیکھو کیا اس کی حس باقی ہے؟ اپنی نبض ٹٹولو کیا وہ چل رہی ہے؟ اپنے پہلو کی تلاشی لو کیا اس میں تم اپنے دل کو پاتے ہو؟ کیا تمہارے دل کو یہ بات بھلی لگتی ہے کہ تم مستقبل قریب کی ناکامی یا جھگڑا چکانے والی موت، حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ؟ پھر اپنی موجودہ حالت سے اپنی پچھلی حالت اور پہلی حالت سے آخری حالت کا قیاس کرلو......

اس کے اشعار:- اپنے کسی دوست پر کہے ہوئے اشعار:-

قد ذبت غیر حشاشة وذماء	ما بین حرّ هوی وحرّ هواء
لا استفیق من الغرام ولا أری	خِلوا من الاشجان والبرحاء
وصروف أیام اقمن قیامتی	بنوی الخلیط وفرقة القرناء
وجفاء خل کنت أحسب أنه	عونی علی السراء والضراء
أبکی ویضحکهُ الفراق ولن تری	عجبا کحاضر ضحکه وبکائی

میں محبت کی سوزش اور ہوا کی تپش کے درمیان گھل گیا ہوں۔ اور اب ناتواں روح اور چند آخری سانسوں کے سوا مجھ میں کچھ باقی نہیں رہا۔ میں عشق و محبت کی مستی سے کبھی ہوش میں نہیں آتا۔ نہ رنج و غم اور تکالیف سے کوئی مقام خالی پاتا ہوں۔ نہ زمانہ کی گردشوں سے جنہوں نے دوست کی جدائی اور ساتھیوں کی فرقت کے باعث مجھ پر قیامت ڈھا دی ہے۔ نہ اس دوست کی بے وفائی سے جسے میں شادی و غم میں اپنا مددگار خیال کرتا تھا۔ میں رو رہا ہوں اور جدائی اسے ہنسا رہی ہے۔ اس کی موجودہ ہنسی اور میرے اس رونے کی طرح تم کبھی کوئی تعجب خیز حالت نہیں دیکھوگے۔

اسی قصیدہ کے کچھ دوسرے اشعار:-

من یُشف من داء باخر مثله	أثرت جوانحه من الادواء
لا تغتنم إغضاءتی فلعلها	کالعین تغضیها علی الاقذاء
واستبق بعض حشاشتی فلعلنی	یوما اقیك بها من الاسواء

جو ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے کہ دوسرے کو بھی ویسی بیماری ہو تو اس کے اعضا بیماریوں سے پھوٹ پڑیں گے میری چشم پوشی کو غنیمت نہ شمار کرو، بہت ممکن ہے کہ یہ اس آنکھ کی طرح بند ہو گئی ہو جسے کچرا پڑنے کی وجہ سے بند کر لیا جاتا ہے۔ اور میری آخری سانسوں (دوستی) کو باقی رہنے دو شاید ان کی وجہ سے میں کسی دن تم کو تباہیوں سے بچا سکوں۔

فلئن أرحت الیّ عازب بلوتی و وجدت فی نفسی نسیم عذار
لاجهزنّ الیك تیم تشکر ولا نثرن علیك سوء ثناء
ولاعضلنّ مودّتی من بعدها حتی ازوّجها من الاکفاء

اگر میری دور ہونے والی پریشانیوں کو تم نے میرے پاس بھیج دیا۔ اور تم یہ خیال کرتے ہو کہ اس میں مطمئن ہو جاؤں گا تو غلط فہمی ہے۔ میں بدترین شکریے تمہارے پاس بھیجوں گا اور تمہارے اوپر مذمتوں کی بوچھاڑ لگا دوں گا۔ اور اس کے بعد میں اپنی دوستی کو اس وقت تک گھر میں بے شادی کرائے بٹھا لوں گا جب تک کہ میں اس کی شادی کے لیے اس کے شایانِ شان کفو وہمسر نہ پالوں۔

۴۔ صاحب بن عباد (۳۲۶۔۳۸۵ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات: ابو القاسم اسماعیل صاحب بن عباد صوبہ قزوین کے طالقان نامی شہر میں پیدا ہوا۔ ابن فارس لغوی سے پڑھا اور جوان ہونے پر ابن العمید کے پاس گیا۔ ان کی شاگردی کی اور اس کی صحبت کا بہت زیادہ اثر قبول کیا اسی کی وجہ سے اس کا لقب صاحب پڑ گیا۔ پھر وہ موید الدولہ بن بویہ کے وزیر ابو الفتح ابن العمید[۱] کے قتل ہونے کے بعد ان کا وزیر بن گیا۔ اس کی سلطنت کا انتظام اور اس کے حدود مملکت کی نگرانی کرتا رہا۔ جب فخر الدولہ اپنے بھائی کے بعد بادشاہ بنا تو صاحب نے اپنا استعفے پیش کر دیا۔ جس پر فخر الدولہ نے کہا "اس حکومت کی وزارت میں تمہارا ایسا ہی موروثی حق ہے جیسا ہمارا حکومت میں، لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے حق کی حفاظت کرے۔"

اس طرح صاحب کا اقتدار بڑھا اور اس کے احسانات عام ہونے لگے۔ انہوں نے علم و ادب کی سرپرستی کی۔ ادباء و علماء و متکلمین و مصنفین اس کے دربار میں آنے لگے جو اس سے بخشش مانگتے اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اس کی مدح سرائی کرتے تھے۔ وہ اپنی تنقید سے ان کی رہنمائی اور اپنی بخشش سے ان کی اعانت کرتا۔ تا آنکہ اس کی بدولت عہد بنو بویہ میں ادب نے ایسی عظیم الشان ترقی کی جس کی نظیر دوسرے زمانوں میں کم ملتی ہے۔

صاحب کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوقین اور کتب بینی کا دلدادہ تھا۔ اس کی مجلس خوش کلام ادیبوں، مناظر متکلموں نیز راویوں اور استفادہ کرنے والے طالب علموں سے کبھی خالی نہ رہتی تھی۔ صاحب نے اپنی تمام زندگی معزز و محترم فرمانروا اور مخدوم بن کر گذار دی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو "وزی" کے

---

[۱] یہ علی ابو الفتح ذو الکفایتین ابن العمید بن ابی الفضل بن العمید ہے، جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ اپنے باپ کے بعد رکن الدولہ کی وزارت کا جانشین ہوا۔ جب وہ مرگیا تو اس کے لڑکے موید الدولہ کا وزیر رہا ایک مرتبہ موید الدولہ کسی بات پر غصہ ہوا اور اسے قتل کر دیا۔

دروازے اس کے ماتم میں بند کر دیے گئے۔ تمام لوگ جنازہ کے انتظار میں اس کے محل کے دروازہ پر جمع ہو گئے جن میں فخرالدولہ اور اس کے فوجی افسران بھی اپنے غیر سرکاری لباسوں میں موجود تھے۔ جب لاش دروازے سے باہر نکلی تو سب نے یکبارگی چیخ نکالی اور زمین بوس ہو گئے۔ وہ اصبہان میں دفن کیا گیا۔

اس کی نثر:- صاحب نے ابن العمید کے طرز نگارش کی پیروی کی۔ لفظی آرائش وزینت بالخصوص سجع وتجنیس میں وہ ان سے بڑھ گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے متعلق یہ مقولہ کہا گیا: "اگر عبارت مسجع بنانے کے لیے وہ کوئی ایسی سجع پاتا جس کی وجہ سے حکومت کا کڑا کھل جاتا اور سلطنت کا نظام ڈگمگا جاتا تو بھی آسانی سے وہ اسے نہیں چھوڑتا تھا"۔ اس کا مرتبہ بدیع کے بعد اور خوارزمی سے پہلے ہے۔ شاعری کرنے میں اسے ذوق سلیم، اور شاعری کے پرکھنے میں اسے صحیح تنقیدی نظر ملی تھی۔ وزارت کی ذمہ داریوں اور رئیسانہ ٹھاٹ نے بھی اسے تصنیف وتالیف سے باز نہ رکھا۔ اور اس نے لغت میں (المحیط) کی سات جلدیں۔ (کتاب الامالہ) اور (الکشف عن مساوئ المتنبی) وغیرہ تصانیف کیں۔ مگر اس کی سب سے بڑی اور اہم خدمت ادیبوں کی حوصلہ افزائی، علماء کو سرگرم عمل بنانا، اور شمع ادب کو فروزاں کرنا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ:- جب قاضی ابو بشر اس سے ملنے کے لیے (ری) کے دروازہ پہ پہنچا تو اس نے یہ خط لکھا:-

تحدثت الركاب بسير أروى   الى بلد حططت به خيامى
فكدت اطير من شوق اليها   بقادمة كقادمة الحمام

قافلہ نے سیراب ترین شخص کے اس دیس میں آنے کی خبر دی ہے جہاں میں مقیم ہوں تو میں فرط شوق سے اس کی طرف ایسے شہپروں سے اڑ کر پہنچنا چاہتا تھا جو کبوتر کے شہپر کی طرح ہیں۔

کیا واقعتہً آنے والے کے متعلق جو خبر ملی وہ صحیح ہے۔ یا سونے والے کے خواب کی طرح محض خیال وگمان؛ نہیں بخدا بلکہ یہ آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اور دراصل وہ (آنے والا) اور مراد کو پالینا برابر ہیں۔ میں آپ کی سواری اور پالان کو مرحبا کہتا ہوں، نہیں بلکہ آپ کو اور آپ کے جملہ ساتھیوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ کس قدر تیزی سے آپ کی آمد کی خوشبو پھیلی، جس طرح یوسفؑ کی خوشبو مہکی تھی۔ آپ سواری کو تیز نہ کیجیے اور میری تشنگی کو اپنے پانی سے بجھایئے۔ اپنی ملاقات سے میری بیماری کا ازالہ کیجئے۔ اور اپنی آمد کے دن سے مجھے مطلع فرمایئے، تاکہ ہم اس دن کو خوشی اور یادگار جشن کا دن بنا دیں۔ اور صدائے بازگشت کے پلٹنے سے بھی پہلے خادم کو واپس بھیج دیجئے۔ میں نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ شاہین کی تیزی سے اڑ کر میرے پاس آئے اور باد صبا کو اپنے پیچھے قید وبند میں چھوڑ آئے۔

سقى الله دارات مررت بأرضها   فادتك نحوى يا ابن عباد بن عامر
أصائل قرب أرتجى أن أنالها   بلقياك قد زحزحن شر الهواجر

اے زیاد بن عامر! جن آبادیوں سے تو گذرا اور جن علاقوں نے تجھے میرا راستہ بتایا۔ خدا ان کو سیراب کرے۔ آپ کی ملاقات کی وجہ سے ہیں جن ٹھنڈی سہ پہروں کا منتظر ہوں ان کے تصور ہی نے دوپہریوں کی تپش کو مجھ سے دور کر دیا ہے۔

۵۔ خوارزمی (۳۲۳ تا ۳۸۳ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:- ابو بکر بن عباس خوارزمی کا اصل آبائی وطن طبرستان ہے۔ وہ خوارزم میں پیدا ہوئے۔ تو عمری ہی میں تحصیل علم وکسب معاش کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ دیا۔ دیس بدیس پھرے۔ بادشاہوں اور رئیسوں کی ملازمتیں کیں، سیف الدولہ سے ملے اور شام میں ان کی ملازمت کی۔ پھر اپنی وارفتہ وسفر پسند طبیعت کی بے عنداری سے مجبور ہو کر وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ بخارا، نیشاپور اور سجستان پہنچے تا آنکہ اصبہان میں صاحب بن عباد سے ملاقات ہوئی۔ جس نے بڑی عزت سے اسے اپنا مہمان بنایا۔ پھر عضد الدولہ کے نام ایک خط دے کر اسے شیراز بھیجا۔ اس کا وہ سفر کامیاب اور یہ سودا نفع بخش رہا۔ چنانچہ وہ ان کے پاس سے بڑی دولت وعزت کے ساتھ پلٹا۔ پھر اس نے نیشاپور کو وطن بنا کر وہاں جائداد وجاگیر بنا لی، اور وہیں اطمینان وآسودگی سے درس وتدریس کی مجلسوں اور یار دوستوں کی محفلوں میں زندگی گذارنے لگا۔ تا آنکہ آخری زمانہ میں بدیع ہمذانی سے اس کا مقابلہ ہوا اور باہم مناظرہ چھڑ گیا جس میں اسے شکست فاش ہوئی۔ اور اس صدمہ نے اس کی صحت خراب کر دی۔ اس کی شہرت کو ختم کر دیا۔ اور ابھی اس واقعہ کو ایک سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ ۳۸۳ھ میں وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ادب وانشا میں اس کا مرتبہ:- دوسرے ذہین اور قوی الحافظہ لوگوں کی طرح خوارزمی کی ذہانت وقوت حافظہ کے متعلق بھی بہت سی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اپنی قوت حافظہ کی وجہ سے وہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ارجان میں صاحب بن عباد کے پاس گیا۔ جب دروازہ پر پہنچا تو دربان نے صاحب سے جا کر کہا کہ دروازہ پر ایک ادیب آپ سے ملنے کی اجازت چاہتا ہے۔ وزیر نے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ دیں نے یہ طے کر لیا ہے کہ میرے پاس اس وقت تک کوئی ادیب نہیں آئے گا جب تک کہ اسے عرب کے بیس ہزار اشعار زبانی یاد نہ ہوں" خوارزمی نے دربان سے کہا کہ جاؤ اور ان سے دریافت کرو کہ مردوں کے اتنے شعر یا عورتوں کے؟ جب اس نے یہ بات صاحب سے کہی تو انہوں نے کہا "یہ ابو بکر خوارزمی معلوم ہوتے ہیں"

خوارزمی لغت وانساب میں امام، اشعار واخبار عرب کا عالم، زبان کے اسرار وتراکیب کے خواص سے واقف تھا۔ نثر میں وہ ابن العمید کے طبقہ کا ہے۔ بہت سے لوگ اسے صاحب سے افضل بتاتے ہیں۔ لیکن یہ کبھی اس سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ صحیح ذوق کھو بیٹھتا اور بے قاعدہ ہو جاتا ہے۔ رہی اس کی شاعری سو وہ درمیانہ ہے نہ خراب نہ عمدہ۔

اس کا منتخب کلام:- لوگ قلعے ہیں جنہیں احسان بناتا ہے اور محرومی ڈھا دیتی ہے۔ وہ اپنے پھلوں کے ذریعہ نیکی اور آسودگی تک پہنچتے ہیں۔ جفاکاری وغرور انہیں مٹا دیتے ہیں۔ بلاشبہ مال و دولت انسانوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ اور کوئی صلح بغیر جنگ کے نہیں ہوتی۔ قبل ازیں کہ بزدل کو تلوار سے قتل کیا جائے وہ خود بخود خوف سے مرجاتا ہے۔ اور بہادر زندۂ جاوید ہے خواہ اس کی زندگی وفا نہ کرے، اور وہ قبر ہی میں کیوں نہ چھپا دیا جائے۔ جو موت کو ڈھونڈتا ہے موت اس سے بری طرح بھاگتی ہے۔ اور جو اس سے بھاگتا ہے اسے وہ پوری طاقت سے تلاش کرتی ہے۔

دوسری جگہ وہ کہتا ہے:-

قیدی سے زیادہ بڑا وہ ہے جو اسے قید کرنے کے بعد رہا کردے۔ شیر سے زیادہ بہادر وہ ہے جو اسے باندھ کر کھول دے۔ سرسبز و بارآور درخت سے زیادہ فیض رساں وہ ہے جو اسے بوئے۔ اور سخی سے زیادہ کریم وہ ہے جو اس پر احسان کرکے اسے اپنا بنالے۔ انسان سے بڑا کوئی شکار نہیں۔ اور زبان سے زیادہ پھانسنے والا کوئی جال نہیں۔ اس شخص میں جو جنگلی جانوروں کو اپنے جال میں پھانسے اور اس شخص میں جو انسانوں کو اپنی باتوں سے شکار کرے بہت بڑا فرق ہے!

شاعری کا نمونہ:- اس کے عمدہ اشعار:-

مضت الشبيبة والحبيبة فالتقى　　دمعان فى الأجفان يزدحمان

ما أنصفتني الحادثات رمينني　　بمودّعين وليس لى قلبان

جوانی اور محبوبہ دونوں جدا ہوگئے، جن کے صدمہ سے آنکھوں میں دو آنسو ملے اور باہم ٹکرا گئے۔ حادثات زمانہ نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، انہوں نے بیک وقت میرے سامنے دو الوداع کہنے والوں کو پہنچا دیا حالانکہ میرے پاس دو دل نہیں ہیں۔

دیگر:-

قلت للعين حين شامت جمالا　　فى وجوه كواذب الايماض

لا يغرّنك هذه الاوجه الغرّ　　فيارب حيّة فى رياض

جب میری آنکھ نے جھوٹی رونق والے چہروں میں حسن وجمال دیکھا تو میں نے اس سے کہا، تو خوشنما اور حسین چہروں کے فریب میں مبتلا نہ ہوجانا، اس لیے کہ بسا اوقات باغوں میں سانپ بھی ہوتے ہیں۔

کسی عباسی خلیفہ کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

مالى رأيت بنى العباس قد فتحوا　　من الكنى ومن الألقاب ابوابا؟

ولقبوا رجلاً لو عاش اولهم　　ما كان يرضى به للقصر بوّابا

قَلّ الدراهم فی کفی خلیفتنا   هذا فاَنفق فی الاَقوام اَلقابا

کیا بات ہے کہ میں بنو العباس کو کنیتوں اور القاب وخطابات کے دروازے کھولتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ وہ ایسے (نااہل) شخص کو خطاب دیتے ہیں کہ اگر ان کے پہلے بزرگ زندہ ہوتے تو اسے چپراسی بنانے پر بھی رضامند نہ ہوتے، ہمارے اس خلیفہ کے ہاتھوں میں روپیہ نہیں رہا۔ اس لیے اس نے لوگوں میں القاب وخطابات عام کر دیے ہیں۔

حکیمانہ اشعار:-

لاتصحب الکسلان فی حالاته   کم صالح بفساد آخر یفسد

عدوی البلید الی الجلید سریعة   والجمر یوضع فی الرماد فیخمد

کاہل کے ساتھ نہ رہو، کتنے ہی بھلے دوسروں کی خرابی سے بگڑ جاتے ہیں۔ کند ذہن کے مرض کی چھوت ذہن کو بہت جلدی لگ جاتی ہے، دیکھو انگارہ راکھ میں دبایا جاتا ہے تو وہ بجھ جاتا ہے۔

رکن الدولہ کے مرثیہ میں وہ کہتا ہے۔

اَلست تری السیف کیف انثلم   و رکن الخلافة کیف انہدم

طوی الحسن بن بویہ الردی   اَیدری الردی اَی جیش ھزم؟

فصیح اللسان، بدیع البیان   رفیع السنان، سریع القلم

اذا تم شیءٌ بدا نقصه   توقّع زوالا اذا قیل تم

کیا تم نے تلوار کو نہیں دیکھا کہ وہ کیسے کر گئی؟ اور پایۂ خلافت کو کہ وہ کیونکر منہدم ہو گیا؟ موت نے حسن بن بویہ کو ختم کر دیا، کیا موت جانتی ہے کہ اس نے کس لشکر کو شکست دے دی ہے؟ وہ بڑا خوش کلام، طرفہ بیان، بلند نیزہ والا اور تیز لکھنے والا تھا۔ جب کوئی چیز پوری ہو جاتی ہے تو پھر اس میں کمی شروع ہونے لگتی ہے۔ لہذا جب تم سے کہا جائے کہ (فلاں چیز) مکمل ہو گئی ہے تو تم اس کے زوال کے منتظر رہو۔

۶:- بدیع الزمان ہمذانی (متوفی ۳۹۸ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:- ابو الفضل احمد بن حسین ہمذان میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پا کر بڑھے۔ انہوں نے فارسی وعربی دونوں زبانوں میں علم حاصل کیا، ہمذان میں کوئی ادیب ایسا نہ چھوڑا جس کا تمام علم حاصل نہ کر لیا ہو۔ پھر ہمذان چھوڑ کر صاحب بن عباد کے پاس چلے گئے اور ان کے علوم و احسانات سے ترقی پائی بعد ازاں جرجان کا رخ کیا اور اکناف اسماعیلیہ میں رہا، اس نے خود کو ابو سعید محمد بن منصور کی خدمت میں وقف کر دیا، ۳۸۲ھ میں نیشاپور گیا جہاں اس کی خداداد صلاحیت کے جوہر آشکارا ہوئے اور لوگوں میں اس کی شہرت عام ہو گئی۔ وہاں اس نے چار سو مقامے لکھوائے، پھر ابو بکر خوارزمی سے مناظرہ

کرنے میں مشغول ہو گیا۔ جو اس سے زیادہ سن رسیدہ اور نامور تھا۔ شروع میں ان کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا جس نے بڑھ کر مناظرہ کی شکل اختیار کر لی۔ کچھ لوگوں نے اُسے غالب بتایا اور کچھ نے اسے۔ بدیع کو اس کی جوانی، خوش بیانی نے نیز خود نمائی کی ضرورت نے مدد بہم پہنچائی۔ چنانچہ وہ خوارزمی پر اس قدر نمایاں فوقیت لے گیا کہ اس کی وجہ سے امراء و رؤساء میں اس کی شہرت عام، اور عزت بڑھ گئی۔ ادھر اس کے حریف نے داعی اجل کو لبیک کہا جس کے باعث اس کے لیے میدان صاف، اور زمانہ سازگار ہو گیا۔ پھر وہ ایران کے امراء سے مدد مانگتے ہوئے شہر بشہر پھرتا رہا اور بالآخر ہرات میں مستقل قیام پذیر ہو گیا۔ حتیٰ کہ وہاں کے معززین و علماء میں اس کا شمار ہونے لگا اور نہایت آسودگی و خوش حالی سے وہاں زندگی گذاردی تاآنکہ ۳۹۸ھ میں انتقال کیا۔

اس کی موت کا سبب بیان کرنے میں اختلاف کیا جاتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ زہر دے کر مارے گئے، کچھ کہتے ہیں کہ سکتہ ہوا اور جلدی میں مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا۔ قبر میں ہوش آیا۔ اور رات میں ان کی آواز بھی سنی گئی۔ جب قبر کھودی تو ان کو داڑھی پکڑے ہوئے مرا ہوا پایا گیا۔

ان کے اخلاق اور خداداد صلاحیتیں:- بدیع مقبول شکل، سبک روح، خوش مذاق، ذکی القلب اور ذہین تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر معروف کتابوں کو ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد اس میں جو کچھ ہوتا اسے بے کم و کاست ایک ایک حرف بیان کر دیتا۔ اور بسا اوقات اسے کسی مشکل موضوع پر مضمون لکھنے کا حکم دیا جاتا تو وہ اسی وقت برجستہ مطلوبہ مضمون لکھ دیتا۔ کبھی وہ مضمون کو آخری سطر سے لکھنا شروع کرتا اور اسے اول تک پہنچا کر ختم کرتا۔ اس طرح کہ الفاظ کا باہمی ربط اور مضمون کا تسلسل قائم رہتا۔ وہ فرمائش پر فارسی اشعار کا عربی اشعار میں ترجمہ بھی کیا کرتا تھا، جس میں طرفگی و برجستگی ہوتی تھی۔

اس کی نثر و نظم:- بدیع کی نثر دلوں کو موہ لیتی اور احساسات پر قبضہ کر لیتی تھی۔ وہ تمام کی تمام از قسم منثور شاعری ہے جس میں صنعت کا اثر پایا جاتا ہے۔ بایں ہمہ وہ طبع زاد ہے جس کو تکلف دار آورد بگاڑنے، اور باریک بینی پیچیدہ بنانے نہیں پاتی۔ اس کے کلام میں لفظی شوکت، معنوی حسن، جمال اسلوب اور نزاکت تخیل یکجا پائے جاتے ہیں، اس انشاء پرداز نے خط نویسی کے متفرق اسالیب سے کام لیا، اور خطوط کی قسموں میں تنوع پیدا کیا، تاآنکہ وہ بجا طور پر عمدہ طرز نگارش کا مرد میدان اور دانائے راز ہو گیا۔

اس کی شاعری لطیف و نازک ہے جو عمدگی میں اس کی نثر کے برابر نہیں پہنچتی اس لیے کہ بیک وقت عمدہ شاعری اور عمدہ انشاء پردازی بہت کم کسی ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں۔

مقامات:- وہ چھوٹے قصے جن میں سے ہر ایک کسی ایسے واقعہ پر مشتمل ہو جو بیشتر ایک ہی مجلس میں سنا دیا جائے اور اس کے آخر میں کوئی نصیحت یا لطیفہ ہو، مقامات کہلاتے ہیں[1]

---

[1] مقامات و قصص پر اگلے صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے وہاں پڑھیے۔

حسن عبارت اور خوبی اسلوب کو ان میں پہلا مقام حاصل ہوتا ہے، بدیع سب سے پہلا شخص ہے جس نے اس صنف نثر میں خوبی پیدا کی، اس نے مقامات لکھنا اپنے استاذ ابن فارس سے سیکھے۔ پھر بھیک مانگنے اور دوسرے موضوعات پر اس نے چار سو (۴۰۰) مقامات املاء کرائے، جنہیں ابو الفتح اسکندری کی طرف منسوب کر کے عیسے بن ہشام کی زبانی کہلایا ہے ان میں سے صرف ترپن ۵۳ مقامات دستیاب ہو سکے جن کی شرح استاذ محمد عبدہ نے کی ہے۔ ان کا طرز بیان دلچسپ و پسندیدہ ہے، لیکن کہانیوں کے اختصار اور سب کہانیوں میں ایک ہی قسم کے خیال نے انہیں درجۂ کمال سے گرا دیا ہے، مقامات کے علاوہ بدیع کا ایک مجموعہ مکاتیب اور شاعری کا ایک دیوان بھی ہے، جو دونوں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک خط میں وہ لکھتا ہے:۔

اس کا منتخب کلام:۔ "بخدا اگر تم پتھر کے نیچے دبا ہوا اور جگر خنجر کی زد میں نہ ہوتا اور چوزہ کی طرح دو دن کا ننھا منا بچہ نہ ہوتا، جس نے مجھے زندگی پیاری کر دی اور میرے سر کا سودا ختم کر دیا ہے تو میں اس جگہ کو حقارت سے ٹھکرا دیتا۔ لیکن میں صبر جمیل سے کام لیتا ہوں، خدا مدد گار ہے۔"

دوسرے خط میں وہ لکھتا ہے:۔ "میں تمہیں کمینہ کی احسان فراموشی پر متعجب پاتا ہوں، اپنی پریشانی کم کرو! خدا تم پر رحم فرمائے، جس حرکت پر تم متحیر ہو وہ انسانوں کی کثیر احسان فراموشی کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتی، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا، ان کو آنکھیں دیں، عقل و بصیرت عطا فرمائی، جس سے کام لے کر انہوں نے سونے کی کانیں کھودیں، ستاروں کی گذرگاہوں کا پتہ لگایا، پرندوں کو پھانس کر بلند فضا سے نیچے گرایا، اور مچھلیوں کو پانی میں سے باہر نکال دیا، پھر ابن جولانی افکار تیزی اذہان کے باوجود انہوں نے اپنے صانع کا انکار کر دیا، اور کہا کہ وہ کہاں ہے؟ اور کیسا ہے؟ تا آنکہ انہوں نے "تلواروں کو دیکھ لیا۔ اب اگر وہ تمہارے احسان کا انکار کرتے ہیں جو نہ تو تمام روئے زمین پر پھیلا ہوا ہے، نہ پہاڑوں کو اپنے گھیرے میں لیے ہے۔ نہ آسمان اس کا خیمہ ہے، نہ رات اس کی اقامت گاہ، نہ دن اس کا راستہ، نہ ستارے اس کے نشانات، نہ آگ اس کے کوڑے ...، تو تم کو تعجب کیوں ہوتا ہے؟

اپنے کسی دوست کو ہوشیار کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

جناب من! شاید آپ نے کسی ناصح کے یہ دو شعر نہیں سنے جو کہتا ہے:۔

اسمع نصیحة ناصح   جمع النصیحة والمقه

ایاك واحذر ان تکو   ن من الثقات علی ثقه

خیر خواہ کی نصیحت سنو۔ جس نے خیر خواہی اور ناراضی کو یکجا کر دیا ہے۔ اور خبردار! دیکھو معتمد لوگوں پر بھی اعتماد کرنے سے بچتے رہنا۔

بخدا! ٹھیک کہا اور خوب کہا۔ کیونکہ بسا اوقات معتمد علیہ چیزیں بھی دھوکا دے جاتی ہیں۔

یہی آنکھ تمہیں سراب کو پانی دکھاتی ہے۔ اور یہی کان ہے جو غلط کو صحیح سناتا ہے۔ لہذا اگر تم ان چیزوں پر بھروسہ کرو جن کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے، تو تم معذور نہیں۔ کیونکہ تم نے اپنے کان سے سننے والے اور اپنی آنکھ پر بھروسہ کر لینے والے کی حالت کو دیکھ لیا۔ میں فلاں شخص کو بہت زیادہ تمہارے پاس آمد و رفت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ حالانکہ وہ نہایت کینہ سرشت، بد دین، ناقابل دوستی اور سرتا پا پلید ہے۔ تم نے اسے اپنا یار اور بھیدی بنا لیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے اس کے انتخاب میں کس جگہ غلطی کھائی ہے، تاکہ میں تمہیں اس کی تلافی کا مقام بتاؤں۔ تمہاری غلطی کو ابراہیم علیہ السلام کی غلطی سے کوئی نسبت نہیں۔ انہوں نے تارہ دیکھا تھا اور تم نے گدھے کا بچہ، ان کی نظر چاند پر پڑی اور تمہاری فضلہ و نجاست پر۔ انہوں نے سورج میں غلطی کی اور تم نے قبر میں۔ بتاؤ تو اس کی ظاہری حالت نے تمہیں فریب دیا، یا باطنی حالت تم کو پسند آئی؟۔

ابو القاسم ناصر الدولہ کے متعلق کہے ہوئے اشعار:۔

غضّی جفونك یا ریا ۔ ۔ ۔ ض فقد فتنت الحور غمزا
واثنی خباءك یا ریا ۔ ۔ ۔ ح فقد کددت الغصن هزّا
دارفق بجفنك یا غما ۔ ۔ ۔ م فقد خدشت الورد وخزا
خلع الربیع علی الرّبیٰ ۔ ۔ ۔ و ربوعها خزّاً و بزّا
و مطارفاً قد نقّشت ۔ ۔ ۔ فیها ید الامطار طرزا

اے باغیچو! اپنی آنکھیں نیچی کرو کیونکہ تم نے آنکھ مار کر حوروں کو فتنہ میں ڈال دیا ہے۔ اور اے ہواؤ! اپنے دامن حیا کو تھامے رہو! کیونکہ تم نے شاخ کو ہلا ہلا کر بے قرار کر دیا ہے۔ اور اے بادلو! اپنی آنکھوں پر رحم کھاؤ کیونکہ تم نے گلاب کے پھولوں کو گود کر چھیل دیا۔ فصل بہار نے ٹیلوں اور ان کے گرد و نواح کو ریشمی اور سوتی نقشیں کپڑے نیز ایسی چادریں اڑھا دیں جن پر بارش نے کڑھائی کا کام کیا ہے۔

اس قصیدہ کے دیگر اشعار:۔

و کان امطار الرّبیع الی ندی کفیك تعزیٰ
یا ایها الملك الذی بعساکر الآمال یغزی
خلقت یداك علی العدای سیفا و للعانین کنزا
لا زلت یا کنف الامیر لنا من الاحداث حرزا

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فصل بہار کی بارشیں آپ کے ہاتھوں کی سخاوت کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ اے وہ بادشاہ! کہ جس پر آرزوؤں کے لشکروں سے چڑھائی کی جاتی ہے۔ آپ کے ہاتھ دشمنوں کے لیے تلوار اور بخشش مانگنے والوں کے لیے خزانہ ہیں۔ اے ظل سلطانی! تو سدا ہمارے لیے حوادث زمانہ سے بچاؤ کا ذریعہ بنا رہ۔

۷۔ حریری (۴۴۶ تا ۵۱۶ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ محمد قاسم بن علی بصری خالص عربی النسل اور بنو حرام میں سے تھا۔ وہ "مشان" نامی بستی میں پیدا ہوا بصرہ میں اس نے پرورش پائی۔ اور وہاں کے فضلاء سے علم کی سند حاصل کی۔ شروع میں وہ ریشم کا کاروبار کرتا تھا اس لیے اس کا لقب حریری پڑ گیا۔ علمی انہماک اور ادبی دل بستگی نے اس سے اس کا پیشہ چھڑا دیا۔ اور اس نے درس وتحصیل علم میں جانفشانی سے محنت کی۔ حتیٰ کہ اسالیب عرب سے واقفیت اور ان کے حالات و اشعار کو حفظ کرنے کی وجہ سے اس کا مرتبہ بلند، اور اس کی شہرت عام ہو گئی۔ امراء نے اس کو اپنا مقرب بنایا۔ اور ادباء اس کے علم سے استفادہ اور اس کے ادب سے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے آنے لگے۔

اس کا حلیہ اور اخلاق:۔ حریری بدشکل، پست قد، کنجوس، میلے کپڑوں میں رہنے والا، اور غور و فکر کے وقت اپنی ڈاڑھی کے بال نوچنے کا عادی تھا۔ خدا نے ان عیوب کے عوض اسے ادبی زینت، خوش مذاقی، بذلہ سنجی، اور عدل و انصاف کی خوبیاں عطا کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی باتیں سننا اس کو دیکھنے سے بہتر تھا۔ ایک پردیسی نے اس کی شہرت سنی تو اس سے ادب سیکھنے کے لیے آیا۔ لیکن جب اسے دیکھا تو اس کی شکل وصورت دیکھ کر کراہت سی محسوس کرنے لگا۔ جسے حریری تاڑ گیا۔ پھر جب اس نے حریری سے کچھ املا کرانے کی درخواست کی تو حریری نے کہا لکھو:۔

ما انت اول سار غرّه قمر ۔۔۔ ورائد اعجبته خضرة الدمن

فاختر لنفسك غيري انني رجل ۔۔۔ مثل المعيدي فاسمع بي ولا ترني

رات میں چلنے والے تم ہی پہلے شخص نہیں ہو جسے چاند نے دھوکا دیا ہو۔ اور نہ تم چراگاہ تلاش کرنے والے پہلے شخص ہو جسے گھورے کی سبزی بھلی معلوم ہوئی ہو۔ تم میرے سوا اپنے لیے کسی اور کو پسند کر لو۔ کیونکہ میں معیدی کی طرح ہوں۔ میری باتیں سنو اور میری شکل مت دیکھو۔

یہ سن کر وہ آدمی شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

اس کی نثر ونظم:۔ حریری بدیع کی طرح زیادہ نثر لکھنے والا اور کم گو شاعر ہے۔ وہ ابن العمید کے پیروؤں کی آخری صف میں ہے اور ان لوگوں میں سے جنہوں نے فاضلیہ طرز نگارش کو روشناس کرانے کی کوشش کی۔ جس میں قصداً بدیع کا استعمال، صنعت میں مبالغہ لفظی زیب و زینت پر زیادہ زور اور معانی پر کم توجہ ہوتی ہے۔ بنا بریں اس طرز تحریر کے الفاظ میں معانی اس طرح کمزور اور دھندلے نظر آتے ہیں جس طرح دق کی ماری دلہن جسے رنگ برنگ کے خوشنما قیمتی کپڑوں اور زیورات سے آراستہ اور دلہن بنا دیا گیا ہو۔ بدیع پسندی اور محض لفظی اہتمام

ہیں اس کی شاعری بھی اس کی نثر کی طرح ہے۔ اپنے مقامات میں جگہ جگہ وہ اپنے اشعار لاتا ہے جنہیں علیحدہ دیوان کی شکل میں بھی جمع کر دیا گیا ہے۔

اس کی تصانیف:- اس کی تصانیف میں "درۃ الغواص فی اوہام الخواص" ہے جس میں اس نے اپنے ہمعصروں پر بعض الفاظ و تراکیب میں عربی زبان کے قواعد کی مخالفت پر تنقید کی ہے۔ علم نحو میں "ملحۃ الاعراب" ہے۔ ایک مجموعہ مکاتیب ہے۔ پھر مقامات جو اس کی بہترین یادگار ہے۔

مقامات:- "مقامات" میں پچاس مقامے ہیں جنہیں انہوں نے ابو زید سروجی کی طرف منسوب کیا ہے اور حارث بن ہمام کی زبانی بیان کیا ہے۔ ان مقامات کو اس نے بدیع کی طرز پر لکھا ہے۔ اور ان میں بے انتہا لغت و امثال اور پہیلیاں یکجا کر دی ہیں جن کی وجہ سے یہ تصنیف عربی الفاظ، لغوی نوادر اور صنعت لفظی کی ایک مفید ڈکشنری بن گئی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ عرب اور یورپ کے ادیبوں نے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا اور یہ کتاب ان میں بہت مقبول ہوئی۔ بیس سے زائد فرانسیسی جرمنی اور برطانوی مستشرقین نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ انگریزی میں ۱۸۵۰ء میں لیدن اور لاطینی میں ۱۸۳۲ء میں ہیمبرگ میں شائع ہوئی۔ ۱۲۶۳ء میں اس کا فارسی میں ترجمہ ہوا پھر ترکی زبان میں آستانہ میں چھپی۔ اور اس وقت سے یہ کتاب مسلسل اپنی شرح کے ساتھ یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے جیسے مستشرقوں کے سرگروہ سلوسٹر دساسی نے ۱۸۲۲ء میں لکھا۔

"مقامات" کے عیوب:- یورپ کے ادباء "مقامات" کے اختصار اور ان سب میں ایک ہی مرکزی خیال کی کارفرمائی کو معیوب بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مصنف نے قصوں اور کہانیوں کو متنوع اور رنگین بنانے میں اس قسم کا اہتمام نہیں کیا جیسا یورپ و یونان کے قدیم مصنفوں نے کیا تھا۔ بلکہ اس نے اپنی تمام تر توجہ الفاظ کی زیب و زینت پر صرف کر دی ہے۔ عربی ادیبوں کا کہنا ہے "ان مقامات میں ایک ہی خیال ہے جسے متفرق شکلوں میں دہرایا جاتا ہے اور اس کے طرز تحریر میں ایسا تکلف ہے جسے اس بدوی کی طبیعت گوارا نہیں کر سکتی جس کی زبان سے انہیں بیان کرایا گیا ہے۔"

تالیف مقامات کا سبب:- "مقامات" لکھنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ حریری بصرہ کی مسجد بنی حرام میں بیٹھا تھا کہ وہاں ایک بزرگ دو چادریں پہنے داخل ہوئے جن پر سفر کے آثار نمایاں تھے۔ وہ پراگندہ حال اور خوش مقال تھے۔ حاضرین نے دریافت کیا "شیخ صاحب آپ کہاں سے آئے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "سروج سے" پھر ان کی کنیت پوچھی۔ انہوں نے کہا "ابو زید" چنانچہ حریری نے "مقامہ حرامیہ" لکھا اور اسے ابو زید کی طرف منسوب کیا اور اس کا راوی "حارث بن ہمام" یعنی خود کو بنایا۔ وہ مقامہ بہت مشہور و مقبول ہوا، حتیٰ کہ اس کی خبر مسترشد باللہ کے وزیر شرف الدین تک پہنچی۔ انہوں نے اسے پسند کیا اور حریری سے اس قسم کے مزید مقامے لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ اس نے بھی پہلے مقامہ کو ملا کر پچاس مقامے پورے کر دیے۔

اس کا منتخب کلام:- کسی وزیر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہتا ہے: بندہ کا وزیر کے لیے دعا کرنا کہ ہمیشہ ان کا بخت خوش نصیب رہے اور ان کی خوش نصیبیاں روز نئی شکل میں نمودار ہوں۔ ان کا بلند مرتبہ قابل حسد ہو۔ اور ان کے دشمن مٹا دیئے جائیں۔ اس شخص کی دعا ہے جو باوجود اپنے گھر کی دوری کے اپنے آپ کو پاس لاکر قریب ہونا چاہتا ہے۔ اور جس کی کوشش ہیں کوتاہی کے ساتھ ہی اس کا وقت بھی کوتاہ ہے۔ اور اس بندہ کا شکر کرنا اس انعام پر جس نے اسے خوش اعتقادی و آرزومندی سے جا ملایا۔ اور شہرت و بخشش سے بہرہ ور کیا۔ اس شخص کا شکریہ ہے جو قید سے رہا کر دیا گیا ہو اور جسے تنگی کے بعد آسانی کی لذت سے بہرہ ور کیا گیا ہو۔ اگر اس کے پاؤں اسے لے کر کھڑے ہو سکتے، اور زمانہ کی مدد اس کو خوش نصیب کرتی تو وہ آپ کے در معمور کی زیارت کے لیے آتا، اور فرمانبردار خادم کی طرح حکم بجا لانے میں تیزی کرتا۔ تاکہ وہ آپ کے احسان کے حقوق میں سے کچھ حقوق ادا کرتا۔ اور شکریہ نامہ خود اپنی زبان سے پڑھتا۔ لیکن صاحب فراش نحیف کیونکر اٹھ سکتا ہے؟ اور کون ہے جو اسے اٹھا کر لے جائے کہ وہ خوش نصیبی سے ہمکنار ہو جائے؟۔

اس کے حکیمانہ اشعار:-

لاتزر من تحب فی کل شهر غیر یوم ولا تزده علیه

فاجتلاء الهلال فی الشهر یوم ثم لا تنظر العیون الیه

اپنے دوستوں سے ہر ماہ میں ایک دن سے زیادہ ملاقات نہ کرو۔ اس لیے کہ چاند کو مہینہ میں ایک دن ہی دیکھا جاتا ہے پھر اس کی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔

دیگر:-

لا تقعدن علی ضر و مسغبة لکی یقال عزیز النفس مصطبر

وانظر بعینیك هل أرض معطلة من النبات کارض حفها الشجر

فعد عما تشیر الاغبیاء به فای فضل لعود ماله ثمر

وارحل رکابك عن ربع ظمئت به الی الجناب الذی یهمی به المطر

واستنزل الری من در السحاب فان بلت یداك به فلیهنك الظفر

تکلیف اور بھوک پر اس خیال سے صبر کیے نہ بیٹھے رہو کہ لوگ کہیں گے بڑا خوددار و صابر ہے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھو، کیا درختوں سے خالی زمین اور وہ زمین جو درختوں سے بھری ہو یکساں ہوتی ہے؟ تم پاگلوں کے مشوروں کو نظر انداز کر دو اور سوچو تو کہ اس درخت میں کیا خوبی ہے جس میں پھل نہ لگے ہوں؟ اور ایسی جگہ سے جہاں تم پیاسے رہو کوچ کر کے اس جگہ چلے جاؤ جہاں موسلا دھار بارش ہو رہی ہو اور بادلوں کی جھڑی سے سیرابی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ پھر اگر اس سے تمہارے ہاتھ تر ہو جائیں (اور آسودگی نصیب ہو جائے) تو کامیابی تمہیں مبارک ہو۔

قاضی فاضل (۵۲۹-۵۹۶ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ ابو علی عبد الرحیم بیسانی فلسطین کے عسقلان نامی شہر میں پیدا ہوا اپنے والد بہاء الدین علی، قاضی عسقلان سے علم حاصل کیا۔ حکومت فاطمیہ کے آخری زمانہ میں دفتری انشاء سیکھنے کے لیے وہ مصر پہنچا، اور اسکندریہ جاکر وہاں کے قاضی ابن حدید کے دفتر میں ملازم ہوگیا۔ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ اس کا فضل و کمال ظاہر ہوگیا، اور اس کی غیر معمولی قابلیت نے اسے نمایاں کر دیا۔ پھر وہ قاہرہ آیا اور وہاں ظافر کے دفتر میں محرر ہوگیا، جب حکومت ایوبیہ قائم ہوئی تو صلاح الدین بن ایوب نے اسے اپنا وزیر مقرر کرلیا، اور اس نے نہایت عمدگی سے اس کی حکومت کا کاروبار چلایا اور صلاح الدین کے بعد ان کے بیٹے "عزیز" اور پھر ان کے بھائی "الملک الافضل" کا وزیر رہا اور ۵۹۶ھ میں بمقام قاہرہ انتقال کیا۔

انشاء پردازی میں اس کا مرتبہ:۔ قاضی فاضل کے عہدہ کا طبعی تقاضا یہ تھا کہ وہ مختلف صوبوں کے انشاء پردازوں سے راہ و رسم رکھے، اور شام، عراق و مصر کے جداگانہ انشاء پردازی کے طریقوں سے واقف ہو۔ چنانچہ اس کی نوعیت محاکات، باہمی مقابلہ اور اس کی شخصی قابلیت و رسوخ نے اسے ایک نئے طرز انشاء کے ایجاد کرنے پر آمادہ کیا جس کی بنیاد اس نے عمیدیہ طرز تحریر کے اصولوں پر رکھی، اور توریہ و تجنیس میں مبالغہ آمیزی سے اس طرز کو عمیدیہ طرز سے ممتاز کیا۔ حتیٰ کہ اس کے زمانہ کی انشاء پردازی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے، زیبائش الفاظ کی ایسی فریب دہ رونق تھی جو مضمون کے ناپائدار و بوسیدہ ڈھانچہ پر قائم تھی۔ اس گنجلک اور بے معنی طرز نگارش نے کوتاہ نگاہوں اور بند طبیعتوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ چنانچہ نام نہاد ضنعت پرست انشاء پردازوں نے اس کی تقلید شروع کر دی اور اس طرح انہوں نے خود کو بے فائدہ مصیبت میں ڈال دیا۔ پھر اس وقت سے ہمارے اس زمانہ تک یہ طریقہ لوگوں کی آنکھوں پر چھایا اور دلوں پر زنگ کی طرح جارہا۔ تا آنکہ رفتہ رفتہ ابن خلدون کی اثر اندازی اور یورپ کے آداب کی تقلید سے یہ اسلوب تحریر ختم ہوگیا۔

اس کے کلام کا نمونہ:۔ صلاح الدین سے "عیذاب" کے خطیب کو "کرک" کا خطیب بنانے کی سفارش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"خدا بادشاہ سلامت کی حکومت کو دائم و مستحکم کرے۔ اور ان کے اعمال قبول فرماکر انہیں برقرار رکھے۔ ان کے دشمنوں کو دوپہر یا رات میں جب کہ وہ آرام میں ہوں تباہ کر دے۔ اور اس کی تلوار سے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرے۔

بندہ کی یہ خدمت بدست خطیب عیذاب آپ تک پہنچ رہی ہے، انہیں سکونت عیذاب راس نہ آئی اور فائدہ بھی وہاں کم پایا۔ مزید برآں انہوں نے ان فتوحات کا چرچا سنا جن کی شہرت روئے زمین

پر عام ہو چکی ہے ۔ اور جن کے حاصل کرنے والوں پر ان (فتوحات) کا شکر ادا کرنا ضروری ہے ۔ تو اس نے عیذاب کی گرم تپتی دوپہر اور کھاری پانی کو چھوڑ دیا ۔ اور شب آرزو میں بغیر اس کی صبح دریافت کیے چلنے لگا ، جو سراسر دن ہے ۔ یہ خطیب ہے اور کرک کی خطابت کا امیدوار ہے ۔ اور اپنے اس مقصد کی برآری کے لیے مجھ سے سفارش چاہتا ہے ، اور یہ آسان کام ہے ۔ یہ مصر سے شام اور عیذاب سے کرک جانے کا مشتاق ہے جو تعجب خیز بات ہے ۔ ضرورت ظالم و تند خو کو چوان ہے ۔ اور شخص مذکور عیال دار و ناتواں ہے ۔ اور مخلوق پر خدا کی مہربانیاں ہمارے سرپرست کے وجود کی وجہ سے زیادہ ہو رہی ہیں ۔ والسلام ۔

چوتھی فصل

شاعری پر تمدن و سیاست کا اثر

اس اجتماعی تبدیلی کا اثر انشاء پردازوں سے زیادہ شعراء کی طبیعتوں پر پڑا اس لیے کہ یہ طبقہ خلفاء سے زیادہ قریب رہنے والا اور اس کے دل آسودگی و تمدن کی طرف زیادہ مائل تھے۔ مے نوشی کی محفلوں میں یہی ان کے ہم پیالہ اور شبانہ مجلسوں میں یہی ان کے ساتھ خوش گپیاں کرنے والے تھے۔ محنت و مشقت میں طبیعت نہ لگنے کی وجہ سے ان کی جولانگاہ خیال بہت وسیع ہو گئی تھی۔ کاروبار میں کسلمندی کی وجہ سے ان کے ہاتھ تو تنگ تھے لیکن دل غور و فکر میں مشغول، اور زبانیں رواں ہو گئیں تھیں۔ کتابوں کی لکھائی اور اشاعت کی دشواری کے باعث انہیں تالیف و تصنیف پر گذران ہوتی نظر نہ آئی لہذا انہوں نے یکسوئی سے شاعری کی متفرق اصناف میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ خلفاء و امراء کو ممد و معاون، تمدن و فطرت کو معین و ناصر اور فکر و طبیعت و خیال کو مددگار پاکر وہ شاعری کے میدان میں اس طرح آزادی سے گھومنے لگے کہ ان کے اسلاف کو بھی کبھی اس قدر مواقع نہ ملے ہونگے، انہوں نے مولدین شعراء کے سرگروہ "بشار" کے ہاتھوں شاعری کو خشک صحراؤں اور تپتے ہوئے خیموں سے نکال کر سر سبز باغوں، بلند محلوں اور خوشنما مناظر میں منتقل کر دیا، ادھر شاعری کو کچھ ایسے حالات پیش آئے جنہوں نے اس کے اسلوب و معانی، اور موضوعات و اوزان میں نمایاں اثر ڈالا، اسلوب میں ان کا اثر، غیر مانوس الفاظ کا ترک، ترکیب میں حلاوت و وضاحت، بدیع کا بکثرت استعمال[1]، کھنڈروں کے ذکر سے قصیدہ کی ابتداء چھوڑ کر[2] محلات اور شراب کا وصف نیز غزل،

---

[1] فن بدیع کی چھوٹے پیمانہ پر ابتدا مسلم بن الولید اور اس کے بعد آنے والے شعراء سے ہو گئی تھی۔ ابوتمام نے آکر بدیع میں جان ڈالی اور ابن المعتز نے اسے فروغ دیا۔

[2] سب سے پہلے جس نے اس قید کو توڑا وہ مطیع بن ایاس ہے یا زیادہ صحیح قول کے مطابق ابونواس ہے، اس کے ان اشعار سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے:-

صفة الطلول بلاغة القدم　　　　فاجعل صفاتك لابنة الكرم

کھنڈروں کا وصف کوتاہ بیان کی بلاغت ہے لہذا تو درخت رز کی صفات بیان کر۔

دیگر:-

تبكي على طلل الماضين من أسد　　　لا در درك قل لي من بنو أسد

لا جف دمع الذي يبكي على حجر　　　ولا صفا قلب من يصبو الى وتد

خاندان اسد کے پچھلے لوگوں کے کھنڈروں پر تو روتا ہے، تیرا بھلا نہ ہو ذرا مجھے (باقی حاشیہ صفحہ ۳۳۰

مدح و ہجو میں مبالغہ آمیزی تشبیہ و استعارہ کی کثرت، قصیدہ کی مختلف اجزاء میں تناسب و موزونیت[1] اور بندش میں ترتیب کی رعایت کی ہے

معانی میں ان کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے تمدنی موضوعات و معانی پیدا کیے، فلسفیانہ افکار داخل ہوئے، اس لیے کہ اس دور کے اکثر شعراء دو قومیتوں کی پیداوار، دو زبانوں اور دو ادبوں سے بہرہ ور، اور دو مختلف تہذیبوں کے پروردہ تھے۔ اس آمیزش نے فکر و عقل میں جو اثر آفرینی کی اس کا اندازہ بشار، ابو نواس ابو العتاہیہ اور ابن الرومی کے اشعار کے جدید معانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ پھر عربوں نے تراجم کے ذریعہ یونانی علوم اپنی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیئے اس سے بھی شاعری کے معانی ہی میں اضافہ ہوا نہ کہ شاعری کے فنون و اصناف میں۔ اس لیے کہ عربوں نے صرف یونانی علم و حکمت کی کتابوں کا ترجمہ کیا تھا۔ اور اپنے ادب کو برتر، اپنی شاعری کو افضل سمجھتے ہوئے انہوں نے نہ تو یونانی شاعری اور قصوں کو درخور اعتنا سمجھا، نہ لاتینی شاعری اور خطبوں کو، یہی وجہ ہے کہ ان تراجم کا اثر عربی شاعری میں صرف فلسفیانہ افکار، سیاسی آراء اور علمی مباحث کی شکل میں ابو تمام، متنبی (اور ابو العلاء المعری) وغیرہ کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

موضوعات میں ان کا اثر، شراب اور مے کدوں کی تعریف میں مبالغہ، باغات اور شکار کا وصف، مردوں سے تغزل، آوارگی و عریانی، کھلا ہنسی مذاق، وعظ، زہد، اخلاق، فلسفہ، اور بعض علوم مثلاً نحو وغیرہ کو نظم میں منتقل کرنا، ہوا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۹ کا) اتنا بتا دے کہ بنو اسد میں کون؟ جو پتھروں پر روئے اس کے آنسو خشک نہ ہوں اور جو مینخوں میں دل لگائے اس کا دل صاف نہ ہو۔

یا ربع ، شغلك اني عنك في شغل

لا ناقتي فيك لو تدري ولا جملي

اے (ویرانے) مکان! اپنا کام کر مجھے تیری ہمکلامی کی فرصت نہیں، اگر تجھے معلوم ہے کہ نہ تو میرا اونٹ تیرے اندر رہے نہ میری اونٹنی۔

[1] حاتمی نے زہر الآداب میں لکھا ہے:۔

"قصیدہ اپنے اجزاء کے باہمی اتصال میں انسانی اعضاء سے مشابہ ہے، کہ اگر بدن کا ایک عضو دوسرے سے الگ ہو جائے تو بدن میں عیب پیدا ہو جاتا ہے، میں نے ماہر متقدمین اور فن کار جدید شعراء کو دیکھا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں پوری احتیاط برتتے ہیں تاکہ اتصال و نظم باقی رہے اور قصیدہ اپنے ابتدائی اور آخری اجزاء کے تناسب کی وجہ سے ایک بلیغ خط یا مختصر خطبہ کی طرح مربوط ہو یہی وہ طریقہ ہے جسے جدید شعراء اپنی ذہانت و ذکاوت سے سمجھ گئے ہیں اور اس کا خصوصیت سے التزام کرتے ہیں۔

اوزان میں ان اثر اندازیوں کی وجہ سے چھوٹی بحروں کا بکثرت استعمال شروع ہوا دیگر نئے اوزان و بحور کا اضافہ ہوا مثلاً مستطیل و ممتد جو طویل و مدید کے بالمقابل ہیں نیز موشح[1] زجل، دوبیت اور موالیا[2] وجود میں آئے اسی طرح قافیہ میں مسمط[3] اور مزدوج ظہور پذیر ہوئے۔

پھر جب ایران، شام، مصر اور مغرب کے گورنروں کی خود مختاری کے سبب خلافت میں انتشار ہوا۔ اور متعدد دپایہ تخت وجود میں آ گئے تو شاعری کو بھی بغداد کے علاوہ دیگر پناہ گاہیں مل گئیں اور

---

[1] سب سے پہلے جس شاعر نے موشح ایجاد کی وہ امیر بن عبداللہ مروانی کے شاعروں میں سے مقدم بن معافر ہے۔ یہ شعراء موشح کو لڑیاں اور شاخیں (بند بند) بنا کر نظم کرتے تھے۔ وہ بہت سی لڑیاں اور شاخیں مختلف عروضوں کے ساتھ بناتے اور ان میں سے چند کے مجموعہ کو ایک بیت کہتے۔ پھر ان شاخوں کے قوافی اور اوزان کا مسلسل آخری قطعہ تک التزام کرتے۔ بیشتر یہ سات بیتوں پر ختم ہو جاتی تھی۔ ہر بیت میں خاص انداز اور ضرورت کے مطابق شاخیں ہوتی تھیں۔ پھر دوسرے علاقوں میں بھی موشح کی طرز پر شاعری ہونے لگی۔ انہوں نے بغیر اعراب کی پابندی کے اپنی شہری زبان میں اس جیسی شاعری کرنا شروع کر دی اور اس نام "زجل" رکھ دیا۔ اس صنف (زجل) کی ایجاد سب سے پہلے ابو بکر بن قزمان اندلسی نے کی ... دیکھیے ابن خلدون۔

[2] دوبیت جیسا کہ نام بتا رہا ہے فارسی سے ماخوذ ہے۔ اس میں دو دو شعر نظم کیے جاتے ہیں اس لیے دوبیت نام پڑا۔ ایرانیوں میں رباعی کے نام سے مشہور ہے اور اس کا وزن "فعلن متفاعلن فعولن فعلن" ہوتا ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:۔

قد أنسم من أحبه بالبارى ان يبعث طيفه مع الاسحار

يا نار اشواقى به فاتقدى ليلاً فعساه يهتدى بالنار

رہ گئی موالیا۔ سو وہ سب سے پہلے برمکیوں پر آفت آنے کے بعد کسی پر وردہ برامکہ نے ایجاد کی۔ اس کے ذریعہ وہ برمکیوں پر نوحہ کرتے تھے۔ اور چونکہ اس میں "یا موالی" بار بار بکثرت دھراتے تھے لہٰذا اس کا نام ہی "موالیا" پڑ گیا۔ یہ صنف مصر میں عام ہے۔

[3] مسمط میں شاعر پہلے دو ہم قافیہ مصرعوں کا ایک بیت لاتا ہے۔ پھر اس قافیہ سے مختلف قافیہ والے چار مصرعے لاتا ہے، بعد ازاں ایک شعر پہلے شعر کے قافیہ کے مطابق یا کبھی اس کے قافیہ سے مختلف بھی لے آتا ہے۔ کم از کم چار مصرعے ہوتے ہیں جیسے:۔

غزال هاج لى شجنًا فبت مكابدًا حزنًا

عميد القلب مرتهنا بذكر اللهو والطرب

باقی رہی مزدوج تو اس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جیسے ابو العتاہیہ کے یہ اشعار ہیں:۔

حسبك مما تبتغيه القوت ما اكثر القوت لمن يموت

ان الشباب حجة التصابى روائح الجنة فى الشباب

وہ بغداد سے نکل کر ان دوسرے علاقوں میں پہنچ گئی۔ چنانچہ اسے بنی بویہ اور آل حمدان جیسے ارباب جود و سخا، زرخیز علاقے، اور کشادہ دل سرپرست مل گئے۔ چنانچہ وہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی ترقی کرنے لگی۔ اس سلسلہ میں ثعالبی[1] کی تصنیف یتیمہ الدھر کی فہرست کا سرسری سا مطالعہ بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہوگا کہ اس سیاسی انتشار نے شعر و شاعری کو ترقی دینے میں کیا نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ وہ دور تھا جس میں رؤسا و حکام شاعروں کو مقرب بنانے اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں خلفاء کی نیابت کر رہے تھے۔ اور جیسا کہ آپ نے دیکھا علوم و شاعری اس وقت تک پھلتے پھولتے اور پروان نہیں چڑھتے جب تک کہ انہیں بادشاہ یا حاکم و رئیس کی سرپرستی حاصل نہ ہو جائے[2]۔

---

[1] ابو منصور عبدالملک بن محمد بن اسماعیل ثعالبی نیساپور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تحصیل علم و ادب میں اس درجہ انہماک کیا کہ ان دونوں چیزوں میں امام وقت شمار ہونے لگے۔ عہد عباسی کے آخری خطوط نویس اور انشار پرداز ہیں۔ انہوں نے تمام ادیبوں سے زیادہ علمی سرمایہ چھوڑا، نثر نگاری اور شاعری میں انہوں نے ابن العمید کا اسلوب اپنایا تھا۔ ادب میں ان کی بہت سی تالیفات ہیں۔ ان میں سب سے اہم "یتیمہ الدھر" چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے زمانہ کے ادیبوں اور شاعروں کی منتخب نظم و نثر اور ان کے سوانح حیات یکجا کر دیے ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف میں فقہ اللغہ فی دقائق الالفاظ المترادفہ، سر العربیہ، سحر البلاغہ اور من غاب عنہ المطرب، ہیں۔ انہوں نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی۔

[2] اسامہ بن معقل کہتے ہیں: سفاح کو خطبات و مکاتیب سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ ان فنون کے ماہرین کی بڑی عزت و خدمت کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے دربار میں قدر و منزلت حاصل کرنے کے لیے ایک ہزار خطوط اور ایک ہزار خطبے حفظ کر لیے تھے اور ان کی وجہ سے مجھے اس کے دربار میں عزت و منزلت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد منصور کو شاہانہ محفلوں میں سنائے جانے والے قصوں، تاریخ اور ایام عرب سے لگاؤ تھا۔ وہ ان امور کے جاننے والوں کو اپنا مقرب بناتا اور انہیں انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔ چنانچہ اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے میں نے کوئی قصہ اور تاریخی واقعہ ایسا نہ چھوڑا جسے یاد نہ کر لیا ہو اور اس طرح میں ان کا بھی مقرب بن گیا۔ موسیٰ شاعری کے دلدادہ تھے اور وہ شعر جاننے والوں کو اپنے خواص میں شامل کرتے تھے چنانچہ میں نے کوئی نادر اور عمدہ و پسندیدہ یا مشہور شعر ایسا نہ چھوڑا جسے یاد نہ کر لیا ہو۔ اس کام کے لیے مجھے جو چیز اکساتی تھی وہ خوش حالی کی خواہش تھی۔ میرا خیال ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کے انعامات و اکرامات اور ان کی علم دوستی سے زیادہ کوئی چیز علم و ادب سیکھنے پر مائل کرنے والی نہیں۔ چنانچہ بعد میں ہارون کو ان چاروں چیزوں میں سے کسی کا بھی شوق نہ تھا اور نتیجہ میں وہ سب حفظ کی ہوئی چیزیں میں اس طرح بھول گیا جیسے میں نے کبھی انہیں یاد ہی نہیں کیا تھا۔

الغرض شاعری اپنی اس رفتار سے الفاظ و موضوعات کی رعایت کرتے ہوئے معنوی نیرنگی کے ساتھ برابر بڑھتی رہی تاآنکہ پانچویں صدی ہجری ختم ہوئی۔ اور اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی شاعری کے معاونین بنی بویہ کے چلے جانے اور اس سے بے التفاتی برتنے والے آل سلجوق[1] کے آجانے نیز فتنوں اور مصیبتوں کے پیہم حملوں اور لوگوں کے غلامی و ذلت پر رضامند ہو جانے کے باعث، مشرق سے عربی شاعری کا حسن و جمال ختم ہو گیا اور عوام کے دلوں سے اس کی مقبولیت و تاثیر بھی زائل ہو گئی۔ اور ان کی طبیعتیں تصوف اور وظائف و ادعیہ کی طرف مائل ہو گئیں۔

ان میں معنی آفرینی و جدت طرازی کا مادہ باقی نہ رہا۔ شعراء نے پرانے شاعروں کے معانی و مطالب کو بھونڈے طریقہ سے میناکاری کے ساتھ چپکانا شروع کر دیا۔ وہ فن بدیع اور مجاز و کنایہ میں غلو کرنے لگے۔ اور سلاطین و امراء کی مبالغہ آمیز مدح و رضاجوئی میں عجمیوں کی تقلید کرنے لگے[2] بالخصوص متاخرین شعراء حتیٰ کہ شاعری کی غرض و غایت ہی ان کے نزدیک "جھوٹ بولنا اور بخشش مانگنا ہو گئی تھی۔ اور وہ یہ کہنے لگے "بہترین شاعری وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹی ہو" پھر اس زمانہ کی شاعری کا بھی بالکل وہی انجام ہوا جو اس زمانہ کی نثر کا انجام ہوا تھا۔

اگر آپ عرب کی تمام شاعری اور اس کی تاریخ پر ایک زندہ قوم کی تاریخ کی حیثیت سے نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس نے اپنے موضوعات و مضامین میں امت عربیہ کی طرح رفتہ رفتہ ترقی کی اسی کے ساتھ انسانی زندگی کے مراحل طے کیے۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ بچپن کے گیت گاتی۔ جوانی کے ولولے خود غرضی کے جذبات کی ترجمانی کرتی۔ زمانۂ اسلام میں جہاد کے ترانے، تعصبات کے ہنگامے اور زندگی کی ہوسناکیاں اس کا موضوع بن گیا۔ پھر یہ جوان ہوئی اور حکومت عباسیہ کے آغاز میں اس کا شباب مکمل ہوا۔ جو بشار، ابونواس اور ان جیسے شعراء کی شاعری میں شباب کی سرمستیاں لیے خودی

---

[1] یہ ایک ترکی خاندان تھا جو اپنے جد اعلیٰ سلجوق کی طرف سے منسوب ہے۔ اس خاندان نے حکومت عباسیہ کے انحطاط کے زمانہ میں اس پر حملہ کیا اور اسے ختم کر کے ۴۴۷ھ میں اس کی حکومت پر قابض ہو گیا۔

[2] خلفاء و رؤساء کا انعام اور بخششوں کے ذریعہ شاعروں کی حوصلہ افزائی کرنا جس طرح شاعری کو بلند کرنے کے لیے مفید و معاون بنا، اسی طرح شاعری کو گرانے کے لیے مضر بھی ثابت ہوا۔ اس لیے کہ وہ شعراء جو سلاطین و امراء تک پہنچنے کے علاوہ روزی کمانے کا کوئی راستہ نہ جانتے تھے بادل ناخواستہ شاعری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے فکر و خیال کو مجبور کر کے، طبیعت پر زور اور دباؤ ڈال کر جھوٹی مصنوعی اور پر تکلف شاعری کرنا شروع کر دی۔ اور اس طرح وہ اپنی شخصی آزادی سے جو انسان کی بلند ترین خوبی ہے نیچے اتر کر خوشامد اور نفاق کے قعر مذلت میں گر پڑے۔ پھر ہوا یہ امراء کے انعامات کی لالچ نے بہت سے ناتجربہ کاروں کو شاعری پر آمادہ کیا۔ اور وہ نہایت واہیات و بے معنی شاعری کرنے لگے جس نے شاعری کے اسباب انحطاط میں مزید اضافہ کیا۔

دمستی کے ترانے اور تنعم و آسودگی کے مظاہر بن کر نمودار ہوئی۔ پھر اس کی عقل کی داڑھ نکلی۔ اور عہد عباسیہ کے وسط میں وہ ادھیڑ اور پختہ کار ہوئی۔ چنانچہ ابن الرومی ابو تمام اور متنبی و معری جیسے شعراء کے کلام میں وہ تجربہ کاری کے اسباق، حکیمانہ نتائج اور فلسفیانہ خیالات ظاہر کرنے لگی۔ پھر عہد عباسیہ کے آخر میں اس پر بڑھاپا آیا جو متاخرین کی شاعری میں مصنوعی آرائش، بڑھاپے کے سٹھیاپے اور بالآخر دم نزع کی حالت میں ظاہر ہوا۔ رہا اس کی پیدائش اور ابتدائی زندگی کا حال سو تاریخ اس سے ناواقف و بے خبر ہے۔

عباسی دور کی شاعری کے نمونے

شجاعت:۔ابو فراس حمدانی کہتا ہے:۔

ولما ثار سیف الدین ثُرنا کما هیّجت آساداً غضابا
استنّه اذا لاقی طعاناً صوارمه اذا لاقی ضرابا
دعانا و الاسنّة مشرعات فکنا عند دعوته الجوابا
صنائع فاق صانعها ففاقت و غرس طاب غارسه فطابا
و کنا کالسهام اذا اصابت مراميها فراميها اصابا
فلما اشتدت الهيجاء کنّا اشدّ مخالبا و احدّ نابا
و امنع جانباً و اعزّ جاراً و اوفی ذمّة و اقلّ عاباً
اذا ما ارسل الاُمراء جيشا الی الاعداء ارسلنا الکتابا

جب سیف الدین نے حملہ کیا تو ہم نے بھی بپھرے ہوئے شیروں کی طرح ہلہ بول دیا، ہم نیزہ بازی کے وقت اس کے نیزے اور تلواروں سے لڑائی کے وقت اس کی تیز تلواریں ہیں، اس نے ہمیں اس وقت بلایا جب نیزوں سے تاکا جا رہا تھا اور اس کی پکار پر ہم عملاً جواب بن گئے، ہم ممدوح کے پروردہ احسانات ہیں اور ممدوح بلند مرتبہ محسن ہے لہٰذا اس کے کارنامے بھی بلند ہیں۔ ہم پاکیزہ مالی کے بوئے ہوئے عمدہ پودے ہیں اور ہم ان تیروں کی طرح تھے جو اپنے نشانوں پر ٹھیک لگ گئے لہٰذا ان کا نشانہ باز بھی ٹھیک نشانہ لگانے والا ہے۔ جب گھمسان کا معرکہ ہوتا ہے، تو ہم سب سے تیز اور مضبوط کیل کانٹوں والے ہوتے ہیں، ہمارا پہلو سب سے زیادہ محفوظ اور ہمارا پڑوسی سب سے زیادہ معزز ہوتا ہے ہم ہی عہد و پیمان اور ذمہ داریوں کو سب سے زیادہ پورا کرنے والے اور ہم ہی سب سے کم عیب والے ہوتے ہیں۔ ہماری دھاک اور معاملہ فہمی کا یہ عالم ہے کہ جہاں دوسرے امراء کو لڑائی کے لیے لشکر بھیجنا پڑتا ہے وہاں ہم صرف خط ہی بھیج دیتے ہیں اور معاملہ بے لڑائی کے سدھر جاتا ہے۔

ابو الطیب متنبی کہتا ہے

عِش عزیزا او مت و انت کریم ــــ بین طعن القنا و خفق البنود
فرؤوس الرماح اذهب للغیظ ــــ و اشفی لغل صدر الحقود
لا کما قد حییت غیر حمید ــــ و اذا مت مت غیر فقید
فاطلب العز فی لظیٰ ودع الذل م ــــ ولو کان فی جنان الخلود

عزت کی زندگی جیو یا پھر جنگ میں نیزوں کی مار اور جھنڈوں کے سایہ تلے جان دے دو، اس لیے کہ نیزوں کے پھل غصہ فرو کرنے میں بڑے کارگر، اور کینہ ور کے سینہ کی گھٹن دور کرنے میں نہایت مفید ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے جس میں نہ عزت ہے نہ شہرت نہ مرے پیچھے کوئی تمہاری کمی محسوس کرنے والا۔ عزت و سربلندی تلاش کرو خواہ وہ جہنم ہی میں کیوں نہ ملے اور جنت الخلد کو خیرباد کہہ دو اگر وہاں ذلت و خواری برداشت کرنا پڑے۔

مدح:۔ ابو تمام کہتا ہے:۔

بمهدی بن اصرم عاد عودی ــــ الی ابراقه و امتد باعی
سعی فاستنزل الشرف اقتساراً ــــ ولولا السعی لم تکن المساعی
و نغمة معتفٍ یرجوه احلی ــــ علی اذنیه من نغم السماع
جعلت الجود لالاء المساعی ــــ و هل شمس تکون بلا شعاع؟
ولم یحفظ مضاع المجد شیء ــــ من الاشیاء کالمال المضاع
ولو صورت نفسك لم تزدها ــــ علیٰ ما فیك من کرم الطباع

مہدی بن اصرم (ممدوح) کی وجہ سے میری حالت سدھر گئی اور میرا ہاتھ فراخ ہو گیا۔ ممدوح نے جد وجہد کرکے مجد و شرف کو بزور و جبر زیر کر لیا ہے اور اگر جد وجہد نہ ہوتی تو بلند کارنامے بھی نہ ہوتے۔ ممدوح کے کانوں کو مدد طلب کرنے والے سائل کی آواز موسیقی کے نغموں سے زیادہ پیاری ہے تونے (اے ممدوح!) سخاوت کو بلند کارناموں کے لیے بطور روشنی استعمال کیا ہے۔ اور بھلا سورج بھی کہیں بے شعاعوں کا ہوا ہے؟ اور کوئی چیز بھی مجد رفتہ کی حفاظت کرنے میں ضائع کیے ہوئے مال سے زیادہ مفید نہیں ہو سکتی۔ اے ممدوح! تو ایسے اخلاق فاضلہ کا پیکر ہے کہ اگر تو خود ہی اپنی مرضی سے اپنی شکل و صورت اور اخلاق بناتا تب بھی تو اپنے موجودہ صفات سے زیادہ کچھ بھی نہ بناتا۔

متنبی کہتا ہے:۔

توهم بلوغ الغلام عندهم ــــ طعن نحور الکماة لا الحلم
کانما یولد الندیٰ معهم ــــ لا صغر عاذر ولا هرم

اذا تولوا عداوة کشفوا	و ان تولوا صنیعة کتموا
تظن من کثرة اعتذارهم	انهم انعموا وما علموا
ان برقوا فالحتوف حاضرة	او نطقوا فالصواب والحِکَم
تشرق اعراضهم و اوجههم	کانما فی نفوسهم شیم
أعیذکم من صروف دهرکم	فانه فی الکرام متهم

یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے یہاں لڑکے کے بالغ ہونے کی علامت احتلام نہیں بلکہ بہادروں کے سینوں کو نیزوں سے چھید نا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جود وسخا ان کے ساتھ ہی جنم لیتے ہیں اور اس راہ میں نہ بچپن حائل ہوتا ہے نہ بڑھاپا۔ جب یہ لوگ کسی سے دشمنی مول لیتے ہیں تو کھلے طور پر اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ اور اگر کسی پر انعام و احسان کرتے ہیں تو اسے چھپا لیتے ہیں۔ اپنے کیے کو کم گردانتے کے باعث اس قدر کثرت سے معذرت خواہی کرتے ہیں کہ تمہیں یہ گمان گذرے گا کہ انہوں نے جو کچھ احسان و انعام کیا ہے شاید انہیں اس کا علم بھی نہیں ہے۔ جب یہ کسی کو دھمکی دیں تو سمجھ لو کہ موت آگئی ہے۔ اور جب یہ بات کریں تو ان کی باتیں صحیح اور پُر حکمت ہوں گی۔ ان کی آبروئیں اور ان کے چہرے ایسے ہی روشن ہیں جیسے ان کی پاک طبیعتیں اور پاکیزہ اخلاق، گویا ان کا ظاہر و باطن درخشاں ہے۔ (اے ممدوحو!) میں تمہیں زمانہ کی گردشوں سے خدا کی حفاظت میں دیتا ہوں اس لیے کہ گردش روزگار پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ وہ شریفوں اور کریموں کی تاک میں رہتی ہے۔

ابن الرومی کہتا ہے:۔

کان مواهبه فی المحو	ل ادادکة عند ضیق الحیل
فلو کان غیثاً لعمّ البلاد	ولو کان سیفاً لکان الأجل
ولو کان یعطی علی قدره	لاغنی النفوس وافنی الامل

تنگی اور قحط کے زمانہ میں اس کی بخششیں اسی طرح مشکلات آسان کرتی ہیں جیسے تدبیریں اور حیلے ختم ہو جانے پر اس کی تجاویز و آراء معاملات سلجھاتی ہیں۔ ممدوح اگر بارش ہوتا تو ہمہ گیر بارش ہوتا جو سارے ملک میں برستی۔ اور اگر وہ تلوار ہوتا تو مرگ مفاجات ہوتا۔ اگر یہ ممدوح اپنے انداز کے مطابق عطیہ دے تو لوگوں کو اس قدر آسودہ اور تونگر بنا دے کہ ان کو نہ کوئی آرزو باقی رہے نہ ارمان۔

مرثیہ: معن بن زائدہ کے مرثیہ میں حسین بن مطیر کہتا ہے:۔

اِلمّا علی معن و قولا لقبره	سقتك الغوادی مربعا ثم مَربعاً
فیا قبر معن انت اول حفرة	من الارض خطت للسماحة مضجعًا
ویا قبر معن کیف واریت جوده	وقد کان منه البرّ والبحر مُترعا
بلی قد وسعت الجود والجود میت	ولو کان حیًّا ضقت حتی تصدّعا

فتی عیش فی معروفه بعد موته — کما کان بعد السیل مجراہ مرتعًا
ولما مضی معن مضی الجود وانقضی — واصبح عرنین المکارم اجدعا

اے میرے دو رفیقو! ذرا معن کے پاس ٹھہرو اور اس کی قبر کو یہ دعا پہنچا دو کہ تجھ پر موسم بہاریں صبح کے وقت برسنے والے بادل سالہا سال تک برستے رہیں۔ اے معن کی قبر! تو زمین کا پہلا گڑھا ہے جسے سخاوت کے آرام کرنے کے لیے کھودا گیا ہے۔ اے معن کی قبر! تو نے اس کی سخاوت کو اپنے اندر کیسے چھپا لیا حالانکہ اس کی سخاوت سے تو برو بحر بھرے ہوتے ہیں۔ ہاں میں سمجھ گیا تو نے مرے پیچھے سخاوت کو اپنے اندر لے لیا۔ اگر وہ پیکر جود و سخا زندہ ہوتا تو وہ تیرے اندر نہ سماتا اور تو پھٹ جاتی۔ وہ ایسا سخی داتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی سخاوت کے طفیل جی رہے ہیں جیسے سیلاب کہ اس کا پانی چلے جانے کے بعد بھی اپنی گذرگاہ کو سرسبز چھوڑ جاتا ہے۔ معن کیا ختم ہوا کہ اس کی موت سے جود و سخا ہی ختم ہو گئے۔ اور مکارم اخلاق کی ناک کٹ گئی۔ (یعنی ان کا کوئی سرپرست اور پرسان حال ہی نہ رہا)۔

محمد بن عبد الملک زیارت اپنی بیوی کے مرثیہ میں کہتا ہے :۔

الا من رای الطفل المفارق امه — بعید الکری عیناہ تنسکبان
رای کل ام و ابنها غیر امه — یبیتان تحت اللیل ینتجیان
و بات وحیداً فی الفراش تجنه — بلابل قلب دائم الخفقان
فلا تلحیانی ان بکیت فانما — اداوی بهذا الدمع ماتریان
فهبنی عزمت الصبر عنها لاننی — جلید فمن بالصبر لابن ثمان؟
ضعیف القوی، لایطلب الاجر حسبة — ولا یاتسی بالناس فی الحدثان
فلم ار کالاقدار کیف تصیبنی — ولا مثل هذا الدهر کیف رمانی
أعینیّ ان لم تسعدا الیوم عبرتی — فبئس اذن مانی غد تعدانی

آہ! اس بچہ کو کس نے دیکھا ہے جو اپنی ماں سے جدا ہو گیا ہے اور نیند کے بعد ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بہتی رہتی ہیں۔ وہ بچہ جو اپنی ماں کے سوا ہر ماں اور اس کے بچے کو رات میں ساتھ سوتے اور سرگوشیاں کرتے دیکھتا ہے۔ اور خود اپنے بچھونے پر تنہا ایسی حالت میں رات گذارتا ہے کہ اس کا دل مسلسل دھڑکتا اور گھبراہٹوں سے گھرا رہتا ہے۔ اے میرے رفیقو! اگر میں اس حال زار پر رو رہا ہوں تو مجھے ملامت نہ کرو کہ میں رو کر اس مصیبت کا علاج کر رہا ہوں جسے تم دیکھ رہے ہو۔ اور فرض کر لو کہ میں نے اس کی موت پر صبر کر لینے کا عزم بھی کر لیا، اس لیے کہ میں قوت ضبط رکھتا ہوں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ آٹھ برس کا بچہ کیوں کر صبر کرے گا جو کمزور و ناتواں ہے؟ ابھی وہ خدا کے ثواب کا طالب بھی نہیں۔ نہ وہ اتنی عقل رکھتا ہے کہ دوسروں کی بدحالی دیکھ کر اپنے آپ کو تسلی دے سکے۔ برا ہو تقدیر کا کہ اس نے مجھے آن لیا۔ اور زمانہ کو کیا کہوں کہ اس نے

مجھ پر ہاتھ صاف کیا۔ اے میری آنکھو! اگر تم آج آنسو بہانے میں میری مدد نہیں کرو گی تو جس مدد کا کل کے لیے تم مجھ سے وعدہ کرتی ہو وہ مجھے پسند نہیں۔

متنبی سیف الدولہ کی ہمشیرہ کے مرثیہ میں کہتا ہے :۔

طوى الجزيرة حتى جاءني خبر ۔۔۔ فزعت فيه بآمالي الى الكذب

حتى اذا لم يدع لي صدقه املا ۔۔۔ شرقت بالدمع حتى كاد يشرق بي

یہ خبر جزیرہ کو طے کر کے میرے پاس پہنچی۔ اور میں نے اپنی آرزوؤں کا سہارا لیتے ہوئے اسے جھوٹ سمجھا تا آنکہ خبر کی تصدیق میں کوئی آرزو باقی نہ رہی اور آنسوؤں سے مجھے اس طرح اچھو لگا کہ میرا دم گھٹنے کے قریب ہو گیا۔

ہجو:۔ مسلم بن ولید کہتا ہے :۔

امّا الهجاء فدقّ عرضك دونه ۔۔۔ والمدح عنك كما علمت جليل

فاذهب فانت طليق عرضك انّه ۔۔۔ عرض عززت به وانت ذليل

تیری آبرو اور عزت اس قدر ناقابل اعتنا ہیں کہ ان کی ہجو کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ رہ گئی مدح سو تو خود ہی جانتا ہے کہ یہ تیرے لیے کس قدر مشکل معاملہ ہے۔ اب اس کے سوا کیا چارہ کار ہے کہ تیری عزت و آبرو کو آزاد چھوڑ دیا جائے جس کی وجہ سے باوجود ذلت کے تو اپنے آپ کو باعزت گردانتا ہے۔

ابو تمام کہتا ہے :۔

كم نعمة لله كانت عنده ۔۔۔ فكانّها في غربة واسار

كسيت سبائب لومه فتضاءلت ۔۔۔ كتضاؤل الحسناء في الاطمار

اللہ کی کتنی نعمتیں اس (مہجو) کے پاس بے قرار و بے چین ہیں جیسے وہ غریب الوطن ہوں یا قیدیں ہوں۔ اس کے کمینہ لباس کی وجہ سے وہ اس طرح مرجھا کر رہ گئی ہیں جیسے حسینہ پھٹے پرانے چیتھڑوں میں۔

ابن الرومی کہتا ہے :۔

يُقَتِّرُ عيسى على نفسه ۔۔۔ وليس بباق ولا خالد

ولو يستطيع لتقتيره ۔۔۔ تنفّس من منخر واحد

عیسی خود اپنے آپ پر بھی تنگی اور بخل سے کام لیتا ہے۔ حالانکہ نہ تو اس کا مال باقی رہنے والا ہے نہ وہ خود حیات جاوید کا مالک ہے۔ وہ بخل میں اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اس کے لیے ممکن ہو سکے تو وہ ایک ہی نتھنے سے سانس لینے لگے۔

کافور اخشیدی کی ہجو کرتے ہوئے متنبی کہتا ہے :۔

اکلما اغتال عبد السوء سیدہ ۔ او خانہ فلہ فی مصر تمھید؟
صار الخصی امام الآبقین بھا ۔ فالحر مستعبد والعبد معبود!
نامت نواطیر مصر عن ثعالبھا ۔ حتی بشمن وما تفنی العناقید
العبد لیس لحر صالح باخ ۔ لو انہ فی ثیاب الحر مولود
لا تشتر العبد الا والعصا معہ ۔ ان العبید لانجاس مناکید
من علم الاسود المخصی مکرمۃ ۔ اقومہ البیض ام اباؤہ الصید؟
ام اذنہ فی ید النخاس دامیۃ ۔ ام قدرہ وھو بالفلسین مردود؟
وذاک ان الفحول البیض عاجزۃ ۔ عن الجمیل فکیف الخصیۃ السود!

کیا جب بھی نکما اور بے وفا غلام اپنے آقا کو دھوکے سے قتل کرتا ہے یا اس سے بے وفائی کرتا ہے تو اس کی ابتدا مصر ہی سے ہوتی ہے ؟ وہاں خواجہ سرا (آختہ) بھگوڑے غلاموں کا امام بنا ہوا ہے ۔ آزاد وہاں غلام اور غلام آزاد ہے ! مصر کے شرفاء و محافظ وہاں کی لومڑیوں سے غافل ہو گئے ہیں حتیٰ کہ یہ لومڑیاں کھا کھا کر بدہضمی میں مبتلا ہو گئی ہیں اور پھر بھی وہاں کے خوشے ختم نہیں ہو رہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ غلام خواہ وہ آزاد کے جون میں ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے کبھی آزاد کے برابر نہیں ہو سکتا ۔ میری نصیحت ہے کہ تم جب بھی غلام خریدو تو اس کے ساتھ ڈنڈا بھی ضرور لے لو ۔ اس لیے کہ غلام نہایت نکمے ناشکرے اور بدقماش ہوتے ہیں ۔ اس آختہ (خواجہ سرا) سیاہ فام کو شرافت و سخاوت کے بلند کارنامے کون سکھائے گا ؟ اس کی سفید (معزز) قوم ؟ یا اس کے باعزت آباء ؟ یا اس کا کان جو بردہ فروش کے ہاتھ میں لہولہان ہوتا ہے یا اس کی قدر و منزلت؛ جو اتنی ہے کہ اگر اسے دو پیسے میں فروخت کیا جائے تو بھی کوئی نہ لے ۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ بے چارہ ہے کس گنتی میں اچھے اچھے شریف لوگ آج کل احسان کرنے سے عاجز ہیں تو یہ سیاہ فام آختہ کیا احسان و سلوک کر سکتا ہے ؟

ابن لنکک کہتا ہے :-

وعصبۃ لما توسطتھم ۔ ضاقت علیّ الارض کالخاتم
کانھم من سوء افھامھم ۔ لم یخرجوا بعد الی العالم
یضحک ابلیس سروراً بھم ۔ لانھم عار علی آدم

اور یہ ایسے گروہ ہیں کہ جب میں ان کے درمیان رہا تو زمین تنگ ہو کر میرے لیے انگوٹھی کے حلقہ کی مانند ہو گئی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی کج فہمیوں کی وجہ سے ابھی تک دنیا میں نکلے ہی نہیں ۔ ابلیس ان کے وجود پر خندہ زن ہے اس لیے کہ یہ آدم کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ ہیں ۔

وصف :- بحتری اپنے قصیدہ میں ایوان کسریٰ کا وصف کرتا ہے :-

وکان الایوان من عجیب الصنعۃ — جوبٌ فی جنب ارعن جلس
یتظنّی من الکابۃ ان یبدا — لعینی مصبّحٍ او ممس
مزعجا بالفراق عن انس اِلف — عزّ او مرھقا بتطلیق عرس
عکست حظہ اللیالی و بات — المشتری فیہ وھو کوکب نحس
فھو یبدی تجلّداً و علیہ — کلکل من کلاکل الدھر مرس
لم یعبہ ان بُزّ من بُسُط الدیباج — و استُلّ من ستور الدِّمقس
مشمخرٌ تعلو لہ شرفات — رفعت فی رُءُوس رضوی و قُدس
لابسات من البیاض فما — تبصر منھا الا غلائل بُرس
لیس یدری اصنع انس لجنٍّ — سکنوہ ام صنع جنٍّ لانس
غیر انّی اراہ یشھد ان لم — یک بانیہ فی الملوک بنکس

فن تعمیر کا شاہکار یہ ایوان اس طرح اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑا ہوا ہے جیسے وہ اونچے بڑے پہاڑ کے بازو میں ایک بڑی ڈھال ہے۔ اداسی کے باعث یہ صبح و شام کو دیکھنے والی آنکھوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ کسی عزیز محبوب کی جدائی سے پریشان ہے یا جیسے اسے بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کیا گیا ہو۔ زمانہ نے اس کا مقدر الٹا کر دیا اور اس کی قسمت مشتری کے برج میں آ گئی ہے جو منحوس تارہ ہے۔ وہ بہادری اور صبر و عزیمت کا مظاہرہ کر رہا ہے، حالانکہ اس پر زمانہ کے بھاری سینہ کا مستقل بار پڑا ہوا ہے۔ اس ایوان کے مخملی گدوں تکیوں حریر و دیبا کے فروش اور پردوں کے چھن جانے سے بھی اس کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا نہ اس کی شان گھٹی۔ یہ ڈٹا ہوا اپنی جگہ سربلند کھڑا ہوا ہے۔ اس کے کنگرے اس طرح بلندی پر ابھرے ہوئے ہیں گویا وہ رضوی اور قدس کے پہاڑوں پر کھڑے ہیں۔ سفید پوشاک میں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے انہوں نے روئی کے کپڑے پہن رکھے ہوں۔ معلوم نہیں کہ یہ انسانوں نے جنات کے رہنے کے لیے بنایا تھا یا جنات نے انسانوں کے لیے؟ کچھ ہی کیوں نہ ہو بہرحال میرا خیال یہ ہے کہ یہ اپنی موجودہ عظمت و شوکت سے اس امر کی گواہی دے رہا ہے کہ جس بادشاہ نے اس کو تعمیر کیا اور اسے تیار کرایا وہ کوئی معمولی اور کم درجہ کا بادشاہ نہ تھا۔

اندلس کی ایک شاعرہ وادی آش کا وصف کرتی ہے:-

وقانا لفحۃ الرمضاء وادٍ — سقاہ مضاعف الغیث العمیم
حللنا دوحہ فحنا علینا — حنو المرضعات علی الفطیم
و ارشفنا علی ظمأ زلالاً — الذّ من المدامۃ للندیم
تروع حصاہ حالیۃ العذاری — فتلمس جانب العقد النظیم
یصدّ الشمس انّی واجھتنا — فیحجبھا و یأذن للنسیم

ہمیں تپتی ہوئی دھوپ کی جھلسا دینے والی لپٹ سے اس وادی نے بچا لیا جس پر بار بار وسیع پیمانہ پر بارش ہوئی تھی۔ ہم اس کے گھنے سایہ میں اترے تو وہ ہمارے ساتھ اس طرح مہربانی سے پیش آئی جیسے بچہ کے ساتھ دودھ پلانے والی ماں۔ اس نے ہمیں پیاس میں ایسا پاکیزہ اور نتھرا ہوا پانی پلایا جو شراب سے زیادہ لذیذ تھا۔ اس کے حسین ریزے، زیور سے آراستہ دوشیزہ کو بھلے لگتے ہیں اور وہ انہیں اپنے ہار کے لیے چاہتی ہے۔ یہ وادی سورج کے ایسے رخ پر تھی کہ وہ جدھر جا رہا تھا اسی طرف سے وہ ہمیں دھوپ سے بچاتی تھی اور خوشگوار ہوا کو آنے کی اجازت دیتی تھی۔

حکیمانہ اور ضرب المثل اشعار۔ بشار بن برد کہتا ہے :۔

اذا کنت فی کل الامور معاتباً ۔۔۔ صدیقك لم تلق الذی لا تعاتبه
نعش واحدًا او صِل اخاك ناته ۔۔۔ مقارف ذنب مرة و مجانبه
اذا انت لم تشرب مرارًا علی القذی ۔۔۔ ظمئت و ای الناس تصفو مشاربه؟

اگر تم ہر ہر بات میں اپنے دوست پر عتاب کرتے رہو گے تو تمہیں کوئی بھی ایسا بے عیب) دوست نہیں ملے گا جس پر تمہیں عتاب نہ کرنا پڑے۔ تم یا تو تنہا زندگی گذارو یا پھر اپنے بھائی سے میل ملاپ پیدا کرو اور یاد رکھو کہ وہ ایک بار غلطی کرے گا تو ایک بار ٹھیک بھی کرے گا۔ اور اگر تم یہی خواہش کرو گے کہ ہمیشہ صاف ہی پانی پیو اور کبھی گدلا پانی نہ پیو تو تمہیں پیاسا مرنا پڑے گا۔ کون ایسا ہے جسے ہمیشہ صاف گھاٹ کا پانی ہی ملتا ہو؟

مسلم بن ولید کہتا ہے :۔

حسبی بما ابدات الایام تجربة ۔۔۔ سعی علیّ بکاسیها الجدیدان
دلّت علی عیبها الدنیا و صدقها ۔۔۔ ما استرجع الدهر مما کان اعطانی
ماکنت ادخر الشکوی لحادثة ۔۔۔ حتی ابتلی الدهر اسراری فاشکانی

زمانہ نے جو کچھ ظاہر کیا وہ میرے تجربہ کے لیے کافی ہے۔ اس نے مجھے اپنے سرد و گرم کا مزہ چکھا دیا۔ دنیا نے مجھے اپنا عیب بتایا۔ اور زمانہ نے وہ چیزیں واپس لے کر جو اس نے مجھے دی تھیں دنیا کی خرابی کی تصدیق کر دی۔ میں کسی حادثہ کے لیے شکایت بچا کر نہیں رکھتا تھا تا آنکہ زمانے نے میرے راز معلوم کر لیے اور مجھے شکایت پر مائل کر دیا۔

ابو العتاہیہ کہتا ہے :۔

الصمت اجمل بالفتی ۔۔۔ من منطق فی غیر حینه
لا خیر فی حشو الکلام ۔۔۔ اذا اهتدیت الی عیونه
کل امرئی فی نفسه ۔۔۔ اعلی و اشرف من قرینه

انسان کے لیے بے وقت بولنے سے خاموشی زیادہ بھلی ہے۔ اگر مقصود کلام تک تمہاری

رہنمائی ہو جائے تو پھر فالتو کلام میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے جی میں اپنے ساتھی سے اعلیٰ واشرف ہے۔

ابو تمام کہتا ہے:۔

من لی بانسان اذا اغضبته ۔ وجهلت کان الحلم رد جوابه
واذا طربت الی المدام شربت من ۔ اخلاقه فسکرت من ادابه
وتراه یصغی للحدیث بقلبه ۔ وبسمعه ولعله ادری به

مجھے وہ انسان کہاں سے ملے گا کہ جب میں اسے غصہ کر دوں۔ اور اس کے ساتھ جہالت اور طیش سے پیش آؤں تو وہ اس کا جواب علم اور بردباری سے دے؟ اور جب مجھے شراب کی سرمستی کی تلاش ہو تو اس کے اخلاق کا جام پیوں اور اس کے اداب سے مدہوش ہو جاؤں۔ جو اپنے حسن اخلاق کے سبب میری بات کو کان اور دل لگا کر سنے حالانکہ شاید وہ پہلے اسے خوب جانتا ہو۔

بحتری کہتا ہے

وترت القوم ثم ظننت فیهم ۔ ظنونا لست فیها بالحکیم
فما خرق السفیه وان تعدی ۔ بابلغ فیک من حقد الحلیم
متی احرجت ذا کرم تخطی ۔ الیک ببعض اخلاق اللئیم

تونے قوم کو نقصان بھی پہنچایا پھر ساتھ ہی ان میں تو گمان بھی رکھتا ہے (کہ وہ تیرے کام آئیں گے) ایسا کرنے میں تو دانشمند نہیں ہے۔ بے وقوف کی حماقت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو کبھی بردبار کے کینہ سے زیادہ نقصان دہ ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب بھی تم کسی شریف کو پریشان اور تنگ کرو گے تو وہ کسی قدر بداخلاقی کا مظاہرہ کر ہی دے گا۔

ابن الرومی کہتا ہے:۔

عدوك من صدیقك مستفاد ۔ فلا تستکثرن من الصحاب
فان الداء اکثر ما تراه ۔ یحول من الطعام او الشراب
وما اللُّجَجُ الملاح بمرویات ۔ وتلقی الری فی النُّطَفِ العذاب

تمہارا دشمن تمہارے دوستوں ہی میں سے بنتا ہے اور انہیں میں سے معلومات حاصل کرتا ہے اس لیے تم اپنے دوستوں کا حلقہ وسیع نہ کرو۔ بیشتر بیماریاں جو نظر آتی ہیں وہ کھانے پینے ہی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہوتی ہیں۔ نمکیں سمندر کے سمندر بھی آدمیوں کی پیاس کو سیراب نہیں کرتے اور تھوڑی مقدار میں میٹھا پانی باعث سیرابی ہو جاتا ہے۔

متنبی کہتا ہے:۔

انا لفی زمن ترك القبیح به ۔ من اکثر الناس احسان واجمال
لولا المشقة ساد الناس کلهم ۔ الجود یفقر والإقدام قتال

و انما یبلغ الانسان طاقته ما کلّ ماشیة بالرّحل شملال
ذکر الفتی عمره الثانی وحاجته ما قاته، و فضول العیش اشغال

ہم اس زمانہ میں ہمیں جس میں بیشتر لوگ اگر صرف برائی کرنا ہی چھوڑ دیں تو یہی ان کا بڑا احسان و اکرام ہوگا اور خوش خلقی متصور ہوگی۔ اگر جد و جہد کرنا اور مشقت کا مقابلہ کرنا نہ ہوتا تو سب کے سب انسان سردار بن جاتے۔ سخاوت فقیر بنا دیتی ہے۔ اور پیش قدمی قتل ہو جانے کا پیغام ہے۔ ہر انسان اپنی پوری طاقت لگاتا ہے لیکن ہر کجاوہ لے کر چلنے والی سواری تیز رفتار سانڈنی نہیں ہوتی۔ انسان کی نیک نامی اس کی دوسری اور نئی زندگی ہے۔ اس کی ضرورت وہی ہے جو اس کی گذر بسر کے لیے کافی ہو اور ضرورت سے زیادہ سامان زندگی محض مصروفیات میں اضافہ ہے۔

معذرت خواہی اور مہربانی کی درخواست:۔

علی بن جہم معذرت خواہی کرتے ہوئے متوکل سے کہتا ہے:۔

عفا الله عنك ألا حُرمةٌ تجود بعفوك ان ابعدا
لئن جلّ ذنب و لم اعتمد لانت اجلّ و اعلی یدا
الم تر عبدا عدا طوره و مولی عفا و رشید هدای؛
ومفسد امر تلافیته فعاد فاصلح ما افسدا
أقِلْنی اقالك من لم یزل یقیك و یصرف عنك الرّدی

خدا آپ سے درگذر فرمائے۔ اگر میں حد سے بڑھ جاؤں تو کیا کوئی ایسی رعایت کی شکل نہیں کہ آپ اپنے عفو سے مجھے نوازدیں۔ اگر میری خطا جو مجھ سے عمداً سرزد نہیں ہوئی ہے، بڑی ہے تو آپ کی ذات تو نہایت بزرگ اور بڑی محسن ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ غلام اپنی حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ اور آقا درگذر کر دیتا ہے اور مرد دانا رہنمائی کرتا ہے۔ میں نے ایک معاملہ کو بگاڑ دیا تھا جس کی آپ نے تلافی کر دی۔ پھر پلٹ کر اپنی خرابی کو خود میں نے بھی سدھار دیا۔ مجھ سے درگذر فرمایئے آپ سے وہ درگذر فرمائے گا جو ہمیشہ آپ کی حفاظت کرتا ہے اور وہ آپ سے تباہیوں کو دور فرمائے گا۔

بحتری کہتا ہے:۔

فدیناك من ایّ خطب عری و نائبة او شکت ان تنوبا
و ان کان رایك قد حال فیّ و اولیتنی بعد بشر قطوبا
اکذّب نفسی بان قد سخطت وما کنت اعهد ظنی کذوبا
ولو لم تکن ساخطا لم اکن اذمّ الزمان واشکو الخطوبا
ایصبح ودّی فی ساحتیك طرِیًّا ومرعای محلا جدیبا؟

وما کان سخطك الا الفراق ... افاض الدموع و یشجی القلوبا
و لو کنت اعرف ذنباً لما کا ... ن خالجنی الشك فی ان اتوبا
ساصبر حتی الاقی رضاك ... اما بعیداً و اما قریبا
اراقب رأیك حتی یصح ... و انظر عطفك حتی یثوبا

ہر مشکل جو سامنے آجائے اور ہر مصیبت جو نازل ہونے کے قریب ہو ہم اس میں آپ پر قربان ہو جائیں۔ اگرچہ میرے بارے میں اب آپ کی رائے دگرگوں ہو گئی ہے اور بجائے خندہ پیشانی سے پیش آنے کے آپ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میں آپ کی ناراضگی کے خیال پر اپنے اپنے دل کو جھٹلاتا ہوں۔ حالانکہ میں نے کبھی بھی اپنے گمان کو جھوٹا نہیں پایا تھا۔ اگر آپ ناراض نہ ہوتے تو میں نہ زمانہ کی مذمت کرتا اور نہ مصائب کا شکوہ۔ کیا آپ کی جناب میں میری محبت ناکارہ ہو گی اور میری چراگاہ خشک و بنجر رہے گی۔ آپ کی ناراضگی کا نتیجہ ایسا فراق ہے جو آنسو رواں اور دلوں کو رنجیدہ کرے گا۔ اور اگر مجھے اپنا جرم معلوم ہو جائے تو توبہ کرنے میں مجھے کسی قسم کا تامل نہ ہو گا۔ میں آپ کی خوشنودی حاصل ہونے تک صبر کرتا رہوں گا خواہ وہ دیر میں حاصل ہو جلد۔ میں آپ کی تبدیل شدہ رائے کے بحال ہونے کا انتظار کرتا رہوں گا اور آپ کی مہربانی کے پلٹنے کا منتظر رہوں گا۔

سعید بن حمید کہتا ہے :۔

لم آت ذنبا فان زعمت بان ... اتیتُ ذنبا فغیر معتمد
قد تَطْرِفُ الکفّ عین صاحبها ... فلا یری قطعها من الرَّشَد

میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ اور اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ میں نے گناہ کیا ہے تو وہ عمداً نہیں کیا ہو گا۔ کبھی آدمی کا ہاتھ (غلطی سے) اپنی آنکھ پر لگ جاتا ہے تو ایسی صورت میں یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں کہ اس سے بدلہ لیا جائے اور اسے کاٹا جائے۔

جب سیف الدولہ بنی کلاب پر غالب ہو گیا تو متنبی اس قبیلہ کے لیے مہربانی چاہتے ہوئے اپنے ایک قصیدہ میں یوں گویا ہوتا ہے :۔

طلبتهم علی الامواه حتی ... تخوّف ان تفتّشه السحاب
یهزّ الجیش حولك جانبیه ... کما نفضت جناحیها العقاب
و کیف یتمّ باسك فی اناس ... تصیبهم و یؤلمك المصاب؟
ترفّق ایّها المولی علیهم ... فان الرفق بالجانی عتاب
و انّهم عبیدك حیث کانوا ... اذا تدعوُ لحادثةٍ اجابوا
و عین المخطئین هم و لیسوا ... باوّل معشرٍ خطئوا فتابوا
و ما جهلت ایادیك البوادی ... و لکن ربما خفی الصواب

وکم ذنب مولّدہ دلال وکم بعد مولّدہ اقتراب
وجرم جرّہ سفہاء قوم وحلّ بغیر جارمہ العقاب

آپ نے ان کو تمام پانی والے مقامات میں تلاش کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ بادل کو بھی خطرہ ہو گیا کہ کہیں آپ کی بھی تلاشی نہ لے لیں۔ آپ کے اردگرد لشکر کے دونوں بازو اس طرح متحرک ہیں جیسے عقاب اپنے پر جھاڑ رہا ہو۔ ان لوگوں کو آپ کیونکر پوری سزا دے سکتے ہیں جن کو سزا دینے سے خود آپ کو تکلیف ہوتی ہے؟ اے آقا! ان پر مہربانی اور نرمی فرمایئے کہ مجرم پر مہربانی کرنا بھی عتاب کا ایک طریقہ ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوں آپ کے غلام ہی ہیں۔ جب بھی انہیں کسی موقع پر آپ پکاریں گے وہ آپ کی پکار کا جواب دیں گے۔ یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے خطا کی ہے لیکن یہ کوئی پہلے خطاکار نہیں ہیں جو خطا کر کے تائب ہو رہے ہوں۔ اہل بادیہ آپ کے احسانات سے ناواقف نہیں لیکن کبھی حق آنکھوں سے اوجھل بھی ہو جاتا ہے۔ کتنے ہی گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ارتکاب ناز اور شوخی کی وجہ سے کیا جاتا ہے اور کتنے ہی بُعد ایسے ہیں کہ ان کا . . . . . سبب قرب ہوتا ہے۔ کتنے ہی ایسے گناہ ہوتے ہیں کہ قوم کے نادانوں سے وہ سرزد ہو جاتے ہیں لیکن ان ناکردہ گناہوں کی سزائیں دوسرے لوگ بھگتے ہیں۔

پانچویں فصل

مولّد شعراء[۱]

زمانہ جاہلیت میں شعراء، قوم کی مدافعت کرنے والی زبان، اس کے حقوق و واجبات کے پاسبان، قومی بلند کارناموں کو دوام بخشنے اور ان کے ترجمانی کرنے والے تھے۔ عہد بنی امیہ میں وہ دین کے داعی، حکومت کو استحکام بخشنے والے ستون، اپنے افکار و مذاہب کے حامی و ناصر اور اپنی پارٹی اور فرقہ کے مؤید تھے۔ عہد عباسیہ میں وہ خلیفہ کے ندیم و مصاحب، حکام و امراء کے مجالس شراب کے متوالے اور عشق و محبت کے دیوانے تھے۔ مؤخر الذکر عہد کے اوائل میں بغداد کے بیشتر شعراء ان محکوم قوموں سے تعلق رکھتے تھے جو بجبر عربوں کے مطیع ہوئے اور اوپری طور پر مسلمان ہوگئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اخلاق کے قلعہ پر فحشیات و آوارگی کے ذریعہ حملے کیے، لوگوں میں الحاد و زندیقی کو رواج دیا اور دین میں شکوک پھیلائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے آزادی فکر، جدت معانی، نادر افکار و خیالات، عمدہ وصف، نئے نئے مذاہب اور غیر معمولی منقولہ ادبی سرمایہ کا بھی اضافہ کیا۔ اس ضمن میں مطیع بن ایاس، حماد عجرد، حسین بن ضحاک، بشار بن برد، والبہ بن حباب، ابو نواس، مسلم بن ولید، ابان بن عبد الحمید، ابو العتاہیہ، ابو دلامہ، مروان بن ابی حفصہ، عباس بن احنف، علی بن الجہم، دعبل خزاعی اور عکوّک قابل ذکر ہیں۔

بغداد کے شعراء

بشار بن بُرد (متوفی ۱۶۷ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:- بشار بن برجوخ، ولاء کے اعتبار سے عقیلی ہے۔ اس کی کنیت ابو معاذ اور لقب مُرعّث ہے (اس لیے کہ اس کے کانوں میں بندے پڑے رہتے تھے) اس کا باپ ایرانی، طخارستان کا باشندہ تھا جو مہلب بن ابی صفرہ کے قیدیوں میں سے تھا جسے مہلب نے بنی عقیل کی کسی خاتون کو ہبہ کر دیا تھا۔ اس خاتون نے بعد میں اس سے نکاح کر لیا اور یوں وہ عقیلی کہلانے لگا۔ بشار بصرہ میں پیدا ہوا اور اس نے بنی عقیل میں پرورش پائی۔ وہ بصرہ کے مضافات میں مقیم عرب کے دیہاتی باشندوں سے ربط و ضبط رکھنے میں دلچسپی لیتا اور ان میں آمد و رفت کا سلسلہ رکھتا تھا، چنانچہ جب وہ جوان ہوا تو اس کی زبان نہایت شستہ و فصیح تھی اور بیان غلطیوں سے پاک۔ یہی سبب ہے کہ بشار وہ آخری شاعر

---

[۱] مولدین کے لیے صفحہ ۳۴۹ کا فٹ نوٹ دیکھئے۔

ہے جن کی شاعری علمائے نحو قابل سند شمار کرتے ہیں۔ جب اس نے باقاعدہ ذمہ داری کی زندگی میں قدم رکھا تو خلفاء و امراء کی مدح کہہ کر ان کے عطیوں پر گذر کرنے لگا۔ اگر وہ ہجو نہ کہتا اور عورتوں سے تعرض نہ کرتا تو وہ اپنی شاعری سے نہایت آسودہ و با فراغت زندگی گذارتے ہیں کامیاب ہو جاتا، لیکن اس کی عریاں بیانی کی وجہ سے لوگ اس سے برہم ہو گئے اور انہوں نے دوشیزاؤں کی حرمت، پردہ نشینوں کی عصمت محفوظ رکھنے کے لیے اسے مار ڈالنا چاہا۔ مالک بن دینار کا قول ہے "اس ملحد اندھے کی شاعری سے زیادہ کوئی چیز شہر میں لوگوں کو فسق و فجور پر برانگیختہ کرنے والی نہیں ہے"۔ بالآخر غیرت مند شہریوں کے ایک وفد نے مہدی کے دربار میں پہنچ کر اسے بشار کا ایک عشقیہ قصیدہ سنایا جسے سن کر مہدی نے کہا "یہی وہ شاعری ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی اور مشکلات آسان کر دیتی ہے"۔ پھر اس نے بشار کو بلوایا۔ جب وہ حاضر ہوا تو اس سے کہا "اگر تم نے آج کے بعد ایک عشقیہ شعر بھی کہا تو بخدا میں تمہاری جان لوں گا"۔ چنانچہ اس کے بعد جب بھی بشار تغزل و تشبیب میں کچھ کہنا چاہتا تو اسے خلیفہ کی تنبیہ یاد آجاتی، تاہم وہ اسے نہ روکتی اور وہ اپنی مرضی کی شاعری کر گذرتا۔

جب اس کی عریاں بیانی حد سے بڑھ گئی، مہدی کی تنبیہ اور لوگوں کی سرزنش بھی بے سود رہی تو لوگوں نے ایک مرتبہ پھر خلیفہ کے دربار میں اس کی شکایت کی اور اس کے خلاف تمام الزامات بیان کیے۔ اس اثناء میں ایک مرتبہ بشار نے مہدی کی مدح بھی کی، لیکن مہدی اس سے برگشتگی کی بناء پر اسے انعام دینے کے بجائے الٹا اس پر برس پڑا۔ چنانچہ بشار نے اس کی ہجو کہہ ڈالی جس میں یہ شعر بھی تھے:۔

بنی أمیة ھبو طال نومکم ... ان الخلیفة یعقوب بن داود

ضاعت خلافتکم یا قوم فالتمسوا ... خلیفة الله بین الزق والعود

اے بنی امیہ! بہت سو چکے اب بیدار ہو جاؤ۔ واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ یعقوب بن داود ہے۔ اے قوم! تمہاری خلافت ضائع ہو گئی ہے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر تم خلیفۃ اللہ کو تلاش کرنا چاہو گے تو اسے شراب و ستار کی محفل میں پاؤ گے۔

جب یہ ہجو خلیفہ تک پہنچی تو اس نے کوتوال کو بلا کر اسے بشار کو کوڑے مارنے کا حکم دیا، چنانچہ اس نے اتنے کوڑے مارے کہ بشار مر گیا۔ یہ ۱۶۷ھ کا واقعہ ہے جب وہ ستر برس کا ہو رہا تھا۔

بشار کا حلیہ اور اخلاق:۔ بشار ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہوا تھا اور اس نے دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا، بایں ہمہ اپنی شاعری میں چیزوں کو ایک دوسری سے تشبیہ دینے میں جو کمال اسے حاصل تھا وہ آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں۔ مثلاً وہ اپنے ایک شعر میں جنگ میں چھا جانے والے گرد و غبار کے اندھیرے کو رات سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

کانّ مثار النقع فوق رؤسنا
واسیافنا لیل تهاوی کواکبه

بشار بڑے ڈیل ڈول والا، نہایت لمبا، چیچک رو اور ایسی ابھری آنکھوں والا تھا جن پر سرخ گوشت چڑھا ہوا تھا۔ اس طرح وہ نہایت بدشکل اور بھیانک اندھا تھا۔ ایک مرتبہ کسی عورت نے اس سے کہا "پتہ نہیں اس مکروہ صورت کے باوجود لوگ تجھ سے مرعوب کیوں ہو جاتے ہیں؟" تو اس نے جواب دیا "شیر کا حسن لوگوں کو مرعوب نہیں کرتا ہے"۔ ایک مرتبہ ایک ادیب اس سے ملنے کے لیے اس کے گھر پر پہنچا جہاں اس نے بشار کو گھر کی دہلیز پر بھینسے کی طرح پڑا سوتا پایا، اس نے بشار سے کہا "اے ابو معاذ! یہ شعر کس کا ہے؟

ان فی بردیّ جسماً ناحلاً لو توکأت علیه لانهدم

میرے کپڑوں کے اندر ایک لاغر جسم ہے۔ اگر تو (اے محبوبہ) اس پر ٹیک لگائے تو وہ دھم سے گر جائے گا"۔

بشار نے جواب دیا "یہ میرا ہی شعر ہے" پھر اس نے پوچھا "اور یہ شعر کس کا ہے؟

فی حلّتی جسمُ فتیً ناحلٍ لو هبّت الریح به طاحا

میرے لباس میں ایک لاغر نوجوان کا جسم ہے۔ اگر اس پر ہوا بھی چلے تو وہ اُڑ جائے گا"۔
بشار نے جواب دیا "یہ بھی میرا ہی شعر ہے" اس پر اس ادیب نے کہا "جناب کو اس مبالغہ آرائی اور دروغ بیانی کی زحمت کیوں برداشت کرنا پڑی؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ وہ تند و تیز آندھیاں بھی چلا دے جن سے پچھلی قوموں کو ہلاک کیا گیا تھا تو بخدا وہ بھی آپ کو اپنی جگہ سے ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکیں گی"۔

بشار بڑا ذہین، حاضر جواب، حساس، بدزبان، منہ پھٹ اور مسخرا تھا، اس کی دینداری مشتبہ تھی، وہ تناسخ کا قائل تھا، آگ کو مٹی پر تفوق اور آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کے بارے میں وہ ابلیس کی رائے کو صحیح بتاتا تھا، اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:-

الارض مظلمة والنار مشرقة والنار معبودة مذ کانت النار

زمین تاریک ہے اور آگ روشن۔ اور آگ جب سے پیدا ہوئی ہے وہ معبود ہی ہے۔
بشار جب اپنے شعر پڑھنا چاہتا تو پہلے تالی بجاتا، کھنکھارتا اور دائیں بائیں تھوکتا پھر شعر پڑھتا۔

اس کی شاعری:- بیس برس کی عمر میں بشار نے شاعری شروع کر دی تھی، اور ابھی اس نے جوانی میں پوری طرح قدم بھی نہ رکھا تھا کہ ملک میں اس کا شہرہ عام ہو چکا تھا، اس نے جریر کا زمانہ پایا تھا اور اس کی ہجو بھی کہی تھی، خود اس کا قول ہے "میں نے جریر کی ہجو کہی، لیکن اس نے بچہ سمجھتے ہوئے مجھے درخور اعتنا نہ سمجھا، اگر وہ میرا جواب دے دیتا تو میں

بڑا شاعر بن جاتا" اس نے سب سے پہلے شاعری کی جس صنف میں طبع آزمائی کی وہ ہجو ہی تھی، اس لیے کہ اس کے بچپن میں اسی صنف کلام کی مانگ تھی۔ بعد ازاں اس نے نہ صرف شاعری کی ان تمام اصناف میں طبع آزمائی کی جو اس سے قبل موجود تھیں بلکہ ان میں اضافہ بھی کیا۔ شاعری کے جملہ رواۃ وناقدین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ بشار طبقہ مولدین[1] کا سرگروہ، فحش مذاق اور رقت انگیز تغزل میں ان سب کا امام تھا، یہی پہلا شخص ہے جس کی شاعری میں بدویانہ بھاری بھرکم پن اور تمدنی نزاکت یکجا ملتی ہے اور جس کی شاعری قدیم وجدید شاعری کے درمیان حد اوسط ہے۔ طبقہ مولدین میں اس کا وہی مقام ہے جو شعراء جاہلین میں امرؤ القیس کا۔ تعقید، نامانوس الفاظ، اور دیگر خامیوں سے اس کی شاعری کے پاک صاف ہونے کے باعث اصمعی اسے اعشیٰ و نابغہ کا ہم پلہ قرار دیتا تھا۔ خود جاحظ نے تمام اصناف کلام میں اس کے تفوق کی شہادت دی ہے، وہ کہتا ہے "بشار خطیب تھا، وہ نظم ونثر پہ کامل دسترس رکھتا تھا، وہ طبع زاد اور جدت طراز شاعر، اور شاعری کے تمام اصناف میں ماہر اور ہر صنف پر طبع آزمائی کرنے والا تھا"

بشار کی شاعری میں جو روانی دکشش اور حسن و رونق ہے اس کی بناء پر وہ بصرہ کے جوانوں اور آزاد مزاجوں میں خوب مقبول ہوئی، خود عورتوں پر بھی اس کا جادو چل گیا، چنانچہ وہ بھی بشار کے پاس جاتیں، اس کی باتوں سے دل خوش کرتیں اور اس کے اشعار گاتیں، ان میں سے عبدہ نامی ایک کنیز پر وہ عاشق ہو گیا تھا اور اسے اپنی شاعری میں نام لے لے کر مشہور بھی کر دیا تھا چنانچہ ان دونوں کے متعلق بہت سے قصے اور اشعار لوگوں میں عام ہو چکے تھے۔

اس کی شاعری کے عیوب:- اس کی شاعری میں سے قابل تنقید مواد بتمام وکمال معلوم کرنا ممکن نہیں، اس لیے کہ اس کا بیشتر حصہ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ بارہ ہزار قصائد میں سے صرف گنتی کے منتخب قطعات مختلف کتابوں میں منتشر باقی رہ گئے ہیں[2] بہر حال اس کے عیوب معلوم ہو سکے ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ وہ دل لگی بازی اور مذاق میں حد سے آگے نکل جاتا ہے، ثانیاً قافیہ سے مجبور ہو کر وہ بے حقیقت الفاظ سے جگہ پر کر لیتا ہے، ثالثاً وہ پر شوکت الفاظ اور سنجیدہ معانی سے گر کر سطحی معانی اور رکیک الفاظ پر اتر آتا ہے، مثلاً وہ اپنی محبوبہ

---

[1] مُوَلّدین یا مُحْدَثین سے مراد وہ شعراء ہیں جن کا لسانی ملکہ بگڑ گیا تھا، چنانچہ اس خامی کا تدارک انھوں نے عہد عباسی کے شاعروں کی طرح تصنع سے کیا تھا۔ ان کی مابہ الامتیاز صفات معانی پیدا کرنا، موضوعات کی بارکی، الفاظ کی رقت اور حسن وصنعت ہیں، تاہم یہ اپنے پیش رو شعراء سے قوت وشوکت میں کمتر اور تصنع وتکلف میں آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

[2] خالدیان نے اس کے اشعار کا اچھا انتخاب جمع کر کے اس کی شرح بھی کر دی ہے، اس مجموعہ کا نام "المختار من شعر بشار" ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۵ء میں قاہرہ سے شائع ہو چکا ہے۔

کے لیے کہتا ہے:۔

زبابة ربّة البيت تصبّ الخلّ فی الزيت
لها عشر دجاجات وديك حسن الصّوت

ربابہ گھر کی مالکہ ہے۔ وہ زیتون کے تیل میں سرکہ ڈالتی ہے۔ اس کی دس مرغیاں ہیں اور ایک خوش آواز مرغ ہے۔

یا مثلاً اس کے یہ اشعار ہیں:۔

ان سلمی خلقت من قصب قصب السکر لا عظم الجمل
و اذا ادنیت منها بصلاً غلب المسك علی ریح البصل

سلمیٰ ، شکر سے بنی ہے ، اونٹ کی ہڈی سے نہیں۔ اگر تم اس کے پاس پیاز لے جاؤ تو اس کی مشک سے بسی ہوئی مہک پیاز کی بو پر غالب آ جائے گی۔

لیکن بشار معذرت کرتے ہوئے کہتا تھا کہ پہلی قسم کی شاعری حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کی گئی ہے اور مؤخر الذکر قسم کی شاعری بچپن کی یادگار ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ عشقیہ شاعری:۔

یزهدنی فی حب عبدة معشر قلوبهم فیها مخالفة قلبی
فقلت دعوا قلبی وما اختار وارتضی فبالقلب لا بالعین یبصر ذو الحب

بہت سے لوگ جن کے دل میرے دل سے ہم آہنگ نہیں میرے دل سے عبدہ کی محبت کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میں ان سے کہتا ہوں کہ تم میرے دل کو اس کی مرضی اور اختیار میں آزاد چھوڑ دو اس لیے کہ عاشق دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا۔

ایضاً:۔

یا قوم اُذنی لبعض الحیّ عاشقة والاذن تعشق قبل العین احیانا
قالوا بمن لا تری تهذی؟ فقلت لهم الاذن کالعین توفی القلب ما کانا

اے لوگو! محلہ کے کسی فرد پر میرا کان عاشق ہو گیا ہے ، اور کبھی آنکھ سے پہلے کان عاشق ہو جاتا ہے۔ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ جسے تم نے دیکھا بھی نہیں اس کے بارے میں بے تکی ہانکتے ہو! اور میں انہیں جواب دیتا ہوں کہ کان بھی آنکھ کی طرح دل کو حقیقت حال سے پوری طرح باخبر کر دیتا ہے۔

ایضاً:۔

لم یطل لیلی ولکن لم انم ونفی عنی الکری طیف ألم
نفّسی یا عبدَ عنی واعلمی أننی یا عبدَ من لحم ودم
ان فی بردی جسما ناحلاً لو توکأت علیه لانهدم

میری شب دراز نہیں ہوئی بلکہ مجھے نیند ہی نہ آئی ،محبوبہ کے خواب نے آکر مجھ سے میری نیند کو اڑا دیا۔ اے عبدہ! خدا کے لیے مجھ پر رحم کر اور یہ جان لے کہ میں (لوہے کا نہیں) گوشت اور خون ہی کا بنا ہوا ہوں۔ میرے کپڑوں میں ایک لاغر جسم ہے اگر تو اس پر ٹیک لگائے گی تو اتنے ہی بار سے وہ جسم سے گر پڑے گا۔

اس کے مشہور عالم اشعار:۔

هل تعلمين وراء الحب منزلة　　تدني اليك ، فان الحب اقصاني

کیا محبت سے آگے بھی کوئی ایسا مقام ہے جس پر پہنچ کر میں تجھ سے قریب ہوسکوں گا؟ اس محبت نے تو مجھے تجھ سے اور دور ہی کر دیا ہے۔

ایضاً:۔

انا والله اشتهی سحر عينيك　　واخشى مصارع العشاق

خدا کی قسم! مجھے تیری آنکھوں کا جادو نہایت درجہ محبوب ہے ،لیکن ساتھ ہی مجھے ڈر بھی ہے کہ کہیں عاشقوں کی طرح بے بس ہو کر نقصان جان نہ کر بیٹھوں۔

اس کے ان شعروں سے عقیدہ جبر کی تائید ہوتی ہے:۔

طبعت على ما فی غیر مخیر　　هوای ، ولو خيرت كنت المهذبا
أريد فلا أعطی و أعطى ولم أرد　　و تقصر علمی ان أنال المغيبا

میں جن اخلاق و عادات پر پیدا ہوا ہوں وہ اختیاری نہیں جنہیں میں نے اپنی مرضی سے پسند کیا ہو، اگر مجھے اختیار دیا جاتا تو میں نہایت شائستہ ہوتا۔ جو میں چاہتا ہوں وہ مجھے دیا نہیں جاتا، اور جو کچھ مجھے دیا جاتا ہے اسے میں چاہتا نہیں۔ اور میرا علم ،غیب کے امور کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔

وصف و حماسہ کا نمونہ:۔

اذا الملك الجبار صعر خده　　مشينا اليه بالسيوف نعاتبه
و أدعن يغشى الشمس لون حديده　　و تخبس ابصار الكماة كتائبه
تغص به الارض الفضاء اذا غدا　　تزاحم أركان الجبال مناكبه
ركبنا له جهراً بكل مثقف　　و ابيض تستسقى الدماء مضاربه
كأن مثار النقع فوق رؤوسنا　　و اسيافنا ليل تهاوى كواكبه

جب کوئی جبار بادشاہ اکڑتا ہے تو ہم اس کے عتاب کو فرو کرنے کے لیے تلواریں لے کر سرگرم معاتبہ میں آجاتے ہیں۔ اور وہ ہتھیار سے لیس لشکر جرار جس کے نیزوں اور آہنی ہتھیاروں سے سورج چھپ جاتا ہے اور جس کے فوجی دستے بہادروں کی نگاہوں کو روک لیتے ہیں۔ وسیع زمین جس کی کثرت سے تنگ ہو جاتی ہے اور جب وہ حرکت میں آتا ہے تو اس کے کنارے پہاڑوں سے

مزاحمت کرتے ہیں۔ ہم ایسے لشکر جرار کے مقابلہ میں خون آشام نیزے اور تلواریں لے کر چڑھ آتے ہیں۔ اس جنگ میں ہمارے سروں پر چھانے والا غبار اور ہماری تلواریں ایسا سماں پیدا کرتی ہیں جیسے رات (کی تاریکی) میں تارے ٹوٹ رہے ہوں۔

ابوالعتاہیہ

(ولادت ۱۳۰ھ وفات ۲۱۱ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:- اس کا پورا نام اسماعیل بن قاسم بن سُوَید ہے کنیت ابو اسحاق اور لقب ابوالعتاہیہ ہے۔ وہ حجاز میں عین التمر نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوا، اور کوفہ میں اپنا خاندانی پیشہ سیکھتے ہوئے اس نے پرورش پائی جو کمہار کا پیشہ تھا۔ چنانچہ وہ بھی مٹکے بناتا، انہیں رسی کی بنی ہوئی جالی میں بھر کر کوفہ کی گلیوں میں اٹھائے لیے پھرتا اور آوازیں لگا کر بیچتا رہتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے شاعری کا بڑا شوق اور ادب سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ بے تکان از خود شعر موزوں کرتا رہتا، کبھی اثنائے گفتگو میں وہ ایسی موزوں مقفی بات کہتا جسے لوگ تو نثر ہی سمجھتے لیکن وہ شعر ہوتی تھی۔ یہ اس لیے ہوتا کہ اس کی طبیعت میں ملکۂ شاعری بڑی حد تک راسخ ہو چکا تھا حتیٰ کہ وہ خود اپنے متعلق کہا کرتا تھا "اگر میں چاہوں کہ اپنی ہر بات شاعری میں کہوں تو یہ بھی میرے لیے ممکن ہے۔"

یہ بات کہ شاعری اکتسابی ہنر نہیں بلکہ خدا داد صلاحیت اور طبیعت پر منحصر ہے۔ ایک حقیقت جس کی تائید اس شاعر کی زندگی سے ہوتی ہے جو فن عروض و قوافی سے یکسر نابلد تھا۔ جب اس کی شاعری کوفہ کے نوجوانوں اور ادبی ذوق رکھنے والوں نے سنی تو وہ اس کے آوے میں اس کے پاس جانے لگے، اور اس سے اس کی شاعری سننے لگے۔ سامعین وہاں سے ٹھیکریاں اٹھاتے اور ان پر شعر لکھ کر لے جاتے۔ اس طرح ابوالعتاہیہ اپنے آوے میں شاعری کے ٹھیکرے بھی تیار کرنے لگا لیکن کچھ دیر نہ لگی کہ وہ ایسے موتی بھی تیار کرنے لگا جو امراء و کبراء کے گلوں کا ہار بننے لگے۔ اور بالآخر وہ لوگوں میں ضرب المثل بن گیا اور ایک دن وہ آیا کہ یہ کمہار مٹی پانی سے نکل کر شعراء کی مجالس اور خلفاء کے دربار کی رونق بن گیا۔

خلیفہ مہدی کے ابتدائی دور میں وہ بغداد، مرکز علم و ادب پہنچا۔ اس نے مہدی کی مدح میں قصیدے کہے اور اس کے دربار میں بڑی عزت پائی۔ اس کی بعض کنیزوں سے میل جول کا موقع نکالا اور ان میں سے ایک نوجوان کنیز عتبہ کو دل بھی دے بیٹھا۔ اس کے عشق میں بہت سے شعر کہے۔ مہدی کا تو ارادہ ہو گیا تھا کہ وہ کنیز اسے بخش دے، لیکن اس کنیز نے نفرت کی بناء پر اس کے پاس جانا پسند نہ کیا۔ چنانچہ مہدی اسے مال کثیر دے کر اس کے دل سے کنیز کی یاد کو محو کرتا رہا۔ وہ مال تولے

لیتا لیکن کنیز کے ذکر سے باز نہ آتا حتیٰ کہ خود مہدی کے مدحیہ قصائد میں بھی اس کا ذکر کر دیتا[1] کہا جاتا ہے کہ وہ اوپری دل سے محض تصنع کے طور پر یہ ذکر کرتا تھا، تاکہ اس طرح لوگوں میں اس کا چرچا جاری رہے۔ جب خلیفہ مہدی کا انتقال ہوا اور ہادی اس کا جانشین ہوا تو اس شاعر کے رویہ میں بھی تبدیلی ہوگئی۔ اس نے عتبہ کا ذکر چھوڑ دیا۔ زہد و تقشف اختیار کر لیا۔ بعض فرقوں اور متکلمین کے مذاہب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ ان میں سے ہر ایک پر وقت صرف کرتا اور جب کسی طرف سے اعتراض ہوتا دیکھتا تو اس مصروفیت کو چھوڑ دیتا۔ ابھی رشید کا زمانہ آنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے تشبیب و تغزل چھوڑ کر اپنی شاعری کا تمام تر رخ زہد اور موت کی یاد کی طرف پھیر دیا۔ پھر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس نے بالکل شعر کہنا ہی چھوڑ دیے۔ رشید نے اسے شعر کہنے پر مجبور کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ چنانچہ رشید نے اسے ساٹھ بید لگوائے اور جیل میں ڈال دیا اور اس وقت رہا نہ کیا جب تک کہ اس نے شاعری شروع نہ کر دی۔ اس کے بعد رشید نے ابو العتاہیہ کو اپنا مصاحب خصوصی بنا لیا اور سفر و حضر میں کبھی اسے جدا نہ کیا۔ پچاس ہزار درہم اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ جو اس کے اور دیگر امراء کے انعامات کے علاوہ تھا۔ اس طرح اس کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا۔ گویے اس کے شعر گاتے، ہر طبقہ کے لوگ بالخصوص زاہد و عابد اس کی شاعری بطور مناجات پڑھتے۔ علماء و رواۃ اس کی شاعری جمع کرنے کا اہتمام کرنے لگے۔ یہ سلسلہ رشید و امین کے دور اور ماموں کے عہد کے بیشتر ایام تک جاری رہا حتیٰ کہ وہ ۲۱۱ھ میں وفات پا گیا۔

اس کا حلیہ اور اخلاق:- ابو العتاہیہ کا رنگ گورا تھا، بال سیاہ گھنگھریالے، جو کانوں پر لٹک آتے تھے۔ وہ خوش وضع تھا اور زبان کا شیریں۔ مذہب میں تلون، افکار و آراء میں اضطراب کی وجہ سے وہ ڈھلمل یقین اور عقیدہ کا کچا تھا۔ باوجود تونگری و آسودگی کے وہ خود اپنے نفس پر اور اپنے بال بچوں پر خرچ میں تنگی کرتا تھا۔ بعض لوگ اسے حیات اخروی کا منکر بتاتے ہیں اور اس دعوی پر دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اس کی شاعری میں موت، فنا اور خاتمہ کا ذکر تو ملتا ہے لیکن میعاد، موت کے بعد اٹھنا، حیات بعد الموت کا ذکر نہیں ملتا۔ الغرض اس شاعر کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا اسے غیر مستقل مزاج، عجیب و غریب اخلاق کا مالک نیز نسب، محبت علم و عقیدہ میں ڈانواڈول ہی پائے گا۔

اس کی شاعری:- ابو العتاہیہ بحر زخار ہے۔ اس میں نزاکت معانی، سہولت الفاظ اور نیرنگی مضامین ہے۔ تکلف و آورد کی کمی ہے۔ تاہم اس کی شاعری کا بیشتر حصہ پست درجہ کا اور معیار سے گرا ہوا ہے۔ اس کی بہترین شاعری وہ ہے جو اس نے زہد کے موضوع پہ کی ہے یا جس میں ضرب الامثال نظم کی ہیں۔ اصمعی کا قول ہے "ابو العتاہیہ کی شاعری کی مثال بادشاہوں کے

---

[1] دیکھئے زہر الآداب، صفحہ ۲۰۰۔

صحن کی سی ہے جہاں جواہرات، سونا، مٹی اور گٹھلیاں ملے جلے پڑے ملتے ہیں"۔ یہ حقیقت ہے، اس لیے کہ وہ جولانی طبع سے مجبور ہو کر بغیر کاٹ چھانٹ کیے جو بھی شعر بنتے انہیں کہتا چلا جاتا۔ بایں ہمہ وہ بشار و ابو نواس کی طرح مولدین کے طبقۂ اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ ابو نواس تو اسے اپنے اوپر ترجیح دیتا تھا۔ ابو العتاہیہ کی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیت، تکلف کی کمی اور الفاظ کی سہولت ہے اور یہ اس حد تک پائی جاتی ہے کہ اس پر ابتذال کا گمان گذرتا ہے۔ اس کے پاس عام فہم شاعری کے جواز میں دلیل یہ تھی کہ اس کا موضوع پند و زہد ہے اور اس کا فائدہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ عام فہم اور آسان زبان میں ہو۔ یہی وہ شاعر ہے جس نے اپنے بعد آنے والے شعراء کے لیے پند و نصائح کے راستے ہموار کیے اور اس کے بعد انہوں نے اس کے اسلوب کا اتباع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے شاعری کے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی، تاہم اسے جو تفوق و برتری حاصل ہوئی وہ حکمت و ضرب الامثال کو نظم کرنے ہی میں تھی۔ اس کا ایک رجزیہ قصیدہ ہے جس میں اس نے چار ہزار سے زائد ضرب الامثال یکجا کر دی ہیں۔ اس کے تغزل کا سب سے بہترین حصہ وہی ہے جو اس نے عتبہ کے عشق میں کہا ہے۔ اور اس کے بہترین مدحیہ قصائد وہ ہیں جو اس نے مہدی اور رشید کی مدح میں کہے ہیں۔ ہجو سے اس نے اپنی زبان کو محفوظ ہی رکھا، تاہم اس کے اور عبداللہ بن معن کے درمیان کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جن کی بناء پر اسے اس موضوع پر زبان کھولنا پڑی، لیکن نہایت محتاط طریقہ سے، جس میں نہ فحش بیانی تھی نہ لغویات، مثلاً وہ ہجو میں کہتا ہے:۔

فصغ ما كنت حليت   به سيفك خلخالا
وما تصنع بالسيف   اذا لم تك قتالا؟
ولو مد الى اذنيه   كفيه لما نالا
اذى قومك ابطالا   وقد اصبحت بطالا

تو نے اپنی تلوار کو جس آرائش سے آراستہ کر رکھا ہے اسے نکال کر اس کی بجائے اس سے اپنے ہاتھوں کے کنگن بنوا کر پہن لے۔ اور تو تلوار سے کرے گا بھی کیا جب کہ تجھ میں مارنے کی قوت ہی نہیں ہے؛ کوتاہی دست کا تو یہ عالم ہے کہ اگر وہ اپنے ہاتھ اپنے کانوں تک ہی پہنچانا چاہے تو وہاں تک بھی نہیں پہنچیں گے۔ تیری قوم تو مجھے بہادر نظر آتی ہے لیکن تو تو نرا گیدڑ ہی ہے۔

تغزل:۔

عيني على عتبة منهلة   بدمعها المنسكب السائل
كأنها من حسنها درة   اخرجها اليم الى الساحل

کان فی فیھا دنی طرفھا سواحرا اتبلن من بابل
بسطت کفی نحوکم سائلاً ماذا تردون علی السائل
ان لم تنیلوہ تقولوا لہ قولا جمیلاً بدل النائل
لم یبق منی حبھا ما خلا حشاشۃً فی بدن ناحل
یا من رای قبلی قتیلا بکی من شدۃ الوجد علی القاتل

میری آنکھ غتبہ کے فراق میں آنسوؤں کی جھڑیاں برسا رہی ہے۔ اپنے حسن کی وجہ سے وہ اس آبدار موتی سے مشابہ ہے جسے سمندر نے ابھی ساحل پر نکال کر رکھ دیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے منہ اور آنکھوں میں بابل کی جادوگرنیاں آ بیٹھی ہیں۔ میں نے تمہاری طرف دست سوال دراز کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم سائل کو کیا دے کر واپس کرتے ہو۔ اگر تم اسے بخشش نہیں دیتے تو اس کی بجائے کم از کم بھلی بات تو کہہ دو۔ محبوبہ کی محبت نے میرے پاس اب لاغر بدن میں بقیہ روح کے علاوہ کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے۔ اور اے لوگو! یہ تو بتاؤ کہ تم نے کبھی مجھ سے پہلے کسی کو بھی ایسی انوکھی حرکت کرتے دیکھا ہے کہ جو اسے قتل کر رہا ہو اسی پر وہ رو رو کر جان دیے دیا ہو۔

مہدی کی بیٹی کی وفات پر اس کے مرثیہ میں کہتا ہے :۔

ما للجدیدین لا یبلی اختلافھما وکل غصن جدید فیھما بالی؟
یا من سلا عن حبیب بعد میتتہ کم بعد موتک ایضاً عنک من سال!
کان کل نعیم انت ذائقہ من لذۃ العیش یحکی لمعۃ الآل
لا تلعبن بک الدنیا وانت تری ما شئت من عبر فیھا و امثال
ما حیلۃ الموت الا کل صالحۃ اولا، فما حیلۃ فیہ لمحتال

سلسلۂ روز و شب میں کون سی قوت پنہاں ہے کہ باوجود ادل بدل کر آتے رہنے کے ان میں کہنگی اور خستگی کے آثار پیدا نہیں ہوتے حالانکہ ہر نئی شاخ ان دونوں کی گردشوں سے کہنہ وخستہ ہو جاتی ہے! اے وہ جو محبوب کی موت کے بعد اس کی موت کے غم کو بھلا چکا ہے۔ تجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تیرے مرنے کے بعد بھی لوگ تیرے غم کو اسی طرح غلط کر لیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں جو لذت پائی جاتی ہے اس کی حقیقت سراب کی سی ہے۔ دنیا کی ان عبرتوں اور مثالوں کو دیکھنے کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں حقائق سے غافل کر دے اور کھیل کود میں مشغول کر دے۔ موت کے غم سے نجات دینے والا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے عمل صالح، اگر یہ نہیں تو پھر کوئی چال بھی موت کے مقابلہ میں کارگر نہیں ہے۔

جب رشید نے شاعری چھوڑنے پر اسے قید کیا تو اس نے یہ اشعار کہے :۔

تذکر امین اللہ حقی و حرمتی وما کنت تولینی لعلک تذکر

لیالی تدنی منك بالقرب مجلسی و وجهك من ماء البشاشة يقطر
فمن لی بالعین التی کنت مرة الیّ بها من سالف الدهر تنظر

اے رشید! میرے حق و حرمت کا خیال کر اور اپنے اس انعام و اکرام کو یاد کر جو تو مجھ پر کرتا تھا، شاید اس طرح تو میرے مقام کو جان سکے۔ ان راتوں کا تصور کر جب محفل میں تو مجھے اپنے قریب جگہ دیتا تھا، اور خوشی سے تیرے چہرے پر رونق و بشاشت جھلکتی ہوتی تھی۔ اب کون ہے جو آپ کی اس پرانی نظر کرم کو میرے لیے دوبارہ واپس لے آئے۔

رشید کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

لا تأمن الموت فی طرف ولا نفس ولو تسترت بالابواب والحرس
واعلم بان سهام الموت قاصدة لکل مدرع منا و مترس
ترجو النجاة ولم تسلك مسالکها ان السفینة لا تجری علی الیبس

تو کسی لمحہ اور کسی سانس بھی موت سے بے خوف نہ ہو جانا، خواہ کتنے ہی دروازے اور دربان تجھے اپنی حفاظت میں کیوں نہ لیے ہوئے ہوں۔ اور یہ جان لے کہ موت کے تیر ہر زرہ پوش اور ڈھال بردار کی طرف چلے آرہے ہیں۔ تو نجات کا امید وار ہے لیکن اس کے راستوں پر گامزن نہیں ہوتا۔ (کیا تجھے نہیں معلوم کہ) کشتی کبھی خشکی پر نہیں چلتی۔

یاد موت:۔

لدوا للموت وابنوا للخراب فکلکم یصیر الی ذهاب
الا یاموت لم ارمنك بدًّا اتیت وما تحیف وماتحابی
کانك قد هجمت علی مشیبی کما هجم المشیب علی الشباب

موت کے لیے اولاد پیدا کرو اور ویرانہ بننے کے لیے عمارتیں تعمیر کرتے رہو۔ اور یاد رکھو کہ تم سب فنا سے ہمکنار ہونے والے ہو۔ اے موت! تجھ سے کوئی مفر نظر نہیں آتا، تو آکر رہتی ہے اور کسی قسم کی رو رعایت نہیں کرتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو میرے بڑھاپے پر اسی طرح حملہ آور ہو رہی ہے جیسے بڑھاپا میری جوانی پر حملہ آور ہوا تھا۔

ابونواس

(ولادت ۱۴۵ھ وفات ۱۹۹ھ)

پیدائش اور حالات زندگی:۔ اس کا پورا نام حسن بن ہانی بن عبد الاول حکمی ہے۔ اس کی پہلی کنیت ابو علی تھی لیکن ابو نواس زیادہ شہرت پانے کی وجہ سے پہلی پر غالب آگئی۔ ابو نواس کنیت رکھنے کا قصہ یہ ہے کہ خلف الاحمر جو ابو نواس کا بڑا

چاہنے والا اور یمن سے تعلق ولار رکھتا تھا، ایک دن ابو نواس سے کہنے لگا کہ تم یمن کے اشراف میں سے ہو لہٰذا وہاں کے پادشاہوں کے ناموں میں سے کوئی نام جن کے شروع میں لفظ ذو آتا ہے بطور کنیت اختیار کر لو۔ پھر اس نے ان بادشاہوں کے نام گناتے ہوئے کہا " ذوجدن، ذویزن، ذونواس" چنانچہ اس نے موخر الذکر نام پسند کرتے ہوئے اپنی کنیت "ابو نواس" رکھ لی۔ یہ علاقۂ اہواز کی ایک بستی میں پیدا ہوا اور وہاں سے بصرہ پہنچا جہاں اس نے پرورش پائی۔ پھر بغداد منتقل ہو گیا اور وہیں وفات پائی۔ اس کا باپ بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کی فوج میں ملازم تھا۔ جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو روزگار سے پریشان ہو کر اس نے ایک عطار کے پاس کام کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے علم سے بڑی محبت اور شعر و شاعری سے بڑا شغف تھا۔ چنانچہ وہ علمار کی محفلوں میں شریک ہوتا، مشاعروں میں حصہ لیتا اور وہاں اپنی نظمیں پڑھ کر سناتا۔ جب اس نے مشہور شاعر والبہ بن حباب کی بلند پایہ شاعری اور مہارت فن کا چرچا سنا، تو اس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ وہ اس ماہر فن استاذ کے پاس جا کر اس کی شاگردی کا شرف حاصل کرے۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ اسی زمانہ میں کہیں والبہ کا گذر اس عطار کی دکان پر ہوا جہاں ابو نواس کام کرتا تھا اور اس نے اس نوجوان (ابو نواس) میں کچھ ذہانت و ذکاوت کے آثار پاتے ہوئے اس سے کہا "مجھے تمہارے اندر کچھ جوہر نظر آتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں ضائع نہ کرو۔ تم شاعر بنو گے، اگر تم میرے ساتھ رہ جاؤ تو میں تمہیں فنی کمال تک پہنچا سکوں گا"۔ ابو نواس نے اس سے اس کا نام دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا "میں والبہ بن حباب ہوں"۔ ابو نواس نے کہا "بخدا! میں تو آپ کی تلاش ہی میں تھا۔ اور یہاں تک ارادہ کر رہا تھا کہ آپ سے استفادہ کے لیے کوفہ پہنچوں"۔ الغرض ابو نواس اس کے ہمراہ ہو لیا۔ جب وہ بغداد پہنچا تو اس کی عمر تیس سے کچھ اوپر ہو چکی تھی۔ یہاں وہ شعرار کی صحبتوں میں رہا اور علمار سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، تاآنکہ وہ اپنے زمانہ کا بہترین، مشہور ترین اور ٹھوس علم رکھنے والا، شاعر بن گیا۔ جب اس کے علم و فضل کا شہرہ رشید تک پہنچا تو اس نے ابو نواس کو اپنی مدح کہنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ اس نے رشید کی مدح کہی اور اس کا مقرب و منظور بن گیا[ل] کہا جاتا ہے کہ اسے اپنے شاہی تقرب پر اس درجہ ناز تھا کہ بنو ہاشم، بڑے بڑے افسر اور سکریٹری اس کے پاس سے گذرتے اور اسے سلام کرتے تو وہ ٹیک لگائے ٹانگیں پھیلائے پڑا رہتا اور ان میں سے کسی کے احترام کی خاطر اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہ کرتا۔ وہ صوبوں کے گورنروں کی خدمت میں جاتا اور ان کی مدح بھی کرتا۔

ل کہتے ہیں کہ اسے رشید کی نظر میں یہ مقام اس لیے حاصل ہوا تھا کہ وہ صبحدم محل میں پہنچ کر محل کے خواص سے وہ تمام واقعات معلوم کر لیتا جو رشید اور کنیزوں کے درمیان گذرتے تھے۔ پھر وہ ان واقعات کے مطابق شعر کہہ دیتا تھا۔

ان ممدوحوں میں سے ایک مصر کا گورنر خصیب بھی ہے جس کی مدح میں اس نے متعدد قصائد کہے تھے۔ جنہیں عراقی رواۃ نے تو نہیں، لیکن مصری رواۃ نے بیان کیا ہے۔ بعد ازاں وہ محمد امین ہی کا ہو رہا، اس کی محفل کا شریک اور اسی کی مدح میں رطب اللسان۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کے علم میں اس کا کوئی ایسا جرم لایا گیا جس کے ثبوت کے بعد اس نے شاعر کو سزا ئے قید دے دی، اور رہائی کے بعد جلد ہی ۱۹۹ھ میں وہ بغداد میں وفات پا گیا۔

اس کا حلیہ اور اخلاق:- ابونواس خوبصورت، سبک روح، شیریں مقال، حاضر دماغ فصیح اللسان، اور شراب کا عادی تھا۔ وہ بڑا مسخرا اور ظریف تھا۔ اس میں وہ تمام مختلف صفات مجتمع تھیں جو آداب مجلس کے لیے ضروری ہیں۔ امور دینی میں وہ استخفاف برتتا تھا۔ شاعری میں دوسرے شعراء سے اس نے مقابلے بھی کیے تھے۔ اس کا مزاحیہ کلام اس کے دیوان کے علاوہ ایک جداگانہ کتاب میں جمع کیا گیا ہے جس کا پہلا حصہ مصر میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن ان مزاحیہ اشعار کا بیشتر حصہ من گھڑت اور مصنوعی ہے چونکہ اس کی شاعری کا بڑا حصہ کھیل تفریح شراب کے وصف اور اسی قسم کی کے موضوعات پر مشتمل تھا، اور اس کے معاصرین یا اس کے بعد آنے والے شعراء کے کلام میں یہ موضوع و اسلوب کسی کا نہیں تھا، اس لیے لوگوں نے جہاں بھی اس کی شاعری سے ملتی جلتی شاعری دیکھی اور اس کے کہنے والے کا نام نہ معلوم ہو سکا تو اسے بھی اسی کے نام سے منسوب کر دیا۔ جنان نامی کنیز شاعرہ کے ساتھ جس پر فریفتہ و عاشق تھا، اس کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔

شاعری میں اس کا مقام:- ابونواس لغت کا ماہر اور عربی اشعار و اخبار کا بڑا راوی تھا، حتیٰ کہ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے شعر کہنا ہی اس وقت شروع کیے تھے جب کہ وہ مردوں کے علاوہ ساٹھ شاعر عورتوں کے کلام کو حفظ کر چکا تھا۔ اس کے بارے میں جاحظ کہتا ہے: ”میں نے ابونواس سے زیادہ کسی کو لغت کا عالم اور فصیح لہجہ والا نہیں پایا اس کے کلام میں شیرینی ہے اور وہ آورد سے خالی ہے۔ شاعری کے تمام اصناف میں اس نے طبع آزمائی کی۔ تاہم تمام شاعروں میں اسے فحش مزاح، صراحت قول، اپنی عادت اور اپنے ماحول کی صحیح عکاسی اور وصف شراب میں امتیازی شان حاصل تھی۔ وصف شراب میں تو اسے وہ زور بیان حاصل تھا کہ اگر حسنین (یعنی حسن بصری اور ابن سیرین) اس کا یہ وصف سن لیتے تو اپنے زہد کو چھوڑ کر رندی اختیار کر لیتے۔“ اس کے سب سے کم شعر مدح میں ہیں اور ان کا بیشتر حصہ رشید اور اس کے بیٹے امین کی مدح میں ہے۔ اپنے لفظی و معنوی اسلوب میں ابونواس بشار کا ثانی معلوم ہوتا ہے اور اس نے بڑی حد تک اس کی ہمنوائی بھی کی ہے، حتیٰ کہ جاحظ کہتا ہے: ”بشار اور ابونواس کے معنے ایک ہیں اور اشخاص دو۔ بشار نے ایسی طبیعت پائی تھی کہ اسے شعر کہنے میں نہ کوئی تکلف ہوتا تھا اور نہ کسی قسم کی تکان، اور ابونواس نے وہ طبیعت پائی تھی کہ اس کی شاعری بغیر اجازت کے دل میں پہنچ جاتی ہے۔“

ابو نواس اپنی شاعری کی تنقیح اور کاٹ چھانٹ میں مشہور تھا۔ وہ قصیدہ کہہ کر اسے رات گذارنے کے لیے چھوڑ دیتا پھر دن میں اس پر نظر ثانی کرتا اور اس کا بیشتر حصہ حذف کر کے عمدہ اشعار پر اکتفا کرتا۔ یہی سبب ہے کہ اس کے بیشتر قصائد چھوٹے ہیں۔ باوجود رقت و مزاح کے اس کی شاعری کے الفاظ وزنی ہیں اور اسلوب پر شوکت ہے نیز اس میں مشکل الفاظ کی بھی کثرت ہے۔ شاعری میں اس نے کچھ ایسی جدتیں کیں جنہیں عقلمندوں نے تو بے قاعدہ اور قابل اعتراض بتایا لیکن دوسرے شعراء نے ان کو اپنا لیا۔ مثلاً آزادانہ فحش بیانی، بے قید مزاح، محبوب کو بجائے مؤنث کے مذکر بیان کرنا، اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ نیا انداز جو اس ظریف شاعر نے اختیار کیا وہ دنیائے ادب میں جرم کی حیثیت رکھتا ہے اور عربی شاعری کی تاریخ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ خمریات:۔

مازلت استل روح الدن من لطف   واستقی دمه من جوف مجروح

حتی انثنیت ولی روحان فی جسدی   والدن منطرح جسما بلا روح

میں پیاپے خم مے کی روح آہستہ آہستہ نکالتا رہا اور اس کے زخمی شکم سے اس کا خون پیتا رہا، تا آنکہ میرے ایک جسم میں دو روحیں آگئیں اور خم مے بے جان پڑا رہ گیا۔

ایضاً:۔

معتقة صاغ المزاج لرأسها   أكاليل در ما لمنظومها سلك

جرت حركات الدهر فوق سكونها   فذابت كذوب التبر اخلصه السبك

وقد خفيت من لطفها فكأنها   بقايا يقين كاد يذهبها الشك

پرانی شراب ہے، پانی کی آمیزش نے اس کے سر پر موتیوں (یعنی جھاگوں) کا ایسا تاج پہنا دیا ہے جس میں موتیاں بے لڑیوں کے پرو دی گئی ہیں۔ اس کے سکون پر زمانہ کی حرکتیں جاری ہیں اور وہ خالص تپائے ہوئے سونے کی طرح پگھل گئی ہے۔ اپنی نزاکت کی وجہ سے وہ ہلکی ہوتی چلی جا رہی ہے جیسے وہ یقین کا بقیہ ہے جسے شک ختم کیا چاہتا ہو۔

شرابی کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

ومستطيل على الصهباء باكرها   فی فتية باصطباح الراح حذاق

فكل شيء راه ظنه قدحا   وكل شخص راه ظنه الساقی

اور شراب کا رسیا جو صبح دم شراب نوشی میں مہارت رکھنے والے نوجوانوں میں شراب نوشی کرتا ہے۔ وہ جس چیز کو بھی دیکھتا ہے اسے جام خیال کرتا ہے اور جس شخص پر اس کی نگاہ پڑتی ہے اسے ساقی تصور کرتا ہے۔

جام کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

و دار ندامی عطلوھا و ادلجوا　　بھا اثر منھم جدایدا و دارس
مساحب من جر الزقاق علی الثری　　و اضغاث ریحان جنی و یابس
حبست بھا صحبی نجدادت عھدہم　　و انی علی امثال تلک لحابس
تدار علینا الراح فی عسجدیة　　حبتھا بالوان التصاویر فارس
قراراتھا کسری وفی جنباتھا　　مھاً تدریھا بالقسی الفوارس

اور وہ مے کدہ جسے رندوں نے ویران چھوڑ کر وہاں سے آخر شب کوچ کیا اور جس میں ابھی ان کے قدیم وجدید آثار تھے۔ مثلاً شراب کی مشکیں گھسیٹنے کے زمین پر نشانات اور تازہ و خشک گلدستے وغیرہ، اس میکدہ پر پہنچ کر میں نے اپنے ہم پیالہ ساتھیوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے اپنے ہم سفر رفیقوں کو ٹھہرایا اور اس قسم کے مقامات پر میرا یہی طریقہ ہے۔ ہم پر طلائی جاموں میں شراب کا دور چلایا جارہا تھا وہ جام جن پر ایرانیوں نے مختلف تصویروں کے نقش بنا رکھے تھے۔ اس کے پیندے میں کسریٰ کی تصویر ہے اور دیواروں پر نیل گائے ہے جسے شہسوار کمانوں سے تاک رہے ہیں۔

جہالت کا انجام بتاتے ہوئے کہتا ہے:۔

و لقد نھزت مع الغواۃ بدلوھم　　و اسمت سرح اللھو حیث اساموا
و بلغت ما بلغ امرؤ بشبابہ　　فاذا عصارۃ کل ذاک اثام

سر پھرے احمقوں کا میں نے ساتھ دیا اور جو گل انہوں نے کھلائے میں نے بھی کھلائے۔ اور جوانی میں جو بھوت انسان پر سوار ہوتا ہے مجھ پر بھی ہوا، لیکن جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ان تمام کاموں کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔

امیر مصر خصیب کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

تقول التی من بیتھا خف محملی　　عزیز علینا ان نراک تسیر
اما دون مصر للغنی متطلب　　بلی ان اسباب الغنی لکثیر
نقلت لھا واستعجلتھا بوادر　　جرت نجری فی اثرھن عبیر
دعینی اکثر حاسدیک برحلۃ　　الی بلد فیھا الخصیب امیر
فتی یشتری حسن الثناء بمالہ　　و یعلم ان الدائرات تدور
فما جازہ جود ولا حل دونہ　　ولکن یسیر الجود حیث یسیر

جب اس کے گھر سے میری سواری کوچ کرنے لگی تو وہ کہنے لگی "تمہارا سفر کرنا ہم پر نہایت شاق گذرے گا۔ کیا مصر کے علاوہ اور کہیں بھی آسودگی و تونگری حاصل کرنے کے امکانات نہیں ہیں! کیوں نہیں، میں تو سمجھتی ہوں دولت حاصل کرنے کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں" اور اس اثناء میں بے تابی سے اس کے آنسو امڈے آرہے تھے۔ تو میں نے اسے جواب دیا "مجھے اس علاقہ میں جانے

دے جہاں خصیب امیر ہے (اس لیے کہ جب میں وہاں کے سفر سے گرانقدر دولت لے کر پلٹوں گا) تو تیرے حاسدوں میں اور اضافہ ہو جائے گا ممدوح (خصیب) وہ جوان مرد ہے جو اپنا مال دے کر اس کے عوض رہتی دنیا تک باقی رہنے والی حمد و ثنا، خرید لیتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ حالات سدا یکساں نہیں رہتے اور زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ ممدوح وہ شخص ہے کہ سخاوت نہ اس سے آگے بڑھی ہے اور نہ اس سے پیچھے رہی ہے، بلکہ جہاں وہ جاتا ہے وہیں سخاوت بھی جاتی ہے"

دنیا کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

الا کل حیّ هالك وابن هالك ۔۔۔ وذو نسب فی الهالکین عریق

اذا امتحن الدنیا لبیب تکشفت ۔۔۔ له عن عدو فی ثیاب صدیق

لوگو! ہوشیار ہو جاؤ۔ ہر زندہ ہالک ابن ہالک ہے اور جب اس کا نسب دیکھو گے تو وہ بھی ہلاک ہونے والوں میں پہنچتا ہے۔ جب بھی کوئی عقلمند دنیا کو آزماتا ہے تو وہ دوست کے لباس میں دشمن بن کر اس کے سامنے آجاتی ہے۔

اس کے وہ اشعار جو عوام میں زبان زد ہو چکے ہیں:۔

لا اذود الطیر عن شجر ۔۔۔ قد بلوت المرّ من ثمره

میں اس درخت سے کبھی پرندوں کو نہیں اڑاتا ہوں جس کے پھلوں کو میں نے تجربہ کے بعد تلخ پایا ہے۔

ایضاً:۔

لیس علی الله بمستنکر ۔۔۔ ان یجمع العالم فی واحد

اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں کہ وہ سارے عالم (کی خوبیوں) کو ایک شخص میں جمع کر دے۔

ایضاً:۔

صار جدًّا ما مزحت به ۔۔۔ رب جدّ ساقه اللعب

جو تو نے مذاق کیا تھا وہ حقیقت بن گیا کتنے ہی سنجیدہ حقائق ہیں جو کھیل کھیل میں سامنے آجاتے ہیں۔

ابن الرومی

(ولادت ۲۲۱ھ وفات ۲۸۴ھ)

پیدائش اور حالات زندگی [1]:۔ یہ عبد اللہ کا آزاد کردہ غلام اور رومی نژاد تھا، اس کا پورا نام ابو الحسن علی بن عباس بن جرجیس ہے۔

---

[1] ابن الرومی کی زندگی تا ہنوز زمانہ کے پردوں میں پوشیدہ راز ہے اور ابھی (باقی حاشیہ صفحہ ۳۶۲ پر)

بغداد میں پیدا ہوا وہیں پلا بڑھا اور علم و ادب حاصل کیا تا آنکہ شاعری کرنے لگا اور اس میں غیر معمولی قدرت حاصل کی۔ پھر بیشتر شعراء کی طرح امراء و حکام سے انعام و وظائف حاصل کرنے میں اپنی زندگی گذاری، اس نے اپنی زبان کی قوت سے لوگوں کو اپنے اعزاز و اکرام پر مجبور کر لیا خواہ یہ مجبوری مدح کی رغبت کے سبب سے ہو یا ہجو کے ڈر سے۔

جیسا کہ اس کی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے۔ ابن الرومی کھانے پینے کا بڑا شوقین اور حریص تھا۔ اس موضوع پر اس کے بہت سے اشعار بھی ہیں۔ وہ بدشگونی کا حد درجہ قائل تھا بلکہ اس سلسلہ میں وہ وہم کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ اپنی تائید میں وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب اقوال کو بطور سند پیش کرتا تھا کہ آپ م فال (نیک شگونی) پسند فرماتے تھے اور بدشگونی ناپسند فرماتے تھے۔ وہ یہ حدیث پیش کرتا تھا کہ ایک دفعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اونٹنی سوار کے قریب سے گذرے جو اپنی اونٹنی کو "اے ملعونہ!" کہہ رہا تھا تو آپ م نے فرمایا تھا "ہمارے ساتھ ملعون نہیں رہے گا" وہ حضرت علی رض کا عمل پیش کرتا تھا کہ وہ اسی وقت جنگ کرتے تھے جب قمر، عقرب میں ہوتا تھا، اس کا خیال تھا کہ بدفالی انسانی سرشت میں موجود ہے اور بعض لوگوں میں یہ بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ بیشتر لوگ جب کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو بول اٹھتے ہیں "آج صبح سویرے کس کی شکل دیکھی تھی؟"

علی بن مسیب کہتے ہیں کہ ۲۷۸ھ میں مہرجان (تہوار) کے دن ابن الرومی ہمارے ہاں آئے مجھے چند گانے والی کنیزیں انعام میں ملی تھیں جن میں ایک بھینگی بچی تھی اور ایک بوڑھی عورت جس کی آنکھ میں پھُلی تھی۔ جنہیں دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں بدشگونی لے لی اور مجھ سے کچھ نہ کہا، باقی دن بھی جوں توں میرے ساتھ گذار دیا، اس کے تھوڑی مدت بعد ہی میری بیٹی کوٹھے سے گر گئی، اور قاسم بن عبید اللہ نے بھی اس سے کج خلقی برتی، چنانچہ اس نے ان حالات کو ان کنیزوں کی نحوست پر محمول کیا، اور اس ضمن میں مجھے یہ اشعار لکھ بھیجے :-

ایھا المتحفی بحول و عور	این کانت عنك الوجوه الحسان؟
قد لعمری رکبت امرًا مهینا	سادنی فیك ایتھا الخلصان
نتحك المهرجان بالحول والعو	ر ارانا ما اعقب المهرجان
کان من ذاك نقدك ابنتك الحر	ۃ مصبوغة بها الاکفان
و تجانی مؤمل لی جلیل	لج فیه الجفاء و الهجران
تف اذا طیرۃ تلقتك و انظر	و استمع ثم ما یقول الزمان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۱) اکلام کسی سوانح نگار نے اس کی سوانح [illegible]
[illegible]

خبّر اللہ ان مشأمة کا نت لقوم و خبّر القرآن

اے بھینگی اور کانی سے میری خاطر و مدارات کرنے والے! تجھ سے حسین چہرے کہاں رہ گئے تھے؟ میری جان کی قسم: تونے نہایت نازیبا حرکت کی، اے مخلص رفیق! مجھے تیری یہ حرکت خوش نہ آئی۔ بھینگی اور کانی سے مہرجان کا افتتاح ہی ان ناگوار واقعات کا باعث ہے جو مہرجان کے بعد رونما ہوئے۔ ان میں سے ایک تو تیری پیاری بیٹی کی موت ہے جس کا کفن خون سے رنگین ہوگیا تھا۔ اور دوسرا میرے بڑے قابل اعتماد دوست کا بچھڑ جانا اور بے وفائی برتنا ہے۔ جب کسی بدشگونی سے تمہارا سابقہ پڑے تو ذرا ٹھہر کر غور کر لیا کرو اور زمانہ کی سنو کہ وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ اللہ نے بھی بتایا ہے کہ مشأمة (نحوست و بدفالی) ایک قوم میں ہے۔ اور قرآن نے بھی بتایا ہے۔

بدفالی کو ماننے میں ابن الرومی اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ ان دنوں میں گھر سے باہر ہی نہیں نکلتا تھا جن میں صبح سویرے اس کے کان میں کوئی بری بات پڑ جاتی تھی۔ اس موضوع پر اخفش کے ساتھ اس کے عجیب و غریب قصے ہیں۔ یہ شاعر نہایت سخت اور تکلیف دہ ہجو کہتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس سے وزراء اور رؤساء خوف زدہ رہتے تھے۔ معتضد کے وزیر ابوالحسین قاسم بن عبداللہ کو بھی ہر گھڑی اس کی ہجو کا خوف دامنگیر رہتا تھا اور اسے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ وہ اس کی ہجو سے محفوظ رہ سکے گا۔ یہ وزیر بڑا بد اور خونخوار تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ جب وہ کھانے پر تھا وزیر نے چپکے سے اس کے سامنے کھانے میں زہر ڈال دیا، جب ابن الرومی کو زہر کا احساس ہوا تو وہ کھانے پر سے اٹھ گیا، وزیر نے اس سے کہا "کدھر چلے؟" اس نے جواب دیا "جہاں تم مجھے بھیجنا چاہتے ہو" وزیر نے کہا "دیکھو وہاں پہنچ کر میرے والد کو میرا سلام پہنچا دینا" اس نے جواب دیا "لیکن جہنم سے میرا گذر نہیں ہوگا" پھر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ جہاں حکیم اس کے علاج کے لیے آتا رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے کچھ غلط دوائیں دے دی ہیں، جب وہ دم توڑ رہا تھا تو نفطویہ نحوی کی بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے یہ اشعار کہے:۔

غلط الطبیب علی غلطة مورد عجزت موارده عن الأصداد

والناس یلحون الطبیب دانّما غلط الطبیب اصابة الأقدار

حکیم نے مجھ پر جو غلطی کی ہے وہ اس شخص کی سی غلطی ہے جو ایسی جگہ پہنچا دے جہاں سے واپسی کی راہیں ممکن نہیں۔ لوگ حکیم کو ملامت کرتے ہیں حالانکہ حکیم نے جو غلطی کی ہے وہ اس لیے ہے کہ قضاء و قدر کا فیصلہ ٹھیک اپنی جگہ پہنچ جائے۔

کچھ لوگ ابن الرومی کی قومیت کی وجہ سے اسے ہیٹا سمجھتے ہیں اور اس بناء پر اس کی شاعری کا درجہ گھٹاتے ہیں، جیسا کہ اس کے اشعار سے واضح ہے:۔

کم غائب کل شیء و کل ما فیه عیب

قد تحسن الروم شعرا ما احسنته العزیب

يا منكر المجد فيهم الـيس منهم صهيب؛

کتنے لوگ ہیں جو ہر چیز میں عیب لگاتے ہیں حالانکہ جو کچھ بھی اس میں ہے وہ سرتا پا عیب ہی ہے۔ کبھی رومی بھی ایسے اچھے شعر کہہ دیتے ہیں جو عرب بچے نہیں کہہ سکتے۔ اسے رومیوں کی مجد و بزرگی کے منکر! کیا انہیں رومیوں میں حضرت صہیب رضؓ رومیؓ نہیں تھے؟

لیکن ہمارا خیال ہے کہ ابن الرومی کی غیر معمولی صلاحیت میں اس کی اسی قومیت کا نمایاں اثر تھا، چنانچہ اس میں آریائی اقوام کی فکری گہرائی، سامی اقوام کی تخیلیلی برتری یکجا تھی اور روم والوں کی نزاکت تصور، عربوں کی قوت عکاسی کا مجموعہ تھا۔ اس طرح تخلیق معانی اور اس میں کامل مہارت شاعری کی امتیازی خصوصیت بن گئی جس میں سے اس نے کسی دوسرے کے لیے کچھ حصہ بھی باقی نہ چھوڑا اور یہی وجہ ہے اس کے قصائد لمبے ہونے کے ساتھ ساتھ تکرار و نقائص سے خالی ہیں۔ ہمیں بہت ہی کم ایسے شاعر نظر آتے ہیں جن کے قصائد طویل ہونے کے ساتھ ان خامیوں سے پاک صاف ہوں اور جن کے قصائد کے اجزاء قوت و حسن، ہم آہنگی و موزونیت لیے ہوئے ہوں۔ کسی چیز کے وصف کرنے اور تشبیہ دینے میں ابن الرومی کو حیرت انگیز کمال حاصل تھا۔ اپنی تندی طبع اور کج خلقی کے باعث اسے دوستوں کی جفاؤں اور بڑے آدمیوں کے اعراض سے پالا پڑتا رہا اس لیے عتاب و ہجو کے موضوع پر اسے بے نظیر قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ یہ ابو تمام اور بحتری کے مرتبہ کا شاعر ہے، بلکہ بعض حالات میں یہ ان سے بھی بڑھ جاتا ہے کیونکہ اس نے شاعری کی ہر معروف صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور ان پر اتنا کچھ اضافہ کیا ہے کہ اگر وہ دس شاعروں پر تقسیم کر دیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کو عظیم المرتبت اور بلند پایہ شاعر بنا دے۔

کبھی کبھی وہ معانی و مضمون کی صحت کے پیش نظر بلند سے نیچے اتر کر بھونڈے اور کرخت الفاظ بھی استعمال کر جاتا ہے۔ اگر وہ عبد اللہ ابن معتز کی طرح آسودہ و شاہانہ ماحول میں تربیت یافتہ ہوتا تو تشبیہ لطائف کے موضوع پر اس کے ساتھ ابن معتز کا ذکر نہ کیا جاتا۔ اس لیے کہ بلحاظ شاعری ابن الرومی اس سے بدرجہا بلند ہے، تاہم تشبیہات میں اس کی معلومات بادشاہوں کی معلومات سے کمتر ہیں۔ اس کے بعض ہمعصروں نے از راہ ملامت اس سے کہا، تمہاری تشبیہیں ابن معتز کی تشبیہوں کی طرح کیوں نہیں ہوتیں؟ تو اس نے کہا " اس ضمن میں مجھے ذرا اس کے کچھ ایسے شعر تو سناؤ جن کی مثال پیش کرنے سے میں قاصر رہا ہوں" چنانچہ اس نے ہلال کے متعلق ابن معتز کا یہ شعر سنایا۔

انظر اليه كزورق من فضة قد اثقلته حمولة من عنبر

ذرہ (ہلال) چاند کو دیکھو، ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے وہ چاندی کی چھوٹی سی کشتی ہے جسے عنبر

لہ صہیب رضؓ بن سنان بن مالک رومی جلیل القدر صحابی ہیں، انہوں نے رومیوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ ۳۸ھ یا ۳۹ھ میں انتقال ہوا۔

کے بوجھ نے گرانبار کر دیا ہے۔

اس پر ابن الرومی نے کہا اس قسم کے چند اور شعر سناؤ، چنانچہ اس نے آذریون نامی ایک پھول (جو زرد رنگ کا ہوتا ہے اور اس کے وسط میں سیاہ نازک رواں سا ہوتا ہے) کے متعلق ابن معتز کے یہ اشعار سنائے:۔

کان اذر یونها غب سماء هامية
مداهن من ذهب فيها بقايا غالية

تیز بارش کے بعد اس باغ کے آذریون پھول ایسے معلوم ہو رہے جیسے سونے کی تیل رکھنے کی کٹوریاں جن کی تہ میں خوشبودار مسالہ کا گاد بیٹھا ہوا ہو۔

یہ سن کر وہ بے ساختہ چیخ پڑا، ہائے میرے اللہ! خدا کسی کو اس کی وسعت و قوت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا، تمہارا یہ شاعر خلیفہ زادہ ہے اور اپنے گھر کے استعمال کی اشیاء کا وصف کر رہا ہے۔ میں کس چیز کا وصف کر سکتا ہوں؟ میرا مقابلہ کرنے کے لیے میرے جیسے لوگ سامنے لاؤ اور پھر دیکھو کہ میں کیا کہتا ہوں اور وہ کیا کہتے ہیں، کیا قوس قزح کے وصف میں کسی نے بھی میرے جیسے شعر کہے ہیں:۔

وقد نشرت ايدى الجنوب مطارفا من الجود كنا والحواشي على الأرض
يطرزها قوس السحاب بأخضر على أحمر فى اصفر اثر مبيض
كأذيال خود اقبلت فى غلائل مصبغة والبعض اقصر من بعض

جنوبی ہوا نے فضا میں سرخ و کبود چادریں (بدلیاں) پھیلا دی ہیں جن کے کنارے زمین پر لٹک رہے ہیں۔ قوس قزح نے انہیں سبز، سرخ، زرد اور سفید رنگوں سے کاڑھ رکھا ہے۔ وہ اس دوشیزہ کے دامنوں کی طرح ہے جو مختلف رنگوں کے لباس میں ملبوس ہے اور جن میں ایک رنگ دوسرے رنگ سے چھوٹا ہے۔

اور پھر چپاتی پکانے والے کے متعلق میں نے جو اشعار کہے ہیں ان کا جواب بھی تمہیں کہیں مل سکا ہے:۔

ما أنس لا أنس خبازا مررت به يدحو الرقاقة مثل اللمح للبصر
ما بين رويتها فى كفه كرة وبين رويتها قوراء كالقمر
الا بمقدار ما تنداح دائرة فى لجة الماء يلقى فيه بالحجر

جن چیزوں کی یاد ہمیشہ میرے ذہن میں رہے گی ان میں سے ایک وہ چپاتی پکانے والا بھی ہے جس کے پاس سے میرا گذر ہوا تھا جو ایک لمحہ میں پوری چپاتی بڑھا لیتا تھا۔ اسے ہاتھ کے پیڑے سے چاند کی طرح گول چپاتی بنانے میں صرف اتنی دیر لگتی تھی جتنی دیر پانی میں پتھر پھینکنے کے بعد دائرہ کے بڑھنے میں لگتی ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:
اس کے وہ اشعار جن کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے اس مضمون کو نہیں باندھا:۔

آراؤکم و وجوهکم و سیوفکم — فی الحادثات اذا دجون نجوم
منها معالم للهدی و مصابح — تجلو الدجی والاخریات رجوم

تمہاری آراء تمہارے چہرے اور تمہاری تلواریں، تاریک حادثات میں تاروں کا کام دیتی ہیں جن میں سے بعض تو رہنمائی کے لیے نشانات راہ ہیں، بعض تاریکی ختم کرنے والے چراغ ہیں اور باقی شیاطین کو مارنے کے لیے گولے ہیں۔

اس کے طبع زاد معانی:۔

و اذا امرؤ مدح امرءًا لنواله — و اطال فیه فقد اراد هجاءه
لو لم یقدر فیه بعد المستقی — عند الورود لما اطال رشاءه

جب کوئی شخص کسی سے بخشش کا طلب گار ہو اور ساتھ ہی اس کی لمبی چوڑی مدح کرنے لگے تو یہ مدح نہیں بلکہ ہجو ہو گی اس لیے کہ اگر وہ اس کے پانی کو بہت گہرا نہ سمجھتا تو اتنی لمبی رسی نہ ڈالتا۔

ایضاً:۔

تودّدت حتی لم اجد متودّدا — وافنیت اقلامی عتابًا مردّدا
کأنّی أستدنی بک ابن حنیّة — اذا النزع ادناه من الصدر ابعدا

میں نے تجھ سے انتہائی محبت کی اور بار بار عتاب نامے لکھ کر اپنے قلم توڑ ڈالے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیری مثال کمان کے تیر کی سی ہے کہ اسے جس قدر اپنے سینہ سے قریب کھینچ کر لاؤ اتنا ہی وہ تیزی سے دور جاتا ہے۔

شباب کے بارے میں اس کا انوکھا تخیل:۔

رایت سواد الرّأس واللهو تحته — کلیل و حُلم بات رأیه ینعم
فلما اضمحلّ اللیل زال نعیمه — فلم یبق الا عهده المتوهّم

شباب کا زمانہ جبکہ سر پر کالے بال اور دل میں جوانی کی مستیاں اور کھیل تفریح کا خیال کروٹیں لیتا رہتا ہے ایسا ہے جیسے رات کی تاریکی میں خواب دیکھنے والا مزے کا خواب دیکھ رہا ہو، پھر جب رات ختم ہو جاتی ہے تو اس کی وہ ساری سرمستیاں بھی باقی نہیں رہتیں اور وہ زمانہ ایک فسانہ بن جاتا ہے۔

سرشام ڈوبتے ہوئے سورج کے وصف میں کہتا ہے:۔

وقد رنّقت شمس الاصیل ونفّضت — علی الافق الغربیّ ورسًا مزعزعا
و ودّعت الدنیا لتقضی نحبها — و شوّل باقی عمرها فتشعشعا
و لاحظت النُّوّار وهی مریضة — وقد وضعت خدًّا الی الارض اضرعا

کما لا حظت عوّادہ عینُ مُدنف   توجّع من أو صابہ ما توجّعا

جاتے جاتے سرِشام سورج کی قوت ماند پڑگئی اور اس نے غربی افق پر لالے کے پھول بکھیر دیے، اور اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے اس نے دنیا کو وداع کہا، اس کی باقی ماندہ عمر بھی جواب دینے لگی اور وہ کمزور پڑ گیا، اس نے بیماری کی حالت میں جب کہ اس نے اپنا کمزور و زرد رخسار زمین پر رکھ دیا، پھولوں کو اس طرح دیکھا جیسے اس بیمار کی آنکھ اپنے عیادت کرنے والوں کو دیکھتی ہے جو اندر ہی اندر درد و تکلیف سے پریشان ہو رہا ہو۔

ابن المعتزّ

اس کی پیدائش اور زندگی کے حالات

یہ امیر المومنین ابو العباس عبد اللہ ابن خلیفہ معتز باللہ ہے، بادشاہ کے گھر اور خلافت کے مستقر میں پیدا ہوا۔ اعزاز و احترام اور آسائش و آسودگی میں پرورش پانے کی وجہ سے وہ شریف النفس، رقیق الحس، جمالیات کا قوی شعور رکھنے والا اور ادب و موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اپنے زمانہ کے ماہر اساتذۂ ادب مثلاً مبرد اور ثعلب سے ادب حاصل کیا۔ بیشتر علوم منقولہ و معقولہ کی تحصیل کی۔ ادبی اور مجلسی سرگرمیوں نیز لہو لعب اور رنگ رلیوں نے اسے محلات کی سیاسی سازش اور خلافت کی لالچ سے دور ہی رکھا۔ اس نے ذیل کے اشعار میں خود اپنی صحیح تعریف کی ہے:

قلیل ھموم القلب الّا للذّۃ   ینعّم نفسًا اذنت بالتّنقّل
فإن تطلبہ تقتنطہ بحانۃ   و الّا ببستان و کرم مظلّل
ولست تراہ سائلاً عن خلیفۃ   ولا قائلاً من یعزلون ومن بلی
ولا صائحاً کالعیر فی یوم لذۃ   یناظر فی تفضیل عثمان أو علی

دل کی فکروں سے آزاد، اگر کچھ خیال ہے تو ایسی لذت کا جس سے نفس کو کچھ خوش رکھا جائے، وہ نفس جو دنیا سے کوچ کی نیازی میں ہے، اگر تمہیں اس کی تلاش ہے تو تم اسے مے کدے میں پکڑ سکتے ہو، ورنہ وہ باغ اور سایہ دار انگوروں کی بیلوں تلے ملے گا، تم اسے کبھی خلیفہ کے متعلق دریافت کرتے ہوئے نہیں دیکھو گے، اور نہ وہ یہ پوچھتا ہے کہ کون برطرف کیا گیا اور کون برسرِ حکومت آیا ہے۔ وہ تفریح سے دن گذارنے کی لذت کو حضرت عثمان رضؓ یا حضرت علی رضؓ کی تفضیل میں مناظرہ کرنے والوں کی گدھے جیسی بے ہنگم آوازیں نکال کر، مکدر نہیں کرتا۔

تاہم اس کی حامی پارٹی نے جب مقتدر کو کمزور، اور ممالیک کو مستبد و بدتدبیر پایا تو مقتدر کو چھوڑ کر اس کی جگہ ابن معتز سے بیعت کر لی، لیکن وہ چوبیس گھنٹہ سے زیادہ تختِ حکومت پر قابض نہ رہ سکا، اس لیے کہ مقتدر کے حامیوں نے اس کی حکومت تسلیم نہ کی اور جداگانہ جماعت بنا کر مخالفین سے لڑائی کر کے انہیں منتشر کر دیا اور مقتدر کو پھر حکومت سونپ دی۔ تب ہمارا یہ شاعر

خلیفہ احصاص جوہری کے گھر میں جا چھپا، لیکن دشمن گھر میں گھس گئے اور اسے گرفتار کر لیا اور مقتدر نے اسے اپنے خادم مؤنس کے حوالہ کر دیا جس نے اس کا گلا گھونٹ دیا، اور چادر میں لپیٹ کر اس کی لاش وارثوں کے حوالے کر دی۔

اس کی شاعری — شاہی ماحول میں پرورش پانے کا اثر ابن معتز کی شاعری میں نمایاں ہے۔ اس کی نزاکت طبع، نرمی اخلاق، شستگی فکر کی وجہ سے اس کی شاعری کے الفاظ خوشنما عبارت سہل، اور اسلوب شستہ ہے۔ نیز احساس، نزاکت شعور، نیز دل و دماغ میں جمالیاتی مناظر، انوکھے افکار اور تمدنی جاہ و جلال بس جانے کی وجہ سے اس کے استعاروں میں کمال، تشبیہوں میں جدت، اور وصف میں نزاکت ہے۔ اور چونکہ وہ اپنے آپ کو خوش کرنے، اور اپنے احساسات کی ترجمانی کرنے کے لیے شاعری کرتا تھا اس لیے وہ جھوٹی مدح اور ذناءت ہجو سے بھی بچا رہا۔ اس کی شاعری کے موضوعات فطرت کی عکاسی، دوستوں کی مجالس، سیر و شکار کے واقعات اور دوستوں سے مراسلات ہیں۔ حسین ساخت، اور آورد سے پاک، بدیع سے اسے بڑا شغف ہے اس کی نثر بھی جودت لفظ، نزاکت تخیل و پاکیزگی اسلوب میں کسی طرح اس کی شاعری سے کمتر نہیں ہے۔

اس کی تصانیف:- ابن معتز کی ایک تصنیف کتاب البدیع[1] ہے، جو اس فن میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس میں اس نے اس فن کے سترہ انواع جمع کر دیے ہیں۔ اس کی مزید تصانیف کتاب مکاتبات الاخوان بالشعر، کتاب الجوارح والصید، کتاب اشعار الملوک، کتاب طبقات الشعراء اور کتاب الزہر والریاض ہیں۔ علاوہ ازیں اور تصانیف بھی ہیں جن میں سے بیشتر مفقود ہیں۔ اس کا دیوان دو حصوں میں مصر میں چھپ چکا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:-

کن جاھلاً او نتجاھل تفز　　للجھل فی ذا الدھر جاہ عریض

والعقل محروم یری ما یری　　کما تری الوارث عین المریض

یا تو واقعتہً جاہل بن جاؤ یا پھر تجاہل سے کام لو تو تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ اس جہان میں جہالت کو بڑا فروغ ہے۔ اور عقل یہ سب کچھ دیکھتی ہے اور محروم رہتی ہے جیسے بیمار کی آنکھ وارث کو دیکھتی ہے۔

---

[1] یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں روسی مستشرق پروفیسر اگناٹیوس کراچویسکی نے شائع کر دی ہے اس کے شروع میں بزبان انگریزی مقدمہ ہے جس میں اس کتاب پر اور اس قلمی نسخہ پر بحث کی گئی ہے جس سے یہ کتاب نقل کی گئی ہے آخر میں ابن معتز کی سوانح حیات کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں ادب عربی پر اس کتاب کی تاثیر بھی بتائی گئی ہے۔

ایضاً:۔

اُتْلُلا همّی بصرف عُقار　و اترکا الدهر فما شاء کانا
ان للمکروہ لذعۃ همّ　فاذا دام علی المرء هانا

خالص شراب پلا کر میرے غم و فکر کو نابود کر دو اور زمانہ کو چھوڑ دو کہ جو ہونا ہوگا وہ ہو ہی جائے گا۔ مکروہ و ناپسندیدہ چیز ہمیشہ انسان کو غم و فکر سے پریشان رکھتی ہے، اور جب انسان پر یہ کیفیت دائم رہے تو وہ آسان ہو جاتی ہے۔ (رنج کا خوگر ہوا تو انسان تو مٹ جاتے ہیں رنج)۔

ایضاً:۔

و نسیم یبشر الارض بالقطــــر　کذیل الغلالۃ المبلول
و وجوہُ البلاد تنتظر الغیـث　انتظار المحبّ رجع الرّسول

اور باد نسیم جو زمین کو نم کرنے والی بارش کی نوید سناتی ہے۔ تمام ملک کی زمین بارش کی اسی طرح منتظر ہے جیسے عاشق قاصد کی واپسی کا منتظر ہوتا ہے۔

ایضاً:۔

اعاذل قد کبرتُ علی العتاب　و قد ضحک المشیب علی الشباب
رددتُ الی التقی نفسی فقرّت　کما رُدّ الحسام الی القراب

اے ملامت کرنے والے! میں عتاب کے باوجود بوڑھا ہو گیا ہوں، اور اب جوانی پر بڑھاپا ہنس رہا ہے۔ میں نے اپنے نفس کو خدا ترسی پر مائل کر لیا ہے اور اسے اس طرح قرار آگیا ہے جیسے تلوار کو میان میں سکون ملتا ہے۔

قبرستان کے متعلق کہتا ہے:۔

و سکّان دار لا تزاور بینهم　علی قرب بعض فی المحلۃ من بعض
کان خواتیما من الطین فوقهم　فلیس لهم حتی القیامۃ من فضّ

اور ایسی بستی کے باشی جن میں آپس میں کوئی ربط ضبط اور میل جول نہیں گو ان کی رہائش ایک دوسرے سے قریب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر مٹی کی مہریں لگا دی گئی ہیں اور قیامت ان کی مہریں کوئی نہیں کھول سکتا ہے۔

ایضاً:۔

کم حاسد حنق علیّ بلا　جرم فلم یضررنی الحنق
متضاحک نحوی کما ضحکت　نار الذبالۃ و هی تحترق

کتنے ہی ایسے حاسد ہیں جو بغیر کسی جرم کے مجھ پر جلن سے اندر ہی اندر گھٹ رہے ہیں لیکن ان کی یہ کیفیت مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچاتی، وہ مجھے دیکھ کر تکلف ہنستے ہیں جیسے بتی (بیک وقت) جلتی بھی ہے اور ہنستی بھی ہے۔

ایضاً:۔

اُنظر الی حسن ھلال بدا　　یھتك من أنوارہ الحندسا
کمنجل قد صیغ من فضۃ　　یحصد من زھر الدجیٰ نرجسا

نکلنے والے ہلال کے حسن کو دیکھو وہ اپنے انوار سے تاریکی شب کی چادر چاک کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس درانتی کی طرح جو چاندی سے بنائی گئی ہو اور رات کی تاریکی میں نرگس کاٹ رہی ہو۔

ایضاً:۔

قلبی وثاب الی ذا وذا　　لیس یری شیئاً فیأباہ
یھیم بالحسن کما ینبغی　　ویرحم القبح فیھواہ

ادھر اور اُدھر دونوں ہی طرف میرا دل اچھل اچھل کر جاتا ہے، اُدھر حسن (گل) پر فریفتہ ہوتا ہے کہ اُسے طبیعت چاہتی ہے اور اُدھر قبح (کانٹوں) پر ترس آتا ہے تو اُس سے بھی نباہ کرتا ہے۔

ایضاً:۔

من لی بقلب صیغ من صخرۃ　　فی جسد من لؤلؤ رطب
جرحت خدیہ بلحظی فما　　برحت حتیٰ اقتص من قلبی

کون ہے جو میرے لیے اس دل کو نرم کر دے جو پتھر کی چٹان سے تراش کر بنایا گیا ہے اور اسے آبدار موتی جیسے بدن میں رکھ دیا گیا ہے؟ میں نے اپنی نگاہ سے اس کے رخساروں کو زخمی کر دیا تو فوراً ہی اس نے میرے دل سے اس کا قصاص لے لیا۔

ایضاً:۔

ولقد تضنت نفسی ماربھا　　وتضنیت غیا مرۃ ورشدا
ونھار شیب الراس یوقظ من　　قد کان فی لیل الشباب رقدا

میرے جی نے اپنے تمام ارمان پورے کر لیے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط، اور جوانی کی سیاہ شب میں جو مدہوش سوتا رہتا ہے اسے بڑھاپے کے دن کی روشنی جو سفید بالوں کی شکل میں سر پر رونما ہوتی ہے ہوشیار و بیدار کر دیتی ہے۔

صبح دم مرغ کے پر پھڑپھڑانے پر کہتا ہے:۔

صفق اما ارتیاحۃ لسنا الفجر　　واما علی الدجیٰ اسفا

اس نے یا تو فجر کی روشنی کے ظہور پر خوشی میں یہ تالی بجائی ہے یا پھر تاریکی کے جانے پر کف افسوس ملا ہے۔

ذیل میں ہم اس کی مشہور موشح درج کرتے ہیں، معلوم نہیں کہ یہ اس کی ابتداع تھی یا اندلسیوں کی اتباع تھی۔

ایتھا الساقی الیك المشتکی! قد دعوناك و ان لم تسمع
ساقیا! تجھی سے شکوہ ہے۔ ہم نے تجھے ہی پکارا ہے خواہ تو نہ سنے۔

و ندیم ھِمتُ فی غُرّتہ
و بشرب الراح من راحتہ
کلّما استیقظ من سکرتہ
جذب الکأس الیہ واتکی و سقانی اربعا فی اربع

وہ ندیم جس کے حسن نے مجھے بے خود کر دیا اور جس کے ہاتھ کی شراب پی کر میں مست ہو گیا، جب وہ اپنے نشہ سے ہوش میں آتا ہے، تو جام اٹھا کر مجھے پیالے پلانا شروع کر دیتا ہے۔

ما لعینی عشیت بالنظر
انکرت بعدك ضوء القمر
و اذا ماشئت، فاسمع خبری
عشیت عینای من طول البکا و بکی بعضی علی بعضی معی!

میری آنکھ کو کیا ہو گیا ہے کہ دیکھنے سے چندھیا جاتی ہے، تیرے بعد چاندنی بھی اسے نہیں بھاتی اور اگر تو چاہے تو میری خبر سن لے، میری آنکھ روتے روتے کمزور ہو گئی ہے اور میری حالت پر میرے ساتھ میرے بدن کے کچھ اعضاء ماتم کر رہے ہیں۔

غصن بان مال من حیث التوی
مات من یھواہ من فرط الجوی
خفق الاحشاء موھون القوی
کلما فکر فی البین بکی ویحہ! یبکی لما لم یقع!

بید کی شاخ جہاں سے جھکی وہیں سے مڑ گئی، جس نے اُسے چاہا وہ سوزِ محبت کی شدت سے جان کھو بیٹھا، پتلی کمر والا کمزور قوی والا۔ جب بھی وہ جدائی کا خیال کرتا ہے تو رو پڑتا ہے، اس کی خرابی! کہ جو واقع نہیں ہوا اس پر رو رہا ہے۔

لیس لی صبر و لا لی جلد
یا لقومی عذلوا واجتھدوا
انکروا شکوای مما اجد
مثل حالی حقہ ان یشتکی کمد الیاس و ذل الطمع

مجھ میں نہ صبر ہے نہ قوت برداشت، اے میری قوم! مجھے خوب ملامت کرو اور جو کچھ میں تکلیف پا رہا ہوں اس پر میرے گلے شکوے کو برا مانتے رہو۔ لیکن میری جیسی حالت والے کو حق

حاصل ہے کہ وہ نومیدی کی گھٹن اور طمع کے ہاتھوں بے بس ہو جانے کا شکوہ کرے۔

کبدی حرّی، و دمع یکف
یذرف الدامع ولا ینذرف
ایها المعرض عما اصف!
قد نما حبی بقلبی و زکا لا تقل فی الحب انی مدّعی

جگر پر سوز ہے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ آنسو بہتے ہیں پر نہیں بہتے۔ اسے میری حالت سے اعراض برتنے والے! تیری محبت میرے دل میں بس رچ گئی ہے! میری محبت کے متعلق یہ نہ کہنا کہ میں صرف دعویٰ کر رہا ہوں۔

شریف رضی

(پیدائش ۳۵۹ھ وفات ۴۰۴ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:- ابو الحسن محمد بن الحسین موسوی بغداد میں پیدا ہوا۔ اپنے باپ کی زیر نگرانی تربیت پائی۔ بچپن ہی میں علم حاصل کیا۔ فقہ و علم الفرائض میں کمال اور علم و ادب میں مہارت و تفوق سے سرفرازی حاصل کی۔ ابھی عمر بیس برس سے زیادہ نہ ہوئی تھی کہ شاعری کرنے لگا۔ ۳۸۸ھ میں جب وہ انتیس برس کا ہوا تھا اس نے طالبیین کی نقابت میں اپنے باپ کی جانشینی کی، اور بعد ازاں وہ باقی ماندہ امور بھی اس کو تفویض کر دیے گئے جو اس کا باپ انجام دیتا تھا، یعنی مقدمات کے فیصلے کرنا اور لوگوں کو حج کرانا۔ وہ ایک مدت تک یہ فرائض انجام دیتا رہا تا آنکہ فاطمی علویوں کی طرفداری کے الزام میں خلیفہ قادر باللہ اس سے ناراض ہو گیا اور اسے ان فرائض کی انجام دہی سے برطرف کر دیا۔ تاہم اس نے ایک فارغ و شریف آدمی کی طرح اپنی بقیہ زندگی گذار دی اور محرم ۴۰۴ھ میں انتقال کیا، اور کرخ میں اپنے گھر میں دفن کیا گیا۔

اس کے اخلاق و عادات:- شریف رضی بڑا خوددار و بلند ہمت تھا۔ اس کا عزم بلند ہمیشہ اسے بلند کاموں کی طرف متوجہ رکھتا، لیکن افسوس کہ زمانہ نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ بڑا غیور و عفت مآب تھا، کسی کا انعام و صلہ اس نے قبول نہ کیا، ان چیزوں سے احتراز کرنے میں وہ یہاں تک متشدد تھا کہ اس نے امیروں اور بادشاہوں کے وہ وظیفے اور انعامات بھی واپس کر دیے جو اس کے باپ کو ملتے چلے آ رہے تھے۔ بنو بویہ نے بہت چاہا کہ وہ ان کے انعامات قبول کر لے لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

اس کی شاعری: شاعری میں رضی کا اسلوب قدیم شعراء سے مشابہ تھا۔ بھاری بھرکم الفاظ، پُرشوکت معانی اس کی شاعری بحتری کی شاعری[1] سے زیادہ ملتی ہے تاہم فخر و حماسہ میں وہ اس پر بازی لے گیا ہے اور اس کی شاعری میں ولید کی سی بے مغز شاعری اور مزاح بھی نہیں ہے۔ ثعالبی کا قول ہے "یہ تمام پچھلے اور موجودہ طالبیین میں سب سے عمدہ شاعر ہے باوجودیکہ ان میں بلند پایہ شعراء کی کثرت ہے، اور اگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ یہ قریش کا سب سے بڑا شاعر ہے تو بھی میں غلط بیانی نہیں کروں گا۔" بعد ازاں وہ کہتا ہے "اور موجودہ دور کے شعراء میں مرثیہ نگاری پر اس سے زیادہ قادر مجھے کوئی شاعر نہیں ملتا" شاعری میں اس درجہ بلند مقام ہونے کے باوجود نثر نگاری میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ خطوط نویسی پر اسے بڑی قدرت حاصل تھی، اور اگر یہ صحیح ہے کہ نہج البلاغہ میں اس کا بھی ہاتھ ہے تو کوئی منصف یہ فیصلہ کرنے میں ذرہ بھر ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا کہ وہ عربی زبان کا سب سے بڑا انشاء پرداز ہے، اس لیے کہ قرآن مجید کے بعد نہج البلاغہ کو بلاغت و بیان میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

اس کی تصانیف:- اس شاعر نے معانی القرآن کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جو اس کی نحوی و لغوی مہارت کے علاوہ اصول دین سے اس کی واقفیت کے کمال کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ دوسری تصنیف قرآن میں مجاز کے استعمال پر ہے۔ اس کے مکاتیب کا ایک مجموعہ اور ایک دیوان بھی ہے۔ نیز اس کی ترتیب دی ہوئی کتاب نہج البلاغہ ہے جس میں اس نے امیرالمومنین حضرت علی رضؓ بن ابی طالب کا کلام جمع کر دیا ہے۔ چونکہ اس کتاب میں صحابہ رضؓ کے خلاف دیدہ دلیری اور بدزبانی ہے نیز اس میں فلسفۂ اخلاقیات، اصول اجتماعیات، رقت وصف، تکلف صنعت، وہ امور ہیں جو اس دور کے مزاج اور اس زمانہ کی قوت سے بالاتر ہیں اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کتاب کا بیشتر حصہ خود شریف کا بنایا ہوا ہے۔ بہرحال ظاہر یہی ہوتا ہے کہ شریف نے حضرت امام علی رضؓ سے منسوب تمام صحیح و مخلوط مواد کو جمع کر دیا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:- اس نے قادر باللہ کی ہمدردی اپنے ساتھ لینے کے لیے اس کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے اس کا نمونہ درج ذیل ہے، اس قصیدہ میں مدح کا وہی اسلوب ہے جو متوکل کی مدح میں بحتری کا ہے:-

لله یوم اطلعتك به العلا   علماً یزاول بالعیون ویرشق
لما سمت بك عزة موموقة   كالشمس تبهر بالضیاء وتومق

---

[1] اس کی تصدیق قادر باللہ کی مدح میں اس کے قصیدے اور متوکل مدح میں بحتری کے قصیدے کے تقابل سے ہو سکتی ہے۔ ان ہر دو قصائد کے نمونے ہم نے ہر دو شاعروں کے حالات کے ضمن میں درج کر دیے ہیں۔

وبرزت في برد النبي وللهدى ... نور على اسرار وجهك مشرق
وكأن دارك جنة حصباؤها ... الجادي أو أنماطها الاستبرق
في موقف تغضي العيون جلالة ... فيه ويعثر بالكلام المنطق
وكأنما فوق السرير وقد سما ... اسد على نشزات غاب مطرق

کس قدر مبارک دن تھا وہ جس میں سرفرازی و سروری نے تجھے بلند کر کے قوم کا معزز فرمانروا بنا دیا اور آنکھیں تیری طرف اٹھنے لگیں اور تجھے دیکھنے لگیں۔ جب تجھے محبوب عزت نے سورج کی طرح بلند کر دیا جو اپنی روشنی سے تابناک ہے اور جس سے محبت کی جاتی ہے۔ تو رسول اللہ کی چادر میں نمودار ہوا، اور ہدایت کا نور تیرے چہرے سے ضوفشانی کر رہا ہے۔ تیرا گھر جنت نظیر ہے، جس کی بجری زعفران ہے اور اس کے فروش دیبا و استبرق کے ہیں۔ وہ باعزت مقام آپ کو حاصل ہے جس کے جلال سے آنکھیں مارے ہیبت کے جھکی رہتی ہیں اور زبان بات کرنے میں لڑکھڑا جاتی ہے۔ آپ بلند تخت پر اس شیر کی طرح پر وقار انداز میں جلوہ فرما ہیں جو جنگل میں کسی بلند ٹیلے پر ہو۔

والناس اما راجع متهيب ... مما رأى، أو طالع متشوق
مالوا اليك محبة فتجمعوا ... ودأوا عليك مهابة فتفرقوا
وطعنت في غور الكلام بفيصل ... لا يستقل به السنان الازرق
وغرست في حب القلوب مودة ... تزكو على مر الزمان وتورق
وأنا القريب اليك فيه ودونه ... لعداي عداوك طود عز اعنق

آپ کے جلال و شوکت سے یا تو لوگ مرعوب و خائف ہو کر واپس ہو جاتے ہیں یا والہانہ آپ کے مشتاق و طالب دیدار ہو جاتے ہیں، کچھ تو محبت کی کشش سے آپ کی طرف پروانہ وار کھنچ کر جمع ہو جاتے ہیں اور کچھ آپ کی ہیبت و سطوت سے خوف زدہ ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کلام کی پیشانیوں پر اپنے فیصلہ کن فرمودات سے ایسا نشانہ لگایا ہے کہ لوہے کے نیزے بھی وہ خدمت انجام دینے سے قاصر تھے۔ (یعنی جو کام نیزوں سے نہیں نکلتا وہ کام آپ بر موقع فیصلہ کن گفتگو سے لیتے ہیں)۔ آپ نے دلوں کی گہرائیوں میں اپنی محبت کا پودا لگا دیا ہے جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور پھلتا پھولتا چلا جا رہا ہے۔ اور میں آپ کی محبت حاصل کرنے کے لیے آپ سے بالکل قریب ہوں، لیکن یہ محبت آپ کے دشمنوں کو نہیں ملتی کیونکہ اس سے ورے آپ کی عزت و سطوت کا بلند پہاڑ ہے جو دشمن کے ہاتھ کو اس محبت تک پہنچنے نہیں دیتا۔

عطفاً امير المؤمنين فاننا ... في دوحة العلياء لا نتفرق
ما بيننا يوم الفخار تفاوت ... ابداً، كلانا في المعالي معرق
الا الخلافة ميزتك فانني ... أنا عاطل منها وأنت مطوق

اے امیر المومنین! مجھ پر کرم فرمایئے۔ ہم دونوں بلندی کے گھنے سرسبز و شاداب درخت کے نیچے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ باہمی مفاخرت کے موقع پر کبھی بھی ہمارے درمیان کوئی تفاوت و اختلاف نہیں، ہم دونوں بلند مراتب و مناصب اور معزز نسب میں پختگی سے جڑے ہوتے ہیں، بس اگر آپ کو کوئی شرف مجھ سے ممتاز کرتا ہے تو وہ خلافت ہے جو آپ کو ملی ہے اور مجھے نصیب نہیں ہوئی۔

طغرائی

(وفات ۵۱۳ھ)

پیدائش اور حالات زندگی:- ابو اسماعیل حسین بن علی المعروف بہ طغرائی (یہ لقب طغراء نویسی کی وجہ سے اسے ملا جو اس کا پیشہ تھا) وہ اپنے مخصوص انداز میں سرکاری خطوط کی پیشانیوں پر طغرے بنایا کرتا تھا جن میں حاکم کے القاب و اوصاف لکھے جاتے تھے۔ اصبہان میں ایرانی گھرانہ میں پیدا ہوا، پھر آل سلجوق کے زیر سایہ مختلف خدمات پر مامور رہا تا آنکہ موصل میں سلطان مسعود کا وزیر ہو گیا۔ اسے استاذ اور منشی کے لقب سے یاد کیا جاتا۔ جب سلطان مسعود اور اس کے بھائی سلطان محمود میں ہمذان کے قریب لڑائی ہوئی اور موخر الذکر کو فتح ہوئی اور طغرائی کو قید کر لیا گیا، اور سلطان نے اپنے وزیر کو اشارہ کر کے اسے قتل کرا دیا۔ ایک چوٹی کے ہمعصر ادیب نے بھی جو اس سے حسد رکھتا تھا بادشاہ کو اس کے خلاف اکسایا اور اس پر الحاد کا الزام لگایا تھا۔ چنانچہ ۵۱۳ھ میں وہ مظلوم قتل کر دیا گیا۔

اس کی شاعری:- طغرائی کی شاعری پُر مغز، قافیہ متین، اور الفاظ منتخب ہیں۔ اس میں فخر و حماسہ کا زور ہے۔ اس کی نثر بھی اس کی شاعری کی طرح پختہ بندش اور محکم اسلوب رکھتی ہے۔ اس کی شاعری کا مجموعہ ایک بڑے دیوان کی شکل میں موجود ہے، جس کا بیشتر حصہ سلطان سعید بن ملک شاہ اور نظام الملک کی مدح پر مشتمل ہے۔ اس کا سب سے بہترین قصیدہ وہی ہے جو "لامیۃ العجم" کے نام سے مشہور ہے اور جسے شاعری کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ یہ قصیدہ اس نے بغداد میں اپنی بیکاری کے ایام میں کہا تھا۔ اس میں وہ حوادث زمانہ کا گلہ اور احباب کی بیوفائیوں کا شکوہ کرتا ہے۔ علماء نے اس قصیدہ کی چھوٹی بڑی شرحیں بھی کی ہیں، اس کے مطلع میں کہتا ہے:-

أصالة الرأي صانتني عن الخطل   وحلية الفضل زانتني لدى العطل
مجدي أخيرا ومجدي أولا شرع   والشمس رأد الضحى كالشمس في الطفل

پختگی اور جودت رائے نے مجھے لغزشوں اور بے فائدہ باتوں سے محفوظ رکھا، اور مادی اسباب زینت سے خالی ہونے پر مجھے زیور علم و فضل نے آراستہ و پیراستہ رکھا۔ میری مجد و عظمت

اول و آخر یکساں ہے، جیسے سورج طلوع کے بعد اور غروب سے قبل ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔

اسی قصیدہ کے دیگر اشعار:۔

حبّ السلامۃ یثنی عزم صاحبہ ۔۔۔ عن المعالی و یغری المرء بالکسل

فان جنحت الیہ فاتخذ نفقا ۔۔۔ فی الأرض أو سلّماً فی الجو فاعتزل

ودع غمار العلا للمقدمین علی ۔۔۔ رکوبہا واقتنع منہن بالبلل

رضا الذلیل بخفض العیش مسکنۃ ۔۔۔ والعزّ تحت رسیم الأینق الذلل

عافیت پسندی اور سلامتی کی خواہش آدمی کے عزم و ہمت کو بلند مقاصد سے موڑ کر اسے کسلمندی کا رسیا بنا دیتی ہیں۔ اگر تمہیں بھی یہی کچھ پسند ہے تو پھر یا تو زمین میں سرنگ کھود دو یا پھر فضا میں زینہ لگا کر چڑھ جاؤ اور بہر حال دنیا کی تگ و دو سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔ اور بلندیوں کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور خود تم ان کی معمولی جھلکیوں پر قانع ہو جاؤ۔ ذلیل شخص کا آسودہ زندگی پر رضامند ہو جانا مسکنت ہے، دراصل عزت تو سدھائی ہوئی اونٹنیوں کی تیز رفتاری میں پنہاں ہے۔

بڑھاپے میں جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو یہ اشعار کہے:۔

ھذا الصغیر الذی وافی علی کبر ۔۔۔ أقرّ عینی ولکن زاد فی فکری

سبع وخمسون لو مرت علی حجر ۔۔۔ لبان تأثیرہا فی صفحۃ الحجر

یہ بچہ جو مجھے بڑھاپے میں ملا ہے، اس نے میری آنکھوں کو تو ٹھنڈا کیا، لیکن میری فکروں میں اضافہ کر دیا ہے، ستاون برس اگر کسی پتھر پر بھی گذر جائیں تو اس پتھر کے خد و خال پر بھی وہ اپنے نمایاں اثرات چھوڑ جائیں گے۔

فخریہ اشعار:۔

أبی اللہ أن اسمو بغیر فضائلی ۔۔۔ اذا ما سما بالمال کلّ مسود

وان کرمت قبلی أوائل أسرتی ۔۔۔ فانی بحمد اللہ مبدأ سؤددی

وما المال الا عارۃ مستردّۃ ۔۔۔ فہلّا بفضلی کاثرونی و محتدی

جب کہ ہر سرمایہ دار مال و دولت کے بل بوتے پر بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے تو میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ اپنے ذاتی جوہر و فضائل کے سوا کسی اور چیز سے بلند مرتبہ حاصل کروں۔ اگرچہ مجھ سے پہلے بھی میرے خاندان کے افراد معزز و باشرف تھے، لیکن بحمد اللہ میں نے اپنی سیادت کو خود اپنی ذات سے شروع کیا ہے۔ مال تو ایک عارضی چیز ہے جسے پلٹا دیا جاتا ہے، میرے مخالفین میں اگر کچھ دم خم ہے تو یہ لوگ میرے فضل اور میری اصل میں مجھ سے مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟

اذا لم یکن لی فی الولایۃ بسطۃ ۔۔۔ یطول بہا باعی و تسطو بہا یدی

ولا کان لی حکم مطاع أجیزہ ۔۔۔ فأرغم اعدائی و أکبت حسّدی

و آمن أن يعتاد في كيد معتد	فاعذار ات تقصرت في حق معتد

اگر حکومت میں میرے لیے کوئی اقتدار نہیں جس سے میری قوت وسیع ہو سکے اور میں اپنا ہاتھ بڑھا سکوں اور اگر میرے لیے فرمانروائی نہیں جسے روبعمل لاکر میں اپنے دشمنوں کو زیر، اور اپنے حاسدوں کو خوار، کرسکوں تو اس کی وجہ سے میں کسی سائل کا حق مارنے سے بچارہا اور میں سیاسی سازشوں کا شکار بننے سے محفوظ رہا۔

أرى دونها وقع الحسام المهند	أأكفى ولا أكفي؟ و تلك غضاضة
يعانيه من مكروهة فكأن قد	من الحزم الا ينضجر المرء بالذي
مريرة عزمى ناب عنه تجلدى	اذا جلدى فى العزم خان ولم يعن
و لو بعد حين انه خير مسعد	ومن يستعن بالصبر نال مرادة

کیا میری ضرورتیں پوری کی جائیں اور میں کفایت نہ کروں؟ یہ تو بڑی توہین کی بات ہے، میں اس ورنے تلوار کی ضرب دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہوشیاری اور احتیاط یہی ہے کہ انسان ان مشکلات سے جن کا وہ مقابلہ کرتا ہے گھبرا نہ جائے، ایسی صورت میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ جب میری معمولی قوت و ہمت میرے عزم کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہتی ہے اور وہ میرے پختہ عزم پر عمل درآمد کرنے میں میرا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو میں اپنے عزم کے لیے تبکلف قوت و ہمت پیدا کر لیتا ہوں۔ اور جو بھی صبر و ثبات سے کام لیتا ہے وہ اپنے گوہر مقصود کو پا لیتا ہے خواہ اسے کامیابی میں کچھ دیر کیوں نہ لگ جائے کیونکہ یہ بہترین مددگار اور کامیاب ذریعہ ہے۔

شام کے شعرا اور ان کی شاعری

عہد بنی امیہ میں دمشق خلافت کا پایۂ تخت، حکومت کی راج دھانی، فوج کی چھاؤنی، اسلام کی پناہ گاہ اور آرزوؤں کا مرکز، تھا۔ چنانچہ ادب۔ قلم کی بجائے وہ ادب سیف میں مشغول رہا، جھنڈے اٹھانے کی وجہ سے اسے کتابیں اٹھانے کی فرصت نہ مل سکی۔ ملکی و سیاسی مسائل کے درد سرنے اسے شعر و ادب کے درد جگر سے بیگانہ رکھا۔ چنانچہ یہ متاع عراق و حجاز میں پروان چڑھا۔ اور وہاں کے قریہ قریہ۔ بستی بستی میں شاعروں کی کثرت اور مجالس میں ادیبوں کی ریل پیل ہو گئی اس تحریک کو بڑھانے اور پروان چڑھانے میں امیر معاویہ رض کا جو حصہ، اور ان کی سیرت کا جو اثر ہے وہ آپ معلوم کر چکے ہیں۔

جب اللہ نے امویوں پر عباسیوں کو، عربوں پر ایرانیوں کو، دمشق پر بغداد کو غالب کر دیا، تو شام کی ادبی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں، تا آنکہ چوتھی صدی میں بنو حمدان، حلب کے فرمانروا ہوئے۔ جن کی تعریف میں ثعالبی لکھتا ہے "ایسے حکام و امراء ہیں کہ ان کی زبانیں فصاحت کے لیے اور ہاتھ سخاوت کے لیے، وقف ہیں۔ سیف الدولہ ان کی سیادت میں مشہور اور ان کا بلند مرتبہ قائد

ہے" وہ خود بھی ماہر ادیب، پیدائشی شاعر اور ممدوح بادشاہ تھا، چنانچہ اس نے اپنا دربار ادباء وعلماء کے لیے کھول دیا، حتی کہ یہ مشہور ہو گیا کہ خلفاء کے بعد کسی بادشاہ کے دروازہ پر اس قدر علماء و ادباء وشعراء کا ہجوم نہ ہوا جتنا اس کے دروازہ پر تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ بادشاہ کی مثال ایک منڈی کی سی ہے کہ اس میں جس چیز کی مانگ اور کھپت ہوتی ہے وہ پہنچنا شروع ہو جاتی ہے۔

شاعری میں شامیوں کا غالب اسلوب بحتری کا سا ہے۔ جس میں پرشوکت الفاظ، فصیح وسہل انداز کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جس میں نہ معانی کی گہرائی مقصود ہوتی ہے نہ ایجاز کی افراط۔ ثعالبی نے صاحب بن عباد کو اس طرز کی تعریف کرتے سنا نیز یہ کہ وہ شامی شاعری سے محفوظ ہوتا تھا۔ انہوں نے ہی خوارزمی سے یہ روایت بھی کی ہے "مجھے اس مقام پر پہنچانے، میری طبیعت کھولنے، فہم کو تیز کرنے، ذہن کو جلاء دینے، اور زبان کو سان چڑھانے، میں شامی نوادر و لطائف ہی کا حصہ ہے، جب میں نوجوانی کے عالم میں تھا تو حلبی لطائف ہی میرے حافظہ میں محفوظ، اور میرے دل و جگر میں پیوست تھے۔"

شام کے لیے یہ فخر کافی ہے کہ اس نے ابو تمام، بحتری، متنبیٔ، ابو فراس اور ابو العلاء المعرّی جیسے بلند پایہ شعراء کو جنم دے کر اس وقت عربوں کو شاعری کے میدان میں آگے لا کھڑا کیا جبکہ وہ اس دور کے آغاز میں ایرانی متعربین اور اولاد موالی سے زیر ہو چکے تھے۔

ہم انہیں مشہور و ماہر فن اساتذہ کے سوانح حیات پر اقتصار کریں گے کیونکہ اس دور کے تمام شعراء کا احاطہ اور ان کے ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہماری اس مختصر کتاب کے بس کی بات نہیں ہے۔

ابو تمام

(پیدائش ۱۸۸ھ وفات ۲۳۱ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات: حبیب بن اوس طائی مضافات دمشق میں جاسم نامی ایک بستی میں پیدا ہوا، پھر اس کا باپ جو جلاہہ پیشہ تھا دمشق میں منتقل ہو گیا، ابو تمام بھی اس کے ساتھ اس کے کام میں ہاتھ بٹاتا رہا۔ جب ذرا جوان ہوا تو مصر چلا گیا، جہاں وہ عمرو بن عاص کی جامع مسجد میں پانی بھرنے لگا، ساتھ ہی مسجد کے علماء سے علم بھی حاصل کرتا رہا۔ وہ مستقل اشعار حفظ کرتا، اور شاعروں کی نقلیں اتارتا رہا اور اس کوشش میں وہ کبھی اٹھتا اور کبھی گرتا رہا، تا آنکہ ایک دن آیا کہ وہ شاعری کے اس بلند مقام پر پہنچا جہاں اس کے ہم عصروں میں کوئی بھی اس کا حریف نہ بن سکا، اور اس

کی شاعری نے ملک کے تمام اطراف میں اس کی دھوم مچا دی، چنانچہ وہ مصر سے نکل کر مشہور و معروف سخی لوگوں کی خدمتوں میں پہنچ کر ان کے انعامات و اکرامات طلب کرتا رہا۔ اور ادب و مدح کے دلدادگان میں اسے کچھ ایسی عظیم مقبولیت حاصل ہوئی جس کی نظیر کسی دوسرے شاعر میں نہیں ملتی حتیٰ کہ نوبت یہ ہو گئی تھی کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا شاعر ایک درہم بھی شاعری کے ذریعہ پیدا نہ کر سکا۔ پھر وہ احمد بن معتصم کے پاس پہنچا اور اس کی مدح کی چنانچہ اس نے انعام میں موصل کی ڈاک کا محکمہ اس کے ماتحت کر دیا اور وہ دو سال تک اس عہدہ پر کام کرتا رہا اور ابھی اس نے اپنی عمر کی چالیس بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں کہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔

اس کا حلیہ اور سیرت:- ابو تمام گندمی رنگ کا طویل القامت شخص تھا۔ فصیح و شیریں کلام، گفتگو میں قدرے ہکلاتا تھا۔ وہ نہایت ذہین و طباع، حاضر دماغ، برجستہ گو، اور قوی الحافظہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اسے قصائد و قطعات کے علاوہ چودہ ہزار اُرجوزے یاد تھے۔ اس کی دو مشہور تالیفات "الحماسہ" اور "فحول الشعراء" اس کی بالغ نظری اور ادبی مہارت کی ناطق شہادت ہیں۔ اس کی برجستہ گوئی اور حاضر دماغی اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ جب اس نے اپنا سینیہ قصیدہ مدح احمد بن معتصم کو سنایا جس کا مطلع ہے:-

مانی وقوفك ساعة من باس   تقضی ذمام الادبُم الادراس

پرانے کھنڈروں کا حق ادا کرنے کے لیے ان پر گھڑی بھر ٹھہر جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس قصیدہ میں آگے چل کر وہ کہتا ہے:-

اقدام عمرو فی سماحة حاتم   فی حلم أحنف فی ذکاء ایاس

اے ممدوح تجھ میں عمرو کی جرأت و پیش قدمی کے ساتھ حاتم کی سخاوت، احنف کی بردباری کے ساتھ ایاس کی ذکاوت ہے۔

تو حاضرین میں سے ابو یوسف کندی فلسفی بول اٹھا "امیر اپنی خوبیوں میں ان لوگوں سے بالاتر ہے، تم نے تو انہیں عرب کے بدوؤں سے تشبیہ دے دی" اس پر ابو تمام نے ذرا سا سر جھکایا اور فی البدیہہ یہ اشعار کہے:-

لا تنکروا ضربی له من دونه   مثلاً شروداً فی الندی والباس

فاللہ قد ضرب الاقل لنوره   مثلاً من المشکوة والنبراس

میں نے ممدوح کی سخاوت و شجاعت کے سلسلہ میں جو کم درجہ کی شخصیتیں بطور مثال پیش کی ہیں تو ان پر برا ماننے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ خود اللہ نے اپنے نور کے لیے جو طاق اور چراغ کی مثال پیش کی ہے وہ اس کے بے مثال نور کے مقابلہ میں بہت ہی کم حیثیت رکھتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب اس کا تحریر کردہ قصیدہ اس سے لیا گیا تو اس میں یہ دو اشعار نہ تھے (یعنی

اس نے یہ دونوں شعر اسی وقت کھڑے کھڑے اعتراض کے جواب میں برجستہ کہے تھے) تو لوگوں کو انتہائی حیرت ہوئی، معترض فلسفی نے خلیفہ سے سفارش کی کہ یہ جو بھی مطالبہ کرے اسے پورا کر دیجیے، اس لیے کہ اس کی فکر اس کے جسم کو اسی طرح کھا جائے گی جس طرح تیز تلوار کو اس کی نیام کھا جاتی ہے، اور یہ زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ احمد بن معتصم نے اسے موصل کے محکمہ ڈاک کا نگران مقرر کر دیا۔

اس کی شاعری:- ابوتمام مولدین کے دوسرے طبقہ کا سرگروہ ہے۔ اس نے متقدمین و متاخرین کے معانی اپنی شاعری میں یکجا کر دیے۔ اس کے دور میں تمدن ترقی کر رہا تھا۔ علوم کے ترجمے ہو رہے تھے۔ ان نئی ترقیوں سے واقفیت کی بناء پر اس کی عقل پختہ اور خیال نازک ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے لیے جداگانہ اسلوب وضع کیا، جس میں اس نے تسہیل عبارت پر تجوید معنی کو ترجیح دی۔ یہی سبب ہے کہ پہلا شاعر ہے جس نے بکثرت عقلی دلائل سے استنباط کیا اور خفیہ کنایات استعمال کیے گو اس سبب سے اس کی عبارت میں کبھی تعقید بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جیسا اسے اپنے کلام میں سلاست الفاظ کا فقدان نظر آیا تو اس نے اس خامی کا ازالہ تجنیس، مطابقت اور استعارہ کے ذریعہ کرنا چاہا۔ چنانچہ کہیں موضوع کو خوبی سے نباہ دیا اور کہیں بات بگڑ گئی اور یہ عیوب، بدر کامل میں چھائیوں کی طرح نمودار ہو گئے با ایں ہمہ اس کا وہ کلام جو خامیوں سے مبرا و منزہ ہے اس قدر کثیر ہے کہ اتنی مقدار نہ اس سے پہلے گذرنے والے شاعروں میں سے کسی کی ہے نہ بعد میں آنے والوں کی۔ انوکھے معانی، منتخب الفاظ جن میں امثال و حکم کو اس پیارے انداز سے سمویا ہے کہ اس سے ایک طرف تو ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہو گیا اور دوسری طرف اس نے اپنے بعد آنے والوں کے لیے اس راہ میں ترقی کے مواقع بہم پہنچا دیے۔ چنانچہ اس کے بعد متنبی اور ابوالعلاء المعری نے اسی کے طریقہ کی پیروی کی۔ اس پر حکمت کا اس درجہ غلبہ ہے کہ لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا "ابوتمام و متنبی تو حکیم ہیں اور شاعر تو بحتری ہے" اس کی شاعری کے متعلق لوگوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے کچھ اس کی حمایت میں انتہائی غلو سے کام لیتے ہوئے اسے اگلے پچھلے تمام شعراء پر ترجیح دیتے ہیں اور کچھ انتہائی مخالفت کی وجہ سے اس کی خوبیوں کو چھپا کر محض خامیوں کو اچھالتے ہیں، تاہم غلبہ اس کے مداحوں کو ہی حاصل ہے۔ بڑے بڑے روساء و امراء میں اسے جو مقبولیت اور ان سے اسے جو داد ملی ہے اس کی تردید مخالفین کسی طرح بھی نہیں کر سکتے۔ جب اس نے ایک عمدہ قصیدہ کے ذریعہ محمد بن عبدالملک زیات کی مدح کی تو اس نے کہا "اے ابوتمام! تم اپنی شاعری میں جو الفاظ کے جواہر جڑتے ہو اور ان میں انوکھے معانی سے جو حسن بڑھاتے ہو وہ حسن و شوکت حسین دوشیزاؤں کے گلوں کے مرصع ہاروں میں بھی نہیں ہوتی۔ اور جو بڑے سے بڑا انعام تمہاری شاعری کے عوض تمہیں دیا جاتا ہے وہ موازنہ کرتے وقت بہرحال تمہاری شاعری سے کمتر ہی رہتا ہے۔

اس کی شاعری جمع کر کے ایک دیوان کی صورت میں کئی بار شائع ہو چکی ہے، اس کے علاوہ اس کی دو تصانیف "الحماسہ" اور "فحول الشعراء" جن میں اس نے زمانۂ جاہلیت و اسلام کی بہترین شاعری کو جمع کر دیا۔ اس نے یہ انتخاب اس قدر عمدہ اور موزوں کیا ہے کہ لوگ کہنے لگے کہ اس کا انتخاب اس کی شاعری سے بہتر ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ اپنے شاہکار قصیدہ میں وہ کہتا ہے:۔

غدات تستجیر الدمع خوف نوی غد — وعاد تتاداً عندها کل مرقد
وانقذها من غمرة الموت انه — صدود فراق لا صدود تعمد
فاجری لها الاشفاق دمعا موردا — من الدم یجری فوق خد مورد

کل پیش آنے والے فراق کے خوف سے اس نے آنسوؤں کی پناہ لینا شروع کر دی، اور پہلو بدلنے کا یہ عالم ہے کہ جیسے اس کے بچھونے پر کانٹے بچھائے گئے ہوں۔ اسے موت کے منہ سے اگر کسی چیز نے بچایا تو وہ اس کا یہ خیال تھا کہ یہ بے رخی عمداً نہیں بلکہ محض سفر کی مجبوری کے سبب ہے، اس خوف نے اس کے آنسوؤں کو خون کی آمیزش سے پیاذی بنا کر اس کے سرخ گالوں پر بہا دیا۔

اپنے اس قصیدہ میں وہ سفر کی ترغیب دلاتے ہوئے کہتا ہے، اگر آپ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو ہر بیت میں مطابقت نظر آئے گی:۔

ولکننی لم احو وفرا مجمعا — نفزت به الا بشمل مبدد
ولم تعطنی الایام نوما مسکنا — الذ به لا بنوم مشرد
وطول مقام المرء فی الحی مخلق — لدیباجتیه فاغترب تتجدد
فانی رایت الشمس زیدت محبة — علی الناس ان لیست علیهم بسرمد

لیکن مجھے بہت سا اکٹھا مال نہ ملا بلکہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے ملتا رہا۔ زمانہ نے مجھے آرام کی نیند کا مزہ بھی نہ لینے دیا، البتہ کچھ پریشان خوابی ضرور ملی۔ قبیلہ میں بہت لمبی مدت تک پڑے رہنے سے انسان کی عزت کم ہونے لگتی ہے اس لیے سفر اختیار کرتے رہو تو عزت از سر نو بڑھ جائے گی۔ میں نے دیکھا ہے کہ سورج سے اسی لیے زیادہ محبت کی جاتی ہے کہ وہ مسلسل انسانوں پر روشن نہیں رہتا۔

ایضاً:۔

نقل فؤادك حیث شئت من الهوی — ما الحب الا للحبیب الاول
کم منزل فی الارض یالفه الفتی — وحنینه ابداً لاول منزل

عاشقی میں تم جہاں چاہو اپنے دل کو پھینکتے اور منتقل کرتے رہو، لیکن حقیقی محبت تو صرف پہلے محبوب ہی کے حصہ میں آتی ہے۔ یوں تو انسان کتنے ہی مقامات میں بود و بوش اختیار کرتا ہے

لیکن اسے جو خاص محبت ہوتی ہے اور جدھر ہمیشہ اس کا دل کھینچتا ہے وہ اس کا مقام پیدائش ہی ہوتا ہے۔

محمد بن احمد طوسی کے مرثیہ میں کہتا ہے:-

کذا فلیجل الخطب ولیفدح الامر — فلیس لعین لم یفض ماؤها عذر
توفیت الآمال بعد محمد — واصبح فی شغل عن السفر السفر
الا فی سبیل اللہ من عطلت لہ — فجاج سبیل اللہ وانثغر الثغر
فتی کلما فاضت عیون قبیلۃ — دما ضحکت عنہ الاحادیث والذکر
فتی دھرہ شطران فیما ینوبہ — ففی باسہ شطر وفی جودہ شطر
فتی مات بین الطعن والضرب موتۃ — تقوم مقام النصر اذ فاتہ النصر
وما مات حتی مات مضرب سیفہ — من الضرب واعتلت علیہ القنا السمر
تردی ثیاب الموت حمرا فماد جا — لھا اللیل الا وھی من سندس خضر

یہ ہے وہ سانحہ جسے عظیم مصیبت اور حد سے بڑھا ہوا معاملہ کہنا چاہیے۔ اور اس موت پر جو آنکھ آنسو نہ بہائے اس کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ محمد کے بعد آرزوئیں ختم ہوگئیں اور مسافر سفر کرنا بھول گئے۔ لو وہ راہ خدا میں چلا گیا اور اب اس کی وجہ سے راہ خدا کے راستے ویران ہو گئے اور سرحدیں غیر محفوظ ہو گئیں۔ وہ ایسا بہادر تھا کہ جب بھی قبیلہ کی آنکھیں خون کے آنسو بہائینگی اس کی یاد اور اس کے چرچے سننے ہی رہیں گے۔ وہ ایسا بہادر تھا کہ دنیا میں اس کے دو ہی کام تھے ایک بہادری سے جنگوں میں حصہ لینا اور دوسرا سخاوت کرتے رہنا۔ وہ ایسا بہادر تھا جو تلواروں اور نیزوں کے درمیان ایسی موت مرا کہ اگر اسے فتح نہ بھی ہو تو وہ فتح سے کچھ کم بھی نہیں۔ اس نے اس وقت تک جان نہ دی تا وقتیکہ اس کی تلوار کا قبضہ ٹوٹ نہ گیا اور اس کے گندم گوں نیزے نے جواب نہ دے دیا۔ اس نے موت کا سرخ لباس پہن لیا اور رات کی تاریکی ابھی آنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ سبز ریشمی لباس میں تبدیل ہو گیا (یعنی جنت الفردوس میں داخل ہو گیا)۔

مدح میں کہتا ہے:-

اذا حرکتہ ھزۃ المجد غیرت — عطایاہ اسماء الامانی الکواذب
یری اقبح الاشیاء اوبۃ آمل — کستہ ید المامول حلۃ خائب
واحسن من نور تفتحہ الصبا — بیاض العطایا فی سواد المطالب

جب اسے مجد و سروری کی لہر آتی ہے تو اس کی بخششیں جھوٹی آرزوؤں کے ناموں کو بدل دیتی ہیں۔ اس کی نظروں میں سب سے بری بات یہ ہے کہ جس سے کوئی آرزو اور توقع کی جائے وہ آرزو کرنے والے کو اس سے محروم واپس پلٹا دے۔ اسے بخششوں کی وہ سفیدی جو مانگنے والوں کی تاریکی کو روشن کر دیتی ہے باد صبا کی کھلائی ہوئی کلیوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

بحتری

(ولادت ۲۰۶ھ وفات ۲۸۴ھ)

پیدائش اور حالات زندگی:- ابو عبادہ ولید بن عبید اللہ طائی، خالص عربی النسل تھا، ۲۰۶ھ میں بمقام منبج (حلب اور فرات کے درمیان) پیدا ہوا۔ دیہات میں طائی قبائل وغیرہ میں پرورش پانے کی وجہ سے عربی فصاحت اس پر غالب رہی، پھر وہاں سے بغداد چلا گیا جہاں ابو تمام سے ملاقات ہوئی اور اسی کا ہو رہا۔ اس سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بدیع میں اس کے طریقہ کو اپنایا۔ بہت سے علماء سے روایت کی جن میں ابو العباس مبرد بھی شامل ہیں یہ مستقل ابو تمام کا پروردہ بنا رہا اس کی آواز کو دہراتا اور اسی کے نقش قدم کا اتباع کرتا رہا اور ابو تمام اسے اصلاح دیتا اور اٹھاتا رہا کیونکہ یہ بھی اس کے جیسا طائی تھا، تاآنکہ ایک دن ابو تمام نے اس سے کہا دیبیٹھے! بخدا میرے بعد کل تم ہی شاعروں کے سردار مانے جاؤ گے" اور اللہ نے اس کی پیشینگوئی سچ کر دکھائی۔ چنانچہ ابو تمام کے بعد بحتری کی شاعری کا چرچا گھر گھر عام ہو گیا اور وہ ادب و شاعری میں امام بن گیا۔ عراق میں متوکل اور اس کے وزیر فتح بن خاقان کا خدمت گار رہا، تاآنکہ وہ دونوں اس کی موجودگی میں قتل کر دیے گئے۔ پھر وہ ان کے بعد منبج واپس آگیا، کبھی کبھار وہ بغداد "سرمن رائی" کے رئیسوں کے پاس ان کی مدح کہہ کر پہنچتا رہتا تھا، حتیٰ کہ ۲۸۴ھ میں انتقال کر گیا۔

اخلاق و عادات:- بایں ہمہ علم و ادب و فضل و نزاکت طبع، بحتری دنیا میں سب سے زیادہ میلے کپڑے پہننے والا، اپنے اوپر اور دوسروں پر بہت بخل کرنے والا تھا۔ اس کے شعر سنانے کا انداز نہایت ناپسندیدہ اور بھونڈا تھا۔ اپنا کلام پڑھتے وقت وہ بتکلف باچھیں پھیلاتا، جھک کر ایک طرف چلتا یا پیچھے ہٹتا۔ کبھی اپنا سر ہلاتا اور کبھی مونڈھوں کو حرکت دیتا، اپنی آستین سے اشارہ کرتا، ہر شعر کے بعد ٹھہرتا اور کہتا "بخدا کیا خوب عرض کرتا ہوں" پھر سامعین کی طرف متوجہ ہو کر کہتا "آپ لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ اس کلام کی داد نہیں دیتے رہتے؟ بخدا یہ وہ کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے سب قاصر ہیں"، بایں ہمہ وہ منصف اور صاحب فضل کی فضیلت کا معترف تھا اور بوگس دعویٰ نہیں کرتا تھا۔ بعض لوگوں نے اس کی شاعری سن کر کہا "آپ ابو تمام سے بہتر شعر کہتے ہیں"، تو اس نے کہا "آپ کے اس قول سے نہ مجھے کوئی فائدہ پہنچے گا نہ اس سے ابو تمام کا کوئی نقصان ہوگا، بخدا اس کے طفیل میں روٹی پا رہا ہوں، میری دلی تمنا ہے کہ میں لوگوں کے کہنے کے مطابق ہوتا، لیکن خدا کی قسم میں ابو تمام کا تابع، اس کا خوشہ چیں، اور اس کی پناہ میں رہنے والا ہوں، اس کی تند و تیز ہوا کے سامنے میرا نرم و نازک

جھونکا رک جاتا ہے، اور اس کے آسمان کے مقابلہ میں میری زمین پست رہ جاتی ہے!!"

اس کی شاعری:- شاعری میں بحتری ابو تمام کا پیرو، اور بدیع میں وہ اس کا متبع ہے تاہم یہ معنی کے لیے الفاظ نہایت حسین انتخاب کرتا ہے اور بقول ابن اثیر "شاعری کرنا چاہتا ہے لیکن گانے لگتا ہے"۔ اس نے مضامین و معانی فطرت کے جمال افروز نظاروں اور اپنے تخیل کے الہام سے پیدا کیے نہ کہ علم و منطق کے قضیوں سے۔ اس طرح اس نے شاعری کے اس حسن و جمال کو جو ختم ہو چکا تھا واپس پلٹا دیا۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے متنبی نے کہا تھا۔ "میں اور ابو تمام تو حکیم ہیں اور شاعر تو بحتری ہے"!! شاعری میں شوکت الفاظ، مضامین کی دلکشی، حلاوت و فصاحت اس کا وہ خاص اسلوب ہے جس میں وہ اپنے استاد و مربی سے ممتاز ہے، اور یہی وہ اسلوب ہے جسے اس کے معاصرین اور بعد میں آنے والوں نے اپنایا اور جسے بعد میں "اہل شام کے اسلوب" سے پہچانا جانے لگا۔ ابو عبادہ نے ہجو کے علاوہ شاعری کی تمام اصناف میں جولانیٔ طبع دکھائی۔ اس کی ہجویہ شاعری کم اور اس میں عمدہ اشعار بہت ہی کم ہیں۔ کہتے ہیں اس نے موت سے قبل اپنی تمام ہجویہ شاعری جلا ڈالی تھی اور یہ زیادہ صحیح بات ہے۔ بہت زیادہ کلام ہونے کی وجہ سے اس کی شاعری میں پست درجہ کے سطحی اشعار بھی ملتے ہیں۔ عمدہ مدح کہنا اور اس میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا، ممدوح کے اخلاق کی پوری پوری تصویر کشی، انوکھے محلات اور عمدہ تعمیرات (مثلاً ایوان کسریٰ[1] متوکل کا تعمیر کردہ تالاب، معتز باللہ کے محل) کا وصف اس کی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ تقریباً اس کے ہر قصیدہ کے ابتداء میں تشبیب ہوتی ہے، ابوبکر صولی نے اس کی شاعری یکجا کر دی ہے اور اسے حروف ہجائی کے مطابق ترتیب دے دیا ہے۔ اس دیوان کے علاوہ اس کی کتاب "معانی الشعر" اور "حماسۃ البحتری" جو ابو تمام کے حماسہ کی طرح ہے، لیکن بحتری کا حماسہ کثرت ابواب اور خوش آہنگ شاعری میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، یہ حماسہ بیروت سے شائع ہو چکا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ: متوکل کے تعمیر کردہ تالاب کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

تنصب فیها وفود الماء معجلة — کالخیل خارجة من حبل مجریها
کأنما الفضة البیضاء سائلة — من السبائك تجری فی مجاریها
اذا علتها الصبا ابدت لها حبکا — مثل الجواشن مصقولا حواشیها
فحاجب الشمس احیانا یضاحکها — وریق الغیث احیانا یباکیها

---

[1] ایوان کسریٰ کے وصف میں بحتری کا قصیدہ عربی کا شاہکار ہے، اس کا کچھ نمونہ ہم پچھلے صفحات میں درج کر چکے ہیں۔

اذا النجوم تراءت فی جوانبها   لیلاً حسبت سماء رُکّبت فیها

پانی کے ریلے تیزی کے ساتھ اس طرح اس تالاب میں آکر گرتے ہیں گویا وہ گھوڑے ہیں جو اپنے سواروں کے ہاتھوں کی لگام سے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانی نہیں سفید پگھلاتی ہوئی چاندی ہے جو نالوں میں بہہ رہی ہے۔ جب اس پر باد صبا چلتی ہے تو اس پر ایسی جالی دار لہریں پیدا ہو جاتی ہیں جو ان زرہوں سے مشابہ ہوتی ہیں جن کے کنارے چمک رہے ہوں۔ کبھی تو یہ تالاب سورج کی چمک کے ساتھ ہنستا ہے اور کبھی بارش کے ساتھ رونے لگتا ہے اور رات کو جب اس کے ارد گرد تاروں کا عکس پڑتا ہے تو یہ آسمان معلوم ہوتا ہے جس میں تارے جڑے ہوئے ہوں۔

خلیفہ متوکل کی مدح اور عید الفطر کے موقع پر مبارک باد یوں کہتا ہے:۔

بالبر صمت وانت افضل صائم   وبسنة الله الرضية تفطر

فانعم بیوم الفطر عینا انه   یوم اغرّ من الزمان مشهر

اظهرت عزّ الملك فیه بجحفل   لجب یُحاط الدین فیه ویُنصر

فالخیل تصهل والفوارس تدعی   والبیض تلمع والاسنة تزهر

والارض خاشعة تمیل بثقلها   والجو معتکر الجوانب اغبر

والشمس طالعه توقد فی الضحی   طورا ویطفئها العجاج الاکدر

حتی طلعت بنور وجهك فانجلی   ذالك الدجی وانجاب ذالك العثیر

فافتن فیك الناظرون فاصبع   یؤمی الیك بها وعین تنظر

تو نے روزہ میں نیکی کا دامن تھامے رکھا اور تو سب سے برتر روزہ دار ہے اور اللہ کی محبوب سنت سے تو روزہ افطار کرتا ہے۔ اب تو عید کے دن جو زمانہ کا نہایت مبارک و مشہور دن ہے، خوشی منا، تو نے حکومت کی شان و شوکت کا مظاہرہ ایسے عظیم لشکر سے کیا جو دین کی حفاظت کرتا اور فتح مند رہتا ہے۔ گھوڑے ہنہنا رہے ہیں اور شہسوار فخر کا مظاہرہ کر رہے ہیں تلواریں چمک رہی ہیں اور نیزے دمک رہے ہیں، زمین اس لشکر کے بار سے جھکی ہوئی اور خاموش ہے اور فضا اس لشکر جرار کی نقل و حرکت سے غبار آلود۔ سورج نکلا ہوا ہے اور چاشت میں کبھی تو بھڑکتا ہوا نمودار ہوتا ہے اور کبھی گھنا گدلا غبار اسے چھپا دیتا ہے۔ حتی کہ آپ کا رخ انور جلوہ افروز ہوا اور اس سے تاریکی ختم ہوئی اور غبار چھٹ گیا اور لوگوں کی نگاہیں آپ کی طرف اُٹھنے لگیں، اُنگلیوں سے تیری طرف اشارے اور آنکھوں سے تیرے نظارے ہونے لگے۔

ذکروا بطلعتك النبی فهللوا   لمّا طلعت من الصفوف وکبّروا

حتی انتهیت الی المصلی لابسا   نور الهدی یبدو علیك ویظهر

ومشیت مشیة خاشع متواضع   لله لا یزهی ولا یتکبر

فلوات مشتاقا تکلّف فوق ما   فی وسعہ لسعی الیاش المنبرا
ابلیت من فصل الخطاب بحکمۃ   تنبی عن الحق المبین وتخبر
و تقفت فی برد النبی مذکّرا   باللہ تنذر تارۃ و تبشّر

جب تو صفوں سے نمودار ہوا تو تیرے چہرے نے لوگوں کو حضور اکرم ؐ کا چہرہ یاد دلا دیا اور فرط محبت سے انہوں نے تہلیل اور نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے حتی کہ تو عید گاہ میں پہنچا اور نور ہدایت تجھ پر ظاہر اور نمایاں تھا، تو خدا کے حضور ایسی خشیت اور تواضع سے چل رہا تھا جس میں نہ خود نمائی کا شائبہ تھا نہ تکبر کی نمائش۔ اگر کوئی مشتاق اپنی طاقت سے زیادہ کا متحمل ہوتا تو ممبر فرط اشتیاق سے آپ کی طرف دوڑا چلا آتا۔ آپ نے اپنے انداز حکیمانہ سے وہ حقیقت افروز خطبہ دیا جس نے حق و صداقت کو نکھار کر واضح کر دیا اور آپ آں حضرت ؐ کی چادریں ملبوس کھڑے کبھی اللہ کی یاد دلاتے تھے اور کبھی بد اعمالیوں کے انجام سے ڈراتے اور اچھے نتائج کی خوشخبریاں دے رہے تھے۔

تو اب یں محبوب کے دیدار پر کہتا ہے:۔

اذا ما الکری اھدی الیّ خیالہ   شفی قربہ التبریح او نقع الصدیٰ
اذا انتزعتہ من یدیّ انتباھۃ   حسبت حبیبا راح منی او غدا
ولم ار مثلینا ولا مثل شاننا   نعذّب ایقاظا و ننعم ھجدا

جب نیند میں مجھے اس کا خیال آتا ہے تو اس کا یہ قرب تمام تکلیفوں کو دور کر دیتا اور پیاس کو تسکین بخش دیتا ہے پھر جب بیداری اسے میرے ہاتھوں سے چھین لے جاتی ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ محبوب میرے پاس سے چلا گیا۔ میں نے اپنی اور اپنے محبوب کی اس قسم کی حالت اور کہیں نہیں دیکھی کہ ہم بیداری میں تو عذاب میں مبتلا رہتے ہیں اور نیند میں بڑے خوش حال اور مگن۔

متنبی

(پیدائش ۳۰۳ھ وفات ۳۵۴ھ)

پیدائش اور حالات زندگی:۔ ابو طیب احمد بن حسین متنبی کوفہ میں نادار والدین کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کوفہ میں بہشتی کا کام کرتا تھا۔ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ اس کا باپ دیہات سے نکل کر شہری زندگی گذارنے کے لیے وہاں سے سفر کر کے شام میں منتقل ہو گیا۔ وہ اپنے بچے کو مدارس میں بھیجتا رہا اور مختلف قبائل میں اس کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ہونہار بچہ کے آثار و قرائن بتا رہے تھے کہ یہ

فاضل بنے گا اور کامیاب زندگی گذارے گا جب باپ کی وفات ہوئی تو وہ جوانی میں قدم رکھ رہا تھا اور علوم لغت و ادب سے خاص دلچسپی پیدا کر چکا تھا، چنانچہ اب وہ روزی کمانے اور مجد و سروری سے ہمکنار ہونے کے لیے سفر کرنے لگا۔

بچپن ہی سے متنبی سبک روح، عالی ہمت، بلند حوصلہ اور مجد و سروری کی طرف مائل تھا۔ بڑا بننے ہی کا شوق تھا جس نے اسے نوجوانی اور ناتجربہ کاری کی عمر میں لوگوں سے اپنی خلافت کی بیعت پر ابھارا[1] اور بیعت کا معاملہ پورا ہوا ہی چاہتا تھا کہ علاقہ کے گورنر کو اس سازش کی اطلاع مل گئی اور اس نے اسے قید کرنے کا حکم دے دیا۔ جیل خانہ سے اس نے گورنر کو ایک قصیدہ بھیجا جس میں کہتا ہے:-

امالك رقي ومن شأنه	هبات اللجين وعتق العبيد
دعوتك عند انقطاع الرجا	ء والموت مني كحبل الوريد
دعوتك لما براني البلى	واوهن رجلي ثقل الحديد
تعجل في وجوب الحدود	وحدي قبل وجوب السجود

اے میرے آقا! جس کا کام ہی دولت بخشنا اور غلاموں کو آزاد کرنا ہے، میں آپ سے امید منقطع ہو چکنے اور اپنا گلا موت کے ہاتھ میں پہنچ جانے کے وقت مدد کی درخواست کرتا ہوں، اس وقت میں آپ سے مدد کا خواہاں ہوں جب کہ میری حالت خستہ ہو چکی ہے اور میری ٹانگوں کو بیڑیوں کے بوجھ نے کمزور کر دیا ہے، ابھی سے مجھ پر حدود قائم کی جا رہی ہیں حالانکہ ابھی تو مجھ پر نماز بھی فرض نہیں ہوئی ہے۔

چنانچہ گورنر نے اسے رہا کر دیا لیکن تمنائے سروری اس کے دل و دماغ میں اس طرح سما چکی تھی کہ جوانی ختم ہو جانے کے بعد بھی اس نے شام میں نبوت کا دعویٰ کر ڈالا۔ اور اپنی جادو بیانی، تیز ادبی قوت سے کام لے کر لوگوں کی اچھی خاصی تعداد کو اپنا مرید بنا لیا اور جب اس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کیا گیا تو اس نے کہا "آپ ہی نے تو میری آمد کی بشارت دی تھی اور فرمایا تھا کہ "لا نبی بعدی"، یعنی میرے بعد "لا" نامی شخص نبی ہوگا اور میرا نام آسمان میں "لا" ہے۔" اس نے قرآن کے مقابلہ میں اپنا کچھ کلام بھی پیش کیا تھا۔ جب اس کا یہ دعویٰ مشہور ہوا تو اخشید یہ کے نائب امیر حمص نے اسے گرفتار کر لیا اور اسے توبہ کرنے پر اس وقت رہا کیا جب اس کے مریدین کا حلقہ ٹوٹ گیا۔ پھر وہ اپنی بلند آرزوؤں سے بھی دور کے سفر کرنے لگا اور ان سفروں میں اس کے پاس صبر و ثبات، عزم و ہمت کے سوا اور کوئی زاد راہ نہ ہوتا جیسا کہ اس کے متعدد اشعار سے معلوم ہوتا ہے مثلاً:-

---

[1] الیتیمۃ جلد اول صفحہ ۷۹۔

وحيدا من الخلان في كل بلدة
اذا عظم المطلوب قل المساعد

وہ ہر شہر میں دوستوں کے بغیر تن تنہا ہے۔ جب مقصود عظیم ہوتا ہے تو مددگار کم ہو جاتے ہیں۔

نیز:-

ضاق صدري وطال في طلب الرز ق قيامي و قل عنه قعودي
ابدا اقطع البلاد ونجمي في نحوس و همتي في سعود

میں دل برداشتہ ہو گیا ہوں، طلب معاش میں ہر دم مارا مارا پھرتا رہتا ہوں اور اس طرف سے مجھے طمانیت نہیں ملتی، سدا ایک ملک سے دوسرے ملک کا قصد کرتا رہتا ہوں میرے تارے نحوست میں ہوتے ہیں لیکن میری ہمت سعادت میں رہتی ہے۔

وہ اسی طور سے ادھر اُدھر پھرتا رہا تا آنکہ سیف الدولہ کی طرف سے انطاکیہ میں مقرر کیے ہوئے گورنر ابو العشائر سے اس کا تعلق ہو گیا، اس نے اس کی مدح بھی کی، چنانچہ گورنر نے اس کی عزت افزائی کی، اسے سیف الدولہ کے حضور پیش کیا، اس کے سامنے متنبی اور اس کے شعر و ادب کی صلاحیتوں کا تعارف کرایا اور اس کا بلند مقام بتایا، چنانچہ حاکم نے اسے اپنے مقربین میں شامل کر لیا اور اس کا بڑا احترام کیا۔ اسے جنگ اور شہسوازی کی تربیت کے لیے متعلقہ ماہرین فن کے پاس بھیجا تا کہ وہ امن و جنگ میں اسے اپنے ہی ساتھ رکھے اور کسی وقت بھی جدا نہ کرے۔ ساتھ ہی اسے خوب آسودہ اور مالا مال کر دیا، حتیٰ کہ وہ خود کہتا ہے:-

تركت السرى خلفي لمن قل ماله وانعلت افراسي بنعماك عسجدا
وقيدت نفسي في هواك محبة ومن وجد الاحسان قيدا تقيدا

میں نے راتوں کا سفر اپنے پیچھے ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جن کے پاس مال کی کمی ہے اور میں نے تیرے انعامات و احسانات کی وجہ سے اپنے گھوڑوں کو سونے کی نعلیں لگوالیں اور میں نے تیرے لطف و کرم کی وجہ سے اپنے آپ کو تیری محبت میں محصور و مقید کر دیا اور جو بھی احسان کو بیڑی کی صورت میں پاتا ہے وہ قید ہو جاتا ہے۔

الغرض وہ اس کے ساتھ نہایت اطمینان و آسودگی سے زندگی گذار رہا تھا کہ کسی وجہ سے ان کے درمیان رنجش پیدا ہو گئی اور وہ ۳۴۶ھ میں اس سے جدا ہو کر مصر چلا گیا۔ وہاں کافور اخشیدی اور ابو شجاع کی مدح کرتا رہا اور ایک زمانہ تک کافور کی نظر عنایت کا منتظر رہا کہ وہ اسے کسی بڑے منصب پر فائز کر دے لیکن تا کجے؟ آخر اسے کہنا ہی پڑا:-

ابا المسك! هل في الكاس فضل أناله فاني اغني منذ حين و تشرب

اے ابو المسک! (یہ کافور کی کنیت ہے) کیا جام میں کچھ میرے لیے بھی بچے گا؟ میں مدتوں

سے گا رہا ہوں اور آپ پیٹھ پھیرے چلے جا رہے ہیں ؟

ایک موقع پر اس نے کہا تھا :

وهل نافعي ان ترفع الحجب بيننا و دون الذي املت منك حجاب
وفي النفس حاجات وفيك فطانة سكوتي بيان عندها و خطاب

ہمارے درمیان کے حجابات دور ہو جانے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا جب کہ وہ امید جو میں آپ سے لگائے بیٹھا ہوں ابھی تک آپ سے پردہ میں ہے میرے دل کے ارمان دل ہی میں ہیں اور آپ ان سے خوب واقف ہیں کیوں کہ آپ میں اندرونی حالات بھانپنے کی صلاحیت ہے نیز خود میری خاموشی زبان حال سے اس قلبی کیفیت کو کھول کر بیان کر رہی ہے۔

اس کی اس قسم کی طنزیہ شاعری، تعلی اور شوق امارت سے کافور کو اس کی طرف سے خطرہ لاحق ہو گیا اور وہ اس سے روگردانی کرنے لگا۔ اس پر متنبی نے اس کی ہجو کہہ ڈالی اور بغداد کا رخ کر لیا۔ چونکہ وہ بالعموم بادشاہوں سے کم درجہ کے لوگوں کی مدح کہنا کسر شان خیال کرتا تھا اس لیے وزیر مہلبی کی اس نے مدح نہ کی جس سے مہلبی نے برا مانا اور انتقاماً بغداد کے شاعروں کو اس کے پیچھے لگا دیا جنہوں نے اس کی اور اس کی شاعری کی خوب گت بنائی۔ لیکن متنبی ان کے منہ نہ لگا اور فضل بن عمید سے ملاقات کرنے کے لیے ارجان روانہ ہو گیا، صاحب بن عباد وزیر نے اس خیال سے کہ وہ اس کی مدح کرے گا اسے اصبہان آنے کی دعوت دی لیکن وہ اسے خطرہ میں نہ لایا اور عضد الدولہ سے ملنے کے لیے شیراز کا قصد کر لیا، اس پر صاحب اس سے جل گیا اور غصہ میں اس کے کلام کی خامیاں نکالنے اور اس پر نکتہ چینی کرنے لگا حالانکہ وہی اس کے محاسن کو سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔ چنانچہ صاحب اور اس کے ساتھیوں نے اس کے خلاف محاذ قائم کر کے اس کے خلاف قلمی جنگ برپا کر دی، اس پر سرقۂ مضامین اور ادب عربی کے اسالیب سے بغاوت کا الزام لگایا، لیکن خود اعتمادی اور اپنی شاعری پر ناز ہونے کی وجہ سے متنبی نے ان ناقدین میں سے کسی کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔

جب وہ عضد الدولہ کے دربار میں پہنچا تو اس نے اپنے بھرپور احسانات و اکرامات سے اسے نوازا۔ اسے تین ہزار دینار، گھوڑے، خلعت اور انعام بخشا، پھر اپنے کسی آدمی کے ذریعہ چپکے سے اس سے دریافت کرایا کہ یہ بخشش و انعام گراں قدر ہے یا سیف الدولہ کا ؟ متنبی نے کہا "یہ نہایت گراں قدر اور عظیم تر ہے لیکن اس میں کچھ تکلف ہے اور سیف الدولہ کی بخشش جوش دروں کا نتیجہ تھی" اس جواب سے عضد الدولہ اس سے غصہ ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس نے بنی ضبہ کے کچھ لوگوں کو فاتک اسدی کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ متنبی کو مار ڈالیں، چنانچہ بغداد کے علاقہ صافیہ میں وہ ایک دوسرے کے بالمقابل آئے اور جنگ ہونے لگی۔ جب متنبی نے اپنی کمزوری اور شکست کا اندازہ لگا لیا تو بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے غلام نے اس سے کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں

"بھگوڑے" کہلاؤ حالانکہ تم نے یہ شعر کہا ہے:-

الخیل واللیل والبیداء تعرفنی　　　والسیف والرمح والقرطاس والقلم

گھوڑوں کے دستے، رات اور لق و دق صحرا، نیز تلوار، نیزہ، کاغذ اور قلم سب مجھے جانتے پہچانتے ہیں۔

چنانچہ وہ جنگ کرتا رہا تا آنکہ وہ بھی قتل ہو گیا اور اس کے ساتھ اس کا لڑکا اور غلام بھی مارے گئے۔ یہ ۳۵۴ھ اواخر رمضان کا واقعہ ہے۔

اس کی شاعری:- متنبی معنی آفریں شاعروں میں سے ہے۔ اس نے شاعری و فلسفہ کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا اور اپنی بیشتر توجہ معنی پر صرف کی۔ اس نے شاعری کو ان بندشوں سے رہائی دی جن میں ابو تمام اور اس کے ہمنواؤں نے اسے قید کر دیا تھا۔ اس نے عربی شاعری کو مخصوص قدیم عربی ڈگر سے نکالا۔ یہی عربی شاعری میں رومانی طرز انشاء (جس میں تخیل و جذبات کا زور ہوتا ہے اور نفس مضمون کو الفاظ و طرز ادا پر ترجیح دی جاتی ہے) کا قائد ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں حکم و امثال کو جگہ دی۔ جنگ کے وصف میں جدت طرازی، عرب کی دیہاتی عورتوں سے تشبیب، حسن تشبیہ، ایک شعر میں دو ضرب المثل لے آنا، حسن گریز، مدح کا انوکھا انداز، پھبتی ہوئی ہجو اس کی شاعری کی خصوصیات ہیں اور سب سے زیادہ جو چیز متنبی کو نمایاں اور ممتاز کرتی ہے وہ ہے شاعری میں اس کی شخصیت کا ابھر آنا، اس کا صدق ایمان و پختگی رائے، اس کی خودی و خود اعتمادی نیز نفسیات، لوگوں کے مشاغل، دلی خواہشات و جذبات، حقائق کائنات، اور مقاصد حیات کی صحیح عکاسی اور پوری ترجمانی اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اس کی شاعری ہر زمانے کے ادیب کے لیے مددگار اور خطیب کے لیے معاون بنی رہی۔

اس کی شاعری کے عیوب:- کبھی کبھی متنبی کی شاعری میں مضمون و معنی تنگ، اور اسے سمجھنا دشوار، ہو جاتا ہے۔ الفاظ سے بے توجہی کی بنا پر اس کی عبارت میں خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً بھونڈے الفاظ، معنوی تعقید، غریب و نامانوس الفاظ کا استعمال مطلع بے ڈول، قیاس کی مخالفت، شاعری کے مضمون میں تفاوت، مبالغہ میں حد سے تجاوز کر کے اسے ناممکن حد تک پہنچا دینا، مثلاً:-

ولا الضعف حتی یبلغ الضعف ضعفہ　　　ولا ضعف ضعف الضعف بل مثلہ الف

یا جیسے اس کا شعر ہے:-

انی یکون ابا البرایا آدم　　　وابوک والثقلان انت محمد

کہنا یہ چاہتا ہے کہ انی یکون آدم ابا البرایا وابوک محمد وانت الثقلان یعنی آدم کیونکر انسانوں کا جد اعلیٰ ہو سکتا ہے، حالانکہ آپ کا باپ محمد ہے اور آپ ثقلان ہیں۔ یا جیسے ایک جگہ وہ کہتا ہے:-

لو لم تکن من ذا الوری الذ منك هو　　عقمت بمولد نسلها حواء

یعنی اے ممدوح اس دنیا میں جس کا وجود ہی تیری ذات سے ہے اگر تو نہ ہوتا تو مائی حوا بانجھ ہو جاتیں اور ان کے کوئی اولاد نہ ہوتی۔

اس قسم کے پر تعقید شعروں کی مثالیں ہمیں ہمارے موضوع سے دور لے جائے گی لہذا جسے ان چیزوں کے معلوم کرنے کا شوق ہو وہ ثعالبی کی تصنیف "یتیمۃ الدہر" دیکھے۔

اس کی شاعری کا نمونہ: زمانہ کا شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

لم یترك الدهر من قلبی ولا کبدی　　شیئاً تتیمه عین ولا جید

یا ساقیی أخمر فی کؤوسکما　　ام فی کؤوسکما هم و تسهید

أصخرة أنا ؟ مالی لا تغیرنی　　هذی المدام ولا تلك الأغانید

اذا اردت کمیت الخمر صافیة　　وجدتها وحبیب النفس مفقود

ماذا لقیت من الدنیا واعجبها　　انّی بما انا باك منه محسود

زمانہ نے میرے دل و جگر میں ایسی چیز باقی نہیں چھوڑی جسے (معشوق کی) نگاہ یا گردن مسحور کر سکے۔ ساقیو! تمہارے جام میں شراب ہے یا اس میں غم و فکر اور بے خوابی ہی بھری ہے؟ کیا میں پتھر ہوں؟ آخر کیا ہے کہ یہ شراب اور یہ نغمے مجھ میں تغیر پیدا نہیں کرتے؟ جب میں ارغوانی صاف شراب کی تمنا کرتا ہوں تو وہ مجھے مل جاتی ہے مگر دوسری طرف (اس کا جوڑ) محبوب مفقود ہوتا ہے۔ مجھے اس دنیا سے ملا ہی کیا ہے؟ لیکن سب سے زیادہ حیرت و تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ جو مجھے ملا ہے اس میں تو نالاں اور بیزار ہوں لیکن لوگ ہیں کہ میری اس حالت پر بھی مجھ سے حسد کرتے ہیں۔

فلسفیانہ شاعری کرتے ہوئے کہتا ہے:

نحن بنو الموت فما بالنا　　نعاف مالا بدّ من شربه

تبخل ایدینا بأرواحنا　　علی زمان هنّ من کسبه

فهذه الأرواح من جوّه　　وهذه الأجسام من تربه

لو فکر العاشق فی منتهی　　حسن الذی یسبیه لم یسبه

لم یُرَ قرنُ الشمس فی شرقه　　فشکّت الأنفس فی غربه

یموت راعی الضأن فی جهله　　میتة جالینوس فی طبّه

وربما زاد علی عمره　　وزاد فی الأمن علی سربه

وغایة المفرط فی سلمه　　کغایة المفرط فی حربه

ہم موت کے بیٹے ہیں (یعنی اس کے "تابع ہیں) پھر آخر کیا سبب ہے کہ ہم اس چیز کو پینے سے گریز کرتے ہیں جس سے کوئی مفر ہی نہیں ہے ؛ ہمارے ہاتھ زمانہ کو اپنی روحیں دینے میں بخل کرتے ہیں حالانکہ ہماری روحیں زمانہ کی کمائی ہیں یہ روحیں تو زمانہ کی فضاسے آتی ہیں اور یہ اجسام اسی زمانہ کی مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اگر عاشق کبھی اس حسن کے انجام پر غور کرلے جس نے اسے بے داموں خرید لیا ہے تو وہ کبھی اس طرح بے خود نہ ہو جاتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ جب سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہوا نظر آئے تو کسی کو اس کے غروب ہونے میں شک ہوا ہو بھیڑ بکریوں کو چرانے والا اپنی لاعلمی و جہالت کے باوجود اسی طرح موت سے ہمکنار ہوتا ہے جس طرح جالینوس اپنی تمام طبی معلومات کے باوجود مرگیا۔ بلکہ کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ زیادہ زندہ رہتا ہے۔ اور اپنے گھر بار کو زیادہ عافیت سے رکھتا ہے۔ اپنی حفاظت و احتیاط میں انتہائی کوشش کرنے والے کا بھی وہی انجام ہوتا ہے جو اپنے آپ کو بے دھڑک جنگ میں ڈال لینے والے کا۔

ایضاً:-

نصیبک فی حیاتک من حبیب ۔۔۔ نصیبک فی منامک من خیال

رمانی الدهر بالأرزاء حتی ۔۔۔ فؤادی فی اغشاء من نبال

فصرت اذا أصابتنی سهام ۔۔۔ تکسرت النصال علی النصال

فهان فما أبالی بالرزایا ۔۔۔ لأنی ما انتفعت بأن أبالی

تمہاری زندگی میں تمہیں محبوب سے جو حصہ ملتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے خواب میں خیال سے معاملہ۔ مجھ پر زمانہ نے اس قدر آفتیں ڈھائی ہیں کہ میرا دل تیروں سے اٹا پڑا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ جب مجھے تیر لگتے ہیں تو گویا وہ تیر تیروں پر ہی لگ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور اب مشکلات میرے لیے آسان ہوگئیں کہ میں ان کو درخور اعتناء نہیں سمجھتا، اس لیے کہ میں نے ان کی پروا کرکے ان سے کوئی فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔

ایضاً:-

صحب الناس قبلنا ذا الزمانا ۔۔۔ وعناهم من امره ما عنانا

وتولوا بغصة کلهم منه ۔۔۔ وان سر بعضهم احیانا

ربما تحسن الصنیع لیالیه ۔۔۔ ولکن تکدر الاحسانا

وکأننا لم یرض فینا بریب الدهر ۔۔۔ حتی اعانه من اعانا

کلما انبت الزمان قناة ۔۔۔ رکب المرء فی القناة سنانا

ومراد النفوس اصغر من أن ۔۔۔ نتعادی فیه وأن نتفانی

غیر ان الفتی یلاقی المنایا ۔۔۔ کالحات ولا یلاقی الهوانا

ولو ان الحیوة تبقی لحی ۔۔۔ لعددنا اضلنا الشجعانا

و اذا لم یکن من الموت بدّ فمن العجز ان نموت جبانا

ہم سے پہلے بھی لوگ اس زمانہ میں رہے ہیں اور اس کی جو چیزیں ہمارے لیے باعث کوفت ہیں انہیں بھی پریشان کرتی رہی ہیں۔ وہ سب اس سے غصہ ہو کر ہی واپس گئے ہیں گو کبھی کبھی اس نے کسی کو خوش بھی کیا ہے، کبھی اس کی راتیں کوئی بھلائی اور احسان بھی کرجاتی ہیں مگر جلد ہی وہ کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صرف زمانہ کی گردشوں پر ہی راضی نہیں بلکہ اس کی مصیبتوں میں اور اضافہ کرنے کے لیے ہم میں سے بعض اس کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی زمانہ کوئی بانس اگاتا ہے تو انسان اس کے اوپر ایک آہنی پھل کا اضافہ کرکے اسے نیزہ بنا ڈالتا ہے۔ انسانوں کے دلوں کی خواہشات اور ان کے تقاضے اس سے بہت ہی حقیر و کمتر ہیں کہ ہم ان میں ایک دوسرے سے دشمنی کریں اور لڑتے مرتے رہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ انسان بھیانک موتوں کا سامنا کر لیتا ہے لیکن ذلت کا سامنا نہیں کرتا۔ اور اگر کسی زندہ کے لیے زندگی ہمیشہ رہ جاتی تو ہم بہادروں کو سب سے زیادہ نامعقول و گمراہ شخص تصور کرتے۔ اور جبکہ ... موت سے کوئی مفر ہی نہیں ہے تو یہ نہایت عاجزی ہو گی کہ ہم بزدلی سے جان دیں۔

ایضاً:-

زوّدینا من حسن وجہك مادا م فحسن الوجوہ حال تحول

وصلینا نصلك فی ھذہ الدنیـــــا فان المقام فیھا قلیل

جب تک تیرے چہرے میں حسن رہے ہمیں اس حسن سے فیض پہنچاتی رہ کہ یہ حسن سدا باقی نہیں رہے گا، اور ہم سے اس دنیا میں میل جول اور راہ و رسم باقی رکھ کہ ہماری یہاں اقامت تھوڑی ہی ہے۔

ابو فراس ہمدانی

(پیدائش ۳۲۰ھ وفات ۳۵۷ھ)

پیدائش اور حالات زندگی:- یہ سیف الدولہ کا چچازاد بھائی ابو الحارث بن ابو العلاء ہے، منبج پیدا ہوا۔ حکومت کے ٹھاٹ اور شاہانہ عزت میں نہایت آسودگی سے پرورش پائی۔ چنانچہ بڑے آدمیوں کی طرح وہ بھی بہادر و خوددار، سلیم الطبع اور کریم الاخلاق ہو گیا۔ وہ تلوار اور قلم دونوں کا دھنی تھا۔ سیف الدولہ اس کی ان خوبیوں کی وجہ سے اس کو بہت پسند کرتا تھا اور اپنی ساری قوم پر اسے ترجیح دیتا تھا۔ اس نے اسے اپنا خاص آدمی بنا لیا تھا۔ جنگوں میں اسے اپنے ساتھ رکھتا، اہم کاموں میں اسے اپنا

نمائندہ بناتا۔ الغرض وہ سیف الدولہ کے تاج کا گوہر یکتا تھا جو جنگ کے زمانہ میں اس کے لشکروں کی قیادت کرتا .... اور امن کے زمانہ میں اس کے دفاتر کا سربراہ ہوتا۔ وہ جس مہم میں شریک ہوتا فتحیاب و مظفر واپس آتا۔ چنانچہ عوام میں اس نے ہر دلعزیزی حاصل کر لی اور گھر گھر میں اس کا چرچا عام ہو گیا، وہ شاعری بھی کرتا۔ فخر و حماسہ اور جنگوں کے وصف میں اس کی شاعری نہایت عمدہ ہوتی۔ بالآخر اس کی قسمت گردش میں آئی اور رومیوں نے اسے ایک جنگ میں قید کر لیا۔ جس میں وہ زخمی ہو گیا اور ایک تیر کا پھل اس کی ران میں پھنسا رہ گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے خرشنہ میں قید کر دیا۔ پھر اسے وہاں سے قسطنطنیہ میں منتقل کر دیا۔ اسیروں کے باہمی تبادلہ کا معاملہ مشکل ہو جانے کی وجہ سے اسے چار سال تک قید میں رہنا پڑا۔ اسی زمانہ میں اس نے وہ شاعری کی جو "رومیات" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ جو اہل و عیال، دوست احباب کی محبت اور وطن کی یاد کے جذبات سے سرشار، اپنی بوڑھی ماں اور اکلوتی پیاری بیٹی کے سوز اشتیاق کی ترجمانی اور سیف الدولہ کی محبت سے بھرپور ہے۔ الغرض ابو فراس لگاتار قید کی تلخیاں اور محبت کی بے چینیاں برداشت کرتا رہا تا آنکہ صلح اور قیدیوں کا مسئلہ سامنے آیا اور رومیوں نے اسے اعزاز و احترام کے ساتھ رہا کر دیا۔

لیکن ابھی فصاحت و بیان کا چاند اپنے گہن سے نکلا ہی تھا اور جنگ کا شیر اپنی قید سے رہا ہی ہوا تھا کہ موت نے سیف الدولہ کو آن لیا اور اسے اتنا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے اچھے دن پھر سے دیکھتا۔ سیف الدولہ کے بعد اس کا بیٹا ابو المعالی، ابو فراس کا بھانجا تخت نشین ہوا۔ ابو فراس نے اپنے لیے حمص کا علاقہ چاہا تو ابو المعالی نے اس کے مطالبہ کو منظور نہ کیا۔ نتیجتاً دونوں میں لڑائی ہوئی جس میں ابو فراس مارا گیا، اور وہ ابھی جوان سال ہی تھا۔

اس کے اخلاق و عادات:۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا، ابو فراس بہادر، خود دار، سخی، اپنی شاعری اور اپنے نفس کو پسند کرنے والا تھا۔ اسے اپنے خاندان اور اپنی قوم پر بڑا فخر تھا، اور ان کی تعریف و مدح میں رطب اللسان رہتا۔ شراب نوشی اور ہنسی مذاق سے وہ طبعاً متنفر تھا، یہی سبب ہے ان چیزوں کے اثر سے اس کی شاعری پاک صاف ہے اور اس میں اس کے اخلاق کا اثر نمایاں ہے، وہ کہتا ہے:۔

لئن خلق الأنام لحسو كأس ۔۔۔ و مزمار و طنبور و عود

فلم يخلق بنو حمدان الا ۔۔۔ لمجد او لبأس او لجود

اگر لوگ شراب نوشی اور گانے بجانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تو بنو حمدان تو سرف مجد و سروری، حرب و ضرب اور جود و سخا کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

اس کی شاعری:- ابو فراس کی شاعری متانت و اسلوب کے لحاظ سے قدیم شاعری کے طرز پر تھی۔ تاہم اس میں اس کی طبیعت کا رنگ، ذہانت کی جھلک اور شاہانہ عزت و شوکت نمایاں ہے، اور یہ وہ چیزیں ہیں جو اس سے پہلے ابن معتز کی شاعری کے علاوہ کہیں نہ ملتیں۔ صاحب بن عباد کہا کرتے تھے" شاعری بادشاہ سے شروع ہوئی اور بادشاہ ہی پر ختم ہوئی" یعنی امرؤ القیس سے شروع ہو کر ابو فراس پر ختم ہو گئی۔ اس نے شاعری کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی، اور نہایت عمدگی سے عہدہ برآ ہوا۔ البتہ فخر و عتاب و استعطاف وموضوع ہیں جن میں اس کا مقام نہایت بلند ہے۔ اس کی شاعری کا "رومیات" والا حصہ نہایت قابل قدر اور اس کی فضیلت علمی پر دال ہے۔ اس کی جیسی شخصیت کے لیے یہ شایان شان نہ تھا کہ وہ کسی امیر کی مدح کرتا، یا کسی چھوٹے آدمی کی ہجو کرتا، یا اپنی شاعری کو شراب و بدمستی کے ذکر سے آلودہ کرتا ہمیں یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ وہ کس ماحول میں پلا تھا۔ اس کی عشقیہ شاعری، پرسوز اور رقت سے لبریز تھی جس میں محبت کی بادشاہی کے آگے اس کا شاہی جلال بے بس نظر آتا ہے۔ اس طرح اس کی شاعری کی یہ صنف نہایت حسین اور پر جلال ہو گئی ہے۔ ثعالبی کا دعوی ہے کہ متنبی اس کی فضیلت کا قائل تھا، چنانچہ وہ اس سے مقابلہ کی جرأت نہ کرتا تھا، اور اس کی دھاک کی وجہ سے اس نے ابو فراس کی مدح نہیں کی، حالانکہ دوسرے آل حمدان کی اس نے مدح کی تھی، لیکن ہمارے خیال میں یہ دعوی اس قابل نہیں کہ اس کی صحت پر دل مطمئن ہو جائے بلکہ جو متنبی کے مزاج سے واقف ہے وہ تو ایسی بات کہہ بھی نہیں سکتا۔

اس کی شاعری کا نمونہ:- قسطنطینیہ کی جیل میں جب اس نے اپنے پاس کے کسی درخت پر قمری کو نوحہ کناں پایا تو کہا:۔

اقول وقد ناحت بقربي حمامة ۔۔۔ ایا جارتا لو تشعرين بحالی
معاذ الهوی ما ذقت طارقة النوی ۔۔۔ ولا خطرت منك الهموم ببال
ایا جارتا ما انصف الدهر بیننا ۔۔۔ تعالی اقاسمك الهموم تعالی
تعالی تری روحا لدیّ ضعیفة ۔۔۔ تردّد فی جسم یعذّب بالی
أیضحك مأسور وتبكی طلیقة ۔۔۔ ویسکت محزون ویندب سالی
أیحمل محزون الفؤاد قوادم ۔۔۔ علی غصن نائی المسافة عالی؟
لقد کنت اولی منك بالدمع مقلةً ۔۔۔ ولکن دمعی فی الحوادث غالی

جب میرے قریب مجھے قمری کے نوحہ کرنے کی آواز آئی تو میں نے کہا "اے میری پڑوسن! کاش تجھے میری حالت کی خبر ہوتی۔ کہاں تو کہاں محبت کی دلسوزیاں، نہ تجھے فراق کی لذت معلوم، نہ تیرے دل میں تفکرات و ہموم کا ہجوم۔ اے پڑوسن! زمانہ نے ہمارے

درمیان انصاف نہیں کیا، آ ہم آپس میں ایک دوسرے کی ٹکڑیں بانٹ لیں، آجا، تجھے میرے اندر کمزور روح نظر آئے گی جو عذاب میں پڑے ہوئے نحیف و نزار جسم میں مضطرب ہے۔ کیا اونچی اور دور دراز کی شاخ پر آزادی سے بیٹھا ہوا پرند، جس کے پاس اڑنے کے لیے پر بھی ہیں، دل میں غم لیے بیٹھا رہے گا اور غموں سے خالی نوحہ کناں ؟ میری آنکھ تجھ سے زیادہ آنسو بہانے کی حقدار ہے، لیکن حادثات میں میرے آنسو مہنگے ہو جاتے ہیں۔

سیف الدولہ سے استعطاف (نظر کرم کی درخواست) کرتے ہوئے۔ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے :-

بمن یثق الانسان فیما ینوبه ۔۔۔ ومن این للحرّ الکریم صحاب؟
وقد صار ھذا الناس الا اقلھم ۔۔۔ ذئابا علی اجسادھن ثیاب
تغابیت عن قوم فظنوا غباوۃ ۔۔۔ بمفرق اغبانا حصی و تراب
الی اللہ اشکو اننا بمنازل ۔۔۔ تحکم فی اسادھن کلاب
تمر اللیالی لیس للنفع موضع ۔۔۔ لدیّ ولا للمعتفین جناب
ولا شدّ لی سرج علی متن سابح ۔۔۔ ولا ضربت لی بالعراء قباب
ستذکر ایامی نمیر و عامر ۔۔۔ و کعب علی علاتها و کلاب
انا الجار لا زادی بطیٔ علیهم ۔۔۔ ولا دون مالی فی الحوادث باب

حوادثات زمانہ میں انسان کس پر بھروسہ کرے اور ایک شریف آدمی کو ساتھی کیوں کر دستیاب ہوں ؟ بہت تھوڑے لوگوں کے سوا تمام کے تمام انسان لباس پہنے ہوئے بھیڑیے ہیں۔ میں نے بعض لوگوں سے تغافل برتا اور قصداً انہیں درخور اعتناء نہ سمجھا تو وہ یہ سمجھنے لگے کہ میرا یہ عمل فی الحقیقت غباوت و جہالت پر مبنی ہے۔ ہم میں سے جو زیادہ کم فہم ہو اس کے سر پر مٹی اور کنکریاں پڑیں۔ میں خدا ہی سے شکوہ کرتا ہوں، ہم وہاں ہیں جہاں شیروں پر کتے فرمانروائی کرتے ہیں۔ زمانہ گذر رہا ہے اور میرے پاس نہ نفع کی کوئی جگہ ہے نہ بخشش چاہنے والوں کے جمع ہونے کے لیے کوئی مقام ہے۔ نہ میرے لیے صبا رفتار گھوڑے کی پشت پر زین کسی گئی اور نہ کھلے میدان میں میرے لیے خیمے نصب کیے گئے۔ میرے زمانہ کو باوجود خامیوں کے قبیلہ نمیر و عامر اور کعب و کلاب یاد رکھیں گے۔ میں ایسا پڑوسی ہوں کہ میرا توشہ لوگوں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگاتا اور نہ حوادث پیش آنے پر میرے مال تک پہنچنے کے لیے لوگوں کی راہ میں دروازہ حائل ہوتا ہے۔

اسی قصیدہ میں کہتا ہے :-

وما ذلت ارضی بالقلیل محبة ۔۔۔ لدیه وما دون الکثیر حجاب
کذالک الوداد المحض لا یرتجی له ۔۔۔ ثواب ولا یخشی علیه عقاب

وقد كنت أخشى الهجر والشمل جامع — وفي كل يوم لقية وخطاب
فكيف وفيما بيننا مُلك قيصر — وللبحر حولي زخرة وعباب
أمن بعد بذل النفس فيما تريده — أثاب بمُرِّ العتب حين أثاب
فليتك تحلو والحياة مريرة — وليتك ترضى والانام غضاب!
وليت الذي بيني وبينك عامر — وبيني وبين العالمين خراب
اذا صحّ منك الودّ فالكلّ هيّن — وكلّ الذي فوق التراب تراب

اور میں ہمیشہ از راہ محبت اس سے تھوڑی چیز پر قناعت کر لیتا تھا حالانکہ زیادہ چیز بھی مجھ سے بچا کر نہیں رکھی جاتی تھی۔ پرخلوص اور بے لوث محبت ایسی ہی ہوتی ہے کہ اس میں نہ کسی بدلہ کی تمنا ہوتی ہے نہ کسی سزا کا خوف غالب رہتا ہے۔ میں تو اس زمانہ میں فراق سے ڈرتا تھا جب کہ ہم مل کر رہتے تھے اور ہر روز ملاقات اور بات چیت ہوتی تھی، تو اب میرے ڈر کا کیا حال ہو گا جب کہ ہمارے درمیان قیصر کا ملک حائل ہے اور میرے ارد گرد سمندر کی موجیں متلاطم ہیں؟ کیا تیری مرضی کے کام میں اپنی جان کی بازی لگا دینے کے بعد مجھے اس قسم کے تلخ عتاب کا بدلہ دے دیا جائے گا؟ کاش تو مجھ سے خوش ہوتا اور زندگی چاہے مجھ سے بگڑ جاتی . . . . اور کاش تو مجھ سے راضی ہوتا خواہ تمام مخلوق مجھ سے غصہ رہتی، اور کاش میرے اور آپ کے درمیان باہمی تعلقات استوار و شگفتہ ہوتے خواہ اس کے بعد سارے جہاں سے میرے تعلقات کشیدہ ہوتے۔ جب تجھ سے محبت برقرار ہے تو پھر ہر مرحلہ اس کے بعد آسان ہے اور جو کچھ بھی مٹی کے اوپر ہے وہ مٹی ہی ہے۔

ابو العلاء المعری

(پیدائش ۳۶۳ھ۔ وفات ۴۴۹ھ)

اس کی پیدائش اور حالات زندگی۔ پورا نام احمد بن عبد اللہ بن سلیمان تنوخی (یہ نسبت تنوخ نامی یمنی قبیلہ کی طرف ہے)

یہ نجیب الطرفین حکیم و فلسفی معرہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جید عالم اور دادا معرہ کا قاضی تھا۔ ابھی چار برس کا ہی تھا کہ چیچک کا حملہ ہوا جس سے بائیں آنکھ جاتی رہی اور داہنی آنکھ میں بھی جالا پڑ گیا، اور اندھے پن کی حالت میں بڑھا۔ رنگوں میں سے وہ صرف سرخ رنگ کو پہچانتا تھا۔ بیماری کی حالت میں اسے سرخ لباس پہنایا گیا تھا۔ چنانچہ یہی وہ رنگ تھا جسے اس نے سب سے پہلے پہچانا اور سب سے آخر میں دیکھا۔ جب وہ پڑھنے کے قابل ہوا تو اس کے باپ

نے اسے عربی زبان سکھانی شروع کی چنانچہ وہ اسے خوب سیکھ گیا۔ بعد ازاں اپنے علاقے کے متعدد علماء کی شاگردی کی اور ان کے علوم پر اس قدر حاوی ہو گیا کہ اسے علاقہ میں اپنے سے زیادہ عالم اور صاحب فہم کوئی نہ مل سکا ابھی وہ تقریباً بیس برس کا تھا کہ اپنے گھر واپس آ گیا اور طلبہ کو عربی زبان اور عربی ادب کی تعلیم دینے لگا۔ اور خود زبان کی باریکیوں اور ترکیبی خواص میں بحث و تحقیق کرنے لگا۔ حتیٰ کہ اس موضوع پر وہ سب سے بازی لے گیا اور کوئی اس کا حریف نہ رہا۔ ۳۹۲ھ میں اس نے معرہ سے شام کا سفر کیا طرابلس کا کتب خانہ دیکھا، لاذقیہ کا قصد کیا اور وہاں راہبوں کے دیر میں رہ کر اس کے علماء سے عہد نامہ قدیم و جدید پڑھا۔ پھر ملک شام کا دورہ کر چکنے کے بعد بغداد کا قصد کیا جو اس زمانہ میں علوم کا مرکز اور علما کا مستقر تھا۔ وہ وہاں یونانی حکمت اور ہندوستانی فلسفہ سیکھنا چاہتا تھا۔ جونہی بغدادیوں کو اس کی آمد کی خبر ملی وہ اس سے علمی و ادبی استفادہ کے لیے اس پر ٹوٹ پڑے۔ چنانچہ دوران اقامت بغداد میں وہ ان تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھاتا رہا اور خود تحصیل فلسفہ میں کوشاں رہا تا آنکہ اس میں بڑا کمال حاصل کر لیا۔ ابو العلاء المعری نے یہاں موزوں ماحول اور زرخیز زمین پائی۔ چنانچہ اس نے اہم مسائل کی بحث و تحقیق اور اپنی فکری کاوشوں کی ترویج شروع کر دی۔ اور اس کے افکار و آراء لوگوں میں پھیلنے لگے اور اس کی شہرت ہونے لگی۔ وہاں اس کا تعلق آزاد فلسفیوں کی ایک جماعت سے ہو گیا جو ہر جمعہ اپنے ایک رفیق ابو احمد عبد السلام بن حسن بصری کے مکان پر اجتماع کرتے تھے۔ اس جماعت کی صحبت نے اس کی عقلی و ادبی صلاحیتوں پر بڑا اثر ڈالا۔ ابھی بغدادیوں سے وہ پوری طرح ربط و ضبط استوار نہ کر سکا تھا کہ وطن سے اچانک اسے اس کی ماں کے مرنے کی اطلاع پہنچی۔ باپ تو اس کا پہلے ہی وفات پا چکا تھا۔ اس دردناک خبر سے اسے بڑا صدمہ پہنچا اور وہ بہت رنجیدہ رہنے لگا۔ حکام اور لوگوں ایک طبقہ اس کے عقیدہ کی طرف سے شک کرتے اور اس کے شاکی تھے۔ چنانچہ اس کی زندگی ناخوشگوار اور حالات ناقابل اطمینان ہو گئے۔ اسے مشفق دوست اور ہمدرد نہ مل سکے اور وہ مجبور ہو گیا کہ اس دنیا کو سیاہ عینک سے دیکھے اور سمجھ لے کہ اس جہان میں آلام ہی آلام ہیں چنانچہ اس نے گوشہ نشینی اور ترک دنیا کو اپنا لیا۔ ۴۰۰ھ میں وہ معرہ واپس پہنچ گیا اور طلبہ کے علاوہ تمام لوگوں سے اجتناب کر لیا۔ اس نے اپنے آپ کو "دو قیدوں میں محبوس" کا خطاب دے دیا ایک قید تو اندھا پن اور دوسری خانہ نشینی، پھر اس نے اپنی زندگی تدریس و تالیف میں وقف کر دی اور دنیا کی تمام دلچسپیوں کو خیر باد کہہ دیا۔ نہ وہ کسی جانور کا گوشت کھاتا نہ جانوروں سے پیدا ہونے والی چیزیں۔ ترکاری کے لیے اس نے مسور کی دال اور مٹھائی کے طور پر انجیر کو اس نے منتخب کر لیا۔ خرچ کے لیے اس نے اس تیس دینار سالانہ پر اکتفا کر لیا جو اس کے لیے وقف کیے گئے تھے۔ وہ کھدر کی پوشاک استعمال کرتا اور چٹائی بچھاتا۔ اپنی اولاد کو انسانوں کی بے وفائی اور کمینگی سے محفوظ رکھنے نیز زندگی کی شقاوتوں اور بدمزگیوں سے بچانے کے لیے اس نے یہ حل سوچا کہ شادی ہی

نہ کی جائے۔ چنانچہ ۴۴۹ھ تک اور یہی وہ سال ہے جس میں اسے موت آئی اس نے بے شادی کیے زندگی گذار دی۔ اور اپنی قبر پر مندرجۂ ذیل شعر کندہ کرنے کی وصیت کر دی:۔

هذا جناه ابي علىّ و ما جنيت على احد

یہ میرے باپ نے میرے اوپر جرم کیا ہے لیکن میں نے کسی پر جرم نہیں کیا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی قبر پر تقریباً ایک سو اسی شعرا موجود تھے جن میں فقہاء محدثین اور صوفیاء تھے۔

اس کی خدا داد صلاحیتیں، اخلاق و عادات اور عقیدہ:۔

جیسا کہ خود اپنے متعلق بتاتے ہوئے ابو العلاء نے کہا تھا وہ انسانوں میں تو پیدا ہوا تھا لیکن طبعاً آدم بیزار تھا۔ وہ نرم دل، سخی، وفا کیش، اپنی خواہشات نفس کو مارنے والا لوگوں سے بدگمان، اور ان کی طرف سے نہایت درجہ محتاط، قوی الحافظہ اور سریع الحفظ تھا۔ اس سلسلہ میں اس کے متعلق حیرت انگیز واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ خواہ کسی زبان کو جانتا یا نہ جانتا، کسی عبارت کو سمجھتا یا نہ سمجھتا، وہ اسے حفظ کر لیتا اور محض ایک بار سن کر اسے یاد کر لیتا تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں اس نے شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ آنکھوں سے معذوری کے باوجود وہ عمدہ تشبیہ دیتا، اور آنکھوں والوں کے ساتھ ان کے مختلف کھیلوں میں شریک ہوتا۔ نرد اور شطرنج کا وہ اچھا کھلاڑی تھا۔ سنجیدہ و مزاحیہ موضوعات میں سے ہر موضوع پر اس نے قلم اٹھایا ہے۔

اس کے عقیدہ کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ برہمنیت کا ہمنوا اور ہند و فلسفہ کا قائل ہونے کی وجہ سے ملحد ہے۔ دوسروں کا خیال ہے کہ صوفیاء کے کلام کی طرح اس کی شاعری بھی دو رخ رکھتی تھی ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کے کلام میں جو گمراہ کن اشعار ہیں وہ اس کے دشمنوں نے اس میں ملا دیے ہیں۔ بیشتر لوگوں کا رجحان اس طرف ہے کہ وہ شکی تھا اور غیر یقینی عقائد رکھتا تھا۔ ایک ہی عقیدہ کا کبھی اقرار کرتا تھا اور کبھی انکار اور یہی سبب ہے کہ اس کی شاعری مجموعہ تضاد ہے[1]

---

[1] مثلاً ایک جگہ وہ کہتا ہے:۔

عجبت لكسرى و أشياعه — وغسل الوجوه ببول البقر
و قول النصارى اله يضام — و يظلم حياً ولا ينتصر
و قول اليهود اله يحب — رشاش الدماء وريح القتر
و قوم اتوا من اقاصي البلا — د لرمي الجمار ولثم الحجر
فوا عجبا من مقالاتهم — ايعمى عن الحق كل البشر؟

مجھے کسریٰ اور اس کے ہمنواؤں پر حیرت ہوتی کہ گائے کے پیشاب سے منہ دھوتے (باقی حاشیہ صفحہ ۴۲۰ پر)

اس کی شاعری:- ابو العلاء کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ عہد شباب کی شاعری جو "سقط الزند" میں ہے اور دور کہولت کی شاعری جو "لزومیات" میں یکجا ہے۔ جوانی کی شاعری میں مبالغہ کی کثرت ہے، طرز بیان تقلیدی ہے اور اس میں آورد اور تکلف پایا جاتا ہے، اس کے دور کے کلام میں اس نے متنبی کی تقلید کی ہے اور بیشتر معانی اس سے اخذ کیے ہیں۔ زبان کے قواعد و اصول کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور اپنے ہم عصر شعراء سے بدیع میں مقابلہ کیا ہے، لیکن اس میں غریب الفاظ کا استعمال ہے اور علمی اصطلاحات کی کثرت ہے، شاعری کی بیشتر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۹ کا) ہیں۔ نیز مجھے نصاریٰ کے اس قول پر تعجب ہوتا ہے کہ معبود کو مغلوب کیا جا سکتا ہے اور اسے زندہ پر ظلم کیا جاسکتا ہے اور وہ اپنی مدافعت نہیں کرسکتا نہ اپنے سے ظلم کو روک سکتا ہے۔ میرے لیے یہودیوں کا یہ عقیدہ بھی باعث استعجاب ہے کہ خدا خون کی ہولی اور خوشبو کی دھونی پسند کرتا ہے۔ نیز دور دراز کے ملکوں سے رمی جمار اور حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے آنے والی قوم (مسلمانوں) کا عمل بھی میرے لیے تعجب خیز ہے۔ ان کی یہ باتیں کس قدر حیرت انگیز ہیں! آخر کیا بات ہے کہ حق تمام انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا ہے؟

دوسری جگہ وہ کہتا ہے:-

هفت الحنيفة والنصارى ماهتدت ... ويهود حارت والمجوس مضلله

اثنان اهل الارض: ذو عقل بلا ... دين وآخر دين لا عقل له

دین حنیفی کے قائل لغزش کھا گئے، عیسائی راہ راست پر نہ رہے، یہودی بھٹک گئے اور مجوسی گمراہ ہو گئے۔ اس زمین پر بسنے والوں کی دو قسمیں ہیں، ایک عقل والے جو بے دین ہیں دوسرے دین دار جو بے عقل ہیں۔

ایک اور مقام پر وہ کہتا ہے:-

ضحكنا وكان الضحك منا سفاهة ... وحق لسكان البرية ان يبكوا

تحطمنا الايام حتى كاننا ... زجاج ولكن لا يعاد له سبك

ہم ہنستے ہیں لیکن ہماری ہنسی حماقت کی بنا پر ہوتی ہے، حالانکہ اس دنیا کے رہنے والوں کو دراصل رونا چاہیے۔ زمانہ ہمیں اس طرح چکنا چور کر دیتا ہے جیسے ہم شیشے ہوں اور شیشے بھی ایسے کہ ان کو پگھلا کر پھر جوڑا نہ جاسکے۔

بایں ہمہ وہ یہ بھی کہتا ہے:-

خلق الناس للبقاء فضلت ... امة يحسبونهم للنفاد

انما ينقلون من دار اعما ... ل الى دار شقوة او رشاد

انسان بقاء کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ لوگ جو انہیں فناء کے لیے خیال کرتے ہیں گمراہ ہیں۔ وہ تو دار اعمال سے یا تو جنت کی طرف منتقل کیے جائیں گے یا جہنم کی طرف۔

اصناف پر طبع آزمائی کی گئی ہے، البتہ خمریات، عشقیات، شکار اور ہجو سے یہ کلام خالی ہے۔ اس دور کی شاعری میں مرثیہ، مدح اور فخر میں اس کے قصائد بھی ہیں۔

دور کہولت کی شاعری میں مبالغہ و تکلف کم ہو گیا، وہ عرب کے متقدمین شعراء کے طریقہ پر شعر کہتا ہے۔ جس میں پر شوکت اور وزنی الفاظ، بدویانہ اسلوب، مشکل قافیوں کا انتخاب، غیر ضروری پابندیوں کا التزام، سختی سے قیاس کی پابندی، بدیع و تجنیس کی کثرت، پائے جاتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں اس نے اپنے فلسفہ اور اپنی آراء کو جگہ دے دی ہے لیکن اس انداز سے کہ اس میں غریب الفاظ اور مشکل تراکیب کی بھرمار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ان فکری نتائج کے کھلے بندوں اظہار کرنے میں اسے لوگوں کے شر سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا لہذا انہیں الفاظ کے کانٹوں سے گھیر دیا تاکہ آسانی سے ان تک ہر کس و ناکس کی رسائی نہ ہو سکے۔ اپنی شاعری میں اس نے جانوروں کے مکالمہ کی جدت بھی کی ہے مثلاً مرغ و کبوتر کی گفتگو، بھیڑیے اور بکری کا مناظرہ۔ متنبی کے بعد یہ سب سے بڑا حکیم شاعر ہے۔ لیکن دقت خیال نیز انواع فلسفہ، اجتماعی مسائل، اخلاقیات، نظامہائے حکومت، قوانین و ادیان کو شاعری میں جگہ دینے کی وجہ سے وہ متنبی سے بھی ممتاز، اور اس راہ میں اپنی قسم کا ایک ہی شاعر ہے۔

اس کی نثر: شاعری کی طرح ابو العلاء کی نثر بھی دور شباب میں دور کہولت سے مختلف تھی۔ جوانی میں اس کی نثر میں مبالغہ کی کثرت، غریب الفاظ کی بھرمار، تکلف، سجع بندی کا التزام، اور علمی اصطلاحات کی فراوانی تھی۔ بعد میں اس نے نثر میں اپنا فلسفہ بیان کرنا شروع کیا تو اس میں مبالغہ آرائی کم ہو گئی۔ جملوں میں سیلاب معانی امنڈ پڑا، بایں ہمہ اس کی تحریر میں دماغ کو پریشان کرنے والا، غموض، اور دل کو اکتا دینے والی تطویل، ضرور ہوتی ہے۔ بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کسی دوست کو خط لکھنے بیٹھتا ہے اور وہ خط بڑھتے بڑھتے ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں مختلف قسم کے مسائل پر مفید بحثیں آجاتی ہیں۔

تصانیف: اس کی بیشتر تصانیف صلیبی جنگوں کی تباہیوں میں تلف ہو گئیں صرف سقط الزند، لزومیات، درعیات، مجموعہ مکاتیب، رسالۃ الملائکہ، رسالۃ الغفران (جو ڈانٹے[1] کی ڈیوائن کامیڈی اور ملٹن[2] کی "جنت گم گشتہ" سے بہت زیادہ مشابہ ہے) بچ گئیں، رسالۃ الغفران

---

[1] ڈانٹے اطالوی شاعری کا مایۂ ناز شاعر اور "الوہیاتی نغمہ" کا مصنف ہے، یہ ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۳۲۱ء میں اس نے وفات پائی۔

[2] ملٹن مشہور انگریز شاعر ہے، کرمویل کا سیکریٹری تھا اس کی وفات کے بعد پریشان حالی کا شکار ہو کر گمنام اور بالآخر آنکھوں سے معذور ہو گیا، اس نے اپنا شہرۂ آفاق "دیوان فردوس" "گم گشتہ" اپنی بیوی اور بیٹی کو املاء کرایا، اس کی یہ تصنیف انگریزی شاعری کا ایک ستون ہے اور انسانی خیال آفرینی کا نادر نمونہ۔ ۱۶۰۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۷۴ء میں انتقال ہوا۔

ہیں وہ عالم تخیل میں ایک ایسے آدمی کو پیش کرتا ہے۔ جو آسمان میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں جو کچھ دیکھتا ہے اسے بیان کرتا ہے۔ اس کتاب میں اس نے نہایت عمدگی اور ڈرامائی انداز میں شعراء راویان شعر، ادبا، نحویوں پر تنقید کی ہے۔ اس کی تصنیف کتاب الایک والغصون جو سو جلدوں پر مشتمل، اور علوم و ادب میں انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی تھی، ناپید ہے۔ اسی طرح شرح دیوان متنبی جس کا نام "معجز احمد" تھا اور عبث الولید" کے نام سے شرح دیوان بحتری، "ذکری حبیب" کے نام سے شرح دیوان ابو تمام وغیرہ۔

اس کی شاعری کا نمونہ:- رعیت پر حکام کے ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہتا ہے:-

مُلّ المقام فکم اعاشر امۃ   امرت بغیر صلاحہا امراؤھا

ظلموا الرعیۃ واستجاز و کیدھا   وعدوا مصالحہا وھم اجراؤھا

میں تو ان میں اقامت کرنے سے اکتا گیا ہوں، کہاں تک ایسی قوم کے ساتھ رہن سہن جاری رکھوں جن کے حکام ایسے احکام جاری کریں جو عوام کے مفاد کے خلاف ہوتے ہوں۔ رعیت پر ظلم کے پہاڑ ڈھاتے رہیں اور اس کے ساتھ چالیں چلنا روا سمجھیں، اور باوجود رعیت کے نوکر اور تنخواہ دار ملازم ہونے کے ان کے مصالح سے تجاوز کرتے رہیں؟

قسمت کی ستم ظریفیاں اور زندگی کے اوہام بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:-

تبارکت! انہار البلاد سوائح   بعذب وخصت بالملوحۃ زمزم

ھو الحظ، عیر البید ساف بأنفہ   خزامی وانف العود بالذل یخزم

توھمت خیراً فی الزمان واھلہ   وکان خیالا لا یصح التوھم

فما النور نوار، ولا الفجر جدول   ولا الشمس دینار ولا البدر درھم

اے مولا تیری ذات بڑی بابرکت ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ دنیا کی نہریں تو شیریں پانی کو لے کر بہ رہی ہیں اور زمزم ہی کو خاص طور پر کھاری بنا دیا گیا؟ یہ قسمت کے ہی کرشمے ہیں کہ جنگلی گدھا خزامی (ایک نہایت خوشبودار پودے) پر اپنی ناک مار رہا ہے اور بیچارے اونٹ کی ناک میں ذلت سے نکیل پڑی ہوئی ہے۔ مجھے وہم ہوا تھا کہ زمانہ اور اہل زمانہ میں خیر ہے لیکن اس کا وہم کرنا بھی صحیح نہیں یہ محض خیال ہی ہے۔ (یہاں جن چیزوں کو ایک دوسری سے تشبیہ دی جاتی ہے وہ بھی صحیح نہیں) نہ نور نوار (پھول) ہے نہ فجر کوئی نالہ ہے، نہ سورج دینار ہے، اور نہ چاند درہم ہے۔

اپنے ایک مرثیہ میں وہ کہتا ہے:-

صاح! ھذہ قبورنا تملأ الرحب   فأین القبور من عھد عاد؟

خفف الوطء ما اظن ادیم الأرض   الا من ھذہ الاجساد

و تبیج بنا و ان بعد العهد   ھوان الاباء و الاجداد
سر ان استطعت فی الھواء رویدا   لا اختیالا علی رفات العباد
رُب لحد قد صار لحد مرارا   ضاحکا من تزاحم الاضداد
ناسال الفرقدین عمن احستا   من قبیل و انسا من بلاد.
کم اقاما علی زوال نھار   و انادا لمدلج فی سواد
تعب کلھا الحیاۃ فما اعجب اِلّا من راغب فی ازدیاد
ان حزنا فی ساعۃ الموت اضعا   ف سرور فی ساعۃ المیلاد

میرے رفیق! یہ ہماری قبریں ہی اس قدر ہیں کہ انہوں نے وسیع زمین کو بھر دیا ہے تو آخر عاد تک کے زمانہ کی تمام قبریں کہاں ہیں؟ ذرہ زمین پر آہستہ قدم رکھو، میرا تو خیال یہ ہے کہ تمام زمین انہی جسموں سے بنی ہوئی ہے، اور ہمارے لیے یہ کس قدر نازیبا ہوگا کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کا احترام نہ کریں خواہ ہمارے اور ان کے درمیان طویل مدت ہی کیوں نہ گذر چکی ہو۔ اگر تجھ سے ممکن ہو سکے تو ہوا میں آہستہ چل، اور بندوں کی بوسیدہ ہڈیوں پر اکڑتے ہوئے نہ چل، یہاں بہت سی ایسی قبریں ہوں گی۔ فرقدین سے ان قبائل اور ملکوں کے متعلق دریافت کروں جنہیں انہوں نے دیکھا پھر ان سے پوچھو کہ وہ دن ختم ہونے پر کتنے عرصہ ٹھہرے اور انہوں نے کتنے عرصہ رات کی تاریکی میں چلنے والوں کو روشنی دکھائی۔ یہ زندگی تمام کوفت اور تھکن ہے اور مجھے یہاں سوائے اس شخص کے جو اس میں زیادتی کا خواہاں ہوتا ہے کسی پر تعجب نہیں ہوتا۔ دم مرگ جو غم ہوتا ہے وہ پیدائش کے وقت کی خوشی سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔

دیندار ریاکاروں اور زاہدوں کے متعلق کہتا ہے:۔

روید لک قد غررت وانت حر   بصاحب حیلۃ یعظ النساء
یحرم فیکم الصہباء صبحا   ویشربھا علی عمد مساء
یقول لکم غدوت بلا کساء   وفی لذاتھا رھن الکساء
اذا فعل الفتی ما عنہ ینھی   فمن جھتین لا جھۃ اساء

ذرا سنبھلو! تم تو شریف اور سمجھ دار آدمی ہو اور تم اس چالباز آدمی کے قریب میں آگئے ہو جو عورتوں کو پند و نصیحت کرتا ہے۔ وہ صبح کو تمہارے درمیان بیٹھ کر شراب حرام بتاتا ہے اور شام کو وہ اسے عمداً پی جاتا ہے۔ وہ تم سے کہتا ہے کہ میرے پاس اوڑھنے کو کپڑا نہیں ہے حالانکہ اپنی عیاشیوں میں اس نے کمبل گروی رکھ دیا ہے۔ جب ایک آدمی وہی کچھ کرنے لگے جس سے وہ دوسروں کو منع کرتا ہے تو وہ ایک اعتبار سے نہیں بلکہ دو اعتبار سے برا کرتا ہے۔

ایضاً:۔

یحسن مرأی لنبی ادم و کلهم فی الذوق لا یعذاب
ما فیهم برّ ولا ناسك الا الی نفع له یجذاب
افضل من افضلهم صخرة لا تظلم الناس ولا تکذاب

انسان دیکھنے میں بڑا بھلا نظر آتا ہے، لیکن آزمانے پر سب اچھے نہیں ثابت ہوتے۔ ان میں جو سب سے افضل و برگزیدہ ہے اس سے بھی چٹان زیادہ برتر و برگزیدہ ہے کہ وہ نہ جھوٹ بولتی ہے نہ لوگوں کا حق مارتی ہے اور نہ ان پر ظلم کرتی ہے۔

ایضاً:-

خف دنیاً کما تخاف سریّاً صال لیث الشری بظفرو ناب
والصلال التی تخاف رداها شرها فی الرؤس والاذناب

جس طرح سردار سے ڈرتے ہو رذیل سے بھی ڈرتے رہو اس لیے کہ شیر (جو جنگل کا سردار ہے) پنجوں (رذیل اعضاء) اور نکیلے دانتوں (بالائی اعضاء) سے حملہ کرتا ہے۔ موذی جانور جن کی تباہ کاریوں سے تم ڈرتے ہو ان کے مضرت رساں اعضاء یا تو ان کے سر میں ہوتے ہیں یا ان کی دموں میں۔

عجبی للطبیب یلحد فی الخا لق من بعد درسه التشریحا
ربّ روح کطائر القفس المسـ ـجون ترجو بموتها التسریحا

مجھے ڈاکٹر اور طبیب کے علوم تشریح کا مطالعہ کر لینے کے بعد خالق کے بارے میں الحاد کرنے میں تعجب ہوتا ہے۔ بعض روحیں پنجرہ کے قیدی پرندوں کی طرح موت کے ذریعہ اپنی رہائی کی آرزومند رہتی ہیں۔

اندلس کے شعرا اور ان کی شاعری

قریشی عقاب سفاح کے دام سے نکل کر اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان بچانے کے لیے اندلس جانکلا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہاں یمنی اور مصری باہم لڑ رہے تھے۔ اور ملک آس لگائے بیٹھا تھا کہ کوئی اس کے چاک رفو کرے، اس کے تن مردہ میں جان ڈال دے، اور افتراق کو اتحاد سے بدل دے۔ چنانچہ عبد الرحمن داخل ہی وہ امام منتظر اور مرد موعود تھا جس کی انہیں تلاش تھی، اور اس نے یمنیوں کی مدد سے ۱۳۸ھ میں وہاں کی سلطنت پر قبضہ کر لیا، اور اس طرح قرطبہ میں بنو امیہ کا وہ پرچم لہرا دیا جسے عباسیوں نے دمشق میں لپیٹ دیا تھا۔ اس سلطنت پر اس کے بعد دو سو چوراسی سال تک اس کی اولاد میں سے انیس خلفاء اس کے جانشین ہوئے، تا آنکہ انہیں امتوں کے مرض کہن نے آلیا، ان کا شیرازہ ابتر ہو گیا اور ملک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گیا جسے طوائف الملوکی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مثلاً قرطبہ میں بنی جہور، اشبیلیہ میں ابن عباد، بطلیوس میں

ابن اندلس۔

مغرب میں بنو امیہ کی سیاسی پالیسی، ان کی مشرقی سیاست سے مختلف تھی۔ مشرق میں وہ موالیوں سے غلط ملط کسرشان خیال کرتے، اور قومی عصبیت پر فخر کرتے تھے، لیکن یہاں وہ متمدن بن گئے تھے اور اپنی مفتوحہ قوم کے ساتھ گھل مل کر رہنے کے لیے ویسے ہی اسباب فراہم کرتے جیسے بنو العباس ایرانیوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ بغداد میں سامی اور آریائی اقوام کا امتزاج، عربی عقل کی پختگی اور ادبی تحریک کی ترقی، نیز اندلس میں ایسے اسلامی تمدن کا شباب پر پہنچنا جس کا مواد مشرقی تھا اور جس کے بانی مبانی عرب تھے[1] انہی باہمی ارتباط و اختلاط کا نتیجہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ پر جہالت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور وہ جہالت و ناخواندگی کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا سست رفتاری سے چل رہا تھا۔

چنانچہ ہسپانیوں نے عربی ثقافت کو اپنا لیا، عربوں کا دین اختیار کر لیا، ان کی زبان بولنے اور ان کے آداب سیکھنے لگے۔ انہوں نے لاطینی زبان اور اس کے ادب کو اس طرح چھوڑ دیا کہ وہ اسے بالکل بھول گئے۔ حتیٰ کہ قرطبہ کے ایک کاہن کو اس صورت حال کا شکوہ کرنا پڑا[2] لیکن پھر یہ سیلاب اس قدر تند و تیز ہو گیا کہ خود مسیحی دینی رہنما بھی اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے

---

[1] بغداد میں جو تمدن اسلامی ظہور پذیر ہوا تھا وہ ایرانیوں، سریانیوں اور ہندوؤں کا پیدا کیا ہوا تھا، اس لیے کہ عرب تو اس دور میں جہالت و بداوت کے وارث تھے، اور وہ لوگ حکومت، تمدن، فلسفہ و علم کے وارث تھے اور ان اقوام کا وہ تمام سرمایہ ان کے قبول اسلام کی وجہ سے اسلام کی ملکیت بن گیا۔

[2] اس کاہن کے الفاظ ہم مختصر طور پر ڈوزی کی کتاب "اسپین میں عربوں کی تاریخ" جلد دوم صفحہ ۱۰۳ سے بیان کرتے ہیں، وہ کہتا ہے:۔

ہم اب شعر و شاعری اور افسانے پڑھنے کے لیے عربی زبان پسند کرتے ہیں۔ دین و فلسفہ بھی عربی زبان میں سیکھتے ہیں۔ ہم اسی زبان کو فصیح و بلیغ اور شیریں سمجھتے ہیں، ہم میں بمشکل . . . . . کوئی ایسا شخص ہو گا جو لاطینی زبان میں مقدس کتابوں کا مطالعہ کر سکتا ہو۔ ہمارے تمام کے تمام ذہین نوجوان عربی زبان اور عربی ادب کے سوا دوسری زبان نہیں جانتے۔ اور جوں جوں عربی کتب و ادب کا مطالعہ کرتے جاتے ہیں وہ اس کے گرویدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے کسی لاطینی کتاب کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں، اس کے پڑھنے میں جتنی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے اتنا فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح مسیحیوں نے اپنی زبان اور اسے لکھنا پڑھنا بھلا دیا۔ عربی زبان کی نظم و نثر پر مہارت حاصل کر لی اور اسے عمدگی سے استعمال کرنے لگے، بلکہ کبھی وہ اس بارے میں خود عربوں سے بھی بازی لے جاتے ہیں

اور انہیں مجبور ہو کر اپنی دینی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنا پڑا۔

بایں ہمہ امویوں اور اندلسی عربوں کی نگاہیں برابر مشرق کی طرف لگی ہوئی تھیں، جہاں ان کا قومی، دینی، لغوی، ادبی اور تمدنی مرکز تھا اور وہ اس کی رہنمائی میں قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ وہاں کے علماء و وزراء سے مدد حاصل کر رہے تھے۔ وہ اپنے انتظامی امور و سیاست میں عباسیوں کی اقتداء کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسے اور یونیورسٹیاں بنائیں۔ پبلک لائبریریاں کھولیں، تصنیف و تالیف کی تحریک کو تیز گام کیا۔ ادبی سرگرمیاں جاری کیں۔ علوم و فنون کے مرتبہ کو بلند بالا کیا۔ مناظرے، قصہ گوئی، مشاعرے اور موسیقی کی مجلسیں منعقد کیں، اور عبدالرحمٰن ثانی کے عہد (۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ) میں اندلس ان چیزوں سے معتد بہ حصہ حاصل کر چکا تھا۔ پھر امیرالمومنین عبدالرحمٰن ثالث (۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ) اور اس کے بیٹے حکم کے عہد میں تو اندلس ہر قسم کی ترقی میں اوج کمال پر پہنچ چکا تھا اور یہی اس کا سنہری دور تھا جس میں اس کی قوت و شوکت، دولت و وحدت، تمدن و عمران، فن و ادب، اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں وہ تقریباً بغداد کا مقابلہ کر رہا تھا، اور اسی حیرت انگیز ترقی نے مشہور مورخ ڈوزی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا، حتی کہ وہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ حقیقت یہ ہے کہ عبدالرحمن ناصر بجائے قرون وسطی کا بادشاہ ہونے کے اس دور کا بادشاہ ہونے کا زیادہ مستحق ہے" اور اس طرح اسلامی تمدن بیک وقت بغداد و قرطبہ سے پھیل کر مشرق و مغرب کی تاریکیاں روشنی سے بدل رہا تھا۔ لیکن ہر کمال کو زوال ہے۔ ابھی حکم کی خلافت ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بنی مروان کی حکومت پر انحطاط و تنزل کے آثار نمودار ہونے لگے، اور ان کی مملکت طوائف الملوکی کا شکار ہو گئی جسے انہوں نے تھوڑا سہارا دیا۔ لیکن بدنظمی اور افتراق کی بیماری نے ان کے کاندھوں کو کمزور کر دیا بربری مرابطین ان کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور انہوں نے اس حکومت کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ ادھر فرنگیوں کی بار بار یلغار نے رفتہ رفتہ ایک ایک شہر ان کے ہاتھ سے چھین لیا تاآنکہ شکست مکمل ہو گئی، اور ابو عبداللہ محمد بن علی کے غرناطہ سے ۸۹۸ھ میں فرار کے بعد ہمہ گیر پیمانہ پر ملک چھوڑنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس کے بعد پھر جزیرہ اسپین نے کبھی عربی زبان اور عربوں کا دور نہ دیکھا۔

یہ ہے ہسپانیہ کے عربوں کا وہ مجمل سا تعارف جسے ہم وہاں کی شاعری اور شعراء کے بیان سے پہلے تمہیداً بیان کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ اس مقام پر ہمارا ارادہ یہ نہیں کہ ہم اندلسی شاعری کا مکمل تجزیہ اور تفصیلی مطالعہ کریں۔ ہم یہاں اس ضمن میں مختصر سی بحث کریں گے جس سے ان کی شاعری کے اسالیب واضح ہو سکیں گے اور شاعری پر ماحول و طبیعت کی جو تاثیر ہوتی ہے وہ ظاہر ہو گی۔

عرب کے شعراء نے یورپ کی رنگا رنگ زندگی میں وہ کچھ پایا جو انہیں ایشیا میں نہ ملا تھا۔ یہاں انہیں نت نئی فضائیں، مختلف مناظر، مسلسل بارشیں، حسین سرسبز مخملی زمینیں، گھنے سایہ دار درخت، لبریز بہتی دریائیں، زرخیز علاقے، ہرے بھرے پہاڑ، پربہار چراگاہیں ملیں جس نے ان کے

اذہان کو صفائی بخشی۔ ان کے وجدان کو بلند، اور ان کے بیان کو شیریں بنایا۔ چنانچہ انہوں نے ادب کے دائرہ میں وسعت پیدا کی۔ شاعری کو مہذب و شائستہ بنایا۔ اس کے الفاظ میں حسن، معانی میں نزاکت، قوافی میں تنوع، اور خیال میں نیرنگی پیدا کی، انہوں نے اسے گلدستہ کی طرح آراستہ اور نہر کی طرح رواں دواں کیا۔ انہوں نے ہلکی پھلکی بحروں میں اس قدر کثرت سے نظمیں کہیں کہ دامان عروض و قوافی تنگ ہو گیا۔ چنانچہ انہیں نزاکت طبع اور موسیقی کے روز افزوں تقاضوں سے مجبور ہو کر فصیح زبان میں شاعری کی ایک نئی قسم "موشح" ایجاد کرنا پڑی جو بعد میں ادبی انحطاط اور عربوں کے اضمحلال سے عوامی زبان میں پہنچ کر "زجل" کی شکل اختیار کر گئی۔

شاعری میں انہوں نے مختلف موضوع اختیار کیے مثلاً مدح، غزل، مرثیہ، دعا، زہد، تصوف، فلسفہ، ظرافت و مزاح۔ وہ شاعری میں اجتماعی مسائل بھی زیر بحث لائے۔ انہوں نے تاریخی واقعات کو بھی نظم کیا۔ نئی نئی چیزوں کا نئے نئے اسالیب سے وصف کیا۔ انہوں نے عمارات، مجسمے، مورتیاں، محلات، تالاب، حوض، فوارے، رہٹ، باغات، چراگاہیں، دریاؤں، درخت، ہواؤں مجالس طرب وغیرہ سب ہی کا وصف کر ڈالا اور نہایت خوبی کے ساتھ، جس میں لفظی حسن اور فنی کمال پوری طرح جلوہ گر ہے۔ بایں ہمہ ان کی شاعری مشرقی شاعری کے طرز پر چل رہی تھی اور اس نے سوائے موشح کی ایجاد اور قافیہ میں تنوع، کے جو ہم نے اوپر بیان کیا اور کسی قسم کی کوئی تبدیلی مشرقی شاعری میں نہ کی، نہ اس کی حدود سے تجاوز کیا۔ یہ اس لیے کہ اس شاعری کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ وہ اصل و سند اور حقیقی مرجع ہے۔

اگر بعض وجوہ کی بنا پر فرنگی ادباء کے اس قول میں کوئی صحت ہو کہ عربی شاعری محض لفظی تصنع کا نام ہے جس میں نہ کوئی عمدہ خیال ہے نہ شعور صادق کی ترجمانی[1] تو ان کا یہ قول ہرگز کسی طرح بھی اندلسی شاعری پر صادق نہیں آ سکتا۔ اندلسیوں نے اپنی شاعری اپنے جذبات کی ترجمانی اور اپنے احساسات کی عکاسی نہایت عمدہ الفاظ اور پرکشش اسلوب میں کی ہے۔ وہ اپنی شاعری کے مطالعہ کرنے والوں پر سوتے کے جاموں میں وہ سب کچھ پیش کرتے جو ان کی طبیعتیں چاہتی تھیں۔ جب وہ فطرت کے مناظر کا وصف کرتے ہیں یا زمین پر پھیلی ہوئی چیزوں کی عکاسی کرتے ہیں تو ان کی شاعری یورپ کی شاعری سے مشابہ ہوتی ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فرانسیسیوں اور اسپینیوں نے سائنس، موسیقی اور فن تعمیر کے علاوہ شاعری کی مختلف اصناف مثلاً مدح، ہجو، غزل، بھی اندلسیوں سے اخذ

---

[1] اگرچہ بعض یورپی مصنف اس خیال کو غلط سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ عربی شاعری رقت انگیز جذبات پر حاوی ہے، مردانہ جوہر، شرافت، حیا، اور قوی ایمان کی ترجمانی میں اپنی نظیر نہیں رکھتی، دیکھئے جوزف کا لمٹر کا مقدمہ جو اس نے واصف پاشا غالی کی کتاب "حدیقۃ الزہور" پر لکھا ہے۔

کی ہیں جس طرح انہوں نے قافیہ بھی انہی سے لیا ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے وہ اپنی شاعری میں صرف آخری حروف کی آواز ہم آہنگ ہونے پر اکتفاء کرتے تھے اور مابعد کے حروف کا کوئی خیال نہ رکھتے تھے[1]

اگر اندلسیوں کی تمدنی ترقی کا یہ دور کچھ عرصہ اور باقی رہ جاتا اور اس ترقی کا اثر ولغت وداب پر پڑتا رہتا تو یقیناً وہ روسو، ہوگو اور لومرٹین اور ان کی قسم کے ادیبوں سے بھی بلند تر مرتبہ کے ادیب پیدا کرتے، لیکن افسوس کہ جلد ہی ان میں افتراق، باہمی خلفشار اور بدنظمی رونما ہوگئی اور ان کی طبیعتیں پژمردہ ہوگئیں، عقلوں کا دیوالیہ نکل گیا، اور وہ نیست و نابود ہوگئے۔ خدا کا قانون اس قسم کے عمل کرنے والی قوم کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے، ولن تجد لسنة الله تبديلا۔

اندلسی شاعری کے نمونے

ابوالفضل بن شرف قیروانی کہتا ہے:۔

مطل الليل بوعد الفلق ... و تشكى النجم طول الارق

ضربت ريح الصبا مسك الدجى ... فاستفاد الروض طيب العبق

والاح الفجر خدا خجلاً ... جال من رشح الندى فى عرق

جاوز الليل الى انجمه ... فتساقطن سقوط الورق

واستفاض الصبح فيها فيضة ... ايقن النجم لها بالغرق

فانجلى ذاك السنا عن حلك ... وانمحى ذاك الدجى عن شفق

بابى بعد الكرى طيف سرى ... طارقاً عن سكن لم يطرق

زادنى والليل ناع سدفه ... وهو مطلوب بباقى الرمق

ودموع الطل تمريها الصبا ... وجفون الروض غرقى الحدق

فتأنى فى ازار ثابت ... وتثنى فى وشاح قلق

وتجلى وجهه عن شعره ... فتجلى فلق عن غسق

نهب الصبح دجى ليلة ... فحباها الخد بعض الشفق

---

[1] لوئیس ویار ڈوٹ نے اپنی تصنیف "اسپین میں عرب وبربر کی تاریخ" کی دوسری جلد میں لکھا ہے "فرانسیسی شاعری اسپینی شاعری کے طرز پر تھی جو عربی شاعری سے ماخوذ تھی، نہ کہ یونانی ورومانی سے۔ کیونکہ موخر الذکر ہردو شاعری سے چودھویں صدی سے قبل تعارف نہیں ہوا تھا کہ ان کے اسلوب کی تقلید کی جاتی ہم نے شاعری اور قافیہ سازی عربوں سے سیکھی ہے، اور یہ صنعت ہم تک مرسیلیا اور طولون کی راہ سے اسپینی تجار کے ذریعہ اسپین سے آئی ہے۔

سلبت عيناهُ حدى سيفه ۔۔ و تحلّى خداه بالرونق

رات نے صبح (کی آمد) کے وقت کو ٹالا اور ستاروں نے دیر تک بیداری پر شکوہ کیا۔ بادصبا تاریکی کے مشک سے ٹکرائی اور باغوں نے مہک حاصل کر لی۔ اور فجر نے اپنا شرمسار رخسار ظاہر کیا جو شبنم سے پسینہ پسینہ تھا۔ اس نے شب کے تاروں کو اپنی زد میں لے لیا اور وہ پتوں کی طرح یکے بعد دیگرے گرنے لگے۔ پھر صبح اپنے نور کے سیلاب کے ساتھ اس طرح چڑھ آئی کہ تاروں کو اس میں ڈوب جانے کا یقین ہو گیا، اس کی روشنی نے تاریکی کو چھانٹ دیا اور شفق کے رونما ہوتے ہی وہ تاریکی مٹ گئی۔ اس خواب میں آنے والے پر میں قربان جاؤں جو اس وقت آیا جبکہ رات اپنی تاریکی پر نالہ کر رہی تھی، حالانکہ وہ باقی ماندہ جان کے عوض بھی مطلوب ہے۔ اس وقت جبکہ بادصبا شبنم گرا رہی تھی اور باغات کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔ وہ چست انداز میں ملبوس خرام ناز کرتا اور ڈھیلی بدھی ڈالے جھومتا آیا، اس حسین چہرہ سیاہ بالوں پر اس طرح رونما ہو رہا تھا جیسے رات کی تاریکی میں پو پھٹتی ہے۔ صبح کی روشنی نے اس کی رات کی تاریکی کو لوٹ لیا تھا اور رخسار کو کچھ شفق کی سرخی دے دی تھی، اور اس کی آنکھوں نے اس کی تلوار کی دونوں دھاریں چھین لی تھیں اور اس کی آب و تاب رخساروں کی زینت ہو گئی تھی۔

ابن حمدیس صقلی دیر میں ایک شراب فروش راہبہ کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

و راهبة اغلقت ديرها ۔۔ و كنا مع الليل زوارها
هدانا اليها شذى قهوة ۔۔ تذايع لأنفك اسرارها
طرحنا بميزانها درهمى ۔۔ فاجرت من الدن دينارها
تفرّس فى شمّه طيبها ۔۔ مجيد الفراسة فاختارها
يغد لما شئت من قهوة ۔۔ سنيها و يعرف خمارها
وعدنا الى هالة اطلعت ۔۔ على قضب البان اقمارها
يرى ملك اللهو فيها الهموم ۔۔ تثور فيقتل ثوارها
وقد سكنت حركات الأسى ۔۔ قيان تحرك اوتارها
فهذى تعانق لى عودها ۔۔ و تلك تقبّل مزمارها
و راقصة لقطت رجلها ۔۔ حساب يد نقرت طارها
و قضب من الشمع مصفرة ۔۔ تريك من النار نوارها
كأن لها عمداً صففت ۔۔ و قد وزن العدل اقطارها

تا آنکہ وہ کہتا ہے:۔

ذكرت صقلية والاسى ۔۔ يهيج للنفس تذكارها

ومنزلة للتصابي خلت | وكان بنو الظرف عمارها
فان كنت اخرجت من جنة | فانى احدث اخبارها
ولولا ملوحة ماء البكا | ء حسبت دموعی انهارها

میں نے سلمٰی کو یاد کیا اور اس کی یاد دل میں رنج و غم کا طوفان بپا کر دیتی ہے۔ وہ ایک پر بہار مقام تھا جو خالی ہو گیا اور جسے زندہ دلوں نے آباد کیا تھا۔ اگر مجھے جنت سے نکال دیا گیا ہے تو میں اس کے حالات بیان کر رہا ہوں۔ اگر میرے آنسوؤں میں کھاری پن نہ ہوتا تو میں انہیں وہاں کی نہریں خیال کر لیتا۔

ابن ہانی کسی بڑے کھاؤ شخص کا وصف بیان کر رہا ہے:

یالیت شعری، اذا اومی الی فمه | احلقه لهوات ام میادین ؟
کانها وخبیث الزاد یضرمها | جهنم، قذفت فیها الشیاطین
تبارك الله ما امضی اسنته | کانما کل فك منه طاحون
کأن بیت سلاح فیه مختزن | مما اعدته للرسل الفراعین
این الاسنة ام این الصوارم ام | این الخناجر ام این السکاکین
کانما الجمل المشوی فی یده | ذوالنون فی الماء لما عضه النون
لف الجداء بایدیها وارجلها | کانما افترستهن السراحین
وغادر البط من مثنی و واحدة | کانما اختطفتهن الشواهین
یخفق الرز من قرن الی قدم | وللبلاعیم تطریب وتلحین
کانما کل رکن من طبائعه | نار، وفی کل عضو منه کانون!
کانما فی الحشا من حمل معدته | ترنفل وجوارش وکمون
توموا بنا فلقد ریعت خواطرنا | وجاذبتنا اعنتها البراذین
نصحتکم، فخذوا من شدته وزرا | اولا، فانتم سویق فیه مطحون

کاش مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ جب وہ اپنے منہ میں کسی چیز کو لے جاتا ہے تو اس کے حلق میں کئی کوے ہیں یا پھر وہاں میدان ہی میدان ہیں؟ جب اس میں دنیا بھر کا الم غلم وہ بھر لیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہنم ہے جس میں شیاطین ڈالے گئے ہیں۔ اللہ کی ذات با برکات ہے، کیا کہنے ہیں دانتوں کی تیزی کے، ہر جبڑا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چکی کا پاٹ ہے۔ جیسے اس کا منہ ہتھیاروں کا گودام ہو جس میں فرعونوں نے رسولوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے ہر قسم کا سامان جنگ جمع کر لیا ہے۔ نیزوں، تلواروں، خنجروں اور چھریوں کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ بھنا ہوا مسلم اونٹ اس کے ہاتھ میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو پانی میں ذوالنون (یونسؑ) کی تھی جب انہیں بڑی مچھلی نے لقمہ بنایا تھا۔ بکری کے ایک سالہ

بچوں کے ہاتھوں اور پیروں کو سمیٹ کر اس بری طرح کھاتا ہے جیسے انہیں بھیڑیوں نے چیر پھاڑ ڈالا ہو۔ بطخوں کو دو دو یا ایک ایک اس طرح اُڑاتا ہے جیسے انہیں شاہینوں نے جھپٹ لیا ہو۔ یوں تو سر سے لے کر پیر تک بدن کے ہر حصہ سے ہلکی ہلکی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں لیکن حلق سے جو سریلی آوازیں نکلتی ہیں ان کی مثال نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مزاج کی ہر غلط میں آگ ہے اور اس کے ہر عضو میں انگیٹھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیٹ میں لوگوں، مسالوں اور زیرہ کی معجون ہے۔ چلو یہاں سے اُٹھو، ہماری طبیعتیں گھبرا گئی ہیں اور ہمارے گھوڑوں نے چلنے کے لیے لگامیں کھینچنا شروع کر دی ہیں۔ میں نے تمہیں نصیحت کر دی ہے، اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اس کی باچھوں سے بچنے کے لیے پناہ گاہ بنا لو ورنہ یاد رکھو تم بھی اس میں پسے ہوئے ستو کی طرح بن جاؤ گے۔

اشبیلیہ کا حاکم معتمد بن عباد جس کی حکومت ابن تاشفین نے چھین کر اسے "اغمات" میں قید کر دیا تھا، جب اس قید کی حالت میں عید کے دن اس کی بیٹیاں پھٹے پرانے کپڑوں میں اس سے ملنے کے لیے پہنچیں تو اس نے یہ اشعار کہے:-

فیما مضی کنت بالاعیاد مسرورا　　فساءک العید فی اغمات مأسورا
تری بناتک فی الاطمار جائعة　　یغزلن للناس ما یملکن تطمیرا
یطأن فی الطین والاقدام حافیة　　کأنها لم تطأ مسکا و کافورا
افطرت فی العید لا عادت اساءته　　فکان فطرک للاکباد تفطیرا
قد کان دهرک ان تامره ممتثلاً　　فردّک الدهر منهیًّا ومأمورا
من بات بعدک فی ملک یسرّ به　　فانما بات بالاحلام مغرورا

ماضی میں تو عیدوں کو خوشی خوشی مناتا تھا لیکن آج اغمات کی قید میں تجھے عید کاٹے کھا رہی ہے تو اپنی بیٹیوں کے چیتھڑے پہنے اور انہیں بھوکا دیکھ رہا ہے۔ وہ لوگوں کے لیے سوت کاتتی ہیں اور پھوٹی کوڑی بھی ان کے پاس نہیں۔ وہ ننگے پاؤں کیچڑ میں پیر رکھ چلتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پاؤں نے کبھی مشک و کافور کو روندا ہی نہیں۔ تو نے عید میں افطار کیا۔ خدا کرے عید کی یہ تکلیف دوبارہ نہ آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عید فطر نے جگر کو پارہ پارہ کر دیا۔ ایک وہ بھی دور تھا جب زمانہ تیرے حکم کا تابع تھا اور آج زمانہ نے تجھے محکوم بنا کر بہت سی چیزوں سے تجھے محروم کر دیا ہے۔ تیری اس حالت کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی حکومت پر خوش ہوتا ہے تو وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے۔

ابن دراج قسطلی اپنے ایک قصیدہ اپنی بیوی اور چھوٹے بچے سے جدا ہونے کے منظر کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:-

ولما تدانت للوداع وقد هفا　　بصبری منه انّة و زفیر

تنا شدنی عهد المودۃ والھوی — وفی المھد مبغوم النداء صغیر
عییٌّ بمرجوع الجواب، ولفظه — بموقع اھواء النفوس خبیر
تبوأ ممنوع القلوب ومھدت — له اذرع محفوفة ونحور
وطار جناح البین بی وھفت بھا — جوانح من ذعر الفراق تطیر
ولو شاھدتنی والھواجر تلتظی — علی ورقراق السراب یمور
اسلط حرّالھاجرات اذا سطا — علی حرّ وجھی والاصیل ھجیر
واستنشق النکباء وھی لوافح — واسنوطئ الرمضاء وھی تفور
وللموت فی عین الجبان تلوّن — وللذعر فی سمع الجری صفیر
لبان لھا انی من البین جازع — وانّی علی مضّ الخطوب صبور

دم وداع میرے صبر کی وجہ سے اس کی آہ نکلی اور وہ ٹھنڈی سانس بھرنے لگی، وہ مجھے عشق ومحبت کے بیتے ہوئے دنوں کا واسطہ دلا رہی تھی اور گود میں غوغاں کرنے والا چھوٹا پیارا بچہ تھا جو جواب دینے سے تو معذور تھا لیکن اس کے منہ سے نکلنے والے (بے معنی) الفاظ دلوں کے اندر گھس جانے اور ان کو موہ لینے کی پوری قوت وکشش رکھتے تھے، جو دلوں کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جس میں کسی کو داخل ہونے نہیں دیا جاتا اور جس کے لیے ہاتھوں اور سینوں سے گود بنائی جاتی ہے۔ جدائی کا پرند مجھے لے کر تیزی سے اڑا اور اس (بیوی) کا دل جدائی کے خوف سے اڑنے لگا۔ اگر وہ مجھے اس حالت میں دیکھ لے — جب دوپہریوں کی تپتی ہوئی گرمی مجھ پر پڑتی ہے اور چمکتا سراب تپ کر مرتعش ہوتا ہے۔ جب اُن دوپہریوں کی گرمی جن کی شام بھی دوپہر ہوتی ہے میرے چہرے پر حملہ آور ہوتی ہے اور میں اسے مغلوب کرتا ہوں اور جب تند وتیز جھلسا دینے والی ہواؤں کو پھاڑتا چلا جاتا ہوں اور جب میں بلبلاتی ریت کو قدموں تلے روندتا چلا جاتا ہوں اور جب گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے موت سامنے نظر آتی ہے جسے دیکھ کر بزدل حواس باختہ ہو جاتا ہے اور بہادر کے کانوں میں بھی سیٹی سی بجنے لگتی ہے۔ تو اس (بیوی) پر یہ واضح ہو جائے گا کہ میں بھی جدائی کے صدمہ سے بے قرار ہوں اور یہ بھی کہ میں مشکلات ومصائب کو برداشت کرنے کی بڑی ہمت رکھتا ہوں۔

قید میں ابن زیدون وزیر نے یہ اشعار کہے:-

ما علی ظنی باس — یجرح الدھر ویاسو
ربما اشرف بالمرء — علی الآمال یاس
ولقد ینجیك اغفا — ل ویردیك احتراس
والمحاذیر سھام — والمقادیر قیاس
ولکم اجدی قعود — ولکم اکدی التماس

وکذا الحکم اذا ما ... عزّ ناس ذل ناس
و بنو الایام اخیا ... ف سراة و خساس
نلبس الدنیا، ولکن ... متعة ذاك اللباس
یا ابا حفص وما سا ... واك فی فهم ایاس
من سنا رأیك لی فی ... غسق الخطب اقتباس
لا یکن عهدك وردا ... ان عهدی لك اٰس
و أدر ذکری کأسا ... ما امتطت کفّك کأس
واغتنم صفو اللیالی ... انما العیش اختلاس
ما تری فی معشر حا ... لوا عن العهد و خاسوا؟
أذؤبٌ هامت بلحمی ... فانتهاب و انتهاس
کلهم یسال عن حا ... لی و للذئب اعتساس
ان قسا الدهر فلما ... ء من الصخر انبجاس
ولئن امسیت محبو ... سا فللغیث احتباس
و یفتّ المسك فی التر ... ب فیوطا ویداس

میرے گمان کے (سچ ہو جانے پر) کوئی مضائقہ نہیں۔ زمانہ کا یہی دستور ہے کہ کبھی وہ گھائل کرتا ہے اور کبھی زخم کا مداوا کرتا ہے۔ ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ انسان کی آرزوؤں پر یاس کی بدلی چھا جاتی ہے۔ اور کبھی لاپرواہی نجات کا باعث ہو جاتی ہے اور ہوشیاری و احتیاط تباہی و بربادی کا باعث۔ وہ خطرات جن سے ڈرا جاتا ہے نیر ہیں اور قضاء وقدر کے فیصلے تو اندازکے مطابق ہوتے ہیں۔

بسا اوقات بیٹھا رہنا سود مند ہوتا ہے اور جد و جہد ناکامی کا سبب ہو جاتا ہے۔ زمانہ کا یہی فیصلہ ہے کہ جب کچھ لوگ غالب ہوتے ہیں تو کچھ دوسرے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اہل زمانہ یکساں نہیں ہوتے کچھ بلند مرتبہ ہوتے ہیں اور کچھ کم مرتبہ۔ ہم دنیا کو اوڑھتے پہنتے ہیں لیکن یہ لباس تھوڑی مدت کا فائدہ ہے۔ اے ابوحفص! ایاس بھی تیری دانائی کا ہم پلہ نہیں ہے۔ مشکلات کی تاریکیوں میں تیری رائے مشورہ سے میں روشنی حاصل کرتا ہوں۔ تیرا عہد میرے لیے گلاب کی طرح نہ ہو (کہ گلاب کے پھول خاص فصل میں ہوتے ہیں) حالانکہ میرا عہد تیرے لیے اس (سدا بہار خوشبودار پودا ہوتا) ہے اور جب تک تمہارا ہاتھ جام کو اٹھانے کی قوت رکھے میری یاد کو جام کی طرح گھماتے رہنا۔ اور زمانہ کی سازگاری کو غنیمت شمار کرو اس لیے کہ زندگی ایک جھپک ہے اور جھپٹ لے وہی اس سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں جو عہد میں خیانت کریں اور قول و قرار کے پکے نہ ہوں تمہارا کیا خیال ہے؟ میرے گوشت پر

بھیڑیے پل پڑے ہیں اور اسے چھین جھپٹ رہے ہیں۔ سب میری حالت دریافت کرتے ہیں اور بھیڑیے بھی تو رات میں خاموشی سے شکار کی خبر لیتے ہیں۔ اگر زمانہ سخت ہو گیا ہے تو کیا ہوا پتھر میں سے بھی تو پانی پھوٹ پڑتا ہے۔ اور اگر آج میں قید میں محبوس ہو گیا ہوں تو کیا ہوا بارش سے پہلے حبس ہی ہوتا ہے۔ مشک بھی کبھی ریزے ریزے کر کے زمین پر بکھیر دیا جاتا ہے اور وہ قدموں تلے روندا جاتا ہے۔

ابن لبقی کی موشح جو بہترین ہے :-

خذ حديث الشوق عن نفسى وعن الدمع الذى همعا

ما ترى شوقى قد وقدا

وهما دمعى واطردا

واغتدى قلبى عليك سدے

اه من ماء ومن قبس بين طرفى والحشا جمعا!

عشق و شوق کی کہانی میری سانس اور میرے بہتے آنسوؤں سے معلوم کر لو، میرا شوق بھڑک رہا ہے، آنسو بہے چلے جا رہے ہیں، اور دل تیری محبت میں از کار رفتہ ہو گیا ہے۔ ہائے اس پانی اور آگ پر جو میری آنکھوں اور دل میں جمع کر دیے گئے ہیں۔

بابى ريم اذا سفرا

اطلعت ازراره قمرا

فاحذروه كلما نظرا

فبا لحاظ الجفون قِسى انا منها بعض من صرعا

میں قربان اس پر جو پردہ اٹھائے تو غزال ہو اور جس کی نقاب کے بٹن کھلیں تو ان میں سے چاند نمودار ہو۔ جب وہ تمہاری طرف دیکھے تو اس سے ڈرتے رہنا اس لیے کہ اس کی نگاہوں میں تیر ہیں اور میں ان تیروں کا ایک شکار ہوں۔

نیز کوئی اندلسی شاعر کہتا ہے :-

ما للمولّه من سكره لا يفيق

يالهُ سكرانا

من غير خمر ما للكئيب المشوق

يندب الاوطانا

هل تستعاد ايامنا بالخليج

ولياليها

او يستفاد من النسيم الاريج

مسك دارينا

واد یکاد حسن المکان البھیج
ان یحتینا
و نھر اظلته دوح علیه انیق
مورق فینان
والماء یجری وعائم و غریق
من جنی الریحان

عشق میں اپنے آپ کو بھلا دینے والے کو کیا ہو گیا ہے کہ اس کا نشہ دور ہی نہیں ہوتا، کیا کہتے ہیں اس بدمستی و نشہ کے، جو بغیر شراب کے ہے۔ اس غمگین و مشتاق کو کیا ہو گیا ہے جو اپنے وطن کا رونا رو رہا ہے۔ کیا خلیج میں ہمارے جو روز و شب گذرے ہیں وہ واپس آ سکتے ہیں۔ یا جھکتی ہوئی نسیم سے مشک دارین کی خوشبو حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایسی وادی جس کی بارونق جگہ کا حسن ہمیں خوش آمدید کہتا تھا۔ جہاں دریا پر خوشنما گھنے لمبی شاخوں والے سایہ دار درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ اور پانی بہتا تھا جس میں خوشبودار پھول تیرتے اور ڈوبتے ہوتے تھے۔

اُندلسی شعراء

ابن عبد ربه

(پیدائش ۲۴۶ھ وفات ۳۲۸ھ)

پیدائش اور حالات زندگی:۔ ابو عمر احمد بن محمد بن عبد ربه ولاء کے اعتبار سے اموی تھا اس لیے کہ اس کا دادا ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل اندلس میں بنی امیہ کے دوسرے خلیفہ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ یہ ادیب شاعر قرطبہ میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے پرورش پائی۔ اندلس کے علماء و ادباء سے کسب علم کیا، بالخصوص علم و روایت میں وسیع الاطلاع اور شعر و انشاء میں ماہر کامل ہو گیا۔ یاقوت نے اپنی تصنیف "معجم الادباء" میں لکھا ہے "ابو عمر کو علم میں گرانقدر مقام حاصل تھا وہ...... دیانت و تقوی کے ساتھ ساتھ ادب میں سرداری اور شہرت کا مالک تھا۔ اسے ایسا زمانہ اور حکومتیں ملیں جن میں علم و ادب کی بڑی قدر اور مانگ تھی، چنانچہ وہ گمنامی کے بعد مشہور و بلند مرتبہ اور فقیری کے بعد امیر ہو گیا۔ اسے تفضیلی بھی خیال کیا جاتا ہے تاہم اس پر شاعری کا مذاق غالب تھا۔" آخری عمر میں اسے فالج ہو گیا تھا، ۳۲۸ھ میں اس کی وفات ہوئی۔

اس کی شاعری:- ابن عبد ربہ کی شاعری کا بیشتر اور عمدہ حصہ وصف اور غزل کا ہے۔ مشرقی حسن و شوکت اور مغربی نزاکت و سلاست کو یکجا جمع کر دیئے ہیں اس کی شاعری ابن زیدون کی شاعری سے زیادہ مشابہ ہے اس نے مشرقیوں کے حالات و واقعات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کی شاعری کا پورا پورا مقلد تھا، چنانچہ مشرقیوں میں اسے مقبولیت و شہرت حاصل ہو گئی تھی اور وہ اس کی شاعری کی روایت اور اس کا چرچا عام کرتے رہتے تھے نیز وہ اس کے حسن کلام اور افضلیت کے معترف تھے۔ ابن الخطیب نے روایت کی ہے کہ ولید اندلسی نے جب حج کیا تو واپسی میں وہ مصر ٹھہرا، یہاں عمرو بن عاص رضؓ کی جامع مسجد میں وہ ابو الطیب متنبی سے ملا اور کچھ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا، پھر متنبی نے کہا "ذرا ہمیں اندلس کے خوش کلام شاعر (یعنی ابن عبد ربہ) کا کلام تو سناؤ۔ چنانچہ ولید نے اسے ابن عبد ربہ کے کچھ اشعار سنائے، متنبی وہ اشعار سن کر بہت خوش ہوا اور خوب داد دی نیز اس سے ان اشعار کے مکرر سنانے کی درخواست کی، پھر اس نے کہا "اے ابن عبد ربہ! عراق تو تیرے پاس گھسٹ کر پہنچے گا"، متنبی کی یہ شہادت اس کی فضیلت و برتری کے لیے بہت کافی ہے۔

ابن عبد ربہ بہت زیادہ شعر کہنے والے شاعروں میں سے ہیں۔ حمیدی نے اس کے اشعار کے بیس سے زیادہ اجزاء دیکھے تھے جو ان اجزاء میں سے تھے جن میں بیشتر اس نے حکم بن عبد الرحمن الناصر کے لیے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے۔ اپنی شاہکار تصنیف "العقد الفرید" میں اس نے ہر عنوان کے تحت اپنی شاعری کا بیشتر حصہ دیا ہے۔ چنانچہ وہ مقدمہ میں لکھتا ہے: "میں نے اس کتاب کے ہر باب میں متعلقہ موضوع سے مطابقت رکھنے والے اشعار بیان کیے ہیں اور ساتھ ہی ہر موضوع کے تحت اس سے متعلقہ اپنے اشعار بھی درج کر دیئے ہیں تاکہ کتاب پڑھنے والے کو معلوم ہو سکے کہ باوجود عربی ممالک سے بعد و انقطاع کے ہمارے مغربی ملک کو نظم و نثر کا بڑا حصہ ملا ہے"

اندلسیوں نے شاعری کی جو صنف موشحات کے نام سے ایجاد کی اس میں یہ پیش پیش تھا۔ اسے بیانیہ شاعری میں (جو عربی میں کم ہے) طبعاً ملکہ حاصل تھا، چنانچہ اس نے اپنے دور کے والی اندلس عبد الرحمن الناصر کی تاریخ ایک ارجوزہ میں لکھی تھی لیکن اس کی یہ شاعری موضوع کی خشکی، خیال کی کمزوری اور رزمیہ شاعری کے اصول سے دوری کی بنا پر بیانیہ شاعری سے زیادہ معلمانہ شاعری کی حیثیت رکھتی ہے، اس کا یہ ارجوزہ عقد الفرید کے دوسرے جزء میں پھیلا ہوا ہے۔

بڑی عمر کے بعد بڑھاپے نے جب بدن میں رعشہ پیدا کر دیا، تو وہ اپنی شوخیوں اور رنگینیوں کو چھوڑ کر مخلصانہ خدا کی طرف رجوع ہو گیا، اس زمانہ میں اس نے بہت سے اشعار کہے جن کا نام اس نے "محصات" رکھا، جن کے ذریعہ اس نے اپنی سابقہ عشق و مستی کی شاعری کا اسی بحر اور قافیہ میں ناصحانہ اور زاہدانہ شاعری کے ذریعہ جواب دیا۔ ابن عبد ربہ نے اپنی بلند پایہ شاعری اور نثر نگاری میں تفوق پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اس نے چاہا کہ وہ تصنیف و تالیف کے

میدان میں بھی اپنے کمال کا اظہار کرے، چنانچہ اس نے ادب کے موضوع پر ایک جلیل القدر کتاب تصنیف کی اور اس کا نام "العقد الفرید" رکھا۔

العقد الفرید

یہ کتاب عربی ادب کی بنیادی کتابوں میں سے ہے۔ جس میں بہت سی بکھری ہوئی مفید باتیں، منتشر مسائل، متفرق واقعات و حوادث، انساب، امثال، اشعار حتیٰ کہ طب اور موسیقی سے متعلق معلومات بھی یکجا جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب میں اصمعی، ابوعبیدہ، جاحظ اور ابن قتیبہ وغیرہ کی جملہ تصانیف کا خلاصہ موجود ہے۔ اس میں صرف عربوں کی تصانیف پر ہی اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ یونانی فارسی سنسکرت کے ترجموں سے مختلف پر حکمت و نصیحت اور دلچسپ باتیں بھی زینت کتاب بنائی گئی ہیں۔ مصنف نے مختلف ابواب باندھنے اور مضامین کی ترتیب دینے میں بڑی خوش اسلوبی اور کمال فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے کتاب کو پچیس (۲۵) ابواب میں تقسیم کیا ہے جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ہر باب کو اپنے فصیح و بلیغ تمہیدی پیش لفظ سے شروع کیا ہے جس میں اس باب کی غرض و غایت بتائی ہے۔ ہر باب کو اس نے ہار کے ایک ہیرے کے نام سے یاد کیا ہے مثلاً موتی، گوہر یکدانہ، زبرجد، مرجان، یاقوت، ہیرا، الخ۔

تعجب خیز امر یہ ہے کہ مصنف نے باوجود اندلسی ہونے کے اس کتاب میں اندلس اور اہل اندلس کے بارے میں اپنے سوا کسی اور کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا، چنانچہ صاحب بن عباد نے جب اس کتاب کا چرچا سنا تو نہایت اشتیاق سے اس کے مطالعہ کی خواہش کی اور جب یہ کتاب اسے ملی اور اس نے اسے شروع سے آخر تک پڑھ لیا تو کہا "یہ تو ہمارا ہی مال و متاع ہمیں واپس دے دیا گیا ہے۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ اس میں کچھ حصہ اندلس اور اہل اندلس کے حالات کا بھی ہوگا، اس میں تو صرف ہمارے ملک کے ہی حالات و واقعات ہیں ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" پھر اس نے اس کتاب کو واپس کر دیا۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور ہزار سے اوپر اس کے صفحات ہیں۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ غزلیات:۔

یا لؤلؤا یسبی العقول انیقا ۔۔۔ و رشا بتقطیع القلوب رفیقا

ما ان رایت ولا سمعت بمثله ۔۔۔ درًّا یعود من الحیاء عقیقا

و اذا نظرت الی محاسن وجهه ۔۔۔ ابصرت وجهك فی سناه غریقا

یا من تقطع خصره من رقة ۔۔۔ ما بال قلبك لا یکون رقیقا؟

اپنے دلوں کو لوٹنے والے حسین و جمیل موتی! اور اے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے

میں مہارت رکھنے والے غزال! میں نے کبھی نہ ایسا موتی دیکھا نہ اس کے متعلق سنا، جو شرم سے (اپنا رنگ بدل کر) عقیق بن جاتا ہے۔ جب تو اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھے گا تو تجھے یہ معلوم ہوگا کہ تیرا چہرہ اس کے نور میں ڈوبا ہوا ہے۔ اے وہ محبوب! کہ نزاکت کی وجہ سے جس کی کمر ٹوٹی پڑ رہی ہے آخر کیا بات ہے کہ تیرا دل نرم و نازک نہیں ہے!

وداع کے موقع پر کہتا ہے:-

ودعتني بزفرة و اعتناق ثم نادت متى يكون التلاقي؟
وبدت لى فاشرق الصبح منها بين تلك الجيوب والاطواق
يا سقيم الجفون من غير سقم بين عينيك مصرع العشاق
ان يوم الفراق افظع يوم ليتني مت قبل يوم الفراق

گلے مل کر وہ مجھ سے رخصت ہو رہی ہے اور بہ آواز بلند کہہ رہی ہے کہ اب ملن کی گھڑی کب آئے گی؟ اور جب وہ میرے سامنے نمودار ہوئی تو برقعہ میں سے اس کا چہرہ صبح کی طرح چمکا، اے بغیر بیماری کے آنکھوں کے مریض! تیری آنکھوں کے سامنے عاشقوں کے پچھڑنے کی جگہ ہے، واقعی جدائی کی گھڑی نہایت درجہ پریشانی اور گھبراہٹ کی گھڑی تھی، کاش میں جدائی کی گھڑی سے پہلے ہی مر جاتا۔

نیزہ اور تلوار کے وصف میں کہتا ہے:

بكل رديني كأن سنانه شهاب بدا فى ظلمة الليل ساطع
تقاصرت الاٰجال فى طول متنه وعادت به الاٰمال وهى فجائع
وذى شطب تقضى المنايا لحكمه وليس لما تقضى المنية دافع

ہر ردینی نیزہ سے جس کا پھل اس طرح چمکتا ہے جیسے تاریک رات میں ٹوٹنے والا تارہ رونما ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی کی وجہ سے موت کی مدتیں مختصر ہو جاتی ہیں اور آرزوئیں بھیانک مصیبتوں کی شکلیں اختیار کر لیتی ہیں اور وہ آب دار تلوار جس کے فیصلہ کے مطابق موتیں فیصلہ کرتی ہیں اور موت کا فیصلہ کوئی ٹال نہیں سکتا، اس کے میان سے نکلنے پر بہادروں کی روحیں نکل جاتی ہیں، یہی نہیں بلکہ خود موت بھی اس سے گھبراتی ہے۔

اس کے وہ اشعار جو اس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں کہے:-

بليت وابلتنى الليالى بكرها وصرفان للايام معتوران
ومالى لا ابلى لسبعين حجة وعشر اتت من بعدها سنتان
ولست أبالى من تباريح علتى اذا كان عقلى باقيا ولسانى

میں کمزور و خستہ حال ہو گیا، روز و شب کی پیہم گردشوں نے مجھے ناکارہ کر دیا، بیاسی برس کی عمر کے بعد بھی اگر میرے اعضاء جواب نہ دیں تو پھر میں کون ہوا؟ بہرحال مجھے

اپنی بیماری کی تکلیفوں کی پرواہ نہیں بشرطیکہ میری عقل و زبان بحال رہیں۔

ابن ہانیؔ اندلسی

(پیدائش ۳۲۶ھ وفات ۳۶۳ھ)

پیدائش اور حالاتِ زندگی: ابو القاسم محمد بن ہانیؔ ازدی اندلسی کی پیدائش اشبیلیہ میں اس وقت ہوئی جب دورِ اموی خلیفہ ناصر کے عہد میں اپنے سنہری دور اور عہدِ شباب سے گذر رہا تھا اور علم و ادب کے لحاظ سے اشبیلیہ ملک کا سب سے زرخیز خطہ تھا۔ یہیں اس کی پرورش ہوئی اس نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق ادب عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اس سلسلہ میں اس کا باپ ہانیؔ، اس کی مدد کرتا تھا جو خود بھی ادیب اور شاعر تھا۔ اس زمانے کے شاعروں کی طرح ہمارے شاعر کو بھی دنیا کی عیش و عشرت کی تلاش ہوئی اور اس نے بھی انہیں کے طریقہ کو اپنا لیا۔ چنانچہ وہ حاکم اشبیلیہ کے دربار میں پہنچا۔ اس کے دل میں اپنی جگہ بنائی اور بڑا اعزاز پایا۔ یہ وہ دور تھا جب اندلسی تہذیب و تمدن میں اسراف، عیاشی، رنگ رلیاں رواج پا رہی تھیں۔ ابن ہانیؔ نے بھی دونوں ہاتھوں سے تہذیب کے ان پھلوں کو سمیٹنا شروع کیا اس سلسلہ میں نہ کسی اخلاقی پابندی نے اسے روکا، نہ دینی قیود اس کی راہ میں حائل ہوئیں۔ اس نے فلاسفہ کے کچھ خیالات بھی اپنا لیے، لیکن اندلسی عوام مشرقیوں کے برعکس بدعت سے متنفر اور سنت کے ناصر تھے۔ وہ فلسفہ کو قابل اعتراض خیال کرتے، اور دین میں زیادہ مین میخ اور کرید سے روکتے تھے۔ لہٰذا اشبیلیہ کے لوگوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور وہ اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہوگئے۔ انھوں نے خود حاکم پر بھی اس کی تائید کرنے اور ہم خیال ہونے کا الزام لگایا۔ چنانچہ حاکم نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے علاقہ سے باہر چلا جائے تاآنکہ لوگوں کا مخالفانہ جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے اور وہ اس واقعہ کو بھول جائیں۔ چنانچہ وہ مغرب کی آخری حدود میں چلا گیا، اس وقت اس کی عمر چھبیس برس کی تھی، وہاں اس کی میر لشکر جوہر سے ملاقات ہوئی جس نے معز کے لیے مصر فتح کیا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کی مدح کی۔ جس سے اس کی آرزوؤں کی کھیتی پروان چڑھی۔ قسمت نے اس کی مدد کی اور اس نے اس معز لدین اللہ عبیدی سے ملا دیا، جس نے اسے اپنا مقرب خصوصی بنا لیا اور اسے اپنے احسانات و اکرام سے مالا مال کر دیا، جب جوہر نے مصر فتح کر کے اسے معز کے لیے ہموار کر دیا اور معز مصر جانے لگا تو ابن ہانیؔ اسے رخصت کر کے خود اپنے بال بچوں اور مال و اسباب لے کر مصر پہنچنے کے لیے پیچھے رہ گیا پھر جب وہ مصر جا رہا تھا تو راستہ میں مقام برقہ کے کسی شخص کے پاس مہمان ٹھہرا، جہاں وہ گانے اور کھیل کود میں حصہ لیتا رہا اور ایک

دن تو اتنی پی گیا کہ نشہ ہی نہ اترا اور موت کے نشہ سے جا ملا، بعض کا خیال ہے کہ مہمانوں میں سے بعض ہم پیالہ ساتھیوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی اور اسے مار ڈالا، یا پھر یہ ہوا کہ وہ گھر سے نشہ میں بدمست ہو کر نکلا اور بدمستی میں کہیں راستہ میں گر گیا اور جان دے دی۔ اس وقت اس کی عمر چھتیس برس کی تھی۔ جب اس کی موت کی خبر معز کو پہنچی تو اسے بڑا افسوس ہوا اور اس نے کہا "ہمیں امید تھی کہ اس شخص کے ذریعہ ہم مشرقی شعراء سے بازی لے جائیں گے لیکن قدرت کو یہ منظور نہ ہوا"

اخلاق اور عادات:۔ ابن ہانی رخوش مذاق وظریف، عیاش و آزادہ مزاج، شرابی اور رنگ رلیوں کا عادی تھا۔ وہ ذہین وطباع، شگفتہ اخلاق، نہایت شائستہ، کھری بات کہنے والا اور اپنے کاموں میں لوگوں کا خوف نہ کرنے والا تھا۔ اسے اس بات کی پرواہ نہ ہوتی تھی کہ لوگ اس کی بات یا کام پر کیا کہیں گے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے ماحول اور معاشرہ کے مخالف افکار وخیالات نیز کفر کی حد تک مبالغہ آمیز شاعری کو علانیہ پیش کر دیا، حالانکہ شاعر فیلسوف کی طرح نہیں ہوتا، اسے تو لوگوں میں مقبولیت کی بڑی شدید خواہش ہوتی ہے۔ اس میں ایک بڑا ثبوت خود اس کی رندانہ موت ہے جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔

اس کی شاعری:۔ تمام لوگ بلا اختلاف اس بات پر متفق ہیں کہ ابن ہانی اندلس کا امیرالشعراً ہے گو اس رائے . . . . . میں ابن زیدون جیسے شاعروں کے ساتھ قدرے ناانصافی ہے، تاہم اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہے۔ جس میں سلامتی فکر، سلاست تعبیر، بہت سے مسائل زندگی کا بیان اجتماعی مسائل کی ترجمانی، اور نفس انسانی میں پیدا ہونے والے افکار وخیالات پائے جاتے ہیں۔ اسے متنبی کے اشعار پڑھنے کا موقع ملا تھا جو اس کا ہم عصر تھا چنانچہ اس نے اس کے اسلوب و طرز کو بہت پسند کیا اور اسے اپنا لیا، اس کی تقلید میں فلسفیانہ افکار کو شاعری میں جگہ دیتا، مدحیہ کلام میں جا بجا حکم و امثال لاتا، اپنی شاعری میں اپنی خصوصی زندگی کو جگہ دیتا۔ اور اس طرح جنگ، قوت اور غلبہ کا بکثرت ذکر کرتا اور جو کچھ دیکھتا یا سنتا اس کا نہایت عمدگی وطرفگی سے وصف کرتا اور یہی وجہ ہے کہ اسے مغرب کا متنبی کہا جاتا ہے (اس لیے کہ مغرب والے اپنے بلند پایہ شعراء کو مشرقی بلند پایہ شعراء سے تشبیہ دینے کے عادی تھے)۔ لیکن ان دونوں میں تشبیہ کا وہی فرق تھا جو چہرہ اور چاند یا عزم وزمانہ یا سخاوت و سمندر کی مشہور تشبیہوں میں ہے اور واقعی آمد اور تقلید میں بڑا فرق ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا اس طرح مقابلہ کرنا ابو العلاء المعری کو برا لگا اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے وہ متنبی کی فضیلت کا بڑا معترف اور اس کا سختی سے طرف دار تھا، چنانچہ اس نے غصہ میں آ کر ابن ہانی کے متعلق کہا "اس کی شاعری میں الفاظ کی بھرمار سے اسی قسم کی بلند آوازیں نکلتی ہیں جیسے چکی میں سینگ پیسنے سے" لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اللہ اسے اور زندگی بخشتا اور وہ اس طرح کی جوان موت نہ مرتا

تو زمانہ کے تجربات اس کو پختہ کار اور اس کی شاعری کو صیقل کر دیتے اور تاریخ اس کے متعلق کوئی دوسری رائے قائم کرتی۔

اس کی شاعری کے موضوعات میں بیشتر حصہ تو مدح کا ہے۔تشبیب و غزل قصیدہ کے ابتداء میں ہے یا پھر تقلید کے طور پر وصف اور مرثیہ کی مقدار گو کم ہے لیکن عمدہ ہے، اسرار فطرت و مناظر فطرت سے جو چیزیں متنبی کو روکنے کا باعث ہوئیں رہی اس کے لیے بھی مانع بنیں چنانچہ ان چیزوں کا تذکرہ اس کی شاعری میں بہت کم ہے۔م

اس کی شاعری کا نمونہ:- ایک مرثیہ میں اس کے بہترین اشعار:-

انا و فی آمال انفسنا	طول و فی اعمارنا قصر
لنری باعیننا مصارعنا	لو کانت الألباب تعتبر
مما دهانا ان حاضرنا	اجفاننا والغائب الکفر
و اذا تدبرنا جوارحنا	فاکلهن العین والنظر
لو کان للالباب ممتحن	ما عُدَّ منها السمع والبصر
ایّ الحیاة الذّ عیشتها	من بعد علمی اننی بشر
خرست لعمر الله السنا	لما تکلم فوقنا القدر

ہمارے جی میں آرزوئیں تو لمبی ہیں لیکن ہماری عمریں کوتاہ ہیں۔ اگر ہماری عقلیں عبرت حاصل کرنے والی ہوں تو ہمیں اپنی آنکھوں سے اپنی موتیں نظر آسکتی ہیں۔ ہمیں جس چیز نے حیرت میں ڈال رکھا ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم آنکھوں سے دیکھ لیں اسے حاضر و موجود سمجھتے ہیں اور جسے فکر و خیال سے معلوم کریں اسے غائب سمجھتے ہیں، اور اگر ہم اپنے اعضاء میں غور و تدبر کریں تو ان میں سب سے کمزور آنکھ اور نظر ہی کو پائیں گے اور اگر عقل کے لیے کوئی کسوٹی ہوتی تو اس میں سمع و بصر کو شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ میں بشر ہوں کون سی زندگی سے سرور و کیف حاصل کروں۔ جب ہمارے اوپر قضاء و قدر کا حکم چلتا ہے تو بخدا ہماری زبانیں گونگی ہو جاتی ہیں۔

اسی مرثیہ کے چند مزید اشعار:-

و اذا صحبت العیش اوّله	صفواً نهین بعده الکدر
و اذا انتهیت الی مدی امل	ددکا، فیوم واحد عمر
و لخیر عیش انت لابسه	عیش جنی ثمراته الکبر
و لکل حلبة سابق آمد	و لکل نهلة وارد صدر
وحدود تعمیر المعمّر ان	یسمو صعوداً ثم ثم ینحدر

جب تمہیں زندگی کا پہلا حصہ خوش گوار مل جائے تو اس کے بعد جو تکدر پہنچے وہ حقیر اور معمولی ہے۔ اور جب تم کسی آرزو کی انتہا تک پہنچ جاؤ، تو ایک دن کو پوری عمر خیال کرو۔ اور بہترین زندگی جس سے تم متمتع ہو وہ زندگی ہے جس کا انجام بڑھاپا ہو تیز دوڑنے والے کے لیے ایک آخری حد ہے اور ہر گھاٹ پر اترنے والے کے لیے واپسی ہے۔ اور جس کو زندگی دی جاتی ہے اس کی زندگی کی حدود یہ ہیں کہ وہ بلند ہو کر پھر نشیب کی طرف ڈھل جائے۔

والسیف یبلی وھو صاعقة   وینال منه الھام والقصر
والمرء کالظل المدید ضحی   والفیء یحسره فینحسر

تلوار بھی گل کھٹ جاتی ہے حالانکہ وہ خود موت ہوتی ہے اور اس سے سر اور گردنیں ماری جاتی ہیں۔ انسان کی مثال چاشت کے وقت لمبے سایہ کی سی ہے جسے سورج کا زوال مٹا دیتا ہے۔

اس قصیدہ کے آخر میں کہتا ہے:۔

غرض تواھی فی الخطوب، فذا   قوس، وذا سھم وذا وتر
فجزعت، حتی لیس بی جزع   وحذرت، حتی لیس بی حذر

انسان کی مثال اس نشانہ کی سی ہے جسے ہر طرف سے مصائب پہنچ رہے ہوں۔ یہ کمان ہے وہ تیر ہے اور وہ تانت ہے۔ میں اس صورت حال سے اتنا گھبرایا کہ اب مجھے کوئی گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی اور اتنی احتیاط برتی کہ اب مجھے احتیاط کی ضرورت ہی نہیں۔

حسن تغزل:۔

امسحوا عن ناظری کحل السھاد   وانفضوا عن مضجعی شوك القتاد
او خذوا منی ما اعطیتم   لا احب الجسم مسلوب الفؤاد
ھل تجیرون محبًا من ھوی؟   او تفکون اسیراً من صفاد
اسلوًا منکم من ھجرکم   قلما یسلو عن الماء الصوادی
انما کانت خطوب قیضت   فعدتنا عنکم احدی العوادی
فعلی الایام من بعدکم   ما علی الظلماء من لبس الحداد
لا مزار منکم یدنو سوی   ان اری اعلام ھضب اونجاد
لم یزدنا القرب الا ھجرة   فرضینا بالتنائی والبعاد
واذا شاء زمان رابنا   برقیب او حسود اومعاد

لللہ! میری آنکھوں سے بے خوابی کو دور کر دو، اور خدارا میرے بچھونے پر سے کانٹے ہٹا دو، یا پھر اتنا تو کر دو کہ جو کچھ تم نے دیا ہے وہ بھی لے لو۔ کہ مجھے وہ جسم جس میں سے دل نکال لیا گیا ہو پسند نہیں ہے۔ کیا تم عاشق کو عشق سے پناہ دے سکتے ہو؟ یا ایک قیدی سے اس کی بندھنیں کھول سکتے ہو؟ کیا تمہاری جدائی کے بعد بھی میرے دل کو تسلی و طمانیت حاصل ہو سکتی ہے اور کیا

پیاسے کو پانی کے بغیر بھی تسکین مل سکتی ہے؟ یہ تو آفتیں تھیں جو مقدر ہوئی تھیں۔ اور کچھ ہنگامی حالات تھے جنھوں نے ہمیں تم سے جدا کر دیا۔ تمہارے بعد زمانہ میرے لیے تاریک راتوں کی طرح ماتمی لباس پہنے ہوئے ہے۔ تم سے ملاقات کی کوئی شکل نہیں سوائے اس کے کہ میں ٹیلوں اور بلند زمینوں کو دیکھتا ہوں۔ وصل نے بھی ہمارے فراق میں اضافہ کیا، لہذا ہم دوری اور جدائی پر ہی خوش ہیں۔ اور جب زمانہ چاہتا ہے تو ہمیں رقیب، حاسد یا پھر سے جدائی کا ڈرا وا دیتا ہے۔

میر لشکر جوہر کی مدح اور مصر جاتے وقت اس کے لشکر کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:-

رأيت بعيني فوق ما كنت اسمع ... وقد راعني يوم من الحشر اروع
غداة كأن الأفق سد بمثله ... فعاد غروب الشمس من حيث تطلع
فلم ادر اذ سلمت كيف أُشيّع ... ولم ادر اذ شيّعت كيف اودع
وكيف اخوض الجيش والجيش لجة ... واني بمن قاد الجيوش لمولع
فلا عسكر من قبل عسكر جوهر ... تخب المطايا فيه عشرا وتوضع

جو کچھ سنا تھا اس سے زیادہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لشکر کو جمع کر کے کوچ کا دن میرے لیے ہیبت کا باعث بن گیا۔ اس روز صبح کے وقت لشکر ایک دوسرا افق بن کر آسمانی افق کے لیے اوٹ بن گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ سورج جدھر نکلا تھا ادھر ہی غروب ہو رہا ہے۔ جب میں نے ... سلام کیا تو یہ ہوش نہ رہا کہ چھوڑنے کے لیے چلا تو یہ ہوش نہ رہا کہ وداع کیونکر کروں، میں لشکر میں کیسے گھستا جب کہ لشکر سمندر کا گہرا کنڈ تھا، اور میں تو اس کا مشتاق تھا جو لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ جوہر کے لشکر سے پہلے ایسا کوئی لشکر دیکھنے میں نہیں آیا جس کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک جانے کے لیے تیز رفتار سواریوں کے لیے دس دن کی مسافت ہو جب کہ وہ اپنی پوری تیزی سے چلیں۔

گھوڑوں کے دستہ کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:-

صواهل لا الهضب يوم مغارها ... هضب ولا البيد الحزون حزون
عُرِفت بساعة سبقها لا انها ... علقت بها يوم الرهان عيون
واجل علم البرق عنها انها ... مرت بجانحتيه وهي ظنون

ہنہناتے گھوڑے، جن کے لیے حملہ کے وقت نہ بلندیاں کوئی بلندیاں ہیں نہ سخت اور دشوار گذار زمین سخت اور دشوار گذار ہے۔ گھوڑ دوڑ میں دوڑتے وقت تو ان پر نگاہ جم ہی نہیں سکتی، انہیں جب وہ آگے بڑھ جاتے ہیں اسی وقت شناخت کیا جاتا ہے، تو بجلی کو بھی ان کے بارے میں جو زیادہ سے زیادہ علم ہے وہ یہ ہے کہ یہ گھوڑے اس کے دونوں پہلوؤں پر سے گمانوں کی سی تیزی کے ساتھ گذر گئے۔

ابن زیدون

(پیدائش ۳۹۴ھ وفات ۴۶۳ھ)

پیدائش اور حالاتِ زندگی:- ابوالولید احمد بن عبداللہ بن زیدون ۳۹۴ھ میں قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سرکردہ فقیہ اور بلند پایہ ادیب تھا۔ چنانچہ اس نے اور لوگوں کے علاوہ اپنے والد سے بھی ادب اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ قدرت نے اسے انشاء پردازی کے لیے موزوں طبیعت بخشی تھی اور طبع سلیم بھی، اپنے کمال و مہارت کی وجہ سے اس نے اتنی ترقی کی کہ اندلس کی طوائف الملوکی کے دور میں وہ اس زمانہ کے ایک بادشاہ ابوالحزم بن جہور کا وزیر بن گیا۔ اس طرح اس کی شہرت عام اور اس کا رتبہ دوبالا ہو گیا۔ حاکم نے تمام معاملات اس کو سونپ دیے اور اس نے نہایت عزم و مہارت سے ان کا انتظام کیا۔ کئی بار اس نے اپنے بادشاہ اور دوسرے بادشاہوں کو اس کے خلاف بھڑکا دیا اور ابن جہور نے غصہ ہو کر اسے قید میں ڈال دیا۔ اس کی پہلی خدمات اور سابقہ درجات میں سے کچھ بھی اس کے کام نہ آیا۔ اس نے بادشاہ کے غصے کو فرو کرنے اور اس کے رحم کو ابھارنے کے لیے قید خانہ سے ایک یگانہ قسم کا خط لکھا پر وہ بھی اس پتھر کے دل کو نرم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہ جیل سے فرار ہو کر قرطبہ میں کہیں روپوش ہو گیا، اور پھر ابن جہور کے بیٹے ابوالولید کی سفارش کے ذریعہ اس کو راضی کر لیا۔ بعد ازاں وہ اس حاکم کے ظل عاطفت میں رہا۔ تا آنکہ حکومت اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے ابوالولید کو مل گئی اور اس نے بھی اسے اپنے مقربین خصوصی میں رکھا۔ لیکن حاکم مالقہ سے اس کے سیاسی تعلقات کی بناء پر بالآخر وہ بھی اس سے ناراض ہو گیا اور اس نے اسے شہر بدر کر دیا۔ اور وہ ۴۴۱ھ میں حاکم اشبیلیہ معتضد عباد کی پناہ میں چلا گیا، جس نے اسے اپنے مقربین میں جگہ دی اور اسے اپنا مشیر و معتمد خصوصی بنا لیا، پھر اس کے بعد وہ اس کے بیٹے معتمد کا وزیر رہا اور اپنی بقیہ عمر اشبیلیہ ہی میں گذار دی۔

ان مختصر حالات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ابن زیدون کی عام زندگی مشکلات اور بے چینی میں گذری اور خاص زندگی بھی کسی طرح عمومی زندگی سے کم مشکل اور بے چینی کی نہ تھی۔ قرطبہ میں اسے ولادہ کی محبت میں مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا، یہ خاتون بنی امیہ کے ایک خلیفہ مستکفی کی بیٹی تھی۔ علم و ادب کا بڑا ذوق رکھتی تھی اور حسن و جمال میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ وہ شاعرہ تھی اور بے پردہ رہتی تھی۔ شاعروں اور علماء کے ساتھ وہ شاعری اور علمی مسائل میں بحث اور مقابلے کرتی تھی۔ اس کا مکان قرطبہ کے امراء و وزراء، ادباء و زعماء کی مجلس بنا ہوا تھا۔ انہی میں ابن زیدون بھی تھا۔ یہ بھی سبک روح و خوش مذاق اور حسن و ادب کا مالک تھا، اور ولادہ کے دل کو

اپنی طرف مائل کرنے کے مقابلہ میں یہ سب سے بازی لے گیا تھا، اور اس کے دل میں بس گیا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دیا، اس کامیابی نے اس کے دوسرے حریفوں کے دل میں آتش حسد بھڑکا دی اور انہوں نے ان دونوں کے تعلقات بگاڑنے کی ہر امکانی کوشش کی اس سلسلہ میں وزیر ابو عامر بن عبدوس جو بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا، پیش پیش رہا۔ چنانچہ وہ کسی وقت موقع پاکر ولادہ کے پاس پہنچا اور اس کے سامنے ابن زیدون کی اتنی برائیاں بیان کیں کہ اس کا دل اس سے برگشتہ کرا دیا۔ لیکن اس کا اثر کچھ دیرپا ثابت نہ ہوا اور محبت پھر اپنے پہلے ڈگر پر پلٹ گئی اور وہ ابن زیدون کی ہو گئی۔ اس پر ابن زیدون نے مذاق اڑاتے ہوئے ابن عبدوس کو ایک طویل تمسخر انگیز خط ولادہ کی طرف سے لکھا جس میں اس کی خوب ہی خبر لی اور جی بھر کر مذاق اڑایا۔ اس خط میں بہت سے ادبی اور تاریخی لطائف بھی ہیں۔

اس کی شاعری:- ابن زیدون کی شاعری اس کے دل کی گہرائیوں سے پھوٹی اور اس کے ملک کی زمین سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے اس کی شاعری اندلسی شاعری کی صحیح تصویر ہے۔ اس کی شاعری ابن ہانی کی شاعری کی طرح مشرق کے پیچھے پیچھے چلنے والی اور اس کی مقلد و نقال نہیں ہے، کیونکہ اس نے شاعری کو نہ تو روزی کمانے کا ذریعہ بنایا تھا نہ شہرت حاصل کرنے کا وسیلہ۔ وہ اپنے نفس کے احساسات اور اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ رقت انگیز شاعری اور باریک و ناز مضامین کو نظم کرنے کے لحاظ سے یہ بنی مخزوم کا آخری شاعر اور اپنے معاصرین میں پہلا شاعر تھا۔ اس کی شاعری میں آپ کو اندلسی شاعری کی تمام مابہ الامتیاز خصوصیات نہایت عمدہ شکل میں ملیں گی۔ مثلاً مناظر کا وصف، جذبات کی ترجمانی، بلندی خیال، ظاہری حسن و رونق۔ کبھی کبھی جب وہ فخر و مدح کرتا ہے تو اس کی شاعری میں کچھ کمزوری کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں لیکن یہ کمزوری تغزل، جذب شوق، اور استعطاف کے موضوعات میں نہیں ملتی۔ اس لیے کہ ان موضوعات میں اس کی طبیعت نہایت فیاض اور اس کا قلم نہایت رواں ہوتا ہے اور اس کا سبب کچھ تو ابن جہور کے ظلم ہیں اور کچھ ولادہ کی بے مروتی اور جدائی کے صدمات۔

ابن زیدون کی تحریر و تقریر میں عربی شاعری کا اسلوب، اس کا ساز و ربیان اور عربی شاعری کا اقتباس بکثرت ہوتا، کہتے ہیں کہ اس کی کسی بیوی کا انتقال ہو گیا تو وہ مختلف طبقوں سے تعزیت کے لیے آنے والوں سے ملتا رہا اور اپنی وسعت علمی اور حاضر دماغی کی وجہ سے اس نے ہر ایک کی تعزیت کا نئے انداز سے جواب دیا اور کسی کو بھی وہ جواب نہ دیا جو ایک بار کسی دوسرے کو دے چکا ہو۔ اس کی شاعری اور نثر میں جو تشبیہات امثال و لطائف ملتے ہیں وہ اس کے بین ثبوت ہیں۔

نثر:- ابن زیدون کی نثر عمدہ و خوشنما اور اس کی عبارت رواں ہے۔ اس میں تکلف، سجع بندی، بے جا طول اور بھرتی کے مترادفات نہیں۔ اس کی نثر کا اسلوب جاحظ کے اسلوب سے بہت

زیادہ مشابہ ہے بالخصوص وہ تنوع جو وہ حروف جار کے ذریعہ پیدا کرتا ہے۔ ابن عمید کے اسلوب سے اس نے امثال و لطائف کو شامل کرنا اور اثنائے نثر میں اشعار داخل کرنا، اپنایا ہے۔ اس کی نثر کے شاہکار اس کے دو مشہور خط ہیں جن میں سے ایک سنجیدہ اور دوسرا مذاقیہ ہے۔ اول الذکر خط اس نے قید خانہ سے ابن جہور کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے لکھا تھا اور دوسرا خط اس نے ولادہ کی زبانی ابن عبدوس کو لکھا تھا جس کا ذکر پہلے بھی گذر چکا ہے۔ ادبار ان دونوں خطوں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور بہت سے علماء نے ان خطوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ بنی جہور کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

بنی جهور احرقتم بجفائکم ... فؤادی فما بال المدائح تعبق
تعدوننی کالعنبر الورد انما ... تفوح لکم انفاسه وهو یحرق

اے بنی جہور! تم نے اپنی بے مروتی و جفاکاری سے میرے دل کو جلا ڈالا، لیکن کیا بات ہے کہ مدحیں مہک رہی ہیں۔ تم مجھے عنبر خیال کرتے ہو جو خود تو جلتا ہے لیکن خوشبو دار دھواں ہر طرف اڑاتا ہے۔

جب ولادہ قرطبہ میں تھی اور وہ اشبیلیہ میں تو اس کے ہجر میں شوق ملاقات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

اضحی التنائی بدیلاً من تدانینا ... و ناب عن طیب لقیانا تجافینا
بنتم و بنا فما ابتلت جوانحنا ... شوقا الیکم ولا جفت ماقینا
یکاد حین تناجیکم ضمائرنا ... یقضی علینا الاسی لولا تاسینا
لیُسق عهدکم عهد السرور فما ... کنتم لارواحنا الا ریاحینا

وصال کے عوض اب جدائی نے جگہ لے لی ہے اور ہماری خوشگوار ملاقات اب فراق سے بدل گئی ہے۔ تم ہم سے اور ہم تم سے جدا ہو گئے اور اس کے بعد سے ہمارے پہلوؤں کی آتش شوق کو سکون ہی نصیب نہ ہوا نہ ہماری آنکھ کے آنسو تھمے۔ جب ہمارے دل میں تمہارا خیال آتا ہے تو غم فراق سے دم نکلنے لگتا ہے اگر ہم ضبط نہ کریں تو واقعی ہم مر جائیں۔ آہ کیا زمانہ تھا، وصال کا جب ہم مسرور و شادماں تھے۔ خدا اس کی یاد دل میں سدا سرسبز رکھے۔ وہ زمانہ جب ہماری روحوں کے لیے تم مہکتے ہوئے پھول تھے۔

من مبلغ الملبسینا بانتزاحهم ... حزنا مع الدهر لا یبلی و یبلینا
ان الزمان الذی ما زال یضحکنا ... انسا بقربکم قد عاد یبکینا
غیظ العدی من تساقینا الهوی فدعوا ... بان نغصّ فقال الدهر امینا
فانحلّ ما کان معقودا بانفسنا ... وانبتّ ما کان موصولا بایدینا

وقد نكون وما يخشى تفرقنا ... فاليوم نحن وما يرجى تلاقينا
لا تحسبوا نأيكم عنا يغيرنا ... ان طال ما غير النأى المحبينا
والله ما طلبت اهواؤنا بدلا ... منكم ولا انصرفت عنكم امانينا

کون ہے جو ان لوگوں کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دے جنہوں نے اپنی جدائی سے ہمیں ایسے رنج وغم میں مبتلا کر رکھا ہے جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بجائے کم ہونے کے ہمیں ختم کر رہا ہے۔ کہ وہ زمانہ جو ہمیں انس ومحبت اور تمہارے وصل کی وجہ سے مدتوں ہنساتا رہا ہے آج وہ ہمیں رلا رہا ہے۔ ہمارے عشق ومحبت کے خوشگوار جام نوش کرنے کی وجہ سے ہمارے دشمن ہم سے جل گئے اور انہوں نے ہمارے اوپر بددعا کی کہ ہماری خوشگوار زندگی مکدر ہو جائے اور ان کی اس بددعا پر زمانہ نے آمین بھی کہہ دی۔ چنانچہ ہمارے باہمی بندھن اور تعلقات منقطع ہو گئے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ محبت بھری زندگی دیکھ کر کسی کے دل میں ہماری جدائی کا خطرہ بھی نہ گذرتا تھا اور آج وہ دن بھی آگیا کہ ہمارے دوبارہ ملنے کی کسی کو امید بھی نہیں ہوتی۔ کبھی تم یہ خیال بھی نہ کرنا کہ تمہاری جدائی ہمارے دلوں کو بدل دے گی۔ گو دنیا میں قدیم زمانہ سے یہی دستور رہا ہے کہ جدائی عاشقوں کو ایک دوسرے سے برگشتہ کر دیتی اور بھلا دیتی ہے۔ بخدا! ہمارے دل نے تمہارے سوا کسی کو اپنے اندر جگہ نہیں دی اور نہ ہماری آرزوؤں نے تمہارے سوا کسی اور کی خواہش کی۔

یا ساری البرق غاد القصر فاسق به ... من کان صرف الهوی والود یسقینا
ویا نسیم الصبا بلغ تحیتنا ... من لو علی البعد حیا کان یحیینا
یا روضة طالما اجنت لواحظنا ... وردا جناه الصبا غضا و نسرینا
ویا حیاة تملینا بزهرتها ... منی ضروبا و لذات افانینا
کانّنا لم نبت والوصل ثالثنا ... والسعد قد غض من اجفان واشینا
لسنا نسمیك اجلالا و تکرمة ... فقد رك المعتلی عن ذاك یغنینا
سرّان فی خاطر الظلماء یکتمنا ... حتی یکاد لسان الصبح یفشینا
یا جنة الخلد ابدلنا بسلسلها ... والکوثر العذب زقوما و غسلینا
انا قرأنا الأسی یوم النوی سورا ... مکتوبة و اخذنا الصبر تلقینا

اے سرشام کے بجلی اور پانی سے بھرے ہوئے بادل! تو قصر جا کر اسے اپنا پانی پلانا جو ہمیں اپنی محبت کے جام پلاتا تھا، اور اے نسیم صبا! اس کو ہمارا سلام پہنچانا کہ جو باوجود دوری کے اگر ہمیں سلام کرے تو ہم زندہ ہو جائیں۔ اے وہ گلستاں! کہ جس نے ایک زمانہ تک ہماری نگاہوں کی تر وتازہ گلاب وچنبیلی کے پھولوں سے ضیافت کی تھی۔ اور اے زندگی! جس کے حسن وشباب سے ہم ایک زمانہ تک مختلف آرزوؤں اور گوناگوں لذتوں کے ساتھ

متمتع ہوتے رہے۔ اے محبوب! ہم تیرے اعزاز و احترام کی وجہ سے تیرا نام نہیں لیتے اس لیے کہ تیرا بلند مرتبہ ہمیں اس سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں نے کبھی اپنے تیسرے ساتھی وصل کے ساتھ ایک شب بھی نہیں گذاری اور ہماری خوش نصیبی پر کبھی ہمارے دشمنوں کے دل نہیں جلے۔ ہم دو راز تھے جنہیں رات کی تاریکی چھپائے ہوئے تھی حتی کہ صبح کی روشنی نے ہمیں بے حجاب کر دیا۔ اے جنت الخلد! ہمیں تیرے رواں شیریں اور با فراط پانی کے عوض زقوم و غسلین (جہنمیوں کی دو غذائیں) مل رہی ہیں۔ ہم نے جدائی کے زمانہ میں رنج و غم کی سورتیں تلاوت کر ڈالیں اور صبر شیوہ بنا لیا۔

ولادہ کو رخصت کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

ودع الصبر محب ودعك ذائع من سرّه ما استودعك
يقرع السن على ان لم يكن زاد في تلك الخطى اذ شيعك
يا اخا البدر سناءً وسنًى رحم الله زمانا اطلعك!
ان يطل بعدك ليلي فلكم بت اشكو قصر الليل معك!

وہ محبوب جس نے تجھے وداع کہا اس نے صبر کو بھی رخصت کر دیا۔ وہ راز جو اس نے تیرے پاس امانت رکھوایا وہ بھی فاش ہو رہا ہے۔ پشیمانی لاحق ہو رہی ہے کہ کیوں نہ چھوڑتے وقت کچھ اور قدم آگے چلا ہوتا۔ اے حسن و روشنی میں بدر کامل کے مثیل! خدا اس زمانہ پر رحم کرے جس نے تجھے نمودار کیا۔ اگر تیرے بعد میری راتیں دراز ہونے لگی ہیں تو مجھے تیرے ساتھ گذرنے والی وہ راتیں بھی یاد ہیں جن کی کوتاہی کے ہیں رات بھر شکوے کیا کرتا تھا۔

ایضاً:۔

اما رجا قلبي فانت جميعه يا ليتني اصبحت بعض رجاك
يدنو بوصلك حين شط مزاره وهم اكاد به اُقبّل فاك

میرے دل کی تو تمام کی تمام تمنا تو ہی ہے، کاش میں تیرے دل کی تمنا کا کچھ حصہ ہی بن جاؤں۔ جب تیری ملاقات بعید ہو جاتی ہے تو تیرے بجائے خواب میں خیال سے واسطہ پڑتا ہے جس کے ذریعہ میں تیرے منہ کو چومتا ہوں۔

اس کی نثر کا نمونہ:- اپنے سنجیدہ خط میں وہ لکھتا ہے:۔

اے میرے آقا و سردار! میری دوستی و محبت آپ کے لیے ہے۔ مجھے اعتماد آپ پر ہے مجھے پرواہ آپ کی ہے۔ میری ترقی آپ سے ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آپ نہایت اولوالعزم مرادیں بر لانے والے ہیں۔ اللہ حضور کو بلند اقبال کرے آپ نے مجھ سے اپنے احسانات کا لباس چھین لیا، اور آپ نے مجھ سے اپنی محبت کا زیور اتار لیا، اور مجھے اپنی لطف و عنایات کے لیے

ترسا دیا ہے، آپ نے اپنا دست شفقت میرے سر سے اٹھا لیا، اور اپنی نظر کرم مجھ سے ہٹالی، حالانکہ آپ سے جو مجھے امیدیں وابستہ تھیں وہ اندھے سے بھی پوشیدہ نہ تھیں اور آپ کی شان میں جو میں نے مدح خوانیاں کی ہیں کسی بہرے کے کان بھی اس سے ناآشنا نہیں۔ اور میں نے آپ کی جو حمد وستائش کی جمادات بھی اس کو محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ کبھی پانی سے ہی پینے والے کے گلے میں پھندا لگ جاتا ہے اور وہی دوا جو برائے صحت استعمال کی جاتی ہے زہر بن جاتی ہے، اور محتاط آدمی کو اسی جانب سے دکھ پہنچتا ہے جس سے وہ مطمئن ہوتا ہے، اور اس کی موت اس کی آرزو ہی میں مقدر ہوتی ہے۔ اور ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ حریص کی تگ و دو سے پہلے ہی موت آجاتی ہے:۔

كل المصائب قد تمر على الفتى فتهون غير شماتة الحساد

آدمی تمام مصیبتوں کو آسانی سے برداشت کر لیتا ہے لیکن حاسدوں کی خوشی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔

بہرحال میں صبر و ضبط سے کام لے رہا ہوں اور اپنے ان دشمنوں کو جو میری مصیبت پر خوشیاں منا رہے ہیں یہ بتا رہا ہوں کہ میں حوادث زمانہ سے گھبرانے والا نہیں ہوں۔ پھر میری عرض ہے کہ کیا میں اس ہاتھ کی طرح نہیں ہوں جس کو اسی کے کنگن نے زخمی کر دیا ہے، اور کیا میں ہی وہ پیشانی نہیں جسے اس کے تاج ہی نے تکلیف پہنچائی ہے اور کیا میں ہی وہ تلوار نہیں جسے اس کے صیقل کرنے والے نے خود ہی مٹی میں ملا دیا ہو، اور کیا میں ہی وہ نیزہ نہیں جسے اس کو درست کرنے والے نے آگ دکھائی ہو، اور کیا میں ہی وہ غلام نہیں جس کے ساتھ اس کے آقا نے اس شاعر کا سلوک کیا جو کہتا ہے:۔

فقسا ليزدجروا ومن يك حازما فليقس أحيانا على من يرحم

تو اس نے ان کو باز رکھنے کے لیے سختی کی اور جو محتاط ہوتا ہے تو وہ کبھی اس پر بھی سختی کرتا ہے جس پر وہ مہربان ہوتا ہے۔

اپنے اسی خط میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے:۔

میں پھر ایک بار حضور عالی کی چشم التفات اپنی طرف متوجہ کراتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ آخر وہ کون سا جرم ہے جو آپ کے دامن عفو میں نہ سما سکا؟ اور وہ کون سی جہالت ہے جس کا تدارک آپ کے حلم سے نہ ہو سکا؟ وہ کون سی دست درازی ہے جسے آپ کا احسان اپنے احاطہ میں نہ رکھ سکا؟ اور وہ کون سی زیادتی ہے جو آپ کی قوت برداشت سے بالاتر ہو گئی؟ بہرصورت میرا معاملہ ان دو شکلوں میں سے ایک ضرور ہے یا تو میں بے گناہ ہوں تو پھر آپ کا عدل کہاں ہے؟ یا پھر میں مجرم ہوں تو آپ کا لطف و فضل کہاں ہے؟

الا يكن ذنب فعدلك واسع أو كان لى ذنب ففضلك اوسع

اگر میرا کوئی جرم نہیں ہے تو پھر آپ کا عدل وسیع ہے یا اگر میں مجرم ہوں تو آپ کا فضل اس سے زیادہ وسیع ہے۔

یہ تمام خط اسی قسم کے دلکش اسلوب میں لکھا ہوا ہے۔

اپنے مزاقیہ خط میں وہ ولادہ کی طرف سے لکھتا ہے:۔

اے مریض عقل! فریب خوردۂ جہل! غلط کار وغلط بیں، خود نمائی کے دام میں پھنسنے والے، دن میں سورج کو نہ دیکھنے والے، شیرہ پر مکھیوں کی طرح گرنے والے، پروانوں کی طرح شمع پر ٹوٹ پڑنے والے! غرور وتکبر نہایت درجہ ناقابل اعتماد امور ہیں، اور آدمی کے لیے اپنے صحیح مقام کو پہچاننا نہایت موزوں طریقہ ہے۔ تو اپنے خط کے ذریعہ مجھ سے میری اس دوستی کا طالب ہوا ہے جو تجھ جیسوں کو نصیب نہیں، اور میرے وصل کا خواہاں ہے حالانکہ تیرے جیسوں کو دھتکار کر اس خواہش سے دور رکھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں تونے مطلب برآری کے لیے اپنی دوست کو بھیجا اور اپنی معشوقہ کو بطور نائیکہ استعمال کیا، تونے اپنے نفس کو دھوکہ دیا کہ تو اسے چھوڑ کر میرا ہو جائے گا اور اس کے بعد میرے لیے مرے گا۔

ولست باول ذی همة ۔ دعته لما لیس بالنائل

تو ہی سب سے پہلا باہمت شخص نہیں جسے اس کی ہمت نے ایسی چیز کی طرف مائل کیا جو اسے نہ مل سکتی ہو۔

اس خط میں آگے چل کر وہ لکھتا ہے:۔

اے بدنما گدی والے، بڑی مونچھوں اور لمبی گردن والے! انتہائی احمق وکند ذہن مبغوض الهیئت، بے وقوفوں کی طرح ادھر اُدھر پھرنے والے، اسکی، بدبودار سانسوں والے، تیری گفتگو بھڑک دار تیری باتیں بے معنی، تیرا بیان غیر واضح، اور تیری ہنسی ٹھٹھے بازی، تیری چال بھدی، تیری آسودگی مجسم بھیک، تیرا دین زندیقی اور تیرا علم بوگس والایعنی:۔

مساولو قسمن علی الغوانی لما اُمھرن الا بالطلاق

تجھ اکیلے میں اتنی بہت سی بری خصلتیں یکجا ہیں کہ اگر وہ برائیاں بہت سی حسیناؤں میں تقسیم کر دی جائیں تو سوائے طلاق کے ان کا کوئی مہر نہ ہو۔

یہ سارا کا سارا خط اسی قسم کے چبھتے ہوئے فقروں اور فحشیات وتہکم سے لبریز ہے۔

ابن حمدیس صقلی

(پیدائش ۴۴۷ھ وفات ۵۲۷ھ)

پیدائش اور حالاتِ زندگی: عبدالجبار بن حمدیس جزیرہ صقلیہ میں پیدا ہوا، کم سنی ہی سے وہ اپنے ماحول میں شاعر کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ لیکن ادبی منڈی

میں اسے کوئی نہیں جانتا تھا، لہٰذا نہ اس کی شاعری کا چرچا ہوا نہ علمی طبقہ میں اس کی قدر و منزلت معلوم ہوسکی، حتیٰ کہ نرمندیوں نے اس کے وطن پر تسلط حاصل کر لیا، اس وقت وہ بھرپور جوانی میں تھا اور اسے اپنی آنکھوں سے غاصب فاتح قوم کے جبر و تشدد کے دیکھنے، اور اپنے کانوں سے ان کے مستبدانہ واقعات سننے کا موقع ملا، اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دشمنوں نے اس کے ملک کو کس طرح تباہ و برباد کر ڈالا، چنانچہ وہ وہاں سے ہجرت کر کے اسپین چلا گیا اور معتمد بن کے خوان کرم سے سیر ہونے کے لیے اشبیلیہ میں پہنچا۔ ایک مدت تک تو معتمد نے اسے درخور اعتنا ہی نہ سمجھا اور اسے دربار میں پہنچنے کا موقع کبھی نہ ملا، حتیٰ کہ ابن حمدیس کہتا ہے میں ناکامی اور انتہائی تھکن اور کوفت کے بعد بالکل مایوس ہو چکا تھا اور الٹے پاؤں واپس ہونے کا عزم کر چکا تھا۔ یہ حالت تھی کہ ایک رات سرکاری ہرکارہ چراغ اور سواری لیے میرے گھر پر آیا اور مجھ سے کہا "بادشاہ کی دعوت پر لبیک کہو!" فوراً ہی میں سوار ہو کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، بادشاہ نے مجھے معزز مقام پر سمور کے قالین پر بٹھایا اور کہا "تمہارے پاس جو کھڑکی ہے وہ کھولو" چنانچہ میں نے اسے کھولا، کیا دیکھتا ہوں کہ دور ایک شیشہ کی بھٹی ہے اور اس کے دونوں دروازوں سے آگ نکل رہی ہے اسے جلانے والا کبھی دونوں دروازے کھول دیتا ہے اور کبھی دونوں بند کر دیتا ہے پھر اس نے مستقل ایک کو بند اور ایک کو کھلا رہنے دیا، جب میں نے ان دونوں دروازوں کو بغور دیکھ لیا تو بادشاہ نے مجھ سے کہا "مصرعہ لگاؤ":-

بادشاہ کا دیا ہوا مصرعہ:-

أنظرها في الظلام قد نجما

ان دونوں کو دیکھو کہ وہ اندھیرے میں چمک رہے ہیں۔

میں نے اس پر یہ مصرعہ لگایا:-

كما رنا في الدجنة الاسد

جیسے تاریکی میں شیر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہو۔

پھر بادشاہ نے مصرعہ پڑھا:-

يفتح عينيه ثم يطبقها

وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے پھر انہیں بند کر لیتا ہے۔

میں نے اس پر یہ مصرعہ لگایا:-

فعل امرئ في جفونه رمد

اس شخص کی طرح جسے آشوب چشم کی شکایت ہو۔

پھر بادشاہ نے مصرعہ پڑھا:-

فابتزّه الدهر نور واحدة
پھر زمانے نے اس کی ایک آنکھ کی روشنی چھین لی۔
اور میں نے اس پر یہ مصرعہ لگایا:۔

وهل نجا من صروفه احد؟
اور بھلا حوادث زمانہ سے کبھی کوئی بچا بھی ہے؟

اس پر بادشاہ نے بڑی داد دی اور میرے لیے گراں قدر انعام کا حکم دیا اور مجھے مستقل اپنی خدمت میں مقرر کر لیا۔

بعد ازاں شاعر ایک مدت مدید تک بادشاہ کے انعام و اکرام میں آسودہ زندگی گذارتا رہا تا آنکہ ابن تاشفین نے اپنی کامیابی کے بعد اس حاکم کو تخت سے اتار کر جلا وطن کر دیا، چنانچہ ابن حمدیس بھی بادشاہ کی جلا وطنی میں اس کا شریک رہا۔ چار سال کے بعد بادشاہ افلاس و پریشانی میں مرگیا اور ہمارا یہ شاعر افریقہ کی راج دھانی مہدیہ میں اقامت گزیں رہا پھر وہاں سے میورقہ منتقل ہو گیا اور وہیں پریشان حالی اور آنکھوں سے معذور ہو کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

اس کے اخلاق و عادات:۔ ابن حمدیس صحیح العقیدہ، باوقار و سنجیدہ، نازک مزاج و حساس، قوی النظر، جفاکش و محنتی تھا اس کی طبیعت میں انقباض تھا اور وہ بدشگونی کا سختی سے قائل تھا۔ بایں ہمہ وہ خوش اخلاق اور اچھا ساتھی تھا۔ مجالس طرب میں شریک ہوتا اور رندوں کی محفلوں میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن کرم خلق، عفت نفس، اور سلامتی آبرو کے ساتھ۔ ان مجلسوں اور محفلوں کا وہ نہایت عمدگی اور طرفگی سے وصف بیان کرتا تھا، وہ کہتا ہے:۔

اصف الراح ولا اشربها — وهي بالشدو على الشرب تداد
كالذي يامر بالكر ولا — يصطلي نار الوغى حيث تقود

میں شراب کی تعریفیں کرتا ہوں لیکن اسے پیتا نہیں ہوں حالانکہ گانے کے ساتھ رندوں میں اس کا دور چل رہا ہوتا ہے۔ اس شخص کی طرح جو حملہ کا حکم دیتا ہے لیکن جنگ کی آگ میں جلتا نہیں۔

اس کے یہ اخلاق و عادات ہم نے اس کی شاعری سے اخذ کیے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا اس کے ایسے اخلاق پیدائشی طور پر تھے یا اپنے وطن میں جو مصائب برداشت کی تھیں ان کا نتیجہ تھے۔

اس کی شاعری:۔ اس کی شاعری صاف آئینہ ہے جس میں مذکورہ بالا اخلاق کھلے طور پر نظر آتے ہیں۔ اس کے الفاظ ستھرے اور افکار پاکیزہ ہیں سطحی مذاق

اور بے راہ روی کی اس میں جھلک بھی نہیں۔ جور ایام، لؤم ابنائے زمان، اور پھر درازی عمر نے اسے زندگی سے بیزار، لوگوں سے شاکی، اور نفس کا باغی بنا دیا تھا۔ اور اس نے زہد و تصوف پند و نصیحت میں ابوالعتاہیہ کا طرز اختیار کر لیا تھا جس کی زبان واضح اور اسلوب بیان خوشنما تھا۔ کبھی اس کی طبیعت میں جلاء اور سینے میں انشراح ہو جاتا ہے اور اس کے احساسات و جذبات کے دروازے فطرت کا جمال، زندگی کا کیف، کائنات کی نیرنگیاں اور عجائبات دیکھنے کے لیے کھل جاتے ہیں۔ اور وہ نہایت خوشنما الفاظ، دلکش انداز، نازک عکاسی اور صاف عبارت میں نہر، پھول، شکار گھوڑے، رات، محلات، مجالس طرب کا وصف بیان کرتا ہے۔ اس کی ہلکی سی جھلک اس کے ان اشعار میں بھی نظر آ سکتی ہے جو ہم اگلے صفحات میں پیش کر رہے ہیں۔ اس کی تمام شاعری دیوان کی شکل میں بالرم میں ۱۸۸۳ء میں اور رومیہ میں ۱۸۹۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ نہر کے وصف میں کہتا ہے:۔

ومطرد الاجزاء يصقل متنه ... صبا اعلنت للعين ما في ضميره

جريح باطراف الحصى كلما جرى ... عليها شكا اوجاعه بخريره

اس کے اجزاء لگاتار ایک دوسرے کے پیچھے چلے آ رہے ہیں، بادِ صبا اس کی پشت کو چمکا رہی ہے۔ اس کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ وہ آنکھ سے دیکھنے والے کو اپنی اندرونی حالت بھی بتا رہی ہے۔ جب وہ پتھروں پر بہتی ہے تو پتھروں کے کناروں سے زخمی ہو جاتی ہے اور خر خراہٹ کے ذریعہ اپنی تکلیف کا شکوہ سے کرتی ہے۔

منصور بن اعلی الناس نے بیجانہ کے محل میں ایک حوض بنایا تھا جس پر سونے چاندی کے درخت اور سنگ مرمر کے شیر بنے ہوئے تھے، پانی درختوں کے کناروں بہتا اور شیروں کے منہ سے نکلتا تھا، اس کا وصف کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:۔

وضراغم سكنت عرين رئاسة ... تركت خرير الماء فيه زئيرا

فكانما غشى النضار جسومها ... واذاب فى افواهها البلورا

اسدا كان سكونها متحرك ... فى النفس لو وجدت هناك مثيرا

وتذكرت فتكاتها فكانها ... اقعت على ادبارها لتثورا

وتخالها والشمس تجلو لونها ... نارا والسنها اللواحس نورا

فكانما سلت سيوف جداول ... ذابت بلا نار فعدن غديرا

وكانما نسج النسيم لمائه ... درعا فقدر سردها تقديرا

وبديعة الثمرات تعبر نحوها ... عيناى بحر عجائب مسجورا

شجريه ذهبية نزعت الى ... سحر يوثر فى النهى تاثيرا

قد سرّجت اغصانها فكانما — قبضت بهن من الفضاء طيورا
وكانما تابى لوقع طيرها — ان تستقل بنهضها ونطيرا
من كل واقعة ترى منقارها — ماء كسلسال اللجين نميرا
خرس تعد من الفصاح فان شدت — جعلت تغرد بالمياه صفيرا
وكانما فى كل غصن فضة — لانت فارسل خيطها مجرورا
وتريك فى الصهريج موقع قطرها — فوق الزبرجد لؤلؤاً منثورا
ضحكت محاسنه اليك كانما — جعلت لها زهر النجوم ثغورا

اپنے گناہوں کا رونا روتے ہوئے اور اپنے سے بخشش کا طالب ہوتے ہوئے کہتا ہے:۔

یا ذنوبي تقلّتِ والله ظهري — بان عذري فكيف يقبل عذري
كلما تبت ساعة عدت اُخرى — بضروب من سوء فعلى وهجري
ثقلت خطوتي وفودى تفرّى — غيهب الليل فيه عن نور فجري
دبّ موت السكون في حركاتي — وخبا في رماده حرّ جمري
وانا حيث سرت اكل رزقي — غير ان الزمان يأكل عمري
كلما مرّ منه وقت بربح — من حياتي وجدت في الربح خسري
يا رفيقا بعبده ومحيطاً — علمه باختلاف سري وجهري
مِل بقلبي الى صلاح فسادي — منه واجبر برافه منك كسري
واجرني بما جناه لساني — وتناجت به وساوس فكري

اے میرے گناہو! بخدا تم نے تو میری پیٹھ گرانبار کردی، میرا عذر ظاہر ہوگیا، اب میرا عذر کیوں کر قبول ہوگا۔ جب بھی میں کسی گھڑی توبہ کرتا ہوں تو دوسری گھڑی میں اسے مختلف بداعمالیوں اور یاوہ گوئی کے ذریعہ توڑ ڈالتا ہوں۔ میرے قدم بھاری ہو گئے اور میرے بال سفید ہوگئے۔ میری حرکتوں میں موت کا سکون سرایت کر رہا ہے اور اس کی راکھ میں میرا شعلہ بجھ رہا ہے، میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنا رزق کھاتا ہوں لیکن زمانہ میری عمر کھاتا رہتا ہے۔ جب بھی میری زندگی کا کوئی وقت نفع بخشتے ہوئے گذرتا ہے میں اس نفع میں بھی اپنا نقصان ہی پاتا ہوں۔ اے اپنے بندہ پر مہربان! اور میرے ظاہر و باطن کے اختلاف کو اپنے علم سے گھیر لینے والے! میرے دل کو مائل کر کہ وہ اپنے فساد کی اصلاح کرے اور اپنی مہربانی سے میری شکستگی کو جوڑ دے، میری زبان اور میری فکر کے وسوسے جو سرگوشیاں کرتے ہیں ان کی لغزشوں سے مجھے محفوظ رکھنا۔

اپنے قصیدہ میں زمانہ کا نالہ، اور اپنے دوستوں اور برادروں کا شکوہ کرتے

ہوئے کہتا ہے :-

اتحسبنی انسی وما زلت ذاکراً ۔۔۔ خیانة دھری او خیانة صاحبی؟
تغذّی باخلاقی صغیراً ولم تکن ۔۔۔ ضرائبه الا خلاف ضرائبی
ویا رُبّ نبت تعتریه مرارة ۔۔۔ وقد کان یسقی عذب ماء السحائب
علمت بتجریبی اُموراً جھلتھا ۔۔۔ وقد تجھل الاشیاء قبل التجارب
ومن ظن امواه الخضارم عذبة ۔۔۔ قضی بخلاف الظن عند المشارب
ولما رایت الناس یرھب شرھم ۔۔۔ تجنّبتھم واخترت وحدة راھب

کیا تو سمجھتا ہے کہ میں زمانہ کی جفاکاری اور اپنے دوست کی بیوفائی بھول گیا ہوں؟ نہیں مجھے یہ سب کچھ یاد ہے۔ یہ میرا دوست بچپن سے میرے اخلاق وعادات سیکھتا رہا لیکن اس کی طبیعت میری طبیعت سے نہ مل سکی، ایسے بہت سے پودے ہیں جنہیں بارش کا میٹھا پانی پلایا جاتا ہے لیکن ان کا مزا تلخ ہو جاتا ہے۔ میں نے تجربہ سے بہت سی ایسی باتیں معلوم کر لیں جو میں پہلے نہیں جانتا تھا، اور تجربوں سے پہلے بہت سی چیزیں لامعلوم ہوتی ہیں۔ اور جو سمندروں کے پانی کو شیریں خیال کرتا ہے وہ جب اسے پئے گا تو اس کا خیال غلط ثابت ہوگا۔ جب میں نے دیکھا کہ لوگوں کی بدی سے ڈرا جاتا ہے تو میں ان سے کنارہ کش ہو گیا اور میں نے راہبانہ تنہائی اختیار کر لی۔

اس کی عشقیہ شاعری :-

عذّبت رقّة قلبی ۔۔۔ ظلما بقسوة قلبك
وسُمْت جسمی سُقْما ۔۔۔ وما شفیت بطبّك
من لی بصبر جمیل ۔۔۔ علی ریاضة صعبك
فیا تشوّقی بعدی ۔۔۔ الی تنسّم قربك
وو جنة غمستها ۔۔۔ فی الورد صنعة ربك
لقد جنحت لسلمی ۔۔۔ کما جنحت لحربك
فیالدلال الذی زاد م ۔۔۔ فی ملاحة عجبك
فکیّ من الأسر قلبًا ۔۔۔ علیه طابع حبّك
و نعمینی بعتبی ۔۔۔ فقد شقیت بعتبك

تو نے ظلم کرتے ہوئے میرے دل کی رقّت کو اپنے دل کی قساوت سے تکلیف پہنچائی اور میرے جسم کو بیمار کر دیا، اور تیری مسیحائی مجھے شفا نہ دے سکی، تو جو مشق ستم کر رہی ہے میں اس پر تاب صبر و ضبط کہاں سے لاؤں۔ تیرے قریب کی مہک کے سونگھنے کے لیے اور اس رخسار کے نظارہ کے لیے جسے قدرت کی کاریگری نے گلاب میں غوطہ دیا ہے میری دوری

کس قدر بے تابانہ مشتاق ہے۔ میں اپنے سے صلح کرنے کے لیے اسی طرح مائل ہوں جیسے تجھ سے لڑائی کرنے پر مائل ہوں۔ تو اپنے اس ناز و انداز سے جس نے تیرے حسن و غرور میں اضافہ کر رکھا ہے، اس دل کو قید سے رہا کر دے جس پر تیری محبت کی مہر لگ چکی ہے اور مجھے اپنی خوشنودی سے بہرہ ور کر دے کہ میں تیرے عتاب سے پریشان ہو چکا ہوں۔

ابن خفاجہ اندلسی

(پیدائش ۴۵۰ھ وفات ۵۳۳ھ)

پیدائش اور حالاتِ زندگی:- ابو اسحٰق ابراہیم بن خفاجہ اندلسی شقر نامی شہر یا بقول عرب جزیرہ شقر میں پیدا ہوا۔ اس کی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے فن کاروں کی طرح ہر قسم کی قید و بند سے آزاد رہ کر زندگی گذاری اس لیے نہ کوئی کارنمایاں انجام دیا۔ نہ کسی ملازمت پر فائز ہوا۔ نہ ہی طوائف الملوکی کے زمانہ میں کسی بادشاہ کے اعانت کا طالب ہوا حالانکہ بادشاہوں کو اس جیسے شعراء کی شدید ضرورت تھی۔ اس نے اپنے آپ کو دنیوی مشاغل سے ہٹا کر اپنے نفس کو وقف جمال، اپنی فکر کو محو خیال اور اپنے احساس کو لذت اندوزی میں منہمک رکھا اور اپنی تمام صلاحیتوں کو فطرت کے حوالہ کر دیا۔ وہ فطرت کے مناظر، مرغزاروں، ندی نالوں، گھنے سایہ دار درختوں، وادیوں اور نشیبی زمینوں میں گھومتا رہتا، ہر حسین و دلفریب چیز سے لطف اندوز ہوتا، ہر واقعہ کا وصف بیان کرتا، پھر وہ واپس ہوتا اور شراب کے لبریز جام نوش کرتا، حسین صورتوں کا نظارہ کرتا یا محروم پھلوں کو چنتا۔ اسی انداز سے اس کی عمر گذرتی رہی تا آنکہ ۵۳۳ھ میں وہ اپنے پیدائشی وطن میں وفات پا گیا۔

اس کی شاعری:- ابن خفاجہ مصور فطرت شاعر تھا۔ فطرت کے جمال اور زندگی کے حسن سے اس کے دل و نگاہ بھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ اسی حسن و جمال کی عکاسی وہ اپنے الفاظ سے کرتا ہے، وہ پاکیزہ اسالیب اور شوخ رنگوں کا انتخاب کرتا، ان پر بدیع کا ملمع چڑھاتا، پھر ان میں مجاز و تشبیہ کا رنگ بھرتا۔ اس کی شاعری میں کثرت تکرار ہے لیکن وہ اپنی تنوع مزاجی اور نیرنگی طبع نیز شاعری میں محسوس مناظر کی عکاسی کے باعث اپنے پڑھنے والے کو دل برداشتہ نہیں ہونے دیتا۔ باقی رہا اس کی شاعری میں پختہ آراء عمیق معانی اور فلسفیانہ افکار کی تلاش کا مسئلہ تو اس کی شاعری کے مطالعہ کرنے والے کو ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اس شاعر کی نثر بھی ملتی ہے جو نہایت بوگس اور پر تکلف ہے[۱] جس کے مطالعہ سے ایک مرتبہ پھر اس امر کی تائید ہوتی

---

[۱] اپنے ایک دوست کو جو قطع تعلق کر چکا ہے دوستی پر مائل کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:- (باقی حاشیہ ص۴۳۷ پر)

ہے کہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں جو بیک وقت عمدہ شاعری اور نثر نگاری کر سکتے ہوں۔

اس کی شاعری کا نمونہ پھول کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

ومائسة تزهی وقد خلع الحیا علیها حلی حمرا واردیة خضرا
یذوب لها ریق الغمائم نضة ویجمد فی اعطافها ذهبا نضرا

تکبر سے مستی میں جھومنے والا، جسے حیا نے سرخ زیورات اور سبز چادریں پہنا دی ہیں۔ جس کے لیے بادلوں کا لعاب دھن چاندی بن کر پگھلتا ہے اور اس کے شانوں پر وہ جم کر خوشنما سونے کی طرح منجمد ہو جاتا ہے۔

مرغزار سے بل کھاتی ہوئی گذرنے والی ایک چھوٹی سی نہر کا وصف کرتے ہوئے جس کے مناظر مختلف انداز سے سامنے آتے ہیں، وہ کہتا ہے:۔

لله نهر سال فی بطحاء اشهی ورودًا من لمی الحسناء
متعطف مثل السوار کانه و الزهر یکنفه، مجرّ سماء
قد رقّ حتی ظن ترصا مفرغا من نضة فی بردة خضراء
و غدت تحف به الغصون کانّها هدب یحف بمقلة زرقاء
والماء اسرع جریه متحدّرا متلوّیا کالحیة الرقطاء
والریح تعبث بالغصون وقد جرى ذهب الاصیل علی لجین الماء

وہ نہر جو بطحاء میں رواں ہے شان خداوندی کی مظہر ہے اس کا پانی پینے کے لیے طبیعت، حسینہ کے ہونٹوں کو چوسنے سے بھی زیادہ اشتیاق رکھتی ہے۔ وہ کنگن کی طرح گولائی میں مڑتی ہوئی جا رہی ہے اور پھول اور پودے اسے گھیرے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ آسمان کی کہکشاں ہے۔ اپنے پانی کی صفائی کی وجہ سے وہ ایسی لگتی ہے جیسے چاندی سبز چادریں ملبوس ہو رہی ہو۔ سر شام جبکہ اس میں شفق کا سونا پانی کی چاندی پر رواں ہے، ہوا ان شاخوں کو چھیڑ رہی ہے۔

سرزمین اندلس کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

یا اهل اندلس لله درکم ماء وظل وانهار واشجار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۶ کا) اطال الله بقاء سیدی اضافه، التنزیهة عن الاستثناء المرفوعة امارته الکریمة بالابتداء، ما لمنجذ فت یاء یرثی للجزم، واعتلت واو یغزو لموضع الضم، کتبت عن ود قدیم، هو الحال لم یلحقها انتقال، وعهد کریم هو الفعل لم یدخله اعتلال، والله یجعل هاتیك من الاحوال الثابتة اللازمة ویعصم هذا بعد من الحروف الجازمة، وانا استنهض طولك الی نجد یذاعهدك بمطالعة الف الوصل بتعدیة فعل الفصل...... الخ یہ تمام کا تمام خط اسی قسم کی بے تکی عبارت کا مجموعہ ہے۔

ما جنّة الخلد الا فی دیارکم ولو تخیّرت هذی کنت اختار

اے اندلس والو! خدا نے تمہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا ہے، تمہارے ملک میں پانی اور سایہ ہے، نہریں اور درخت ہیں۔ تمہارے ملک کے سوا اور کہیں جنت الخلد نہیں ہے اور اگر مجھے ان دونوں جنتوں میں سے ایک کے انتخاب کا موقع دیا جاتا تو میں اسی کو انتخاب کرتا۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ کہتا ہے:-

ان للجنة بالاندلس منجلی عین وریّا نفس
فسنا صبحتها من شنب ودجا لیلتها من لعس
فاذا ماھبّت الریح صبا صحت: واشوقی الی اندلس!

جنتِ اندلس میں آنکھوں کے لیے خوشنما مناظر اور نسیم صبا کی خوشبوئیں ہیں۔ اس کی صبح کی روشنی محبوب کے دانتوں کی چمک سے مشابہ ہے اور رات کی تاریکی محبوب کے ہونٹوں کے حسین سرگیں رنگ سے مشابہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب نسیم صبا کے جھونکے چلتے ہیں تو میں فرط شوق سے چلا اٹھتا ہوں کہ ہائے اندلس!

اس چولہے کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے جس پر ہوا چلی اور اس نے اسے بھڑکا دیا۔

لاعب تلک الریح ذاک اللھب فعاد عین الجد ذاک اللعب
وبات فی مسری الصبا ینبعه فھو لھا مضطرم مضطرب
ساھرته احسبه منتشیاً یھز عطفیه ھناک الطرب
لوجاءه منتقد لما دری الھب منتقد ام ذھب؟
تلثم منه الریح خداً خجلا حیث الشرار اعین ترتقب
فی موقد قد رقرق الصبح به ماء علیه من نجوم حبب
منقسم بین رماد ازرق وبین جمر خلفه یلتھب
کانما خرّت سماء فوقه وانکدرت لیلا علیه شھب

اس ہوا نے ان شعلوں سے کھیلنا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر میں وہ کھیل عین سنجیدہ شکل اختیار کر گیا، یہ باد صبا کی گذرگاہ میں تھی جہاں وہ اس کی وجہ سے بھڑکتی اور مضطرب ہو رہی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ جاگتا رہا میرا خیال تھا کہ وہ نشہ میں ہے اور مستی اسے جھوما رہی ہے، اگر کوئی نقاد صاحب نظر بھی آئے تو وہ بھی یہ فیصلہ نہ کر سکے گا کہ یہ آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں یا سونے کے ٹکڑے چمک رہے ہیں۔ ہوا ان شعلوں کے سرخ رخسار کو چوم رہی تھی اور شرارے وہاں رقیبوں کی آنکھیں بنے ہوئے تھے۔ اس آگ کے جلنے کی جگہ صبح نے پانی برسایا اور اس پر تاروں کے بلبلے تھے اور وہ آگ دو حصوں میں منقسم ہو گئی ایک حصہ تو نیلگوں راکھ کا تھا اور دوسرے وہ چنگاریاں جو اس کے پس پردہ جل رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آسمان اس کے

اوپر گر گیا ہے اور رات میں اس کے تارے دھندلے پڑ گئے ہیں۔

تیرتے ہوئے خوبصورت جوان کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وصقيل افرند الشباب، بطرفه سقم . وللعضب الحسام ذباب
يمشي الهوينى نخوة و لربما اطرته طوراً نشوة و شباب
شتى المحاسن، للوضاءة ربطة ابداً عليه ، وللحياء نقاب
وبمعطفيه للشبيبة منهل قد اشف عنه من القميص سراب
عبر الخليج سباحة فكانما اهوى نشق به السماء شهاب
تطفو لغرته هناك حبابة و يموج من ردف الف عباب

اور جوان جو جوانی کی آب و تاب سے چمک رہا تھا، جس کی نگاہ میں بیماری ہے۔ اور تیز تلوار کی دھار ہوتی ہے۔ وہ نخوت سے آہستہ چلتا ہے اور کبھی شباب ومستی اسے بھڑکا دیتی ہے۔ وہ مختلف خوبیوں کا مالک ہے، اس پر ہمیشہ حسن کی چادر اور حیا کا نقاب پڑا رہتا ہے۔ اس کے کاندھوں پر جوانی کا گھاٹ ہے اور سراب اس قمیص میں سے جھانک رہا ہے۔ اس نے نیر کر خلیج کو اس طرح عبور کیا جیسے وہ شہاب تھا جس نے ٹوٹ کر آسمان کو شق کر دیا ہو۔ اس کی روشن پیشانی بلبلہ بن کر پانی پر تیر رہی تھی اور سمندر جوش میں موج پر موج مار رہا تھا۔

لسان الدین بن الخطیب

(پیدائش ۷۱۳ھ وفات ۷۷۶ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات:۔ یہ ذوالوزارتین ابو عبد اللہ لسان الدین المعروف بہ ابن الخطیب ہے۔ ۷۱۳ھ میں علم و ریاست وسیادت کی آغوش میں بمقام غرناطہ پیدا ہوا۔ وہاں کے علماء سے علوم عربیہ وشرعیہ، فلسفہ وطب، ریاضی وتاریخ کی تعلیم حاصل کی اور ان تمام علوم میں اپنے ہمعصر ادباء اندلس سے سبقت لے گیا۔ پھر ادب و شاعری کے وسیلہ نے اسے حاکم غرناطہ ابوالحجاج یوسف (۷۳۳ھ تا ۷۵۵ھ) تک پہنچا دیا، چنانچہ سلطان نے اسے اپنا سکریٹری مقرر کر لیا، پھر بعد میں وزیر بنا لیا اور امور مملکت میں اس کو آزادانہ تصرف کا اختیار دے دیا، جس سے اس کا رسوخ بڑھ گیا اور اس کا معاملہ نہایت درجہ اہمیت اختیار کر گیا۔ وہ اپنے اس عہدہ پر ابوحجاج کی وفات تک رہا اور اس کے بعد جب اس کا بیٹا محمد خامس تخت نشین ہوا تو اس نے بھی وزارت پر اسے بحال رکھا۔ لیکن چغل خوروں نے شکایتیں پہنچا کر دونوں کے تعلقات خراب کرا دیے اور بادشاہ اس سے بدظن ہو گیا۔ تب ابن خطیب نے بھاگ کر افریقہ میں پناہ لی، جہاں کے بادشاہوں نے اس کی بڑی

عزت وتکریم کی۔ پھر وہ مسلسل شدائد ومصائب میں گھر گیا اور بالآخر اپنے دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا، جنہوں نے اس کے فلسفیانہ مشاغل وافکار کی بناء پر اس کے خلاف الحاد کا فتوے دے دیا۔ چنانچہ بعض غنڈے جیل کی دیوار پھاند کر اس کے پاس پہنچے اور اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔

انشاء پردازی میں اس کا مقام :- لسان الدین فطری طور پر سجع نگار تھا۔ وہ اپنے فن میں اپنی طبیعت کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اپنے رسائل میں وہ اندلسی انشاء نویسوں کی طرح مضمون کو پھیلاتا اور طول دے کر بیان کرتا تھا اور بسا اوقات ایک بڑا رسالہ پورا کا پورا ایک ہی روی میں لکھ دیتا تھا۔ اندلسیوں پر شاعری غالب ہونے کی وجہ سے ان کی نثر میں بھی خیال آفرینی وصنعت کا زور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تکلف سجع بندی، بتعمد تحسین عبارت نیز مضمون کو بیان کرنے میں طول دینے کے سبب سے، ان کی نثر خوشگوار و پسندیدہ خاطر اور مقبول نہیں ہوتی۔ اندلسی طبعاً شاعر ہیں اور بتکلف نثر نگار۔ اور جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے وہ اس سلسلہ میں اہل مشرق سے مختلف ہیں۔

اس کی شاعری کے الفاظ نرم وشستہ، معانی لطیف وپسندیدہ، نیز فنی لحاظ سے وہ مقبول ہے۔ اندلس میں علم وادب کی امامت اسی طرح اس پر ختم ہو گئی تھی جس طرح افریقہ میں علم وادب کی قیادت اس کے ہم عصر ابن خلدون پر ختم ہو گئی۔ ابن الخطیب کا تاریخ میں نہایت بلند مقام تھا۔ اس مضمون میں اس نے تقریباً ساٹھ تصانیف چھوڑی ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ" ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اور غرناطہ کی شخصیتوں کی یہ ایک تاریخی ڈکشنری ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ :- اپنی مشہور موشح میں جو اس نے ابن سہل کی موشح کے مقابلہ میں کہی ہے وہ کہتا ہے :-

جادك الغيث اذا الغيث همى ‏ ‏ ‏ يا زمان الوصل بالاندلس
لم يكن وصلك الاحلما ‏ ‏ ‏ فى الكرى اوخلسة المختلس

اے اندلس کے زمانہ وصل! خدا تجھے موسلادھار بارش سے سرسبز وشاداب رکھے۔ تیرے وصل کا زمانہ ایک خواب تھا یا جھپٹا مارنے والے کا ایک تیزی کا جھپٹا تھا جو آنکھ جھپکنے میں گذر گیا)۔

اس موشح کے چند منتخب بند :-

يا اُهيل الحىّ من وادى الغضا ‏ ‏ ‏ و بقلبى سكن انتم به
ضاق عن وجدى بكم رحب الفضا ‏ ‏ ‏ لا اُبالى شرقه من غربه
فاعيدوا عهد اُنس قد مضى ‏ ‏ ‏ تُعتقوا عانيكم من كربه

واتقوا الله واحیوا مغرما یتلاشی نفسا فی نفس!
حبس القلب علیکم کرما افترضون عفاء الحبس؟

اے وادیِ غضا کے باشندو! میرے دل میں تمہارے بسنے کی جگہیں ہیں جس میں تم موجود ہو۔ تمہارے غمِ فراق میں یہ کشادہ فضا میرے لیے تنگ ہو گئی ہے، نہ مجھے مشرق کا ہوش ہے نہ مغرب کا۔ خدارا! اس محبت کے زمانہ کو پھر سے واپس لے آؤ اور اپنے قیدی کو اس درد وکرب سے رہائی دے دو۔ خدا سے ڈرو اس عاشق کو جو دم بدم ختم ہو رہا ہے حیات بخش دو۔ اس نے اپنی شرافت کے سبب اپنا دل تمہارے لیے وقف کر دیا ہے کیا تمہیں منظور ہے کہ تمہارے اسیر مٹ جائیں؟

وبقلبی فیکم مقترب باحادیث المنی، وھو بعید
قمر اطلع منه المغرب شقوۃ المغری به وھو سعید
قد تساوی محسن او مذنب فی ھواہ بین وعد ووعید
ساحر المقلة معسول اللمی جال فی النفس مجال النفس
سدد السهم وسمّی ورمی ففؤادی نهبة المفترس

میرا دل تمناؤں کے ذریعہ تم سے قریب ہو جاتا ہے حالانکہ وہ دور رہوتا ہے۔ چاند ہے جسے مغرب نے عاشق کی بدبختی کے لیے نکالا ہے، حالانکہ وہ بختاور ہے۔ اس کی محبت میں وعدہ اور ..... وعید کی وجہ سے نیکوکار و مجرم یکساں ہو گئے۔ اس کی آنکھ میں جادو اور لبوں میں شہد ہے، وہ جی میں اس طرح سے پھرنے لگا جیسے بدن میں سانس چلتی ہے۔ اس نے تیر کو تاکا، خدا کا نام لیا، پھر تیر پھینک دیا اور میرا دل شکاری کے ہاتھ میں لوٹ کا مال بن گیا۔

ان یکن جار وخاب الامل وفؤاد الصب بالشوق یذوب
فھو للنفس حبیب اول لیس فی الحب لمحبوب ذنوب
امرہ معتمل ممتثل فی ضلوع قد براھا وقلوب
حکم اللحظ بها فاحتکما لم یراقب فی ضعاف الانفس
منصف المظلوم ممن ظلما ومجازی البر منها والمسی

اگر اس نے ظلم کیا، اور آرزو بر نہ آئی اور عاشق کا دل وفورِ شوق سے پگھلتا رہا تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ وہ پہلا محبوب ہے جسے دل نے چاہا اور محبت میں محبوب کا کوئی جرم نہیں ہوتا۔ اس کا حکم واجب العمل اور اس کا فرمان اس دل وجگر میں نافذ ہے جسے اس نے زخمی کر دیا ہے۔

ما لقلبی کلما ھبت صبا عادہ عید من الشوق جدید
کان فی اللوح له مکتتبا قوله ان عذابی لشدید

جلب الهم له د الموصبا　　فهو للأشجان فی جهد جهید
لاعج فی اضلعی قد اضرما　　فهی نار فی هشیم الیبیس
لم یدع فی مهجتی الاذما　　کبقاء الصبح بعد الغلس

خدا جانے دل کو کیا ہوا ہے کہ جب باد صبا چلتی ہے وہ مچل جاتا ہے اور اس کا شوق از سرنو عود کر آتا ہے۔ اس کی لوح پر اس کا یہ قول لکھا ہوا تھا: "میرا عذاب نہایت سخت ہے۔" میرے دل کے لیے اس نے غم و فکر اور بیماری کا تحفہ دیا۔ چنانچہ وہ دکھوں سے بے چین و بے تاب ہے۔ اس نے میرے سینے میں ایک آگ سی لگا دی ہے جو خس و خاشاک میں آگ کی طرح پھیل گئی ہے۔ میری جان کو اس نے اسی طرح آخری حالت میں چھوڑ دیا جیسے فجر کی تاریکی کے بعد صبح کا حال ہوتا ہے۔

نمونۂ نثر:- اس کے مختصر خطوط میں سے ایک وہ خط ہے جو اس نے ابن خلدون کو لکھا تھا، اس میں وہ اپنے جذب شوق کی کیفیت بیان کر رہا ہے:-

شوق کا یہ حال ہے کہ وہ سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور صبر کا یہ عالم کہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں مر گیا ہے۔ بہر حال شدت سے سہولت وابستہ ہے اور مومن اللہ کی رحمت سے آس نہیں توڑتا۔ لیکن شہد کی مکھیوں کے ڈنکوں پر صبر ہو کیسے؟ نہیں بلکہ یہ تو وہ مار ہے جس سے گوشت کے پرخچے اُڑ گئے ہیں پھر روز و ماہ کی دست درازیاں، حتیٰ کہ قہر کا تسلط ہو گیا۔ کیا آنکھوں دیکھتے اندھوں کی طرح تسلی حاصل کر لی جائے یا زاہد کی طرح دل و دماغ سے ان تاثرات کو دور ہی رکھا جائے؟ بدن میں ایک ہی تو گوشت کا ٹکڑا ہے کہ جب وہ ٹھیک کام کرے تو بدن ٹھیک رہتا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ جب وہی ٹکڑا اچل دے تو بدن کا کیا حال ہو گا؟ اور جہاں یہ حال ہو کہ فراق ہی سے موت شروع ہو جائے تو آیندہ کے مرحلوں میں کس پر اعتبار کیا جائے؟ فراق کی چارہ گری میں ہی تمام چارہ گر جواب دے بیٹھے اور شوق کی سوزش ہی دل کا خاتمہ کرنے لگی۔

تم نے تو مجھے اپنے فراق کے بعد بے تاب و بے قرار چھوڑ دیا، گاہ میں اپنے دانت ندامت سے پیستا ہوں اور گاہ آنکھوں سے آنسو بہاتا ہوں۔

―――― :o: ――――

عہدِ فاطمیین میں مصری علوم و فنون اور شاعری و انشا پردازی

حکومت میں ابتری، بدنظمی، وزراء کے استبداد، اور لیڈروں کی باہمی کشمکش کی وجہ
سے متوکل علی اللہ کے بعد عباسیوں کا دور دورہ ختم ہوگیا۔ گورنروں نے ہر طرف سے ان کی
سلطنت کم کرنا شروع کر دی، انقلاب پسند باغیوں نے ان کے بیشتر علاقوں کو اپنے ماتحت کر
لیا۔ اس تقسیم شدہ لوٹ میں فاطمی علویوں نے بھی حصہ لیا تھا، چنانچہ انہوں نے اس سلطنت
میں سے پہلے شمالی افریقہ، پھر مصر اور شام و حجاز بھی اپنے قبضہ میں لے لیا۔

ان کا پہلا خلیفہ عبید اللہ بن محمد ۲۹۶ھ میں قیروان میں جلوہ افروز ہوا، پھر ان کے
چوتھے خلیفہ المعز لدین اللہ نے اپنے کمانڈر اور سکریٹری جوہر صقلی کو ایک لشکر جرار کے ساتھ
مصر بھیجا۔ چنانچہ اس نے بزور تلوار اسے فتح کیا اور سونے کے بل بوتہ پر وہاں حکومت قائم
کی۔ ۳۵۸ھ میں اس نے اپنے اسی مقام پر جہاں اس نے پڑاؤ ڈالا تھا، اپنے آقا کے لیے
ایک بڑے محل کی اور اللہ کے لیے جامع ازہر[1] کی بنیاد رکھ دی اور فوج کو ان دونوں

---

[1] **الازہر اور اس کے آثار:** الازہر قاہرہ کی سب سے پہلی جامع مسجد، مصر کی قدیم ترین
درس گاہ اور دنیا کی عظیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک
ہے۔ قاہرہ شہر کے حدود وغیرہ کی پیمائش کر لینے کے بعد جوہر صقلی نے الازہر کی بناء ڈال دی تاکہ
وہاں دینی شعائر کو قائم کرنے اور علوی شیعہ کے دینی مسلک کی تائید کے لیے مرکز بنایا جائے۔ اس
نے اس ادارہ کے لیے تمام دنیا کے چوٹی کے علماء و فقہاء کو بلا لیا اور ان کی معاشی آسودگی کے
لیے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کر دیں اور بے اندازہ و بے حساب دولت خرچ کر کے انہیں ہر قسم کی معاشی
فکروں سے آزاد کر دیا، تا آنکہ عزیز باللہ کا وزیر یعقوب بن کلس آیا جو یہودی سے مسلمان ہوا تھا
اور اس نے ان اساتذہ و علماء کی تنخواہیں مقرر کر دیں اور جامع ازہر کے قریب ہی ان کی رہائش کے
لیے مکانات تعمیر کرا دیے۔ یہ فقہاء ہر نماز کے بعد فقہ شیعہ کے درس دیتے، وعظ کی مجلسیں قائم کرتے،
اور قدرے بحث و تحقیق کی شکل بھی اختیار کر لیتے، لغوی اور نحوی مسائل میں بھی حصہ لیتے اور یہاں
مجالس مناظرہ بھی منعقد کرتے تا آنکہ فاطمیوں کی حکومت ختم ہوگئی اور مصر ۵۶۷ھ میں ایوبیوں کے
قائد سلطان صلاح الدین کے زیر نگیں آگیا، یہ اہل سنت تھا۔ چنانچہ اس نے عباسیوں سے بیعت کر
لی، اس نے بجائے شیعہ فقہ کے ازہر میں شافعی فقہ کو نافذ کر دیا۔ ساتھ ہی اس میں فقہ حنفی کی تدریس
بھی جاری کر دی کہ وہ خلفاء بغداد کا مذہب تھا۔ پھر صلاح الدین نے تمام مسلمانوں کے دلوں کو
ہم آہنگ کرنے اور ان کی تالیف قلب کے لیے وہاں چاروں مذاہب کی تعلیم کی اجازت دے
دی۔ اس توسیع نے اس میں علوم لغوی و ادبی کا اضافہ کیا۔ ریاضیات و طبیعیات کا سلسلہ شروع

مقامات کے ارد گرد اتار دیا۔ اور اس کے آگے اینٹوں کی ایک فصیل کھڑی کر دی۔ اس طرح شہر قاہرہ وجود پذیر ہو گیا جسے اسی وقت سے فاطمیوں نے اپنا دار الخلافہ بنا لیا، اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۳ کا) گیا، سقوط بغداد کے بعد عہد غلامان میں جب خلافت و ثقافت مصر میں منتقل ہو گئے الازہر کا ستارہ عروج پر پہنچ گیا۔ چنانچہ اس نے لغت عربی کو زوال سے اور علوم عربیہ و اسلامیہ کو اضمحلال سے بچا لیا۔ اس وقت یہی واحد ادارہ تھا جس سے کرنیں پھوٹ کر تمام عالم اسلامی کو منور کر رہی تھیں۔ ہر عالم اسی ادارہ سے فارغ التحصیل ہوتا اور ہر ادیب و شاعر یہیں سے کمال فن حاصل کرتا تھا تا آنکہ عہد بنی عثمان میں اس ادارہ پر بھی مشرق کا ہمہ گیر جمود طاری ہو گیا۔ ادھر دنیا نئی ہو گئی، علم نے ترقی کی اور معیار تعلیم بلند ہو گیا، لیکن یہ اپنی پرانی حالت پر منجمد اور موروثی طریقہ پر قائم رہا، مگر بایں ہمہ دور جدید کے آغاز میں اسی ادارہ کے کارکن نپولین کے تنظیمی امور میں اس کے دست و بازو بنے اور انہی نے محمد علی کو مقاصد میں کامیاب بنانے میں مدد کی اور یہی وہ پناہ گاہ تھی جہاں جہالت کے تند و تیز سیلاب، ناخواندگی اور آفات کی بلا خیز آندھیوں سے دین و لغت و آداب نے پناہ لی۔ بہرحال مصر اپنی نیند سے بیدار ہو گیا اور اس وقت اسے الازہر کی موجودہ حالت مطمئن نہ کر سکی اس نے اسے اپنی رہنمائی و قیادت کا کما حقہ اہل نہ پایا۔ لہٰذا اس نے مغرب کی طرف اپنا رخ پھیرا، اور وہاں کے چشموں سے اپنی علمی پیاس بجھائی اور وہاں کے پھلوں سے اپنی جھولیاں بھرنے لگا۔ حتیٰ کہ قدیم و جدید تعلیم کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی اور مصر میں دو مختلف ثقافتیں پھیل گئیں جو ایک دوسری سے برسرپیکار رہتیں۔ ایک تو وہ ثقافت جو قدیم کتابوں اور پرپیچ راہوں کے سہارے قائم تھی، اور دوسری وہ ثقافت جو مغربی علوم اور جدید تعلیم پر مبنی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ عوامی تحریک میں حصہ لینے کے لیے الازہر کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ حکومت خدیویہ نے ۱۳۰۵ھ شیخ البابی کے عہد ہی میں اس کی طرف ڈال دی تھی۔ اس نے بڑے پس و پیش اور شرعی فتوی کے بعد بعض نئے علوم الازہر کے نصاب میں داخل کر لیے تھے۔ اس کے بعد امام کبیر مفتی محمد عبدہ نے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، انہوں نے بنیاد ڈال دی لیکن ازہریوں نے عمارت بنانے میں ان کی مزاحمت کی، مگر سیلاب بلا خیز اور روتند و تیز تھی لہٰذا ازہری اس کی تاب مقاومت نہ لا سکے۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور اصلاح قبول کر لی، اور اس کے بعد سے اب تک مسلسل حکومت نے اس کی اصلاح کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔

آج کل الازہر کا تعلیمی سلسلہ مختلف شعبوں میں منقسم ہے، ایک مدرسہ ابتدائی تعلیم کے لیے ہے، دوسرا ثانوی تعلیم کے لیے۔ پھر اعلیٰ تعلیم مختلف شعبوں میں تقسیم کی گئی ہے ایک کلیہ الشریعہ ہے ایک کلیہ اللغہ العربیہ اور ایک کلیہ اصول الدین۔ الازہر کا رقبہ بتدریج بڑھتا رہا تا آنکہ اب یہ بارہ ہزار میٹر میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی آمدنی بھی بڑھتی جا رہی ہے حتیٰ کہ اس سال وہ ہزار دو (باقی صفحہ ۴۶۵ پر)

اس کے تخت پر یکے بعد دیگرے ان کے چودہ خلفاء ۳۵۸ ھ سے ۵۶۷ ھ تک جلوہ افروز ہوتے۔ تا آنکہ سلطان صلاح الدین نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

معز کے مصر میں داخلہ سے مصر کو آزادی و خود مختاری، خلافت اور الازہر جیسی نعمتیں ملیں۔ قاہرہ پر سفید جھنڈا لہرانے لگا جو بغداد کے سیاہ جھنڈے اور قرطبہ کے سبز جھنڈے کا حریف تھا، اور ان تینوں جھنڈوں تلے عربی ادب اور اسلامی تہذیب پھلنے پھولنے اور پھیلنے لگیں۔ مصر میں فاطمیین اور اندلس میں اموی دونوں عراق میں عباسیوں سے مشابہت کی کوشش کرتے تھے۔ وہ انہی کے طریقہ کی اقتدار کرتے تھے اور علم وفن، تہذیب وتمدن، ادب وسیاست میں انہی کے طریقوں سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ لہذا ان امور میں سوائے آب وہوا، تعلیمی طریقہ اور اجتماعی نظام کی تاثیر کے انہوں نے اپنے طور پر کوئی ایسی جدت نہیں پیدا کی جسے ان کی طرف منسوب کیا جا سکے یا جس میں ان پر اعتماد کیا جا سکے۔ لیکن ان تینوں علاقوں کی باہمی کشمکش کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہاں کی حکومتیں شاعروں کو مقرب بنانے، علماء کی حوصلہ افزائی کرنے مدارس بنانے، دفاتر قائم کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگیں، چنانچہ جس طرح ایشیا میں رشید اور اس کے بیٹے نے شہرت حاصل کی، یورپ میں ناصر اور اس کے بیٹے حکم نے شہرت حاصل کی اور افریقہ میں عزیز باللہ اور اس کے بیٹے حاکم نے عزیز کو کتابیں جمع کرنے اور ان کے پڑھنے پڑھانے کا اس قدر شغف تھا کہ اس کے کتب خانے میں جسے اس نے اپنے محل میں بنوایا تھا تقریباً ایک لاکھ کتابیں فقہ، نحو، حدیث، تاریخ اور دیگر علوم کی جمع ہو گئی تھیں۔ اور اس کے وزیر یعقوب بن کلس کو مصر میں ادب پروری اور علم دوستی میں بڑا مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اس کے مکان پر علماء وادباء، فقہاء وشعراء صناعوں اور فن کاروں کا اجتماع ہوتا تھا جنہیں وہ انعامات و امداد بخشتا اور تالیفات کے کچھ حصے پڑھ کر سناتا تھا۔ حاکم بامر اللہ نے بغداد میں مامون کے بنائے ہوئے بیت الحکمۃ کی طرز پر ایک کتب خانہ کی بنا ڈالی اور وہاں تمام بلند پایہ علماء وادباء فقہاء واطباء کو بلوایا، ان کو معقول مشاہرے پیش کیے، اور وہاں عوام کو بھی داخلہ کی اجازت دی۔ چنانچہ وہاں بکثرت مناظرے ہوتے، مختلف موضوعات پر تقاریر ہوتیں اور خود حاکم بنفس نفیس ان میں شرکت کرتا اور اس کی تائید ونصرت کرتا اور مامون کی طرح ان کے انعقاد کا حکم صادر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۴ کا) پونڈ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کی طلبہ کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے جو اب دس ہزار سے متجاوز ہے اور ان طلبہ کو اوقاف کی آمدنی کے ذریعہ خوردونوش، رہائش اور ہاتھ خرچ کی مدد دی جاتی ہے۔ ان میں عرب، ترکستان، سوڈان، مغرب، ایران، شام، عراق، ہندوستان، جاوا، افغانستان وغیرہ سب ہی علاقوں کے طلبہ شامل ہوتے ہیں جو سب کے سب بذریعہ عربی زبان تعلیم حاصل کرتے ہیں اور انہیں اسلامی ثقافت کی غذا دی جاتی ہے۔

کرتا۔ عربی لغت و ادب سے فاطمیوں کا اہتمام اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ وہ دفتری کاروائیوں کی انشا پردازی کی تصحیح و تہذیب کے لیے ماہر ادیب مثلاً ابن بابشاذ متوفی ۴۹۹ھ اور ابن بری متوفی ۵۸۲ھ مقرر کر رکھے تھے۔ جو تمام عربی لکھنے والوں کو عربی انشاء نویسی کی تربیت دیتے تھے۔ عزیز باللہ کی خلافت کے زمانہ میں الازہر کی روشنی دور دور تک پھیلنے لگی تھی۔ اس نے اپنے وزیر یعقوب کو حکم دیا تھا کہ وہ تمام عالم اسلامی سے جس قدر ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ مجتہد فقیہوں کو بلوالے تاکہ وہ مذہب شیعہ کی حمایت اور دعوائے خلافت کی تائید کریں۔ اس نے ان کے لیے معقول مشاہرے دینے اور موزوں مکانات بنوانے کا بھی حکم دے دیا تھا۔ اس طرح یہ فقہاء درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سے ہٹ کر مناظروں اور مباحثوں میں لگ گئے۔ حتیٰ کہ الازہر ایک عظیم القدر اسلامی درس گاہ بن گیا۔

پانچویں صدی کے وسط میں دور معز کا قاہرہ تہذیب و تمدن کے اوج کمال پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی آبادی انتہائی گنجان ہو چکی تھی۔ علوم و آداب اور دیگر فنون کے ماہروں کی وہاں کثرت ہو گئی تھی۔ اقوام گذشتہ اور قرون ماضیہ کا متروکہ سرمایہ وہاں جمع ہو گیا تھا۔ خلفاء و امراء و وزراء کے دل پسند مناظر، عمارات، شاندار محلات، عجیب و غریب قبوں کی تعمیر ہو رہی تھی۔ انوکھی طرز کا دیواروں کا آرائشی حاشیہ بنایا جا رہا تھا۔ اور پھر ان سب چیزوں کو مصر کے فن کار کاریگر نہایت دل کش نقش و نگار اور رنگ برنگ کی پچی کاری سے مزین کرتے تھے۔ پھر رنگین شیشوں سے اس کی آرائش، مرمر اور حسین کاشانی کے چکدار ٹائلوں کا فرش اور چوپڑ کا کام، وہ چیزیں تھیں جن کی وجہ سے قاہرہ بغداد اور قرطبہ کا حریف بن گیا تھا۔ اور یہ چیزیں ساتویں صدی کے اواخر اور آٹھویں صدی کے اوائل میں فن تعمیر اور پچی کاری کا صحیح نمونہ تھیں۔ خلفائے فاطمیین کے اسراف، بیش بہا جواہرات و نوادرات نیز اسلحہ و کتب کی ذخیرہ اندوزی کے بارے میں جو کچھ سنا گیا ہے اس کی نظیر اسلامی تاریخ میں شاذ و نادر ملتی ہے۔ پھر جس تزک و احتشام سے خلفائے قاہرہ میلے، عیدین اور جشن مناتے تھے اس کی مثال کسی دوسری حکومت میں نہیں ملتی۔ ان محفلوں میں شاعری کی بڑی مانگ اور کھپت تھی، اور اس میدان میں شعراء کے باہمی مقابلے ہوتے، چنانچہ اس حکومت کے آخری دور میں بلند پایہ مصری شعراء کی ایک جماعت یہاں وجود پذیر ہو گئی، جو صنعت بدیع اور لفظی آرائش میں بغدادی شعراء کے آخری دور کے اسالیب کی اتباع کرتے تھے۔ اسی طرح یہاں جو نثر نگار پیدا ہوئے وہ بھی اسی رجحان کو لیے ہوئے تھے۔ اس ضمن میں یہی بات کافی ہے کہ قاضی فاضل نے جو ادب عربی کے چوتھے طرز انشاء کا امام تھا، اسکندریہ میں قاضی بن حدید کے دفتر میں انشاء پردازی سیکھی اور قاہرہ میں ظافر کے دفتر میں منشی بنا۔ اور اس کے بعد سلطان صلاح الدین بن ایوب کا وزیر بنا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اسلوب وہی تھا جو اس کے زمانہ میں عام تھا۔ اس سلسلہ میں تفصیلی بحث ہم انشاء پردازی کے عنوان، نیز اس انشاء پرداز کے حالات زندگی کے تحت، پچھلے صفحات میں کر

آئے ہیں لہذا اسے سامنے رکھا جائے۔

مصر میں شعرا

وادی نیل کے اس سرسبز علاقہ میں جن شعراء نے نام پیدا کیا ان میں سے چند یہ ہیں:-

۱- ابو علی تمیم بن خلیفہ معز لدین اللہ فاطمی متوفی ۳۷۵ھ یہ اپنی عاشقانہ غزلیات، عمر بن ابی ربیعہ سے مشابہ سوال و جواب پر مشتمل شاعری، پختہ اسلوب اور دقیق تراکیب کی وجہ سے مشہور ہے۔ الیتیمہ کے مصنف نے اپنی تالیف کے پہلے جزء کے صفحہ ۳۴۷ میں اس کی شاعری کا عمدہ انتخاب دیا ہے۔

۲- ابن وکیع جو عاطس کے لقب سے مشہور ہے۔ یہ دمیاط کے قریب ایک بستی میں پیدا ہوا اور وہیں ۳۹۳ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ یہ جدید معانی پیدا کرنے اور ہر موضوع کو خوش اسلوبی سے نباہنے میں اپنا مخصوص مقام رکھتا ہے۔

۳- ابو الفتوح نصر اللہ بن قلاقس اسکندری جس کا لقب "قاضی اعز" تھا، اپنی عمر کے اواخر میں وہ یمن چلا گیا تھا، جہاں اس نے یمن کے بعض حکام کی مدح کی اور انہوں نے اسے اپنے انعامات دے کر آسودہ کر دیا، لیکن وہ کشتی جو اسے مصر لا رہی تھی مقام دھلک کے قریب غرق ہو گئی، اور وہ خالی ہاتھوں یمن واپس ہوا، پھر وہ سسلی چلا گیا اور وہاں سے واپسی پر ۵۶۷ھ بمقام عیذاب وفات پا گیا۔

۴- ہبۃ اللہ بن سناء الملک الملقب بہ "قاضی سعید" یہ خوش نصیب شاعروں اور گنتی کے چند رئیسوں میں سے ایک تھا۔ اس کا تعلق قاضی فاضل اور انشاء پرداز عماد سے ہو گیا اور اس کی قابلیت نے اسے دولت و مرتبت کے بلند مقام پر پہنچا دیا۔ اس کے زمانہ میں مصر میں شاعروں کی ایک جماعت تھی جسے ادبی ذوق نے ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر شعر و شاعری اور قصہ گوئی کی محفل جماتے اور یہ شاعر اس محفل کی روح رواں ہوتا اور اس کے جلسوں کی صدارت کے فرائض انجام دیتا۔ مشرق کے شاعروں میں یہ سب سے پہلا شاعر ہے جس نے موشحات کہنے میں سبقت کی اور اس میں کمال پیدا کیا۔ اس کا ایک موشحہ ہے جس کا مطلع ہے:-

کللی یا سحب تیجان الربی بالحلی　　　واجعلی سوارکے منعطف الجدول

۵- جمال الدین بن مطروح، یہ اسیوط میں پیدا ہوا، قوص میں اس کی ابتدائی پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ پھر یہ سلطان صالح ایوبی کی ملازمت میں منسلک ہو گیا تاآنکہ اس نے انہیں خزانچی پھر دمشق کے گورنر کا وزیر بنا دیا، پھر اس کی زندگی مختلف احوال میں گذرتی رہی کبھی سفر کبھی حضر، کبھی سرکاری خوشنودی اور کبھی ناراضی، تاآنکہ وہ ۶۴۹ھ میں انتقال کر گیا۔

۶۔ پھر مشہور رقت انگیز غزل گو شاعر کمال الدین بن النبیہ ہے اور اس کے حالات زندگی درج ذیل ہیں :۔

کمال الدین بن النبیہ

(وفات ۶۱۹ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات : اس کامل فن شاعر کی پیدائش اور ابتدائی حالات کا علم نہ ہو سکا۔ اس کی زندگی معمول کے مطابق وسیع باغ کے بہتے نالے کی طرح، پرسکون گذری، جہاں باغ کے نغموں اور پانی کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اس نے خود کو اس سیاسی معرکہ میں نہیں ڈالا جو اس کے گرد و پیش گرم ہو رہا تھا۔ جب تک مصر میں رہا بنی ایوب کی مدح سرائی پر اکتفا کی۔ جزیرہ و خلاط کے والی الملک الاشرف موسی کے دربار میں پہنچا وہاں وہ اس کا منشی بن گیا اور اس کی ملازمت کرتے ہوئے نصیبین میں رہنے لگا اور وہیں ۶۱۹ ھ میں وفات پائی۔

اس کی شاعری :۔ ابن النبیہ نہایت درجہ برجستہ گو، خوش کلام، صاحب اسلوب رواں اور فطرتاً بدیع نگار تھا۔ وہ لفظی حسن وشوکت کو بڑی محنت و کاوش سے تلاش کر کے لاتا ہے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نے اس کی تلاش میں قطعاً تگ ودو نہیں کی اس لیے کہ اس فن کاری اور چیزوں کو اپنی صحیح جگہ رکھنے میں کمال حاصل ہے۔ اس سے پہلے ہمیں کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جو اس درجہ بدیع کا دلدادہ اور اس حد تک اس میں زیادتی کرنے والا ہو اور بایں ہمہ وہ اپنے پڑھنے والے کو مجبور بھی کر دیتا ہو کہ وہ اس کی شاعری کو پسند کریں اور اس کی داد دیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس کا اسلوب زوردار، حیات بخش، کثیر التنوع اور نیرنگیوں سے لبریز ہے۔ وہ اپنی صنعتی کمزوری پر اپنی طبیعت کی قوت سے غالب آجاتا ہے۔

مثال کے طور پر اس کے یہ بدیہہ اشعار ملاحظہ کیجیے :۔

نحریق جمرۃ سیفه للمعتدی   و رحیق خمرۃ سیبه للمعتفی

یا بدر! تزعم ان تقاس بوجهه   و علی جبینك كلفة المتكلف؟

یا غیم! تطمع ان تكون ككفه   كلا و انت من الجهام المخلف

ممدوح کی تلوار سرکشوں کے لیے آگ اور انگارہ ہے۔ اور اس کی بخشش طالب احسان کے لیے شراب خالص ہے۔ اے چودھویں کے چاند! تو اس وہم میں مبتلا ہے کہ ممدوح کے چہرہ کا مقابلہ کر سکے گا، حالانکہ تیری پیشانی پر چھائیوں کے داغ ہیں۔ اور اے بادلو! تم اس امید

یں ہو کہ اس کے ہاتھوں کی طرح سخاوت کر سکو قطعاً نہیں تم تو کبھی امید دلا کر برستے بھی نہیں ہو۔
اس کی شاعری کے کل تین موضوع ہیں جن سے وہ باہر نہیں جاتی، ایک تو مدح اور یہ حصہ بجز ایک دو قصیدوں کے جو خلیفہ ناصر عباسی کے لیے ہیں تمام کا تمام بنو ایوب کی مدح میں ہے۔ دوم غزل، سوم وصف، لیکن موخر الذکر دونوں موضوع اس کی شاعری میں مستقل حیثیت نہیں رکھتے ہیں، انہیں وہ اپنی مدحیہ شاعری کے آغاز میں بطور مقدمہ لاتا ہے۔ مدح میں اس کا طریقہ وہی پرانا ہے جس میں ممدوح کے غلبہ و فتح، قوت و شوکت اور جود و سخا کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس کی شاعری کا غزلیہ حصہ مادی شہوت رانی سے متعلق ہے جو ظاہری شکل کے حسن و جمال سے آگے نہیں بڑھتا مثلاً سیاہ گھنے بالوں کو رات، چہرہ کو صبح، کہنا۔ آنکھوں کے جادو اور نگاہوں کے تیروں کا ذکر، دانتوں کی موتیوں سے شباہت، ہونٹوں کو یاقوت بتانا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس تغزل میں آپ کو کہیں بھی محبت کا قلبی احساس، جمالیات کا نفساتی ادراک نظر نہیں آئے گا۔ گمان غالب یہ ہے کہ وہ اس صنف شاعری میں جوش دروں اور فیضان طبیعت سے مجبور ہو کر کچھ نہیں کہتا، بلکہ محض برائے شاعری اور خانہ پری شعر کہتا تھا۔ رہ گیا وصف تو اس کا بیشتر حصہ شراب اور محفل ہائے مے نوشاں سے متعلق ہے اور بہت ہی قلیل حصہ مناظر فطرت کے وصف کا ہے۔
مجموعی طور پر ابن النبیہ شاعر شیریں بیان، تفنن پسند، مجاز و تشبیہ و بدیع کا دلدادہ، خوشنما مطلع کہنے والا، اور عمدہ گریز کرنے والا ہے، اس کا ایک دیوان ہے جو بیروت اور مصر میں چھپ چکا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:- سلطان ناصر لدین اللہ العباسی کی مدح میں کہے ہوئے ایک قصیدہ کے شروع میں کہتا ہے:-

باکر صبوحك اهنى العيش باكره	فقد ترنّم فوق الايك طائره
و الليل تجري الدارى فى مجرّته	كالروض تطفو على نهر ازاهره
وكوكب الصبح نجاب، على يده	مخلق تملأ الدنيا بشائره
فانهض الى ذوب ياقوت لها حبب	فهل جناها مع العنقود عاصره؟
ساق تكون من صبح ومن غسق	فابيض خداه و اسودت غدائره
سود سوالفه، لعس مراشفه	نعس نواظره، خرس اساوره
مهفهف القد، يندى جسمه ترفا	مخصر الخصر، عبل الردف وافره
تعلمت بانة الوادى شمائله	و زورت سحر عينيه جاذره
خذ من زمانك ما اعطاك مغتنما	و انت ناه لهذا الدهر آمره
فالعمر كالكاس، تستحلى اوائله	لكنه ربما مجّت اواخره

اپنی صبح کی شراب کو ذرا سویرے نوش کر لو کہ سب سے زیادہ خوش گوار زندگی وہ

ہے جو پہلے پہل کی ہو۔ جھاڑیوں پر پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا ہے اور رات جس کے تارے کہکشاں میں چلتے ہیں اس باغ کی طرح ہے جس کی نہر پر اس کے پھول بچھے ہوئے ہیں۔ اور صبح کا تارہ روشن ہے جس کے ہاتھ میں عطر بیز خوشبوئیں ہیں جس کی بشارتیں دنیا میں پھیل گئی ہیں۔ اب اٹھو اور اس ارغوانی شراب کو نوش کرو جس پر جھاگ آ رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کشید کرنے والے نے مع خوشوں کے اسے توڑ لیا ہے۔ اور ساقی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صبح کی روشنی اور شام کی تاریکی کا آمیزہ ہے، اس لیے اس کا چہرہ گورا، اور کاکل سیاہ ہے۔ گیسو دراز ہونے کی وجہ سے اس کی گردن سیاہ ہے اور اس کے لبوں میں حسین سیاہی ہے۔ اس کی آنکھیں نیم باز ہیں اور اس کی کلائیاں بھری ہوئی ہیں۔ اس کی کمر پتلی ہے اور پروردہ ناز و نعم ہونے کی وجہ سے اس کا جسم گدارا، اور کولھے بھرے ہوئے اور بڑے ہیں۔ وادی کے بید کے درختوں نے لچکنے کی ادا اس سے سیکھی ہے اور نیل گایوں نے اس کی آنکھوں کے جادو اور جاذبیت کو اپنے اندر بتصنع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ زمانہ جو کچھ تمہیں دے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے لے لو، دراں حالیکہ تم اس زمانہ کے آقا اور سیاہ وسفید کے مالک ہو۔ زندگی کی مثال اس جام شراب کی سی ہے جو ابتدا میں تو بڑا اسرور اور فرحت بخش معلوم ہوتا ہے لیکن آخر میں بارہا اسے اگل دیا جاتا ہے۔

الملک الاشرف کے مدحیہ قصیدہ کے آغاز میں کہتا ہے:۔

افدیه ان حفظ الهوىٰ او ضیعا ملك الفواد فما عسى ان اصنعا؟
من لم یذق ظُلم الحبیب کظَلمه حلوا فقد جهل المحبة وادعىٰ
یا ایها الوجه الجمیل تدارك الصبر الجمیل فقد عفا و تضعضعا
هل فی فؤادك رحمة لمتیم ضمت جوانحه فؤاد موجعا؟

میں اس پر قربان ہوں خواہ وہ محبت کا پاس رکھے یا نہ رکھے۔ وہ تو دل کا مالک ہو گیا اب میں اس پر کیا کر سکتا ہوں؟ جو محبوب کے ظلم وستم سے ویسی ہی دلچسپی اور لذت محسوس نہیں کرتا جیسی وہ اس کے حسن وجمال سے محسوس کرتا ہے تو اسے محبت کا مزہ ہی نہیں معلوم وہ تو محبت کا جھوٹا دعوی کر رہا ہے۔ اے رخ جمیل! صبر جمیل اختیار کر۔ کیونکہ وہ نڈھال ہو گیا اور مٹ گیا۔ کیا تیرے دل میں، اس اسیر محبت کے لیے جس کے پہلو میں درد بھرا دل ہے، جذبات رحمت ومودت ہیں؟

اس کے ایک قصیدہ کے غزلیہ اشعار:۔

احیفانه شرك القلوب کانما هاروت اودعها فنون فنونه
یا قوتة متبسم عن لؤلؤ خجلت عقود الدر من مکنونه
ساق صحیفة خده ماسودت عبثا بلام عذاره و بنونه

جمد الذی بیمینه فی خده — وجری الذی فی خده بیمینه
طاب الربیع کانما عجن الصبا — کافور مزنته بعنبر طینه
و تفضضت ازهاره و تذهبت — فکأنما الطاوس فی تلوینه

اس کی آنکھیں دلوں کے لیے جال ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ہاروت ماروت نے اپنی ساحری کے تمام کمالات بھر دیے ہیں۔ اس کے ہونٹ یاقوت ہیں جن سے تبسم کے وقت ایسے موتی نمودار ہوتے ہیں جن کے سامنے ہار کے قیمتی موتی بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایسا ساقی ہے جس کے رخسار پر زلف سیاہ بلا سبب بکھری ہوئی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ کی چیز (شراب) اس کے رخسار میں جم گئی ہے اور جو اس کے رخسار میں ہے (یعنی خون) وہ اس کے ہاتھ کی چیز میں رواں ہے۔ بہار اس درجہ خوشگوار ہے جیسے صبا نے اپنے بادلوں کے کافور سے عنبر کی مٹی گوندھ دیا ہو۔ اور اس کے پھول سفید و زرد اس طرح کھلے ہوئے ہیں گویا وہ نیرنگیوں کی وجہ سے طاؤس ہیں۔

ایک دوسرے قصیدہ کے غزلیہ اشعار:-

اماناً ایها القمر المطل — فمن جفنیك اسیاف تسل
یزید جمال وجهك كل یوم — ولی جسد یذوب و یضمحل
وما عرف السقام طریق جسمی — ولكن دل من اهوی یدل
یمیل بطرفه الترکی عنی — صدقتم ان ضیق العین بخل
اذا نشرت ذوائبه علیه — تری ماء یرف علیه ظل
ایا ملك القلوب! فتكت فیها — و فتكك فی الرعیة لا یحل
قلیل الوصل ینفعها فان لم — یصبها وابل منه فطل
ادر کاس المدام علی الندامی — فمن خدیك لی راح و نقل
بمنظرك البدیع تدال تیها — و لی ملك بدولته ادل

اے چھا نکلنے والے چاند! خدارا امان بخشو! تمہاری نگاہیں ننگی تلواریں ہیں۔ تیرے رخ کا حسن ہر روز دو بالا ہوتا جاتا ہے اور میرا بدن برابر نڈھال ہوتا اور گھلتا جا رہا ہے۔ بیماری نے میرے بدن تک پہنچنے کا راستہ نہیں پایا تھا، لیکن میرے معشوق کے ناز و انداز نے اسے میرے جسم کا راستہ بتا دیا۔ وہ اپنی ترکی نگاہ کے ذریعہ مجھ سے اعراض کرتا ہے۔ واقعی لوگوں کی یہ کہاوت صحیح ہے کہ چھوٹی آنکھ بخل کی نشانی ہے۔ جب اس کی زلفیں اس پر پریشان ہو جاتی ہیں تو تمہیں ایسا معلوم ہوگا جیسے پانی کو چار سو سے سایہ نے گھیر لیا ہو۔ اے دلوں کے بادشاہ! تو نے دلوں پر حملے کرنا شروع کر دیے ہیں (جو تیری رعیت ہیں) حالانکہ رعیت پر حملے کرنا روا نہیں ہے۔ تھوڑا سا وصل ہی انہیں مطمئن کر سکتا ہے، موسلا دھار بارش نہ سہی اوس

ہی سہی۔ ہمنشینوں پر جام مے کا دور چلاؤ، میرے لیے تو تمہارے رخسار ہی شراب اور نقل ہیں۔ تو اپنی حسین و جمیل شکل وصورت پر غرور و ناز سے اکڑ رہا ہے اور میں اپنے بادشاہ کی مملکت پر فرحاں و نازاں ہوں۔

ناصر باللہ کے بیٹے کی وفات پر اس نے ایک مشہور قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع یہ ہے :۔

الناس للموت کخیل الطراد ۔۔۔ فالسابق السابق منها الجواد

واللہ لا یدعو الی دارہ ۔۔۔ الا من استصلح من ذی العباد

والموت نقاد علی کفہ ۔۔۔ جواہر یختار منها الجیاد

لا تصلح الارواح الا اذا ۔۔۔ سری الی الاجسام ھذا الفساد

لوگوں کی حالت موت کے لیے گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی سی ہے کہ اس میں سب سے عمدہ اور کامیاب گھوڑا وہ ہوتا ہے جو سب سے آگے بڑھ جائے، اور اللہ اپنے پاس بندوں میں سے انہی کو بلاتا ہے جنہیں وہ اس کا اہل اور قابل سمجھتا ہے۔ موت بڑی پرکھنے والی ہے، اس کے ہاتھ میں مختلف جواہرات ہوتے ہیں جن میں سے وہ بیش قیمت کا انتخاب کر لیتی ہے۔ روحیں اس وقت تک درست اور صحت مند نہیں ہوتیں جب تک کہ جسموں میں بگاڑ اور ابتری پیدا نہیں ہو جاتی۔

ابن الفارض

(پیدائش ۵۷۶ھ وفات ۶۳۲ھ)

پیدائش اور حالات زندگی :۔ اس کا نام ابو حفص عمر بن علی ہے اور ابن فارض کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا آبائی وطن حماۃ تھا، لیکن یہ ۵۷۶ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوا۔ دین میں تفقہ حاصل کیا۔ عربی زبان اور اس کے ادب پر عبور حاصل کیا۔ پھر اسے صوفیہ کا اتباع پسند آنے لگا۔ چنانچہ اس نے ان کا طریقہ اختیار کر لیا۔ ان کے اسرار و رموز سے واقف ہوا۔ پھر مکہ شریف کا سفر کیا اور وہاں مقدس مقامات کی زیارت کی اور ایک عرصہ تک وہاں مقیم رہا۔ پھر مصر واپس آ گیا اور اپنی بقیہ زندگی نہایت عزت و احترام کے ساتھ وہاں گذارتا رہا تا آنکہ ۶۳۲ھ میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا اور اسے سفح المقطم میں دفن کیا گیا۔

اس کے اخلاق و عادات :۔ ابن فارض باوجود اپنے تقشف و تصوف کے خوش وضع و خوش پوش، شگفتہ مزاج و ملنسار، باوقار اور نہایت درجہ خدا ترس و باورع تھا۔ جب وہ شہر میں نکلتا تو لوگوں کا ہجوم اس کے اردگرد جمع ہو جاتا، وہ اس سے اپنے لیے دعا کرواتے اور طالب برکت ہوتے۔ جب وہ کسی مجلس میں شریک ہوتا تو اس کی ہیبت سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جاتیں اور وہ خاموش بیٹھ جاتے۔ جب وہ اشعار نظم کرنا چاہتا تو اس پر ایک مدہوشی اور غیاب کی کیفیت طاری ہو جاتی جو بعض اوقات دس دن تک طول کھینچ لیتی تھی۔ اس اثناء میں وہ نہ کھاتا تھا نہ پیتا تھا نہ کوئی حرکت کرتا تھا۔ پھر جب ہوش میں آتا تو اپنے اشعار املاء کرا دیتا تھا۔

اس کی شاعری :۔ ابن فارض کی نشو ونما ایوبیوں کے دور میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں لوگ دو مختلف محرکات کی کشمکش میں مبتلا تھے، ایک تو تصوف و تقویٰ کا محرک جو مسلسل جنگوں اور پیہم قحط و موت کی آفتوں کی

وجہ سے رونما ہوگیا تھا، دوسرا محرک آوارگی اور فسق وفجور کا تھا جو اخلاقی بندھنوں کے ڈھیلا پڑ جانے، جذبات وخواہشات کے غلبہ اور منہیات عام ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہوگیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مصر اور غیر مصر میں شاعری کے بھی یہی دو میلانات تھے یا تو اس سے خوشنودی مولی مقصود ہوتی تھی یا پھر خوشنودی شیطان۔ ابن فارض نے چونکہ دینی ماحول میں تربیت پائی تھی اور وہ صوفیانہ ماحول پلا اور بڑھا تھا۔ لہٰذا اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنی شاعری میں بھی اپنی قوم کا طریقہ اختیار کرتا۔ صوفیہ کے رموز واشارات کو نظم کرتا اور ان کے مقامات کا وصف بیان کرتا۔ شراب کی دل کھول کر تعریف کرتا اور خوب غزلیہ شاعری کرتا اور ان سب چیزوں سے اصطلاح تصوف کے مطابق ذات الٰہی مقصود ہوتا۔ اس طرح ابن فارض عربی شاعری میں رمز نگاری کا موجد بن گیا۔ اسے شعر کہنے میں تمام شعراء سے زیادہ طبیعت پر زور ڈالنا پڑتا تھا اور بدیع کے لیے تکلف اور آورد سے کام لینا پڑتا تھا۔ یہ تطبیق وتجنیس کا دلدادہ تھا۔ اس کی شاعری رقت انگیز، دو پہلوؤں پر مشتمل (ایک طرف تو باطن پسندوں یعنی زاہد وصوفی کی دل پسند اور دوسری طرف ظاہر پسندوں یعنی آزاد مزاج عاشقوں کے لیے موزوں) ہونے کی وجہ سے اپنے تمام ہم عصر شعراء سے زیادہ مقبول وعام ہوئی۔ صوفی اس کی شاعری کو اپنی مجالس ذکر میں پڑھتے اور رندو آوارہ مے کدوں میں اسے گاتے تھے۔

متعدد علماء نے مختلف نقطۂ نظر سے اس کے دیوان کی شرحیں کیں، بعض نے بغیر تاویل کے محض ظاہری الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے شرح کی مثلاً بورینی کی شرح (متوفی ۱۰۲۴ھ) بعض نے صوفیہ کے طرز پر باطنی معانی کے اعتبار سے شرح کی مثلاً نابلسی (متوفی ۱۱۴۳ھ)۔

اس کے مشہور ترین شعروں میں اس کے دو تائیۃ قصیدے ہیں ایک چھوٹا تائیۃ قصیدہ اور دوسرا بڑا تائیۃ قصیدہ۔ اول الذکر میں ایک سوتین اشعار اور ثانی الذکر میں چھ سو اشعار ہیں۔ ہر دو قصائد میں صوفیہ کے تمام مقاصد واسرار پورے پورے آ گئے ہیں اور ان کو صرف وہی شخص پڑھ سکتا ہے جس میں صبر وہمت ہو کہ جفاکشی سے ان کے رموز واسرار کو حل کر سکے۔ بڑے تائیۃ قصیدہ کے مطلع میں کہتا ہے:۔

نعم بالصبا قلبي صبا لاحبتي　　　فيا حبذا ذالك الشذا حين هبت

تذكرني العهد القديم لانها　　　حديثة عهد من أهيل مودتي

ہاں! باد صبا کے چلنے کی وجہ سے میرا دل دوستوں کی طرف مائل ہوگیا، نسیم صبا کے جھونکے جب وہ چلتے ہیں تو کس قدر خوشگوار ہوتے ہیں، وہ پرانے زمانے کی یاد میرے دل میں تازہ کر دیتے ہیں کیونکہ وہ تازہ بتازہ دوستوں کے پاس آ رہے ہوتے ہیں۔

ان قصائد کے علاوہ اس کے تمام باقیماندہ اشعار واضح اور صاف ہیں اور ان کا بیشتر حصہ حجاز واہل حجاز کے اشتیاق اور وہاں کی بستیوں اور پہاڑوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ : غزلیہ اشعار :-

لم اخل من حسد علیک فلا تضع — سھری بتشبیع الخیال المرجف
واسأل نجوم اللیل ھل زار الکری — جفنی ؟ وکیف یزور من لم یعرف

مجھے کسی گھڑی بھی میرے اوپر حسد کے خیال سے چین نہ ملا۔ تو میری بیداری کو خونناک خیال . . . کرکے ضائع نہ کر۔ رات کے تاروں سے پوچھو کہ کیا نیند میری آنکھوں تک پہنچ بھی سکی؟ اور بھلا جس سے شناسائی ہی نہ ہو اس سے ملاقات کی شکل کیونکر پیدا ہو سکتی ہے ؟

ایضاً :-

اعد ذکر من اھوی ولو بملام — فان احادیث الحبیب مدامی
کان عذولی بالوصال مبشری — وان کنت لم اطمع برد سلامی
طریح جوی صب جریح جوارح — قتیل جفونی بالدوام دوامی
صحیح علیل فاطلبونی من الضنی — نفیھا کما شاء النحول مقامی

میرے محبوب کا ذکر تکرار کرو خواہ اس میں میری ملامت کا پہلو ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ محبوب کا چرچا ہی میری شراب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبت پر مجھے ملامت کرنے والا گویا مجھے وصال کی نوید دے رہا ہے، حالانکہ مجھے تو محبوب کے سلام کے جواب کی بھی امید نہیں میں مریض محبت، کشتۂ سوز عشق ہوں، ان آنکھوں کا مارا ہوا ہوں جو ہمیشہ خون سے رنگین رہتی ہیں میں تندرست بھی ہوں مریض بھی مجھے بیماری و بدحالی میں تلاش کرو اسی میں جس طرح لاغری و بیماری چاہتی ہے میں رہتا ہوں۔

شراب کے متعلق اس کے اشعار جن میں بہت سے تصوفانہ رموز ہیں :-

شربنا علی ذکر الحبیب مدامة — سکرنا بھا من قبل ان یخلق الکرم
لھا البدر کأس وھی شمس یدیرھا — ھلال وکم یبدو اذا طلعت نجم
ولولا شذاھا ما اھتدیت لحانھا — ولولا سناھا ما تصورھا الوھم
یقولون لی صفھا فانت بوصفھا — خبیر، اجل عندی باوصافھا علم
صفاء ولا ماء، ولطف ولا ھوا — ونور ولا نار، وروح ولا جسم
تقدم کل الکائنات حدیثھا — قدیمًا ولا شکل ھناک ولا رسم
وقالوا شربت الاثم، کلا وانما — شربت التی فی ترکھا عندی الاثم
فلا عیش فی الدنیا لمن عاش صاحیًا — ومن لم یمت سکرًا بھا فاتہ الحزم
علی نفسہ فلیبک من ضاع عمرہ — ولیس لہ فیھا نصیب ولا سھم

ہم نے محبوب کی یاد پر شراب پی، جس کے نشہ میں ہم اس زمانہ سے مست ہیں جب کہ تاک

پیدا ابھی نہیں ہوا تھا۔ بدر اس کا جام ہے اور وہ سورج ہے جسے ہلال گھما رہا ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایسے وقت میں طلوع ہوتی ہے جب کہ ستارے نمودار ہوتے ہیں۔ اگر اس کی مہک نہ ہوتی تو میں کبھی اس کی دکان کا راستہ نہ پاتا، اور اگر اس کی چمک اور روشنی نہ ہوتی تو وہم میں بھی اس کا تصور نہ کیا جا سکتا تھا۔ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم اس شراب کا وصف بیان کرو اس لیے کہ تم اس کا وصف بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہو۔ واقعۃً یہ بات صحیح ہے کہ مجھے اس کے اوصاف کا علم ہے۔ اچھا تو لو سنو، وہ ایک صاف شے ہے جو پانی نہیں اور لطیف شے ہے جو ہوا نہیں۔ وہ نور ہے نار نہیں۔ روح ہے جسم نہیں۔ کائنات کے وجود سے پہلے۔ جب کہ یہاں نہ کوئی شکل تھی نہ صورت۔ اس کا چرچا موجود تھا۔ لوگ کہتے ہیں تو نے اثم (شراب) پی ہے۔ ہرگز نہیں، یہ غلط سمجھے، دراصل میں نے وہ شے پی ہے کہ جس کے نہ پینے پر مجھے اثم (گناہ) ملتا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں اس کی زندگی کوئی زندگی ہی نہیں جو اس کے نشہ سے بے نیاز رہا ہو اور جو اس کے نشہ میں جان نہ دیدے اس کا عقل مند ہونا مشتبہ ہے۔ اس شخص کو اپنی عمر پر رونا چاہیے جو اس سے کوئی حصہ نہ پا سکا اور اس کی عمر ضائع ہو گئی۔

٥ بہاء الدین زہیر

(پیدائش ۵۸۱ھ وفات ۶۵۶ھ)

پیدائش اور حالاتِ زندگی:۔ ابو الفضل زہیر بن محمد المہلبی مکہ کے قریب وادی نخلہ میں پیدا ہوا، وہاں سے مصر لایا گیا اور یہاں اس نے فقہ و ادب کی تعلیم حاصل کی، جب یہ جوان ہوا اور علمی کمال حاصل کر چکا، نظم و نثر اور کتابت میں مہارت حاصل کر لی تو الملک الصالح بن الملک الکامل ایوبی کی خدمت میں چلا گیا اور شام و جزیرہ میں اس کے ساتھ رہا۔ جب اس کے چچا زاد بھائی والی کرک، الملک الناصر فوج بھی اس کے چچیرے بھائی سے جا ملی) اسے شکست دے کر قید کر دیا تو اس موقع پر بہاء الدین اپنے بادشاہ کا وفادار رہا اور اس نے کسی دوسرے کی ملازمت اختیار نہ کی۔ وہ اس وقت تک نابلس میں مقیم رہا جب تک کہ پانی نے اپنا صحیح رخ اختیار نہ کیا اور اس کے مغلوب بادشاہ کا نصیب نہ چمکا چنانچہ جب صالح نے علاقہ مصر واپس لے لیا تو اس نے بہاء الدین کی وفاداری اور پاس عہد کا اعتراف کرتے ہوئے اسے اپنے پاس بلا لیا اور اسے اپنا رازدار وزیر بنا لیا وہ ہر معاملہ میں اس سے رائے لیتا اور اس کے مشورہ پر عمل کرتا۔ چنانچہ اس کی وساطت و سفارش سے خلق کثیر کو فیض پہنچا، وہ اپنے اسی عہدہ پر برقرار رہا تا آنکہ الملک الصالح کا انتقال ہو گیا، اس کی موت کے بعد بہاء الدین نے خانہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ سقوط بغداد والے سال مصر میں پھیلی ہوئی ایک

وبائیں مبتلا ہو کر اس نے انتقال کیا۔

اس کی شاعری:۔ بہاء الدین نرم خو، رقیق الطبع، مہربان اور شیریں کلام تھا۔ اس کی طبیعت کا اثر اس کی شاعری پر یہ ہوا کہ وہ بھی نہایت شیریں، رقت انگیز اور آسان ہو گئی، ایسی آسان جسے سہل ممتنع کہا جاتا ہے، اس کی شاعری فیضان طبع اور زور دروں کا نتیجہ، اور اپنے ماحول کی ترجمان تھی۔ اس کا اسلوب خود پیدا کردہ تھا جس میں وہ کسی کا مقلد نہ تھا۔ اس نے اپنے احساسات وجذبات میں کسی دوسرے کی خوشہ چینی نہیں کی۔ اپنے شعور و احساسات کے اظہار کے لیے اس نے شاعری میں جو زبان و اسالیب اختیار کیے وہ بھی خالص مصری ہیں۔ نہ اس میں کوئی اجنبی لفظ ہے، نہ پیچیدہ جملہ۔ آپ کو اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہو گا جیسے دریائے نیل اپنی شیرینی کے ساتھ اچھلتا مچلتا موجیں مارتا چلا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی آپ کو اس میں شاعر کے ماحول کی جھلک اور اس فضا کا جمال بھی نظر آئے گا۔ اس نے غزل اور عتاب کے موضوع پر نہایت عمدہ اشعار کہے ہیں اور بقیہ موضوعات میں اس کی شاعری کم درجہ ہے۔ بہاء الدین کی شاعری نہ جدت معانی ہے، نہ ندرت تخیل۔ وہی مروجہ معانی ہیں جنہیں اس نے آسان الفاظ کا جامہ پہنا کر ان میں اپنی پرجوش روح سے وہ قوت تاثیر پیدا کر دی ہے کہ ان کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔ اس کی شاعری کا مجموعہ طبع ہو چکا ہے اور عام طور پر ملتا ہے۔ انگریز مستشرق پلمر نے اس کے دیوان کا انگریزی شاعری میں ترجمہ کر کے حواشی کے ساتھ اسے ۱۸۷۶ء میں کیمبرج سے دو جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ حوادث زمانہ کا پروقار انداز میں مقابلہ کرنے والے کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

لا تعتب الدهر فی خطب رماك به ۔۔۔ ان استرد فقدما طالما وهبا

حاسب زمانك فی حالی تصرفه ۔۔۔ تجده اعطاك اضعاف الذی سلبا

والله قد جعل الأيام دائرة ۔۔۔ فلا ترى راحة تبقى ولا تعبا

ورأس مالك وهی الروح قد سلمت ۔۔۔ لا تأسفن لشیء بعدها ذهبا

ما كنت اول مقدوح بحادثه ۔۔۔ كذا مضى الدهر لا بدعًا ولا عجبا

فرب مال نما من بعد مرزأة ۔۔۔ اما ترى الشمع بعد القطف ملتهباً

زمانہ جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچائے تو اس پر عتاب کا اظہار نہ کرو اگر اس نے تم سے کچھ واپس لیا ہے تو پہلے وہ تمہیں بہت کچھ دیتا بھی رہا ہے۔ زمانہ کے گرم و سرد ہر دو حال کا حساب کرنے رہا کرو تو تم دیکھو گے کہ اس نے تم سے جو کچھ چھینا ہے اس سے کئی گنا زیادہ وہ تم کو دے بھی چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمانہ کو چکر میں رکھا ہے اور اسے ایک حالت پر قائم نہیں

رکھا لہذا یہاں نہ تم کسی راحت کو مستقل پاؤ گے نہ آفت کو پھر جب کہ تمہارا راس المال یعنی روح صحیح وسالم باقی رہ جاتی ہے تو اس کے بعد اگر کوئی چیز چلی جائے تو اس پر افسوس نہیں کرنا چاہیے۔ پھر یہ بھی تو دیکھو کہ تم ہی پہلے شخص نہیں ہو جس پر زمانہ نے مصیبت کے پہاڑ توڑے ہوں، زمانہ کا سدا سے یہی دستور رہا ہے اس میں نہ کوئی انوکھا پن ہے نہ تعجب خیز بات۔ بہت سے مال ایسے ہوتے ہیں کہ وہ نقصان اور تکلیف کے بعد بڑھتے اور نشو ونما پاتے ہیں، مثلاً شمع کے موم کو دیکھو جو توڑے جانے کے بعد جلائی جاتی ہے۔

اس کے غزلیہ اشعار:۔

خلیلیّ اما هذه فدیارهم — واما غرامی فهو ما تریان

خلیلی هذا موقف یبعث البکا — فماذا الذی بالدمع تنتظران

فان کنتما لا تسعدانی علی الاسیٰ — فقفا ودعانی ساعة ودعانی

فیا ویح قلبی بالغرام اطعته — فمالی اراه فی السلو عصانی!

وانی وایاه کما قال قائل — رفیقک قیسی وانت یمانی!

اے میرے رفیقو! یہ تو ہیں ان کے مکانات۔ اور ان سے جو مجھے عشق ہے وہ تمہیں نظر ہی آرہا ہے۔ میرے رفیقو! یہ ہے وہ مقام جو رونے پر مجبور کرتا ہے، اب آنسو بہانے میں تم کس بات کے منتظر ہو؟ اگر تم اس رنج میں میری مدد نہیں کر سکتے، تو ٹھہرو اور مجھ سے گھڑی بھر کے لیے جدا ہو جاؤ اور مجھے چھوڑ دو۔ کس قدر قابل افسوس ہے میرے دل کی حالت کہ جب اس نے مجھے عشق کرنے کی دعوت دی تو میں نے اس کی بات مان لی۔ لیکن جب میں اس سے کہتا ہوں کہ اب عشق کو چھوڑ کر مطمئن ہو جا، تو وہ میری نافرمانی کرتا ہے۔ اب میری اور میرے دل کی وہ حالت ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تمہارا یار تو قبیلہ قیس سے ہے اور تو یمنی ہے، یعنی دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ میں کچھ چاہتا ہوں اور وہ کچھ اور۔

چھٹی فصل

علوم و معارف

ترجمہ و تالیف

عہد بنی امیہ میں جن علوم کی بنیاد رکھی گئی تھی عہد عباسیہ میں وہ بیج نشو و نما پا کر ایک پھل دار درخت بن گیا۔ اس عہد میں عقول بیدار اور افہام روشن ہو گئی تھیں۔ خلفاء و علماء نے علوم کی نشر و اشاعت، ترجمہ و تدوین کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصے لینے شروع کر دیے تھے۔ اس میدان میں سب سے زیادہ آگے بڑھنے والوں میں خلیفہ ثانی ابو جعفر منصور تھا۔ اس نے طب و شریعت کی تعلیم کے لیے مدرسے بنائے۔ جرجیس بن بختیشوع کو بلایا جو جندیسا پور کے چوٹی کے طبیبوں میں سے تھا، نیز سریانی ایرانی اور ہندوستانی عالموں کی ایک جماعت کو بلایا جس نے اس کے لیے علم نجوم و طب کی کتابیں ترجمہ کیں۔ انہی کتابوں میں علم الافلاک سے متعلق کتاب سندہند اور ریاضیات میں کتاب اقلیدس بھی تھی۔ ابن مقفع نے اس کے لیے ادب و منطق کی بعض کتابیں ترجمہ کیں پھر یہ علمی تحریک خلیفہ ہادی و مہدی کے زمانہ میں دب گئی حتیٰ کہ برامکہ کے تعاون سے خلیفہ رشید نے اسے پھر تقویت دی اور اسے اپنی وسیع مملکت میں عام کیا۔ اس نے اپنے دربار میں ماہر علماء کو اکٹھا کیا اور یہ طے کر لیا کہ علم کو وسیع پیمانہ پر پھیلانے کے لیے ہر مسجد کے ساتھ ایک علمی ادارہ کی بنیاد ڈال دے گا، نیز ہر سفر میں اپنے ساتھ سو علماء رکھے گا۔ وہ ہر عالم و فن کار کی تعظیم و تکریم کرتا تھا خواہ کسی مذہب کا کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس کے سریانی اطباء و مترجمین میں آل بختیشوع اور آل ماسویہ جیسے عیسائی تھے۔ اس کے زمانہ میں طب، کیمیا، حیل (علم سکون و حرکت یا علم جر ثقیل جسے مکانک کہتے ہیں) الجبرا، علم نباتات، علم حیوانات پر جس قدر کتابیں دستیاب ہو سکی تھیں ترجمہ کر دی گئی تھیں۔

جب خلافت مامون کو ملی ــــ وہ مامون جو عرب میں یونان کے پریکلیس یا روم کے اگسٹس کی نظیر تھا ــــ تو یہ علمی تحریک اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ اس نے اپنے آباء و اجداد کی تمام کوششوں کو کمال تک پہنچایا۔ یونانی، سریانی اور عجمی علماء کو اس نے اپنا مقربین خصوصی بنایا۔ اس کی علم پروری کی وجہ سے ہر طرف سے بلا امتیاز مذہب و ملت اد باء و حکماء اس کے دربار میں پہنچنے لگے۔ اس نے ارمینیا، شام و مصر میں اپنے تمام گورنروں اور سفیروں کو ہدایات جاری کر دیں کہ وہ ان علاقوں میں جتنی کتابیں پائیں مرکز میں بھیجیں

جائیں۔ چنانچہ یونانی، عبرانی اور فارسی کی کتابوں سے لدے ہوئے اونٹ وقتاً فوقتاً بغداد میں داخل ہوتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس نے روم کے بادشاہوں سے تعلقات بڑھائے اور اس صلہ میں ان سے ان کے ملک میں جو فلسفہ کی کتابیں تھیں وہ مانگیں، چنانچہ انہوں نے اس کی مانگ پوری کی قسطنطنیہ کے بادشاہ میخائیل سوم سے شرائط صلح میں یہ بھی شرط رکھی کہ وہ اپنے ملک کی نادر کتابیں بھیج دے جب یہ سب ذخیرۂ کتب جمع ہو گیا تو اس نے ان کا ترجمہ کرنے کے لیے بہترین مترجمین کا انتخاب کیا اور وہ کتابیں جس قدر بھی ممکن ہو سکا بہترین شکل میں ترجمہ کی گئیں۔ الغرض صنعت و حرفت، علوم و فنون کی کوئی کتاب ایسی نہ بچی جو عربی میں ترجمہ نہ ہو چکی ہو۔ پھر خلفاء اور عوام و خواص ان علوم کو پڑھنے اور سمجھنے کی طرف متوجہ ہوئے تا آنکہ انہوں نے ان علوم کے رموز کو حل کیا۔ بند خزانوں کو کھولا۔ ان کی شرح و تفصیل کی اور انہیں تکمیل تک پہنچایا۔ پھر یہی نہیں کہ انہوں نے اس سلسلہ میں متقدمین عرب غلطیوں کو سدھارا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے خود یونانیوں کی غلطیوں کی اصلاح بھی کی۔ بعد ازاں انہوں نے علوم شریعت کو شرح و بسط سے لکھا۔ زبان کے قواعد مرتب کیے۔ علوم البیان کی بنا رکھ ڈالی اور علم عروض قافیہ کی طرف توجہ کی۔ پھر تو مشرق و مغرب کے بادشاہوں نے عباسیوں کے طریقہ کو اپنانا شروع کر دیا، انہوں نے بھی مدارس قائم کیے۔ رصد گاہیں بنائیں۔ علماء کی حوصلہ افزائی کی، حتیٰ کہ بہ تحریک برگ و بار لائی اور عربوں نے انکشافات و تحقیقات شروع کر دیں اور وہ ایجادیں کیں جنہیں زمانہ ہمیشہ یاد رکھے گا اور تاریخ کبھی نہیں بھلائے گی[1]۔

علم کا یہ بازار برابر گرم رہا حتیٰ کہ تاتاریوں کے غلبہ اور ترکی تسلط سے عربوں کی حالت کمزور ہو گئی، بادشاہوں کا علمی شوق مر گیا اور طلب علم کے ذرائع منقطع ہو گئے۔ تصانیف ردی کی ٹوکری میں جگہ پانے لگیں اور علم کا بازار مندا پڑ گیا اور لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ علم

---

[1] انہوں نے مائع و جامد اجسام کے ثقل معلوم کرنے کے قوانین کا انکشاف کیا۔ بجنے والی گھڑیاں ایجاد کیں جیسی ایک گھڑی رشید نے اپنے زمانہ میں شاہ فرانس شارلمان کو تحفۃً پیش کی تھی۔ انہوں نے پنڈولم اور قطب نما ایجاد کیے۔ انہی نے حقیقی کیمیاء کا علم وضع کیا اور علم الجبرا کو ترقی دی اور اس میں اضافے کیے۔ علم ہیئت و فلکیات پر تصنیفات کیں۔ چاند گرہن اور سورج گرہن کے حساب لگائے۔ ربیعی و خریفی اعتدالین کا مشاہدہ کیا۔ ہندی ہندسوں کو عام کیا۔ کاغذ کی صنعت میں پہل کی، وغیرہ وغیرہ، جس کا تذکرہ عربی مورخین نے نہیں بلکہ یورپین مورخین نے نہایت شرح و بسط سے کیا ہے، دیکھئے سدیو کی کتاب عرب اور ان کے تمدن کی تاریخ، نیز زیارت کی کتاب فی اصول الادب جو ۱۹۳۰ء میں قاہرہ میں طبع ہوئی۔

حاصل کرنا سعی باطل ہے اب بجائے تحقیق و ترقی کے کتابوں کی شروح اور خلاصوں پر اکتفا کی جانے لگی اور لوگ معانی کی بجائے محض الفاظ کے چکروں میں پڑ گئے۔

جب علوم و فنون نے اپنی اس ناقدری کو مشرق میں دیکھا اور انہیں یہ احساس ہو گیا ان کے قدر دان کمزور ہو چکے ہیں تو انہوں نے ماتمی لباس پہن لیا اور افریقہ و شام کی راہ سے یورپ کا قصد کرنے لگے۔ مغرب نے کھلے دل سے ان کا استقبال کیا اور وہاں کے بادشاہوں نے عربی علوم کے ساتھ وہی سلوک کیا جو عربوں نے یونانی علوم کے ساتھ کیا تھا چنانچہ مشرق میں علوم کا سایہ سمٹتا اور سکڑتا رہا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔

ادبی علوم

علم ادب

عہد بنی امیہ میں بھی علم ادب کو وہی بلند مقام حاصل تھا جو اسے عہد عباسیہ میں ملا ہوا تھا۔ اس کا اہتمام اس لیے زیادہ کیا جاتا تھا کہ لوگوں میں بداوت کے اثرات باقی تھے۔ زبان کی فصاحت پر فخر و مباہات کا سلسلہ جاری تھا، نیز انہیں کتاب اللہ کے مشکل مقامات کی توضیح[1] احادیث کے الفاظ غریب کی تشریح، نحوی قواعد پر استشہاد، لسانی ملکہ کے اکتساب کے لیے فصیح بیان کے نمونے اور عمدہ شاعری کی ضرورت تھی۔ اس وقت تک ادب کی روایات منہ در منہ بیان کی جاتیں، اور سینوں میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ جہاں کہیں ان کے ملنے کے امکانات ہوتے ان کی خاطر دشوار گذار سفر طے کیے جاتے تھے۔ لیکن جب اس دور کا ہلال افق پر نمودار ہوا، اور عربوں میں عجمیت سرایت کر گئی زبانی خامیاں عام ہو گئی جو "رواۃ" کے نام سے مشہور ہیں، مثلاً حماد راویہ (وفات ۱۵۶ھ) خلیل بن احمد (وفات ۱۷۴ھ) خلف الاحمر (وفات ۱۸۰ھ) ابو عبیدہ (وفات ۲۰۹ھ) ابو زید انصاری (وفات ۲۱۵ھ) اور اصمعی (وفات ۲۱۶ھ)۔ علماء کی یہ جماعت عرب کے دیہاتوں میں لغوی و ادبی معلومات حاصل کرنے کے لیے پھرتی اور اس غرض کے لیے عرب کے دیہاتوں سے روابط پیدا کرتی اور ان کے ساتھ گھل مل کر رہتی۔

---

[1] حضرت ابن عباس رض کا قول ہے کہ جب تم کلام اللہ کی تلاوت کرو اور اس کی کوئی عبارت تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو عربوں کی شاعری کے ذریعہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ امام شافعی کا قول ہے کہ میں نے صرف فقہ سے مدد حاصل کرنے کے لیے بیس سال تک عربی لغت و ادب کا علم حاصل کیا۔

ایک مدت تک ادبی روایات کو سن کر حفظ کر لینے کا سلسلہ جاری رہا، لیکن جب عربوں میں عجمیت داخل ہونے لگی اور ان کی حکومت کا دائرہ وسیع ہو گیا تو اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ ان ادبی روایات کو ضبط تحریر میں لایا جائے۔ چنانچہ علماء نے جو کچھ سن کر حافظہ میں رکھا تھا اسے لکھنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ کی ابتدا ابو عبیدہ اور اصمعی نے کر دی تھی، لیکن جاحظ پہلا شخص ہے جس نے ان منتشر ادبی شہ پاروں اور متفرق ادبی روایات کو اپنی دو کتابوں "البیان والتبیین" اور "کتاب الحیوان" میں جمع کر دیا، پھر مسلسل یکے بعد دیگرے علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھانا شروع کر دیا۔ ان میں مبرد "الکامل" کا مصنف، ابن قتیبہ "ادب الکاتب" کا مصنف، ابن عبد ربہ "العقد الفرید" کا مصنف، ابو علی القالی "الامالی" کا مصنف، ابو الفرج اصبہانی "الاغانی" کا مصنف اساسی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی تصانیف ادیبوں کے لیے اصلی سرچشمے اور مآخذ و مراجع ہیں۔

اُدَبَاء

اَصْمَعِی

(پیدائش ۱۲۳ھ وفات ۲۱۶ھ)

اس کی زندگی کے حالات اور اس کا علمی مقام:۔ ابو سعید عبد الملک بن قُرَیب اصمعی (یہ نسبت اس کے دادا اصمع کی طرف ہے) ۱۲۳ھ میں ایک عربی گھرانہ میں پیدا ہوا جو انشاء پردازی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس کی ابتدائی پرورش بصرہ میں ہوئی، اور وہاں کے ائمہ علوم سے اس نے عربی زبان اور حدیث و قرآن کی تحصیل کی۔ اس نے بصرہ میں آنے والے فصیح دیہاتی عربوں کی روایات نقل کیں اور خود بھی بشتر دیہاتوں میں جاتا رہا، وہاں دیہات کے فصیح عربوں سے بالمشافہہ روایتیں سنتا اور ان کے ساتھ سکونت اختیار کرتا۔ بسا اوقات اس کے یہ علمی سفر سالوں مسلسل جاری رہتے۔ اس زمانہ میں وہ حج بھی کرتا، اور میلوں وغیرہ کے اجتماعات میں فصیح عربوں سے ملتا حتیٰ کہ اس کے پاس اخبار و واقعات، نوادر و الفاظ غریب کا اس قدر وافر ذخیرہ جمع ہو گیا جو کسی دوسرے کے پاس جمع نہ ہو سکا۔ وہ ابو عبیدہ کا معاصر اور لغت و روایت میں اس کا حریف تھا۔ ایک مرتبہ ابو نواس نے ان دونوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا "ابو عبیدہ کو اگر موقع ملے تو وہ لوگوں کو اگلوں اور پچھلوں کے مکمل حالات و واقعات سنا ڈالے۔ لیکن اصمعی عرب کا بلبل ہے جو انہیں اپنے نغموں سے مست اور مسحور کرتا ہے۔" خود اصمعی اپنا ایک واقعہ

یوں بیان کرتا ہے "ایک دفعہ میں اور ابو عبیدہ فضل بن الربیع کے پاس پہنچے اس نے مجھ سے سوال کیا "تم نے گھوڑوں پر کتنی کتابیں لکھی ہیں؟" میں نے جواب دیا "ایک کتاب" پھر اس نے ابو عبیدہ سے اس موضوع پر اس کی لکھی ہوئی کتابوں کے متعلق دریافت کیا، اس نے کہا "پچاس جلدیں" اس پر فضل بن الربیع نے ایک گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابو عبیدہ سے کہا "اٹھو! اور اس گھوڑے کے بدن کا ایک ایک عضو پکڑ کر اس کا نام بتانے جاؤ" اس نے جواب دیا "میں کوئی بیطار نہیں ہوں" میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ عربوں سے لے کر لکھا ہے" اس پر فضل نے مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے اصمعی! تم اٹھو اور یہ کام کر دو" اس پر میں کھڑا ہوا اور پیشانی سے لے کر ایک ایک عضو ہاتھ میں پکڑ کر اس کا نام، اور جو کچھ عربوں سے اس کے متعلق اشعار مروی تھے سب سنا ڈالے، جب میں فارغ ہوا تو اس نے کہا "یہ گھوڑا تم لے لو" چنانچہ وہ میں نے لے لیا، اور جب مجھے ابو عبیدہ کو غصہ دلانا مقصود ہوتا تو میں اس گھوڑے پر سوار ہو کر اس سے ملنے کے لیے چلا جاتا" یہ واقعہ ایک طرف تو ان دونوں ادیبوں کے فرق کو ظاہر کر رہا ہے اور دوسری طرف اصمعی کی عظیم قوت حافظہ پر دلالت کر رہا ہے، اس اعتبار سے اگر وہ یہ کہتا تھا کہ مجھے بارہ ہزار ارجوزے (رجزیہ قصائد) حفظ ہیں تو کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اصمعی روایت میں ثقہ ہونے، اور لغت میں کامل مہارت رکھنے، کے ساتھ ساتھ شاعری کو پرکھنے اور اس پر نقد و تبصرہ کرنے میں بھی مشہور تھا، اس نے یہ فن خلف الاحمر سے حاصل کیا تھا۔ شعر و شاعری کے موضوع پر اس کی بلند آراء ہیں۔ باوجود ظریف ہونے کے وہ نہایت درجہ خدا ترس اور کتاب و سنت کی تفسیر کرنے میں بڑا محتاط، تھا، جب اس سے کتاب و سنت کی کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ اس طرح جواب دیتا "عرب اس کے یہ معانی بتاتے ہیں، لیکن کتاب و سنت میں اس سے جو مراد ہے وہ میں نہیں جانتا" وہ خلیفہ رشید کی وفات تک اس کا مصاحب رہا۔ پھر جب مامون اس کا جانشین ہوا۔ اور خلق قرآن کا فتنہ برپا ہوا تو اسے اپنا دین خطرہ میں نظر آیا، اور اس نے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا۔ مامون نے اسے اپنے ساتھ بلانے کی بڑی کوشش کی لیکن اس نے کمزوری اور بڑھاپے کا عذر پیش کر کے خود کو الگ کر لیا۔ مامون مشکل مسائل جمع کر کے اسی کے پاس بھیجتا تھا تاکہ وہ ان کا جواب دے دے۔ بعد میں لوگوں نے اسے اپنے بدشکل سے گدھے پر سوار ہو کر آتے جاتے دیکھا تو کسی نے کہا "خلفاء کے گھوڑوں پر سواری کرتے کرتے اب اس گدھے پر سواری کی نوبت آگئی؟" تو اس نے کہا "دین سلامت رکھ کر اس گدھے پر سواری کرنا مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میں دین کھو دوں اور ان سواریوں پر سواری کرتا رہوں"! اس طرح اس نے معمولی گذر بسر پر قناعت کر لی۔ تا آنکہ ۲۱۶ھ میں نوے برس کی عمر پا کر وہ وفات پا گیا۔

اس کی تصانیف:- اصمعی نے تقریباً بیالیس سال سے اوپر اپنی تصانیف چھوڑیں، جن میں سے بیشتر لغت کے موضوع پر ہیں۔ مثلاً کتاب خلق الانسان، کتاب الاجناس، کتاب الخیل، کتاب النبات، کتاب النوادر، کتاب معانی الشعر، کتاب الاراجیز وغیرہ اس کی تصانیف میں سے بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔

ابوالفرج اصبہانی

(پیدائش ۲۸۴ھ وفات ۳۵۶ھ)

حالاتِ زندگی: ابوالفرج علی بن حسین مروانی اصبہان میں پیدا ہوا، اور بغداد میں پرورش پائی، علماء و رواۃ کی صحبت میں آتا جاتا رہتا، اس نے حدیث و اخبار کی سماعت کی اور انساب و اشعار کی روایت کی۔ نحو، سیرت و سوانح، بیطاری، طب و نجوم میں مہارت حاصل کی، چنانچہ اس کے علم و فضل کا چرچا ہونے لگا اور اس کا نام مشہور ہوگیا۔ اس وقت مشرق میں مختلف حکومتیں باہم دست وگریباں تھیں، چنانچہ اس نے کوشش کی کہ ان تمام حریفوں تک پہنچے۔ انہیں اپنے علم و ادب، اور تصانیف سے فائدہ پہنچائے اور خود ان کے مال اور اثر رسوخ سے استفادہ کرے۔ لیکن مشرقی بادشاہوں کے انعامات و صلات اس کے لیے کافی نہ ہوسکے، چنانچہ وہ چھپ کر اندلس کے اموی حکام کے لیے بھی کتابیں لکھتا جو اس کو انعامات سے نوازتے رہتے تھے۔ وہ علانیہ شیعیت کی طرف مائل تھا، شیعوں کے لیے تقیہ و مدارات کرنے میں وہ اموی تھا، اس لیے کہ وہ ان کے ملک میں پیدا ہوا تھا اور ان کے فضل و کرم سے نامور ہوا تھا۔

اس کو سب سے زیادہ چاہنے والا اور اس کی سب سے زیادہ خدمت کرنے والا، معزالدولہ ابن بویہ کا وزیر، الوزیر المہلبی تھا۔ چنانچہ وہ بھی اسی کا ہو رہا، اسی کی مدح کرتا، اور اسی کی مجلس میں رہتا تا آنکہ ۳۵۶ھ میں اس کا انتقال ہوگیا، مرنے سے پہلے اس کے حواس کچھ مختل ہو چکے تھے۔

اس کے اخلاق اور اس کا علمی مرتبہ:- باوجود ظرافت و ادبیت کے یہ شخص زبان کا تیز تھا، جلد باز اور منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ چونکہ یہ خاندانوں کے انساب اور مختلف گھرانوں کے کمزور پہلوؤں سے خوب واقف تھا اس لیے امراء و ملوک اس سے ڈرتے تھے۔ وہ نہایت بدہیئت تھا۔ میلے کپڑوں میں رہتا۔ نہ انہیں دھوتا تھا نہ بدلتا تھا۔ الوزیر المہلبی باوجود اپنی نفاست پسندی و نزاکت طبع کے اصبہانی کی خوش مقالی اور علمی بلندی کی وجہ سے اس کی

یہ سب کوتاہیاں برداشت کرتا تھا، جیسا کہ ہم نے بتایا وہ مختلف علوم کا جامع، منتخب نظم و نثر کا راوی، اپنی بیان کردہ روایات میں ثقہ، اور جو کچھ سنتا تھا، اس کو پرکھنے والا، تھا۔ ابو الفرج فطرتاً شاعر نہ تھا، لیکن وہ بہترین نثر نگار، قادر مؤلف، عمدہ مصنف اور امین راوی تھا۔ اس کے لیے صرف یہی شرف بہت کافی ہے کہ وہ "الاغانی" جیسی ضخیم، جامع وبہ گیر اور پر معلومات کتاب کا مصنف ہے۔

الاغانی

مورخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس موضوع پر "الاغانی" جیسی کوئی تصنیف نہیں ہوئی اور یہ کہ ادب کی ہر کتاب اس سے کم درجہ یا اس کی خوشہ چین ہے نیز یہ کہ اگر یہ جامع تصنیف نہ ہوتی تو جاہلیت، صدر اسلام اور عہد بنی امیہ کی بڑی ادبی روایات ضائع ہو جاتیں۔ مصنف نے یہ کتاب پچاس سال کے عرصہ میں لکھی۔ اس کتاب کی بنیاد ان سو سروں پر رکھی جو خلیفہ رشید کے لیے منتخب کیے گئے تھے اور جن میں واثق کے لیے اضافہ کیا گیا تھا اور جو خود اس نے اپنے منتخبہ راگوں میں سے پسند کیے تھے۔ پھر اس نے ان راگوں کے کہنے والوں اور ان کے گانے والوں کے حالات زندگی لکھے اور ان میں سے جو جنگ، بہت شاعری، ظرافت و مزاح کے جس موضوع سے متعلق تھا اس کے تحت اس کا ذکر کیا۔ پھر اس تصنیف کو مکمل کرنے کے بعد اس نے اسے سیف الدولہ بن حمدان کو پیش کیا، سیف الدولہ نے مصنف کو ایک ہزار دینار کا انعام معذرت کے ساتھ پیش کیا۔ صاحب ابن عباد جب سفر کرتا تو اپنے مطالعہ کے لیے ضروری کتابیں تیس اونٹوں پر لاد کر ہمراہ لے جاتا تھا، لیکن جب اسے "الاغانی" دستیاب ہو گئی تو وہ ان سب کتابوں کی بجائے صرف اسی ایک کتاب کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کتاب کے بہت سے اجزاء ہیں جن میں سے ۱۲۸۵ھ میں بیس اجزاء شائع ہوئے، بعد میں ایک مستشرق کو یورپ کے کسی کتب خانہ میں اس کا ایک اور حصہ مل گیا تو اس کتاب کے اکیس اجزاء مکمل ہو گئے۔ ایک اطالوی پروفیسر گویڈے نے اس کی طویل فہرست ابجد کے لحاظ سے مرتب کر دی جو ۱۹۰۰ء میں لیدن سے شائع ہوئی۔ پھر وہ فہرست عربی میں منتقل ہو کر ۱۳۲۲ھ میں مع الاغانی کے مصر میں شائع کی گئی۔ اب پھر دار الکتب المصریہ مصر کے ایک بڑے سرمایہ دار کے تعاون سے اس کتاب کو مہذب و منقح چھاپ رہا ہے۔ خود ابو الفرج نے الاغانی کی تمام جلدوں کا خلاصہ ایک جلد میں کیا تھا لیکن وہ اس کی دیگر تصانیف کے ساتھ تلف ہو گیا۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ الوزیر المہلبی کی مدح میں کہتا ہے:۔

ولما انتجعنا لائذین بظلہ   اعان وما عنّی ومنّ وما منّا

وردنا علیہ مقترین فراشنا وردنا حماہ مجدبین فاحصینا

جب ہم طلب معاش کے لیے اس کے ظل عاطفت میں پناہ گیر ہوئے تو اس نے ہمیں کبیدہ خاطر کیے بغیر ہماری مدد کی۔ ہم پر احسانات کیے اور محض آرزوئیں نہیں دلاتا رہا۔ ہم خالی ہاتھ اس کے پاس پہنچے اور اس نے ہمیں ضروری ساز و سامان بہم پہنچایا۔ ہم قحط زدہ اس کے دربار میں آئے اور اس نے ہمیں آسودہ حال کر دیا۔

ایک دوسرے قصیدہ میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

فداؤك نفسى هذا الشتاء علينا بسلطانه قد هجم

ولم يبق من نشبي درهم ولا من ثيابي الا رمم

يؤثر فيها نسيم الهواء و تخرقها خافيات الوهم

فانت العماد ، ونحن العفاة و انت الرئيس ونحن الخدم

میں آپ پر قربان جاؤں، یہ جاڑا اپنی تمام قوتوں کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہو گیا ہے اور میرے پاس نہ درہم ہے نہ بوسیدہ چیتھڑوں کے علاوہ کوئی لباس، ہوا کے ہلکے جھونکے بھی اس میں اثر اندازی کر دیتے ہیں اور ہلکا سا وہم بھی ان کو پھاڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، آپ ہمارے سہارے ہیں اور ہم طالب احسان ہیں، آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم آپ کے خدام ہیں۔

علم نحو

عہد عباسیہ کا آغاز ہوا تو اس وقت علم نحو مساجد میں پڑھایا جاتا تھا اور کتابوں میں مدون کیا جا رہا تھا۔ اس کے احکام اور اصول و ضوابط مرتب کیے جا رہے تھے۔ بصرہ اور کوفہ کے علماء اس علم پر خوب شرح و بسط سے کلام کر رہے تھے۔ لیکن علم نحو کی ایجاد و تدوین میں فضیلت کا سہرا بصرہ کے علماء کے سر ہے۔ انہی میں ابو الاسود دؤلی موجد علم نحو اور ابن اسحٰق حضرمی نحوی قوانین بیان کرنے والا اور ہارون بن موسیٰ ضابط نحو ہیں۔ انہی میں علم نحو پر سب سے پہلی تصنیف کرنے والا عیسیٰ بن عمر ہے اور نحوی مسائل کو ابواب کے تحت مرتب و مہذب بنانے والا "الکتاب" کا مؤلف سیبویہ ہے۔ جب یہ علم بصرہ اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں پھیل چکا تو کوفہ والوں نے اس میں حصہ لینا شروع کیا۔ انہوں نے پہلے یہ علم بصریوں سے ہی سیکھا۔ پھر انہوں نے اس کے پڑھنے پڑھانے، مدون کرنے اور شروح و تفصیل میں بصریوں کی برابری اور ان سے مقابلہ شروع کر دیا، حتی کہ فریقین میں سخت چپقلش اور کشمکش رہنے لگی اور ان میں سے ہر فریق کا ایک جداگانہ مذہب ہو گیا جس کی ہر ایک تائید و مدد کرتا تھا۔ فریقین میں مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ بصری سماع کو ترجیح دیتے تھے اور صرف بصورت مجبوری قیاس کی اجازت دیتے تھے۔ روایت کی سختی سے پابند تھے اور صرف خالص فصیح عربوں کو قابل سند

سمجھتے تھے اور اس قسم کے عربوں کی بصرہ اور اس کے مضافاتی دیہاتوں میں کثرت تھی۔ کوفی نبطیوں اور اہل سواد کے اختلاط کی وجہ سے بیشتر مسائل میں قیاس پر اعتماد کرتے تھے اور ان عرب کے دیہاتوں کو بھی قابل سند سمجھتے تھے جن کی فصاحت بصری تسلیم نہ کرتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ علماء بصرہ نہایت درجہ وسیع العلم اور روایت کے اعتبار سے زیادہ مستند تھے۔ لیکن چونکہ کوفی عباسیوں کے زیر سایہ اور بنو ہاشم کے حمایتی تھے اور اس لیے بھی کہ کوفہ بغداد سے زیادہ قریب تھا عباسیوں نے کوفیوں کو ترجیح دی اور اس طرح کوفیوں کا مذہب دار الخلافہ میں پھیل گیا۔ اگر یہ سیاسی سرپرستی نہ ہوتی تو نہ کوفیوں کا نام و نشان ہوتا نہ ان کا کوئی قول نقل کیا جاتا۔ الغرض فریقین کے جھگڑے بڑھتے ہی چلے اور انتہائی شباب پر پہنچ گئے، حتیٰ کہ یہ دونوں شہر ویران ہو گئے اور یہاں کے علماء بغداد منتقل ہو گئے اور پھر بغدادیوں کا مذہب پیدا ہوا جو ان دونوں مذہبوں کا آمیزہ تھا، جس طرح علم نحو کے اندلس میں پہنچنے پر اندلسیوں کا ایک مذہب پیدا ہو گیا تھا۔ اور ابھی چوتھی صدی کا آغاز بھی نہ ہوا تھا کہ ہر دو مذہب کے شہسوار دنیا سے رخصت ہو گئے اور فریقین کے حمایتیوں کی طاقت کمزور ہو گئی اور اس طرح یہ جھگڑا ختم ہو گیا اور بعد میں آنے والے مولفوں نے بصری مذہب کو اساسی حیثیت دی اور اسی کی شرح و بسط کرتے رہے اور مذہب کوفی میں سے انہوں نے صرف اس کے اختلافات بتانے پر اکتفا کیا۔

بعد ازاں اس علم نے وسعت اختیار کر لی، اور یہ بہت پھیل گیا۔ متاخرین نے بعد میں اس کے طول کو مختصر کیا اور صرف اصول و مبادی پر اکتفا کی، جیسے "تسہیل" میں ابن مالک نے اور "مفصل" میں زمخشری نے کیا۔ بایں ہمہ اس علم کی خدمت کرنے کے ایک ایسی فلسفی نحویوں کی جماعت بھی آئی جس نے جھگڑوں کا راستہ کھول دیا۔ مردہ الفاظ کو زندہ کیا، صحیح کو شاذ میں غلط ملط کیا۔ ایسے لایعنی اسباب و علل، فضول اندازے اور قیاسات، اور ڈھیلے اقوال کو نحو میں جگہ دے دی کہ جس کے بعد ہر غلطی کرنے والے کو کوئی وجہ جواز اور ہر مدعی کو اپنے زعم باطل کے لیے کوئی سند مل جاتی ہے۔

ہم اس کتاب میں اپنے طریقہ کے مطابق یہاں چار بلند پایہ نحویوں کی سوانح حیات درج کر رہے ہیں جو ان نحویوں کے علاوہ ہے جن کی دوسرے مقامات پر ہم نے سوانح حیات لکھی ہے۔

علماءِ نحو

سیبویہ (متوفی ۱۷۷ھ)

حالاتِ زندگی:۔ امام البصریین ابو بشر عمرو بن عثمان کا لقب سیبویہ ہے (جس کے معنے ہیں بوئے سیب)۔ ایران میں پیدا ہوا اور بصرہ میں پرورش

پائی۔ شروع میں وہ حدیث و فقہ پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن وہ حماد بن سلمہ کی املاء کرائی ہوئی ایک حدیث رسول ﷺ لکھ رہا تھا جس کی عبارت یہ تھی "لیس من اصحابی احد الا لو شئت لاتخذت علیہ، لیس ابا الدرداء" تو سیبویہ بول اٹھا "لیس ابو الدرداء" اس پر حماد نے چلا کر کہا "سیبویہ تم غلطی کر رہے ہو، یہ استثناء ہے" تب سیبویہ نے کہا "لازماً اب میں وہ علم سیکھوں گا جس کے بعد میری زبان میں کوئی خامی نہ نکال سکے گا" چنانچہ اس نے نحو سیکھی، اور خلیل کی صحبت میں رہا۔ یونس اور عیسے بن عمر سے بھی اکتساب علم کیا، تا آنکہ وہ اس فن کے اصول و فروع سیکھ کر اس میں ماہر ہو گیا۔ اس نے اس فن کے شاذ اور قیاسی مسائل بھی اپنے حیطۂ علم میں لے لیے، پھر اس نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف ترتیب دی جس میں اس نے جو کچھ علم خلیل سے حاصل کیا وہ سب درج کر دیا۔ مزید برآں بصرہ و کوفہ کے علمائے نحو سے جو کچھ حاصل کیا وہ بھی ہر ایک کے حوالہ کے ساتھ نقل کر دیا۔ اس طرح اس کی یہ تالیف اپنے فن میں یکتا اور پر معلومات ہو گئی۔ کسی طالب نحو کو اس سے آگے بڑھنے کی مجال نہیں۔ نہ ہی اسے اس سے استفادہ کیے بغیر کوئی چارہ کار ہے۔ لوگوں کی نظر میں اس تالیف نے وہ مقام احترام پایا کہ انھوں نے اس کا نام ہی "الکتاب" رکھ دیا، اور جب بھی نحوی "الکتاب" کا لفظ علی الاطلاق استعمال کریں تو اس سے مراد یہی کتاب ہو گی۔ مبرد سے جب کوئی یہ کتاب پڑھنا چاہتا تو وہ اس سے پوچھتا "کیا تم نے کبھی سمندر کا سفر کیا ہے؟" یعنی یہ کتاب سمندر کی طرح وسیع، پرہول، اور مشکل ہے ابو عثمان مازنی کا قول ہے کہ سیبویہ کی "الکتاب" کے بعد جو شخص علم نحو میں کوئی عظیم و جامع کتاب تالیف کرنا چاہتا ہے اسے شرم محسوس کرنا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر سیبویہ کی یہ تالیف نہ ہوتی تو اس کا نام کوئی نہ جانتا۔

جب سیبویہ کو اپنی نحوی معلومات میں تفوق کا احساس ہوا تو وہ بغداد میں برامکہ کے پاس پہنچا۔ اس زمانہ میں یہاں نحو کا مشہور عالم کسائی، رشید کے بیٹے امین کا اتالیق تھا۔ چنانچہ یحیی بن خالد نے ایسا موقع فراہم کیا جس میں یہ دونوں عالم یکجا جمع ہو گئے، اور پھر ان دونوں کے درمیان ایک مجلس میں مناظرہ ہوا۔ اس مجلس میں کسائی نے سیبویہ سے یہ سوال دریافت کیا کہ جملہ "کنت اظن ان العقرب اشد لسعۃ من الزنبور فاذا ھو ایاھا" میں فصیح عربوں کا کیا طریقہ ہے؟ سیبویہ نے کہا کہ اس جملہ کے آخر میں "ایاھا" کی منصوب ضمیر لانا جائز نہیں ہے۔ صحیح عبارت "فاذا ھو ھی" ہو گی۔ کسائی نے کہا "نہیں بلکہ عرب دونوں طریقہ سے اسے بولتے ہیں" جب یہ جھگڑا طول کھینچ گیا تو دونوں نے مسئلہ کا فیصلہ کرانے کے لیے ایک فصیح اللہجہ دیہاتی عرب کو حکم بنا لیا، اس نے سیبویہ کی بات کو صحیح بتایا، لیکن چونکہ کسائی امین کا اتالیق تھا اور ساتھ ہی وہ کوفی بھی تھا — اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے خلفاء ان لوگوں کی طرفداری کرتے تھے — اس لیے امین نے کسائی کی حمایت میں تعصب سے کام لیا۔ پھر اس

دیہاتی نے بھی چاہا کہ کسائی کی موافقت میں فیصلہ دے۔ جب سیبویہ کو امراء کی اس دھاندلی بازی، اور اپنی جان کے خطرہ، کا احساس ہوا تو وہ بغداد کو خیرباد کہہ کر بصد افسوس شیراز کی ایک بستی میں جو ''بیضاء'' کے نام سے مشہور تھی چلا گیا، جہاں وہ چالیس سے کچھ اوپر عمر پاکر انتقال کر گیا۔

کسائیؒ (متوفی ۱۸۹ھ)

زندگی کے حالات: ابوالحسن علی بن حمزہ، کسائی کے لقب سے مشہور ہے یہ کوفی نحویوں کا امام تھا۔ کوفہ میں پرورش پائی، حمزہ زیات سے قرآن پڑھا۔ قراءت کی ایک مخصوص طرز میں امتیاز حاصل کرنے کی وجہ سے یہ قراء سبعہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسے شاعری میں کوئی درک حاصل نہ تھا، حتیٰ کہ اس کے متعلق یہ مقولہ عام ہو چکا تھا کہ عربی کے علماء میں کسائی سے زیادہ شاعری سے ناواقف کوئی نہیں۔ یہ بوڑھا ہونے لگا تھا اور اسے نحو کا کوئی علم نہ تھا، ایک دن وہ اپنے بعض عربی کے طالب علم دوستوں کے پاس پہنچا تو طویل فاصلہ سے چل کر آنے کی وجہ سے آہ بھرتے ہوئے کہا ''لقد عییت'' (مطلب یہ تھا کہ میں تھک گیا) اس پر اس کے ساتھیوں نے کہا ''تم ہماری صحبت میں رہتے ہو اور عربی بولنے میں غلطی کرتے ہو''، اس نے کہا ''میں نے کون سی غلطی کی ہے؟'' انہوں نے اسے بتایا کہ اگر تم محنت سے تھک گئے ہو تو تم کو بجائے ''عییت'' کے اعییت کہنا چاہیئے تھا، اس لیے کہ ''عییت'' اس موقع بولتے ہیں جب انسان کو کوئی تدبیر سجھائی نہ دے اور وہ بے بس اور عاجز و درماندہ ہو جائے۔ اس پر اس نے خفت محسوس کی اور اس نے کوفہ کے دو نحویوں ''معاذ الہراء'' اور ''رؤاسی'' کی صحبت میں رہ کر ان کا تمام علم حاصل کر لیا۔ پھر بصرہ میں خلیل سے ملا۔ اس کا تبحر علمی دیکھ کر کسائی حیران رہ گیا۔ اس نے خلیل سے پوچھا ''یہ علم آپ نے کہاں سے حاصل کیا؟'' خلیل نے جواب دیا ''حجاز، نجد اور تہامہ کے دیہاتوں سے''، چنانچہ کسائی بھی دیہاتوں میں نکل گیا، دیہاتی قبائل میں گھومتا پھرتا اور ان کے فصحاء سے ان کی باتیں سنتا رہا، تاآنکہ اس نے روایت اور لغت کا پورا پورا حصہ لے لیا، اور اس کے دربار میں اسے اس درجہ قدر و منزلت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ اور قاضی محمد بن حسن دو الگ الگ کرسیوں پر اس کے سامنے بیٹھتے تھے، اور اس نے ان دونوں کو اپنے اٹھنے بیٹھنے یا آنے جانے پر احتراماً اٹھنے بیٹھنے سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔ یہ دونوں اسی معزز طریقہ سے رہے حتیٰ کہ ایک مرتبہ رشید ان دونوں کو ہمراہ لے کر ''رَی'' چلا گیا، اور وہ دونوں زنبویہ میں جو رَی کے قریب ایک مقام ہے ایک ہی دن میں وفات پاگئے۔ رشید کو ان دونوں کی موت کا بڑا صدمہ ہوا اور اس نے کہا ''میں نے فقہ اور عربی زبان دونوں کو ''رَی'' میں دفن کر دیا۔''

تالیفات:- کوفہ و بغداد میں عربی دانی اور قراءت کی امامت کسائی پر ختم ہوگئی، اس نے ہر دو موضوع پر تقریباً بیس کتابیں لکھی تھیں۔ "کتاب معانی القرآن"، "کتاب النحو"، "کتاب النوادر"، "کتاب الہجاء" اور "رسالۃ فی لحن العامۃ"، انہی تالیفات میں سے ہیں۔

فرّاء

(پیدائش ۱۴۴ھ وفات ۲۰۷ھ)

حالاتِ زندگی:- ابوزکریا یحییٰ بن زیاد فراء کوفہ میں پیدا ہوا۔ اس نے کسائی سے کسب فیض کیا اور اس سے سند فراغت حاصل کی۔ عرب کے دیہاتیوں سے بالمشافہ گفتگو کی اور ان سے علم حاصل کیا۔ پھر بہت سے دوسرے علوم مثلاً طبیعیات، نجوم، عربوں کی تاریخ اور عربی شاعری میں نظر پیدا کی اور اس طرح اپنے استاد کسائی سے ممتاز ہو گیا۔ اس کا میلان معتزلہ کی طرف تھا، علم کلام میں بحث و نظر بھی وہ پسند کرتا تھا لیکن اسے طبعاً اس سے لگاؤ نہ تھا۔ ان چیزوں سے اس میں نظم و ترتیب کا ملکہ، استنباط و تعلیل کی قوت پیدا ہوگئی تھی۔ کوفیوں میں اس کے سوا کوئی ایسا شخص نہیں جس نے عربی زبان کی خدمت کی ہو۔ ابوالعباس ثعلب کا قول ہے "اگر فراء نہ ہوتا تو عربی زبان نہ ہوتی۔ اس لیے کہ اس نے اسے حاصل کرکے ضبط کیا اور اگر یہ نہ ہوتا تو وہ ضائع ہو جاتی"۔ ابوبکر انباری کہتا ہے "اگر بغداد و کوفہ کے عربی دانوں میں کسائی اور فراء کے علاوہ اور کوئی نہ ہوتا تو بھی اُن کو تمام لوگوں پر برتری اور فخر کے لیے یہ کافی ہوتا"۔

جب اس کی شہرت پھیل گئی تو وہ بغداد پہنچا، جہاں کسائی نے اس کی اقامت کے لیے راستہ ہموار کیا اور اپنی موت کے بعد اسے اپنی مسند درس و تدریس پر بٹھا گیا، جب خلافت مامون کو ملی تو یہ اس کے دربار میں پہنچ گیا اور وہاں بڑا مرتبہ پایا مامون اسے اپنے دونوں لڑکوں کو ادب کی تعلیم دینے کے لیے اتالیق مقرر کر لیا۔ اس نے کسائی کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی کہ وہ عربی کی وہ تمام معلومات جو اس نے سنی ہے نیز اصول نحو کو تالیف کے ذریعہ جمع کر دے۔ اس نے اپنے گھر میں فرّاء کے لیے ایک خاص کمرہ بنانے کا حکم دے دیا اور اس کے لیے لونڈی اور خدام بھی معین کر دیے۔ کاتبوں کی ایک جماعت اس کے پاس بھیجی جو اس کی املاء کرائی ہوئی عبارت لکھتے۔ چنانچہ اس نے دو سال کی مدت میں "کتاب الحدود" تصنیف کی۔ پھر اس نے لوگوں میں نکل کر انہیں اپنی تصنیف "کتاب المعانی" املاء کرائی، جسے کتب فروشوں نے گراں قیمت وصول کرنے کے لیے چھپا لیا۔ وہ اس کتاب کے پانچ اوراق نقل کرنے کی قیمت ایک درہم وصول کرتے تھے، اس گرانی کی شکایت لوگوں نے فراء سے کی۔ چنانچہ اس نے تاجروں کو سمجھایا، لیکن

جب وہ نہ مانے تو اس نے ایک اور کتاب اسی معانی کے موضوع پر اس سے زیادہ طول وعریض املاء کرانی شروع کر دی۔ اس پر کتب فروش ڈر گئے اور وہ دس اوراق نقل کرنے کی قیمت ایک درہم لینے پر رضا مند ہو گئے۔

حکومت میں فراء کو بڑا مرتبہ حاصل ہوا اور حالت یہ تھی کہ جب وہ باہر جانا چاہتا تو اس کے جوتے پیش کرنے کے لیے مامون کے دونوں بیٹے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے، پھر دونوں اس بات پر صلح کر لیتے کہ ان میں سے ہر ایک ایک جوتا اٹھا کر رکھ دے۔ جب مامون کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس نے فراء کو بلا کر پوچھا "لوگوں میں سب سے بلند مرتبہ و باعزت کون ہے؟" اس نے جواب دیا "میں امیر المومنین سے زیادہ کسی کو بلند مرتبہ و باعزت نہیں پاتا" مامون نے کہا "نہیں، بلکہ وہ شخص سب سے زیادہ باعزت ہے جس کو جوتے پیش کرنے کے لیے دو ولی عہد آپس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا اور لڑ مرنا چاہتے ہیں" فراء نے کہا "امیر المومنین! میں نے چاہا کہ انہیں اس سے منع کر دوں۔ لیکن پھر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں اس طرح میں ان کے اخلاق فاضلہ اور جذبہ خدمت کو نہ دبا دوں" اس پر مامون نے کہا "اگر تم انہیں منع کرتے تو مجھے تم سے شکایت ہو جاتی، ان کے ایسا کرنے سے ان کا بلند مرتبہ گھٹتا نہیں، بلکہ اس سے تو ان کا مرتبہ بلند ہوتا ہے اور ان کا جوہر نکھرتا ہے۔ آدمی خواہ کتنا ہی بڑا ہو جائے وہ تین شخصیتوں کے احترام سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ایک حاکم وقت، دوسرے والدین، اور تیسرے استاد"

فراء کی بہت سی تالیفات ہیں جو وہ اپنے شاگردوں کو بغیر کسی کتاب میں دیکھے اپنے حافظہ کی قوت سے املاء کراتا تھا۔ وہ زیادہ تر بغداد میں رہتا تھا۔ سال کے آخر میں وہ کوفہ چلا جاتا اور وہاں چالیس دن اپنے اہل وعیال میں رہتا اور جو کچھ دولت جمع کرتا وہ ان میں تقسیم کر دیتا۔ اس کی وفات ۲۰۷ھ میں ہوئی۔

ابن الحاجب

(متوفی ۶۴۶ھ)

حالات زندگی: ابو عمرو عثمان بن عمر المعروف بہ ابن الحاجب صعید مصر میں بمقام اسنا پیدا ہوا۔ اس کا باپ کرد تھا اور امیر عزیز الدین موسک صلاحی کا دربان تھا۔ بچپن ہی میں وہ قاہرہ آیا اور قرآن پڑھنے لگا تا آنکہ اسے حفظ کر لیا۔ پھر اس نے دینی تعلیم مذہب مالکی کے مطابق حاصل کی قراءتین سیکھیں اور تمام دیگر علوم میں حصہ لیا۔ لیکن ان سب پر زبان عربی کا علم غالب آ گیا۔ دمشق کا سفر کیا اور وہاں کی جامع مسجد میں امالی فی النحو

پڑھی۔ پھر اسکندریہ واپس آیا اور وہاں ۶۴۶ھ میں وفات پائی۔

تالیفات:۔ اس کی تالیف میں دو کتابیں کافیہ اور شافیہ نحو میں ہیں اور "کتاب المقصد الجلیل فی علم الخلیل" فن عروض و قوافی میں، الامالی النحویہ، منتہی السول والامل، فی علم الاصول والجدل، یہ مذہب امام مالک پر مطول کتاب ہے جسے اس نے ایک کتاب میں اختصار سے پیش کیا ہے یہ خلاصہ "مختصر ابن حاجب" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک تالیف "کتاب جامع الامہات" فقہ میں ہے۔

علم لُغت

جب عربی زبان بولنے میں لوگوں نے اعراب کی غلطیاں کیں تو علماء نے وہ قوانین بنائے جن سے ان خامیوں کا ازالہ ہو جائے۔ لیکن اس سے بھی زبان ٹھیک نہ ہوئی اور خامیاں باقی رہیں۔ اب زیادہ غلطیاں الفاظ کی ساخت اور ان کے استعمال میں ہونے لگیں۔ چنانچہ علماء نے کتاب اللہ اور عربی زبان کی حفاظت کے لیے الفاظ کو لکھ کر ضبط کر لینے کی کوششیں کیں۔ اس سلسلہ کی ابتدا بعض علمائے لغت کے چھوٹے چھوٹے رسائل کے املاء سے ہوئی جو انہوں نے الفاظ کے متعلق لکھوائے۔ یہ الفاظ جامع اور ہر موضوع پر نہ ہوتے تھے بلکہ چند خاص موضوعات سے متعلق ہوتے مثلاً انسان کے بدن اور اس کی ساخت کے متعلق یا اونٹ اور گھوڑوں کی ساخت سے متعلق یا پودوں سے متعلق۔ بالآخر خلیل بن احمد نے آکر اپنی مشہور تصنیف "کتاب العین" لکھ کر عربی لغت کو ضبط کرنے کا راستہ ہموار کیا، اس نے حروف ہجاء سے مرکب ہونے والے دو حرفی، سہ حرفی، چہار حرفی، پنج حرفی الفاظ حسابی ترتیب کے ساتھ شمار کیے جس سے اس کے سامنے مہمل اور مستعمل مادوں کی تعداد واضح ہو گئی۔ پھر ان مرکب الفاظ کو مخارج حروف کے لحاظ سے ترتیب دی، یعنی پہلے وہ حروف جن کا مخرج حلق ہے پھر وہ جن کا مخرج زبان ہے پھر دانت اور پھر ہونٹ اور اس کی ابتدا حروف علت سے کی۔ خلیل کی اس کتاب کا ابوبکر زبیدی (متوفی ۳۷۹ھ) نے اندلس کے حاکم ہشام المؤید کے لیے خلاصہ کیا اور یہ خلاصہ اس قدر عام ہوا کہ اصل سے بازی لے گیا۔ خلیل کی لغت لکھے ہوئے ایک صدی سے زیادہ گذر گئی تھی اور اس باب میں اس کی کتاب کے علاوہ کوئی لغت کی کتاب موجود نہ تھی۔ حتیٰ کہ ابوبکر ابن درید نے آکر خلیل کی کتاب اور دیگر تصانیف کی مدد سے کتاب الجمہرہ لکھی اور اسے حروف ہجاء کے لحاظ سے ترتیب دیا۔ اس کے بعد ازہری آیا اور اس نے خلیل کی ترتیب کے مطابق "کتاب التہذیب" لکھی پھر مشرقیوں میں سے جوہری نے "کتاب الصحاح" تصنیف کی۔ اندلسیوں میں سے ابن سیدہ نے "کتاب المحکم" لکھی اور ابن فارس نے "کتاب المجمل"۔ یہ ہیں لغت کی اہم اور بنیادی کتابیں۔ رہیں دوسری کتابیں مثلاً تکملہ، نہایۃ، لسان العرب، اور

القاموس تو وہ انہی کتابوں کے مواد کیجا جمع کرتی ہیں یا ان کی ملخص ہیں۔

مناسب ہوگا کہ ہم یہاں ثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ) کی کتاب فقہ اللغہ کا ذکر کر دیں، اس کتاب میں مصنف نے الفاظ کی وضع اور ان کے استعمال کے فرق بیان کیے ہیں، اور مترادف و متقارب معانی ایک باب کے تحت جمع کر دیے ہیں اور پھر ان کے درمیان جو فرق ہے وہ بھی واضح کر دیا ہے۔ نیز اس موقع پر زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی کتاب اساس البلاغہ کا تعارف بھی ہو جانا چاہیے، اس کتاب میں مصنف نے الفاظ کی وہ آخری حدیں اور استعمال کے وہ مجازی طریقے بتائے ہیں جو عرب روا رکھتے تھے، ان ہر دو کتابوں میں لغت عربی کی خصوصیات اور اس کے سربستہ رازوں کو اس طرح نکھار کر پیش کیا گیا ہے کہ کوئی ادیب ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا اور ان کے بعد طالب علم کو ان پر اضافہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

لُغوِیّیْن

خلیل بن احمد

(پیدائش ۱۰۰ھ وفات ۱۷۴ھ)

حالاتِ زندگی:- ابو عبد الرحمن خلیل بن احمد فراہیدی، بصرہ میں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پائی۔ بلند پایہ علماء عربی اور اعلیٰ طبقہ کے رواۃ سے اس نے نحو، قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی مثلاً ابو عمرو بن علاء اور عیسیٰ بن عمر وغیرہ۔ پھر عرب کے دیہاتوں میں چلا گیا جہاں فصیح عربی سنی اور غریب الفاظ کا ذخیرہ جمع کیا، حتیٰ کہ عربی علوم کی اس بلندی پر پہنچا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ سیبویہ اور دیگر ائمہ علوم مثلاً نضر بن شمیل اور مؤرخ سدوسی سے علم حاصل کیا۔ تمام عمر بصرہ ہی میں فقر و فاقہ اور عسرت سے بسر کر دی اس لیے کہ نہ وہ کسی کا احسان لینا چاہتا تھا نہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ سلیمان نے اسے ایک قاصد کے ذریعہ اپنے دربار میں پہنچنے کی دعوت دی اور اسے اہواز میں اپنے بچے کی اتالیقی کا عہدہ پیش کیا۔ خلیل نے قاصد کو روکھی سوکھی روٹی پیش کرتے ہوئے کہا "جو کچھ میرے پاس ہے وہ پیش خدمت ہے اسے تناول فرمائیے، اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں، اور جب تک مجھے یہ ملتا رہے گا مجھے سلیمان کی خدمت میں پہنچنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ یک سوئی اور تن دہی سے علمی تحقیق، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مشغول رہا اور اسی راہ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ کہتے ہیں کہ اس نے کہا تھا "میں حساب کا ایک ایسا آسان طریقہ ایجاد کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے بعد کوئی بنیا کسی بچی کو بھی حساب میں

غوطہ نہیں دے سکے گا۔ اسی فکر میں وہ مسجد میں داخل ہوا، اور ایک ستون سے اس زور سے ٹکر کھائی کہ اس کا بھیجا ہل گیا اور موت واقع ہو گئی۔

اس کی علمی خدمات:۔ خلیل کو صحت قیاس نحوی مسائل کے استنباط، اور ان کی توجیہ و تعلیل میں بے پناہ قدرت حاصل تھی سیبویہ کی "الکتاب" کا بیشتر حصہ اسی کی روایت سے منقول ہے یا اس کی مدد سے روایت کیا گیا ہے۔ وہ موسیقی سے بھی واقف تھا، چنانچہ یہ پہلا شخص ہے جس نے کوئی غیر زبان سیکھے اور آلات موسیقی کا علم رکھے بغیر، اس موضوع پر پہلی کتاب تصنیف کی نغمات اور ان کے زیر و بم نے اس کے ذہن رسا کو علم و عروض و قوافی کی ایجاد میں مدد پہنچائی۔ چنانچہ اس نے شاعری کے پندرہ اوزان بنائے اور انہیں ان کے پانچ دائروں میں تقسیم کیا۔ وہ انہیں حرکات و سکون کے اعتبار سے الگ الگ کرتا تھا۔ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے وہ اپنی تمام تر توجہات مبذول کر دیتا اور گھنٹوں اپنے کمرہ کی تنہائیوں میں اپنی انگلیاں ہلاتا، اور سر کو جنبش دیتا رہتا۔ اتفاقاً اس کے لڑکے نے ایک مرتبہ اسے اس حالت میں دیکھ لیا اور یہ خیال کیا کہ ابا جان کو کچھ جنون لاحق ہو گیا ہے، اس پر خلیل نے یہ اشعار کہے:۔

لو کنت تعلم ما اقول عذرتنی   او کنت تعلم ما تقول، عذلتکا

لکن جھلت مقالتی فعذلتنی   و علمت انک جاھل فعذرتکا

اگر تو وہ کچھ جانتا ہوتا جو میں کہہ رہا ہوں تو تو مجھے معذور گردانتا، یا اگر تو یہ جانتا ہوتا کہ تو کیا کہہ رہا ہے تو میں تجھے ملامت کرتا۔ لیکن تو میری بات کو نہ جاننے کی وجہ سے مجھے ملامت کرنے لگا اور میں یہ جانتا ہوں کہ تو جاہل ہے لہذا تجھے معذور گردانتا ہوں۔

خلیل پہلا شخص ہے جس نے عربی زبان کو باقاعدہ ضبط کیا، تدوین لغت کی طرح ڈالی، اور عربی رسم الخط کو موجودہ مستعمل شکل بخشی۔

تصانیف:۔ اس نے خراسان میں "کتاب العین"، تصنیف کی اور سلف کے دستور کے مطابق اس کتاب کا نام اس پہلے لفظ سے رکھا جس سے اس کتاب کی ابتداء ہوئی تھی۔ لیکن موت نے اسے یہ کتاب مکمل نہ کرنے دی۔ اس کے بعد اس کے بعض شاگردوں نے اسے پورا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے بلند معیار کو قائم نہ رکھ سکے، لہذا کتاب کچھ ڈھیلی اور ناقص رہ گئی۔ اس کے علاوہ اس کی تالیفات میں "کتاب النغم، کتاب العروض، کتاب الشواہد، کتاب النقط والشکل، اور کتاب الایقاع" ہیں۔

ابنِ دُرَید

(پیدائش ۲۲۳ھ وفات ۳۲۱ھ)

حالات زندگی:- ابوبکر محمد بن درید، بصرہ میں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پائی ریاشی اور سجستانی جیسے علماء سے علم حاصل کیا پھر زنگیوں کے فتنہ میں بصرہ چھوڑ کر عمان چلا گیا اور وہاں بارہ سال رہ کر دیہاتی عربوں سے عربی اور شاعری کی معلومات حاصل کی، پھر بصرہ واپس آیا وہاں سے شاہ بن میکال اور اس کے بیٹے سے طلب اعانت کے لیے ایران چلا گیا، جو ایران کے گورنر تھے۔ ان کے لیے اس نے اپنی کتاب "جمہرۃ اللغۃ" تصنیف کی، اور اپنے قصیدہ (مقصورہ) کے ذریعہ ان کی مدح کی، چنانچہ انہوں نے اس کی قدر افزائی کرتے ہوئے اسے سرکاری دفاتر کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ چنانچہ حکومت ایران کی جس قدر بھی ڈاک نکلتی وہ اس کے مشورہ اور اس کے دستخط سے باہر نکلتی تھی۔ جب میکال کے بیٹوں کو گورنری سے برطرف کر دیا گیا تو وہ خراسان چلے گئے اور ابن درید ۳۰۸ھ میں بغداد پہنچ گیا، جہاں وزیر علی بن فرات نے اس کا نہایت اعزاز و احترام سے استقبال کیا اور اسے انعامات سے نوازا۔ خلیفہ مقتدر کو جب اس کے علمی بلند مرتبہ کا علم ہوا تو اس نے اس کے لیے پچاس دینار ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، تاکہ وہ معاشی تگ و دو سے مطمئن ہو کر علمی تحقیق کے کام جاری رکھ سکے۔ اس کے بعد وہ تصنیف و تالیف اور علم و ادب کے کام یکسوئی سے کرتا رہا تاآنکہ ۳۲۱ھ میں وہ فالج میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔

اُس کے اخلاق و عادات اور اس کا علمی مقام: ابن درید موسیقی اور آلات طرب کا بڑا دلدادہ، شراب کا عادی، دولت کا دشمن، کھیل کود عطیوں اور بخششوں میں مال بہت صرف کرنے والا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی سائل نے اس سے کچھ مانگا اور اس وقت اس کے پاس سوائے شراب کے مٹکے کے اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے وہی سائل کو دے دیا۔ اس کے خادم نے شراب صدقہ کرنے پر اعتراض کیا تو اس نے کہا "اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے"، پھر اس نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی۔ لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون: جب تک تم اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ نہیں کرو گے نیکی کا مقام ہرگز نہیں پا سکو گے" اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے بعد ہی اسے دس شراب کے مٹکے ہدیہ پیش کیے گئے، تو اس نے اپنے خادم سے کہا "ہم نے ایک مٹکا نکالا اور دس ہمارے پاس آ گئے۔"

ابن درید لغت، ادب و انساب میں چوٹی کا عالم مانا جاتا ہے۔ ان علوم میں اس کا مرتبہ خلیل بن احمد کے برابر تھا۔ اس نے شاعری میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا، حتیٰ کہ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ شعراء میں سب سے زیادہ فقیہ اور فقہاء میں سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس نے عربوں سے متعلق چار سو قصے گھڑے جن کے بیان کا طریقہ روایت و بیان کا سا ہے، ان کی انشاپردازی میں اس نے حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے تحریر میں اس کے کمال اور زورِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے، یہ تمام واقعات ادب کی کتابوں میں اس طرح منتشر ہیں کہ وہ عرب کے جملہ واقعات و حکایات و نوادر سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ اس کی نظم بھی نہایت ٹھوس، شیریں اور خوش گوار ہے جو اس کی قادر الکلامی اور طبیعت کی جولانی پر دال ہے۔ اس کا بہترین حصہ "مقصورہ" ہے، جس میں دو سو انتیس اشعار ہیں، ان میں اس نے عربوں کے بہت سے واقعات، ضرب الامثال، اور حکیمانہ اقوال جمع کر دیے ہیں۔ اس مقصورہ کی بہت سے علماء نے شرحیں لکھی ہیں، اور متعدد شعراء نے اس کے مقابلہ میں مقصورہ کہے ہیں اس کے مقصورہ کا مطلع ہے:-

اما تری رأسی حاکی لونه طرة صبح تحت اذیال الدجا
واشتعل المبیض فی مسوده مثل اشتعال النار فی جزل الغضا

اگر تو میرے سر کو دیکھ رہی ہے کہ اس کا رنگ صبح کے ابتدائی حصہ سے مشابہ ہے جو تاریکی کے دامنوں میں چھپا ہوا ہے، اور سفیدی اس کی سیاہی میں اس طرح بھڑک اٹھی ہے جیسے کیکر کی موٹی موٹی لکڑیوں میں آگ بھڑکتی ہے۔

مقصورہ کے کچھ اور اشعار:-

والناس کالنبت فمنه رائق غض نضیر عوده مرّ الجنی
ومنه ماتقتحم العین، فان ذقت جناه انساغ عذبا فی اللها
والناس الف منهم کواحد وواحد کالألف ان امرعنی
وللفتی من ماله ما قدمت یداه قبل موته، الا ما اقتنی
وانما المرء حدیث بعده فکن حدیثا حسنا لمن وعی
واللوم للحر مقیم رادع والعبد لا یردعه الا العصا
وآفة العقل الهوی فمن علا علی هواه عقله فقد نجا
کم من اخ مسخوطة اخلاقه اصفیته الود لخلق مرتضی
اذا بلوت السیف محموداً فلا تذممه یومًا ان تراه قد نبا

لوگوں کی مثال پودوں کی سی ہے، کہ بعض پودے دیکھنے میں بڑے ہرے بھرے اور تروتازہ نظر آتے ہیں لیکن ان کا پھل چکھو تو وہ تلخ ہوتا ہے۔ اور بعض پودے بظاہر نہایت

بھونڈے اور بدشکل نظر آتے ہیں لیکن ان کا پھل نہایت خوشگوار اور فرحت بخش ہوتا ہے۔
لوگوں میں بعض تو ہزار ایک شخص کے برابر ہوتے ہیں اور کوئی ایک ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقت
پڑنے پر وہ اکیلا ہزار کے برابر ہوتا ہے۔ آدمی کے لیے اس کے مال میں سے وہی حصہ اس کے
کام آتا ہے جو اس نے اپنی موت سے پہلے کار خیر میں لگا دیا اور عقبیٰ کے لیے ذخیرہ کر دیا نہ کہ
وہ مال جسے وہ جمع کر چھوڑتا ہے۔ آدمی اپنے مرنے کے بعد ایک کہانی بن جاتا ہے، لہٰذا تو
ان لوگوں کے لیے جو تیری کہانی یاد کریں اچھا قصہ بننے کی کوشش کر۔ شریف آدمی کو اس کی
غفلت سے بیدار کرنے کے لیے معمولی سی تنبیہ ہی کافی ہوتی ہے، لیکن غلام ذہنیت کو راہ راست
پر لانے کے لیے ڈنڈا ہی درکار ہوتا ہے۔ عقل کو جو چیز تباہ کرتی ہے وہ جذبات و خواہشات
نفسانی ہیں جس شخص کی عقل اس کے جذبات و خواہشات پر غالب ہو جائے بس سمجھ لو کہ وہ نجات پا گیا۔ کتنے ہی ایسے دوست ہیں جن کے
اخلاق لوگ پسند نہیں کرتے، میں نے پسندیدہ اخلاق کی وجہ سے ان سے بے لوث اور پر خلوص محبت
رکھی۔ اگر تم تلوار کو ایک دفعہ آزمائش کے بعد اسے قابل تعریف پالو تو کبھی جب اس کا نشانہ
اچٹ جائے، اس کی برائی کرنے نہ بیٹھ جاؤ۔

اس کی تالیفات:۔ مقصورہ کے علاوہ اس کی تصنیفات میں جمھرۃ اللغہ، کتاب الاشتقاق فی اسماء القبائل والعمائر وشعرائہا وفرسانہا، اور کتاب السحاب والغیث، اور اخبار الرواۃ، وغیرہ ہیں۔

علم بیان

گمان غالب یہ ہے کہ سب سے پہلے علم بیان پر جس نے کچھ بحث کی وہ ابو عبیدہ جنہوں نے
نے اپنی کتاب "مجاز القرآن" میں آیہ کریمہ "طلعہا کانہ رؤس الشیاطین: اس میں سے پھوٹنے والے
شگوفہ کا خول ایسا ہے جیسے شیطان کے سر" کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا
کہ یہ اسی قسم کی تشبیہ ہے جیسی امرؤالقیس کے اس شعر میں ہے:۔

ایقتلنی والمشرفی مضاجعی و مسنونۃ زرق کانیاب اغوال

کیا وہ مجھے قتل کر دے گا حالانکہ تیز تلوار میرے پہلو میں لگی ہے اور نیلگوں تیز دھار والی
جو بھوتوں اور چڑیلوں کے نکیلے دانتوں کی طرح ہے۔

(یہاں مرئی و محسوس شے کو غیر مرئی و غیر محسوس شے سے تشبیہ دی گئی ہے)

عہد بنی العباس کا ابتدائی دور ختم ہو چکا تھا لیکن علم معانی پر کوئی جداگانہ کتاب مدون
نہیں ہوئی تھی، الا یہ کہ بعض بلند پایہ ادیبوں سے منسوب کچھ روایات نقل ہوئی تھیں جو انہوں
نے کسی کے سوال کے جواب میں یا دوران گفتگو میں سرسری طور پر بلاغت سے متعلق بیان
کی تھیں، تاآنکہ جاحظ آیا اور اس نے اس کے بعض موضوعات پر اپنی کتاب "البیان والتبیین"

میں روشنی ڈالی۔ پھر قدامہ، ابوبکر ابن درید، ابو ہلال عسکری نے اس کی پیروی کرتے ہوئے اس موضوع پر قلم اٹھایا، تاہم ان لوگوں کو ہم ان کی مختصر تحریروں اور عمومیت عبارت کی وجہ سے اس فن کے بانی مبانیوں میں شمار نہیں کر سکتے۔ اس فن کے وضع کرنے میں جن کی فضیلت مسلم ہے وہ امام عبدالقاہر جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) اور امام ابو یعقوب سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) ہیں۔ اول الذکر نے اس کے موضوعات و مباحث کی اختراع کی اور اس کے قواعد کی تمہید کی اور مؤخر الذکر نے اُسے بلو کر اس کا مکھن نکالا اور معانی کو بیان سے ممتاز کر کے انہیں دو مستقل علوم قرار دیا۔

رہ گیا علم بدیع سو اس میں سب سے پہلی کتاب جس نے تالیف کی وہ عبداللہ بن المعتز ہے جس نے اس علم کی سترہ قسمیں اس میں جمع کر دیں اور اس کے معاصر قدامہ بن جعفر نے اس کی بیس قسمیں گنائیں جن میں سے سات عبداللہ بن المعتز والی قسمیں ہیں۔ پھر لوگوں نے ان اقسام کا پوری طرح کھوج لگانا شروع کر دیا حتیٰ کہ ابن حجہ حموی (متوفی ۸۳۷ھ) کی تالیف خزانۃ الادب میں پہنچتے پہنچتے یہ اقسام ایک سو بیالیس ہو گئیں۔

چونکہ یہ فنون اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب کہ عربوں میں کمزوری اور زبان پر عجمیت طاری ہو رہی تھی اس لیے اب تک یہ اپنے کمال تک نہ پہنچ سکے۔ ان فنون میں مشرقی لوگ مغربیوں سے زیادہ پختہ کار تھے۔ اس لیے کہ ان میں عجمی بھی تھے جو ان فنون میں دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی نظر ان امور میں تیز تھی۔ مغربیوں نے سہولت ماخذ کی بناء پر صرف بدیع پر کچھ توجہ دے کر اسے فنون شاعری میں جگہ دی اور اس کے ابواب و افروع مرتب کیے۔

تاریخ

اس دور کے آغاز ہی میں عربوں کے ہاں تدوین تاریخ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت یہ سلسلہ دینی حدود میں محدود اور اس کے فروعی تقاضوں کے ماتحت رونما ہوا تھا مثلاً "مغازی" تاکہ اس کے ذریعہ ان اوقات و مقامات کا علم حاصل ہو سکے جن میں آیات قرآنی نازل ہوئیں یا ان کے بارے میں احادیث روایت کی گئیں اور "فتوحات" تاکہ جو علاقے بذریعہ صلح یا بعد جنگ فتح کیے گئے ان کا علم ہو سکے اور اسی طرح خراج و جزیہ کا نظام درست رکھا جائے۔ اور "طبقات" تاکہ صحابہ و تابعین میں سے شریعت کو بیان کرنے والے راویوں اور ادبی خدمت کرنے والوں کا تعارف ہو سکے۔ تاریخ کو ان اصولوں کے تحت ترتیب دینے میں عربوں کو تمام دیگر اقوام عالم پر فوقیت حاصل ہے، پھر انہوں نے "انساب" کے موضوع پر لکھا تاکہ قریشی اشراف اور سادات قبائل کی شناخت ہو سکے۔ ان کے مراتب معلوم کیے جا سکیں اور اس کے مطابق ان کے سرکاری وظائف متعین ہوں، نیز "ایام عرب" پر مواد جمع کیا تاکہ ان کے ذریعے شاعری کے اغراض و مقاصد

سمجھنے میں مدد ملے۔ اور وہ مشہور اہل قلم جنہوں نے ان موضوعات پر خامہ فرسائی کی بالترتیب یہ ہیں، ابن اسحٰق متوفی ۱۵۱ھ، واقدی متوفی ۲۰۷ھ، ابن سعد متوفی ۲۳۰ھ، کلبی متوفی ۲۰۶ھ، اصمعی متوفی ۲۱۶ھ۔

جب اقوام عالم کی تواریخ عربی میں ترجمہ ہوئی اور عربوں نے اس کا مطالعہ کیا تو اس وقت تک وہ اپنی مخصوص تاریخ میں نہایت خوش اسلوبی سے حصہ لیا، چنانچہ عمدۃ المورخین محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے اپنی مبسوط تاریخ کی کتاب ترتیب دی جس میں ترادیث سن وار درج کیے۔ اس کے بعد دیگر مصنفین نے بھی اس کے طریقہ کو اپنا لیا۔ بعض مورخین نے تو اپنی تاریخی کتابوں میں علمی و ادبی مباحث شامل کر کے ابن جریر پر تفوق بھی حاصل کر لیا مثلاً ابو زید بلخی (متوفی ۳۲۲ھ) کتاب البدء والتاریخ[1] کا مولف مسعودی (متوفی ۳۴۶ھ) مولف "مروج الذہب" ابن الندیم متوفی ۳۸۵ھ مولف "کتاب الفہرست" اور ابن مسکویہ متوفی ۴۲۱ھ مولف "تجارب الامم" بعد ازاں مورخین کو مبسوط تاریخی کتابیں لکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی اور انہوں نے پہلی تصانیف پر اضافے اور ضمیمے لکھنے شروع کر دیے، چنانچہ مورخین کی ایک جماعت نے ابن جریر کی تاریخ پر تکملے اور ضمیمے لکھ کر اسے ۶۱۶ھ کے واقعات تک بڑھا دیا اور پھر سب کے بعد اس عہد کا آخری مورخ ابوالحسن علی بن الاثیر[2] آیا جس نے اپنی کتاب الکامل کو طبری کی تاریخ اور اس کے ضمیموں اور تکملوں کی مدد سے بالتفصیل لکھا اور ۶۲۷ھ تک کے واقعات اس میں درج کیے۔

تاریخ نویسی میں عربوں کا طریقہ

عربوں میں تاریخ نویسی کے دو طریقے رائج تھے، ایک تو سن درج کر کے اس کے تحت واقعات

---

[1] مشہور یہی تھا کہ یہ کتاب ابو زید بلخی کی تصنیف ہے لیکن فرانسیسی مستشرق کلے مین ہیار جس نے اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ آستانہ سے حاصل کر کے اسے فرانسیسی میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے کہ اس کا پہلا جزء شائع کرتے پر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مطہر بن طاہر مقدسی کی تالیف ہے جو سجستان کے علاقہ بست کا باشندہ تھا۔ دوسرے اور تیسرے جزء کے مقدمہ میں اس نے اس دعویٰ کے ثبوت میں جو قرائن و شواہد بیان کیے ہیں وہ قوی اور قابل اعتماد ہیں۔

[2] یہ ابن الاثیر، عزالدین ابوالحسن علی بن محمد شیبانی ہیں جو الجزیرہ کے جزیرہ ابن عمر میں ۵۵۵ھ میں پیدا ہوئے پھر وہ اس کے دو بھائی (مبارک مولف نہایہ فی غریب الحدیث اور ضیاء الدین مؤلف المثل السائر) اپنے باپ کے ہمراہ موصل گئے اور وہاں کے علماء سے پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ وہاں سے ابن الاثیر بعض مشرقی ممالک میں تحصیل علم اور طلب جاہ کی خاطر نکل پڑا، پھر موصل پہنچ کر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گیا اور یہاں اس نے اپنی تاریخ کی کتاب، نیز اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ لکھی۔ ۶۳۰ھ میں اس نے انتقال کیا۔

بالاسناد درج کرنا، خواہ وہ کسی مقام میں واقع ہوئے ہوں، اس طریقہ میں واقعات کی ترتیب مسلسل نہیں رہتی نہ ربط عبارت برقرار رہتا ہے اس کی مثال ابن جریر طبری، ابن الاثیر جزری اور ابو الفداء کی تصانیف میں ملے گی۔ یہ طریقہ طبع پہ گراں گذرنے کے باوجود عربوں کے نزدیک صحیح تاریخ نویسی کا طریقہ تھا جیسا کہ اس فن کے نام یعنی تاریخ سے ظاہر ہے جس کے معنی ہی تعیین وقت کے ہیں، برخلاف اس کے یونانیوں نے اس فن کا نام ہی کہانی اور قصہ رکھا تھا اس لیے کہ ان کے ہاں تاریخی واقعات نہایت دلچسپ اسلوب اور پرکشش انداز سے بیان کیے جاتے تھے۔ تاریخ نگاری کا دوسرا طریقہ جو عربوں میں رائج تھا وہ قوموں اور حکومتوں کی تاریخ ان کے ادوار کی ترتیب سے لکھنے کا تھا، یہ طریقہ مسعودی، ابن الطقطقی، ابن خلدون ابن العبری کا ہے۔

ہر دو طریقوں سے لکھنے والے بہت کچھ لکھنے کے باوجود ذرائع و وسائل کی کمیابی نیز حکام کی اثر اندازی کی وجہ سے فن تاریخ نویسی کے صحیح طریقہ تک نہ پہنچ سکے نہ اس فن میں کمال حاصل کر سکے۔ خلفاء جانبداری اور بادشاہوں کی موافقت وحمایت انہیں تنقید کے میدان میں قدم نہ رکھنے دیتی تھی۔ وہ حقیقت کا کھوج لگائے بغیر حوادث نگاری کر دیتے۔ واقعات کے اسباب ونتائج پہ ان کی نظر نہ پڑتی۔ انہوں نے اقوام کی تاریخ لکھتے وقت ان کے اقتصادی، اجتماعی اور ادبی احوال کو درخور اعتناء نہ سمجھا اور صرف اسی پہ اکتفا کیا کہ جنگ وفتوحات کے حالات لکھ دیں۔ والیوں اور حکام کی تخت نشینی اور معزولی نیز ان کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کا ذکر کر دیں۔ وہ اس بات کو بھول گئے کہ قوم کے مختلف طبقات میں انقلاب احوال اور تغیر میلانات کا اس کی سیاست پہ بڑا اثر پڑتا ہے اور سب سے زیادہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ابن خلدون جیسا مورخ بھی جس نے اقوام عالم کے علماء میں سب سے پہلے فلسفہ تاریخ کی بناء ڈالی ان میں سے بیشتر عیوب سے خالی نہ رہ سکا۔

لیکن اس فروگذاشت پہ ہمارے مورخین قابل معافی ہیں، اس لیے کہ جب تک پورے پورے وسائل وذرائع اور تمام علوم مثلاً علم مسکوکات (علم سکہ شناسی) قدیم تاریخی دستاویزوں کا علم، علم آثار قدیمہ، اقتصادیات، علم اعداد وشمار، علم تنقید، تک رسائی نہ ہو، فن تاریخ میں کمال ومہارت ممکن نہیں اور چونکہ عرب ان سب علوم یا ان میں سے بیشتر سے ناواقف تھے اس لیے انہوں نے رونما ہونے والے واقعات کے ظاہر کو دیکھا اور وہ تاریخ کے اس مفہوم تک نہ پہنچ سکے جو آج کل سمجھا جاتا ہے۔

علومِ شرعیّہ

علمِ حدیث

عمر بن عبد العزیز رح کے بعد منصور پہلا شخص ہے جس نے احادیث کی تدوین کا اہتمام

کیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اصحاب حدیث کی موت سے احادیث رسول اللہ ضائع نہ ہو جائیں، چنانچہ اس نے امام مالک بن انس رح کو موطا کی تالیف کا حکم دیا، جس پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے ایک احادیث و فقہ کا مجموعہ "موطا" کے نام سے لکھ دیا۔ پھر فقہ دینی میں وسعت پیدا کرنے اور فضیلت حاصل کرنے کے لیے علماء اس میدان میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے لگے۔ بازار میں اس سودے کی مانگ بڑھ گئی اور احادیث کی روایت عام ہو گئی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ احادیث بیان کرنے والوں میں بہت سے گمراہ اور فرقہ پرستوں نے حصہ لے کر اس میں ریشہ دوانیاں شروع کر دیں، انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان تراشا اور بھولے بھالے راویوں کے ذریعہ جھوٹی احادیث بھی ان میں داخل کر دیں۔ اس طرح گھڑی ہوئی احادیث کی کثرت ہو گئی اور حق لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تب ائمہ حدیث نے مستعدی سے کام لیتے ہوئے حدیثوں کی جانچ پڑتال اور تنقید و تحقیق نیز راویوں کو پرکھنے کے لیے جرح و تعدیل کا سلسلہ شروع کیا۔ اس موضوع پر جس نے سب سے پہلے قلم اٹھایا وہ اسحٰق بن راہویہ متوفی ۲۳۸ھ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حدیث کو فقہ سے الگ کیا۔ ان کے بعد امام بخاری رح اور امام مسلم رح آئے اور انہوں نے اپنی کتابوں میں صحیح احادیث جمع کر دیں۔ ان کے بعد ایک ہی زمانہ میں چار کتابیں اور لکھی گئیں اور اس طرح احادیث صحیحہ کے چھ مجموعے (الصحاح الستۃ) وجود میں آئے۔ بعد کی چار کتابوں میں ایک تو ابو عیسے ترمذی متوفی ۲۷۹ھ کی کتاب ہے، دوسری ابوداؤد سجستانی متوفی ۲۷۵ھ کی کتاب، تیسری ابوعبدالرحمٰن النسائی متوفی ۲۷۵ھ کی کتاب اور چوتھی کتاب ابوعبداللہ بن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ کی ہے۔

لوگوں نے ان کتابوں کی صحت پر اتفاق کر لیا اور پھر ان کی مدد سے احادیث کی جمع و تلخیص و تشریح میں مشغول ہو گئے۔ ان کے بعد حدیث کے موضوع پر جس قدر تصانیف ہوئیں ان کا دارومدار انہی پر ہے اور وہ ان کی تابع ہیں۔

محدثین

امام بخاری رح

(پیدائش ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ)

حالاتِ زندگی:- ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری، حالت یتیمی میں بخارا میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ پہلے انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا، علوم عربیہ میں پختگی حاصل کی اور جب نو برس کے ہوئے تو حدیث سیکھنا شروع کر دی اور تھوڑی ہی مدت

یں ہزاروں احادیث حفظ کرلیں۔ ۲۰۴ھ میں وہ اپنی والدہ اور بھائی کے ہمراہ حج کو گئے، حج کے بعد بھائی اور والدہ تو واپس آ گئے لیکن وہ علم حدیث کا وسیع تحقیقی مطالعہ کرنے کے لیے وہیں رہ گئے۔ وہاں سے انہوں نے بیشتر مشرقی ممالک کے سفر کیے، وہاں کے علماء سے احادیث اخذ کیں۔ علم فقہ سیکھا۔ پھر ان کی قسمت کا چکر انہیں واپس ان کے ملک میں لے گیا، جہاں فتنۂ خلق قرآن میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے قرآن مجید کے قدیم اور غیر مخلوق ہونے کا فتوٰے دیا۔ جس کی پاداش میں انہیں بخارا سے جلا وطن کیا گیا، اور سمرقند سے تین فرسخ کے فاصلہ پر ایک بستی میں انہیں موت نے آن لیا۔

امام بخاری ؒ نے اپنی کتاب "الجامع الصحیح" سولہ برس کی مدت میں مرتب کی، اس میں انہوں نے نو ہزار احادیث درج کی ہیں جو چھ لاکھ احادیث سے چھان پھٹک کر نکالی ہیں۔ ان میں تین ہزار مختلف طرق کے اعتبار سے مکرر ہیں۔ تمام علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ کتاب صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے، حتیٰ کہ صحت کے لحاظ سے یہ صحیح مسلم سے بھی فوقیت رکھتی ہے۔

مسلم بن حجاج

(پیدائش ۲۰۶ھ وفات ۲۶۱ھ)

ابو الحسن مسلم بن حجاج قشیری ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے علم حدیث حاصل کرنے کے لیے انہوں نے حجاز و عراق و شام و مصر کے مختلف سفر کیے۔ کئی بار بغداد گئے۔ انہوں نے بخاری سے بھی حدیثیں لیں۔ ان سے دوستی کی اور ان کی حمایت و مدافعت بھی کی۔ ابن حنبل اور ابن راہویہ سے بھی روایات نقل کیں اور اپنا مجموعۂ احادیث تین لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے مرتب کیا۔ صحت و مقبولیت کے اعتبار سے یہ مجموعہ بخاری کے بعد دوسرا درجہ رکھتا ہے۔ پھر انہوں نے نیساپور میں مستقل اقامت اختیار کر لی اور وہاں اپنی نفع بخش تجارت کی بدولت آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرتے رہے اور وہیں انتقال فرمایا۔

علم فقہ

اسلام کے عہد اول ہی میں اس علم کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ عہد بنی عباس میں اس کی تحریر و تدوین ہوئی اور اسی دور میں یہ پختہ ہوا۔ اس زمانہ میں مدینہ منورہ فقہاء و محدثین کا مرکز، فقہ کے طلبہ اور حدیث کے راویوں کا قبلہ بنا ہوا تھا۔ جب عراق میں عباسیوں کی حکومت مستحکم ہوئی تو عراقیوں میں علم فقہ پھیلا اور وہاں فقہاء کی ایک ایسی جماعت ظہور پذیر ہوئی جس نے قانون سازی میں اپنا طریقہ حجازیوں کے طریقہ سے ہٹ کر بنا لیا۔ چونکہ فقہائے حجاز فن روایت میں

دسترس اور حدیث میں وسیع معلومات رکھتے تھے اس لیے وہ اپنی فقہ کی بنیاد قرآن و حدیث کی نصوص پر رکھتے تھے اور جہاں تک انہیں کوئی حدیث یا آثار صحابہ ملتا وہ جلی یا خفی قیاس کی طرف رجوع نہ کرتے تھے۔ یہی "اہل حدیث" تھے اور ان کے قائد امام مالک بن انس رح تھے۔ لیکن فقہائے عراق روایت کے بارے میں متشدد تھے۔ ان کے پاس ذخیرہ سنت بھی کم تھا، نیز آریائی نسل ہونے کی وجہ سے یہ احکام فقہ کے استنباط میں قیاس پر اعتماد کرتے۔ یہ لوگ "اصحاب رائے" تھے اور ان کے سرگروہ امام ابو حنیفہ رح ہیں خلیفہ منصور کی سیاست کا تقاضا تھا کہ عراق کو حجاز پر، بغداد کو مدینہ پر ایران کو عرب پر، فوقیت دے۔ چنانچہ اس نے امام ابو حنیفہ رح کو بغداد بلا کر ان کو عزت بخشی اور ان کے مذہب کی تائید کی۔ اس طرح ان کا مذہب عراق، ایران، ہندوستان، چین اور ترکستان میں پھیل گیا۔ امام مالک رح کا مذہب حجاز، مغرب اقصے اور اندلس میں رہا۔ بعد ازاں امام محمد بن ادریس شافعی رح آئے جو امام مالک رح کے پیروؤں میں سے تھے انہوں نے عراق کا سفر کیا، وہاں امام ابو حنیفہ رح کے شاگردوں سے قیاسی مسائل اخذ کیے اور پھر ان دونوں مذہبوں کے بین بین ایک نیا مذہب بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ خوش قسمتی سے مصر کے سفر نے اپنے مذہب کی تنقیح و تہذیب کا موقع دے دیا اور انہوں نے اسے جدید طرز پر مرتب کر کے وہاں عام کر دیا۔ اس کے بعد امام احمد بن حنبل رح آئے انہوں نے حدیث امام شافعی رح سے اور قیاس بعض حنفی فقہاء سے لے کر ایک نئے مذہب کی بناء ڈالی جس میں فروعی مسائل میں تشدد اور دائرہ سنت پر انحصار رکھا۔

یہی وہ چار مذاہب ہیں جو کتاب اور سنت صحیحہ کی بنیادوں پر اٹھے اور جن کے بعد اجتہاد ختم ہو گیا، اور تمام ممالک میں انہی کی تقلید کی جانے لگی۔

فقہاء

امام ابو حنیفہ رح

(پیدائش ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ)

حالات زندگی:- ان کا نام نعمان اور کنیت ابو حنیفہ ہے والد کا نام ثابت ہے۔ یہ اہل کوفہ کے قبیلہ تیم اللہ کے مولیٰ تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کابل کے فارسی تھے۔ پہلے یہ ریشمی کپڑوں کی سوداگری کرتے تھے، پھر علوم دین حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے، جن صحابہ رض سے ملے ان سے اکتساب علوم دینیہ کیا اور روایات نقل کیں۔ حتیٰ کہ علوم دینیہ میں ایسی شہرت حاصل کر لی کہ منصور نے انہیں عہدہ قضاء پیش کرنا

چاہا۔ لیکن انہوں نے اس عہدہ کو منظور کرتے ہوئے کہا "منصور! خدا سے ڈرو، اور یہ عہدے ایسے لوگوں کو دو جو خوف خدا رکھتے ہوں، بخدا میں تو رضامندی کی حالت میں خطرہ سے خالی نہیں، تو غصہ کی حالت میں کیونکر مامون ہو سکتا ہوں؟" منصور نے کہا "تم جھوٹ کہتے ہو، تم بالکل موزوں ہو" انہوں نے کہا "خود آپ نے میری تائید میں اپنے خلاف فیصلہ کر دیا ہے، بتائیے یہ کیونکر جائز ہے کہ آپ اپنی امانت ایسے قاضی کے حوالہ کریں جو جھوٹا ہو؟" لیکن منصور کو ان کا یہ جواب مطمئن نہ کر سکا اور اس نے ابو حنیفہ رح کو قید کر دیا اور اسی قید میں وہ وفات پا گئے۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ایک بہانہ بنا لیا گیا تھا، درحقیقت انہیں منصور نے جیل میں اس لیے ڈالا تھا کہ وہ علویوں کی طرف داری کرتے تھے۔

حلیہ اور اخلاق:- ابو حنیفہ رح کا رنگ گندمی اور قد میانہ تھا وہ نہایت خوش الحان، بلند آواز اور خوش مقال تھے۔ بڑے خشوع و خضوع کرنے والے، غور و فکر کرنے کی وجہ سے دیر تک خاموش رہنے والے اور قانع مزاج تھے۔ لوگوں کی غیبت سے کوسوں دور رہتے اور اپنے دشمن کا بھی کبھی برائی سے ذکر نہ کرتے۔

علم و عمل:- ابو حنیفہ رح عربی کے علاوہ اپنے زمانہ کے تمام علوم میں کمال رکھتے تھے۔ عربی میں ان کی زبان خام تھی اور اس میں عجمیت کی جھلک آجاتی تھی۔ ان کی قوت استدلال نہایت زوردار تھی۔ حتیٰ کہ امام مالک رح نے ان کے بارے کہا ہے "وہ ایک ایسی قوت استدلال کے مالک ہیں کہ اگر میں ان سے اس ستون کو سونے کا بتانے کے لیے کہوں تو وہ نہایت مضبوط دلائل سے اسے ثابت کر دیں گے" یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے فقہ کی تبویب و تفصیل کی اور اس میں قیاس کے لیے اصول مرتب کیے۔ یہی ہیں جنہوں نے فقہ میں رائے کو داخل کیا، اس لیے کہ ملحدین عراق بہت احادیث گھڑتے رہتے تھے اور اس لیے بھی کہ یہ اپنے دین میں کسی قسم کا شک برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان کی نظر میں صرف سترہ حدیثیں صحیح تھیں۔ عراق و کوفہ کے فقہاء میں سے جنہوں نے آپ سے فارغ التحصیل کی سند حاصل کی ان میں سے قاضی ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) محمد بن حسن (متوفی ۱۸۹ھ) زفر بن ہذیل (متوفی ۱۵۸ھ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کی طرف منسوب تصانیف میں کتاب الفقہ الاکبر فی اصول الدین، کتاب المخارج فی الحیل ہیں۔ نیز ایک وصیت نامہ جو انہوں نے اپنے اصحاب کو اصول میں کیا ہے۔

مالک بن انس

(پیدائش ۹۵ھ وفات ۱۷۹ھ)

حالات زندگی:- ابو عبداللہ مالک بن انس اصبحی مدینہ میں پیدا ہوئے اور وہیں انہوں نے پرورش پائی۔ ربیعۃ الرأی (متوفی ۱۳۶ھ) سے علم حاصل کیا۔

علوم دین میں گہری نظر پیدا کی۔ حتیٰ کہ وہ حدیث میں سند اور فقہ میں امام بن گئے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے منصور کو معزول کر کے آل علی میں سے محمد بن عبداللہ کی بیعت کرنے کا فتویٰ دے دیا تھا، جس پر خلیفہ کا چچا جعفر بن سلیمان جو امیر مدینہ بھی تھا ان پر غصہ ہو گیا اور اس نے انہیں ننگا کر کے ستر کوڑے لگوائے، لیکن اس سزا سے ان کی عزت و احترام میں اضافہ ہی ہوا۔ اس واقعہ کے بعد ہی منصور نے ان سے معذرت خواہی کر لی اور ان کو منا لیا۔ پھر اس نے کہا "اس وقت لوگوں میں مجھ سے اور آپ سے بڑا فقیہ کوئی نہیں رہا میں خلافت میں مشغول ہوں، لہذا آپ لوگوں کے لیے ایک ایسی کتاب لکھ دیجئے جو انہیں دینی مسائل سمجھانے میں مفید ہو۔ لیکن اس میں ابن عباس رض کی رخصتوں، ابن عمر رض کی سختیوں اور ابن مسعود رض کے شواذ، سے تعرض نہ کیجئے گا اور اس تصنیف کو لوگوں کے لیے نہایت آسان بنا لیجئے گا۔" چنانچہ انہوں نے "الموطا" تصنیف کی۔ اس کتاب کو مہدی اور پھر رشید نے سنا اور اس پر انہیں انعامات و خلعت سے نوازا۔ امام مالک رح آفتاب علم، راویان حدیث کے قبلہ اور فتویٰ دینے میں سند بنے رہے۔ تاآنکہ مدینہ ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

حلیہ اور اخلاق:- امام مالک رح کا رنگ بھورا اور بہت سفید تھا۔ ان کا سر بڑا اور گنجا تھا۔ وہ خوش ہیئت، باوقار، پر رعب و باعفت شخصیت کے مالک تھے۔ وضو کے بغیر وہ کوئی حدیث بیان نہ کرتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس درجہ احترام تھا کہ باوجود کمزوری کے مدینہ میں سواری پر نہ بیٹھتے تھے۔ علم کے بارے میں وہ نہایت درجہ امین تھے۔ اگر وہ کوئی مسئلہ نہ جانتے تو انہیں اس کے جواب میں لاعلمی کا اظہار کرنے میں قطعاً جھجک محسوس نہ ہوتی تھی۔

علم و فضل:- امام مالک مخلوق خدا میں اللہ کی ایک حجت تھے، وہ صرف صحیح احادیث بیان کرتے اور ثقہ راوی سے روایت کرتے تھے۔ انہیں سنت کا بڑا علم تھا انہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد بھی سنت ہی پر رکھی۔ فقہ میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ لہذا آخری فتویٰ انہی کا مانا جاتا تھا۔ اپنے متعلق وہ کہتے تھے۔ "بہت کم ایسے استاد ہیں جن سے میں نے علم حاصل کیا ہو اور بقید حیات ہوتے ہوئے بعد میں وہ میرے پاس نہ آئے ہوں اور مجھ سے فتویٰ نہ دریافت کیا ہو۔" اور یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں یہ مثل عام ہو گئی تھی۔ "لا یفتی و مالک فی المدینۃ: مدینہ میں مالک کی موجودگی میں کسی دوسرے سے فتویٰ نہیں لیا جائے گا۔" حدیث میں "موطا" ان کی تصنیف ہے جس پر مذہب مالکی کی بنیاد ہے۔ ان کی دوسری کتاب ایک رسالہ ہے جس میں انہوں نے رشید کو پند و موعظت کی ہے۔

محمد شافعیؒ

(پیدائش ۱۵۰ھ وفات ۲۰۴ھ)

حالات زندگی:- ابو عبداللہ محمد بن ادریس قرشی شافعی (یہ نسبت ان کے دادا کے دادا کی طرف ہے) غزہ میں مفلسی کے عالم میں پیدا ہوئے۔ دو سال کے بعد وہ مکہ لائے گئے اور وہاں بنو ہذیل میں پرورش پا کر بڑھے۔ ان کی بیوہ ماں اپنے قریشی رشتہ داروں سے مدد حاصل کر کے ان کی پرورش کرتی رہیں۔ وہ ابھی بالغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ حیرت انگیز ذکاوت و ذہانت کا اظہار کرنے لگے۔ انہوں نے قرآن مجید پڑھا۔ عربی زبان سیکھی اور پھر لغت و ادب کی تلاش میں بادیہ پیمائی شروع کر دی۔ جب انہوں نے امام مالک کی موطا حفظ کی تو ان کی عمر پندرہ برس سے متجاوز نہ ہوئی تھی۔ پھر اسی عمر میں سفر کر کے وہ امام مالک رح کی خدمت میں پہنچے، اپنے حافظہ سے انہیں موطا سنائی۔ اس پر امام مالک رح نے کہا "اگر کوئی کامیابی حاصل کرے گا تو یہ لڑکا کرے گا" ۱۹۵ھ میں بغداد گئے تو وہاں کے علماء ان سے استفادہ کے لیے ان کے حلقہ میں بیٹھنے لگے، انہی میں احمد بن حنبلؒ بھی تھے۔ محمد بن حسن (امام ابو حنیفہ رح کے تلمیذ خصوصی) سے ملاقات ہوئی تو امام شافعی رح نے انہیں قیاس میں بصیرت دی۔ پھر ۱۹۹ھ میں وہ مصر پہنچے اور اسے مستقل طور پر اپنی اقامت گاہ بنا لیا۔ فسطاط (قاہرہ) میں رہنے لگے۔ اور اپنا نیا مذہب جامع عمرو میں لیکچروں کے ذریعہ املاء کرانے لگے۔ وہاں وہ مسلسل درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور عبادت میں مصروف رہے حتیٰ کہ وہیں وفات پائی اور قاہرہ میں دفن ہوئے۔

حلیہ اور حالات:- امام شافعیؒ لمبے اور دبلے پتلے، خوش شکل و خوش آواز تھے۔ ان کے چہرے پر ہلکے ہلکے بال تھے۔ ان کی گفتگو فصیح، عقل پختہ اور قوت استدلال نہایت مضبوط تھی۔ ان کے اخلاق نہایت بلند، اور دینی اعتبار سے وہ ثقہ تھے۔

علم و فضل:- وہ کتاب اللہ اور سنت رسول میں سب لوگوں سے زیادہ فقیہ، لغت میں سند، انساب و اخبار میں حیرت انگیز معلومات کے مالک تھے۔ ادب اور دنیا لغت میں ان کا بلند مقام اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ خود اصمعی جیسے ادیب نے ان سے اشعار الہذلیین پڑھے۔ اور احمد بن حنبل رح کا تو قول ہے "کوئی طالب علم ایسا نہیں جو شافعی کا منت کش احسان نہ ہو"

اپنے مذہب میں انہوں نے اہل رائے اور اہل سنت کے بین بین راہ اختیار کی ہے، ان کے متبعین ہر علاقہ میں بکثرت پھیل گئے اور انہوں نے احناف سے تدریس و افتاء کے مناصب

یں حصے لینے شروع کر دیے ، بالآخر ہر دو مذہبوں کے پیروؤں میں اختلافات رونما ہونے لگے۔ متعدد مناظروں کی مجلسیں منعقد ہوئیں اور اس طرح علم خلاف وجدل ظہور پذیر ہوا۔ گمان غالب یہ ہے کہ امام شافعیؒ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اصول فقہ کو موضوع بحث بنایا اور اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ الفہرست کے مصنف نے ان کی ایک سو سے زائد تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان میں سے صرف فقہ میں "کتاب الام" کی سات جلدیں، "اصول الفقہ" اور حدیث میں "مسند الشافعی" دستیاب ہوتی ہیں۔

احمد بن حنبل

(پیدائش ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ)

حالات زندگی:- ابو عبداللہ احمد بن حنبلؒ شیبانی بغداد میں پیدا ہوئے اور وہیں یتیمی کی حالت میں تربیت پائی سولہ سال تک علم حدیث حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے بکثرت راویوں سے احادیث اخذ کیں۔ صحیح حدیث کو ضعیف سے الگ کیا۔ احادیث کا علم حاصل کرنے اور انہیں جمع کرنے کے لیے دور دراز بلاد اسلامیہ میں سفر کیے تا آں کہ انہوں نے دس لاکھ احادیث میں کچھ اوپر چالیس ہزار احادیث کا انتخاب کیا اور انہیں اپنی مشہور کتاب "المسند" میں جمع کر دیا۔ امام شافعیؒ کے ہم خیال اور ان کے ہونہار شاگرد تھے۔ امام شافعیؒ جب مصر جانے لگے تھے تو انہوں نے ان کے متعلق کہا تھا "میں نے بغداد چھوڑا تو وہاں احمد بن حنبلؒ سے زیادہ تقوی شعار اور فقیہ کوئی نہیں تھا"

علم وفضل:- انہوں نے اپنا مذہب کتاب وسنت سے مستنبط کیا اور اس میں قدرے قیاس کی بھی آمیزش کر دی اپنے مذہب میں اجتہاد سے دوری اور روایت کے تمسک، کی وجہ سے ان کی متبعین کی تعداد کم رہی۔ دور رشید و مامون میں انہوں نے اور ان کی پارٹی نے متکلمین و فلاسفہ کے خلاف سخت مناظرے اور مقابلے کیے۔ معتصم کے زمانہ میں انہیں مجبور کیا گیا کہ یہ قرآن حمید کو مخلوق بتائیں لیکن انہوں نے نہ مانا اور مخالفت پر ڈٹے رہے، اس پر انہیں انتیس کوڑے مارے گئے جن کی وجہ سے بدن سے خون جاری ہو گیا، ہوش وحواس جاتے رہے۔ اور جسمانی نقص ہو گیا۔ اور اس ابتلاء ومحن سے متوکل کے عہد میں جا کر چین نصیب ہوا جو حامی سنت تھا۔ بالآخر وہ اپنی زندگی پوری کر کے خدا سے جا ملے۔ ان کے جنازہ میں آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتوں نے شرکت کی۔ اور یہ ان کی مقبولیت، بلندی مرتبت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

عُلومِ عقلیہ

فلسفہ

اسلام نے حریت فکر کا جو درس دیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فرقے پیدا ہوئے ...... اور معتزلہ کا ظہور ہوا۔ معتزلہ دینی نصوص کی تطبیق عقلی احکام سے کرنے کے حامی تھے۔ اور جیسا کہ آپ کو بتایا گیا ہے بنی عباس قیاس و رائے کی طرف زیادہ مائل تھے، لہذا معتزلہ کا مذہب ان میں خوب پھیل گیا۔ مامون نے بھی اپنے خاندان کا ساتھ دیا بلکہ وہ جو کچھ دل میں رکھتے تھے اس نے علی الاعلان اسے کہنا شروع کر دیا، چنانچہ اس نے خلق قرآن کی تائید کرتے ہوئے اس مسئلہ کو پیش کیا اور سنت و اعتزال میں مناظرہ اور جنگ و جدل کی آگ بھڑکائی۔ اپنے حریفوں کو زیر کرنے کے لیے اس نے یونانی منطق سے مدد لی فلسفہ کا ترجمہ کرایا اور لوگوں کو اس کی تلاش میں مصروف کیا، اس نے ایسا ماحول پیدا کیا کہ لوگ مناظرہ و مباحثہ میں فلسفہ سے دلچسپی لیں، انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ علم کلام وجود میں آیا جو عربی فلسفہ کی تمہید تھا۔

اس میں شک نہیں کہ عربی فلسفہ اسلامی کی ایک ترقی پذیر شکل، اور تاریخ تمدن عربی کی پیداوار ہے۔ اس لیے فلسفیوں کی تعداد کم رہی اور مشرق میں ان کا ہلکا سا اثر ہوا۔ تاہم یہی لوگ قدیم و جدید فلسفہ کے درمیان حلقۂ اتصال تھے۔ اور یہی قرون وسطے کے حیران و سرگرداں جہالت کی تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے یورپ کے لیے رہنما مینار ثابت ہوئے، جن کی بدولت آج کا یورپ اپنی موجودہ ترقی یافتہ زندگی اور عظیم تمدن تک پہنچا۔

معتزلہ کو فلسفہ کی بدولت ایک ہتھیار مل گیا جس کے ذریعہ وہ اہل سنت سے لڑتے۔ ادھر اہل سنت نے معتزلہ اور ان کے اختیار کردہ فلسفہ کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ وہ ان دونوں کے خلاف لوگوں کو ڈراتے اور بھڑکاتے رہتے۔ حتی کہ فلسفہ لوگوں کی نظروں میں الحاد و زندیقی کے مترادف بن گیا، اور معاشرہ میں فلسفی کا یا تو مذاق اڑایا جاتا یا اس کے خلاف نفرت و غصہ کا اظہار کیا جاتا۔ یہ کیفیت مامون و معتصم اور واثق کے دور میں خفیہ اور دبی ہوئی تھی کیونکہ یہ خلفاء حامی سنت اور ماحی بدعت تھے۔ انہوں نے فلسفیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دبایا اور ان پر کڑی پابندیاں لگائیں اور اس طرح انہیں مجبور کر دیا کہ وہ لوگوں سے چھپ کر اپنی سرگرمیاں زیر زمیں جاری رکھیں۔ چنانچہ ان کی ایک جماعت "اخوان الصفاء و خلان الوفاء" کے نام سے بنی جو اپنے رموز و آداب میں جماعت "ماسون"[1] سے مشابہ تھی۔

---

[1] فری میشن

اس جماعت کی تشکیل چوتھی صدی کے وسط میں اس غرض سے ہوئی کہ وہ فلسفہ کے مختلف مسائل میں بحث وتحقیق کرے اور اسے پھیلائے اس جماعت نے پچاس گمنام رسائل لکھے جن میں تمام عربی اور فلسفہ اور یونانی حکمت کا نچوڑ یکجا کر دیا۔ اس طرح انہوں نے فلسفہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی اور اسے دلوں تک پہنچانے کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اتفاق سے اسی دوران میں (۳۳۴ھ) بغداد پر بویہیو کا غلبہ ہوگیا جو شیعہ تھے۔ ان کا غلبہ اسی شکل میں باقی رہتا تھا کہ سینوں کا زور توڑا جائے۔ چنانچہ فلسفہ نے پھر سر اٹھایا اور اس کا بازار پھر گرم ہو گیا، حتیٰ کہ بتدریج پھر دیگر تمام علوم کی طرح یہ بھی کمزور اور مضمحل ہوگیا۔

اندلس میں فلسفہ کی تاریخ بھی بالکل اس کی مشرقی تاریخ سے مشابہ ہے، یہاں عبدالرحمٰن اوسط کے زمانہ میں (۲۳۸ھ) فلسفہ پہنچا۔ مامون سے قرب زمانی کی وجہ سے اس کی پیروی کرتے ہوئے اس نے بھی فلسفہ کا ساتھ دیا۔ چنانچہ اندلسیوں نے پوری سرگرمی سے فلسفہ سیکھنا شروع کر دیا، اور ابوالحکم عمرو کرمانی (المتوفی ۴۵۸ھ) کی وساطت سے رسائل اخوان الصفا پہنچے پر تو ان کی فلسفیانہ سرگرمیاں بڑی شدت اختیار کر گئیں اور ان میں بہت سے فلسفی اور حکماء پیدا ہوگئے۔ لیکن عوام ان پر بڑے ظلم وستم ڈھاتے، ناروا سلوک کرتے اور ان کی سخت تحقیر وتذلیل کرتے۔ قوم کا ساتھ دینے اور سواد اعظم میں مقبول ہونے کے لیے حکام بھی عوام کا ساتھ دیتے ہوئے ان کی سخت گرفت کرتے۔ قدم قدم پر ان کے لیے پابندیاں لگا دیتے۔ اور جونہی کسی کی زبان سے کوئی ناروا بات نکلتی اسے سنگسار کر دیا جاتا یا جلا دیا جاتا۔ اس ضمن میں ابو یوسف منصور موحدی کی مثال کے بعد کسی دوسرے واقعہ کی ضرورت نہیں رہتی جس نے چھٹی صدی کے اواخر میں فلسفیوں کا شیرازہ ابتر کر دیا۔ اور ان کی تصانیف جلا ڈالی تھیں۔

اس طرح اندلس کے حکام نے جہالت وظلم سے کام لے کر فلسفہ کی مخالفت کی اور اسے دیس سے نکال دیا، حتیٰ کہ فلسفیوں کی ایک معزز جماعت وہاں سے بھاگ کر اپنے یورپین پڑوسیوں کے پاس جا کر پناہ گیر ہوگئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، علوم وعلماء کے ساتھ ہمیشہ اسی قسم کے انقلابات وتغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔

فلاسفہ

عرب کا سب سے پہلا فلسفی جو ہمیں ملتا ہے وہ یعقوب بن اسحٰق کندی متوفی ۲۴۶ھ ہے۔ یہ مامون کا معاصر تھا۔ طب، فلسفہ، حساب، منطق، ہندسہ، نجوم اور موسیقی میں اسے کمال حاصل تھا۔ ان علوم میں اس نے دوسو اکتیس کتابیں لکھی ہیں اور ان میں ارسطو کے اسلوب کا تتبع کیا ہے۔ وہ یونانی سے ترجمہ کرنے کا بڑا ماہر تھا۔ اس کے بعد ابونصر فارابی متوفی ۳۳۹ھ

آتا ہے جو کتاب السیاسۃ المدنیۃ کا مولف اور موسیقی کے قانون کا موجد ہے۔ یہ معلم ثانی کے لقب سے مشہور ہے۔ پھر ابو علی بن سینا اور ابو حامد غزالی آتے ہیں۔

اندلس کے فلسفیوں میں ابو بکر بن باجہ متوفی ۵۳۳ھ اور اس کا شاگرد رشید ابن رشد اور ابن طفیل متوفی ۵۸۱ھ مولف رسالہ حی بن یقظان ، ہیں ہم ان میں سے تین فلاسفہ کے حالات بیان کرنے پر اکتفاء کریں گے۔

ابن سینا

(پیدائش ۳۷۰ھ وفات ۴۲۸ھ)

حالاتِ زندگی :- الشیخ الرئیس، ابو علی حسین بن سینا، جنہیں یورپ والے (Avicenne) کے نام سے جانتے ہیں۔ بخارا کی ایک بستی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے باپ، نوح بن منصور سامانی کی طرف سے گورنر تھے۔ بچپن ہی میں وہ وہاں سے بخارا منتقل ہو گئے تھے جہاں انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ ادب عربی میں درک پیدا کیا اور کچھ مبادیات علوم بھی سیکھے۔ اس دوران میں ابو عبداللہ ناتلی بخارا میں آئے اور انہوں نے اسے ایساغوجی پڑھائی اور منطق میں اسے فاضل بنا دیا۔ پھر ان کا رجحان طب کی طرف ہوا اور انہوں نے بو سہل مسیحی سے اصول طب کی۔ اس کے بعد اپنے مطالعہ اور تحقیق سے انہوں نے فروعات طب میں کمال حاصل کیا، حتیٰ کہ وہ فن طب کے امام تسلیم کیے جانے لگے اور ہر طرف سے شائقین علم طب اور اطباء ان کے پاس استفادہ اور مشورہ کے لیے آنے لگے۔ جب وہ اس کمال پر پہنچے تھے تو ان کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہ ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے امیر نوح بن منصور سامانی کی ایک مزمن اور موذی بیماری کا نہایت کامیاب علاج کیا، جس پر اس نے انہیں اپنا مقرب بنا لیا اور انہیں اپنے کتب خانہ میں داخلہ کی اجازت دے دی، جہاں انہوں نے بہت سی نادر و نایاب کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اتفاقاً وہ کتب خانہ جل گیا اور یہی ایک شخص تھے جن کے پاس اس کا سرمایہ موجود تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عمداً اس کتب خانہ کو جلا دیا تھا۔

جب وہ بائیس برس کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا، بعد ازاں وہ خوارزم کے علاقے میں چلے گئے اور پھر برابر سفر کرتے رہے۔ جرجان پہنچے اور وہاں تعلیم و تصنیف کا شغل جاری کیا طب میں کتاب القانون لکھی، پھر وہاں سے ہمذان واپس آ گئے اور وہاں شمس الدولہ بن بویہ نے انہیں قلم دان وزارت سونپ دیا، ابھی انہیں یہ عہدہ سنبھالے ہوئے تھوڑی ہی مدت ہی گذری تھی کہ فوج نے ان کے خلاف بغاوت کر دی، ان کا مال لوٹ

لیا، اور بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ وہ انہیں قتل کر دے، لیکن بادشاہ نے صرف انہیں جلاوطن کرنے پر اکتفا کی۔ اس پر بھی ان کی مشکلات کا خاتمہ نہ ہوا بلکہ تاج الدولہ کے یہاں ان کے خلاف نہایت نازیبا قسم کی خیانت کا اتہام لگایا گیا، جس پر اس نے انہیں چار ماہ تک ایک قلعہ میں بند رکھا، جہاں سے انہوں نے بھیس بدل کر فرار کر کے نجات حاصل کی اور اصبہان میں علاءالدولہ کے پاس پناہ لی اور اس کی حفاظت میں کچھ زمانہ اطمینان سے گذارا، لیکن ایک طرف تو پیہم حوادث نے ان کی کمر توڑ کر حوصلہ پست کر دیا اور دوسری طرف شہوت پرستی کے غلبہ نے ان کو جسمانی طور پر کمزور کر کے ایک ایسی لاعلاج بیماری میں مبتلا کر دیا جس کے علاج میں ان کی تمام طب اور تدابیر ناکام رہ گئیں، اور وہ ہمذان میں وفات پا گئے۔

ان کا علمی مقام اور ان کی تصانیف:۔ ابن سینا کو فلسفہ میں نہایت بلند مقام اور طب میں کمال درجہ مہارت حاصل تھی۔ اس نے ارسطو کے اصول اپنائے تھے، لیکن دین کے بارے میں وہ راسخ العقیدہ تھا، یقین کے بعد اس پر شک کا دور نہ آیا، ہاں یہ الگ بات ہے کہ وہ شہوت پرست اور آزاد مزاج واقع ہوا تھا۔ یورپ والوں نے جالینوس اور بقراط سے زیادہ اس کی کتابوں کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا۔ انہوں نے اس کی بیشتر تصانیف کا لاطینی میں ترجمہ کیا جن کی تعداد سو تک پہنچی ہے، اور انہوں نے جدید فلسفہ کی تشکیل میں اسی پر بنیاد رکھی ہے۔ اس کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور طب میں "کتاب القانون" ہے، اور حکمت میں "کتاب الشفا"، اول الذکر چودہ جلدوں میں ہے اور موخر الذکر اٹھارہ جلدوں میں۔

حجۃ الاسلام غزالی

(پیدائش ۴۵۰ھ وفات ۵۰۵ھ)

حالات زندگی:۔ ابو حامد محمد بن حامد غزالی، طوس میں پیدا ہوئے اور اپنی ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پھر وہاں سے نیسا پور آئے اور وہاں مختصر سے عرصہ میں امام الحرمین ابو المعالی سے فارغ التحصیل کی سند لی، اور ان کی وفات تک انہی کے ساتھ رہے۔ ان کی وفات کے بعد وہ معسکر میں وزیر نظام الملک کے پاس گئے جس نے ان کا پرتپاک استقبال کیا اور ان کی بلند علمی قابلیتوں کو بہت پسند کیا۔ اس کے دربار میں امام غزالی نے فاضل علماء سے بعض مسائل میں بحث کی جس سے ان کی علمی برتری کا سکہ بیٹھ گیا اور ان کی شہرت عام ہو گئی۔ چنانچہ وزیر نے بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم تدریس

آپ کے سپرد کر دی۔ وہاں امام غزالی علوم پڑھاتے رہے اور اسی دوران میں خود فلسفہ کا مطالعہ کرتے رہے۔ ۴۸۸ھ میں وہ خصوصی مہارت حاصل کرنے اور بعض مسائل کا بتعمق مطالعہ کرنے کے لیے، درس و تدریس سے علیحدہ ہو گئے۔ طویل عرصہ کی تحقیق و بحث اور گہرے مطالعہ سے ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ فلسفہ اور دین دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فلسفیوں کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ انہیں کے ہتھیاروں سے ان پر وار کیے۔ انہیں کے دلائل سے ان کے استدلال کو کمزور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں "حجۃ الاسلام" کا لقب دیا گیا۔ پھر انہوں نے شیوۂ زہد اختیار کر لیا اور راہ تصوف پر گامزن ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے تصوف کو حکمت کی بنیادوں پر پختگی سے سراٹھایا، اور حقائق علمیہ سے اس کی تائید کی۔ بعد ازاں وہ بغداد چھوڑ کر شام، اورشلیم، حجاز و اسکندریہ گئے۔ آخر میں وہ امیر یوسف بن تاشفین سے ملنے کے لیے مراکش کے سفر کا ارادہ رکھتے تھے کہ انہیں امیر کی موت کی خبر مل گئی اور وہ واپس طوس چلے گئے اور وہاں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ پھر مجبوراً انہیں مدرسہ نظامیہ کا کام سنبھالنا پڑا، لیکن جلد ہی وہ وہاں سے علیحدہ ہو کر اپنے وطن چلے گئے جہاں انہوں نے صوفیوں کے لیے خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ علوم دینیہ کے لیے ایک مدرسہ کا افتتاح کیا۔ مسلسل تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں کے ساتھ وہ عبادت الٰہی میں بھی مصروف رہتے تھے، حتیٰ کہ انہی اشغال میں ایک دن داعی اجل کو لبیک کہا۔

تصانیف:- امام غزالی نے فقہ شافعی میں کتاب البسیط، الوسیط اور الوجیز لکھیں۔ تصوف میں کتاب احیاء علوم الدین لکھی جو چار بڑے عنوانوں کے تحت مرتب ہے۔ عبادات، عادات، مہلکات (تباہ کن امور)، منجیات (نجات بخش امور) اس کتاب کی فضیلت و گراں قدری کا یہ عالم ہے کہ اس کے متعلق کہا جاتا ہے "اگر اسلام پر لکھی ہوئی جملہ کتب تلف ہو جائیں اور صرف "احیاء علوم الدین" باقی رہ جائے تو یہ تمام تلف شدہ کتابوں کی جگہ لے سکتی ہے۔" ان کی ایک تصنیف "کتاب تہافت الفلاسفۃ" ہے جو یونانی فلسفیو اور ان کے متبعین کے رد میں ہے، نیز اسی موضوع پر ایک تصنیف "کتاب مقاصد الفلاسفۃ" بھی ہے، ان کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف بھی ہیں۔

ابنِ رُشد

(پیدائش ۵۱۴ھ وفات ۵۹۵ھ)

حالاتِ زندگی:- اس کا پورا نام ابو الولید محمد بن احمد بن رشد ہے یورپ والے اسے کہتے ہیں۔ یہ قرطبہ کے ایک معزز گھرانہ میں پیدا ہوا

جو منصب قضاء پر فائز تھا۔ اپنے زمانہ کے علماء سے اس نے فقہ طب اور فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ یکسوئی سے حکمت میں بحث و تحقیق کرنے لگا اور اس میں بڑا کمال حاصل کیا۔ ۵۴۸ھ ابن الطفیل نے اس کا تعارف ابو یعقوب یوسف بن عبدالمومن سے کرا دیا جو فلسفہ سے بڑی محبت رکھتا تھا۔ چنانچہ ابن رشد نے اس کے لیے ارسطو کی کتابوں کے خلاصے تیار کیے۔ پھر اسے ۵۶۵ھ میں اشبیلیہ کی قضاء کا منصب تفویض کیا گیا۔ وہاں سے مراکش چلا گیا جہاں امیر المومنین نے اسے اپنا طبیب خاص بنانے کے لیے دعوت دی تھی۔ لیکن تھوڑی مدت کے بعد ہی وہ قاضی بن کر قرطبہ واپس آگیا۔ جب ابو یعقوب کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا یعقوب المنصور تخت نشین ہوا تو اس نے بھی ابن رشد کو اس کے منصب پر ہی بحال رکھا اور اس کا بڑا احترام کرتا رہا۔ لیکن زمانہ اس حکیم کو چین سے زندگی گذارتے نہ دیکھ سکا اور اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف امیر سے شکایت کی اس پر بے دینی اور زندیقی کے الزام عائد کیے جس پر امیر نے غور و فکر کے بعد اسے نہایت عزت و احترام کے ساتھ مراکش واپس بلا لیا اور اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ لیکن جلد ہی وہ مراکش میں وفات پا گیا۔

اس کا فلسفہ اور تصانیف:۔ اگر عقیدۂ تناسخ صحیح ہوتا تو ہم کہتے کہ ارسطو کی روح مجالس حکمت کو از سر نو آراستہ و پیراستہ کرنے اور فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے کے لیے ابن رشد کے بدن میں حلول کر آئی تھی عرب کا یہ حکیم، حکیم یونان کا بڑا مداح و معترف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ارسطو علم کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی اس کے فلسفہ کی تشریح اور اس کی تصانیف کی تلخیص کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔ بعد میں یورپ والوں نے ابن رشد کی کتابوں کو بڑے اہتمام سے ترجمہ کرنا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ یہی ان کی حکمت کی اساس اور ان کی فلسفیانہ سرگرمیوں کے لیے مینار بن گیا۔ اس کے متعلق ارنسٹ رینان اپنی تصنیف "ابن رشد اور اس کا مذہب" میں لکھتا ہے: "یہ قرون وسطیٰ کے ان فلسفیوں میں جنہوں نے ارسطو کی پیروی کی اور حریت فکر و قول کی راہ پر گامزن ہوئے، سب سے بڑا فلسفی تھا" ارسطو کے شاگردوں میں ابن رشد اور اس کے ہمنواؤں کا فلسفہ میں تقریباً وہی مذہب تھا جو مادہ پرستوں اور حلول کے ماننے والوں کا ہے۔ جن کے خیال میں مادہ ازلی ہے اور خلق اس مادہ میں اضطراری حرکت ہے اور یہی حرکت یا محرک خالق ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ازلیت میں مخلوقات بھی مادہ کے ساتھ شریک ہیں کیونکہ وہ بھی مادہ ہی سے ہیں، لہٰذا جب انسان عاقل یکسوئی سے تحصیل علم میں منہمک ہو جاتا ہے تو وہ بتدریج اللہ میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ بشری عقول ایک ہیں جو سب کی سب عقل اول کی طرف رجوع کرتی ہیں جسے، وہ لوگ "عقل فاعل" کہتے ہیں اور صرف یہی وہ عقل عام ہے جو انفرادی عقول سے ہٹ کر اللہ تک پہنچتی ہے۔ اس فلسفہ کی بناء پر نتیجہ یہ

نکلتا ہے کہ انسانی نفوس بھی بدنوں کی موت کے ساتھ مرجاتے ہیں۔ مادہ کے سوا کسی کو خلود حاصل نہیں، اس لیے نہ ثواب کچھ معنے رکھتا ہے نہ عقاب اور یہ کہ خالق کو حوادث کے کلیات کا تو علم ہوتا ہے جزئیات کا نہیں۔ تعالیٰ اللہ عما یقولون علوا کبیرا۔

حجۃ الاسلام غزالی اور بہت سے یورپ کے علماء نے اس مذہب کی تردید کی ہے۔ لیکن بایں ہمہ ابن رشد کی پوری کوشش تھی کہ وہ اس فلسفہ اور دین میں تطبیق پیدا کر دے۔ اس موضوع پر اس نے اپنی کتاب "فصل المقال فیما بین الشریعۃ والحکمۃ من الاتصال" اور "مناھج الادلۃ فی عقائد الملۃ" لکھی۔ نیز غزالی کی کتاب "تہافت الفلاسفۃ" کے رد میں ایک کتاب تہافت التہافت لکھی۔ اس کے آخر میں وہ لکھتا ہے "بلاشبہ اس شخص (غزالی) نے شریعت کے بارے میں وہی غلطی کی جو اس نے فلسفہ کے بارے میں کی اور اگر اہل حق کی طرفداری میں طلب حق کا تقاضا نہ ہوتا تو میں اس موضوع پر کچھ نہ لکھتا" ان کے علاوہ ابن رشد کی اور بھی تصانیف ہیں جن میں کتاب الکلیات فی الطب، فلسفۂ ارسطو وغیرہ ہیں۔ اس کی تصانیف کے اصلی نسخے ناپید ہیں صرف لاطینی اور عبرانی تراجم باقی ہیں۔

ساتویں فصل

ادب عربی میں کہانیاں اور مقامات

کہانیاں اور قصے لکھنا ادب کے گرانقدر فنون میں سے ایک فن ہے۔ اس کے ذریعہ فکر کو کھیل کود اور تفریحی باتوں میں مشغول کر کے نفس کی کدورت دور کی جاتی، اور اسے سکون و آرام پہنچایا جاتا ہے۔ نیز پرحکمت باتوں سے عقل کی اصلاح و تربیت کی جاتی ہے۔ یورپ میں تو اس فن کو نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے اور اس کے لیے اصول و ضوابط مقرر ہیں، لیکن عرب والوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی تھی، ایک تو اس لیے کہ جو فن دین میں مفید نہ ہو اس سے وہ بے اعتنائی برتتے تھے دوسرے اس لیے کہ حکومت کو اس کی ضرورت نہ تھی، نیز اس کی طرف توجہ نہ کرنے کے وہ اسباب بھی ہیں جن کی وجہ سے عربوں نے طویل تاریخی کہانیوں کو نظم کرنے اور رزمیہ شاعری کرنے میں کوتاہی کی تھی۔ پھر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ بہرحال نثر نگاری ہی کی ایک قسم ہے جو زمانۂ جاہلیت اور صدر اسلام حتیٰ کہ بنو امیہ کے عہد کے آخر تک تقریباً کالعدم رہی تاآنکہ ابن مقفع نے نثر نگاری اور قصہ نویسی کی داغ بیل ڈالی۔ پھر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے کلیہ و دمنہ، ہزار افسانہ (الف خرافہ)، دارا اور الصنم الذہب، وغیرہ جیسی کتابوں کے تراجم کیے، جن سے عربوں کو اس قسم کی تصانیف کا شوق پیدا ہوا اور یہ تراجم ان کے لیے نمونہ بنے۔

جب عربوں میں آسودگی اور عیش کوشی بڑھی اور عجمیوں نے خلفاء کے بار خلافت کو اٹھا لیا، تو خلفاء شراب نوشی اور قصہ گوئی کی محفلوں میں راتیں بسر کرنے لگے۔ پھر کیا تھا مصاحبین و منادمین نے قصے یاد کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلے شروع کر دیے۔ تیسری اور چوتھی صدی کے ادیبوں نے قصے لکھنے اور انہیں خواص میں زبانی سنانے، میں مسابقت شروع کر دی۔ ان تقلید میں آرام پرست، خوش حال عوام کو بھی اپنی محفلوں اور مجلسوں میں، شادیوں اور دیگر اجتماعات میں قصہ گویوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور جوں جوں عہد بنی عباس کے آخر میں عالم اسلامی پر مشکلات و مصائب کا دور آنے لگا اور اس کے بعد سلجوقی مستبد حکمرانوں اور ظالم مغل بادشاہوں کا زمانہ آیا اس کی طلب اور زیادہ شدید ہوتی گئی۔ مصری عوام بیکاری و نجاشی اور منشیات (بھنگ اور افیون) کے عادی ہو چکے تھے، چنانچہ ان کے پاس قصہ گو پہنچتے جن کی حیثیت ان کے لیے بادشاہوں کے مصاحبین کی سی ہوتی۔ یہ ان سے بہادروں کے قصے، جنات کی کہانیاں، جادوگروں کی شعبدہ بازیاں اور دیگر نسلاً بعد نسل بیان کیے جانے والے واقعات و حوادث، ملک ملک کے سیاحوں اور تاجروں کے مشاہدات وغیرہ بیان کرتے۔

پھر ان قصے کہانیوں میں من گھڑت افسانے اور مبالغہ آرائیاں ہوئیں اور مدت دراز گذرنے کے سبب ان کے بنانے والوں کے نام بھلا دیے گئے جس طرح قدیم یورپ کی کہانیوں کے لکھنے والوں کے نام بھلا دیے گئے جس طرح قدیم یورپ کی کہانیوں میں عنترہ کا قصہ ہے[1] مزید برآں بنی ہلال، سیف بن ذی یزن، الامیرۃ ذات الہمہ، الظاہر بیبرس، علی زیبق مصری، فیروز شاہ کی کہانیاں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمام کہانیاں پانچویں چھٹی اور ساتویں صدیوں میں مصر میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض صلیبی جنگوں کے زمانہ کی ہیں اور بعض سقوط بغداد کے دور کی۔ مصر میں لکھے جانے کے ثبوت میں ان کہانیوں کے مقامات، حادثوں کے موضوعات اور ان کے کرداروں کے نام بین شہادت ہیں، نیز ان کی مخلوط زبان اور متبذل اسالیب اس امر کے غماز ہیں کہ ان کا زمانہ پانچویں صدی ہجری تک کا ہے اور ان کہانیوں کا پختہ وغریب تخیل منشیات کی تاثیر سے ہے۔ اس زمانہ کی اجتماعی حالت اور صلیبی جنگوں کے سلسلہ نے انہیں یہ قصے لکھنے پر ابھارا تاکہ جنگ کا وصف، بہادری مدح، رہنماؤں اور جنگی افسروں کی عزت افزائی، اور فوجیوں کو بے دھڑک جنگ میں حصہ لینے کی ترغیب کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ تقریباً وہی طریقہ تھا جو پہلی صدی ہجری کے مسلمان بھی اختیار کرتے تھے[2]۔

---

[1] عنترہ کی کہانی عشق و بہادری کی کہانی ہے جو عربوں کے دور جاہلیت کی زندگی کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ وہ ان کے اخلاق و عادات اور ان کی لڑائیوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس کے پڑھنے سے نفس میں حمیت، شجاعت، وفاداری اور سخاوت کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ عربی کی سب سے عمدہ کہانی اور اس قابل ہے کہ اسے عربوں کی ایلیڈ کہا جائے، اس کا طرز بیان نہایت دلچسپ اور موزوں ہے۔ کہیں کہیں رکاکت بھی پیدا ہو جاتی ہے اس کی نثر مسجع ہے جس میں تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ نثر میں جا بجا قصائد ہیں جن میں سے بعض قدماء سے سنے ہوئے اور بعض مصنوعی ہیں۔ رجحان غالب یہ ہے کہ اس میں عربوں کے ان احوال و وقائع کو جو سالہا سال راویوں اور قصہ گویوں کی زبانوں پر جاری تھے سب یکجا کر دیے گئے ہیں۔ پھر اس میں مبالغے ہوتے رہے حتی کہ عزیز باللہ فاطمی کے عہد میں (۳۶۵ تا ۳۸۶ھ) اس کے حکم سے یہ قصہ یوسف بن اسمعیل سے لکھوایا گیا تاکہ قوم اس واقعہ کو بھول جائے جو اس کے گھر میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اسے بہتر اجزاء میں لکھ کر عام کر دیا، اور اس کی قدر بڑھانے اور زیادہ مقبول عام بنانے کے لیے اسے اصمعی کی طرف منسوب کر دیا۔

[2] ابن اثیر نے ۷۷ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ عتاب بن ورقاء جنگ سے پہلے اپنے ساتھیوں کو جنگ پر ابھارنے کے لیے قصے سنا رہا تھا، پھر اس نے کہا "قصہ گو کہاں ہے؟" تو کسی نے جواب نہ دیا، پھر اس نے کہا "وہ کہاں ہے وہ جو عنترہ کے اشعار سنائے؟" تو اس پر کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا، الخ۔

یہ اسباب تھے جنہوں نے ادب عربی میں قصے کہانیوں کو جنم دیا اور تقریباً ایسے ہی واقعات تھے جن میں یہ مغرب میں پیدا ہوئے۔ دونوں جگہ یہ جنگوں کی وجہ سے وجود میں آئے اور دونوں جگہ ان کا آغاز بہادروں اور جانبازوں کے واقعات سے ہوا۔ فرق یہ ہے کہ مغرب میں ادیبوں کی توجہ، تنقیدی نظر، تمدنی وسعت اور علمی ترقی نے اس فن کی آبیاری کی لہذا یہ وہاں پروان چڑھا اور بڑھتا گیا لیکن مشرق میں یہ بچپن اور کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا، عوام اس سے دل بہلاتے، خواص اس سے متنفر رہتے، ادیب اس سے اعراض کرتے۔ حتیٰ کہ جو کپڑے پیدائش کے وقت اسے پہنائے گئے انہی میں اسے دفن کر دیا گیا۔ البتہ عربوں نے جن اصناف میں کمال پیدا کیا وہ حکایات، امثال اور مقامات ہیں۔

حکایات

الف لیلۃ و لیلۃ

حکایات کا فن عربوں نے ایرانیوں سے اخذ کیا اس سلسلہ میں ان کے ہاں جو بہترین مواد تھا وہ سعدی کی گلستان اور الف لیلہ کی اصلی کتاب تھی۔ اور یہی دونوں کتابیں مشرق و مغرب میں اس فن کی مثالی کتابیں شمار کی جاتی ہیں۔ لیکن عربوں نے جب یہ چیزیں ایرانیوں سے لیں تو انہوں نے اس میں اس قدر اضافے کیے اور اتنا دسترس حاصل کر لیا کہ وہ اس میدان میں ان کے حریف و سہیم ہو گئے بلکہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اولیت ہی ان کو حاصل ہے۔ انہوں نے ایرانیوں سے جو الف لیلہ لی تھی اس میں اس قدر اضافے کیے کہ وہ اصل کتاب پر چھا گئے اور یہ کتاب ادب عربی کا ایک بلند شاہکار بن کر رہ گئی۔

الف لیلہ کی اصل کے متعلق اغلب خیال یہی ہے کہ وہ فارسی کی ایک چھوٹی سی کتاب تھی جیسے ہزار افسانہ، کہا جاتا ہے اس میں انہوں نے ایک بادشاہ، وزیر اور اس کی بیٹی شہرزاد اور اس کی کنیز دنیازاد کی حکایت بیان کی ہے۔ عربوں نے تیسری صدی ہجری کے آخر میں یہ کتاب فارسی سے عربی میں ترجمہ کی۔ پھر اس کی مقبولیت نے انہیں اس کی توسیع و تفریح پر مائل کیا چنانچہ انہوں نے اس میں اس سے مشابہ قسم کی عربی، ہندوستانی اور یہودیوں کی کہانیوں، خلفاء و امراء کے واقعات، زمانۂ جاہلیت و اسلام کے بہادروں اور سخاوت کرنے والوں کے قصے جوڑ دیے، اور ان اضافوں کا دروازہ دسویں صدی ہجری تک کھلا رہا، اور اس طرح اس میں جو کمی رہ گئی تھی وہ سب پوری ہو گئی۔ ایرانیوں کی اصل کتاب کے خال خال اثرات رہ گئے بلکہ یوں کہیے کہ عربوں نے اس میں جنات اور جانباز بہادروں کے قصے، غیبی آوازوں کے مکالمے، جادوگروں کی کارستانیاں جس دلچسپ جاذب طبع اور

مفید خاطر انداز میں بیان کیے ہیں اس سے وہ فارسی والا حصہ تقریباً نابود ہو گیا ہے۔

اس کتاب کی نمایاں فضیلت و خصوصیت یہ ہے کہ وہ شام و مصر و عراق کے اسلامی دور کے عصور وسطی میں عربوں اور مسلمانوں کے اخلاق و عادات، رسوم و رواج، اور ان کے مختلف نظامہائے حیات کی ایسی ترجمانی کرتی ہے جس سے اجتماعیات کا مطالعہ کرنے والے ادیب اور فلسفی مؤرخ کو بڑی مدد اور گراں قدر مواد ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ والوں نے اس پر خصوصی توجہ دی اور اس کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ اس کے بیانات کو بحث و تحقیقات کا موضوع بنایا۔ اس کتاب کی طرز نگارش مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں ہونے کی وجہ سے یکساں نہیں ہے۔ وہ حصہ جو اخبار عرب اور نوادر خلفاء سے متعلق ہے نیز وہ ترجمہ جو صدر اول میں ہوا، اس کا بڑا حصہ صحیح اور فصیح ہے۔ لیکن وہ حصہ جو بعد میں آنے والے مصر و شام کے قصہ گویوں نے اضافہ کیا اس کی عبارت رکیک، الفاظ عامیانہ اور ترکیبیں مبتذل ہیں۔ تاہم قصوں کی روانی عمدہ، اور واقعات و حوادث کا باہمی ربط پختہ ہے۔

امثال

کلیہ و دمنہ

امثال کی ابتداء مشرق میں ہوئی۔ اس لیے کہ یہ مطلق العنان اور مستبد حکومتوں کا مرکز تھا۔ یہاں کے مظلوموں، کمزوروں اور محکوم انسانوں کے لیے اپنے دبے ہوئے خاموش احتجاج کو سرکش و جابر حکمران طبقہ کے کانوں تک پہنچانے اور اشارات و کنایات کے پردوں میں اپنی پند و نصائح سے انہیں مطلع کرنے کا یہی ایک کامیاب طریقہ تھا۔ اس صنف کلام نے سب سے پہلے ہندوستان میں جنم لیا۔ پھر وہاں سے چین پہنچی اور پھر ایران اور ایران سے عرب اور یونان۔ چنانچہ قدیم ترین امثال جن کا پتہ ملتا ہے وہ لقمان حکیم، ایزوپ رومی اور بید پا (دبید بابا) ہندی کی ہیں۔ اور عربی ادیبوں میں سب سے مشہور شخص جس نے اس صنف پر قلم اٹھایا وہ "ابن مقفع" ہیں جو "کلیہ و دمنہ" کے مترجم ہیں۔ یہ کتاب پند و نصائح کے ذریعہ اخلاق سدھارنے، اور حکمت کے ذریعہ عقول کی تربیت کرنے میں بہترین کتاب ہے۔ اسے بید پا ہندی نے تقریباً بیس صدی قبل دبشلیم بادشاہ کے لیے جانوروں اور پرندوں کی زبانوں سے بزبان سنسکرت لکھا تھا۔ اس نے اس کتاب کے بارہ باب باندھے تھے۔ پھر یہ فارسی میں ترجمہ ہوئی اور فارسی زبان سے عبداللہ بن مقفع نے اسے عربی میں منتقل کیا اور اس کے شروع میں ایک مقدمہ کا اضافہ بھی کیا جس میں اس کتاب کا تعارف اور اس کے پڑھنے کا شوق دلایا گیا ہے۔ بعد ازاں اس کتاب کی اصل اور تراجم سب ہی نایاب ہو گئے اور صرف عربی کا ترجمہ باقی رہ

گیا۔ بلکہ پھر یہی اصل بن گیا جس سے دنیا کی دوسری زبانوں میں قدیم و جدید تراجم ہوئے۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کے ابواب میں اضافے بھی ہوتے رہے حتیٰ کہ اب وہ اکیس ابواب ہو گئے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (ایک جامع علمی تصنیف، جو مستشرقین کی ایک جماعت کی زیر نگرانی تیار ہو کر فرانسیسی، جرمنی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتی ہے) (اس) میں ہے کہ یہ کتاب ایک نامعلوم برہمن کی لکھی ہوئی ہے، جسے اس نے تین صدی قبل مسیح کشمیر میں تصنیف کیا تھا۔ اس وقت اس میں ایک مقدمہ اور پانچ ابواب تھے۔ اس نے اس کا نام (تنترہ) رکھا تھا۔ یہ ہرٹل کا بیان اس کتاب کے متعلق۔ یہ وہی ہرٹل ہے جس نے اس کتاب کا سنسکرت سے ترجمہ کیا، اس پر مقدمہ اور تشریحی حاشیہ لکھا۔ پھر اسے دو جلدوں میں برلن سے شائع کیا۔

اس کتاب کا ایک اور نسخہ ہے جس کا نام (پنچ تنترہ) ہے۔ اسے نوشیرواں کے حکم سے اس کے طبیب برزویہ نے فارسی میں ترجمہ کیا، اور اس نے اس کتاب میں ہندوستانی کہانیوں کے مزید کچھ ابواب کا اضافہ کیا۔ اس ترجمہ کو سامنے رکھ کر ابن مقفع نے عربی کا ترجمہ کیا، اور اس کے شروع میں مقدمہ کا اضافہ کیا جو ادیان میں شک پیدا کرتے ہیں! اور کتاب میں "باب الفحص عن امر دمنہ" و "باب الناسک، وضیفہ" تک اضافہ کیا بعض نسخوں میں کتاب پر دو بابوں کا مزید اضافہ ہے جن کے متعلق یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آگئے اور وہ ہیں (۱) باب مالک الحزین والبطۃ اور (۲) باب الحمامۃ والثعلب و مالک الحزین۔ (یہاں انسائیکلو پیڈیا کی عبارت ختم ہوتی ہے)۔

بعض لوگوں کا خیال ہے یہ عبداللہ بن مقفع ہی کی تصنیف ہے، اور اس نے محض اس کتاب کی مقبولیت کی خاطر اسے ہندوستانی پنڈتوں کی طرف منسوب کر دیا تھا، لیکن ہمارے خیال میں یہ ذرا مستبعد سی بات ہے۔ اس لیے کہ ابن مقفع کے نقل و تراجم کے جتنے کام ہیں ان کی عربی اس کی طبع زاد تحریروں کے مقابلہ میں زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ بہت سے عربی شعراء مثلاً ابان لاحقی اور ابن ہباریہ نے اس کی کہانیوں کو نظم بھی کیا ہے۔ سہل بن ہارون نے اس کے مقابلہ میں جواباً ایک کتاب لکھی جس کا نام "ثعلۃ وعفرۃ" رکھا۔

پھر امثال کے موضوع پر لکھنے میں ابن الہباریہ متوفی ۵۰۴ھ نے شہرت حاصل کی جس نے کتاب الصادح والباغم لکھی ہے جو کلیلہ و دمنہ کی طرز میں دو ہزار شعروں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ابن عرب شاہ دمشقی ۸۵۴ھ میں جو کتاب فاکہۃ الخلفاء و مفاکہۃ الظرفاء کے مؤلف ہیں۔ ان کی یہ کتاب کلیلہ و دمنہ کی طرز پر امثال و حکم کا مجموعہ ہے۔ اپنی اس کتاب کو انہوں نے دس ابواب میں تقسیم کیا ہے، لیکن اس کی امثال کو تطویل و زوائد نے معیوب

اور طرز تحریر کو تصنع و تکلف نے کمزور کر دیا ہے۔

مقامات نویسی

مقامہ اس مختصر اور دلپسند و خوش اسلوب کہانی کو کہتے ہیں جس میں کوئی نصیحت یا لطیفہ ہو۔ دراصل یہ مقام سے ہے جس کے معنے ہیں کھڑے ہونے کی جگہ۔ پھر ذرا اس کے معنوں میں وسعت پیدا کر کے اسے جگہ اور مجلس کے معنوں میں استعمال کرنے لگے۔ پھر کثرت استعمال سے مجلس میں بیٹھنے والوں کو "مقامہ" کہنے لگے، جیسے مجلس سے مراد مجلس میں بیٹھنے والے ہو جاتے ہیں۔ پھر بڑھتے بڑھتے مجلس میں پڑھے جانے والے خطبہ، پند و نصیحت وغیرہ کو بھی "مقامہ" یا "مجلس" کہنے لگے۔ چنانچہ مقامات الخطباء کے معنے ہیں خطیبوں کی تقاریر، اور مقامات القصاص کے معنے ہیں قصہ گویوں کی کہانیاں، اور مقامات الزہاد کا مفہوم ہے زاہدوں کی پند و نصائح۔

کہانیوں کی یہ صنف عہد بنی عباس کے وسط میں پیدا ہوئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ادب اور فنی انشا پردازی اپنے شباب پر تھی۔ کہتے ہیں کہ مقامات نگاری کی ابتدا ابن فارس نے کی۔ پھر اس کی تقلید میں اس کے شاگرد بدیع الزمان نے مقامات لکھے جو اتنے عمدہ اور دلچسپ تھے کہ ان کی وجہ سے وہ اس فن کا امام مان لیا گیا۔

مقامہ سے مقصود نہ تو جمالِ حکایت ہے نہ حسن وعظ اور نہ افادۂ علمی۔ بلکہ وہ فنی ادبی تحریر کا ٹکڑا ہوتا ہے جس میں خوش نما سجع کے طرز پر غریب الفاظ، نادر تراکیب اس طرح جمع کیے جاتے ہیں کہ وہ اثر آفرینی سے زیادہ طبیعت کو مسرور کرتے اور فائدہ بخشی سے زیادہ لذت بخشتے ہیں۔ اسی لیے اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا اس میں فن افسانہ نگاری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ مقامات لکھنے والوں نے قصہ نگاری، کہانی میں رنگ بھرنے اور اس کے کرداروں کی تحلیل نفسی پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ انھوں نے اپنی تمام تر توجہ تحسین لفظی پر مبذول رکھی۔

مقامہ عام طور پر ایک معمولی سے واقعہ کے ارد گرد گھومتا ہے جس کا تعلق ایک شخص معین سے ہوتا ہے جسے اصطلاح فن میں "ہیرو" کہتے ہیں، مثلاً یہ ہیرو مقامات حریری میں ابو زید سروجی اور مقامات بدیع میں ابو الفتح اسکندری ہے۔ اس ہیرو اور ایک دوسرے شخص میں بڑے گہرے تعلقات اور قدیم شناسائی ہوتی ہے۔ یہ شخص ہر واقعہ میں اسے دیکھتا ہے۔ پھر اس کے متعلق جو کچھ بھلا برا اسے معلوم ہوتا ہے وہ اسے لوگوں کو بتا دیتا ہے۔ اس شخص کو راوی کہا جاتا ہے جیسے مقامات بدیع میں عیسیٰ بن ہشام ہے اور مقامات حریری میں حارث بن ہمام۔

رہ گئے مقامات نگار، سو پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ اس کی ابتدا ابن فارس نے کی تھی اور اس کے اتباع میں بدیع (متوفی ۳۹۸ھ) نے مقامے لکھے۔ اس نے بھیک اور دیگر موضوعات

پر چار سو مقامات املاء کرائے۔ انہیں اس نے عیسی بن ہشام کی زبانی ابو الفتح اسکندری کی طرف منسوب کیا، لیکن ان میں سے صرف ترپن مقالے مل سکے۔ اس سلسلہ میں پوری بحث بدیع کے حالات میں گذر چکی ہے۔ بعد ازاں حریری متوفی ۵۱۶ھ آیا، اس نے پچاس مقامے لکھے، جنہیں اس نے حارث بن ہمام کی زبانی کو ابو زید سروجی کی طرف منسوب کیا۔ طرز نگارش میں اس نے بدیع کے اسلوب کو اپنایا۔ اس پر مختصر بحث پچھلے صفحات میں بھی گذر چکی ہے۔ ان بلند پایہ ادیبوں کے بعد بہت سے انشاپردازوں نے مقامات نگاری کو اپنا موضوع بنایا لیکن وہ ان دونوں کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکے مثلاً ابن اشترکونی متوفی ۵۸۲ھ کی مقامات پر قسطیہ جس میں پچاس مقامے ہیں جو اس نے قرطبہ میں حریری کے مقامات دیکھنے کے بعد لکھے تھے۔ ان مقامات میں اس نے بڑی محنت، تکلف اور لایعنی پابندیوں سے کام لیا ہے۔ اس میں منذر بن حمام کی زبانی سائب بن تمام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، علاوہ ازیں زمخشری متوفی ۷۰۱ھ کے مقامات ہیں جو مشہور ہیں، نیز ابو عباس یحیٰی ابن سعید بن ماری نصرانی بصری طبیب متوفی ۵۸۹ھ کی مقامات مسیحیہ ہے جو اس نے حریری کے طرز پر لکھی ہے اور احمد بن اعظم رازی کے بارہ مقامات ہیں جو اس نے ۶۳۰ھ میں لکھے۔ اس میں اس نے قعقاع بن زنباع وغیرہ کو راوی بنایا۔ نیز زین الدین ابن صیقل جزری متوفی ۷۰۱ھ کی مقامات زینبیہ ہے جس میں مقامات حریری کے مقابلہ میں پچاس مقامات ہیں، اس کی روایت قاسم بن جریان دمشقی، ابو نصر مصری سے کرتے ہیں نیز مقامات سیوطی ہے یہ بجائے مقامات کے مضامین (رسائل) سے زیادہ مشابہ ہے۔

:٥:

چوتھا باب

ترکی دور

(سقوط بغداد کے بعد)

قاہرہ نے بغداد و قرطبہ کو کیوں کر پیچھے چھوڑ دیا؟

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا گیا، عہد متوکل کے بعد ایرانیوں اور ترکیوں کی باہمی کشمکش، سنی شیعہ جنگ، نیز لوگوں کے دلوں سے خلافت کی دھاک ختم ہو جانے کی وجہ سے عباسیوں کی حکومت کمزور ہو گئی تھی۔ اس پر لگاتار مصائب کے حملے ہوتے، اور دشمن غالب آتے جا رہے تھے۔ تا آنکہ ۶۵۶ھ ہلاکو خاں نے آ کر اس حکومت کا خاتمہ کر ڈالا۔ اُدھر اندلس میں بربریوں اور موالیوں کے غلبہ کی وجہ سے امویوں کی حکومت ڈگمگا رہی تھی اور حکومت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو جانے کی وجہ سے یورپ کے لیے اسے لقمہ لقمہ نگلنا آسان ہو رہا تھا۔ تا آنکہ ۸۹۸ھ میں پوری اندلسی حکومت یورپ کا تر نوالہ بن گئی۔ مصر و شام سے فاطمیوں کا دور دورہ جاتا رہا اور وہ امویوں اور پھر خاندان غلاماں کے زیر نگیں آ گئے۔ ۹۲۳ھ میں خاندان غلاماں سے نکل کر ان علاقوں کی حکومت عثمانی ترکوں کے ہاتھ آ گئی۔ اس تاریخ کے مطالعہ سے آپ کو نظر آئے گا کہ عالم اسلامی پر پانچ سو ساٹھ برس ایسے گذرے جن میں نہ کہیں عربوں کا جھنڈا نصب ہوا نہ کہیں ان کی دخل اندازی رہی۔ بلکہ ان کے علاقے اور ان کے آثار مغل، ترک، ایرانی، جرکسی قوموں اور پھر آخر میں اسپینیوں کے لیے لوٹ کا مال بن گئے۔ ان عجمی اقوام نے جو وحشی اور ناخواندہ تھیں عربی میراث میں دست درازیاں کیں۔ آباد علاقوں کو ویران کیا۔ عصمت و ناموس کی قبائیں چاک کیں۔ کتب خانے جلا کر، مدرسے اجاڑ کر، رصدگاہیں ڈھا کر، علماء کو مار کر، انہوں نے عربی زبان اور اس کے علوم و ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس ضمن میں بغداد و بخارا میں تاتاریوں نے، شام میں صلیبیوں نے اور اندلس میں یورپ والوں نے جو تباہیاں مچائیں ان کے مقابلے میں تمام تباہیاں ہیچ ہیں۔ ان تباہ کاریوں سے اگر عربی زبان کا نام و نشان مٹ جاتا اور وہ بھی اپنی دیگر سامی زبانوں سے جا ملتی تو یہ نہ کوئی انوکھی بات ہوتی نہ تاریخ میں کوئی نمایاں حادثہ! لیکن ان تمام آفات و مصائب کو جھیلنے کے بعد بھی زمانہ کے علی الرغم وہ بلاد مغرب، مصر، شام اور جزیرۂ عرب میں دین و علم کی زبان اور قوم و حکومت کی زبان بنی رہی واقعہ یہ ہے کہ اگر ترکوں کی دھاندلی بازی اور ایرانیوں کا تعصب نہ ہوتا تو یہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی زبان ہوتی۔

یہ زبان اپنے بولنے والوں کے ختم ہو جانے کے باوجود [illegible] قی رہی اور کس نے اسے

باقی رکھا یہ ایک معجزہ ہے اور اس کا سہرا قرآن کریم کے سر ہے۔ علاوہ ازیں اس میں جامعہ ازہر، ایوبی اور خاندان غلاماں کے سلاطین مصر و شام کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ یہ اس زبان کے دست و بازو اس زبان کے بولنے والوں کے لیے ملجا اور علماء عربی کے لیے ماوٰی تھے۔ انہوں نے اس موقع پر یہ خدمت انجام دی جب مغلوں کے حملوں سے خراسان و ایران و عراق تباہ ہو رہے تھے۔ بلاشبہ اگرچہ ایوبی نوبیت کے اعتبار سے کرد تھے، تاہم وہ عربی بولتے تھے۔ عربی ادب سیکھتے تھے اور ان میں بہت سے بلند پایہ عربی شعراء و علماء و مورخ پیدا ہوئے تھے۔ مثلاً الملک الافضل علی بن صلاح الدین[1] متوفی ۶۲۱ھ، بہرام شاہ والی بعلبک متوفی ۶۲۸ھ۔ الملک المؤید عماد الدین ابو الفداء متوفی ۷۳۲ھ۔ یہی حال خاندان غلاماں کا بھی تھا ان میں بھی ایک فرمانروا بلند پایہ شاعر تھا اور وہ ہے قانصوہ غوری متوفی ۹۲۲ھ۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے مصر کو اپنا وطن اسلام کو دین اور عربی کو اپنی زبان بنایا تھا۔ وہ علماء کی مدد کرتے اور ادباء کو مقرب بناتے تھے۔ انہوں نے اساتذہ و مصنفین کی اس طرح حوصلہ افزائی کی کہ ان کے زیر سایہ وہ بلند مرتبہ شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے زبان و علوم کے منتشر اجزاء کو جامع تصانیف میں جمع کیا۔ اپنے

---

[1] یہ بادشاہ ضعیف الرائے اور غفلت شعار تھا۔ چنانچہ اس کے چچا عادل ابوبکر اور اس کے بھائی عزیز عثمان نے اس سے ملک شام و مصر چھین لیا تھا۔ اس پر اس نے خلیفہ ناصر عباسی کو ایک شکایت نامہ لکھا جسے اس نے اپنے دو شعروں سے شروع کیا جو نہایت موزوں اور برمحل تھے، وہ یہ ہیں:-

مولای ان ابابکر و صاحبہ ۔۔۔ عثمان قد اخذا بالسیف حق علی

فانظر الی حرف ھذا الاسم کیف لقی ۔۔۔ من الاواخر مالاقی من الاول

اے میرے آقا! ابوبکر اور اس کے ساتھی عثمان نے تلوار کے زور سے علی کا حق چھین لیا۔ دیکھئے اس نام کی طرف کہ کس طرح اس پر آخر میں وہی کچھ مصیبت آئی جو پہلوں سے اسے پہنچی تھی۔ یہاں ابوبکر سے مراد اس کا چچا ہے اور عثمان سے مراد اس کا بھائی۔

خلیفہ ناصر نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا:-

وافی کتابک یا ابن یوسف معلنا ۔۔۔ بالصدق یخبر ان اصلک طاھر

غصبوا علیا حقہ ان لم یکن ۔۔۔ بعد النبی لہ بیثرب ناصر

فاصبر فان غدا علیہ حسابھم ۔۔۔ وابشر فناصرک الامام الناصر

اے ابن یوسف! تیرا شکایت نامہ ملا جس میں تو نے سچی بات علانیہ کہی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیری اصل پاک ہے۔ انہوں نے نبی کے بعد علی کا حق اس لیے غصب کر لیا تھا کہ مدینہ میں ان کا کوئی مددگار نہ تھا۔ تم صبر کرو ہم کل ان کے کیے کی باز پرس کریں گے اور خوش ہو جاؤ کہ امام ناصر تمہارا مددگار ہے۔

پیش رو علماء کی علمی تصانیف کی شرحیں اور خلاصے لکھے۔ تاریخ کو مہذب کیا اور اس کا فلسفہ مرتب کیا اور باوجودیکہ شاعری کا ذوق نادر اور اسے سننے والے ناپید ہو چکے تھے انہوں نے اس کے اوزان کی پابندی کی۔ ان میں ابن منظور مؤلف لسان العرب، فیروز آبادی مؤلف قاموس، ابن خلدون مؤلف مقدمہ، قلقشندی مؤلف صبح الاعشیٰ، الشاب الظریف، صفی الدین حلی، ابن الوردی، ابن معتوق اور صفدی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ وہ شخصیتیں ہیں جو مختلف ادوار میں پیدا ہوئیں۔ لہذا یہ لوگ اس مصیبت کی ماری دکھیاری زبان کے زخموں پر مرہم نہ رکھ سکے جو اسے اس کی عالم اولاد کے مرجانے سے پہنچے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان، خراسان، ایران، عراق اور بلاد روم اور اندلس میں یہ زبان ختم ہو گئی اور مصر و شام و بلاد عرب میں یہ لب گور مریض کی طرح باقی رہ گئی۔

شاعری و نثر نگاری میں ان لوگوں کا اسلوب، اپنے سے پہلے گذرنے والی عصر عباسی کے کے متاخرین شاعروں اور ادیبوں کا سا تھا۔ لیکن وہ ان کی تقلید بھی عمدگی سے نہ کر سکے۔ نہ صحیح مقصد تک پہنچ سکے۔ ان کی تمام تر توجہ لفظی حسن اور صنعتوں میں مبالغہ آرائی تک محدود رہی۔ حتیٰ کہ اگر ان کی سجع بندی اور تجنیس و توریہ کی راہ میں اعراب یا معانی حائل ہوتے تو وہ اعراب کی پابندی اور حسن معنیٰ کو کوئی اہمیت نہ دیتے۔

جب خاندان غلاماں پر بنو عثمان کی فتح ہوئی تو خلافت، عباسیہ کی بجائے خلافت عثمانیہ آ گئی اور اسلامی حکومت کا دارالسلطنت بجائے قاہرہ کے قسطنطنیہ ہو گیا اور سرکاری زبان عربی کے بجائے ترکی ہو گئی[1] اسی طرح عربی زبان میں غیر زبان کے الفاظ بکثرت داخل ہونے لگے۔ دفاتر میں

---

[1] بایں ہمہ ترک اپنے دور کے آغاز میں عربی زبان سیکھتے اور بولتے تھے اور اس میں گرانقدر تالیفات بھی کرتے تھے۔ مثلاً فیروز آبادی، برکوی متوفی ۹۸۱ھ ابو السعود، فناری، ملا خسرو، جامی، خیالی، خواجہ زادہ، حاجی خلیفہ، طاشکبری اور مؤلف کتاب التنبیہ علی غلط الجاہل والنبیہ ابن کمال پاشا۔

خود عثمانی بادشاہ، ترکی زبان و ادب کی طرح عربی زبان و ادب بھی سیکھتے تھے۔ ان میں سے بعض تو عربی میں شاعری کرتے اور عربی شاعری کی روایت کرتے تھے۔ مثلاً سلطان احمد اول، اس کا ایک قصیدہ بھی بیان کیا جاتا ہے جس کا مطلع ہے:-

ظبي يصول ولا وصول اليه   جرح الفؤاد بصارمي لحظيه

غزال ہے جو حملہ کرتا ہے۔ لیکن اس تک پہنچنے کی کوئی شکل نہیں۔ جس نے اپنی آنکھوں کی دو تلواروں سے میرا دل گھائل کر دیا ہے۔

ترکی علماء نے عربی زبان کی طرف التفات میں کمی اور بے رغبتی سلطان محمود ثانی اور اس کے بیٹے سلطان عبدالمجید اول کے عہد میں کی۔ اس لیے کہ ان دونوں نے ترکی زبان کو زندہ رکھا۔ اس کے اصول و قواعد ضبط کیے۔

عامیانہ بولیوں اور نثر کی زبان نے اس پر یلغار کر دی اور نظم ونثر میں خالص عربی اسالیب ناپید ہو گئے۔ دوسری طرف نفوس میں غلامی کی ذلت اور احساس کمتری پیدا ہونے کی وجہ سے طبیعتوں کی تولانی ختم ہو گئی اور علمی چشمے خشک پڑ گئے۔ کتابیں اطمینان وسکون سے کتب خانوں میں بند رہیں۔ صرف دیمکوں اور جھینگروں نے ان کے آرام میں خلل ڈالا اور ان کے اوراق چاٹے۔ اہل مشرق کی آنکھوں پر جہالت چھا گئی، وہ اندھے ہو گئے اور ذلت کے بوجھ تلے دب گئے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ وہ بے خبر سوتے رہے اور تاریکی ان پر چھائی رہی۔ حتیٰ کہ قاہرہ کی سرحد پر نپولین کی توپوں کے دھماکوں نے انہیں خواب سے بیدار کیا۔

اِس دَور کی نمایاں شخصیتیں

مغلوں کے عہد میں ادب عربی کی فضاء پر تاریکی چھائی رہی۔ نگاہیں اندھی اور طبائع بھٹکتی رہیں۔ لوگ جہالت کی اندھیریوں میں سرگرداں پھرتے رہے۔ انہیں زندگی کی کوئی رمق اور روشنی کی کوئی چمک اگر نظر آتی تھی تو وہ مصر سے یا شام سے، اس لیے کہ یہی وہ دو علاقے تھے جنہوں نے عربی زبان کی حفاظت کی، اس کے گرتے ہوئے ادب کو اٹھایا اور علمی انتشار کو سمیٹ کر جمع کیا۔ اگر یہ دونوں علاقے اس کی سرپرستی نہ کرتے تو قدیم وجدید ادب میں کوئی تعلق نہ رہتا۔ میرے لیے بڑی مسرت کا باعث ہوتا اگر اس کتاب میں میرے ان ہموطن اور ہمسایہ ادیبوں کے حالات درج ہونے کی گنجائش ہوتی جنہوں نے اس عہد میں علمی وادبی خدمات انجام دیں۔ لیکن افسوس کہ ہمارے پاس گنجائش کم اور جگہ محدود ہے۔ بایں ہمہ ان کے فضل علمی اور خدمات ادبیہ کا اعتراف کرتے ہوئے ہم ان کے اسماء گرامی درج کر رہے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ان کے ہم عصر عراقی اور مغربی علماء کے اسماء بھی لکھ رہے ہیں۔

ادب وشعر میں نمایاں مقام حاصل کرنے والوں میں تلّعفری موصل میں پیدا ہوئے۔ الملک الاشرف موسیٰ کی خدمت میں رہے اور ۶۷۵ ہجری میں شکار قمار ہو گئے۔ بوصیری جنہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں قصیدۂ بردہ کہا، مصر میں پیدا ہوئے اور وہیں ۶۹۵ھ میں وفات پائی۔ ابن نباتہ مصری متوفی ۷۶۸ھ۔ ابن حجہ حموی، اپنے دور کے امام الادباء، مولف خزانۃ الادب، متوفی ۸۳۷ھ۔ قلقشندی، مولف صبح الاعشیٰ، متوفی ۸۲۱ھ۔ صفی الدین حلی، متوفی ۷۵۰ھ۔ ابن معتوق، متوفی ۱۰۸۷ھ ہیں، ان کی شاعری صنعت کی قیود کی پابندیوں کی وجہ سے گرانبار اور تقلید کے دائرہ میں محصور ہے، معانی کے اعتبار سے اس کی شاعری میں اخلاقی کمزوریاں غالب ہیں مثلاً بزدلی، خوشامد، شکوہ شکایت، فحش وعریانی، ہاں کچھ حصہ ایسا بھی ہے جس میں کچھ حسن وبیان کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

زبان اور اس کے علوم میں نمایاں کمال حاصل کرنے والوں میں ابن مالک مولف الفیہ، متوفی ۶۷۲ھ، لسان العرب کا مولف جمال الدین بن منظور، متوفی ۷۱۱ھ المغنی فی النحو کا مولف جمال الدین بن ہشام، متوفی ۷۶۱ھ اور قاموس کا مصنف فیروز آبادی، متوفی ۸۱۷ھ ہیں۔ یہ وہ علماء ہیں جنہوں نے عربی زبان کے قواعد شرح وبسط سے لکھے اور اس کے تمام مواد کو ڈکشنریوں اور دیگر کتابوں میں جمع کیا۔

تاریخ وجغرافیہ کے بلند پایہ علماء میں، ابن ابی اصیبعہ، مولف عیون الانباء فی طبقات الاطباء متوفی ۶۶۸ھ۔ ابن خلقان مولف وفیات الاعیان، متوفی ۶۸۱ھ۔ ابوالفداء، متوفی ۷۳۲ھ۔ شمس الدین ذہبی مولف تاریخ الاسلام، متوفی ۷۴۸ھ۔ مقریزی، کتاب المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار، متوفی ۸۴۵ھ۔ ابن الطقطقی مؤلف الفخری، متوفی ۷۰۱ھ۔ ابن خلدون (العبر و دیوان المبتدا والخبر اور اس کے گراں قدر) مقدمہ کا مصنف، متوفی ۸۰۸ھ۔ لسان الدین بن خطیب، متوفی ۷۷۶ھ۔ مقری مولف نفح الطیب، متوفی ۱۰۴۱ھ ہیں۔ ان مورخین کے اسلوب نگارش میں تاریخی واقعات کا بالاستیعاب ذکر، استنباط عبر، واقعات پر نقد وتبصرہ، بعض علمی واجتماعی مسائل میں بحث، شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ اپنے اسلاف سے بہتر اور صحیح تاریخ نگاری کے طریقہ سے قریب تر تھے۔

دیگر عام مولفین میں، نویری مولف نہایۃ الادب فی فنون الادب، متوفی ۷۳۲ھ۔ ابن فضل اللہ عمری، مولف مسالک الابصار متوفی ۷۴۸ھ۔ جلال الدین سیوطی متعدد گراں قدر تصانیف کا مولف، متوفی ۹۱۱ھ۔ کمال الدین دمیری مولف حیاۃ الحیوان، متوفی ۸۰۸ھ ہیں۔ ان حضرات کو منتشر علمی وادبی مباحث کو ایک جامع تصنیف میں یکجا کرنے کا شرف حاصل ہے یہ تقریباً وہی کام تھا جسے آج کل انسائیکلوپیڈیا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان تفاصیل سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی زبان کو بایں ہمہ حوادث روزگار تلف ہونے سے محفوظ رکھا اور اپنے دین اور اپنی کتاب کو بچا لیا۔ حتیٰ کہ اس دور انحطاط میں بھی اس کے لیے یکے بعد دیگرے ایسے مایۂ ناز علماء پیدا کیے جو اس زبان میں پیدا ہونے والے نقصانات کی تلافی کرتے رہے اور اسے نیست ونابود ہونے سے بچاتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

نجوم سماء کلما انقض کوکب بدا کوکب تاوی الیہ کواکبہ

یہ یکے بعد دیگرے آنے والے علماء آسمان کے تارے تھے کہ جب ان میں سے ایک گرتا تھا تو دوسرا تارا اس کی جگہ لے لیتا تھا اور اس کے اردگرد دوسرے تارے جمع ہو جاتے تھے۔

اب ہم ان علماء وادباء میں سے چند بلند پایہ شخصیتوں کی زندگی کے حالات درج

کرتے ہیں، اور سر دست اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

صفی الدین حلّی

(پیدائش ۶۷۷ھ وفات ۷۵۰ھ)

پیدائش اور زندگی کے حالات: صفی الدین ابوالبرکات عبدالعزیز بن سرایا عراق کے ایک مقام حِلّہ میں پیدا ہوا، وہیں اس نے ابتدائی پرورش اور تعلیم و تربیت پائی، پھر سیاسی اضطراب اور بے اطمینانی نے اسے جزیرہ میں ماردین کی طرف ہجرت کے لیے مجبور کیا، تاکہ وہ شاہان آل ارتق (۶۶۳ھ سے ۷۱۲ھ تک) کی پناہ میں رہے، چنانچہ ان بادشاہوں نے اس کے دل سے خوف و خطر کو دور کر دیا۔ اور اسے اپنے اعزازات و انعامات سے نواز کر آسودہ حال بنا دیا۔ وہاں اس نے ان کی مدح میں ۲۹ قصائد کہے جن میں سے ہر قصیدہ میں انتیس شعر ہوتے اور ہر شعر کا پہلا حرف بالترتیب حروف ہجا کا ایک حرف ہوتا اور اسی حرف پر وہ شعر ختم بھی ہوتا۔ ان قصائد کا نام اس نے "درر النحور فی مدائح الملک المنصور" رکھا، جو ارتقیات کے نام سے مشہور ہیں۔ ۷۲۶ھ میں وہ مصر آیا اور الملک الناصر بن قلاوون کے دربار میں کھڑے ہو کر اس کی مدح کی جس پر اس نے انعامات سے اس کے ہاتھ بھر دیے، بعد ازاں وہ یہاں سے ماردین واپس چلا گیا، اور پھر وہاں سے بغداد گیا جہاں اس نے وفات پائی۔

اس کی شاعری:- اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ صفی الدین اپنے زمانہ کے شاعروں کا قائد تھا۔ اس کی شاعری میں لفظی فصاحت اور اسلوب میں دلربائی اور متانت۔ اس نے صنعت کی مختلف قسموں میں خوب حصہ لیا ہے۔ لمبے قصائد، مقطوعات، موشحات، اور زجل اس نے نہایت عمدگی سے کہے ہیں۔ ظرافت اور ہنسی مذاق بھی اس کے ہاں خوب ہے۔ وہ مختلف موضوعات ادل بدل کر اپنی شاعری لاتا ہے۔ شاعری کے گیارہ اصناف میں اس نے طبع آزمائی کی ہے اور ان میں سے ہر صنف اس کے دیوان کا ایک باب ہے۔ نظم میں اس نے کچھ نئی قسمیں ایجاد کی ہیں جن میں سے ایک موشح مضمن ہے، اس کی مثال وہ تضمین ہے جو اس نے ابونواس کے بائیہ پر کی ہے۔ جس کا ایک بند درج ذیل ہے:۔

وحق الهوى ما حلت يوما عن الهوى ولكن نجمى فى المحبة قد هوى

ومن كنت ارجو وصله قتلى نوى واضنى فؤادى بالقطيعة والنوى

لیس فی الھوی عجب ان اصابنی تعب
حامل الھویٰ تعب یستخفه الطرب

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ فخر وحماسہ کے موضوع پر کہتا ہے:۔

سل اسرماح العوالی عن معالینا — وسائل البیض ھل خاب الرجا فینا
وسائل العرب والاتراك ما فعلت — فی ارض قبر عبیداللہ ایدینا
لما سعینا فما رقت عزائمنا — عما نروم ولاخابت مساعینا
یا یوم وقعة زوراء العراق وقد — دنا الأعادی کما کانوا یدینونا
بضمر ماربطناھا مسومة — الا لنغزو بھا من بات یغزونا
و فتیة ان نقل اصغوا مسامعھم — لقولنا ، او دعوناھم اجابونا

ہماری سربلندی کے متعلق بلند نیزوں سے معلوم کرو، اور تلواروں سے دریافت کرو کہ آیا کبھی ہماری کوئی آرزو ناکام بھی رہی ہے؟ اور جو کچھ ہمارے ہاتھوں نے سرزمین قبر عبید اللہ میں کیا ہے اس کے بارے میں عربوں اور ترکوں سے پوچھو، جب ہم نے کسی مقصد کے لیے کوشش کی ہے تو ہمارے عزائم ڈھیلے نہیں ہوئے اور نہ ہماری کوششیں بے نتیجہ رہیں۔ اے زوراء العراق کے معرکہ کے دن جہاں ہم نے دشمنوں کو ویسے ہی زیر کیا جیسے وہ ہمیں زیر کرتے تھے۔ اس معرکہ میں ہمارے چھریرے گھوڑے ہمارے ساتھ تھے جنہیں ہم نے اپنے حریفوں سے مقابلہ کے لیے تیار کیا تھا، اور وہ نوجوان تھے جو ہمارے ہر حکم کی اطاعت کرتے اور ہماری ہر آواز پر لبیک کہتے تھے۔

قوم اذا استخصموا کانوا فراعنة — یومًا و ان حکموا کانوا موازینا
تدرعوا العقل جلبابًا فان حمیت — نار الوغٰی خلتھم فیھا مجانینا
اذا ادعوا جاءت الدنیا مصدقة — و ان دعوا قالت الایام امینا
انا لقوم ابت اخلاقنا شرفًا — ان نبتدی بالاذیٰ من لیس یؤذینا
بیض صنائعنا، سود وقائعنا — خضر مرابعنا ، حمر مواضینا
لا یظھر العجز منا دون نیل منی — ولو رأینا المنایا فی امانینا

یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان سے لڑائی مول لی جاتی ہے تو یہ فرعون ہوتے ہیں اور جب وہ جھگڑے فیصل کرتے ہیں تو ترازو بن جاتے ہیں۔ یوں تو انہوں نے اپنے اوپر عقل کا جامہ پہن رکھا ہے لیکن جب جنگ کی آگ بھڑکتی ہے تو یہ تمہیں دیوانے معلوم ہوں گے (کیونکہ یہ دیوانہ وار جنگ میں حصہ لیتے ہیں)۔ جب یہ کوئی دعویٰ کرتے ہیں تو ساری دنیا ان کی صداقت پر گواہی دیتی ہے اور جب یہ کوئی دعا کرتے ہیں تو زمانہ اس

پر آہین کہتا ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ شرافت کی وجہ سے ہمارے اخلاق عالیہ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم پہل کر کے کسی ایسے شخص کو ستائیں جس نے ہمیں ایذا نہ پہنچائی ہو۔ ہمارے کارنامے روز روشن کی طرح نمایاں ہیں۔ اور ہماری جنگیں تاریک راتوں کی طرح بھیانک ہیں۔ ہماری چراگاہیں سرسبز ہیں اور ہماری تلواریں خوں آشامی کی وجہ سے سرخ ہیں۔ ہم جب کسی چیز کی آرزو کر لیتے ہیں تو اس کے حصول میں کسی قسم کی دوں ہمتی اور عاجزی کو حائل نہیں ہونے دیتے، ہم اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتے ہیں خواہ ہم اپنی آرزوں میں موتوں ہی کو کیوں نہ دیکھ لیں۔

ابنِ منظور

(پیدائش ۶۳۰ھ وفات ۷۱۱ھ)

زندگی کے حالات: جمال الدین محمد بن کرم، بروز پیر ۲۲ محرم ۶۳۰ھ، قاہرہ کے ایک علمی گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے عبد الرحمٰن بن طفیل اور مرتضیٰ بن حاتم اور ابن المقیرؒ جیسے اپنے دور کے ماہر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، پھر انہوں نے اس درجہ علوم وفنون میں کمال حاصل کیا کہ انشاء کے دفتر میں کام کرنے کے قابل ہو گئے۔ واضح رہے کہ اس دفتر میں کام کرنے کے لیے اس زمانہ میں بہت سے علم وفنون میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہوتی تھی۔ ان علوم وفنون کی تفصیل صبح الاعشیٰ کے مؤلف نے کی ہے۔ پھر وہ ایک عرصہ تک طرابلس میں منصب قضاء پر فائز رہا، لیکن ان تمام مصروفیتوں کے دوران وہ کبھی بھی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے غافل نہ رہتا تھا چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو پانچ سو جلدیں خود اس کی تصنیفات پر مشتمل تھیں۔

ابن منظور محنتی، خلیق، خوش نصیب اور ارادہ کا دھنی تھا۔ اس کا رجحان طبع رفض کے بغیر شیعیت کی طرف تھا۔ لسان العرب میں جہاں کہیں اس موضوع سے متعلق الفاظ پر بحث کرتا ہے وہاں اس کا رجحان ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس نے قاہرہ میں وفات پائی۔

تصانیف: ابن منظور طرز نو ایجاد کرنے کی قوت نہ رکھتا تھا، اپنے ہم عصر علماء کی طرح اس کا میلان بھی منتشر مباحث کو جمع کرنے اور مطولات کو مختصر کرنے کی طرف تھا۔ اس کے بارے میں صلاح الدین صفدی نے لکھا ہے: "دو میں ادب کی کوئی کتاب ایسی نہیں جانتا جسے جمال الدین بن کرم نے مختصر نہ کیا ہو"۔

لسان العرب: یہ وہ عظیم القدر جامع لغت کی کتاب ہے جس میں ازہری کی تہذیب ابن سیدہ کی محکم، جوہری کی صحاح، ابن درید کی جمہرۃ اللغۃ ابن الاثیر کی

نہایہ جیسی مستند کتب لغات یکجا ہیں۔ مولف نے اسے مادوں کے آخری حروف کی ترتیب سے اس قدر خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہے کہ اس سے استفادہ میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ نقل میں عبارت اور حوالوں کی صحت کا کمال درجہ اہتمام رکھا ہے۔ پہلے راویوں سے جو کچھ الفاظ کی شرح میں مروی تھا اسے من وعن نقل کر دیا ہے۔ اس کے بعد قرآن وحدیث، امثال واشعار سے جو مستند اور صحیح شواہد ملتے ہیں انہیں درج کیا ہے۔

اس کے سوانح نگاروں نے جن میں صفدی بھی ہے، یہ بیان کیا ہے کہ اس کتاب کا پہلا نسخہ جسے مصنف نے اپنے حسین خط سے لکھا تھا، مصر کے دفتر انشاء کے مہتمم المفرالاشرف کمالی کی ملکیت میں تھا، جو ستائیس حصوں پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ حصے مصر سے ۱۳۰۰ھ میں بیس جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔

لسان العرب کے علاوہ دیگر تصانیف میں اس کی ایک اہم تصنیف "کتاب" سرور النفس بمدارک الحواس الخمس" ہے اس کتاب کا موضوع تمام وہ اشیاء ہیں جن کا تعلق حواس سے ہے مثلاً روز وشب اور ان کے اوصاف، صبح اور اس کی مدح، ہلال اور اس کا ظہور، فجر کا سماں، وقت سحر نسیم کے جھونکے، درختوں پر پرندوں کا چہچہانا، سورج ستارے، نجومیوں اور علم الافلاک جاننے والوں کی ان کے متعلق آراء .... الخ۔

مزید برآں اس کی بہت سی تصانیف تہذیب واختصار کتب پر مشتمل ہیں۔ مثلاً مختار الآغانی، مختصر تاریخ بغداد (جو خطیب بغدادی کی تصنیف ہے) مختصر مفردات (ابن بیطار کی تصنیف)، مختصر العقد (ابن بیطار کی تصنیف) مختصر العقد (ابن عبدربہ کی تصنیف)، مختصر زہر الآداب، مختصر الحیوان (جاحظ کی تصنیف) مختصر الیتیمہ (ثعالبی کی تصنیف)، لطائف الذخیرۃ (جو ابن بسام کی تصنیف ہے)۔

وہ شاعری بھی کرتا تھا اور عمدہ شعر کہتا تھا، اس کے شعر ہیں:۔

ضم کتابی اذا اتاك علی الارض وقلبه فی یدیك لماما
فعلی ختمه وفی جانبیه قبل لنا وضعتهن تؤاما
کان قصدی بها مباشرۃ الارض وکفیك بالتثامی اذاما

جب میرا خط آپ کو ملے تو اسے زمین پر رکھیے اور اسے تھوڑی دیر بعد اپنے ہاتھوں میں الٹ پلٹ کیجئے، اس کے دونوں کناروں پر بوسے ہیں جو میں نے یکے بعد دیگرے لیے ہیں۔ اس سے میرا مقصود یہ ہے کہ میں بیک وقت آپ کے ہاتھوں میں بھی رہوں اور زمین پر بھی ....

اس کے دو اور شعر ملاحظہ ہوں:۔

باللہ ان جزت بوادی الاراك وقبلت اغصانه الخضر فاك

فابعث الی المملوک من بعضه　　فاننی واللہ مالی (سواک)

تمہیں خدا کی قسم، جب تم پیلو کے درختوں کی وادی سے گذرو اور ان درختوں کی سرسبز شاخیں تمہارا منہ چومیں تو اس بندہ کے لیے بھی ان میں سے کچھ شاخیں بھیج دینا کہ بخدا میرے پاس کوئی مسواک ہی نہیں ہے۔

(آخری شعر میں "سواک" ہے جس کے ایک معنے تو اوپر گذر رہے، دوسرے معنے یہ ہیں کہ تیرے سوا میرے لیے کوئی نہیں ہے)۔

ابو الفداء

(پیدائش ۶۷۲ھ وفات ۷۳۲ھ)

حالاتِ زندگی:- یہ الملک المؤید عماد الدین ابو الفداء اسمٰعیل بن علی ایوبی، والی حماۃ ہے۔ اس نے دمشق میں فضل و سیادت کے ماحول میں جنم لیا۔ آسودگی و خوش حالی میں پرورش پائی، علوم سیکھے اور تاریخ و ہیئت میں کمال حاصل کیا۔ وہ نہایت جری اور بہادر بھی تھا۔ تاتاریوں سے لڑائی میں اس نے ملک ناصر بن قلاوون کی بڑی جانفشانی سے خدمت کی تو اس نے اسے حماۃ کا علاقہ دینے کا وعدہ کیا اور اپنا وعدہ وفا بھی کر دیا، چنانچہ اس نے ابو الفداء کو حماۃ کا مطلق العنان حکمران بنا دیا اور اسے "الملک المؤید" کا لقب دے دیا، اسے مصر بلوایا اور وہاں اسے شعار شاہی سے نوازا، جس کی وجہ سے امراء و کبراء اس کی خدمت میں بیش قیمت گھوڑے غلام اور جواہرات پیش کرتا رہتا تھا۔ جب تک ابو الفداء زندہ رہا کمزوروں کا مددگار، علماء کا پشت پناہ تصنیف و تالیف کا دلدادہ بنا رہا۔ تا آنکہ وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔

تصانیف:- ابو الفداء کی تاریخ اور جغرافیہ کے موضوع پر دو کتابیں ہیں، جو ان دونوں علوم میں عربوں اور یورپ والوں کے لیے مرجع و سند رہی ہیں (۱) کتاب المختصر فی اخبار البشر، یہ عربوں کی عمومی تاریخ پر مشتمل ہے اور اس میں ۷۲۹ھ تک کے واقعات ہیں۔ اس نے یہ کتاب بیس سے کچھ اوپر کتابوں کو سامنے رکھ کر خلاصہ کے طور پر لکھی ہے۔ اس نے وقائع نگاری میں ابن اثیر کے اسلوب کی اقتداء کرتے ہوئے اس کی ترتیب سن وار رکھی ہے اور واقعات و حوادث نقل کرنے میں صداقت اور تنقید سے کام لیا ہے (۲) کتاب تقویم البلدان ہے۔ اس میں قدماء نے جو کچھ بھی جغرافیہ اور فلکیات سے متعلق لکھا ہے اس کا خلاصہ یکجا کر دیا ہے۔ اسماء کا صحیح تلفظ ضبط کیا ہے۔ طول و عرض کی تحقیق کی ہے، بالخصوص اس نے مصر، شام، بلاد عرب اور ایران کے حالات بیان کرنے میں بڑی توجہ مبذول کی ہے، یورپ

والوں نے بھی اس کتاب کو بڑی اہمیت دی ہے، انہوں نے اپنی زبانوں میں اس کے تراجم کر دیے ہیں اور وہ عرب کے جغرافیہ سے متعلق امور میں اس کی معلومات پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔

ابنِ خلدون

(پیدائش ۷۳۲ھ وفات ۸۰۸ھ)

حالاتِ زندگی: ابو زید عبدالرحمٰن بن محمد المعروف بہ ابن خلدون، کا نسب کندہ کے نوابوں میں وائل سے جا ملتا ہے۔ اس کا نواں دادا خلدون ہجرت کر کے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں اندلس چلا گیا تھا، جہاں اس کا خانوادہ اشبیلیہ میں مقیم ہو گیا۔ پھر جلاوطنی کے بعد یہ خانوادہ تونس منتقل ہو گیا جہاں یہ عظیم القدر مورخ عالم ۷۳۲ھ میں پیدا ہوا اور علم وسیادت کے ماحول میں پلا۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنے والد اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ قرآن مجید کا پختہ علم سیکھا پھر دیگر علوم حاصل کیے۔ فقہ اور عربی ادب میں مہارت حاصل کی۔ تاریخ میں وسیع نظر پیدا کی اور اس کے تمام مباحث کا استقصاء کیا تا آنکہ وہ اس فن میں یگانۂ روزگار ہو گیا۔ بچپن ہی سے اسے بادشاہوں کی خدمت میں رہنے کا شوق تھا، چنانچہ وہ اندلس و مغرب کے بہت سے بادشاہوں سے وابستہ رہا۔ قضاء اور سکریٹری کے عہدوں پر فائز رہا۔ لیکن اپنی خودداری، حق گوئی اور حاسدوں کی کثرت کی وجہ سے وہ کسی عہدہ پر زیادہ دیر تک نہ جمتا تھا۔

۷۶۴ھ میں وہ اندلس گیا، جہاں والی غرناطہ الغنی باللہ نے اس کی آمد پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اپنے خواص کو ان کے استقبال کے لیے بھیجا۔ انہیں اپنا مصاحب بنایا اور اس درجہ اہمیت دی کہ اپنے وزیر کو بھی ان کا شریک مجلس نہ بنایا۔ جس سے وہ وزیر ان سے جلنے لگا، ابن خلدون اس کی عداوت کو تاڑ گیا۔ اور بادشاہ و وزیر کو خیرباد کہہ کر اپنے وطن واپس چلا آیا۔ پھر وہ ممالک کی سیاحی کرنے لگا، تا آنکہ ۷۸۴ھ میں وہ مصر پہنچا۔ یہاں جامع ازہر میں وہ استاذ بن گیا، اور سلطان برقوق کی خدمت میں باریاب ہوا، جس نے اس کی قدرشناسی کرتے ہوئے اس کے انکار کے باوجود اسے مالکی قضاء کا منصب سونپ دیا۔ وہاں اس نے عدالت و انصاف کا وہ رنگ جمایا کہ دوسرے قاضیوں کی عدالتیں سونی پڑ گئیں۔ چنانچہ وہ اس کے خلاف برہم ہو گئے اور اس پر جھوٹے اتہام لگا کر بادشاہ کے پاس اس کی شکایت پہنچا دی مگر بادشاہ نے ان کی شکایت پر قطعاً توجہ نہ دی، لیکن ابن خلدون اس تلخ زندگی، اور پیہم سازشوں سے دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ ادھر ایسا اتفاق ہوا کہ اس کے گھر والے جو تونس سے اس کے پاس آ رہے تھے کشتی ڈوب جانے کی وجہ غرق ہو گئے۔ اس حادثہ سے

اسے سخت صدمہ پہنچا، اور اس نے منصب قضاء سے استعفی دے دیا اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد اپنی فیوم کی جاگیر میں (جو اسے سلطان نے بخشی تھی) عزلت کی زندگی گذارنے لگا۔ اور تدریس و تصنیف میں مشغول ہو گیا۔ بعد ازاں دوبارہ وہ منصب قضا پر فائز ہوا، اور قسمت کی گردش میں پڑ گیا، کبھی تقرری ہوتی اور کبھی برطرفی، کبھی کامیابی ہوتی کبھی ناکامی، تاآنکہ ۸۰۸ھ میں وہ مصر میں وفات پا گیا

اخلاق و آداب:- لسان الدین خطیب نے اس کے بارے میں کہا ہے وہ فاضل، بااخلاق بہت سی خوبیوں کا مالک، باحیا، باوقار، خوش ہیئت، خوددار ارادہ کا دھنی، تصیبہ کا متلاشی، علوم عقلیہ و نقلیہ میں باکمال، محقق، کثیر الحفظ، خوش خط، شان و شوکت کا دلدادہ اور ملنسار ..... وغیرہ وغیرہ تھا" جن کی تصدیق اس کے افکار و آثار سے بھی ہوتی ہے۔

اس کی نثر اور شاعری:- ابن خلدون اس دور کی پیداوار ہے جب علوم کا بازار مندا اور ادب کا محل ویران ہو چکا تھا۔ صنعت پسندی نے روح انشاء کا گلا گھونٹ رکھا تھا، لیکن اس کی فطرت شناس طبیعت نے اسے عہد اول کی انشاپردازی کی طرف مائل کر دیا۔ وہ سجع بندی سے متنفر، اور بدیع سے برگشتہ رہا۔ اس نے لفظ کو معنے کا غلام بنایا، اپنے اس اسلوب انشاء کی تصریح اس نے اپنے ایک خط میں کی ہے جو اس نے شاہان اندلس میں سے ایک بادشاہ ابو سالم کی خدمت میں لکھ کر بھیجا تھا۔ اس میں وہ لکھتا ہے "ان میں سے میرے بیشتر مکاتیب و مضامین کی عبارت آزاد ہوتی اور اپنے اس اسلوب نگارش میں اُس وقت میں منفرد تھا۔ ان لوگوں میں جو صنعت پسند اور بتکلف مسجع عبارت لکھنے کے عادی تھے میرا کوئی شریک انشاء نہ تھا، ان لوگوں کے کمزور مسجع اسلوب نگارش میں برخلاف آزاد انشاء کے معانی پوشیدہ رہتے تھے۔ لہذا اس قسم کے صنعت پسند میری طرز تحریر کو بنظر استعجاب دیکھتے تھے۔ پھر مجھے شاعری کا شوق ہوا تو شاعری کی بحریں میرے اوپر برسنے لگیں، اور میں نے درمیانہ قسم کی شاعری کی"۔ اس نے اپنے متعلق جس صداقت و جرأت سے فیصلہ کیا ہے وہ کسی مزید تبصرہ کا محتاج نہیں ہے۔

تاریخ کے موضوع پر اس کی تصنیف: ابن خلدون نے تاریخ کے موضوع پر گہری نظر ڈال کر اس کے مباحث معین کیے۔ حوادث کی علتیں بتائیں، اور اس نے اپنی مشہور کتاب "العبر و دیوان المبتدأ والخبر" لکھی جو سات جلدوں میں تین کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ جب ایک حکومت سے دوسری حکومت کا بیان نئی فصل میں کیا جاتا ہے تو اس فصل کے شروع میں تاریخی مباحث پر فلسفیانہ تمہید بطور مقدمہ ہوتی ہے۔ اس تالیف کی دیگر خصوصیات میں حق گوئی،

اصابت رائے اور کسی نتیجہ کے متعلق فیصلہ کرنے میں انصاف قابل ذکر ہیں۔
مگر اس شخص کی فضیلت و شہرت کا باعث ان میں سے صرف پہلی کتاب ہی ہے جو مقدمہ کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں اس نے اجتماعیات، اقتصادیات اور فلسفۂ تاریخ کے متعلق بالکل نئی اور متنوع بحثیں کی ہیں، نیز اپنی عظیم زندگی اور متعدد سیاحتوں میں اس نے جو کچھ پڑھا اور مشاہدہ کیا اس سے اسباب و علل کا استنباط کیا ہے۔ یہ مقدمہ چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔ (۱) ابتدائے آفرینش اور ارتقاء (۲) اجتماعیات (۳) عملی سیاست (۴) امور حرب (۵) اقتصادسیاسی (۶) تاریخ ادب عربی۔ یہ کتاب اپنے رواں اور دل ربا اسلوب کے علاوہ علم و ادب کا ایک عظیم خزانہ ہے۔
گمان غالب یہ ہے کہ ابن خلدون پہلا شخص ہے جس نے فلسفۂ تاریخ کا استنباط کیا اور اسے دو مخلوق میں فطرت عمران" کے نام سے یاد کیا۔ اپنے مقدمہ میں اس نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے اس پر صحیح تاریخی واقعات و حوادث سے شہادتیں پیش کی ہیں۔ جس سے اس کی اصابت رائے، صدق نظر، وسعت معلومات، اور استنباط و تعلیل میں حیرت انگیز قدرت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علماء نے اس کی تاریخ میں کچھ ایسی خامیاں نکالی ہیں جن میں وہ خود اپنے اصول و قواعد سے انحراف کرتا ہے اور وہی غلطیاں کرتا ہے جن پر وہ خود دوسروں پر اعتراض کرتا ہے، لیکن بے عیب اور کامل ذات تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

سیدہ عائشہ باعونیہ

(وفات ۹۲۲ھ)

حالات زندگی: یہ فاضلہ اور عابدہ و زاہدہ خاتون سیدہ عائشہ بنت یوسف بن احمد باعونی ہے۔ شام کے شہر صالحیہ میں ایک علم و تقوی مآب خاندان پیدا ہوئی۔ اس کا باپ، چچا، بیٹا، اور بھائی فقہ و حدیث، تصوف و تاریخ و ادب میں باکمال علماء تھے۔ یہ تھا وہ ماحول جس نے اسے سرچشمہ علم سے سیراب کر دیا۔ پھر اس نے جمال الحق والدین اسماعیل حورانی اور محی الدین ارموی جیسے اپنے ہم عصر علماء کی جماعت سے فقہ و نحو و عروض میں کمال حاصل کیا، بعد ازاں مصر پہنچی اور وہاں شارح بخاری علامہ ابو العباس قسطلانی کی شاگردی کی۔ پھر تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئی اور بہت سے طلبہ نے اس کے علم و فضل سے استفادہ کیا۔

تصانیف: اس نے کتاب الفتح المبین فی مدح الامین لکھی جو علم بدیع میں، ابن حجہ کے اسلوب پر اس کے قصیدے کی شرح ہے۔ دوسری کتاب فیض الفضل ہے، جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہے ہوئے قصائد کا دیوان ہے۔ اس کی ایک کتاب المواد الاہنیٰ فی المولد الاسنیٰ، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرۂ میلاد پر ہے جس میں رقت انگیز نظم و نثر ہے۔

شاعری و نثر نگاری میں اس کا مقام: اس تاریک دور میں باعونیہ جیسی فاضل خاتون کو دیکھ کر جو اپنے علم و ادب میں مردوں سے بھی بازی لے گئی تھی، انسان حیرت میں رہ جاتا ہے، اس کے اسلوب میں یہ کوئی عیب نہیں کہ اس میں سجع بندی، بدیع پسندی اور لفظ آرائی ہے یا یہ کہ اس نے اپنی شاعری کو محض مدح نبوی میں محدود رکھا اس لیے کہ انسان اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے اور صحیح شاعری اپنے کہنے والے کا آئینہ، اور اس کے دل کی تصویر ہوتی ہے، یہ ہمیں معلوم ہی ہے کہ اس دور کے شعراء کس طرح لفظی صنعت کے دلدادہ، اور دینی موضوعات کی طرف متوجہ تھے، لہذا اگر اس خاتون نے اپنے زمانہ کے اخلاق و آداب کو اپنا کر اپنی نثر نگاری اور شاعری میں اسی دور کا اسلوب اختیار کر لیا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔

نمونۂ کلام:۔ اپنے قصیدۂ علم بدیع کی شرح کے مقدمہ میں وہ لکھتی ہے:۔

"یہ ایک برقع پوش عورت کا کہا ہوا قصیدہ ہے، جو سلامت طبع پر شاہد، اور حسن بیان سے آراستہ ہے۔ اس کی بنیاد خدا ترسی اور اس کی رضا جوئی پر رکھی گئی ہے۔ اس میں انواع بدیع کو کھول کر بتایا گیا ہے۔ مدح رسول حبیب و شفیع نے اسے سربلندی بخشی ہے۔ یہ تسمیۂ انواع کی قیود سے آزاد، اور افق ابداع میں اس کا طالع روشن ہے۔ قصائد مدح نبی ﷺ میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے اور بموجب الہام جو اہل اشارات کے لیے سند ہے۔ اس کا نام "الفتح المبین فی مدح الامین" رکھا جا رہا ہے"۔

اس قصیدہ کا مطلع ہے:۔

فی حسن مطلع انوار بذای سلم — اصبحت فی زمرۃ العشاق کالعلم

اقول والدمع جار جارح مقلی — والجار جار بعذل فیہ متھم

اس قصیدہ کے دیگر اشعار:۔

یا سعد ان ابصرت عیناک کاظمۃ — وجئت سلعاً فسل عن اھلہ القدم

فثم اقمار تم طالعین علی — طویلع حیھم و انزل بحیھم

اے سعد! اگر تو کاظمہ دیکھے اور سلع پہنچے تو اس کے قدیم باشندوں سے پوچھنا۔
وہاں چودھویں کے چاند ہیں انہیں سلام کہنا اور ان کے قبیلہ میں اترنا۔

دیگر:-

واستوطنوا السرمني فهو موضعهم ۔۔ ولا ابوح به يومًا لغيرهم

انہوں نے میرے راز کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو وہ ان کی جگہ ہے۔ اور میں کبھی ان کے سوا کسی پر اپنا راز آشکارا نہیں کروں گی۔

قالوا هو الغيث، قلت الغيث اونة ۔۔ يهمي، وغيث نداه لايزال همي

انہوں نے کہا "وہ بارش ہے"، میں نے کہا کہ بارش تو کبھی کبھار مسلسل موسلا دھار برستی ہے لیکن اس کی بخششوں کی بارش تو متواتر موسلا دھار برستی رہتی ہے۔

مداحت مجدك والاخلاص ملتزمي ۔۔ فيه وحسن امتداحي نيك مختتمي

میں نے خلوص کے ساتھ تیری عظمت کی مدح کی، اور میری نہایت یہی ہے کہ میں تیری اچھی مدح کرتی رہوں۔

ظاہر برقوق نے (نہر) شریعت پر پل بنایا تو اس نے کہا:-

بنى سلطاننا برقوق جسراً ۔۔ بامر والأنام له مطيعه

مجاز في الحقيقة للبرايا ۔۔ وامر بالمرور على الشريعه

ہمارے بادشاہ برقوق نے اپنے حکم سے پل بنایا ہے اور تمام مخلوق اس کی فرمانبردار ہے۔ یہ درحقیقت لوگوں کے لیے مجاز (گذرنے کی جگہ) ہے اور شریعت پر چلنے کا حکم ہے۔

دمشق کے وصف میں وہ کہتی:-

نزه الطرف في دمشق ففيها ۔۔ كل ما تشتهي وما تختار

هي في الأرض جنة فتأمل ۔۔ كيف تجري من تحتها الأنهار

كم سما في ربوعها كل قصر ۔۔ اشرقت من وجوهه الأقمار

وتناغيك بينها صادحات ۔۔ خرست عند نطقها الاوتار

كلها روضة وماء زلال ۔۔ وقصور مشيدة وديار

نگاہ کو دمشق میں سیر کراؤ کہ وہاں تمام وہ چیزیں ہیں جن کو چاہا اور پسند کیا جاتا ہے، یہ علاقہ زمین کی جنت ہے، بغور دیکھو اس کے نیچے نہریں کس حسین انداز سے بہہ رہی ہیں۔ اس کی سرزمین میں کتنے ہی ایسے محل ہیں جن سے چاند کسب ضیا کرتا ہے، وہاں کتنے ہی ایسے خوش الحان پرندے ہیں جن کی مست کرنے والی آوازوں کے سامنے آلات موسیقی ہیچ ہیں۔ وہ تمام علاقہ باغات، آب زلال، بلند محلات اور خوشنما مکانوں سے بھرا پڑا ہے۔

پانچواں باب

دورِ جدید

ظالم زمانہ عربی ممالک کے وسیع رقبہ کو مسلسل یکے بعد دیگرے کاٹ کر کم کرتا رہا تاآنکہ اٹھارویں صدی کے آخر میں اس وسیع علاقہ میں سے صرف عراق عرب، شام، بلاد عرب، مصر، سوڈان اور مغرب باقی رہ گئے اور ان علاقوں میں بھی عربی زبان نہایت بے سرسامانی اور کمزوری کے عالم میں آخری سانسیں لے رہی تھی، تاآنکہ اللہ تعالیٰ نے آفتاب تمدن کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ وادی نیل پر آب و تاب سے طلوع ہو جائے، اس طرح یہاں سے کمزوری دور ہوئی اور اس کی جگہ زندگی کی لہر دوڑنے لگی۔ یہ آفتاب تمدن اور یہ روح حیات مصر میں نمودار ہوئی، وہیں اس نے تقویت حاصل کی اور پھر وہاں سے دیگر مقامات میں پھیلی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب وہ زمانہ تھا جب مصر حکماً عثمانیوں کے اور عملاً خاندان غلاماں کے زیر اقتدار تھا۔ مختلف افکار و خیالات، باہم دگر ٹکرانے والی قوتیں اور ایک دوسری سے مخالف قوتیں، اس مصیبت زدہ قوم کے ڈھانچہ کو گھن کی طرح کھا رہی تھیں۔ اس کی تعداد تیس لاکھ بھی نہ تھی، ناخواندگی اس میں عام اور جہالت کی اس پر فرمانروائی تھی۔ قحط اور وبائیں اسے مارے ڈال رہی تھیں اور یہ ظلم کے پنجے میں دبی ہوئی اور حاکموں کی غلام بنی ہوئی تھی۔ یہ دردناک حالت تھی کہ زمانہ حرکت میں آیا اور نپولین نے حملہ کر دیا۔

۱۷۹۸ء میں مصر پر نپولین نے حملہ کیا، یہاں اس حملہ کے صرف ادبی پہلو پر بحث کریں گے، اس عظیم القدر فاتح کے ساتھ جو علمی جماعت آئی تھی اس نے باوجود جنگوں اور دیگر ہنگاموں کے بہرصورت مصر میں تمدن کے بیج بو ہی دیے۔ انہوں نے دو مدرسے بنائے، دو رسالے[1]، ایک تھیٹر اداکاری کے لیے، ایک اکادمی علمی تحقیقات کے لیے، ایک کتب خانہ، ایک پریس متعدد کیمیاوی معمل اور رصد گاہیں بنائیں اور لوگوں کے لیے ان سے استفادہ کی راہیں آسان کر دیں۔ الغرض اس جماعت نے تقریباً وہی کام کیا جو تاریکی میں روشنی کا دیا کر سکتا ہے، چنانچہ مصری افق سے تاریکی کے بادل چھٹ گئے اور لوگ اس قابل ہوئے کہ وہ کچھ دیکھ سکیں۔ لیکن انہوں نے کیا دیکھا؟ دیکھا یہ کہ وہ انیسویں صدی میں ہیں اور یورپ ان کے سامنے ایسے کھڑا ہے جیسے ایک بے زبان جانور کے سامنے عقلمند انسان، جو انہیں باندازِ تمسخر دیکھ رہا ہے اور زندگی کے صحیح راستہ پر مادہ کو مسخر کرتا چلا جا رہا ہے جسے دیکھ کر وہ دہشت زدہ

---

[1] یہ دو رسالے "الاعشور المصری" اور "بریدِ مصر" ہیں، اول الذکر الاعشور اس لیے کہلاتا تھا کہ وہ ہفتہ وار تھا اور ہفتہ فرانسیسی جمہوری جنتری کی اصلاح میں دس دن کا ہوتا تھا۔

اور مبہوت رہ گئے۔

لیکن ایک شخصیت تھی جو دہشت زدہ نہ ہوئی اور وہ تھی مصری قوم کے نجات دہندہ کی شخصیت، خاندان خدیویہ کا سردار (محمد علی پاشا)، جو تاڑ گیا تھا کہ مغرب میں تہذیب و تمدن نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ علم کی بنا پر ہے۔ چنانچہ اس نے مصر میں جہاں تعلیم یافتہ شخص عنقا تھا تعلیم کو عام کرنے کی جد و جہد کی۔ شہروں اور بستیوں میں مختلف مقاصد کے تحت مدرسے جاری کیے اور لوگوں کو جبراً وہاں تعلیم دی۔ انھوں نے فرانس کے علماء کی ایک جماعت کو تعلیم و تصنیف کے لیے بلایا جس میں ڈاکٹر کلوٹ بک طبیہ کالج کے مؤسس اور گومارک مصری مشن کے مہتمم، جیسے فاضل تھے۔ ان تعلیم گاہوں سے فارغ التحصیل طلبہ کو مزید تحقیقات و استفادۂ علمی کے لیے فرانسیسی تعلیم گاہوں میں بھیجا گیا۔ جب یہ طلبہ (جن کی تعداد چوالیس تھی) تعلیم کے بعد اپنے وطن واپس آئے تو انھوں نے تراجم و تعلیم کے کام کرنے شروع کر دیے۔ پھر تعلیمی وفود یورپ پہنچتے رہے اور یہ تمام وفود ازہر شریف ہی کے طلبہ پر مشتمل ہوتے، یہ اس عظیم المرتبت درس گاہ کا عربی زبان پر ایک احسان ہے جس نے عربی کو ترقی دینے میں بڑی مدد پہنچائی، جس طرح پہلے اس درس گاہ کا ایک احسان وہ تھا کہ اس نے عربی زبان کو ختم ہونے سے بچایا تھا۔ اس کے بعد قاہرہ میں غیر ملکی زبانیں سکھانے اور ترجمہ کرانے کے مراکز کھلے، پرانے المطبعۃ الاہلیہ کے بلیے پر (جو فرانسیسی اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کے جانے کے بعد ختم ہو گیا تھا) المطبعۃ المصریۃ کی عمارت رکھی گئی۔ الوقائع المصریہ نکالا گیا، جو تمام مشرق میں پہلا عربی اخبار تھا، اور یہ سب کچھ اس چنگاری کی آگ تھی جو نپولین مصر میں لایا تھا اور جس میں محمد علی پاشا نے ایندھن ڈال کر، پھونکیں مار کر، اس کی آگ کو بھڑکایا اور پھیلایا تھا، حتیٰ کہ شام اور تمام بلاد عربیہ تک اس کے شعلے پہنچ رہے تھے۔ جس سے سوتے جاگ اُٹھے تھے اور تاریکی چھٹ گئی تھی۔ مصر میں جو خدمت محمد علی پاشا انجام دے رہے تھے شام میں وہی خدمت امیر بشیر شہابی انجام دے رہے تھے جہاں ان کی مدد امریکی اور فرانسیسی عیسائی مبلغین مدرسے اور پریس بنا کر کتابیں تالیف کر کے، رسائل جاری کر کے، اداکاری سکھا کر، کر رہے تھے، اور ان تمام کوششوں میں وہ عربی زبان کو استعمال کرتے اور اسے ترقی دے رہے تھے۔ اس طرح ان کے اداروں سے اہل شام کی ایک معتد بہ جماعت انشاء پردازی، شاعری، صحافت نگاری اور ترجمہ میں مہارت حاصل کر گئی۔ پھر یہ دونوں علاقے دوش بدوش کھڑے ہو کر عربی زبان اور علوم عربیہ کے احیاء کی کوششیں کرتے رہے۔ چنانچہ علوم و سائنس کی بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ عربی تالیفات شائع ہوئیں اور زبان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن ابھی تک لسانیات و ادب کا معاملہ کس مپرسی کے عالم میں تھا، اس لیے کہ امیر کبیر صرف انہی علوم کی طرف توجہ دے رہا تھا جن کی اسے ضرورت تھی مثلاً جنگی، طبی، صنعتی اور ریاضی علوم۔ ان علوم کے

اظہار کے لیے وہ عامیانہ زبان اور اصطلاحی اسلوب ہی پر قناعت کرتا تھا۔ زبان کی صحت کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس امیر اور اس کے جانشینوں کے عہد میں دفاتر کی زبان ترکی و عربی زبانوں کا مبہم سا مرکب بنی ہوئی تھی۔

بایں ہمہ اس زمانہ میں بھی زبان عربی کے مخلص معاونین ناپید نہ تھے۔ بلکہ شیخ حسن عطار، بطرس کرامہ، سید علی درویش، رفاعہ بک طہطاوی جیسے علماء و ادباء موجود تھے جو عربی زبان کی حفاظت و سالمیت، اور اس کے اسلوب بیان میں جدت کے لیے کوشاں تھے۔

یہ مبارک تحریک آہستہ آہستہ برابر ترقی کرتی رہی تاآنکہ عباس اور پھر سعید کا دور حکومت آیا اور یہ تحریک ماند پڑ گئی، اس لیے کہ انہیں علم و تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

لیکن جب اسمعیل پاشا ۱۸۶۳ء میں تخت خدیویہ پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے جتنے مدارس بند ہو چکے تھے صرف انہیں کھولا ہی نہیں، بلکہ ان میں اضافے بھی کیے۔ اس نے علوم و آداب انجینیرنگ، طب اور فوجی تربیت کے ادارے قائم کیے۔ تعلیمی وفود دوبارہ یورپ بھیجنے شروع کیے۔ اور تعلیم کے لیے ایک جداگانہ محکمۂ تعلیمات کی بنا رکھی۔ کتب خانہ خدیویہ کھولا۔ اساتذہ کی تربیت کے لیے ایک مدرسہ بنایا۔ مؤلفین و مصنفین کی حوصلہ افزائی کی۔ ملک میں امن و امان کا دور دورہ ہوا تو غیر ممالک کے لوگ بھی تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لیے آئے۔ جن میں علماء و ادباء بھی تھے۔ ان لوگوں کا مصریوں سے اختلاط، نیز چھاپہ خانوں کی کثرت[1] مدرسوں کی فراوانی، صحافت کی توسیع، ڈراموں کی اداکاری، علوم کے تراجم، ادبی

---

[1] **پریس اور چھپائی**:۔ ٹائپ کے حروف کے ذریعہ طباعت کی ایجاد پندرھویں صدی کے اوائل میں جرمن کے شخص گوٹمبرگ نے کی۔ اُس کی اس ایجاد نے ادب و تمدن پر بڑا اثر ڈالا، ابھی اس ایجاد نے پوری طرح یورپ میں شہرت بھی نہ حاصل کی تھی کہ مشرقی زبانوں کے ٹائپ ڈھالے جانے لگے۔ اور ۱۵۱۴ء میں عربی زبان کی پہلی کتاب ٹائپ میں چھپ گئی۔ اس کے بعد مشرقی زبانوں، بالخصوص عربی زبان میں ٹائپ کی کتابیں رفتہ رفتہ زیادہ ہونے لگیں جو یورپ کے بڑے بڑے شہروں سے چھپتی تھیں۔ ان مطبوعات میں جلیل القدر کتابیں تھیں مثلاً عہد نامہ قدیم و جدید اور لیسی کی نزہۃ المشتاق، ابن سینا کا قانون اور تحریر اصول اقلیدس، اور اس کے بعد سے اب تک وہاں سے نادر قلمی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ پھر ایک یہودی عالم کی وساطت سے طباعت کا سلسلہ ۱۴۹۰ء میں مشرق میں آستانہ کی راہ سے آیا۔ اس یہودی عالم نے بہت سی دینی اور علمی کتابیں یہاں چھپوائیں، لیکن عربی ٹائپ یہاں ۱۷۲۸ء ہی میں نمودار ہوا۔ آستانہ کے مشہور عربی مطبعوں میں احمد فارس شدیاق کا "مطبعۃ الجوائب" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس مطبع میں بہت سی گراں قدر علمی کتب شائع ہوئی ہیں، لیکن ممالک عربیہ میں سب سے پہلے پریس استعمال کرنے کا شرف مسیحی مبلغوں کے کرم سے ملک شام کو (باقی حاشیہ صفحہ ۵۱۹ پر)

مجالس اور علمی اداروں (اکادمیوں) کا قیام[۵] غیر ملکی زبانوں کی تعلیم، یورپی تہذیب کی آمد اور شخصی آزادی کا تعارف، یہ تمام وہ اسباب ہیں جنہوں نے طبیعتوں کو افکار و علوم سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱۸ کا) حاصل ہوا۔ لگایا، پھر ۱۸۴۸ء میں مطبعہ کاثولیکیہ کی بنا رکھی گئی جسے قدیم قلمی اور علمی وادبی قلمی کتب کے شائع کرنے اور عمدہ عربی چھاپنے میں بڑی فضیلت و برتری حاصل ہے۔ پھر مصر کی باری آتی ہے، جہاں نپولین کے ذریعہ ۱۷۹۸ء میں طباعت کا سلسلہ جاری ہوا۔ نپولین یہاں اپنے فرامین و احکامات شائع کرنے کے لیے پریس لایا تھا اس کا نام اس نے "المطبعۃ الاہلیۃ" رکھا تھا۔ یہ اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ اسی مطبعہ کے ملبے پر محمد علی پاشا نے ۱۸۲۱ء میں مطبعہ بولاق کی عمارت اٹھائی اور اس مطبعہ کا نظم ونسق نقولا مسابکی شامی کے حوالہ کر دیا۔ یہاں ٹائپ کے حروف مختلف پائنٹ میں خط نسخ کے حسین طرز پر ڈھالے گئے۔ پھر دوبارہ مصر کے مشہور خوشنویس مرحوم جعفر بک کے طریقہ کے مطابق یہ حروف ڈھالے گئے۔ اور یہی ٹائپ آج کل استعمال ہو رہا ہے۔ مسبعہ بولاق اس وقت دنیا کا سب سے بڑا عربی پریس ہے جس میں بڑی تعداد میں علمی ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد مصر میں مطابع عام ہو گئے جن سے علم و ادب کے پھیلنے میں بڑی مدد ملی۔

[۵] تاریخ میں یہ بات نہایت فخر سے بیان کی جائے گی کہ عربی اقوام میں باوجود تنگ حالی و غلامی کے ہمارے شامی بھائیوں نے سب سے پہلے علمی تحقیقی اداروں (اکادمیوں) کی بنا ڈالی، جس طرح انہوں نے ترجمہ وصحافت و اداکاری میں پہل کی۔ چنانچہ ۸ جون ۱۹۱۹ء میں شامی قوم کی حکومت فرانس کے تحت آنے کے بعد علامہ محمد بک کرد علی، شام کی ادبی تحریک کے قائد، وزیر تعلیمات عامہ، اور مجمع علماء کے صدر، کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے دمشق میں "المجمع العلمی" کی تاسیس ہوئی۔ اس کے اغراض و مقاصد میں "وہ تمام مسائل شامل ہیں جو عربی ادب کو ترقی دینے سے متعلق ہیں، نیز ماہر فن مطالعہ کرنے والوں کے لیے اصول بحث و مطالعہ کی تلقین کی۔ المجمع العلمی نے نئی علمی اصطلاحات بنانے پر بھی توجہ دی ہے۔ اس نے بعض انتظامی امور کی بھی اصلاح کی ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا دفاتر کی زبان کو بھی درست کیا ہے۔ اس نے ادیبوں، شاعروں اور مقرروں کی بعض اغلاط کی بھی تصحیح کی ہے علاوہ ازیں اس نے متعدد مولفوں اور مترجموں کی کاوشوں میں بھی ان کی مدد کی ہے ..." (دیکھئے المجمع العلمی کی چوتھی رپورٹ) اس ادارہ کے اراکین میں شام و عراق و مصر کے ممتاز علماء نیز یورپ کے مستشرقین شامل ہیں۔ اپنے علمی افادات، تحقیقی خطبات اور مفید مقالات شائع کرنے کے لیے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا ہے۔

۲۔ قاہرہ کا مجمع اللغۃ العربیۃ الملکی

۱۴ شعبان ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۳۲ء کو قاہرہ میں وزارت تعلیمات عامہ (باقی صفحہ ۵۲۰ پر)

مالا مال کیا، زبان کو ترقی دی۔ اور علوم و آداب کو زندگی بخشی۔
پھر ۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، یہ وہ وقت تھا جب ہر چیز اُٹھنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱۹ کا) کے ماتحت ایک مجمع اللغۃ العربیۃ الملکی کے بنانے کا شاہی فرمان صادر ہوا۔ اس کے اغراض و مقاصد میں (۱) زبان عربی کی سالمیت کی حفاظت کرنا اور اسے علوم و فنون کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کے مطابق پورا بنانا، عصر حاضر کی عمومی ضروریات زندگی سے ہم آہنگ کرنا۔ اس سلسلہ میں لغات، خصوصی تفاسیر یا دیگر ذرائع سے ان الفاظ و تراکیب کی نشاندھی کرنا جن کا استعمال یا ترک استعمال ضروری ہے (۲) عربی زبان کی تاریخی لغت تیار کرنا (۳) مصر اور دیگر ممالک عربیہ کے جدید عربی لہجوں اور بولیوں کا باقاعدہ علمی مطالعہ کرنا (۴) تمام امور و مسائل پر غور و خوض کرنا جن کا تعلق عربی زبان کی ترقی سے ہو بشرطیکہ اس بارے میں وزیر تعلیمات عمومی سے اجازت حاصل کر لی گئی ہو" اس ادارہ کی "مجلس عاملہ بیس اراکین پر مشتمل ہے، جو بغیر کسی قومیت کی قید کے دنیا کے مشہور و معروف عربی علماء میں سے چنے جاتے ہیں یا ان محققین میں سے جو اس زبان اور اس کی متفرق بولیوں اور لہجوں پر تحقیق کرتے ہیں" اس زمانہ میں اس کے دس ارکان مصری ہیں، پانچ مستشرق، تین شامی اور لبنانی، ایک عراقی اور ایک بلاد مغرب کا۔

۳۔ صحافت

رسائل و اخبارات وہ چلتے پھرتے مدارس ہیں جو عمارتوں کی حدود اربعہ سے آزاد، اور کسی علاقہ کی قید سے بالاتر ہوتے ہیں۔ تعلیم و تربیت، اصلاح و تبلیغ میں ان کا سب سے زیادہ اثر، اور ان کا حلقہ وسیع تر ہوتا ہے۔ ان کے ذریعہ عوام تہذیب سے آشنا ہوتے ہیں۔ خواص کی فکریں منظم و مرتب ہوتی ہیں۔ پس ہمتوں میں بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ بگڑی ہوئی زبانیں سدھر جاتی ہیں۔ دور دراز رہنے والی قومیں ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ واقعات و حوادث کے محفوظ ریکارڈ ہوتے ہیں۔ انہی سے تاریخ مرتب کی جاتی ہے اور یہی تقویم بنتے ہیں پورے مشرق میں سب سے پہلا عربی اخبار "الوقائع المصریۃ" تھا جسے ۱۸۲۸ء میں محمد علی پاشا نے پروفیسر رفاعہ بک طہطاوی کی مدد سے جاری کیا تھا۔ ابتداءً وہ ترکی اور عربی زبانوں میں نکلتا رہا پھر صرف عربی زبان میں نکلنے لگا۔ اس کی ادارت کے فرائض شیخ حسن عطار، سید شہاب، امام محمد عبدہ، شیخ عبدالکریم سلمان اور سعد پاشا زغلول جیسے ممتاز اہل قلم انجام دیتے رہے، اور یہ قاہرہ سے مسلسل ہفتہ میں تین مرتبہ نکلتا رہتا ہے۔ پھر ۱۸۵۵ء میں شام سے "مرآۃ الاحوال" کے نام سے ایک اخبار جاری ہوا جو سیاسی تھا جس کی ادارت رزق اللہ حسون حلبی کرتے تھے۔ اور دوسرا "حدیقۃ الاخبار" خلیل الخوری کی زیر ادارت ۱۸۵۸ء میں نکلا۔ پھر ۱۸۶۱ء میں آستانہ سے احمد فارس شدیاق نے (باقی صفحہ ۵۲۱ پر)

اور اُبھرنے، بڑھنے اور ترقی کرنے پر مائل تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جلتی آگ پر پانی ڈال دیا گیا ہو یا پانی کے تیز دھارے کے سامنے بند باندھ دیا گیا ہو۔ اسمعیل پاشا کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲۰ کا) "الجوائب" نکالا اور ۱۸۶۱ء میں تونس سے "الرائد التونسی" جاری ہوا۔ پھر عہد اسماعیل پاشا میں ابوالسعود آفندی نے ۱۸۶۶ء میں پہلا سیاسی اخبار مصر سے نکالا جس کا نام وادی النیل" رکھا۔ یہ قاہرہ سے ہفتہ میں دو بار نکلتا تھا۔ بعد ازاں ۱۸۷۰ء میں متعدد علمی و ادبی ماہرین کی جماعت کے زیر نگرانی ایک علمی ادبی رسالہ "روضۃ المدارس المصریہ" نکلا۔ اس کے بعد ۱۸۷۶ء میں "الاہرام" نکلا جو فرانسیسی اور عثمانی سیاست کا مرکب تھا اور جنگ عظیم کے بعد وہ مصری ہو گیا۔ ۱۸۷۷ء میں "الوطن" فرقہ وارانہ اقتدار پرست پرچہ نکلا اور اسی کے طرز پر "جریدۃ مصر" اور ۱۸۸۰ء میں ادیب اسحٰق کی زیر ادارت "المحروسۃ" نکلے۔ انگریزوں کے قبضہ کے بعد ۱۸۸۸ء میں "المقیم" نکلا یہ بھی اقتدار پرست تھا۔ پھر "المؤید" جاری ہوا جو اسلامی خدیوی تھا۔ اور پھر "اللواء" جو اسلامی وطنی تھا۔ اور پھر یکے بعد دیگرے "الجریدہ، الشعب، السیاسۃ، البلاغ، الجہاد اور کوکب الشرق" نکلے۔ یہ سب سے زیادہ شائع ہونے والے اہم سیاسی روزنامے تھے جو تمام کے تمام قاہرہ سے نکلتے تھے اور ان میں سے بیشتر اب بند ہو چکے ہیں۔ کچھ "الرسالۃ، المصور اور اللطائف" کی طرح ہفتہ وار اور "المقتطف، الہلال (مصر سے) اور مجلۃ المجمع العلمی (دمشق سے)" ماہنامے بھی نکلے۔

ان اخبارات و رسائل کی پالیسی، ادارت، اسلوب تحریر، اور تاثیر کے متعلق کچھ بحث کرنا ہمیں تطویل میں ڈال دے گا۔ تاہم اعتراف فضیلت کے طور پر ہم یہ ضرور بتاتے ہیں کہ صحافت و انشاء اور ترجمہ کے باب میں برتری شام ہی کو حاصل ہے اس لیے کہ شامی ہی سب سے پہلے مغربی اقوام سے گھلے ملے اور انھوں نے ہی پہلے یورپ کی زبانیں سیکھیں۔

۴۔ اداکاری (تمثیل)

لفظ تمثیل اپنے نئے معنوں (یعنی اداکاری) میں پچھلی صدی کے وسط سے پہلے عربی زبان میں غیر متعارف تھا۔ مشرق میں سب سے پہلے اس فن کو شامیوں نے سیکھا۔ اس لیے کہ وہ غیر ملکی تعلیم گاہوں سے فارغ التحصیل ہوئے تھے اور یورپ کے ادب کا مطالعہ کر چکے تھے۔ ان میں سب سے پہلے جس نے اداکاری (ایکٹنگ) کی وہ مارون نقاش (متوفی ۱۸۵۵ء) ہے۔ اس نے پہلا عربی ڈرامہ ۱۸۴۸ء میں پیش کیا، جب اسماعیل پاشا تخت نشین ہوا تو اس نے ادیبوں، عالموں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی اور مدد کی۔ پھر جب اس کے زمانہ میں نہر سویز کی کھدائی کا کام مکمل ہوا تو اس نے اس کی افتتاحی تقریب میں شاندار اور مشہور جشن منایا۔ نیز اپنے یورپین مہمانوں کی خاطر، مصر کی اقامت کے دوران میں، انھیں ڈرامے دکھانے کا انتظام بھی کیا، چنانچہ اس نے (باقی حاشیہ صفحہ ۵۲۲ پر)

دور کے آخر تک علمی تحریک وسیع حلقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ مدارس بڑی تعداد میں موجود تھے۔ عربی زبان ذریعہ تعلیم تھی اور اسی زبان میں کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ لیکن جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو انہوں نے ترقی کی راہیں بند کرنا شروع کر دیں۔ تعلیم کا رخ پلٹ دیا۔ بیرونی ممالک میں تعلیمی وفود بھیجنے روک دیے۔ مختلف زبانیں سکھانے والے ادارے ختم کر دیے۔ مفت تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور عربی زبان کو بے کسی کے عالم میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ انہوں نے تمام تعلیم انگریزی کے ذریعہ لازمی کر دی، اور پھر تعلیم کا مقصد صرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲۱ کا) خدیوی تمثیل خانہ (اوپیرا ہاؤس) کی بنیاد ڈالی، اور اس میں کھیل دکھانے کے لیے یورپین ایکٹروں کی ایک جماعت کو دعوت دی جس نے "عایدہ" نامی پہلا ڈرامہ فرانسیسی میں دکھایا۔ اس کے بعد ہی مصر میں شامی ادیبوں کی ایک جماعت آئی جن میں سلیم نقاش، ادیب اسحق تھے۔ اس جماعت نے ۱۸۷۶ء میں سکندریہ کے زیزینا تھیٹر میں متعدد ڈرامے پیش کیے لیکن اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور وہ واپس چلی گئی۔ ان کے بعد یوسف خیاط اپنی جماعت کے ساتھ مصر آیا اور یہاں پہنچ کر وہ اسماعیل پاشا سے ملا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لیے تمثیل خانہ کھول دیا۔ جہاں اس نے اپنا پہلا ڈرامہ "بڑا ظالم" پیش کیا، جس کے بارے میں اسماعیل پاشا کو یہ خیال ہو گیا کہ اس کہانی میں اس کے کردار کا مذاق اُڑایا گیا ہے، لہٰذا اس نے اس جماعت کو اپنے ملک سے نکال کر اس کے وطن میں اسے واپس بھیج دیا۔ پھر یہ تمثیل خانہ عربی ڈراموں کے لیے بند رہا تاآنکہ سلیمان قرداحی اور اس کے ساتھی شیخ سلامہ حجازی کی جماعت آئی۔

اس گذشتہ مدت میں فن تمثیل قومی نہیں تھا بلکہ وہ چند سرمایہ داروں اور حکومت کی ملکیت تھا جس سے امراء و حکام ہی متمتع ہوتے تھے۔ لیکن جب اسکندر فرح نے شارع عبدالعزیز میں اپنا تھیٹر بنا کر شیخ سلامہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تو یہ فن عوام کا ہو گیا۔ اس وقت تک یہ فن ناپختہ اور بے قاعدہ تھا۔ اس کا تمام تر دار و مدار گانوں اور ہنسی مذاق پر تھا، تاکہ اس طرح عوام کو اپنی طرف مائل کیا جائے اور انہیں خوش رکھا جائے۔ ڈراموں کی زبان بھی ناقص و عامیانہ اور مسجع سی ہوتی تھی۔ سب سے پہلے اس فن نے ترقی کی طرف جو قدم بڑھایا اس کا سہرا جارج ابیض کی جماعت کے سر ہے جسے خدیو عباس حلمی کی مدد حاصل تھی۔ اس کی جماعت میں چنے ہوئے اداکار تھے جنہیں طویل تجربوں نے پختہ کار بنا دیا تھا۔ مگر یہ جماعت بھی بد انتظامی مال کی کمی، اور عوام کی فنی اداکاری سے بے رغبتی و بد شوقی کی وجہ سے ختم ہو گئی اور یہ فن حوادث و احوال کے مطابق ابھرتا اور ڈوبتا رہا۔ اگرچہ اس کی موجودہ حالت ہر پہلو سے خوش کن اور قابل اطمینان نہیں تاہم وہ کامیاب مستقبل کی بشارت دے رہی ہے۔ خود وزارت تعلیم نے اپنے خرچ پر ایک حکومت کی تمثیلی پارٹی بنانے کا طے کیا ہے جس کی نگرانی مشہور شاعر خلیل بک مطران کریں گے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۴۳ پر)

یہ کر دیا کہ وہ حکومت کے لیے کلرک پیدا کرے نہ کہ قوم کے خادم۔

لیکن مصری قوم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی قوت رکھتی ہے۔ وہ اپنی مدد آپ کرنے کے اصول کو جانتی ہے، لہٰذا وہ اس دور میں جبکہ دنیا ترقی کر رہی ہے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ چنانچہ مصری باشندے اپنے ملک میں اپنی زبان کو غالب کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کا خود بندوبست کر لیا، اس طرح عربی زبان پھر مدارس میں عود کر آئی۔ طلبہ کی جماعتیں پھر یورپ جانے لگیں۔ قومی اور شاہی مدارس کی کثرت ہو گئی۔ ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے خلاف آزادی حاصل کرنے کے لیے قوم نے کامیاب بغاوت کر دی، جس کی گونج تمام عالم عربی میں پھیل گئی۔ اس طرح بیداری میں جو رہی سہی کسر باقی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ مجبور و محکوم عوام نے آزادیِ حکومت، آزادیِ قول، آزادیِ فکر، اور آزادیِ عقیدہ کا مطالبہ کر دیا، حتیٰ کہ ۱۹۲۲ء میں ملنے والے آئین کی رو سے مصر کو اس سلسلہ میں بڑی کامیابی حاصل ہو گئی۔ اس طرح عراق کو بھی آئین اور آزادی حاصل ہو گئی۔ اور شام، لبنان و فلسطین و بلادِ مغرب، بھی اس راستہ کو طے کرنے میں کوشاں ہیں، اور اس طویل تاریک رات کے بعد روشن صبح کے منتظر ہیں۔

ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں اور ہمیں قوی اُمید ہے کہ کامیابی کی گھڑی جلد ہی آ جائے گی اور اللہ اس تحریک میں قوت و برکت عطا فرمائے گا تاکہ یہ اپنے کمال تک پہنچے۔

و اذا رایت من الهلال نموه — ایقنت ان سیصیر بدرًا کاملاً

جب میں ہلال کو بڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بدر کامل بھی بن ہی جائے گا

:٥:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲۲ کا) یقیناً اس پارٹی کو تھیٹر کے ترقی دینے میں بڑی کامیابی ہوگی، حالانکہ اب سینما کے آ جانے سے جمہور نے تھیٹر میں دلچسپی لینا ختم کر دی ہے۔

پہلی فصل

نثر و شاعری

نثر نگاری: اس دور کے آغاز میں سلف کی دو کتابیں مروج تھیں جن میں سے ہر ایک جداگانہ طرز انشاء کی حامل تھی۔ ایک تو مقامات حریری اور دوسری مقدمہ ابن خلدون۔ اول الذکر ظاہری رونق والے، لیکن بے معنی اور مصنوعی اسلوب کی نمائندگی کر رہی تھی اور دوسری پر معنی و محکم فطری اسلوب کی۔ لیکن چونکہ ابھی تک طبیعتوں میں اپج اور جدت طرازی پیدا نہ ہوئی تھی اور عقلیں بحث و تحقیق کے لیے تیار نہیں تھیں، لہذا قدامت پرستی، دقت صنعت، اور مقبولیت کی وجہ سے عوام پر مقامات کے اسلوب کا جادو چل رہا تھا۔ لیکن خواص طبیعت اور مزاج زمانہ سے ہم آہنگی نیز مغربی اسالیب سے مشابہت کی بنا پر ابن خلدون کے اسلوب کو ترجیح دیتے تھے۔ پھر تنقید متواتر اسے اٹھاتی بڑھاتی، اور اسے گراتی مٹاتی رہی تاآنکہ مویلحی کی کتاب عیسے بن ہشام کے آخری صفحہ پر قاضی فاضل کا قلم ٹوٹ گیا اور اب جو بھی اس طرز پر لکھے گا وہ شکستہ ہو گا۔

تاہم قلموں نے مقامات اور اس جیسی تحریروں کے اسلوب سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ابن خلدون کے تقلید اور اسی میں محدود رہنے پر اکتفا نہ کی، بلکہ وہ آگے بڑھ کر جاحظ، ابن مقفع اور امام علی رض کے اسالیب تک پہنچے۔ پھر جب انشاء پردازوں نے یورپ کے ادب کا مطالعہ کیا تو ان کا رجحان حسین و متین اور سہل و محکم اسلوب کی طرف ہونے لگا۔ اب ان کی انشاء نگاری عمومی مفاد کے لیے ہوتی۔ اس میں الفاظ و معانی دوش بدوش چلتے، اور صرف عندالضرورت ہی سجع یا اطناب ہوتا۔

پھر اس نئے دور میں نئے نئے اسالیب پیدا ہوئے۔ ادباء فقہا، وکلاء اور صحافیوں میں سے ہر ایک نے اپنے لیے جداگانہ طرز انشاء اختیار کیا، اور ان سب کے مقاصد الگ الگ ہو گئے۔ انہوں نے قانون، سیاسیات، اجتماعیات پر لکھا، اور وہ یورپ کی زبانوں سے ترجمہ کیے ہوئے ناول، افسانے اور ڈراموں کے اسالیب کو اپنانے لگے۔

مختصر یہ کہ اس دور کی انشاء پردازی کی تحریک ایک پر امید، باعظمت و درخشاں مستقبل کی خوشخبری دے رہی ہے، اور اس نثر نگاری کے بڑھتے ہوئے زور نے شاعری اور شعراء کو تقریباً دبا دیا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں اس کمزور و پست ہمت انشاء پرداز طبقہ کی طرف بھی اشارہ کرتے چلیں جو اپنی دوں ہمتی اور بے علمی کی وجہ سے صحیح و فصیح انشاء نگاری تو نہ کر سکا۔

لہذا اس نے عامیانہ زبان لکھنا شروع کر دی اور اس کا نام "نیا طرز یا اسلوب جدید" رکھ کر دوسروں کو بھی اسے اختیار کر لینے کی دعوت دینے لگے۔ ان مصنوعی انشاء پردازوں کی کوئی ایسی کوشش نہیں جو ہماری نظر میں قابل احترام و لائق ستائش ہو۔ نہ ہی ان کا کوئی ایسا نپا تلا اور معین طرز نگارش ہے جس پر ہم بحث کر سکتے ہوں۔ بس ان لوگوں کا طرز فکر، اور اسلوب تحریر یہ کہ عجمی اسلوب کو عربی الفاظ کا جامہ پہنا دیا جائے جس میں ہر قسم کی خامیاں، کمزوریاں اور سطحیت ہوتی ہے۔ اس طبقہ کے متعلق ہم بلاتبصرہ و تفصیلات اتنا ہی لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں۔

خطابت (فنِ تقریر) اس دور کے آغاز میں خطابت کا وہی حال تھا جو عہد عباسی کے آخر میں تھا۔ یعنی یہ مساجد و معابد کی چار دیواریوں میں محصور تھی اور صرف ایک جاہل طبقہ اس سے کام لیتا تھا اور وہ بھی اتنا کہ کچھ قدیم قصے اور روایات نقل کر دیے اور بس۔ مگر جب عربی انقلاب رونما ہونے لگا تو اسے بپا کرنے والے لیڈروں کی زبانوں پر سیاسی تقریریں رواں ہونے لگیں۔ ان لیڈروں میں سب سے مشہور سید عبداللہ ندیم اور شیخ محمد عبدہ ہیں۔ پھر بہت سے واعظ، خطیب اور ادیب بھی اس رنگ میں رنگ گئے۔ ہفتہ وار مجلسیں منعقد ہونے لگیں جن میں دینی اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی موضوعات پر تقاریر ہوتیں۔ لیکن اس فن کی دیرینہ بیماری کا ازالہ مشہور وطن پرور لیڈر مصطفےٰ پاشا کامل (متوفی ۱۹۰۸ء) ہی کے عہد میں ہوا۔ ان کی تمام جدوجہد میں ان کا سب سے کارگر ہتھیار بھی فن خطابت تھا۔ فن خطابت ہی ملک کو بیدار کرنے، آزادی کی جدوجہد میں جان ڈالنے اور وطنی تحریک کو تقویت دینے میں ان کی سب سے بڑی معین و مددگار رہی۔ پھر ہمارے نوجوانوں بالخصوص وکیلوں کے طبقہ نے اس طرف توجہ کی اور ان میں سے ایک اچھی خاصی جماعت نے اس فن میں کمال حاصل کر لیا۔ اور ہمارا خیال ہے کہ شاید مشرق نے مرحوم سعد پاشا زغلول سے پہلے کسی عہد میں بھی ایسا جلیل القدر، وسیع العلم، خوش بیان، بلند آواز اور پر زور خطیب نہیں دیکھا ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے اس جدید آئینی حکومت کے دور میں فن خطابت کو ترقی کے بڑے مواقع ملیں گے۔ سیاسی آزادی، مخالف پارٹیوں کے باہمی مقابلے، پارلیمانی بحثیں وہ قومی محرکات ہیں جو خطابت کو نہایت بلند مقام پر پہنچا دیں گے۔ اور اگر یہ محرکات نہ ہوتے تو نہ یونان میں ڈیمستھین کا وجود ہوتا، نہ روم میں شیشرون کا، نہ عرب میں حضرت علی رضؓ کا۔

ڈرامہ اور افسانہ نویسی اس فن کے متعلق عربوں کی کاوشوں پر پہلے بحث ہو چکی ہے جہاں ہم نے بتایا ہے کہ اس باب میں عربوں کی کوتاہی کے وہی اسباب ہیں جو طویل قصوں کو نظم نہ کرنے کے ہیں۔ تاہم جب اس نئی تحریک کی پہلی کھیپ تیار ہوئی تو جہاں یورپ کا بہت سا دوسرا ادب در آمد کیا گیا وہاں یورپ کا قصہ نویسی کا فن بھی آ گیا۔ اس فن کو عربی میں لانے کی پہل شامیوں نے کی اس لیے کہ انہوں نے سب سے پہلے

یورپین اقوام سے خلط ملط پیدا کرکے ان کے علوم کی خوشہ چینی کی تھی۔ ان میں فرنسیس مراش حلبی متوفی ۱۸۷۳ء، سلیم بستانی، متوفی ۱۸۸۴ء، جرجی بک زیدان متوفی ۱۹۱۴ء قابل ذکر ہیں۔ پھر مصریوں نے بھی قصہ نویسی میں کچھ حصہ لیا۔ ان تھوڑوں میں سے بہت ہی کم وہ ہیں جنھوں نے اس فن کا حق ادا کیا مثلاً پروفیسر محمد حسین ہیکل نے اپنی کہانی "زینب" میں۔ رہا مقامات تو ان کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، کیونکہ جدید ادب نے آکر لفظی صنعتوں کے لیے قطعاً کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ حریری کی تقلید میں جو آخری کوششیں ہوئیں ان میں شام کے ادیبوں شیخ ناصیف یازجی اور نقولا الترک ہیں۔ مصریوں نے بھی اگرچہ اس طریقہ کو اپنایا لیکن انھوں نے قصہ کو طویل اور موضوع کو متنوع بھی بنایا جیسے "حدیث عیسےٰ بن ہشام" میں محمد بک مویلحی نے، اور "لیالی سطیح" میں حافظ بک ابراہیم نے کیا ہے۔ اس میں انھوں نے طریقہ تو وہی مقامات کا رکھا ہے لیکن تفصیلات سے موضوع کو اتنا طویل کر دیا ہے کہ وہ مقامہ اور ناول کے درمیان ایک چیز بن گئی ہے۔

یہ تو ہوا کہانی اور افسانہ نویسی کا حال۔ رہا ڈرامہ نویسی سو یہ فن ادب عربی میں بالکل اجنبی رہا، جسے کوئی جانتا ہی نہ تھا حتی کہ یورپ کے سفروں اور ان کے قصوں کے تراجم کے ذریعہ ادب عربی کا اس سے تعارف ہوا۔ یورپ کے ادب کا مطالعہ کرنے والوں کی ایک جماعت نے بغیر پوری تیاری کیے نقالی اور تقلید کرتے ہوئے اس موضوع پر طبع آزمائی کرنا شروع کی، لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اب حکومت مصر ڈرامہ نویسوں کو انعامات دے کر اداکاروں کی مدد کر کے اس فن کی ترقی کے لیے راستہ ہموار کر رہی ہے۔ امید ہے کہ ان اقدامات سے تمنائے دلی بر آئے گی، اور خدیو اسماعیل کا لگایا ہوا پودا اپنے شباب پر پہنچے گا۔

شاعری:- علوی امراء نے علوم و فنون کی جس اہتمام سے سرپرستی کی ویسا اہتمام انھوں نے ادب کی ترقی پر نہ کیا۔ چنانچہ شاعری — باوجود کم ہونے کے — زمانہ ماضی کی طرح اسیر تقلید و تابع صنعت رہی۔ پھر خدیو اسماعیل کے عہد میں اسے بھی عوام کی بیداری کی تحریک سے کچھ معمولی سا حصہ ملا۔ چنانچہ اس کے مقرب شعراء و مصاحبین میں سے سید علی ابو النصر[1] اور شیخ علی لیثی[2] جیسوں نے فضا میں شاعری کی گونج پیدا کی۔

---

[1] سید ابو النصر منفلوط میں پیدا ہوئے۔ اسماعیل کے عہد میں چمکے، اس کے دربار میں مرتبہ حاصل کیا۔ اور اس کے انعامات پر گذر بسر کی۔ سفر میں بھی اس کے ساتھ رہتے۔ ۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔ ان کی شاعری کا مجموعہ مصر سے شائع ہو چکا ہے۔

[2] شیخ علی لیثی بڑے سبک روح، خوش مذاق، ملنسار، اور مجلس میں رونق پیدا کرنے والے تھے۔ خدیو اسماعیل نے انھیں بھی اپنا مقرب بنا لیا تھا۔ وہ اس کی محفلوں کے شریک، اس کے شاعر اور رفیق سفر بھی تھے۔ ۱۸۹۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ لیکن افسوس کہ ان کی شاعری کا کوئی مجموعہ تیار نہ ہو سکا۔

لیکن اب ہمارے موجودہ دور میں شاعری کا رخ تیزی سے خودمختاری اور آزادی کی طرف پھر گیا ہے۔ یورپی تہذیب کی اثراندازی، غیر ملکی زبانوں کی تعلیم نیز علمی تحریکوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے شاعری جدید طرز اختیار کر رہی ہے۔ شعراء اب حسن لفظ کے ساتھ معنوی صحت و کمال کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ وہ نفوس میں گھس کر ان کا تجزیہ کرنے، اشخاص کی تحلیل، اشیاء کی تفصیل، اور فطرت سے ہمکلام ہونے میں کوشاں ہیں ان میں سے اکثر قدیم اسالیب و روایات سے الگ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اب ان کے قصیدہ کی ابتداء خارج از موضوع مضامین مثلاً تغزل وتشبیب وغیرہ سے نہیں ہوتی جس کے بعد گریز کرکے اصل موضوع کی طرف آنا پڑتا تھا۔ وہ پورے قصیدہ کو ایک جاندار ہستی کی طرح خیال کرتے ہیں جو ایک معین مقصد کے لیے کہا جاتا اور جس کے تمام اجزاء باہم دگر موزون و ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اختلاف تربیت اور تبدیلی ماحول کی وجہ سے ان شعراء نے شاعری کے قدیم موضوعات مثلاً مدح، فخر ہجاء، مذاق و آوارگی کو چھوڑ کر عوام کی ضرورت کے موضوعات کو اپنا لیا ہے۔ مثلاً ماضی کی مجد و سروری کا مرثیہ، معاشرہ کے موجودہ نقائص و عیوب پر تنقید، خودمختاری و آزادی کا مطالبہ وغیرہ۔ تاہم ابھی ان میں کچھ گڑے مردے اکھیڑنے والے بھی ہیں، جو ان کے کفن اتارتے اور ان کے طریقوں کو اپناتے ہیں یا مجاز و تشبیہ کے ضمن میں ان کی تعبیرات کی تقلید کرتے ہیں۔ حالانکہ اب دنیا بدل چکی ہے اور اس کے تقاضے بھی دگرگوں ہو چکے ہیں۔ بہر حال ایسے لوگوں کو علمی تنقید اور عوامی نفرت و بیزاری ہی راہ راست پر لانے کے لیے مجبور کر سکے گی۔

ہمیں یہ بتاتے ہوئے صدمہ اور افسوس ہوتا ہے کہ اب جبکہ قوم کا ذہن جوش و ولولہ سے معمور ہے ہمارے عصر حاضر کے شعراء پر جمود طاری ہے ان کی طبیعتوں کی جولانی بند ہو گئی ہے حالانکہ موضوعات شعر وافر ہیں۔ قوم کے شعور و احساسات کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اس کے افکار میں انقلاب بپا ہے۔ وہ اپنی جان و مال کی بازی لگا کر آزادی حاصل کرنے کے لیے جہاد کر رہی ہے لیکن یہ ہیں کہ فوج کو بغیر موسیقی کے چھوڑ کر دیواروں تلے بیٹھے انگڑائیاں اور جمائیاں لیتے ہوئے دھوپ کھا رہے ہیں۔ ہاں ایک شاعر بلبل نیل شوقی ہے جو وقتاً فوقتاً اپنے سریلے نغموں سے طبیعتوں کی کدورت دور کرتا اور مردہ دلوں کو زندگی بخشتا ہے۔

۱۹۳۲ء میں جب حافظ اور شوقی کا انتقال ہوا۔ جن کا نام دور آخر کے شعراء میں سرفہرست درج ہے۔ تو ان کی جگہ پُر کرنے کے لیے نوجوان شعراء مسابقت کرنے لگے نتیجۃً مصر میں شاعری کا بازار گرم ہو گیا۔ نئی پود نے اپنے نغموں سے فضا میں چہل پہل کر دی۔ اخبارات و رسائل میں شاعری چمکنے لگی۔ لیکن ان نرم و نازک آوازوں نے ابھی تک کانوں پر قبضہ نہیں جمایا، نہ قوم کی وحشت دور کی ہے۔ شام میں بھی بلند پایہ شعراء پیدا ہونے کے آثار نمودار

ہیں، لیکن بُعد کی وجہ سے ان کی پوری آواز ہم تک نہیں پہنچی۔ بہرحال زمانہ جو بہترین نقاد ہے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کرکے صرف خالص اور حق چیز کو باقی رکھتا ہے وہی ان کوششوں پر مہرفنا یا مہر دوام ثبت کرکے اپنا فیصلہ دے گا۔

---:o:---

دوسری فصل

جدید تحریک کے روح رواں

مصر و شام و عراق و مغرب میں

تحریک جدید کے مصری اراکین:- اس دور کے وہ مصری ادبا جنہوں نے اس تحریک کو اپنی جد و جہد سے تقویت بخشی مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) شیخ عبدالرحمن جبرتی، یہ اس تاریخ کی کتاب کے مصنف ہیں جو ان کے نام سے مشہور ہے۔ انہوں نے ازہر میں تکمیل تعلیم حاصل کی۔ پھر جب مصر میں فرانسیسیوں کا قبضہ ہوا تو ان کی حکومت کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی، بعد ازاں ملازمت چھوڑ کر تصنیف و تالیف میں لگ گئے اور اپنی کتاب "عجائب الآثار فی التراجم والاخبار" لکھی۔ ۱۸۲۵ء میں وفات پائی۔

(۲) شیخ محمد مہدی، شیخ جامع ازہر رکن دیوان خصوصی، مصری عیسائیوں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ازہر میں تعلیم حاصل کی، تاآنکہ وہاں کا سب سے بڑا عہدہ پایا۔ ان کی تصنیف "کتاب تحفۃ المستقیظ الآنس فی نزہۃ المستنیم الناعس" ہے جو الف لیلہ سے بہت مشابہ ہے، ان کی وفات ۱۸۱۵ء میں ہوئی۔

(۳) شیخ حسن عطار جو نظم و نثر دونوں لکھتے تھے۔ قاہرہ میں پیدا ہوئے، ازہر میں تعلیم حاصل کی، پھر فرانسیسیوں کی ملازمت کی، شام گئے جس سے ان کی فہم تیز ہوئی اور علم میں اضافہ ہوا، پھر ازہر میں معلم ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے شیخ ازہر کے عہدہ تک پہنچے۔ ۱۸۳۳ء میں وفات پائی۔

(۴) سید علی درویش، شاعر امیر عباس اول، قاہرہ میں پیدا ہوئے، اپنی شاعری کی وجہ سے بڑی باعزت زندگی گذاری، ان کے ایک شاگرد نے ان کی تمام شاعری ایک دیوان میں جمع کر دی ہے، اس دیوان کا نام "الاشعار بحمید الاشعار" رکھا ہے ۱۸۵۳ء میں انتقال ہوا۔

(۵) شیخ شہاب الدین مولف "سفینۃ الملک"، مکہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مصر، ازہر میں آئے، ادب میں کمال حاصل کیا، حساب انجینیری اور موسیقی سے بھی شغف تھا۔ پھر اخبار الوقائع کے عملہ میں کام مطبع بولاق میں تصحیح کتب کا کام کیا۔ ۱۸۵۷ء

میں انتقال ہوا۔

(۶) رفاعہ بک طہطاوی، رکن مجمع العلمیہ، ناظم مدرسہ تجہیزیہ تھے، اخبار الوقائع
[illegible] ہوئے۔ ازہر میں تعلیم حاصل کی۔ محمد علی پاشا کے
[illegible] فرانس بھیجے گئے [illegible] تھے، وہاں تعلیم مکمل کی۔ واپسی پر انجینئرنگ، ترجمہ
تالیف و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۸۷۳ء میں وفات پائی۔

(۷) محمود صفوت ساعاتی، قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۸۸۰ء میں انتقال ہوا، یہ
بلند پایہ شاعر تھے۔

(۸) شیخ عبدالہادی نجا ابیاری، پیدائشی شاعر، مستند لغوی، اور ذہین مولف
تھے۔ ابیار میں پیدا ہوئے، ازہر میں علم حاصل کیا، اسمعیل پاشا کی خدمت میں پہنچے جس نے
انہیں امام اور مفتی بنا لیا، ۱۸۸۸ء میں انتقال کیا۔

(۹) علامہ شیخ حسین مرصفی، استاذ الاساتذہ، عمدۃ المولفین، مؤلف الوسیلۃ الادبیہ
فی العلوم العربیہ" ازہر سے فارغ التحصیل ہوئے، اور وہیں معلم ہو گئے، ذکاوت و نزاکت
احساس جو خدا نے آنکھوں کے عوض نابیناؤں کو بخشا ہے، آپ کو بھی ملا تھا، ۱۸۸۹ء میں
انتقال ہوا۔

(۱۰) شاعر و ادیب عبداللہ پاشا فکری، عہد اسمعیل میں مہتمم تعلیمات تھے "الفصول
الفکریۃ للمکاتب المصریۃ" کے مصنف، ۱۸۸۹ء میں انتقال ہوا۔

(۱۱) مصلح، علی مبارک پاشا، منتظم مدارس مصریہ، خدیویہ لائبریری کے مہتمم، الخطط
التوفیقیہ اور نخبۃ علم الدین کے مصنف، یہ بہت سے علوم سے واقف تھے اور محمد علی پاشا
سے لے کر عہد توفیق تک متعدد بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے، ۱۸۹۳ء میں انتقال ہوا۔

(۱۲) بلند پایہ ادیب سید عبداللہ ندیم، انقلابی خطیب، تنقیدی مزاحیہ صحافت نگاری
کے امام، سیاسی و ادبی مجالس کی روح تھے۔ اسکندریہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی،
پھر حزب عرابی میں شامل ہو گئے اور اپنی زبان اور قلم سے اس کی مدد کرتے رہے۔
چنانچہ ان کو جلا وطن کر دینے کے احکام جاری ہو گئے لیکن پھر معاف کر دیا گیا۔ دو ڈرامے
لکھے اور خود ہی انہیں پیش بھی کیا۔ پھر "التنکیت والتبکیت" جاری کیا اور اس کے بعد
"الطائف" اور پھر "الاستاذ"۔ ان کی شاعری کا انتخاب "سلافۃ الندیم فی منتخبات
السید عبداللہ ندیم" کے نام سے ہو گیا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں انتقال ہوا۔

(۱۳) ماہر مترجم محمد عثمان بک جلال، جنہوں نے العیون الیواقظ میں لا فونٹین کی امثال
کا ترجمہ کیا، نیز شامیانہ زبان ٹرٹوف، بول اور ورجینی کا ترجمہ کیا، نیز "السیاحۃ الخدیویہ فی
الاقالیم المصریہ" تالیف کی، ۱۸۹۸ء میں انتقال ہوا۔

(۱۴) سیدہ فاضلہ عائشہ تیموریہ، جس نے ترکی و عربی شاعری میں کمال پیدا کیا، اور ان دونوں زبانوں میں اپنے دیوان چھوڑے، علاوہ ازیں اس کی ایک کتاب ادب میں نتائج الاحوال" ہے۔ ۱۸۴۰ء میں مصر میں پیدا ہوئی اور وہیں ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔

(۱۵) ماہر اجتماعیات، مفکر انشاپرداز، قاسم بک امین، جو مصری عورت کو آزادی سے ہم کنار کرانے والا، اور اجتماعی اصلاح کا علم بردار ہے۔ "تحریر المرأۃ" اور "المرأۃ الجدیدۃ" کا مصنف، عورتوں کی ترقی کی تحریک میں جو خدمت انہوں نے انجام دی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ۱۹۰۸ء میں انتقال ہوا۔

(۱۶) بے باک مقرر، تجربہ کار سیاستدان، سچا وطن پرور، ماہر صحافت نگار، مصطفےٰ پاشا کامل، جنہوں نے مصری وطنیت کی روح کو بیدار کیا، قومی صحافت نگاری کی داغ بیل ڈالی، اور سیاسی جہاد کرتے ہوئے ۱۹۰۸ء میں اپنی جان دے دی۔

(۱۷) فقیہہ محقق، ماہر مترجم، فتحی پاشا زغلول جو قانون مدنی رسول لا) کے شارح کتاب المحاناۃ کے مصنف، کوشاف لوبون کے مترجم، اور القوانین المصریۃ کے لکھنے والے ہیں، ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا۔

(۱۸) نابغۂ یکتا، ماہر وکیل، باکمال اصولی خطیب خوش مقال، بلند پایہ انشاء پرداز، تجربہ کار سیاستدان سعد پاشا زغلول جو سیاسی تحریک کے قائد مصری انقلاب کے ہیرو، اور تمام مشرق میں وطنیت کی علامت تھے، ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا۔

(۱۹) کامل لغت داں، محقق مورخ، احمد پاشا تیمور جو "الخزانۃ التیموریۃ" اور "قاموس اللغۃ العامیۃ" کے مولف ہیں نیز تاریخ و لغت میں متعدد دیگر بلند پایہ تصانیف اور مفید مقالات لکھنے والے ہیں، ۱۹۳۰ء میں انتقال ہوا۔

(۲۰) بلند پایہ ادیب، پختہ کار نقاد، محمد بک مویلحی، جو حدیث عیسےٰ بن ہشام کے مؤلف ہیں، ۱۹۳۰ء میں انتقال ہوا۔

(۲۱) وسیع الاطلاع ادیب، نابغہ، احمد زکی، جو "الخزانۃ الزکیۃ" کا مصنف، عربی تالیفات کو زندہ کرنے والا اور ثقافت اسلامی کو نشر کرنے والا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں وفات پائی۔

تحریک جدید کے شامی اراکین: اس دور کے وہ شامی ادباء جنہوں نے اس تحریک میں جان ڈالی یہ ہیں۔

(۱) معلم، شاعر، بطرس کرامہ حمصی، یہ امیر بشیر شہابی کا مداح شاعر اور اس کے بیٹے کا اتالیق اور ان کا معتمد علیہ آدمی تھا، اس کی شاعری کے تین مجموعے ہیں جن میں سے صرف ایک دیوان شائع ہوا ہے، ۱۸۷۱ء میں انتقال ہوا۔

(۲) فلسفی شاعر، فرنسیس مراش حلبی، سب سے پرانا شخص جس نے جدت پسندی و تجدید کی دعوت دی۔ متعدد مفید کتابوں کا مولف ہے۔ ۱۸۸۳ء میں نابینا ہو کر وفات پائی۔

(۳) انشاء نگار، صحافی، ادیب اسحٰق، عہد توفیق میں محکمہ تعلیمات مصر کے شعبۂ انشاء کا نگران، دمشق میں پیدا ہوا وہیں تعلیم حاصل کی۔ پھر مصر کا سفر کیا وہاں جمال الدین افغانی سے ملاقات کی جدیداپنی تحریک میں ان کی تاثیر نمایاں ہے۔ ۱۸۸۵ء میں انتقال ہوا۔

(۴) اجتماعی مصلح۔ سیاسی ادیب، شیخ عبدالرحمٰن کواکبی، "طبائع الاستبداد" "ام القریٰ" کے مؤلف ہیں۔ بیشتر ممالک اسلامیہ کا سفر کیا، پھر مصر میں سکونت اختیار کی اور وہاں ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔

(۵) بلند پایہ ادیب، "حضارۃ الاسلام فی دار السلام" کے مصنف، جمیل المدور، بیروت میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا۔

(۶) بڑا ادیب، ماہر صحافی، قادر مترجم، شیخ نجیب حداد بکثرت ڈرامے لکھنے اور ترجمہ کرنے میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اپنی بھرپور جوانی میں ۱۸۹۹ء میں انتقال کر گئے۔

(۷) مستند و معتمد علیہ مورخ، شیخ طاہر الجزائری دمشق کا عالم و ادیب، ۱۹۲۵ء میں انتقال کیا۔

(۸) مشہور مورخ، باکمال صحافی، مقبول ناول نویس جرجی بک زیدان، الہلال کا ایڈیٹر۔ تاریخ و ادب، لغت و اجتماعیات کے موضوع پر متعدد بیش قیمت تصانیف کرنے والا، مشرق میں تاریخی ناول نویسی کا امام ہے، ۱۹۲۴ء میں انتقال ہوا۔

(۹) محقق فلسفی، جدت طراز صحافی، ڈاکٹر یعقوب صروف، المقتطف کا ایڈیٹر اور علوم جدیدہ کا پیامبر ہے، ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا۔

تحریک جدید کے مصری اراکین:

عراق میں جن علماء و ادباء نے جدید تحریک کو تقویت بخشی وہ یہ ہیں:

خاندان الوسی کے باکمال افراد، جن میں سب سے مشہور (۱) علامہ فقیہ شہاب الدین الوسی ہیں جن کی مشہور تفسیر روح المعانی کے نام سے نو جلدوں پر مشتمل ہے، انہوں نے ۱۸۵۴ء میں بغداد میں انتقال فرمایا۔

(۲) ان کا پوتا سید محمود شکری الوسی، ادیب عراق، جو بلوغ الارب فی احوال العرب (۳ جلد) کے مصنف ہیں، ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا۔

(۳) رقت انگیز شاعر، عبدالغفار اخرس، ان کی وفات ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔

مغرب کے اراکین: (۱) مصلح و سیاسی ادیب، محمد بیرم، جو "صفوۃ الاعتبار بمستودع الامصار" کے نام سے ایک سفرنامہ کے مصنف ہیں، یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ مصر آئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی، یہاں انہوں نے "الاعلام" نامی اخبار نکالا، ۱۸۸۹ء میں انتقال ہوا۔

(۲) عالم وزیر، خیرالدین پاشا، جو "اقوم المسالک فی معرفۃ احوال الممالک" کے مصنف ہیں۔ یہ اپنے موضوع پر بہترین تصنیف ہے۔ ان کی قابلیت کی وجہ سے انہیں تونس کی وزارت دی گئی اور آستانہ کی صدارت عظمی کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ ۱۹۰۰ء میں انتقال ہوا۔

ان کے علاوہ کچھ ایسے بلند پایہ ادیب، شعراء و علماء بھی ہیں جن کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:۔

محمود سامی پاشا بارودی

(پیدائش ۱۲۵۵ھ وفات ۱۳۲۲ھ)

حالاتِ زندگی: یہ حسن بک حسنی کے بیٹے ہیں، جو محمد علی پاشا کے عہد میں دنقلہ و بربر کے علاقہ کے ناظم تھے۔ قاہرہ میں پیدا ہوئے اور بچپن اپنے والد کی نگرانی میں آسودہ ماحول میں گذارا، سات برس کے بھی نہ ہوئے کہ دنقلہ میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے خاندان کے بعض افراد نے ان کی تربیت کا انتظام کیا۔ انہیں فوجی اسکول میں داخل کیا گیا، جہاں فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ فوجی افسر بن کر نکلے۔ بچپن ہی سے انہیں شعر و شاعری سے بڑا شغف تھا۔ ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس طرف ان کی طبیعت کا میلان کن اسباب کی بناء پر ہوا، بہرحال وہ بلند پایہ عربی شعراء کے دواوین کا اپنے طور پر مطالعہ کرتے رہے اور جب جوان ہوئے تو وہ نہایت فصیح و بلیغ تھے۔ نحو جانے بغیر ہی صحیح اعراب دیتے تھے۔ پھر ان کی محفوظ شاعری کا ذخیرہ ترقی کر کے ان کی زبان سے ان کی شاعری کی شکل میں نکلنے لگا، جو مختلف موضوعات پر ہوتی۔ انہوں نے آستانہ کا سفر کیا، جہاں انہوں نے ترکی اور فارسی زبان سیکھی اور ان کے ادب میں اتنا کمال حاصل کیا کہ ان زبانوں کے شاعر سمجھے جانے لگے۔ وہاں ۱۲۷۹ء میں خدیو اسماعیل کی خدمت میں پہنچے جس نے انہیں اپنا مقرب بنا لیا، اور انہیں لے کر مصر آیا۔ پھر وہ فوجی مدارج میں ترقی کرتے رہے حتی کہ ۱۲۹۴ھ میں وہ میجر جنرل کے مرتبہ پر پہنچے۔ اس اثنا میں انہوں نے فرانس اور انگلینڈ کے سفر کیے۔ جس سے ان کی ادبی قوت، اور فنی معلومات میں اضافہ ہوا۔

وہ اس مصری فوج کے افسروں میں سے ایک تھے جس فوج نے بلقان وا قریطش کی بغاوت میں حکومت علیہ کی مدد کی، ان معرکوں میں انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

مصر واپس آنے کے بعد وہ حکومت کے انتظامی عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ شرقیہ کے ناظم ہوئے، پھر پولیس کے افسر اعلیٰ بنے۔ توفیق کے عہد حکومت میں وہ اوقاف کے نگران ہوکر لفٹیننٹ جنرل کے عہدہ تک پہنچ گئے۔ عربی انقلاب سے کچھ پہلے وہ محکمہ فوج کے نگران اور پھر شریف پاشا کے بعد وہ اس محکمہ کے سربراہ ہو گئے۔ اس کے بعد ہی ہنگامۂ بغاوت بپا ہو گیا۔ فتنہ کی چنگاریاں اُڑنے لگیں، لوگوں میں عام چرچا تھا کہ بارودی اس انقلابی فتنہ کے قائد ہیں لیکن ان کے اشعار جو ہم آگے دے رہے ہیں اس الزام سے براءت کے اظہار کرتے ہیں۔

یہ بغاوت وادی نیل پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد فرو ہو گئی۔ حکومت نے فتنہ وبغاوت بپا کرنے والوں کو قید کیا۔ اور انہیں جلا وطن کر کے جزیرہ سرندیپ بھیج دیا۔ انہی میں یہ شاعر بھی تھا، سترہ سال سے کچھ اوپر یہ جلا وطنی کی زندگی گذارتا رہا، اس دوران میں اس نے انگریزی سیکھ لی اور عربی کی عمدہ نظمیں کہیں، پھر خدیو عباس ثانی کی مہربانی سے انہیں ۱۳۱۷ھ میں معافی دی گئی اور شہری حقوق سے متمتع ہونے کی اجازت ملی۔ اس کے بعد وہ پانچ سال تک زندہ رہے۔ یہ مدت بڑھاپے کی وجہ سے مطالعۂ کتب، دوستوں سے ملاقات اور شعر و شاعری کے مشاغل میں پرسکون گذری۔ موت سے ذرہ پہلے ان کی آنکھیں جواب دے گئی تھیں۔

شاعری: اگر امرؤ القیس کو شاعری کی تمہید اور قصیدہ گوئی کی اصلاح کا شرف حاصل ہے اور بشار کو شاعری کے ترقی دینے اور حسین بنانے میں فضیلت حاصل ہے تو یقیناً بارودی کے سر عربی شاعری کی احیاء و تجدید کا سہرا ہے، اس زمانہ میں شاعری کی صورت آخری کی تاریک صدیوں کی وجہ سے بگڑ چکی تھی۔ نظم بے ڈول، تکلف عام، صنعت غالب، اور مضمون ناقص ہوتا تھا۔ اس نے اسے چمکایا، منظم و حسین بنایا، لفظی رونق اور معنوی حسن بخشا۔ بارودی نے ابن المعتز، ابو فراس، رضی، طغرائی اور ان جیسے دیگر بلند پایہ شعراء کا کلام حفظ کر لیا تھا، وہ اس سے بڑی حد تک متاثر اور ان کے رنگ میں رنگ گیا تھا اس کے ساتھ ہی وہ ذوق سلیم اور احساس قوی کا مالک تھا۔ چنانچہ ان سب چیزوں کے مل جانے سے اس کے پرزور اور حسین اسلوب کا مرکب تیار ہوا۔ یہی سبب ہے کہ جب آپ اس کی شاعری کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ اس کی شاعری کے اردگرد انہی قدیم بلند پایہ شعراء کی روحیں منڈلا رہی ہیں۔

ہمارے اس شاعر نے نہ تو نئے معانی پیدا کیے، نہ کوئی جدید اسلوب اختراع کیا،

بایں ہمہ وہ قادر الکلام شاعر ہے۔ نغمہ و ترنم سے وہ عشق کرتا ہے۔ صنعت کی طرف مائل ہے اسی لیے وہ پرشوکت الفاظ میں تھوڑے معنی کو، معمولی الفاظ میں بلیغ معنی پر ترجیح دیتا ہے۔ فخر، حماسہ اور وصف میں اس کی شاعری نہایت عمدہ ہے۔

تالیفات:۔ اس کی ایک کتاب "مختارات البارودی" چار حصوں پر مشتمل ہے، جس میں اس نے عہد عباسی کے تیس شعراء کے مختلف موضوع پر اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ اپنے انتخاب میں اس نے وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو اس کی شاعری کا ہے۔ چنانچہ اس نے لفظی و معنوی حسن اور صرف لفظی حسن کو معنوی حسن اور لفظی قبح پر ترجیح دی ہے۔ اس کے اشعار کا مجموعہ دو جلدوں میں حال ہی میں مصر سے شائع ہو گیا ہے۔

اس کی شاعری کا نمونہ:

حماسہ و فخر میں وہ کہتا ہے:۔

و نقع کلج البحر خضت غمارہٗ	ولا معقل الا المناصل والجرد
صبرت له والموت یحمر تارۃ	و ینغل طورا فی العجاج فیسود
فما کنت الا اللیث انهضه الطوی	وما کنت الا السیف فارقه الغمد
صؤول وللابطال همس من الونی	ضروب وقلب القرن فی صدره یعدو
فما مهجة الا ورمحی ضمیرها	ولا لبة الا وسیفی لها عقد

جنگ میں اڑنے والا وہ کثیف غبار جو سمندر کے کنڈ کے مانند تھا میں نے اس میں غوطہ زنی کی، جہاں تلواروں اور گھوڑوں کے سوا کوئی پناہ گاہ نہ تھی، میں نے وہاں جم کر مقابلہ کیا اور موت کا یہ حال تھا کہ کبھی تو وہ تلواروں کے خون سے سرخ ہوتی تھی اور کبھی غبار میں کالے رنگ کی بھیانک شکل اختیار کر لیتی تھی۔ میری حالت اس شیر کی سی تھی جو بھوک میں حملہ کے لیے بپھرا ہو یا پھر ایسی تلوار جو نیام سے جدا ہو گئی ہو۔ میں اس وقت حملہ کرتا ہوں جب بہادروں کے چھکے چھوٹ رہے ہوتے ہیں اور اس وقت تلوار سے وار کرتا ہوں۔۔۔۔ جب حریف کا دل سینہ میں بلیوں اچھلتا ہے، اور عالم یہ تھا کہ کوئی جان ایسی نہ تھی جس کو میرے نیزہ نے نہ چھیدا ہو اور کوئی سینہ ایسا نہ تھا جس پر میری تلوار ہار نہ بن گئی ہو۔

اپنی بیوی کے مرثیہ میں کہتا ہے:۔

لا لوعتی تدع الفؤاد ولا یدای	تقویٰ علی رد الحبیب الغادی
یا دهر فیم فجعتنی بحلیلة	کانت خلاصة عدتی وعتادی؟
ان کنت لم ترحم ضنای لبعدها	افلا رحمت من الاسی اولادی؟
ومن البلیلة ان یسام اخو الاسی	رعی التجلد وهو غیر جماد
هیهات بعدک ان تقر جوانحی	اسفا لبعدک او یلین مهادی

وَلَهِیَ علیك مصاحب لمسیرتی ‏ ‏ ‏ ‏ والدمع نیك ملازم لوسادی
فاذا انتبهت فانت اول ذکرتی ‏ ‏ ‏ ‏ واذا اویت فانت آخر زادی

نہ سوزِ غم میرے دل کو چھوڑتا ہے نہ مجھ میں یہ طاقت ہے کہ جانے والے محبوب ہی کو واپس لے آؤں۔ اے ظالم زمانے! تو نے مجھ سے میری رفیقۂ حیات کو کیوں چھین لیا، وہی تو میری تمام کوششوں اور میرے تمام مال و متاع کا ماحصل تھی۔ اگر تجھے اس کی جدائی کی وجہ سے میری بدحالی پر رحم نہ آیا تو کم از کم میرے بچوں کے رنج و غم پر تو ترس کھایا ہوتا! واقعی یہ بڑی آزمائش ہے کہ ایک غم زدہ کو صبر کے لیے مجبور کیا جائے، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ وہ پتھر کا بنا ہوا نہیں ہے۔ ناممکن ہے کہ تمہارے بعد غم میں میرے پہلوؤں قرار حاصل ہو یا مجھے بچھونے پر چین نصیب ہو سکے۔ دن میں جب میں چلتا پھرتا ہوں تمہارا صدمہ میرے ساتھ رہتا ہے، اور شام کو میرا تکیہ تمہارے غم میں آنسوؤں سے تر رہتا ہے۔ جب میں خواب سے بیدار ہوتا ہوں تو سب سے پہلے تمہاری یاد آتی ہے اور جب میں بچھونے پر آتا ہوں تو میرا سب سے آخری ساتھی تم ہی ہوتی ہو۔

ایک قصیدہ میں ذوق و شوق کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

رُدّوا علی الصبی فی عصری الخالی ‏ ‏ ‏ ‏ وهل یعود سواد اللمة البالی؟
لم یدر من بات مسرورا بلذته ‏ ‏ ‏ ‏ انی بنار الاسی من هجره صال
یا غاضبین علینا هل الی عدة ‏ ‏ ‏ ‏ بالوصل یوم اناغی فیه اقبالی؟
غبتم فاظلم یومی بعد فرقتکم ‏ ‏ ‏ ‏ وساء صنع اللیالی بعد اجمال
فالیوم لا رسنی طوع القیاد ولا ‏ ‏ ‏ ‏ قلبی الی زهرة الدنیا بمیال
ابیت منفردا فی راس شاهقة ‏ ‏ ‏ ‏ مثل القطامی فوق المربأ العالی

میری عمرِ رفتہ میں سے لڑکپن اور نوجوانی کے زمانہ کو واپس لادو اور کیا میرے بالوں کی بوسیدہ سیاہی واپس آسکتی ہے؟ جو اپنے عیش و آرام میں مسرت سے رات گذار رہا ہے اسے کیا خبر ہے کہ میں اس کے ہجر میں آتشِ غم میں جلا جا رہا ہوں۔ اے ہم پر غصہ ہو جانے والو! کیا وعدہ وصل کی امید کا کوئی امکان ہے، وہ دن جس میں مجھے خوش بختی سے ہمکنار ہونے کا موقع ملے؟ تم کیا چلے گئے کہ تمہاری جدائی سے میرا دن بھی تاریک ہو گیا اور راتیں جو پہلے میرے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتی تھیں اب بدسلوکی کر رہی ہیں۔ آج میں مجبور و کبیدہ خاطر ہوں اور میرا دل دنیا کی زیب و زینت کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ میں شاہین کی طرح بلند پہاڑ کی اونچی چوٹی پر تنہا رات گذار رہا ہوں۔

آتشِ بغاوت بھڑکانے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

نصحت قومی، فقلت الحرب مفجعة ‏ ‏ ‏ ‏ وربما تاح امر غیر مظنون

فخالفونی و شبوها مکابرة و کان ادلی بقوفی لو اطاعونی
تاتی الامور علی مالیس فی خلدٍ و یخطیٔ الظن فی بعض الاحایین
حتی اذا لم یعد فی الامر منزعة و استبم الشر امرا غیر مکنون
اجبت اذ هتفوا باسمی دمن شیمی صدق الولاء و تحقیق الاظانین

میں نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور کہا دیکھو لڑائی بڑے جانی و مالی نقصان پہنچاتی ہے۔ اور بعض اوقات اس کے وہ نتائج نکلتے ہیں جن کا گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے میری بات نہ مانی اور ضد کرتے ہوئے آتش جنگ کو بھڑکا ہی دیا۔ اگر وہ میری بات مانتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ معاملات کبھی ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس کا وہم بھی نہیں گذرتا ہے۔ اور بعض اوقات گمان غلط ہو جاتا ہے۔ حتی کہ جب معاملہ ہاتھ سے نکل گیا، اور شر کھل کر سب کے سامنے آگیا۔ پھر انھوں نے میرا نام لے کر مجھے بلایا، تو میں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ اس لیے کہ دوستی نباہنا۔ اور ان امیدوں کو سچ کر دکھانا جو مجھ سے وابستہ ہوں، میری عادت ہے۔

جمال الدین افغانیؒ

(متوفی ۱۳۱۴ھ موافق ۱۸۹۷ء)

حالاتِ زندگی اور خدمات:- سید محمد جمال الدین افغانی بن سید صفتر افغانستان میں ضلع کابل کی ایک بستی اسد آباد کے ایک شریف گھرانہ میں پیدا ہوئے جو حضرت حسین رضؓ سے نسبی تعلق کے ساتھ ساتھ بعض افغانی علاقوں پر حاکم بھی تھا۔ ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جو غیرت و آزادی، حمیت و خودداری میں دیہاتی ماحول کی خوبیاں رکھتا تھا۔ جب وہ آٹھویں برس میں تھے تو ان کے والد کابل منتقل ہو گئے جہاں اس بچہ نے مروجہ نصاب کے مطابق علوم عربیہ ادبیہ و شرعیہ وعقلیہ حاصل کیے۔ پھر اپنی زندگی کے متفرق ادوار میں مختلف علاقوں کے سفروں سے عربی، فارسی، ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں مہارت حاصل کر لی۔ انگریزی اور روسی زبانیں بھی کسی قدر سیکھ لیں اور زبانوں کی مدد سے انہیں مشرق و مغرب کی قدیم و جدید تہذیبوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر انھوں نے حسب توفیق ایزدی ہندوستان، ایران، حجاز، مصر، ترکی، انگلینڈ، فرانس، روس وغیرہ کے سفر کیے اور ان کے ذریعہ احوال ممالک و اخلاق امم کا بصیرت افروز مطالعہ کیا۔ مرحوم چونکہ عظیم شخصیت کے مالک تھے اس لیے طبیعت میں تواضع تھا، مرد آزاد تھے اس دلِ جرات مند رکھتے تھے۔ طبیعت میں استغناء و زہد تھا لہٰذا نہایت درجہ فیاض تھے۔ قریشی

ہونے کی وجہ سے شیریں مقال وفصیح اللسان تھے۔ حاکم خاندان سے تعلق کی بناء پر وہ خوددار وغیرتمند تھے۔ حساس و ذہین ہونے کی وجہ سے تیز مزاج تھے۔ کمال مردانگی کی وجہ سے وہ نہایت صاف گو اور حق پسند تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ ان صفات کے بعد مجھے سوائے طمانیت قلب کے کسی چیز کی مزید خواہش نہیں وہ کہتے تھے کہ الحمد للہ خدا نے مجھے وہ جرأت و ہمت بخشی کہ میں جس بات پر یقین رکھتا ہوں اسے کہہ ڈالتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں اس پہ عمل کرتا ہوں[۱]۔ ان خصائل کے ساتھ مذکورہ بالا اسباب و ذرائع مل جانے سے زمین ان کے لیے کشادہ اور فضا ان کے لیے وسیع ہوگئی تھی۔ پھر ان کی بلند ہمت نے انہیں گھربار بیوی بچے، کنبہ ناتے سے ہٹا کر سارے عالم اسلامی اور تمام مشرق کے انسانوں کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور ان کی تمام مساعی اس مقصد کے لیے وقف ہوگئیں کہ استعماری قوتوں کو ختم کرنے کے لیے تمام عالم اسلامی ایک وحدت بن جائے اور سب مل کر ایک آئینی حکومت قائم کریں تاکہ استبداد کا استئصال ہوجائے۔

وہ اس دعوت پر ایسا ہی پختہ یقین رکھتے تھے جس طرح وہ خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ اس راہ میں جیل جانے کو ریاضت، جلا وطنی کو سیاحت اور قتل ہوجانے کو شہادت خیال کرتے تھے[۲]۔

جو لوگ جمال الدین افغانیؒ کی سیرت کا بنظر غائر مطالعہ نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی دعوت کو بروئے کار لانے میں پوری پوری جد و جہد نہ کی اور تقریر و تحریر کے ذریعہ فضا کو سازگار بنانے میں کوتاہی کی لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انہوں نے جتنی امکانی کوششیں اور تدبیریں کی تھیں سب ہی کر ڈالیں، مگر اس وقت عالم اسلامی جو افتراق و انتشار تھا وہ اس حد سے بہت آگے نکل چکا تھا کہ اسے متحد کر دیا جائے۔ استبدادی قوتیں ان علاقوں پر اس طرح مستولی ہوچکی تھیں کہ انہیں ہٹانا اور شکست دینا ناممکن ہوگیا تھا۔

آغاز جوانی میں انہوں نے شاہ افغانستان محمد اعظم کی وزارت کا عہدہ سنبھالا۔ اس بادشاہ کے دل کو آزادی پر مائل کیا اور وہاں شورائی نظام قائم کیا۔ انگریزوں نے ان اصلاحی اقدامات سے خطرہ محسوس کیا، چنانچہ انہوں نے اس کی مخالفت پارٹی کو روپیہ دے کر ان کے خلاف بغاوت کرادی، ملک میں نظام قائم نہ رہا اور نتیجۃً شاہ افغانستان کو جلاوطن کر دیا گیا۔ تب، جمال الدین افغانی امن و سکون کی تلاش میں اپنے ایک تاجر دوست

---

[۱] خاطرات جمال الدین صفحہ ۱۱

[۲] خاطرات جمال الدین صفحہ ۳۳

کے پاس ہندوستان آ گئے۔ سرحد پر انگریزوں نے ان کا استقبال کیا اور بادل نخواستہ انہیں حکومت کا مہمان بنا لیا۔ یہاں انہوں نے انگریزوں سے دو ماہ اقامت کی اجازت مانگی۔ لیکن جب انگریزوں نے عوام میں ان کی مقبولیت و ہر دلعزیزی بڑھتے دیکھی تو اس مدت میں کمی کر کے انہیں ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور جب ہندوستان سے چلتے وقت وہاں کے لیڈروں کے سامنے انہوں نے مندرجہ ذیل جملے کہے تو ہندوستانی مردہ اعضا میں ہیجان برپا ہونے لگا تھا۔

قسم ہے اس ذات کی جس نے حق کے غلبہ اور عدل کے قیام کا ایک بھید رکھا ہے، اگر تم میں سے لکھو کھا افراد صرف مکھیاں بن جائیں تو وہ اپنی بھنبھناہٹ اور بھنکار سے ہی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال سکتے ہیں اور اگر تمہاری یہ تعداد کچھوے بن کر برطانوی جزیروں میں پہنچ جائے تو ان جزیروں کو پاٹ کر میدان بنا ڈالے۔"

آستانہ میں صدر اعظم نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ اعیان حکومت نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ مجلس معارف کے رکن مقرر ہو گئے۔ انہوں نے تعلیم کے بارے میں اپنی رائے دی اور صنعتی امور پر ایک تقریر کی جس سے محکمہ تعلیم کے جہل پسند افسران اور علماء دین میں سے اصحاب ضلال ان سے بگڑ گئے۔ اس مخالفانہ تحریک کی قیادت اپنی ذاتی غرض کی وجہ سے شیخ الاسلام نے کی۔ چنانچہ اس نے جمال الدین افغانی پر قسم قسم کے الزامات لگائے۔ ان کے خلاف چغلیاں کھائیں اور ان کی راہ میں سازشوں کے جال بچھا دیے چنانچہ افغانی مجبور ہو کر قاہرہ چلے گئے۔

یہاں ریاض پاشا نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ چنانچہ ان کی تعلیمی، انتظامی اور انقلاب انگیز غیر معمولی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آ گئیں اور انہوں نے اپنے تند و تیز شعلہ سے گھروں اور قہوہ خانوں میں اپنی مقدس تعلیم کے تابناک دیے روشن کر دیے جس نے طالبین علم و شائقین حکمت علماء و ادباء، سیاسی مدبروں اور لیڈروں کی نگاہیں چکاچوند کر دیں۔ پھر اس آزاد خیال پارٹی سے جس کی تشکیل انہوں نے اپنی تعلیمات پھیلانے کے لیے بطور رہنما مینار کی تھی، کارکن افراد کی ٹولیوں کو ہر وزارت کے محکمہ میں جماعت جماعت تقسیم کر دیا۔ محکمہ جنگ میں جانے والی جماعت نے مصری کمانڈروں پر جو ظلم کیا جا رہا تھا اس کی جانچ پڑتال کی اور انہوں نے فوجی محکمہ کے خلاف احتجاج بلند کیا کہ وہ جراکسی (ترکی) کمانڈروں سے مصری کمانڈروں کا حق دلائے۔ اسی طرح قانون، مالیات، مزدوری و ملازمت دلانے والے محکموں کی جماعتوں نے اپنے اپنے وزیروں کے خلاف آوازیں بلند کیں کہ مصریوں کو دوسروں کے برابر کام اور اجرت دی جائے۔ حاکم طبقہ نے جب قومی رپورٹیں پڑھیں اور ساتھ ہی انہوں نے ملازموں کا شور شرا اور تعلیم یافتہ طبقہ کی بے اطمینانی دیکھی تو انہیں بڑا خطرہ

لاحق ہوا۔ چنانچہ خدیو توفیق نے علامہ رح کو اپنے پاس بلایا اور اس بارے میں ان سے گفتگو کی علامہ نے اپنی گفتگو میں یہ بھی کہا تھا:-

"اصلاح کی سبیل یہ ہے کہ ملک کے نظم و نسق میں نظام شوریٰ کے مطابق قوم حصہ لے"

بعد ازاں جمال الدین افغانی نے پوری قوت سے اپنی تحریک کو چلانا شروع کر دیا چنانچہ ملک کا تمام ادبی حلقہ ان کا ہمنوا ہو گیا اور ہر طرف سے ان کی آواز گونجنے لگی اور آٹھ سال کے پیہم جہاد سے نوبت یہ ہو گئی کہ انگریز ان کے اثر و رسوخ سے تنگ آگیا اور انہوں نے خدیو کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ انہیں مصر سے نکال دے۔

چنانچہ یہ شعلہ مصر سے پیرس منتقل ہو گیا اور وہاں العروۃ الوثقیٰ کی شکل میں اٹھا اور اس کی تیز روشنی اٹھارہ ماہ تک مشرقی ممالک کے لیے مینار کا کام دیتی رہی۔ اس رسالہ نے ظالموں کا خانہ خراب کر دیا، بحری ڈاکوؤں کے تمام سربستہ راز آشکارا کر دیے۔ شاہ ایران نے انہیں بلا کر اپنا وزیر بنا لیا اور جب انہوں نے اسے اپنے شورائی نظام کا مشورہ دیا تو وہ ان سے بددل ہو گیا۔ شاہ روس نے ان کو ملاقات کے لیے بلایا اور ان کے مقاصد معلوم کیے اور جب انہوں نے اسے اپنا شورائی نظام بتایا تو وہ بھی ان سے متنفر ہو گیا۔ خاقان ترک نے انہیں بلا کر ان سے مشورہ لینا چاہا اور جب انہوں نے اسے اپنے شورائی نظام سے مطلع کیا اور ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ تمام سلطنت کو دس حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جن میں عثمانی گورنر مقرر کر دیے جائیں تو سلطان عبدالحمید نے بھی ان سے نگاہیں پھیر لیں۔ تاہم اس نے اس بہادر حکیم کو نرم جواب دیا اور چار سال تک انہیں نہایت اعزاز و احترام سے اپنے پاس رکھا اور بہت کوشش کی کہ انہیں کسی بلند عہدہ یا شادی کے بندھن میں باندھ کر قید کر لے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا، البتہ موت اس انقلابی مرد آزاد کو اپنی بیڑیاں پہنانے میں کامیاب ہو گئی، تاکہ استبدادی طاقتیں اپنی مقررہ میعاد تک کار فرما رہیں۔ وہ آستانہ میں مرض سرطان میں مبتلا ہوئے اور وہیں ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو وفات پائی۔

نمونۂ نثر:- جب انہیں معلوم ہوا کہ ایک شخص نے عبداللہ پاشا فکری کی موجودگی میں خدیو کے سامنے ان کی مذمت کی اور وہ خاموش رہے اور ان کی طرف سے کوئی مدافعت نہ کی تو عبداللہ پاشا کو اپنے عتاب نامہ میں لکھا:-

عتاب من! مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ نے حق کے بارے میں رورعایت سے کام لیا ہے حالانکہ آپ پاکیزہ سرشت، حق پرست اور راہ حق میں ہر مشکل کا مقابلہ کرنے والے ہیں۔ اس خبر کو سن کر میں نے اپنے یقین کو شک کے عوض فروخت کر دیا۔ اگر میں آپ کے بارے میں یہ وہم بھی کرتا ہوں کہ آپ نے راہ راست سے گریز کیا ہے یا حق کو چھوڑ دیا ہے—— حالانکہ مجھے آپ کی حق پرستی و اعتدال پسندی پر یقین ہے—— تو میں اپنے علم کو جہالت سے

بدل دوں گا اور اگر میں یہ کہوں کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو حق کے بارے میں ملامت کرنے والوں کی ملامت سے متاثر ہو جاتے ہیں اور جنہیں ظالم کا خوف حق سے ہٹا دیتا ہے — حالانکہ آپ بغیر کوتاہی و دل برداشتگی کے علانیہ حق کا پرچار کرتے رہتے ہیں خواہ باطل اپنی تمام ہلاکت آفریں طاقتوں سے آپ کے خلاف صف آرا ہو جائے — تو میں خود اپنے آپ کو جھٹلاؤں گا اور جو بھی میری بات سنے گا وہ مجھے جھوٹا بتائے گا۔ عالم و جاہل، ذہین و غبی سب کے سب ہی آپ کی پاکیزگی سیرت و صفائی ضمیر پر یک زبان ہیں۔ سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جہاں آپ ہیں وہاں پر تمام فضائل ہیں۔ حق آپ کے ساتھ ہے۔ آپ مجبور ہو کر بھی مکارم اخلاق کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ کی سرشت میں خیر ہے اور شر آپ کے پاس پھٹک نہیں سکتا اور کوئی بری بات قصداً آپ سے سرزد نہیں ہو سکتی۔ آپ حق کا فیصلہ صادر کرنے میں کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہیں کرتے، نہ سچی گواہی دینے میں کسی قسم کی کوتاہی کرتے ہیں ان سب صفات کے باوجود نیز میرے امر واقعی اور ظاہر و باطن سے بخوبی واقف ہونے کے ساتھ آپ نے اس حق کی حمایت نہ فرمائی جو آپ پر واجب تھا اور نہ اس عہد کا پاس رکھا جس کی حفاظت آپ پر لازم تھی۔ آپ نے گواہی چھپائی حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میں خدیو یا مصریوں کے لیے کسی قسم کی برائی کا خواہاں نہیں ہوں اور نہ میں نے اپنے دل میں کسی کے خلاف کوئی دشمنی چھپا رکھی ہے۔ آپ نے فلاں کمینہ کو بے روک ٹوک مجھے اپنے دانتوں سے چبانے اور نوچنے کے لیے چھوڑ دیا جو اپنے دل میں سید ابراہیم لقانی کے خلاف بغض بھرے بیٹھا تھا اور میری دشمن فلاں پارٹی کے ورغلائے میں آگیا تھا۔ آپ سے مجھے یہ امید نہ تھی، نہ کبھی آپ کا ایسا طرز عمل دیکھا گیا گو میرا دل فضائل میں آپ کے بلندی مرتبہ کا معترف اور کمالات میں آپ کی گرامی قدر کا مقر ہے — تاہم میری زبان میرا ساتھ نہیں دیتی کہ میں کہوں جو کچھ ہوا خدا اس سے درگذر فرمائے" تا آنکہ آپ ببانگ دھل حق کا اعلان نہ کریں اور سچ کو قائم نہ کر دیں۔ شک و شبہ دور کرتے باطل کو مٹاتے اور شر اور اہل شر کو رسوا کرنے کے لیے آپ شہادت کو ظاہر نہ کر دیں اور میرا خیال ہے کہ آپ ادائے فریضہ اور اقامت عدل کی خاطر ایسا کر دیں گے۔

اب میں آپ کو سلام کہہ کر، دعائیں دیتے ہوئے لندن جا رہا ہوں اور وہاں سے پیرس پہنچوں گا۔ برادرم فاضل ابین بک کو میرا سلام پہنچا دیجئے گا والسلام علیکم۔

استاذ امام محمد عبدہ

(پیدائش ۱۲۶۶ھ وفات ۱۳۲۳ھ)

حالاتِ زندگی: محمد عبدہ بن عبدہ بن حسن خیر اللہ مصر کے شہر بحیرہ کے محلہ نصریہ میں پیدا ہوئے۔ درمیانہ طبقہ کے دیہاتیوں کی طرح ان کی تربیت ہوئی۔ گاؤں کے مدرسہ میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر تعلیم کے لیے جامع احمد اور وہاں سے ازہر شریف بھیجے گئے۔ ابتداء میں انہیں بعض نااہل اساتذہ سے پالا پڑا جو بغیر سمجھائے مسائل پڑھاتے تھے۔ چنانچہ وہ اس تعلیم سے اکتا گئے۔ اور مدرسہ سے بھاگ گئے۔ لیکن جب علم کی حقیقی لذت سے بہرہ ور ہوئے تو انہیں اس کی تلخیاں بھی گوارا ہو گئیں اور وہ پوری محنت سے علم حاصل کرنے لگے حتیٰ کہ تھوڑی مدت میں انہوں نے کثیر علم حاصل کر لیا۔ اس زمانہ میں ازہر کا تعلیمی نصاب اس قابل نہ تھا کہ وہ امام محمد عبدہ جیسا وسیع العلم، کریم الخلق، صاحب بصیرت، ساحر بیان، صائب الرائے اور مستند طالب علم تیار کرتا۔ یہ نتیجہ تھا حکیم مشرق، فلسفی اسلام علامہ سید جمال الدین افغانی کی فیض صحبت کا جنہوں نے امام کو ان بلند صفات سے ہمکنار کیا۔ یہ علامہ عہد اسماعیل میں مصر آئے۔ تو ذہین طلبہ کی ایک جماعت نے ان کے فیض علمی سے استفادہ کیا۔ اور یہی جماعت بعد میں تحریک جدید کی قائد و داعی بنی۔ ان تمام طلبہ میں جس نے سب سے زیادہ ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا وہ امام محمد عبدہ ہی تھے اور خود جمال الدین افغانی بھی انہی کو دوسروں سے زیادہ چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ جب وہ مصر سے جا رہے تھے تو انہوں نے کہا تھا "میں مصر میں شیخ محمد عبدہ کے علم کی بڑی دولت چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب جمال الدین افغانی مصر چلے گئے تو امام محمد عبدہ نے از سر نو علوم میں غور و فکر کرنا شروع کیا اور دین کو براہ راست اس کے سرچشموں سے حاصل کرنے لگے تا آنکہ وہ علوم عقلیہ و نقلیہ و لسانیہ میں امام بن گئے اور ۱۲۹۴ھ میں انہیں درجہ عالیہ کی سند مل گئی۔ پھر وہ دار العلوم اور زبانوں کے مدرسہ میں ادب و تاریخ کے استاد بنائے گئے اور بعد میں وہ الوقائع الرسمیہ و اصلاح اللغۃ العربیہ کے ایڈیٹر بنا دیے گئے۔

پھر قوم کے دلوں میں علامہ افغانی کی تعلیمات نشو و نما پانے لگیں اور وہ قوم کو اس طرح برانگیختہ کرنے لگیں کہ منحوس عربی بغاوت تک نوبت پہنچ گئی۔ استاد محمد عبدہ اس تحریک کے حامی و معاون تھے اور انہوں نے خدیو کو معزول کرنے کا فتویٰ بھی دیا تھا۔ چنانچہ انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ شام چلے گئے۔ اور وہاں چھ سال اقامت کی اس عرصہ میں انہوں نے "نہج البلاغۃ" اور "مقامات بدیع" کی شرحیں لکھیں۔ پھر وہاں سے جمال الدین افغانی کے پاس پیرس چلے گئے

یہاں دونوں نے مشہور رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" نکالا اور اس کے ذریعہ دین وعلم، ادب واصلاح کی دعوت عام کرنے لگے۔ چنانچہ عالم اسلامی کے پاکیزہ قلوب کو اس کوشش سے بڑی مسرت ہوئی، لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ امام محمد عبدہ نے مغربی تمدن وعلوم کے جو نمونے دیکھے تھے ان کی وجہ سے انہیں شوق ہوا کہ وہ ان سے واقفیت حاصل کریں، چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھنا شروع کی اور چند مہینوں انہوں نے اس زبان میں مہارت حاصل کر لی۔ پھر خدیوی عام معافی میں ان کو بھی معاف کر دیا گیا اور یہ روشن ضمیر، وسیع علم اور پختہ عمر لے کر وطن پلٹے۔ اور یہاں عدالت مرافعہ میں مشیر مقرر ہو گئے۔ ازہریں معانی بیان اور تفسیر قرآن کے درس بھی دیتے۔ اُن کے درس میں وکلاء، ادباء، صحافی، ماہرین تعلیم، سب ہی قسم کے لوگ جمع ہوتے۔ پھر انہیں منصب افتاء پر فائز کیا گیا اور تا دم آخر اسی عہدہ پر رہے۔ اسکندریہ میں وفات پائی اور قاہرہ میں دفن کیا گیا۔

ان کا حلیہ واخلاق :- وہ درمیانہ قد، گندمی رنگ اور پختہ کاٹھی والے تھے۔ تیز نگاہ بلیغ وخوش مقال، قوی الحافظہ، ذہین اور زندہ دل تھے۔ خودداری، پاکیزگی عقل، دوربینی، عزیمت، خوش خلقی بیباکی وحق گوئی، حتی کہ اپنی ہیئت میں بھی وہ ابن خلدون سے بہت حد تک مشابہ تھے۔ نیز حق کی رضا جوئی، بدعت سے لڑائی میں بھی انہوں نے ابن خلدون کی طرح عوام وخواص کی دشمنی مول لی جیسا کہ ہر قوم میں مصلحین کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

زبان وادب پر ان کی اثر اندازی :- ان کے زمانہ میں عربی زبان پر عجمیت چھائی ہوئی تھی اور وہ خستہ وبے جان ہو رہی تھی۔ انہوں نے اسے عجمیت کے تسلط سے نجات دلانے اور از سر نو زندہ کرنے کے لیے پوری جد وجہد کی۔ جب وہ الجریدۃ الرسمیہ کے ایڈیٹر تھے تو وہ بڑے غور سے رسالوں، اخباروں اور دفتروں کی زبانوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے۔ اپنے رسالہ میں انہوں نے مضامین کا ایک سلسلہ جاری کیا تھا جس میں بھونڈے اسالیب اور غلط تراکیب پر تنقید ہوتی۔ غلط تحریروں کے نمونے دیتے۔ پھر ان کی غلطی کے اسباب بیان کرتے اور ساتھ ہی لکھنے والوں کی اصلاح وتربیت کے لیے اس مضمون کو صحیح اور فصیح عربی میں لکھ کر بتاتے۔ پھر انہوں نے تعلیم وتدریس میں ازہریوں کا طریقہ چھوڑ کر ایک جداگانہ انداز اختیار کیا۔ اور نہایت جاذب ودلپذیر انداز سے بلاغت کے موضوع پر عبد القاہر کی دو کتابیں پڑھائیں۔ زبان رسول ؐ میں کتاب اللہ کی تفسیر کی۔ ان کے درس کا انداز خطیبانہ ہوتا جس میں زبان زور، استدلال کی قوت اور روانی ہوتی۔ طلبہ ان کے زور بیان سے بھی اسی طرح مستفید ہوتے جس طرح وہ ان کے علمی افادات سے متمتع ہوتے۔ انہی کی شخصیت عربی کتابوں کے نشر واحیاء میں پیش پیش تھی اور وہی تھے

جنہوں نے ازہر میں ادب پڑھانے کی طرح ڈالی۔ احیاءِ کتب عربیہ میں انہوں نے امام محمد محمود شنقیطی سے مدد لی اور ازہر میں تدریس ادب کے لیے ہمارے استاد سید بن علی مرصفی کا تعاون حاصل کیا۔

دین وعلم پر ان کی اثر اندازی:۔ افق دین پر بدعتوں اور گمراہیوں کی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ محمد عبدہ نے اپنے علم و فکر کا آفتاب طلوع کر کے باطل کی بدلیوں کو منتشر کر دیا اور حق کی بنیادیں از سرِ نو استوار و مستحکم کر دیں۔ انہوں نے دیکھا کہ جدید علوم و سائنس دین کے سامنے کچھ گستاخ و بے باک ہو گئے ہیں۔ لہذا وہ ان دونوں کے درمیان افہام و تفہیم کے لیے اسی طرح کھڑے ہو گئے جیسے اپنے زمانوں میں ابن سینا اور ابن رشد کھڑے ہوئے تھے۔ وہ علوم جدیدہ، سائنس اور عقل کی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر کرنے لگے۔ عبد القاہر کے طرز پر انہوں نے عقیدہ توحید پر ایک رسالہ لکھا، اس طرح وہ عقائد کے سمجھنے میں آسانیاں پیدا کر کے ان کے ابہامات دور کرنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسیحی مبلغین اور استعمار پسند طبقہ کی طرف سے اسلام پر جھوٹے الزامات تراشے جا رہے ہیں چنانچہ انہوں نے دلائل و براہین کے ذریعہ ان کے الزامات کا جواب دیا۔ ان کے دلائل کو کمزور ثابت کیا۔ ان کی کتاب "رد النصرانیۃ والاسلام" اور ہانوٹو فرانسیسی کا رد، اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

المختصر یہ کہ مفتی محمد عبدہ ان عظیم مجتہدین اور علماء محققین میں سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے حق کی تائید و نصرت کے لیے چن لیتا ہے، جو تجدید دین کے فرائض انجام دیتے، علمی بنیادیں مضبوط کرتے اور زمین سے فساد کو مٹاتے ہیں۔

ان کا اسلوب نگارش:۔ امام کا ایک مخصوص طرز نگارش ہے جو نہایت درجہ خوشگوار و دلپذیر ہے اور ایسا حسین ہے جیسے باغ کا قطعہ، ان کے جوابات اور مقالات میں ان کا یہ اسلوب آپ کو نمایاں نظر آئے گا۔ مکاتیب نگاری میں وہ ابن العمید کی طرز انشاء کو اپناتے ہیں لہذا اس میں تکلف سجع بندی اور صنعت پسندی ہے۔ لیکن تالیفات میں ان کا اسلوب جاحظ کا سا ہے۔ جس میں عبارت موضوع کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ فقرے موزوں و مرتب ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے سامنے متفرق موضوع ہوتے ہیں لہذا ہر موضوع کی مناسبت سے وہ اس کے لیے جداگانہ اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں۔ رہا ان کی شاعری کا معاملہ تو ہمیں اس کا کوئی علم نہیں کہ انہوں نے کبھی شاعری کی ہو۔ لیکن لوگ ان کے کچھ اشعار بیان کرتے ہیں جو انہوں نے دم مرگ کہے تھے اور وہ یہ ہیں:۔

ولست أبالی ان یقال محمد ۔۔۔ ابلّ او اکتظت علیہ الماتم

ولکن دینًا قد اردت صلاحہ ۔۔۔ أحاذر ان تقضی علیہ العمائم

فیارب ان قدرت رجعی قریبة الی عالم الارواح والفضی خاتم
فبارك علی الاسلام وزقه مرشدًا رشیدًا یضیٔ النھج واللیل قاتم

مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ محمد (عبدہ) صحت پاتا ہے یا اس کا بڑے پیمانہ پر ماتم کیا جاتا ہے۔ لیکن مجھے یہ خدشہ ضرور ہے کہ وہ دین جس کو صحیح شکل میں قائم کرنے کا میں نے ارادہ کیا تھا کہیں عمامے اور دستاریں اس کا خاتمہ نہ کر دیں۔ اے میرے رب! اگر مستقبل قریب میں تو نے میرے لیے عالم ارواح میں واپسی مقدر کی ہے اور میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ تو خدایا تو اسلام کو بڑھانا اور اس کا چمن پھلا پھولا رکھنا۔ اسے ایسا رہبر کامل عطا فرمانا جو اس تاریک رات میں راستہ روشن کرتا چلا جائے۔

تحریر کا نمونہ:۔ ایک شامی عالم نے امام کو منصب افتاء کی تفویض پر مبارک بادی کا خط لکھا۔ تو اس کے جواب میں امام نے یہ خط لکھا۔ اس خط میں امام ان مشکلات کا تذکرہ کر رہے ہیں جو اصلاح کی راہ میں شیوخ و علماء دین کی طرف سے انہیں پہنچیں۔

آپ کی قوم نے میرے منصب افتاء پر فائز ہونے سے مسرت محسوس کر کے میرے ساتھ انصاف کا ثبوت دیا ہے، شاید یہ اقدام اس احساس کے تحت ہوا ہے کہ وہ مجھے دین اللہ کے بارے میں سب سے زیادہ مستعد، موقع شناس، تبلیغ حق میں سب سے زیادہ ماہر و بیباک سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے دلوں میں نہ میرے خلاف حسد ہے نہ مخاصمت، اور ہر دیندار کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ میری طرح اپنے دینی معاملات میں ہمت و عزیمت کا ثبوت دے، بالخصوص جب کہ اسے جنگ سے بچا لیا جائے اور سفر کرنے یا مال خرچ کرنے کی تکلیف بھی نہ دی جائے۔

لیکن میری قوم کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ جو جتنا مجھ سے قریب ہے اتنا ہی مجھ سے بعید ہے۔ انصاف ان سے بہت دور ہے۔ میرے متعلق وہ قسم قسم کے گمان رکھتے ہیں۔ بلکہ خدا سے چاہتے ہیں کہ میں حوادث روزگار کا شکار ہو جاؤں۔ اس لیے کہ وہ جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ مبتلائے اوہام باتیں بنانے کے خوگر، لعن طعن اور ملامت کرنے میں مزہ لینے والے ہیں۔ میں کہتا ہوں اور وہ نہیں سنتے۔ میں بلاتا ہوں اور وہ لبیک نہیں کہتے۔ میں عمل کرتا ہوں لیکن وہ اس سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے۔ میں انہیں ان کی بھلائی کے کام بتاتا ہوں لیکن وہ آنکھیں نہیں کھولتے۔ میں انہیں ہاتھ پکڑ کر وہاں تک پہنچاتا ہوں لیکن وہ شعور سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ اپنی تباہی کی طرف بھاگتے ہیں چیخ پکار اور شور و غل ان کا مشغلہ ہے۔ جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہ اس طرح اس سے دور ہو جاتے ہیں جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:۔

لکن قومی و ان کانوا ذوی عدد لیسوا من الشر فی شیٔ وان ھانا

لیکن باوجود کثیر تعداد ہونے کے میری قوم ایسی ہے کہ وہ شر میں قطعاً کوئی حصہ ہی

نہیں لیتی تواہ وہ شربت معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

ان میں میری مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک بھائی جسے اس کے سب بھائی بیوقوف بنائیں۔ یا وہ باپ جس کی اولاد اس سے بغاوت کر دے۔ یا وہ بیٹا جس پر اس کے ماں باپ اور اقرباء مہربان نہ ہیں۔ حالانکہ سب کو اس کی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر ان کی عمارت استوار نہیں رہ سکتی۔ اس کو شناکر وہ اپنے مصالح ہی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اور اگر وہ چاہتے تو اسے بچا کر خود اپنے آپ کو بچا لیتے لیکن وہ ہے کہ مسلسل جد و جہد کرتا جا رہا ہے اور ان کے نشو و نما کا انتظام کر رہا ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں کہ اس نے اس نازک مرحلہ پر بھی مجھے صبر کشادہ ظرفی اور حلم و عزم کی توفیق بخشی مجھے خطرہ ہے کہ امید بر آنے سے پہلے موت آن پہنچے گی۔ بالخصوص اس صورت میں جب کہ ساری کوششیں ایسی بنجر زمین پر صرف ہو رہی ہیں کہ اگر آسمان بھی پانی بن کر اس پر پگھل جائے تب بھی اس میں نہ کھیتی اگے گی نہ کوئی درخت ہی پھوٹے گا۔ اس بھیانک تصور کی یاد سے میں گھبرا کر ہمت ہارنے لگتا ہوں اور میرا دل پھٹنے لگتا ہے، پھر میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور وہ عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

اس طرح پھر میرے دل کو قرار نصیب ہوتا ہے اور میں اس امید پر اپنی پیہم جد و جہد میں لگ جاتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی شکل پیدا کر دے گا۔

کاش میں اس جاہلیت کے دور میں ہوتا جس کی بدکرداریاں اور غلط رسومات مٹانے کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اور اس دور میں مجھے علماء کی جہالت اور اساتذہ کی حماقت کی شکایت ہوتی۔ اس جاہلیت میں اگرچہ گمراہی بہت بڑھ چکی تھی تاہم قوم میں سمجھنے کی طاقت قوی تھی۔ یہی سبب ہے کہ جب ان کے سامنے ضوء ہدایت روشن ہوئی تو انہوں نے اسے دیکھا، اور جب داعی کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے اس پر لبیک کہا، قرآن ان کے دلوں کو پھاڑتا، ان کی سختی کو نرم کرتا، ان کی تندی کو ختم کرتا اور اور ان کی سخت چٹانوں میں سے رحمت و مہربانی کے چشمے جاری کر دیتا تھا۔ ان میں بہت کم ہٹ دھرم تھے جو حق پہچاننے کے بعد بھی اسے نہ مانتے، ایک جماعت تو صرف اس خوف کی بناء پر حق سے بھاگتی تھی کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے، کیونکہ اگر وہ اسے سن لے اور سمجھ لے تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ وہ اس کی آواز پر لبیک کہے اور اس کی حمایت کرنے لگے۔ سمجھ کے ساتھ انکار ایسا ہی ہے جیسے علم کے ساتھ یقین، اور یہ دونوں چیزیں بنی آدم میں کم ملتی ہیں۔ لیکن آج مجھے جس چیز کا گلہ ہے وہ کم فہمی ضعف عقل، غربت ادراک کا خلل، اور خواص کی بد احساسی ہے، نہ انہیں فصاحت اپنی طرف

کھینچتی ہے نہ بلاغت ان کے دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے، ان کی سب سے بڑی اور آخری تمنا یہ ہے کہ ان کی تعریف ایسے کاموں پر کی جائے جو انہوں نے نہ کیے ہوں۔ اور خواہ یہ نرے جاہل ہوں انہیں عالم و فاضل بتایا جائے، اور جب یہ کوئی مطالبہ کریں تو اس کو پورا کر دیا جائے۔ اور خواہ یہ گرتے چلے جائیں لیکن ان کا مقام بلند ہی رکھا جائے۔ یہ واقعہ ہے کہ متکلم کی گفتگو پر سامع کی فہم اور صلاحیت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور بحث و مناظرہ میں فکر کو سیدھا کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں میں زندگی گذارنا جو بات سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں ذہانت و گویائی کے سوتے کو بند کر دیتا، فکر کی آنکھ کو نابینا کرتا، اور روح عقل کو تباہ کر دیتا ہے....

ابراہیم بک مویلحی

(پیدائش ۱۲۶۲ھ وفات ۱۳۲۳ھ)

حالاتِ زندگی: یہ عظیم القدر انشاء پرداز آسودہ و دولتمند خاندان کے تاجر گھرانہ میں پیدا ہوا جسے خانوادہ خدیویہ مالکیہ میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ جوانی کے زمانہ سے اسے کاروبار اور تجارتی معاملات میں حصہ لینے کی تربیت دی گئی۔ لیکن ان کی بے چین ذہندی طبیعت اور ہمت بلند معمولی اور جائز قانونی منافع پر قناعت نہ کر سکی لہذا انہوں نے اپنے مال کو مختلف سٹوں اور لاٹریوں میں لگانا شروع کر دیا۔ جس سے انہیں سوائے نقصان کے کوئی منفعت حاصل نہ ہوئی۔ پھر وہ قدرے تنگی کی زندگی گذارنے لگے تاآنکہ انہیں اسماعیل پاشا کی بخشش کی ایک رو پہنچی اور وہ عدالت مرافعہ میں جج بنا دیے گئے۔ لیکن کسی بات پر انہیں ان کے افسر اعلی سے اختلاف ہو گیا جس کے نتیجہ میں استعفٰے دینا پڑا۔ خدیو نے انہیں دوسری جگہ متعین کر دیا لیکن وہاں بھی وہی ناکامی رہی جو تجارت اور ججی کے عہدہ میں ہوئی تھی۔ پھر شریف وزارت کا دور آیا جس نے پہلا آئین مرتب کرنا چاہا چنانچہ اس خدمت کے لیے مویلحی کو منتخب کیا گیا تاکہ وہ باطنی آئین بنائیں۔ لیکن ان کی مساعی کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی پر جا کر ختم ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے معاشی فکر سے آزاد ہونے کے لیے انشاء پردازی اور نشر و اشاعت کو ذریعہ بنانا چاہا۔ اور اعلی پایہ کی کتابیں شائع کرنے کے لیے جمعیۃ المعارف کی بناء ڈالی اور کتابوں کو چھاپنے کے لیے ایک مطبعہ اپنے لیے خرید لیا۔ پھر مرحوم محمد بک عثمان جلال، مترجم ملییر و مولف "العیون الیواقظ" سے مل کر "نزہۃ الافکار" نامی رسالہ نکالا۔ لیکن اسماعیل پاشا کو اس طرف سے کوئی خطرہ ہوا اور انہوں نے اسے بند کر دیا۔ ۱۲۹۶ھ میں جب خدیو معزول ہو کر اٹلی چلا گیا تو اس نے ابراہیم کو اپنا سکریٹری بنا کر بلوایا۔ چنانچہ وہ چند سال اس خدمت کو سرانجام دیتے رہے اور اس خدمت کے

دوران میں انہوں نے اٹلی سے "الاتحاد" اور "الانباء" نام کے دو رسالے بھی نکالے لیکن وہ زیادہ نہ چل سکے۔ پھر ۱۳۰۳ھ میں آستانہ چلے گئے جہاں عبدالحمید نے ان کی بڑی آؤبھگت کی اور انہیں تعلیمی بورڈ کا رکن بنا لیا۔ یہاں وہ نو سال تک رہا اس عرصہ میں اس نے ترکی محکموں کے افسروں اور حکومت کے سربراہوں سے رابطہ رکھا۔ پھر وہ مصر آئے، اس وقت ان کے بال سفید ہو رہے تھے، زمانہ نے ان کا جسم بھی گھٹا دیا تھا۔ یہاں انہوں نے ایک ہفتہ وار رسالہ "مصباح الشرق" نکالا جسے وہ نہایت حسین الفاظ اور خوشنما اسلوب سے مرتب کرتے تھے۔ اس رسالہ نے ادیبوں کی دیرینہ آرزو پوری کی انہیں انشاء کا ایک سیدھا اور پختہ اسلوب بتایا۔ اسی رسالہ نے ان کے لیے رؤساء و کبراء کی محفل میں جگہ بنائی۔ وہ تاحیات یہ رسالہ نکالتے رہے۔

اس کا اسلوب نگارش:- مویلحی کے زمانہ میں انشاء صنعت کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی اور خستہ حال تھی۔ لہذا ان کی تحریر بھی بدیع کے غالب اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی، نہ ہی اسے ظاہری حسن و نمائش سے نجات مل سکی۔ تاہم ملکوں کی سیاست مختلف معاملات میں تصرف، قسم قسم کے لوگوں سے میل جول، ملک کے سربراہوں سے رابطہ، سیاسیات میں بے باکی سے حصہ لینا، صحافت کا وسیع تجربہ، وہ اسباب ہیں جنہوں نے ان کی طبیعت کو کھول دیا تھا اور ان میں ہر موضوع پر قلم اٹھانے اور ہر مطلب کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ ان کا اسلوب نگارش آسان بنا دیا تھا اور ان کے ہاتھ میں بلاغت کی لگام دے دی تھی جس کے ذریعہ وہ اسے جدھر چاہتے پھیر دیتے تھے۔ بالخصوص مضمون نگاری میں انہیں کمال حاصل تھا اور وہ اس کے ہر پہلو کو نہایت خوبی سے پیش کرتے تھے۔ مویلحی کی تحریریں گو معنوی پہلو سے کچھ اضطراب، اور جدت طرازی میں کچھ کمزوری ہے، لیکن اس نے نثر نویسی میں وہی کام کیا جو شاعری میں بارودی نے کیا۔ اس نے انشاء پردازی کے بگڑے ہوئے اسالیب کی تجدید کی۔ معانی و بیان کے دھندلے نقوش کو اجاگر کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس مبارک تحریک کا ایک محکم ستون ہے۔

اس کے علمی آثار:- ان کے آثار کا بیشتر حصہ ان سیاسی و اجتماعی مقالات کی شکل میں ہے جو انہوں نے اپنے جاری کردہ رسالوں مثلاً نزہۃ الافکار، الاتحاد، الانباء اور مصباح الشرق میں لکھے تھے یا وہ مقالات جو انہوں نے دوسرے مجلات مثلاً انگلینڈ کے ضیاء الخافقین اور فرانس کے العروۃ الوثقی کے لیے لکھے۔ علاوہ ازیں ان کی ایک کتاب "الفرج بعد الشدۃ" ہے جو ریاض پاشا کی وزارت کے حالات پر مشتمل ہے، اور دوسری کتاب "ما ہنالک" ہے جس میں انہوں نے آستانہ کے قیام میں جو کچھ دیکھا وہ لکھ دیا ہے۔

نمونۂ نثر: ۔آستانہ میں جمعہ کی نماز کے شاہی جلوس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:۔

وہ رعب و دبدبہ وہ شان و شوکت وہ حسن و جمال جس کا نظارہ جمعہ کے شاہی جلوس میں ہوتا ہے اس کی مثال نہ قیصر کی فتح مند فوج سے دی جاسکتی ہے نہ سکندر کے عظیم لشکر سے۔ یہ کیا چیزیں ہیں خود سعد قادسیہ سے اور معتصم عموریہ سے آتے ہوئے بھی اس شاہی جلوس کا مقابلہ نہیں کر سکتے جمعہ کے دن ظہر سے دو گھنٹہ قبل پیادہ اور گھوڑ سوار فوج تمام اطراف سے بشکطاش پہنچتی ہے۔ اس کی تعداد دس ہزار یا اس سے بھی زائد ہوتی ہے۔ یہاں یہ شاہی گذرگاہ پر سرکار کے مسجد کی طرف تشریف فرما ہونے کی منتظر رہتی ہے۔ یہ اس دلیس کا آج تک دستور رہا ہے، جلالتمآب نماز جمعہ مسجد حمیدی میں ادا فرماتے ہیں۔ جب حضور کی تشریف نکلنے کا وقت ہونے لگتا ہے تو فوج باب سرائے کے سامنے مسجد کے میدان میں جمع ہو کر ایک کے پیچھے ایک صف بستہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس اثناء میں مشیروں، وزیروں، مشائخ، غیر ملکی سفراء وغیرہ کی سواریاں پہنچنا شروع ہو جاتی ہیں۔ سفراء اور ان کے ساتھ آستانہ آنے والے معزز مہمان حبیب ہمایونی کے ہال میں بیٹھتے ہیں۔ جو اس صحن کی طرف نکلتا ہے جس میں سوائے تلواروں کی جھنکار کے کوئی انسانی یا حیوانی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ہاں ہیبت و جلال سلطانی اور حضور پرنور کے انتظار و استقبال میں کچھ سانسیں چلنے کی آوازیں ضرور سنائی دیتی ہیں۔ جب نماز کا وقت ہو جاتا ہے تو مطلع سرائے سے شاہی سواری کا سنہرا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ یہ سواری امام وقت نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کو اٹھائے ہوتی ہے۔ اس کے آگے کے حصہ میں غازی عثمان پاشا تشریف رکھتے ہیں۔ وزراء و مشیر اور اعلیٰ سرکاری افسر امام کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے سر جھکائے خشوع و خضوع سے سواری کے اردگرد پیدل چلتے ہیں۔ یہ وہی افسر ہیں جو دوسرے اوقات میں قیصر و کسریٰ کی عظمت و جبروت رکھتے ہیں۔ یہ سب کے سب سنہری پوشاک میں ملبوس بسیج خواں ہوتے ہیں۔ ان کے سینوں پر جواہرات ٹکے ہوئے بلے ہوتے ہیں جن کی چمک نگاہوں کو خیرہ اور عقل کو مسلوب کر لیتی ہے اور اس منظر کا مشاہدہ کرنے والا بیہم خدا کی حمد و ثنا میں مشغول ہو جاتا ہے کہ اس نے حکومت کو ایسے وفادار اور مخلص خادم عنایت فرمائے۔ ان کے سینوں پر حکومت کی طرف سے یہ بلے اس امر کی شہادت کے طور پر آویزاں کیے گئے ہیں کہ ان کے اندر وہ جوہر و فضائل موجود ہیں جو ملک کی عزت و حمیت و غیرت کے لیے درکار ہیں۔ لیکن اگر سینے پر آویزاں بلے کی تحریر دل پر لکھی ہوئی تحریر سے ہم آہنگ نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے دغا باز تاجر سرکہ کی بوتل پہ عرق گلاب کا لیبل چسپاں کر لے۔

شیخ علی یوسف

(پیدائش ۱۲۸۰ھ وفات ۱۳۳۱ھ)

حالات زندگی: یہ ذہین سیاست دان، ماہر صحافی، ضلع جرجان کے شہر بلصفورة میں ایک پاکیزہ سرشت، خستہ حال گھرانہ میں پیدا ہوا۔ اسے پیدا ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پھر ماں اسے لے کر اس کے ننھیال بنی عدی میں چلی گئی جو منفلوط میں مقیم تھے، یہاں اس کی تربیت ہوئی اور یہیں وہ جوان ہوا۔ اس نے قرآن مجید حفظ کیا اور کچھ ابتدائی علوم حاصل کیے۔ ۱۲۹۹ھ میں اسے ازہر بھیج دیا گیا جہاں اس نے منتخب اساتذہ کی زیر نگرانی فقہ، نحو، صرف، بلاغت، منطق، مبادی فلسفہ، توحید وغیرہ میں درک پیدا کیا لیکن اس کا بلند نفس اور ہمت عالیہ اس پر قناعت نہ کر سکی۔ اسے ازہر میں جمود و گمنامی نظر آنے لگی اور اس نے ازہریوں کے طریقہ پر زندگی گذارنے سے اعراض برت لیا۔ اس نے بعض امراء زادوں سے تعلق پیدا کر کے ان کی محفلوں کو رونق بخشنا اور ان کی مدح میں شعر کہنا شروع کر دیے۔ حتی کہ مصر میں رسالہ الجوائب کے ایڈیٹر مرحوم احمد فارس شدیاق آئے اور انہوں نے یہاں سے "القاہرۃ الحرۃ" نامی رسالہ نکالا۔ چنانچہ شیخ ان کے ساتھ رہ کر ادبی کاموں میں ان کی مدد کرنے لگے۔ اس اتصال سے ان میں انشاء پردازی اور صحافت نگاری کا ملکہ پیدا ہو گیا۔ پھر انہوں نے "الآداب" کے نام سے اپنا ایک رسالہ نکالا جو ۱۳۰۷ھ تک جاری رہا۔ اس وقت اللہ نے اس عالی نفس، بلند ہمت شخص کو ایک موقع دیا کہ وہ تمام حدود وقیود سے نکل کر تقدیر سے بھی آگے بڑھ کر اپنے ایک قدیم ازہری رفیق کے ساتھ ایک سیاسی روزنامہ جاری کریں جس کا نام انہوں نے "المؤید" رکھا۔

ربیع الثانی ۱۳۰۷ھ میں اس روزنامہ کا پہلا شمارہ نکلا۔ (یعنی یکم دسمبر ۱۸۹۸ء میں) اس وقت اس پرچہ کی مالی حالت خستہ تھی، اسے نہ حکومت سے کوئی مدد ملتی تھی نہ کسی سیاسی پارٹی کی حمایت حاصل تھی، نہ ہی قوم کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ چنانچہ مالی کمزوری کی وجہ سے اس شخص کو اخبار نکالنے میں بڑی دقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس نازک موقع پر قابل و ماہر وکیل سعد افندی زغلول اور بلند پایہ ادیب ابراہیم افندی لقانی جیسوں کی مدد اس کے شامل حال کر دی جنہوں نے اس کی مالی اور قلمی اعانت کی۔ پھر کچھ دنوں بعد دونوں شریکوں میں باہم اختلافات ہو گیا۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ اخبار خالصتاً شیخ علی کا ہو جائے بشرطیکہ وہ اپنے شریک کو ایک سو گنی نقد ادا کر دے۔ اس مایوسی کے نازک مرحلہ میں اگر دوبارہ سعد زغلول اس رقم پر مشتمل ایک تھیلی دے کر اس پر احسان نہ کرتے تو اس کے لیے یہ شرط پوری

کرنا ممکن نہ تھی۔ اس کے بعد "المؤید" باقاعدہ کامیابی کے ساتھ نکلتا رہا۔ اسے حکومت کے سربراہ کی مدد اور چوٹی کے ادیبوں کی قلمی اعانت حاصل تھی۔ مثلاً سعد بک زغلول، شیخ محمد عبدہ، شیخ عبدالکریم سلمان، سید توفیق بکری، فتحی بک زغلول، ابراہیم بک مویلحی، قاسم بک امین، اسماعیل پاپاشا اباظہ، مصطفےٰ لطفی منفلوطی وغیرہ۔ چنانچہ یہ پرچہ عالم اسلام میں اس قدر مقبول اور عام ہوا کہ اس سے پہلے کسی پرچہ کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اس زمانہ جو جہالت و ناخواندگی کا دور کہلاتا ہے یہ آٹھ ہزار کی تعداد میں چھپتا تھا۔ اس پرچہ نے اسلام کی مدافعت اور حکومت کی بقاء کے سلسلہ میں نمایاں کارنامے انجام دیے جس کی وجہ سے خلیفہ خدیو اور قوم سب ہی اس سے خوش تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسے بلند القاب اور تمغوں سے نوازا اور اسے نیک نامی بخشی۔ لیکن فساد پسند عناصر اس کے اور غیر ملکیوں کے درمیان دشمنی پیدا کرانے کی کوششیں کرنے لگے۔ سفیروں اور غیر ممالک کے نمائندوں کو اس کے خلاف بھڑکانے لگے۔ لیکن وہ اپنے خلوص، صداقت و ہمت، اور عزم و حزم سے ان تمام مشکلات پر قابو پاتا رہا۔

پھر انہوں نے آل سادات میں شادی کر لی۔ جس کا بڑا جھگڑا چلتا رہا اور بڑے چرچے ہوئے۔ لیکن بالآخر حسب معمول اس جھگڑے میں بھی اسے ہی کامیابی ہوئی چنانچہ وہ اپنی بیوی کو واپس اپنے گھر لے آیا۔

شیخ علی کا نام حکومت دوستی اور خدمت تاج میں مشہور ہو گیا۔ حتیٰ کہ خدیو عباس کی نظر میں وہ معتبر و امین مشیر، لسان ناطق اور تیغ بے نیام بن گیا۔ یوں یہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والا، بلند ہمت، غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک، اپنے دشمنوں حاسدوں اور مخالفوں کی کثرت کے باوجود، نہایت باعزت بلند مرتبہ اور ہر دلعزیز کی زندگی گذارتا رہا تا آنکہ سنیچر کے دن ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔

اخلاق و فضائل: شیخ علی نہایت درجہ خلیق و کریم واقع ہوئے تھے۔ اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز تھا۔ وہ نرم خو، خاکسار، وسیع القلب، نہایت بامروت، وفا کیش، ذہین، معاملہ فہم، دور رس اور اپنے اوپر پورا پورا بھروسہ کرنے والے تھے۔ وہ نہایت ہوشیار اور گہرے آدمی تھے۔ اس لیے ان کے دشمن ان پر چالبازی اور سازش کرنے کا الزام لگاتے تھے۔ وہ سیاست میں بڑے ضبط و تحمل سے کام لیتے تھے لہٰذا ان کے دشمن انہیں خائن اور دھوکہ باز سمجھتے تھے۔ وہ کار خیر میں پیش پیش رہتے اور لوگوں کو بھی رفاہ عامہ کے کاموں کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ لوگ ان کے الجمعیۃ الخیریۃ الاسلامیۃ کی تاسیس کے کارنامے کو بھلا نہیں سکیں گے۔ انہوں نے ہی عربی مدارس میں عربی زبان کے ذریعہ تعلیم کو عام کیا۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ مشہور مقولہ زبان زد خاص و عام ہے:

"قوم کو اس کی زبان میں تعلیم دینے سے محض چند افراد تک علم کی رسائی ہوتی ہے۔"

ان کی تعلیم اور طرز نگارش:- شیخ نے آخر تک ازہر کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لہٰذا وہ علم کی گہرائی میں نہیں گئے۔ نہ انہیں ادب میں وسیع معلومات حاصل ہوئی۔ انہوں نے نہ زندگی کے فنون میں سے کسی فن میں مہارت حاصل کی نہ لوگوں کی زبانوں میں سے کسی زبان میں کمال حاصل کیا۔ بایں ہمہ وہ تمام صحافیوں میں سب سے بہتر انشاء پرداز تھے۔ ان کا اپنا ایک مخصوص اسلوب تھا جس میں نہ صنعت کی آمیزش نہ تھی نہ ملمع کاری کی نمائش۔ ان کی دل گدازی، خوش ادائی، صحت استدلال، زور بیان، راستی فکر وہ چیزیں ہیں جو قاری پر جادو کر دیتی ہیں۔ انہیں بلا کی مناظرانہ قوت ملی تھی۔ بہت سے ایسے موقعے آئے جن میں وہ جریدہ کی طرح بہت سے ادیبوں کے مقابلہ میں تنہا ڈٹے رہے۔ اور حق و دلائل سے اپنے مخالفین کو زیر کیا۔

عنفوان شباب میں انہوں نے کچھ شاعری کرنا شروع کی تھی۔ لیکن وہ ان کے بس کا روگ نہ تھی۔ شاعری میں بھی ان کا اسلوب ازہریوں جیسا نہ تھا۔ اپنی شاعری کا مجموعہ انہوں نے "نسمۃ السحر" کے نام سے ۱۳۰۳ھ میں شائع کر دیا تھا۔

ان کی نثر کا نمونہ:- لارڈ کرومر کی روانگی پر جو مصر میں برطانیہ کے وائسرائے تھے ایک الوداعی پارٹی اوپیرا تھیٹر میں دی گئی تھی۔ اس موقع پر لارڈ کرومر نے جو تقریر کی اس کے رد میں وہ لکھتا ہے:-

تقفون والفلک المحرک دائر — و — تقدرون فتضحک الاقدار

تم ٹھہرتے ہو لیکن چرخ نیلوفری گردش میں ہے۔ تم اندازے لگاتے ہو اور تقدیر اس پر ہنستی ہے۔

گذشتہ سینچر کی شام بڑے شاہی دار التمثیل (تھیٹر) میں بڑے بڑے مقررین نے ایکٹروں کا پارٹ ادا کیا۔ وہ ماضی و مستقبل کے بارے میں اس طرح فیصلے کر رہے تھے جیسے کائنات میں قضاء و قدر فیصلے کرتے ہیں۔ وہ معاملات کے ادھیڑ بن اور انہیں اوپر نیچے کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ لوگ طوعاً و کرہاً ان کی باتیں سن رہے تھے اس لیے کہ گنے چنے وہاں کل تین ہی مقرر تھے۔ اگر آزادی سے ہر بولنے والے کو اظہار خیال کی اجازت دی جاتی تو جس طرح وہ اپنی پسندیدہ باتیں ہی کہہ رہے تھے انہیں بعض ناپسندیدہ باتیں بھی سننا پڑتیں۔

ہم نے کہا کہ ان مقررین نے ان ایکٹروں کا سا پارٹ ادا کیا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں واقعتاً انہوں نے کثیر الحوادث، متعدد مناظر اور لمبے ڈرامے کے ایک آخری منظر کا پارٹ ادا کیا۔ جس کا ہیرو مجلس کا وہ آخری مقرر تھا۔ جو ان میں سب سے زیادہ دلوں کو دکھ پہنچانے والا تھا۔ وہ اس سرزمین پر اپنے آخری اقتدار کا پارٹ ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوا اور زبان حال سے یوں کہہ رہا تھا:-

ما في وقوفك ساعة من باس

(تیرے گھڑی بھر کھڑے ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔)

اس نے یہ کردار ایسے مقام میں ادا کیا جو قائل کے لیے بہت زیادہ باعث عبرت نیز اقتدار رفتہ اور مجد زائل کا مظہر تھا۔ اور اس مثل کا بہترین مصداق کہ "ہر بات کے لیے ایک مقام ہے"

اسی تردیدی مقالہ میں آگے چل کر وہ لکھتا ہے:۔

لیکن جیسا کہ منتظمین مجلس کا خیال تھا یہ مجلس اس شخص کے وداع کے اعزاز میں سیاسی مظاہرہ نہ رہی بلکہ وہ الٹ کر لارڈ کرومر کی دشمنی کا ایسا مظاہرہ بن گئی جس کی مثال ایسے موقعوں پر نہ دیکھنے میں آئی نہ سننے میں۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ میر مجلس نے غلطی کی کہ وہ پہلے نہ بولا، اور اسے اب تک اتنا بھی علم نہ ہوا کہ میر مجلس اور رئیس وزارت دونوں عہدوں کے باوجود کوئی دوسرا اس سے پہلے کیونکر تقریر کر سکتا ہے۔ ہمیں اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ اس نے فرانسیسی زبان میں تقریر کی اور ایسے موقع پر اپنی ملکی زبان کا کوئی حصہ نہ رکھا۔ ہمیں اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ وہ حکومت کی طرف سے جمہور کی نمائندگی کر رہا تھا حالانکہ جمہور رائے اور قول میں اس سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ہمیں اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ کونٹ ڈی سرلیون نے یورپین پارٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے انگریزی استعمار کے احسانات گنوائے یا اس نے جمہوری حکومت کی وساطت سے انگریزی سفارت کو پیرس میں کامیاب بنوانا چاہا الخ۔

ان تمام امور سے صرف نظر کرتے ہوئے ہمیں اپنی توجہ لارڈ کی اس سیاسی تقریر کی طرف مبذول کرنا چاہیے جو اس نے اپنی آخری وصیت اور مصر میں اپنی آخری خدمت کی حیثیت سے کی۔

ایسے موقع پر جب کہ مصری قوم اس عظیم القدر مسافر اور دانشمند بزرگ سے اس کی روانگی کے وقت یہ امید لگائے بیٹھی تھی کہ وہ ان کوتاہیوں کا تدارک کرے گا جو اس سے اسلامی شریعت کے بارے میں سرزد ہوئی تھیں اور جن کی وجہ سے اس نے شریعت اسلامی کو دائمی طور پر معطل کر دیا تھا یا اس زیادتی کا مداوا کرے گا جو اس نے مصری قوم کو نکما اور ناکارہ بنا کر کی تھی۔ اسی طرح مصری قوم کو توقع تھی کہ جانے والے محترم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے زخموں پر مرہم رکھیں گے۔ نیز قوم کو امید تھی کہ اپنے عہد حکومت میں انہوں نے انتہائی مطلق العنان حکومتوں کی طرح جو مظالم ڈھائے تھے ان کے متعلق وہ معذرت خواہی کریں گے۔۔۔۔۔ لیکن ہوا کیا۔۔۔۔

لارڈ صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے، تو کینہ اور جھگڑے سے بھرے ہوئے، وہ اپنے دل میں خیال کر رہے تھے کہ اب وہ اس محل کو چھوڑ کر جا رہے ہیں جس کے نیچے نہریں بہتی تھیں

اس حکومت کو خیر باد کہہ رہے ہیں جس کی راتیں اور دن ان کے غلام تھے۔ انہیں اپنے حریفوں کو چھوڑنا پڑ رہا ہے جن سے امید ہے کہ وہ یہ خیال کریں گے کہ ہم جیت گئے اور لارڈ صاحب بھاگ گئے۔۔۔۔۔

لارڈ صاحب تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور ان کے دل میں دو قسم کے خیالات آرہے تھے۔ ایک تو بڑا زور لگا رہا تھا کہ وہ یہاں پر ہی رہ جائیں۔ لیکن دوسرا کہہ رہا تھا کہ استعفیٰ کے بعد رہنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

اپنے علم کے مطابق اپنے تھوڑے دوستوں کو اور اپنے وہم کے مطابق اپنے کثیر دشمنوں کو، انہوں نے یاد کیا۔ کچھ خوش ہوئے اور کچھ بگڑے نرم ہوئے اور سخت ہوئے، وعدہ وعید کیے، ڈانٹ ڈپٹ کی، غصہ ہوئے اور ڈرایا دھمکایا۔ حکم چلایا۔ اور تخمینے لگائے۔ اسی طرح جیسے مثل مشہور ہے دو کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔

حفنی بک ناصف

(پیدائش ۱۲۷۲ھ وفات ۱۳۳۷ھ)

حالاتِ زندگی: محمد حفنی ناصف بن شیخ اسماعیل ناصف ۱۲۷۲ھ میں قاہرہ کی مضافاتی بستی "برکۃ الحج" میں ناداری اور یتیمی کی حالت میں پیدا ہوا اس کے ماموں اور دادی نے اس کی کفالت کی۔ پھر وہ بستی کے مدرسہ میں داخل ہو گیا جہاں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور کچھ حصہ قرآن کا حفظ کیا۔ گیارہ برس کی عمر میں وہ بھاگ کر ازہر چلا گیا اور وہاں تیرہ سال رہا۔ پھر اس نے دارالعلوم میں داخلہ لے لیا اور علوم میں مہارت حاصل کی۔ یہاں سے فراغت کے بعد وہ مدارس امیریہ میں عربی کے استاد مقرر ہو گئے۔ پھر نہیں لا کالج کا استاد منتخب کر لیا گیا۔ یہاں ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ طلبہ کی کلاسوں میں بھی شامل ہو جائیں چنانچہ انہوں نے قانون پڑھ لینے کے بعد پڑھانے کا مشغلہ چھوڑ دیا۔ اور سرکاری وکیل کے سکریٹری بن گئے۔ پھر ۱۸۹۲ء میں وہ ملکی عدالت کے جج معین کر دیے گئے، اور اس ضمن میں اتنی ترقی کی کہ طنطا کی ملکی عدالت کے نمائندہ بن گئے۔ اس اثنا میں انہیں جامعہ مصریہ نے ادب عربی پڑھانے کی دعوت دی جس پر لبیک کہتے ہوئے انہوں نے ادب عربی پر نہایت پر معلومات لکچر دیے جو کتابی شکل میں جمع کر دیے گئے۔ پھر جب وزارت تعلیم کے چیف انسپکٹر شیخ حمزہ فتح اللہ، پنشن پا کر الگ ہو گئے۔ پھر جب وزارت تعلیم کے چیف انسپکٹر شیخ حمزہ فتح اللہ، پنشن پا کر الگ ہو گئے تو پروفیسر حفنی بک ان کی جگہ آ گئے۔ اور ان کے آنے سے مملکت ادب کا نصیبہ جاگ اٹھا اور زبان کے

دن پھر گئے ، یہ مختصر سی مدت انہوں نے علمی بحث و تحقیق میں گذاری تا آنکہ وہ ستر برس کے ہو گئے اور انہیں پنشن مل گئی۔ اس کے بعد وہ صرف تین سال زندہ رہے ، اور نومبر ۱۹۱۹ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مقبرہ شافعی میں دفن ہوئے۔

اخلاق:- مرحوم بڑے خوش مذاق ، شگفتہ طبع ، حاضر جواب ، برجستہ گو ، مزاح پسند اور خلیق تھے۔ وہ ہر علم و فن کا ساتھ دیتے تھے اور قدیم و جدید کو نہایت توازن کے ساتھ ملائے رکھتے تھے۔

ان کی نثر اور شاعری:- حفنی بک ناصف جدید ادبی تحریک کے ایک محکم ستون تھے۔ انہوں نے اپنی علمی کاوشوں اور تالیفوں سے اس تحریک میں جان ڈالی اور اپنے قصائد و مقالات سے اس کو تقویت پہنچائی۔ لغت میں انہیں بڑی مہارت ، قواعد میں وسیع معلومات حاصل تھی۔ وہ اسرار کلام سے باخبر اور فن تنقید میں بڑی نظر رکھتے تھے۔ مضمون نگاری میں ان کا انداز عصر عباسی کے آخری دور کے اسلوب نگارش ان قیود سے آزاد تھا ، لہٰذا اس میں رقت و سلاست اور سادگی و متانت ہے۔

رہی شاعری تو اس کا اسلوب نثر منظوم کا سا ہے ، اس میں لطائف اور لفظی حسن کی زیادتی ہے کبھی کبھی اس کی تراکیب میں کمزوری نمایاں ہو جاتی ہے تاہم مجموعی طور پر وہ رواں اور فطری ہے۔

تالیفات:- انہوں نے دوسرے مولفین کے ساتھ مل کر عربی زبان کے قواعد کی کتابوں کا ایک سلسلہ لکھا جو آج کل مصری مدرسوں میں بطور کورس مقرر ہے۔

"ممیزات لغۃ العرب" کے نام سے ایک کتاب انہوں نے مستشرقین کی اس کانفرنس میں پیش کی تھی جو وائنا میں ۱۸۸۶ء منعقد ہوئی تھی۔ نیز وہ اس وفد کے سکریٹری بھی تھے جو اس کانفرنس میں مصر کی نمائندگی کر رہا تھا۔ جامعہ مصریہ میں انہوں نے جو لکچرز دیئے تھے ان کا مجموعہ "حیاۃ اللغۃ العربیۃ" کے نام سے ہے۔ ایک کتاب "القطار السریع فی علم البدیع" ہے۔ بحث و مناظرہ پر ایک رسالہ لکھا ہے اور ایک رسالہ منطق پر ، ایک "کتاب الامثال العامیہ" اور ایک "بدیع اللغۃ العامیہ" ہے۔ ان کی بیشتر کتب غیر مطبوعہ ہیں۔

اس کی شاعری:- ایک رئیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:-

أحييت آمالي وكنت أمتُّها   من طول ما لاقيتُ من اخواني

أدلى بإخلاصي لهم وأذودعن   أعراضهم بجوارحي ولساني

محضتهم ودي فلما أيسروا   كانت بداية أمرهم نسياني

حسبي من الدنيا صديق ثابت   فرد فكنه ولا احتياج لثان

تو نے میری آرزوؤں کو زندہ کر دیا حالانکہ دوستوں سے مسلسل تلخ تجربات کے باعث میں انہیں ختم کر چکا تھا۔ میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ اخلاص برتا، اپنی زبان اور دیگر ذرائع سے ان کی عزت و آبرو کی مدافعت کی، ان سے بے لوث محبت کی، لیکن جب وہ خوش حال ہوئے تو پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ مجھے ہی نظر انداز کر گئے۔ مجھے دنیا میں ایک مخلص اور وفادار دوست کافی ہے۔ بس آپ وہ بن جایے۔ مجھے اس کے بعد کسی دوسرے دوست کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

عالموں کی بے بسی پر رنج کرتے ہوئے کہتا ہے:

انقضى معي ان حان حيني تجاربي   وما نلتها الا بطول عناء؟

و يحزنني الا ادى لى حيلة   لاعطائها من يستحق عطائى

اذا ورث المثرون ابناءهم غنى   وجاهًا فما اشقى بني الحكماء

کیا میرے مرنے کے ساتھ ہی ساتھ میرے تمام تجربے بھی ختم ہو جائیں گے حالانکہ میں نے تو انہیں طویل مشقتوں سے حاصل کیا ہے؟ مجھے اپنی بے چارگی پر رنج ہوتا کہ میں ان تجربات کو ان اشخاص تک منتقل نہیں کر سکتا جو ان کے مستحق ہیں۔ حکیموں اور عالموں کی اولاد کس قدر بدنصیب و محروم ہے کہ اسے ان کے آباء و اجداد سے کوئی معنوی ورثہ نہیں ملتا حالانکہ سرمایہ دار اپنے بچوں کو دولت و عزت کا وارث بنا جاتے ہیں۔

باحثۃ البادیہ

(پیدائش ۱۸۸۶ء وفات ۱۹۱۸ء)

ابتدائی حالات: ادیب و شاعر حفنی بک ناصف کی بیٹی سیدہ فاضلہ ملک ناصف، بروز یک شنبہ ماہ دسمبر ۱۸۸۶ء قاہرہ میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مختلف پرائمری اسکولوں میں پائی۔ پھر اکتوبر ۱۸۹۳ء میں مدرسہ سنیہ میں داخل ہو گئی اور وہاں سے ۱۹۰۰ء میں ابتدائیہ کی ڈگری حاصل کی۔ یہی وہ پہلا سال تھا جس میں مصری عورتوں کو پہلی مرتبہ یہ ڈگری دی گئی تھی۔ بعد ازاں وہ اس مدرسہ کے تربیتی سیکشن میں منتقل ہو گئی، اور وہاں سے تعلیم دینے کا لائسنس حاصل کیا۔ پھر وہ مدارس البنات الامیریہ میں تعلیمی خدمت انجام دینے لگی۔ ۱۹۰۷ء میں فیوم قبیلہ کے ایک رئیس سے اس کی شادی ہو گئی اور اس کے بعد سے اس نے پڑھانے کی نوکری چھوڑ کر اپنا مشغلہ انشاء نگاری اور تصنیف تالیف بنا لیا۔ اور اپنے شوہر کے ساتھ خلوص و وفاداری سے زندگی گذارنے لگی۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں وہ ہسپانوی بخار میں مبتلا ہوئی اور بھر پور جوانی میں انتقال کر گئی۔

علم و ادب میں اس کا مقام :- باحثۃ البادیہ کی تحریروں میں اس کے جو اخلاق ابھر کر سامنے آتے ہیں ان میں بلندی، اخلاق شیرینی روح، ذہانت طبع، صحیح دینداری، اور جذبۂ اصلاح نمایاں ہیں۔ اس کے والد محترم نے بچپن ہی سے اس کی نگرانی و تربیت کی۔ اپنے ادب سے اسے غذا دی اور اپنی روح اس میں پھونک دی۔ چنانچہ گیارہ برس کی عمر میں وہ شاعری کرنے لگی تھی۔ پھر انشاء کی طرف توجہ کی اور اس میں ایسا کمال اور بلند مقام حاصل کیا کہ مرد اس پر حسد کرتے تھے۔ قاسم امین کے بعد اس نے مصری عورت کو اٹھانے میں سرگرم جدوجہد کی، چنانچہ وہ سب سے پہلی مسلمان عورت تھی جس نے قدیم ماحول میں رہنے کے باوجود تحریک ترقی نسواں میں علانیہ حصہ لیا۔ اس موضوع پر اس نے لکچروں کا ایک سلسلہ رسالہ الجریدہ کے ادارہ میں دیا جسے حزب الامہ نکالتی تھی اور اس کے ایڈیٹر استاذ احمد لطفی سید تھے۔ اس موضوع پر اس نے بہت سے مقالات اسی رسالہ میں "باحثۃ البادیہ" کے قلمی نام سے دیئے، یہی قلمی نام بعد میں مشہور ہو کر اس کا لقب بن گیا۔

یہ تمام مقالات "النسائیات" نامی کتاب میں جمع ہو گئے ہیں جس کا پہلا جزء شائع ہو چکا ہے، آخری عمر میں وہ "حقوق النساء" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ رہی تھی۔ جس کے تین مقالات مکمل ہو چکے تھے اور بقیہ کی تکمیل میں موت حائل ہو گئی۔

اس کی نثر کا نمونہ :- اپنی کتاب نسائیات میں لکھتی ہے :-

دیہات کی فضا کس قدر صاف، پانی کس قدر شیریں، اور ہوا کس قدر پاکیزہ ہوتی ہے، اور شہروں کی زندگی کس قدر مصنوعی اور موت سے قریب ہوتی ہے! دیہات حسین و جمیل ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ فطرت کے مطابق ہوتے ہیں لیکن شہروں میں تکلف و تصنع، نمائش و ریاء کا دور دورہ رہتا ہے۔ کہاں بجلی کی مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور کہاں پانی کی خرخراہٹ، کہاں چمنیوں سے نکلنے والا گاڑھا دھواں اور کہاں وہ صاف فضا میں یا تو پرندے منڈلاتے ہیں یا پھر کھجوروں کے لمبے درخت نظر آتے ہیں۔ کہاں سڑکوں کا گرد اور کیچڑ، کہاں گھاس بچھا ہوا مخملی فرش، کہاں جانوروں کی لید اور گھروں کی متعفن بدبوئیں اور کہاں کھیتوں اور باغوں کی خوشبو دار مہکیں۔ پھر شہروں میں نگاہ کس قدر الجھتی اور بھٹکتی ہے کہ وہ آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتی ہے لیکن دیواروں سے ٹکرا کر رہ جاتی ہے اور دیہات میں یہ عالم ہے کہ جس طرف نظر دوڑاؤ لامحدود فضا پھیلی ہوتی ہے :-

نمونہ نظم :- عورت کے متعلق اپنے ایک قصیدہ میں کہتی ہے :-

أعملت اقلامي وحيناً منطقي   في النصح والمأمول لم يتحقق

أيسوءكم أن تسمعوا لبناتكم صوتًا يهز صداه عطف المشرق
أيسركم ان تستمر بناتكم رهن الإسار ورهن جهل مطبق
هل تطلبون من البنات سفورها حسن ولكن اين بينكم التقى
لاتتقي الفتيات كشف وجوهها لكن فساد الطبع منكم تتقي
تخشى الفتاة حبائلًا منصوبة غشيتموها في الكلام برونق
لا تطفروا، بل اصلحوا فتياتكم وبناتكم وتسابقوا للائق
ودعوا النساء وشأنهن فانما يدري الخلاص من الشقاوة من شقي
ليس السفور مع العفاف بضائر وبدونه فرط التحجب لايقي

میں نے (صنف لطیف کی) خیر خواہی میں کبھی اپنے قلم اور کبھی اپنی گفتگو سے کام لینے میں دریغ نہیں کیا۔ لیکن ابھی تک آرزو پوری نہیں ہوئی۔ (اے مردو!) کیا تمہیں یہ برا لگتا ہے کہ اپنی بچیوں کی آواز میں وہ تاثیر دیکھو کہ اس کی گونج سے مشرق کی فضا میں ہلچل اور جوش عمل پیدا ہو جائے! کیا تمہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ تمہاری بیٹیاں قید میں بند رہیں اور جہل مرکب کا شکار ہو جائیں؟ کیا تم اپنی بچیوں سے بے پردگی کا مطالبہ کرتے ہو؟ بات تو ٹھیک ہے، مگر ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم میں تقوی شعار ہیں کہاں؟ بچیاں اپنے چہرے کھولنے سے نہیں گھبراتی ہیں، بلکہ وہ تو تمہاری فساد طبع سے ڈرتی ہیں۔ لڑکی تو ان دامہائے فریب سے گھبراتی ہے جنہیں تم نے گفتگو کی ملمع سے حسین بنا رکھا ہے۔ تم پھلانگ نہ مارو، بلکہ مستقل مزاجی سے عورتوں کے معاملہ کو سدھارنے کی کوشش کرو، اور مفید و مناسب کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم عورتوں اور ان کے معاملات کو جانے ہی دو۔ اس لیے کہ جو مشکل اور بدبختی میں پڑا ہوا ہے وہی اس سے نکلنے کی بہتر سبیل بھی جانتا ہے۔ عفت کے ساتھ بے پردگی کوئی نقصان دہ چیز نہیں اور عفت کے بغیر سات پردوں میں رہنا بھی بے سود ہے۔

مصطفیٰ لطفی منفلوطی

(پیدائش ۱۸۷۶ء متوفی ۱۹۲۴ء)

حالاتِ زندگی: سید مصطفیٰ لطفی صوبہ اسیوط کے شہر منفلوط میں ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے اور اپنے شریف گھرانہ میں پرورش پائی جو دینی عظمت اور فقہی میراث کا مالک تھا۔ ان کے گھرانہ میں تقریباً دوسو سال تک شرعی قضاء کا عہدہ اور صوفیہ کی گدی وراثۃً چلی آرہی تھی۔ اپنے آبائی دستور کے مطابق منفلوطی کی بھی تعلیم و تربیت ہوتی رہی۔ چنانچہ اس نے مدرسہ میں قرآن مجید حفظ کیا۔ ازہر میں تعلیم حاصل کی اور باوجودیکہ ان کا دل

مائل بتقوی تھا اور آبائی سلسلہ بھی متقاضی تھا کہ وہ دینی تعلیم میں دلچسپی لیں۔ لیکن ان کی توجہ صرف لسانیات وادبیات ہی پر مرکوز رہنے لگی۔ وہ اشعار یاد کرتے، نادر کلام ضبط کرتے، اشعار نظم کرتے اور مضامین لکھتے۔ ازہریوں میں ان کی ذہانت اور ان کے حسن اسلوب نگارش کی شہرت ہونے لگی تو مفتی محمد عبدہ نے انہیں اپنا مقرب بنا لیا۔ انہیں ادب و زندگی کے بلند مقصد اور اس تک پہنچنے کے لیے بہترین راستہ سے باخبر کیا۔ امام محمد عبدہ کے قرب سے منفلوطی نے سعد پاشا زغلول سے راہ و رسم پیدا کر لی اور ان دونوں عظیم شخصیتوں کے قرب نے اسے "رسالہ المؤید" کے مالک کی نظر میں بلند مرتبہ بنا دیا، یہی سب سے بڑی وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے منفلوطی کی فطری صلاحیت اور اس کے والد کی تربیت کے بعد اسے کامیاب ادیب بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ازہر کی طالب علمی کے زمانہ میں اس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے ایک ہفتہ وار رسالہ میں خدیو عباس حلمی ثانی کی ہجو میں قصیدہ کہہ کر چھپوایا ہے۔ چنانچہ اس کو قید کی سزا دی گئی اور اس نے جیل میں اپنی سزا کی مدت پوری کی۔ پھر جب مفتی محمد عبدہ کا انتقال ہو گیا تو ان سے امید اور ان پر اعتماد کی وجہ سے منفلوطی کو بہت صدمہ ہوا، اور وہ ناامید ہو کر اپنے وطن واپس آ گیا۔ پھر ایک مدت کے بعد اس کی مردہ امیدوں میں جان آئی تو وہ رسالہ "المؤید" کے ذریعہ اپنی کامیابی کے ذرائع تلاش کرنے لگا۔ اور جب وزارت تعلیم سعد پاشا کو ملی تو انہوں نے اپنی وزارت میں منفلوطی کو عربی کا انشاء پرداز مقرر کر لیا۔ پھر جب سعد پاشا وزارت قانون میں منتقل ہوئے تو اپنے ساتھ منفلوطی کو بھی لے گئے اور اسی قسم کا عہدہ وہاں دے دیا۔ پھر حکومت سعد پاشا کی مخالف پارٹی کے ہاتھ میں چلی گئی تو یہ بھی وہاں سے چلے گئے۔ پھر جب پارلیمنٹ قائم ہوئی تو انہیں سعد پاشا نے وہاں انشاء پردازی سے متعلق ایک عہدہ پر مقرر کر دیا اور وہ آخر عمر تک اس پر رہے۔ وفات کے وقت ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔

اخلاق و عادات: منفلوطی بظاہر و باطن موسیقی کا ایک ساز تھے۔ نہایت سڈول اور متناسب بدن، نہایت موزوں مذاق، خوش فکر و خوش اسلوب و خوش وضع۔ ان کے کسی قول یا عمل سے نہ عبقریت کی جھلک نظر آتی تھی نہ غباوت و کج فہمی کی۔ وہ بات کو ٹھیک سمجھ لیتے تھے مگر ذرا دیر کے بعد۔ ان کی فکر لغزشوں سے سالم رہتی تھی مگر اس کے لیے انہیں کوشش کرنا پڑتی تھی۔ وہ دقیق الحس تھے، لیکن قدرے سکون کے ساتھ وہ اپنی زبان کو بڑی احتیاط سے کھولتے تھے اور یہ خصائل جس میں بھی ہوں اسے لوگ غبی اور جاہل سمجھیں گے، یہی وجہ ہے کہ وہ مجلسوں سے کنارہ کش رہتے بحث و جدال سے گریز کرتے اور تقریر کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ پھر ان عادات کے ساتھ وہ رقیق القلب، پاک دل و پاک نفس، صحیح العقیدہ اور فیاض تھے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنے خاندان، وطن اور انسانیت پر نثار کر دیتے تھے۔

ان کا اسلوب نگارش اور ادب:- منفلوطی فطرتاً ادیب پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ادب میں آمد آورد سے بہت زیادہ ہے اس لیے کہ تکلف سے نہ کوئی نیا ادب پیدا ہوتا ہے نہ ہی کوئی ممتاز ادیب اور نہ کوئی مستقل اسلوب۔ ان کے زمانہ تک فنی نثر قاضی کے ادب کی ایک بگڑی ہوئی شکل یا ابن خلدون کے فن کا ایک بقیہ ڈھانچہ تھی۔ لیکن آپ اس کے اسلوب کو ان دونوں میں سے کسی کا چربہ نہیں کہہ سکتے۔ اپنے زمانہ میں منفلوطی کا اسلوب بالکل ایسا ہی تھا جیسے ابن خلدون کا اسلوب اپنے زمانہ میں بالکل انوکھا جسے بغیر کسی نمونہ کے زوردار طبیعت نے پیدا کر لیا ہو۔

منفلوطی سب سے پہلا افسانہ نویس ہے اور اس نے اس فن کو اس حد تک عمدہ اور کامل بنا دیا جس کی توقع اس جیسے ماحول میں پیدا ہونے والے اور اس کے دور کے لکھنے والو سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ منفلوطی کے ادب کے پھیلنے کا راز یہ ہے کہ وہ اس زمانہ میں رونما ہوا جب خالص ادب پر جمود و اضمحلال طاری تھا اور اس عالم میں اچانک لوگوں کو اس کے یہ دلچسپ افسانے نظر آتے جو پاکیزگی اسلوب، شیرینی بیان اور حسن الفاظ کے ساتھ نہایت عمدگی سے درد و غم کی مصوری اور نہایت دلکش اسلوب سے معاشرہ کے عیوب کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اس کے ادب میں دو ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اسے دوام نصیب نہیں ہو سکے گا ایک لفظی کمزوری دوم معنوی تنگی یعنی کوتاہی۔ لفظی کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ منفلوطی کو اپنی زبان کا وسیع علم اور اس کے ادب پر گہری نظر حاصل نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اس کے بیان اور تعبیر افکار میں غلطی، زائد الفاظ کی بھرمار اور الفاظ کا بے محل استعمال پائیں گے۔ معنوی تنگی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ تو علوم شرقیہ کو بکمال حاصل کیا تھا اور نہ وہ مغربی علوم سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ ان کی فکر میں سطحیت، سادگی، محدودیت اور ادھورا پن پائیں گے۔ مختصر یہ کہ نثر میں منفلوطی کو وہی جگہ حاصل ہے جو بارودی کو شاعری میں حاصل تھی۔ دونوں نے اپنی اپنی جگہ احیاء و تجدید ادب کا فریضہ انجام دیا اپنے لیے ایک معین و واضح اسلوب اختیار اور ادبی اسلوب کو ایک منجمد حالت سے دوسری بہتر حالت میں منتقل کر دیا۔

تصانیف و تراجم:- اس کی ایک تصنیف "النظرات" تین جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں اس کے وہ تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں جو رسالہ "المؤید" میں شائع ہوتے رہے ان میں کچھ کہانیاں ہیں۔ دوسری تصنیف "العبرات" ہے جس میں اس کے طبع زاد یا ماخوذ افسانے ہیں۔ ایک تصنیف "مختار المنفلوطی" ہے جس میں قدیم شاعروں اور ادیبوں کے اشعار و مضامین کا انتخاب ہے۔ اس کے بعض دوستوں نے فرانسیسی زبان سے اس کے لیے الفونس کار کی تصنیف میڈولین (زیزفون درختوں کے سایہ تلے) برناڈی

سان بییر کی تصنیف بول و ورجینی (فضیلت) اڈمون رسٹان کی تصنیف بیرانو وبرگراک (شاعر) ترجمہ کردیں جنہیں اس نے آزادانہ اپنے الفاظ میں منتقل کر دیا اور اس طرح اس نے عربی ادب کے سرمایہ میں گراں قدر دولت کا اضافہ کیا جس نے جدید افسانہ نگاری کو بڑی قوت بخشی اور قابل اقتدا نمونہ فراہم کیا۔

اس کی نثر کا نمونہ :- امیر و فقیر :-

کل رات میں ایک پریشان حال کے پاس سے گذرا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ پیٹ پر ہے اور وہ اپنے پیٹ کی تکلیف کا شکوہ کر رہا ہے۔ میں نے اس کے حال زار پر رحم کھاتے ہوئے اس کی حالت دریافت کی تو اس نے بتایا کہ بھوک کی وجہ سے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں نے کسی قدر اس کی بھوک فرو کرنے کی کوشش کی پھر اسے چھوڑ کر اپنے ایک امیر و خوش حال دوست سے ملنے چلا گیا۔ وہاں مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ وہ بھی اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور وہی تکلیف بتا رہا تھا جو اس بد احوال فقیر نے بتائی تھی۔ میں نے اس کی حالت دریافت کی تو اس نے بدہضمی کی شکایت بتائی۔ اس پر میں نے کہا "ہمارے معاشرہ کی حالت کس قدر تعجب انگیز ہے! اگر یہ مالدار اپنی ضرورت سے زیادہ خوراک اس فقیر حال کو دے دیتا تو دونوں میں سے کوئی بھی پریشان و شاکی نہ رہتا۔ اس کا فرض تھا کہ یہ اتنی ہی غذا استعمال کرتا جس سے یہ اپنی بھوک فرو کرتا اور اپنی ضرورت پوری کر لیتا لیکن افسوس اس کی خود غرضی حد سے بڑھ گئی اور اس نے اپنے دسترخوان کی رونق بڑھانے کے لیے فقیر کی پلیٹ بھی اپنی طرف گھسیٹ لی۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اسے بدہضمی کی سزا دی۔ تاکہ ظالم اپنے ظلم کی وجہ سے چین سے نہ بیٹھ سکے اور اسے طمانینت حاصل نہ ہو سکے اور اس طرح یہ مشہور مثل اس پر صادق آ گئی کہ امیر کی بدہضمی فقیر کی بھوک کا انتقام ہوتی ہے۔"

آسمان پانی برسانے میں بخل نہیں کرتا نہ زمین پودے اُگانے میں کمی کرتی ہے۔ البتہ طاقتور کمزوروں کے پاس یہ چیزیں دیکھنے میں حسد کرتے ہیں اور وہ ان چیزوں کے غریبوں تک پہنچنے کی راہ میں حائل بن جاتے ہیں اس طرح محتاج اور اپنی پریشان حالی کا شکوہ کرنے والا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لہذا غریب طبقہ کا حق دبانے والے سرمایہ دار اور امیر لوگ ہیں نہ کہ زمین و آسمان۔

طاقتور لوگ کس قدر ظالم اور سخت دل ہیں! وہ اپنے نرم گدوں پر آرام کی نیند سوتے ہیں اور ان کا پڑوسی جو سردی سے ٹھٹھرتا اور تکلیف سے آہیں بھرتا ہے ان کی نیند میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ وہ قسم قسم کے کھٹے میٹھے سلونے کھانوں سے بھری ہوئی میز پر بیٹھتا

ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی اس کے دل میں کوئی تکدر پیدا نہیں ہوتا کہ اس کے بہت سے رشتہ دار ایسے ہیں جو اس دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں کے لیے بھوک سے بیتاب ہیں۔ بلکہ ان امیروں میں ایسے بھی ہیں جن کے دل میں نہ رحم و مہربانی کا گذر ہے نہ حیا ان کی زبانوں کو لگام لگاتی ہے۔ چنانچہ وہ فقیروں کے سامنے انہیں سنانے کے لیے اپنی آسودگی و خوش حالی کی داستانیں بیان کرتے ہیں اور اپنے زر و جواہر مال و اثاثہ کی گنتی کرانے کے لیے فقیروں سے خدمت لیتے ہیں تاکہ غریب کا دل توڑیں اور اس کی زندگی بدمزہ کر دیں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر بات اور ہر ادا سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم امیر ہیں اس لیے خوش نصیب اور تم فقیر ہو اس لیے بدبخت و کم نصیب ہو۔

میں انسان کو انسان سمجھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تاآنکہ وہ احسان سے کام نہ لے اس لیے کہ میں انسان و حیوان کے درمیان جو صحیح حد فاصل قائم کر سکتا ہوں وہ احسان ہی ہے۔ مجھے یہاں تین قسم کے انسان ملتے ہیں ایک وہ جو کسی پر اس لیے احسان کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے ساتھ احسان کرنا چاہتا ہو۔ ایسا شخص مستبد و جبار ہے جو احسان کے معنے آدمی کو غلام بنا لینے کے سمجھتا ہے۔ دوسرا وہ انسان ہے جو اپنے اوپر احسان کرتا ہے اور دوسروں پر احسان نہیں کرتا۔ اس لالچی اور خودغرض انسان کو اگر معلوم ہو جائے کہ سیال کا خون کسی عمل سے جم کر سونا بن جاتا ہے تو وہ اس سونے کو حاصل کرنے کے لیے تمام انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دے گا۔ تیسری قسم کا انسان وہ ہے جو نہ اپنے ساتھ احسان کرتا ہے نہ دوسروں کے ساتھ اور یہ احمق بخیل ہے جو اپنا پیٹ مار کر اپنے صندوق کا پیٹ بھرتا ہے۔

رہ گئی انسان کی چوتھی قسم جو دوسروں کے ساتھ احسان کرتا ہو اور اپنے ساتھ بھی احسان کرتا ہو تو میں اسے نہیں جانتا اور اب تک اس سے نہیں مل سکا اور میرا خیال ہے کہ اسی قسم کے انسان کو یونانی فلسفی اڈوگین کلبی، دن میں چراغ لے کر ڈھونڈتا پھرتا تھا اور جب اس سے کسی نے پوچھا کہ کیا تلاش کر رہے ہو تو اس نے جواب دیا تھا: "انسان کو تلاش کر رہا ہوں"۔

شیخ حمزہ فتح اللہ

(پیدائش ۱۸۴۹ء وفات ۱۹۱۸ء)

حالاتِ زندگی: عالم لغت، استاد شیخ حمزہ فتح اللہ ۱۸۴۹ء میں اسکندریہ میں پیدا ہوئے اور درمیانہ طبقہ کے لوگوں کی طرح وہاں پرورش پائی۔ قرآن

حفظ کیا، علوم شرعیہ اور لسانیہ سیکھے پھر ٹیونس کا سفر کیا اور وہاں چند سال گذارے اس اثناء میں رسالہ "الرائد التونسی" کی ادارت کرتے رہے، پھر اسکندریہ واپس آئے اور خدیو توفیق کی خدمت میں پہنچے۔ اس نے انہیں رسالہ الاعتدال نکالنے کا مشورہ دیا۔ تاکہ اس کے ذریعہ وہ حکومت خدیو کی مدافعت اور اس کی سیاست کی حمایت کرتا رہے۔ لیکن وہ ایک برس بھی نہ چلا۔

۱۸۸۶ء میں انہوں نے حکومت مصر کی نمائندگی کرتے ہوئے "الموتمر العلمی الشرقی" میں شرکت کی جو وائنا میں منعقد ہوئی تھی۔ اسی طرح علوم شرقیہ کی دوسری کانفرنس میں بھی جو ۱۸۸۹ء میں اسٹاکھالم میں منعقد ہوئی تھی۔ پھر صحافت کے بعد انہوں نے تعلیمی مشغلہ اختیار کر لیا تھا اور ۱۸۸۸ء میں زبانوں کے مدرسہ (مدرسۃ الالسن) اور پھر دار العلوم میں معلم مقرر ہوئے۔ بعد ازاں تعلیمات کے محکمہ انسپکشن میں منتقل ہو گئے اور ۱۹۱۲ء میں پنشن ملنے کے وقت تک اسی محکمہ میں رہے۔ پنشن کے بعد وہ تحقیقی مطالعہ میں لگے رہے حتیٰ کہ اپریل ۱۹۱۸ء میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔

علم واخلاق: مرحوم قلب سلیم اور اخلاق کریمہ کے مالک تھے۔ وہ عربی زبان اور اس کی بقاء پر جان دینے والے، ادب کے دلدادہ اور بحث و تحقیق کے متوالے تھے۔ ان کی یہی صفات ان کے بیشتر تلامذہ میں حلول کر گئیں۔ چنانچہ وہ سب بھی عربی کی ترقی، زبان کے احیاء اور ادب کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصے لینے لگے۔ دار العلوم میں پڑھانے کے عرصہ میں انہوں نے ایک کتاب "المواھب الفتحیۃ فی علوم اللغۃ العربیۃ" تالیف کی۔ اس کے بعد محکمہ تعلیمات کی طرف سے تیار ہونے والے نصابوں کی تہذیب و تنقیح میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

نظم میں ان کا اسلوب متقدمین کا اور نثر میں متاخرین کا سا تھا۔ گویا وہ ان دونوں کی درمیانی کڑی تھے، ذیل میں ہم دونوں چیزوں کے نمونے دیتے ہیں جن سے مذکورہ بالا دعوی کا ثبوت ملے گا۔

نمونۂ نظم: ان کے بہترین اشعار میں وہ قصیدہ ہے جو انہوں نے موتمر شرقی میں سنایا تھا جس کا مطلع ہے :-

حمد السری یا اُخی العود والناب　　　انساك وعثاء اغباب واخباب

اے اونٹوں والے! سفر کے بعد جب تیری تعریف ہو گی تو وہ تمام کدورتیں اور مشقتیں جو تو نے جانوروں کو ناغہ سے پانی پلانے اور تیز دوڑانے میں برداشت کیں، سب کو بھول جائے گا۔

اسی قصیدہ کے پر حکمت اشعار :-

ومن یرد نیل مجد وھو فی دعة	فقد بغی من صفاة در احلاب
والمرء فی موطن کالدر فی صدف	والتبر فی معدن والنبع فی غاب
والسیف مثل العصا ان کان مغتمدا	وزامر الحی لا یحظی باطراب
وازھد الناس فی علم وصاحبه	أدنی الاحبة من اھل واصحاب

اور جو آرام میں رہ کر عزت و مجد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ چٹان سے دودھ کی دھاریں نکالنے کا خواہشمند ہے۔ آدمی اپنے وطن میں (ایسے ہی کس مپرسی کے عالم میں رہتا ہے) جیسے سیپ میں موتی، یا کان میں سونا، یا جنگل میں کمان کی لکڑی کا درخت۔ نیام میں تلوار لاٹھی کی طرح ہے، اور جو (قافلہ کے بجائے) قبیلہ میں بانسری بجاتا ہے وہ انہیں مسرور و مست کر کے تیز روی پر مائل نہیں کر سکتا۔ لوگوں میں علم و علماء سے سب سے زیادہ بے رغبتی کرنے والے ان کے قریبی رشتہ دار اور ساتھی ہی ہوتے ہیں۔

نمونۂ نثر:- سید عبدالحمید بکری کو معذرت خواہی کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

میرے آقائے محترم! آپ کے دیدار کا اشتیاق تیز تر ہو رہا ہے۔ اپنے دل سے اس مخلص وفادار دوست اور اس کی دوستی کے بارے میں پوچھو جسے مرور زمانہ پختہ تر کرتا جاتا ہے اور جو دن گذرتا ہے اس کے استحکام میں اضافہ کرتا ہے۔ جناب کے دل میں یہ خیال بھی نہ پیدا ہو کہ بندہ جو آپ کے دربار میں حاضری نہیں دیتا اس کا سبب تکبر یا کسی قسم کی کوتاہی ہے۔ اس باب میں میرے پاس اپنی تاخیر کے سلسلہ میں معذرت ہے۔ اور آپ! خدا آپ کو دیر تک زندہ رکھے، اپنے دوست سے معذرت قبول کرنے میں بڑے کشادہ دل، اور ضروری کاموں کی وجہ سے اس کی تاخیر پر چشم پوشی سے کام لینے والے ہیں۔ مجھے جناب کی ذات گرامی سے امید ہے کہ میری یہ معذرت ملاقات سے مانع نہ رکھے گی۔ آپ کے کتنے ہی احسانات مجھ پر ہیں جن پر میں ہمیشہ آپ کا شکر گذر رہوں گا۔

والسلام

اسمٰعیل پاشا صبری

(پیدائش ۱۸۴۵ء وفات ۱۹۲۳ء)

حالاتِ زندگی:- یہ فنکار شاعر نیل کے ساحلی علاقہ میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا، اور اسماعیل پاشا کے عہد میں، جو ترقی و تمدن اور ادب کا دور تھا، جوان ہوا۔ وہ جدید نظامی مدرسہ میں داخل کیا گیا، اور ابتدائی ثانوی جماعتوں سے نکلتا ہوا اعلیٰ تعلیم میں پہنچا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ اس زمانہ میں طلبہ کے ادبی رسالہ

"روضۃ المدارس المصریۃ" کے ابتدائی متعدد شمارے شائع ہو چکے تھے۔ اس رسالہ کے لکھنے والوں میں اس زمانہ کے منتخب اہل قلم مثلاً رفاعہ بک، شیخ حسین مرصفی، استاد بارودی، عبداللہ فکری، صالح مجدی، شامل تھے۔ یہ مہینہ میں دو بار نکلتا تھا۔ اس میں منتخب موضوعات پر قیمتی مضامین نیز عمدہ نثر اور نظموں کا انتخاب ہوتا تھا۔ صبری ان رسالوں کا بغور مطالعہ کرتا اور اپنی نظم و نثر میں اس کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کرتا۔ خود اس کی طبیعت میں بھی جولانی، ذوق سلیم اور پختہ صلاحیت تھی، چنانچہ اس نے خدیو کی مبارک بادی کے سلسلے میں ایک قصیدہ کہا جو اس رسالہ میں شائع ہوا اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی۔ پھر وہ مصر سے یورپ جانے والے تعلیمی وفد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے فرانس گیا۔ اور وہاں ۱۸۷۸ء میں ایکس یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران میں یورپ کی تہذیب کا اس نے قریبی مطالعہ کیا اور فرانسیسی ادب کا مزا خوب چکھا۔ یہاں اس کی صلاحیتوں کو علم و فن اور جمال کا بڑا وافر حصہ ملا۔ اور وہ خوب بڑھیں اور پھلی پھولیں۔ مصر واپس آتے پر وہ یکے بعد دیگرے عدالتی عہدوں سے ترقی کرکے صوبہ اسکندریہ کے گورنر بنائے گئے۔ وہاں سے قانونی کونسل میں تبادلہ ہوا اور ایک مدت وہاں کام کرتے رہے۔ پھر ۱۹۰۷ء میں پنشن کی عمر پر پہنچنے کی وجہ سے انہوں نے سب نوکریاں چھوڑ دیں اور گھر پر ادبی صحبتوں اور شعر و شاعری کے مشغلے میں زندگی بسر کرنے لگے۔ اور قوم کو اپنے افکار و جذبات، شاعری کے نغموں کی صورت میں پیش کرتے رہے۔ ان کا گھر شاعروں کی مجلس اور ادیبوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ یہ لوگ شبانہ محفلوں میں آتے، اپنے اشعار سناتے جنہیں صبری پاشا ماہر نقاد کی حیثیت سے پرکھتا اور استاد کی حیثیت سے درست کرتا، حتیٰ کہ سب نے انہیں استاد کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا اور ان کی علمی برتری کو تسلیم کر لیا، یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ انہیں قلبی عارضہ ہو گیا۔ چند سال وہ اس کا مقابلہ کرتے رہے، لیکن بالآخر ۱۹۲۳ء میں جب کہ ان کی عمر اکہتر برس کی تھی اس کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

ہمارا تجربہ ہے کہ جتنے بھی وجدانی اور فطری شعراء نے بلند مقام حاصل کیا ہے انہوں نے عین شباب اور بہار حیات میں جب کہ جذبات جوان، احساسات برانگیختہ، آرزوئیں بھرپور اور زندگی تر و تازہ ہوتی ہے کمال حاصل کیا۔ لیکن صبری نے جو خالص وجدانی شاعر ہے، بارودی کی طرح صغرسنی میں شاعری میں کمال حاصل نہیں کیا، بلکہ اس وقت کمال حاصل کیا جب اس کی عمر چالیس برس کی ہو رہی تھی۔ اس میں یہ ملکہ مرور زمانہ، طویل مشق اور مسلسل غور و نظر سے پیدا ہوا۔ جوانی میں اس کی شاعری ناپختہ اور تقلیدی تھی۔ اس میں فکر کی خامی تھی اور وہ ایک ناتمام کوشش کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی شاعری میں عمدہ الفاظ اور نادر معانی سموئے۔ وہ بحتری کی طرح محبت، دوستی، جمال اور موت کے موضوعات پر اشعار کہتا۔ پھر وہ ان غنائیہ

قطعات کو، جو اس کی طبیعت کی عکاسی اور روح کی ترجمانی کرتے اور دیگر شعراء کے اشعار کے مقابلے میں امامت کی جگہ فائز ہوتے، نہایت ترنم سے پڑھتا۔ بقول مطران، صبری بیشتر کسی اہم حادثہ کو دیکھ کر، یا کوئی اہم خبر سننے پر، یا کسی کتاب کے مطالعہ پر، تاثر کے بعد ہی شعر کہتے تھے۔ وہ اپنے اشعار کو خوب پرکھتے، ان میں خوب الٹ پلٹ اور تبدیلی کرتے پھر جب وہ نزاکت لفظی، فصاحت اسلوب اور حسن معنی کے لحاظ سے ان کی مرضی کے مطابق ٹھیک ہو جاتے تو وہ انہیں چھوڑ دیتے اور بھول جاتے۔ اکثر وہ اپنے مقصود کو دو، چار یا چھ اشعار میں نظم کر دیتے تھے اور اس تعداد سے بہت کم وہ تجاوز کرتے تھے الا یہ کہ قصیدہ کا ارادہ ہو اور وہ بھی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔

شاعری کا نمونہ: تغزل :-

یالواء الحسن احزاب الهوى ... ایقظوا الفتنة فی ظل اللواء
فرقتهم فی الهوى ثاراتهم ... فاجمعی الامر وصونی الابریاء
ان هذا الحسن كالماء الذی ... فیه للأنفس ریّ وشفاء
لا تذودی بعضنا من ورده ... دون بعض واعدلی بین الظماء
انت یمّ الحسن فیه ازدحمت ... سفن الآمال یزجیها الرجاء
یقذف الشوق بها فی مائج ... بین لجین، عناء وشقاء
شدة تمضی وتأتی شدة ... تقتفیها شدة، هل من رجاء
ساعفی آمال أنضاء الهوى ... بقبول من سجایاك رخاء
وتجلی واجعلی قوم الهوى ... تحت عرش الشمس بالحكم سواء
اقبلی نستقبل الدنیا وما ... ضمنته من معدات الهناء
واسفری، تلك حلی ما خلقت ... لتنوارى بلثام او خباء
واخطری بین الندامی یحلفوا ... ان روضا راح فی نادی وجاء
وانطقی ینثر اذا حدثتنا ... ناثر الدر علینا ما نشاء
وابسمی من كان هذا ثغره ... یملأ الدنیا ابتساما وزادها
لاتخافی شططا من انفس ... تعثر الصبوة فیها بالحیاء
راضت النخوة من اخلاقنا ... وارتضى آدابنا صدق الولاء
فلو امتدت امانینا الى ... ملك ما كدرت ذاك الصفاء
انت روحانیة، لا تدعی ... ان هذا الشكل من طین وماء
وانزعی عن جسمك الثوب یبن ... للملا تكوین سكان السماء

خلف تمثال مصوغ من ضیاء   وارى الدنيا جناحى ملك

اے فوج حسن! اے لشکر عشق! اپنے جھنڈے تلے فتنے بیدار کرو۔ محبت میں مشوقوں کے حملوں نے انہیں جدا جدا کر دیا ہے، اے محبوبہ! تو ان کے معاملہ کو سمیٹ کر یکسو کر، اور جو بے جرم ہیں انہیں بچالے۔ یہ حسن پانی کی طرح ہے جس سے جانوں کو سیرابی اور صحت و شفا حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا تو ہم میں سے کسی کو اس سے سیراب ہونے سے نہ روک۔ اس بارے میں کسی سے امتیازی سلوک نہ کر، اور سب پیاسوں کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک کر۔ اے محبوبہ! تو حسن کا سمندر ہے جس میں آرزوؤں کی کشتی کا ہجوم ہے، جنہیں امید چلا رہی ہے۔ شوق انہیں کونت اور مشقت کے دو گہرے کنڈوں میں پھینک رہا ہے۔ یہاں یکے بعد دیگرے سختیاں ہی سختیاں آرہی ہیں، کیا ان سے نجات کی کوئی امید ہے؟ کشتگان عشق کی آرزوؤں کی لاج رکھ کر تو تو بڑی نرم خو ہے۔ اپنا جلوہ دکھا، اور سورج کی حکومت تلے تمام عاشقوں کو ایک نظر سے دیکھ۔ تو ہماری طرف متوجہ ہو جا ہم دنیا اور اس کی آسائشوں کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ تو اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دے کہ یہ حسن و آرائش اس لیے نہیں بنائی گئی ہے کہ نقابوں اور حجابوں میں چھپی رہے اور رندوں کو موج خرام سے مست کر، تاکہ یہ طلفیہ کہہ سکیں کہ محفل میں ایک باغ آگر گیا ہے۔ اور ہم کلام ہو، کہ تیری باتوں سے ہم پروہ موتی بکھریں گے جن کے ہم خواہاں ہیں۔ اور تو مسکرا، جیسے قدرت نے یہ حسین موتی بخشے ہیں وہ تو ساری دنیا کو جگمگا دے گا۔ تو ان نفوس کی بے راہ روی سے نہ ڈر۔ ان میں عشق و مستی حیاء کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہی ہے، جرأت و نخوت ہمارے اخلاق میں راسخ ہو چکے ہیں اور دوستی کو خلوص و وفاداری سے نباہنا ہمارا شیوہ ہے۔ اگر ہماری یہ آرزوئیں آگے بڑھ کر فرشتوں میں پہنچ جائیں تو ان کی پاکیزگی و صفائی میں ذرا بھی خلل و تکدر پیدا کریں گی۔ تو اے محبوبہ! پیکر روحانی ہے، اس بات کا دعوی نہ کر کہ یہ شکل و صورت مٹی اور پانی سے بنی ہے۔ اور اپنے بدن سے یہ لباس ہٹا دے تاکہ مخلوق پر آشکارا ہو جائے کہ آسمانی مخلوق کیسی ہوتی ہے۔ اور اس روشنی سے ڈھلی ہوئی مورتی کے پیچھے دنیا کو فرشتہ کے دو بازو دکھا۔

دم رخصت وہ کہتا ہے:

انتری انت خاذلی ساعة التو ... دیع یا قلب فی غدام نصیری

ویلك! قل لی متی اراك بجنبی   راضیاً عن مكانك المهجور

ساعة البين! قطعة انت قدت   للمحبین من عذاب السعیر

اے دل! ذرا یہ تو بتا کہ دم وداع تو میرا ساتھ چھوڑ دے گا یا میری مدد کرے گا؟ تیرا برا ہو! مجھے یہ تو بتا کہ میں تجھے اپنے پہلو میں جو تیری چھوڑی ہوئی جگہ ہے کب رضامند و مسرور پاؤں گا؟ اے جدائی کی گھڑی! تو عاشقوں کے لیے جہنم کے عذاب میں سے کاٹ کر لایا

ہوا ایک ٹکڑا ہے۔

ایضاً:-

اتصر فؤادی! فما الذکری بنافعة ولا بشافعة فی ردّ ما کانا
سلا الفواد الذی شاطرته زمنا حمل الصبابة فاخفق وحدك الآنا

اے دل: بس کر! اب یاد سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا، اور اس یاد کی سفارش سے دل کی وہ پہلی حالت واپس نہیں آسکے گی۔ اے دل! تیرے دو حصے جو اب تک ہم نوا تھے اب ان میں سے ایک حصہ کی وہ کیفیت دور ہو چکی ہے، اب تو تنہا پھڑکتا رہ۔

ایضاً:-

تمسی تذکرنا الشباب وعهده هیفاء مرهفة القوام فنذکر
تثب القلوب الی الرؤوس اذا بدات وتطل من حدق العیون وتنظر

نازک بدن پتلی کمر والی محبوبہ ہمیں جوانی اور اس کا زمانہ یاد دلاتی ہے تو ہم اسے یاد کرنے لگتے ہیں، جب وہ ظاہر ہوتی ہے تو دل اچھل کر سروں میں آجاتے ہیں جہاں وہ آنکھوں کے موکھلوں میں سے جھانک کر دیکھنے لگتے ہیں۔

دوستی کے بارے میں کہتا ہے:-

اذا خاننی خل قدیم وعقنی وفوقت یومًا فی مقاتله سهمی
تعرض طیف الود بینی وبینه فکسر سهمی فانثنیت ولم ارم

جب کوئی پرانا دوست مجھ سے بے وفائی کرتا ہے اور میں اس کو مارنے کے لیے اپنا تیر بالکل سیدھا پر تان لیتا ہوں تو ایسے میں میری نگاہوں کے سامنے وہ پرانا دوستی کا زمانہ آجاتا ہے، اور وہ میرے تیر کو توڑ دیتا ہے تو میں باز آجاتا ہوں، اور اسے نہیں مارتا۔

موت سے کہتا ہے:-

یاموت خذ ما ابقت الـ أیام والساعات منی
بینی وبینك خطوة ان تخطها فرجت عنی

اے موت! دنوں اور گھنٹوں نے میری زندگی کا جو حصہ باقی چھوڑ دیا ہے اسے لے لے۔ میرے اور تیرے درمیان ایک قدم کا فاصلہ ہے اسے بڑھا کر تو میری مشکلات آسان کر سکتی ہے۔

اللہ سے مناجات کرتے ہوئے کہتا ہے:-

یارب این تری تقام جهنم للظالمین غدا وللأشرار
لم یبق عفوك فی السموات العلی والارض شبرا خالیا للنار
یا رب اهلنی لفضلك واکفنی شطط العقول وفتنة الافکار

ومرالوجود یشف عنك لکی اری　　غضب اللطیف و رحمة الجبار
یا عالم الأسرار حسبی محنة　　علمی بانك عالم الأسرار
اخلق برحمتك التی تسع الوری　　الا تضیق باعظم الأوزار

پروردگارا! یہ معلوم کر لینا میری سمجھ سے تو بالاتر ہے کہ تو نے ظالموں اور بدمعاشوں کے لیے جہنم کہاں بنائی ہے! تیرے عظیم و وسیع عفو نے ایک بالشت بھر زمین بھی تو جہنم کے لیے خالی نہیں چھوڑی ہے۔ پروردگارا! مجھے اپنے فضل و کرم کا اہل بنا، اور عقول و افکار کی بے راہ روی سے محفوظ رکھ۔ اور یہ وجود کا حجاب جو حائل ہے اسے دور ہونے کا حکم دیجیے تاکہ میں مہربان کا غضب اور جبار کی رحمت دیکھ سکوں۔ اے رازوں کے جاننے والے! میرے لیے یہی آزمائش کافی ہے کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ تو عالم اسرار ہے۔ تیری وہ ہمہ گیر رحمت جو دنیا پر چھائی ہوئی ہے اس سے یہی امید ہوتی ہے کہ وہ بڑے گناہ کے لیے تنگ نہیں ہوگی۔

موت کے بارے میں کہتا ہے:۔

ان سئمت الحیاة فارجع الی الأر　　ض تنم آمنًا من الأوصاب
تلك أم احنی علیك من الام　　م التی خلفتك للانعاب
لا تخف فالممات لیس بماح　　منك الا ما تشتکی من عذاب
کل میت باق وان خالف التـ　　ـوان ما نص فی غضون الکتاب
وحیاة المرء اغتراب فان ما　　ت فقد عاد سالمًا للتراب

اگر تو زندگی سے اکتا گیا ہے تو زمین میں واپس چلا جا، وہاں تو ہر قسم کی تکالیف سے بے خوف ہو کر آرام سے سو سکے گا۔ وہ تیری اس ماں سے بھی زیادہ تجھ پر مہربان ہے جس نے تجھے تکالیف و مصائب کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ڈر و مت! موت تو ہم سے صرف وہی تکلیف دور کرتی ہے جس سے ہم پریشان رہتے ہیں۔ ہر مرنے والا بقا سے ہم کنار ہو جاتا ہے، اگرچہ یہ مضمون کتاب میں مذکور نص کے خلاف نظر آتا ہے۔ انسان کی زندگی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا نام ہے، جب وہ یہاں سے مرتا ہے تو صحیح و سالم مٹی میں واپس چلا جاتا ہے۔

احمد شوقی بک

(متوفی ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء)

ابتدائی زندگی کے حالات:۔ احمد شوقی بن احمد شوقی بک قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے اپنے خاندان کے متعلق انہوں

نے اپنے والد یہ کہتے سنا تھا کہ وہ کرد اور پھر عرب تھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے باپ اس ملک میں جوانی میں آئے تھے اور والی مصر محمد علی پاشا کے نام احمد پاشا جزار کی ایک سفارشی چٹھی بھی لائے تھے۔ جس پر محمد علی پاشا نے انہیں اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا تھا۔ پھر وہ مختلف بڑے عہدوں پر کام کرتے رہے تا آنکہ وہ مصری محکمہ محصولات کے مہتمم مقرر ہو گئے۔

ان کے والد بڑے خراج تھے، انہوں نے جو کچھ اپنے والد سے ورثہ میں پایا تھا وہ سب اڑا ڈالا تھا۔ چنانچہ ابتدا میں شوقی کی پرورش ان کی دادی مہ لانے کی جو اسماعیل پاشا کے زمانہ میں محل کی ملازمہ تھیں۔ جب چار برس کے ہوئے تو انہیں حنفی محلہ کے مدرسہ شیخ صالح میں داخل کر دیا گیا۔ بعد ازاں انہوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے فراغت پائی اور چھوٹی عمر ہی میں لاکالج میں داخل ہو گئے، جہاں انہوں نے دو سال گذارے، پھر اس کالج میں کھولے جانے والے نئے شعبۂ ترجمہ میں منتقل ہو گئے جہاں مزید دو سال گذارے، جن کے بعد ان کو اعلیٰ قابلیت کی ڈگری مل گئی۔ پھر خدیو توفیق نے انہیں اپنے عملہ میں لے لیا اور اپنے خرچ پر انہیں قانون و ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے فرانس بھیج دیا۔ جہاں انہوں نے دو سال منبلییہ میں اور دو سال پیرس میں تعلیم حاصل کی پھر واپس آ کر خدیوی عملہ میں اپنا عہدہ سنبھال لیا اور بتدریج ترقی کرتے رہے تا آنکہ خدیو عباس ثانی کے عہد میں وہ یورپین ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ ہو گئے اور اس حاکم کے دل میں انہوں نے اتنی جگہ پیدا کر لی تھی کہ وہ کسی فیصلہ میں ان کی سفارش رد نہ کرتا، نہ ان کے کسی مشورہ کی مخالفت کرتا۔ پہلی جنگ عظیم میں جب انگریزوں نے اپنی استعماری قوت کے بل بوتہ پر خدیو عباس ثانی کو حکومت مصر کے تخت سے اتار دیا تو ارباب حل و عقد کے مشورہ پر اس نے بھی مصر کو خیر باد کہہ دیا اور ہسپانیہ کے ایک صوبہ برشلونہ میں اقامت اختیار کر لی اور جب تک عالمی امن قیام پذیر نہ ہوا، مصر واپس نہ آیا۔ لیکن سابقہ نظام حکومت سے پختہ تعلقات اور جلا وطن کیے ہوئے خدیو کی مدح میں کہے ہوئے قصائد ان کی راہ میں حائل ہوئے لہٰذا شاہی محل سے ان کے تعلقات استوار نہ ہو سکے۔ چنانچہ اب شاعر نے اپنے افکار و اشعار کا رخ قوم کی طرف پھیر دیا۔ قومی شعور و احساسات کی ترجمانی میں لگا رہا اور اسے مصروف جہاد رکھنے کے لیے حدی خوانی کرتا رہا تا آنکہ صرف مصر ہی نہیں بلکہ تمام عالم عربی ان کے اس احسان کا مداح ہو گیا۔ قوم نے شاہی اوپیرا ہاؤس میں اس شاعر کے اعزاز میں ایک جشن عام منایا جس میں جلالۃ الملک فواد الاول کی زیر سرپرستی مصر اور دیگر عربی ممالک کی سربرآوردہ شخصیتوں نے حصہ لیا۔ شوقی قوم کی نظروں میں مسلسل عزت و احترام اور مقبولیت حاصل کرتا رہا اور اس کی شاعری پر ملک و قوم کی حمایت و مدافعت کا

یہی جذبہ غالب رہا تاآنکہ وہ ۱۹۳۲ء میں اس دارِ فانی سے رحلت کر گیا۔ اس کی وفات پر شاہی اوپیرا ہاؤس میں وزارتِ تعلیم اور دیگر اربابِ علم و ادب نے ایک تعزیتی محفل منعقد کی جس میں ملک معظم کے نمائندہ نے شرکت کی اور دیگر عربی ممالک کی سرکردہ شخصیتوں کو دعوت دے کر شریک کیا گیا تھا۔

شوقی کی شاعری :- تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ شوقی ان دس صدیوں کا نعم البدل ہے جن میں متنبی کے بعد سے عربی تاریخ میں کوئی موہوبی صلاحیتیں رکھنے والا ایسا شاعر پیدا نہ ہوا جو وحی افکار کے منقطع سلسلہ کو جاری کرتا اور ادب کے فرسودہ اسلوب میں نئی روح پھونکتا۔

شوقی کی شاعری پرجوش طبیعت، احساس صادق، ذوقِ سلیم اور روح قوی سے پھوٹ کر نکلتی تھی۔ لہٰذا اس میں روانی کا زور اور بندش کی پختگی پائی جاتی ہے اور وہ ہر قسم کی کمزوری، لغو وحشو، اور اضطراب سے پاک صاف ہوتی ہے۔ متنبی کی طرح وہ بھی ہر طبقہ کے لوگوں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے ان کی طبیعتوں سے واقف اور ان کے جذبات و میلانات سے باخبر تھا اور ان کی صحیح ترجمانی کرتا تھا۔ نادر شعر، ضرب المثل اور حکمتِ عالیہ نظم کرنے میں بھی وہ متنبی سے مشابہ ہے۔ ان چیزوں کو وہ بلا قصد و ارادہ مدح و وصف و مرثیہ کے تحت مناسب موقعوں پر لے آتا ہے۔ اسی طرح وہ عمیق معانی اور گہرے مطالب کو نظم کرنے میں بھی متنبی کا مثیل ہے جن میں انسانی ذہن ڈوب جاتا ہے اور نہ کہیں ان کی تہ ملتی ہے نہ کہیں ساحل نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری کے بیشتر معانی خود اسی کے پیدا کردہ اور کمتر دوسروں سے لیے ہوئے ہیں۔ اس کے الفاظ، کلام کی مناسبت اور حالات کی مطابقت سے مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں تاہم ان کے بڑے حصہ پر اس کی طبعی شگفتگی، ظرافت اور شیرینی روح کی جھلک پائی جاتی ہے کبھی وہ اپنی طبیعت کو آزاد چھوڑ کر روانی میں شاعری کر جاتا ہے تو اس میں کچھ ایسا عنصر شامل ہو جاتا ہے جو اس کے فضل مرتبت سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔

شوقی اپنے دین کا پابند اور اپنی زبان و فن کا محافظ ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اپنے کلام میں جا بجا وہ انبیاء و خلفاء الٰہی کتب نیز مقاماتِ مقدسہ کا تذکرہ کرتا رہتا ہے وہ عہد بنی العباس کے بلند پایہ شعراء کے طرز پر شاعری کرتا ہے اور اپنی شاعری کے لیے طویل بحریں منتخب کرتا ہے۔ وہ نومولود اوزان پر بہت کم شعر کہتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک قصیدہ کے قافیہ میں بہت کم تنوع پیدا کرتا ہے، تاہم قدیم اسلوب کی پابندی اس کی راہ میں اس طرح حائل نہ ہو سکی کہ وہ عربی شاعری کی کمی کو پورا کرنے میں ناکام رہتا۔ اس سے پہلے عربی شاعری غنائی تھی جسے شاعر اپنی طبیعت سے پیدا کرتا اور اپنے دل سے نکالتا تھا۔ شوقی

نے آکر بیانیہ شاعری کی طرح ڈالی اور وطنیت نیز عمومی حوادث کے موضوعات پر طویل نظمیں کہیں جن کی مثالیں آپ "دول العرب" کے ارجوزہ اور "وادی النیل" کے قصیدہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

پھر اس نے اپنی توجہ ڈرامائی شاعری کی طرف مبذول کی اور اپنے مشہور ڈرامے نظم کیے مثلاً قلوپطرہ کی تباہی۔ مجنوں لیلی۔ قمبیز۔ علی الکبیر۔ عنترہ۔ الست ہدی۔ اپنی انہی جدت طرازیوں کی وجہ سے وہ عربی کا باکمال شاعر کہلایا۔ اس کی شاعری کا ایک دیوان ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ مزید برآں اس کی شاعری کے اور بھی مجموعے ہیں مثلاً کتاب عظماء الاسلام۔ نیز بچوں کے لیے نظموں اور دیگر گانوں کے مجموعے۔

شوقی مسجع نثر بھی لکھتا ہے۔ جو اس کی شاعری سے صرف وزن نہ ہونے کی وجہ سے مختلف ہے۔ اس نے اپنی نثر کا بڑا حصہ ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے اور اس کا نام "اسواق الذہب" رکھا ہے۔ اس نے آزاد نثر میں کچھ کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں لا یاس، ورقۃ الآس، مذکرات بنتاؤر" اور امیرۃ الاندلس" قابل ذکر ہیں۔

شاعری کا نمونہ:۔ اپنے ایک قصیدہ میں دمشق کا وصف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

امنت بالله واستثنيت جنته ‏ ‏ دمشق روح و جنات وريحان

قال الرفاق و قد هبت خمائلها ‏ ‏ الارض دار لها (الفيحاء) بستان

جرى و صفق يلقانا بها (بردى) ‏ ‏ كما تلقاك دون الخلد رضوان

دخلتها و حواشيها زمردة ‏ ‏ والشمس فوق لجين الماء عقيان

والحور في (دمر) اوحول (هامتها) ‏ ‏ حور كواشف عن ساق وولدان

و "ربوة" الواد في جلباب راقصة ‏ ‏ الساق كاسية و النحر عريان

والطير تصدح من خلف العيون بها ‏ ‏ و للعيون كما للطير الحان

و اقبلت بالنبات الارض مختلفا ‏ ‏ افوافه فهو اصباغ و الوان

و قد صفا (بردى) للريح فابتردت ‏ ‏ لدى ستور حواشيهن افنان

ثم انثنت لم يزل عنها البلال ولا ‏ ‏ جفت من الماء اذيال و اردان

میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں اور اس کی جنت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ دمشق میں ہر قسم کی آرائش و آسائش اور خدا کی رحمتیں موجود ہیں اور یہ علاقہ جنت ارضی ہے۔ جب یہاں کے گھنے درختوں کے جھنڈ جھومے تو ساتھیوں نے کہا کہ ساری زمین تو لوگوں کے رہنے کے لیے مکانات کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا چمن "فیحاء" ہے۔ یہاں داخل ہونے پر تیز رفتار اور تھپیڑے مارتا ہوا دریائے بردی اس طرح ہمارا استقبال کرتا ہے جیسے

جنت میں داخل ہونے پر رضواں تمہارا استقبال کر رہا ہو۔ جب میں اس میں داخل ہوا تو اس کے مضافاتی علاقے زمردیں تھے اور سورج پانی کی چاندی پر سونا بنا ہوا تھا۔ نور کے درخت "دمر" اور "دہامہ" کے ارد گرد ایسے معلوم ہو رہے ہیں گویا وہ حور وغلمان ہیں جن کی پنڈلیاں برہنہ ہیں اور وادی کا ربوہ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ فراک پہنے رقص کر رہا ہے۔ اس کی پنڈلیاں ڈھکی ہوئی ہیں اور سینہ عریاں ہے۔ چشموں کے پیچھے پرند چہچہا رہے ہیں اور خود پرندوں کی طرح چشموں سے بھی خوش الحان آوازیں نکل رہی ہیں۔ زمین پر مختلف خوشبوؤں اور پھولوں والے پودے اگ آئے ہیں جن کی وجہ سے وہ رنگ برنگی بنی ہوئی ہے۔ دریائے "بردی" ہوا سے کان لگائے ہوتے ہے جس کی وجہ سے وہ ہوا دریا پر چھائے ہوئے درختوں کی شاخوں کے اوٹ میں غسل کر کے ٹھنڈی ہو گئی ہے اور وہ جب وہاں سے پلٹی تو اپنے اندر نمی لے آئی اور اس کے دامن و آستین کا پانی ابھی تک خشک نہیں ہوا۔

ایک طویل قصیدہ میں اپنے سفر اندلس کا وصف بیان کر رہا ہے:۔

اختلاف النهار والليل ينسی	اذكرا لي الصبا و ايام انسي
وصفا لي ملاوة من شباب	صورت من تصورات ومس
عصفت كالصبا اللعوب ومرت	سنة حلوة ولذة خلس
وسلا مصر: هل سلا القلب عنها	او اساجرحه الزمان المؤسی
كلما مرت الليالي عليه	رق و العهد في الليالي تقسی
مستطار اذا البواخر رنت	اول الليل اوعوت بعد جرس
أحرام علی بلابله الدو	ح حلال للطير من كل جنس

روز وشب کا ادل بدل کر آنا بہت سے واقعات کو بھلا دیتا ہے۔ اے میرے رفیقو! مجھے بچپن اور میری محبت کے دن یاد دلاؤ۔ اور گھڑی بھر کے لیے میرے سامنے ایام شباب کا وصف بیان کرو جو تصورات اور احساس کی آمیزش سے رونما ہوا تھا۔ اور جو اٹھلاتی ہوئی باد صبا کی طرح گذر گیا جیسے میٹھی نیند اور آنکھ کی جھپک کے ساتھ ختم ہو جانے والی لذت۔ اور اے میرے ساتھیو! ذرا مصر سے پوچھو! کیا دل اس کی یاد کو بھلا سکا؟ یا اس کی یاد کے زخم کو وہ زمانہ مندمل کر سکا جو مرور ایام کے ذریعہ بہت سے زخموں کا مداوا کر دیتا ہے؟ جب بھی راتیں اس پر گذرتی ہیں تو وہ دل نرم وگداز ہو جاتا ہے حالانکہ زمانہ راتوں میں سختی پیدا کرتا ہے۔ جب بھی ابتدائے شب میں کسی جہاز کی آواز یا گھنٹی کے بعد اس کی سیٹی کی آواز سنتا ہوں تو دل بے چین ہو کر اچھلنے اور اڑنے لگتا ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ چمن کے گھنے سایہ دار درخت چمن کی بلبلوں کے لیے تو حرام ہو جائیں اور ان کے علاوہ ہر جنس کے پرندوں کے لیے وہ حلال ہوں؟ (یعنی وطن والے وطن کی آسائشوں

سے فیضیاب نہ ہو سکیں اور استعمار پسند طاقتیں ان پر تسلط جما کر عیش کرتی رہیں)

اسی قصیدہ میں ہے:-

کل دار احق بالاھل الا　　فی خبیث مین المذاھب رجس

ہر جگہ اپنے باشندوں کے لیے زیادہ سزاوار ہے سوائے اس جگہ کے جسے غلط طریقوں سے کام لے کر (استعماری قوتوں نے) گندا اور ناکارہ کر دیا ہو۔

ایضاً:-

وطنی لو شغلت بالخلد عنه　　نازعتنی الیه فی الخلد نفسی

شهد الله لم یغب عن جفونی　　شخصه ساعة ولم یخل حسّی

میرے وطن! اگر تجھ سے ہٹا کر مجھے جنت میں بھی بھیج دیا جائے تو وہاں بھی میرا جی تیری طرف کھنچتا رہے گا۔ خدا گواہ ہے کہ تیرا ماحول گھڑی بھر کے لیے بھی میری آنکھوں اور میرے شعور سے اوجھل نہ ہو سکا۔

محمد حافظ ابراہیم

(وفات ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء)

حالات زندگی:- محمد حافظ ابراہیم صوبہ اسیوط کے شہر دیروط میں ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے، جہاں اس وقت ان کے والد ابراہیم فہمی پلوں کی تعمیر کی نگرانی کرنے والے انجینیروں میں تھے۔ جب ان کی عمر دو برس کی تھی تو ان کے والد دیروط میں ناداری کے عالم میں انتقال کر گئے، اور ان کی والدہ انہیں ان کے ماموں کے پاس قاہرہ لے آئیں، جنہوں نے اس بچہ کی کفالت کی اور اسے مدرسہ خیریہ پھر مدرسۃ المبتدیان اور بعد ازاں مدرسہ خدیویہ میں داخل کرایا۔ پھر اس کے ماموں طنطا چلے گئے تو اسے بھی اپنے ساتھ وہاں لے گئے، جہاں اس نے چند سال بے کاری میں گذارے۔ وہ اپنے خالی اوقات مطالعہ میں صرف کرتا اور اپنی طبیعت کے ملال کو شعر و شاعری کے مشغلہ سے دل بہلا کر دور کرتا۔ بعض وجوہ کی بناء پر اس کے ماموں اس کے دل سے نومیدی کی گھٹا اور یتیمی کی ذلت کو دور نہ کر سکے، چنانچہ وہ ہمیشہ زندگی سے بیزار اور لوگوں سے نالاں اور تقدیر سے شاکی رہنے لگا۔ اور اس زمانہ میں اس کی شاعری کے یہی موضوع ہوتے۔ پھر ضرورت انہیں وکلاء کے دفاتر میں لے گئی جہاں انہوں نے ایک زمانہ تک کام کر کے روزی کا سلسلہ جاری رکھا تا آنکہ انہیں ایک اچھا موقع ملا اور وہ ملٹری اسکول میں داخل ہو گئے اور وہاں سے فوجی افسر بن کر نکلے۔ پھر وہ پولیس میں چلے گئے اور وہاں سے پھر فوج میں تبدیلی ہو گئی۔ پھر لارڈ

کچنر کے زیر کمان سوڈان پر مصری حملہ میں ان کو بھی وہاں بھیجا گیا۔ یہاں وہ ایک مدت تک مقیم رہنے کی وجہ سے بیزار و آمادۂ بغاوت ہو گئے اور بار بار مصر واپس آنے کی کوشش کرتے رہے اور جب کامیابی نہ ہوئی تو افسروں کی ایک جماعت کے ساتھ ۱۸۹۹ء میں بغاوت کر دی۔ فوجی عدالت میں ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور پھر انہیں محفوظ فوج میں اور بعد ازاں پنشن دے دی گئی۔

حافظ پھر پہلے کی طرح اپنی بے قرار و بے مقصد زندگی گذارنے لگا۔ نہ جم کر کوئی کام کرتا نہ کسی مقصد کو اپنے سامنے رکھتا بلکہ وہ ایک ہوٹل سے دوسری ہوٹل میں اور ایک مجلس سے دوسری مجلس میں جا جا کر اپنا دن گذارتا۔ امام عبدہ کے زیر سایہ رہتا، ان کے بلند مرتبہ سے استفادہ کرتا اور ان کے سہارے زندگی گذارتا۔ ساتھ ہی خوش حال و آسودہ طبقہ میں آمد و رفت رکھتا، ان کی مجالس میں اپنی میٹھی باتیں سناتا اور اپنا عمدہ کلام پیش کرتا۔ ۱۹۱۱ء میں حشمت پاشا نے جو ان دنوں وزیر تعلیم تھے اسے دار الکتب المصریہ کے ادبی شعبہ کا صدر اور پھر مہتمم مقرر کر دیا اور آغاز ۱۹۳۲ء پنشن پانے تک وہ اپنے اسی عہدہ پر فائز رہے اور اسی سال ۱۹۳۲ء کی گرمیوں میں انتقال ہو گیا۔

حافظ بحیثیت ادیب:- حافظ کی بچپن کی زندگی انتشار و آوارگی اور بے کاری میں گذری۔ نہ اسے علم کا شوق ہوا نہ کسی کام میں سرگرمی سے لگا۔ بالکل انہیں قدیم ادیبوں کی طرح جو مسلم بن الولید اور ابو نواس کی طرح بادشاہوں کے انعامات و احسانات پر زندگی گذارنے کے عادی تھے۔

اس کی ادبی زندگی ہر روز نئی صورت اختیار کرتی تھی جس طرح اس کی مادی زندگی ہر گھڑی بدلتی رہتی تھی۔ اس نے ایک زمانہ میں امیدوں کو مصر میں تخت خدیویہ اور آستانہ میں تخت خلافت سے وابستہ دیکھا تو اس کی زبان عباس و عبد الحمید کے مدحیہ قصائد سے رواں ہو گئی۔ بعد ازاں امام محمد عبدہ اور ان کی معززین ملک پر مشتمل جماعت اور قوم کے شیوخ میں پہنچا اور یہ زمانہ وہ تھا جب ان لوگوں کو انگریزوں سے اچھی امید اور خوش ظنی تھی، چنانچہ اس عرصہ میں اس نے ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ، ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر مبارک باد کی نظم، لارڈ کرومر کے لیے الوداعی قصیدہ، کہے۔ جن میں اس نے حکومت پرستانہ جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ پھر وہ یکسوئی سے قوم کی جانب متوجہ ہو گیا، عوام سے رابطہ پیدا کیا۔ ان کے لیڈروں سے ملا اور پر جوش و جوان وطنی جذبات لے کر مصطفےٰ کامل کے جھنڈے تلے سرگرم عمل ہو گیا، اپنے شکوے کو ملک کے شکوے میں ضم کر دیا اور دلوں کے ساز کو جہاد کے ترانوں کے ساتھ بجانے لگا۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے جوانی کی آرزوئیں اور اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کے مافی الضمیر کی ترجمانی، نظم کرنے لگا۔

جوانی ہی سے وہ شاعروں کے دواوین دیکھتا رہتا، اغانی کے اجزاء کا بار بار گہری نظر سے مطالعہ کرتا تھا تا آنکہ اسے انتخاب روایت اور پاکیزہ کلام کو چن لینے میں انتہائی کمال حاصل ہو گیا تھا۔ مزید برآں وہ دیگر ثقافی و تمدنی فروعات میں سے سنی سنائی یا اخبارات میں پڑھی ہوئی چیزوں میں سے ان ضروری مسائل کو چن لیتا تھا جنہیں وہ مجالس کی گفتگو یا شاعری میں اپنے لیے کار آمد خیال کرتا تھا۔

حافظ بحیثیت شاعر:۔ حافظ کی مضمون بندی اور حسن اسلوب ہی اس کی امتیازی خوبی اور خداداد صلاحیت ہے۔ اس باب میں وہ ادب کے ان پانچ اساطین[1] میں سے ایک ہے جن کی آواز سے شاعری کی تحریک میں جان پیدا ہوئی اور جن کی فن کاری نے بلاغت قصیدہ میں نئی روح پھونکی اور شاید اپنے تمام ساتھیوں میں یہ اپنے قلبی واردات کی سچی تعبیر کرنے، قوم کی آرزوؤں کی پوری پوری تفسیر کرنے اور اپنے زمانہ کی برائیوں کی صحیح عکاسی کرنے میں یگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی شاعری میں جو روح کارفرما ہے اور جو موضوعات ہیں ان میں سے کچھ تو اس کی ماضی کی انفرادی یادداشتوں کی منتشر صدا ہائے بازگشت ہیں اور کچھ حال کی اجتماعی آراء و افکار کا اقتباس ہے۔ جب وہ شعر کہنے کا ارادہ کرتا تو اس وقت کے اہم مسائل و مباحث و آراء جو لوگوں کے ذہنوں میں گھوم رہے ہوتے یا وہ موضوعات جو اس وقت مجالس و اجتماعات و اخبارات میں زیر بحث ہوتے انہیں کو وہ اپنے ذہن میں جمع کر لیتا پھر ان پر خوب غور و فکر بعد ازاں وہ انہیں شاعری کا جامہ پہناتا اور ان کو بہترین اسلوب اور نہایت عمدہ قالب میں ڈھالتا۔ حتی کہ جب قاری کے سامنے وہ نظم آتی یا وہ اسے سنتا تو نہایت روانی کے ساتھ وہ مضمون اس کے دل و دماغ میں اترتا چلا جاتا اور اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس مضمون کو وہ پہلے بھی سن چکا ہے لیکن اس پر حافظ کی چھاپ اور اس کی مہر ثبت پاتا۔

اس کی شاعری کا نمونہ:۔ زبان عربی اپنے بولنے والوں میں اپنی زبوں حالی و بدقسمتی پر مرثیہ خواں ہے:۔

رجعت لنفسی فاتهمت حصاتی	وناديت قومی فاحتسبت حياتی
رمونی بعقم فی الشباب وليتنی	عقمت فلم اجزع لقول عداتی
ولدت فلما لم اجد لعرائسی	رجالا و اكفاء وأدت بناتی
وسعت كتاب الله لفظا و غاية	وما ضقت عن آی به وعظات
فكيف اضيق اليوم عن وصف آلة	وتنسيق اسماء لمخترعات
انا البحر فی احشائه الدر كامن	فهل سألوا الغواص عن صدفاتی

[1] یہ پانچ اساطین بارودی، صبری، شوقی، حافظ اور مطران ہیں۔

فیا ویحکم ابلی وتبلی محاسنی ... ومنکم وان عزّ الدواء اُساتی

فلا تکلونی للزمان فانّنی ... اخاف علیکم ان تحین وفاتی

اری لرجال الغرب عزًّا ومنعة ... وکم عزّ اقوام بعزّ لغات

اتوا اھلھم بالمعجزات تفنّنا ... فیا لیتکم تاتون بالکلمات

میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو میں نے اپنی عقل پر تہمت لگائی۔ پھر میں نے اپنی قوم کو آواز دی اور مجھے خیال ہوا کہ ابھی میں زندہ رہوں گی۔ ان لوگوں نے عین عالم شباب میں مجھ پر بانجھ پن کا الزام لگا دیا اور کاش میں بانجھ ہی ہوتی تو مجھے اپنے دشمنوں کے الزام سے کوئی بے چینی اور پریشانی نہ ہوتی۔ میں نے تو بچے دیے۔ لیکن جب اپنی بیٹیوں کو دلہن بنانے کے لیے ہمسر و کفو نہ پائے تو میں نے انہیں زندہ درگور کر ڈالا۔ میں نے لفظی و معنوی اعتبار سے کتاب اللہ کی وسعتوں کو اپنے اندر لینے کی طاقت رکھی اور اس کے کسی معجزانہ کلام اور پند و نصیحت کے بیان میں کہیں بھی میں نے تنگی و کوتاہی کا ثبوت نہ دیا تو آج میں کسی نئی ایجاد کا وصف کرنے یا اس کے لیے نام رکھنے میں کیونکر تنگ اور کوتاہ ہو سکتی ہوں! میں تو ایک ایسا سمندر رہوں جس کا پیٹ موتیوں سے بھرا پڑا ہے، ذرا لوگ غوطہ خوروں سے میری سیپیوں کی بابت سوال تو کر دیکھیں۔ ہائے افسوس! میں مٹتی جا رہی ہوں اور میری خوبیاں ضائع ہوتی جا رہی ہیں اور گو میری دوا مشکل سے ملے گی لیکن بہرحال تم میں ہی میرے معالج موجود ہیں۔ تم مجھے زمانہ کی دستبرد پر نہ چھوڑو مجھے خطرہ ہے کہ اس طرح تم میری زندگی کے دن ہی ختم کرا دوگے اور میں فنا ہو جاؤں گی۔ میں اقوام مغرب کو عزت و بلندی اور حفاظت و پناہ میں دیکھ رہی ہوں اور بار ہا زبانوں کے غلبہ و قوت سے ان زبانوں کو بولنے والی قومیں بھی غلبہ و قوت سے ہمکنار ہو گئی ہیں۔ دنیا کے دیگر ممالک تو اپنی قوموں کو آئے دن نئے نئے معجزے ایجادات کی شکل میں دے رہے ہیں کاش تم لوگ محض الفاظ ہی ایجاد کرنے کی طاقت پیدا کر لیتے۔

خمریات:

اوشك الدیك ان یصیح ونفسی ... بین ھم وبین ظن وحدس

یا غلام! المدام والکاس والطا ... س وھیئ لنا مکانا کامس

اطلق الشمس من غیاھب ھذا الدن ... م واملأ من ذلك النور کأسی

واذن الشمس ان یلوح لعینی ... من سناھا، فذلك وقت التحسی

وادع ندمان خلوتی وائتناسی ... وتعجل واسبل ستور الدمقس

واسقنا یا غلام حتی ترانا ... لا نطیق الکلام الا بھمس

خمرة قیل انھم عصروھا ... من خدود الملاح فی یوم عرس

مرغ کی اذان کا وقت ہوا چاہتا ہے اور میرا جی غم و فکر اور ظن و تخمین میں الجھ رہا ہے۔ اے لڑکے! شراب اور جام و پیالہ لاؤ اور کل کی طرح جگہ ہموار درست کرو۔ اور اس خم مے کو کھول دو تاکہ اس کی تاریکیوں میں سے سورج برآمد ہو جائے اور میرے جام کو اس نور سے لبریز کر دو۔ اور صبح کو اجازت دو کہ وہ اس کی روشنی سے میری آنکھوں میں روشن ہو جائے کیونکہ وہی تو گھونٹ گھونٹ چڑھانے کا وقت ہے اور میری خلوت و جلوت کے ہم پیالہ ساتھیوں کو آواز دو اور جلدی سے سفید ریشمی پردے ڈال دو۔ اور اے لڑکے! ہمیں وہ شراب ارغوانی پلاؤ جس کے متعلق روایت ہے کہ وہ شادی کے وقت حسینوں کے رخساروں سے کشید کی گئی ہے اور اتنی پلاؤ کہ ہم بے خود ہو جائیں اور ہلکی آوازوں کے سوا ہم کچھ نہ بول سکیں۔

اپنے ایک قصیدہ بعنوان "غادة البابان" (جاپانی دوشیزہ) میں کہتا ہے:-

لا تلم کفّی اذا السیف نبا	صح منی العزم والدهر ابی
رب ساع مبصر فی سعیه	اخطأ التوفیق فیما طلبا
مرحباً بالخطب یبلونی اذا	کانت العلیاء فیه السببا
عقّنی الدهر ولولا انّنی	اوثر الحسنی عققت الادبا
ایه یا دنیا اعبسی اُو ابسمی	لا اری برقك الا خلبا
انا لولا ان لی من اُمّتی	خاذلا مابت اشکو النوبا
امة قد فتّ فی ساعدها	بغضها الاهل وحب الغربا
تعشق الالقاب فی غیر العلا	و تفدی بالنفوس الرتبا
وهی والاحداث تستهدفها	تعشق اللهو وتهوی الطربا
لا تبالی لعب القوم بها	ام بها صرف اللیالی لعبا

اگر تلوار اچٹ جائے تو میرے ہاتھ کو ملامت نہ کرنا۔ میرا عزم تو بالکل ٹھیک تھا لیکن زمانہ نے اس کی تصدیق نہ کی۔ بارہا ہوشیار اور کوشش کرنے والا اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ ہر اس مصیبت کو جو بلند مقصد کے حصول کی راہ میں میرا امتحان لیتی ہے میں اسے خوش آمدید کہتا ہوں۔ زمانہ نے میرے ساتھ وفا نہ کی اور اگر میں نیکی اور خیر کو ترجیح نہ دیتا تو میں بھی ادب سے بے وفائی برت لیتا۔ چل اے دنیا! تو خواہ منہ بگاڑے یا مسکرائے میں تجھ سے اپنی امیدیں وابستہ نہیں کر سکتا۔ اور تیری بجلی (وعدہ) کو میں فریب ہی سمجھتا ہوں۔ اگر میری قوم میں وقت پر ساتھ چھوڑ دینے والے نہ ہوتے تو میں بیٹھا مشکلات و مصائب کے شکوے نہ کرتا رہتا۔ میری قوم وہ ہے کہ جسے اپنوں سے بغض اور غیروں سے محبت نے بے دست و پا کر دیا

ہے۔ اسے اگر عشق ہے تو اس سے کہ بغیر بلند کارنامے انجام دیے اسے القاب و خطابات مل جائیں۔ یہ بے معنی مراتب حاصل کرنے کے لیے اپنی جانوں کی بازی لگا دیتی ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ زمانہ نے اسے حوادث کا تختہ مشق بنا رکھا ہے لیکن یہ ہے کہ اسے کھیل کود اور گانے بجانے سے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ اسے قطعاً پروا نہیں کہ دوسرے (استعمار پسند) لوگ اسے اپنا آلہ کار بنالیں یا حوادث روزگار اس کو ختم کر ڈالے۔

شیخ ناصیف یازجی

(پیدائش ۱۸۰۰ء وفات ۱۸۷۱ء)

حالاتِ زندگی:۔ ناصیف بن عبداللہ یازجی لبنان کے ایک گاؤں کفرشیما میں پیدا ہوا اور صاحبِ علم و فضل ادب گھرانہ میں پروان چڑھا۔ ابتدائی تعلیم ایک پادری سے حاصل کرنے لگا۔ انہوں نے مبادئ طب اپنے والد سے سیکھے۔ پھر ان کی طبیعت ادب کی طرف مائل ہوئی اور وہ اسے حاصل کرنے میں منہمک ہوگئے۔ اس زمانہ میں کتابیں کمیاب، ان کی تجارت کا سلسلہ محدود، اور ان کا حاصل کرنا مشکل تھا چنانچہ جب کوئی قلمی کتاب ان کے ہاتھ لگی تو وہ اسے یا تو یاد کرلیتے یا نقل کرلیتے یا اس کا خلاصہ لکھ لیتے، تا آنکہ ان کی معلومات وسیع، علم پختہ، اور نظم و نثر میں انہیں خاصا درک حاصل ہوگیا۔ چنانچہ امیر بشیر شہابی نے اسے اپنا سکریٹری بنا لیا، یہ وہ زمانہ تھا جب امیر کا عروج تھا۔ ناصیف بارہ سال تک مسلسل اس کی خدمت کرتا رہا حتیٰ کہ ۱۸۴۰ء میں امیر نے اسے اپنے ملک سے نکال دیا۔ تب وہ اپنے گھر والوں کو لے کر بیروت چلے گئے اور وہیں اقامت اختیار کرکے اپنی باقی ماندہ زندگی تصنیف و تالیف و تدریس نیز ادباء سے مراسلت اور مشاعروں میں گذارتے رہے، آخری عمر میں ان کے بائیں نصف بدن پر فالج گر گیا، پھر انہیں ان کے بڑے لڑکے شیخ حبیب کی موت کا صدمہ پہنچا، جس سے ان کے قویٰ کمزور ہوگئے اور وہ اس کے بعد زیادہ زندہ نہ رہے۔

نثر اور شاعری:۔ شیخ حریری کے اسلوب نگارش کا اتباع کرتے تھے۔ لہذا بدیع کے شیدا، صنعت کے دل دادہ اور غریب کلمات پر فریفتہ تھے انہوں نے مقامات لکھی جس میں ساٹھ مقامے ہیں، اس میں انہوں نے حریری کی نہایت عمدگی و خوش اسلوبی سے اقتدا کی ہے۔ لفظی حسن کی انتہا کر دی۔ شاعری میں وہ اسی طرح متنبی سے متاثر ہیں جس طرح نثر میں حریری سے۔ لیکن متنبی کی تقلید میں وہ کمزور، اور نمایاں طور پر دوڑ میں اس سے پیچھے رہ گئے۔ باوجود کوشش اور طبعی زور کے ان کی شاعری

حریری اور اس کے ہم نوا شاعروں سے مشابہ ہوگئی، بالخصوص ان قصائد میں تو انہوں نے بڑی ہی زیادتی کر ڈالی ہے جن میں انہوں نے بتکلف تاریخیں کہی ہیں۔ حتی کہ دو شعروں میں اٹھائیس تاریخیں نکالی ہیں، یا قصیدہ کے ہر مصرعہ میں تاریخ کا التزام کیا ہے مثلاً وہ قصیدہ جس میں فتح عکار پر ابراہیم پاشا کو مبارکباد دی ہے، یا پورا قصیدہ ایسے حروف پر مشتمل ہے جس میں کہیں نقطہ والا حروف نہیں، مثلاً

حول در حل ورد   هل له للهم ورد

بایں ہمہ ان کے کچھ قصائد ایسے بھی ہیں جن کو پڑھنے سے متنبی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اس کے الفاظ پرشوکت، اسلوب پختہ، معانی میں جدت و ندرت اور جگہ جگہ ضرب الامثال و حکمت ہیں۔

علمی مقام اور تالیفات:- یازجی کی تصانیف سے اس کی لغت میں وسیع معلومات ادب میں گہری نظر، اور علوم لسان میں کمال و مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی ایک تصنیف مجمع البحرین ہے جو اس کے ساٹھ مقامات کا مجموعہ ہے، جس میں اس نے حریری کے اسلوب کی تقلید کی ہے، دو مجموعے رجزیہ شاعری کے ہیں جن کے نام "الجمانۃ" اور "جوف الفرا" ہیں۔ اول الذکر علم صرف پر ہے اور دوسرا نحو میں۔ صرف و نحو پر ایک مختصر تالیف "فصل الخطاب" ہے۔ معانی بیان کے موضوع پر ایک کتاب "عقد الجمان فی علم البیان" ہے عروض و قوافی میں ایک کتاب "نقطۃ الدائرۃ" ہے۔ منطق میں "قطب الصناعۃ"۔ علاوہ ازیں "نفحۃ الریحان" "فاکہۃ الندمار فی مراسلۃ الادبار" اور "ثالث القمرین" ہیں۔ ان کی بیشتر تصانیف مدارس کے نصاب کے سلسلہ میں لکھی ہوتی ہیں، جو زیادہ تر شام کے عیسائی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

شاعری کا نمونہ:- اپنے ایک قصیدہ میں بلاد عربیہ کی فوج کے کمانڈر اسعد پاشا کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:-

بناء العلی بین القنا والبوارق	علی صهوات الخیل تحت البیارق
و لله سر فی العباد و انما	قیل محل السر بین الخلائق
یقلب هذا الدهر احوالنا کما	تقلب فینا لاحقا اثر سابق
ولولا اختیار الدولة ابن سریها	لما اعتمدته فی المعانی الدقائق
کریم تولی الامر یصلح امره	کفتق تولته انامل راتق
اقام السرایا ینفر الموج خیلها	بکل لواء فوق لبنان خافق
یحدث اهل الغرب فی کل لیلة	بما فعلت غاراته فی المشارق
فیعجب من افعاله کل عاقل	و یثنی علی افضاله کل ناطق

تضیق بحار الشعر عنہ وتستحی — ببحر لہا فی بحر کفیہ غارق

بلندی و سروری نیزوں اور تلواروں کے درمیان گھوڑوں کی پیٹھوں پر جھنڈوں کے نیچے ہوتی ہے۔ بندوں میں اللہ کے راز ہیں لیکن مخلوق میں کم ہی راز کے اہل ہوتے ہیں۔ یہ زمانہ جس طرح خود دگرگوں ہوتا رہتا ہے ویسے ہی یکے بعد دیگرے ہمارے حالات کو بھی الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے۔ اور اگر حکومت اپنے صاحب تخت کو انتخاب نہ کرتی تو وہ اس پر کبھی اہم معاملات میں اعتماد نہ کرتی۔ یہ ایسا شریف ہے کہ جس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اس کے بگاڑ کو نہایت ہوشیاری سے سدھارتا ہے۔ اس نے ایسے لشکروں کو تیار کیا ہے جس کے سوار ہر حائل ہونے والی مشکل پر غلبہ پا لیتے ہیں، ان کا جھنڈا لبنان پر لہرا رہا ہے۔ اس کے لشکر مشرق میں جو تباہی مچاتے ہیں۔ ہر رات ان کا چرچا مغرب والوں میں ہوتا ہے۔ اس کے کاموں سے ہر عقلمند حیرت میں رہ جاتا ہے اور ہر بولنے والا اس کے احسانات کا ثنا خواں ہے۔ شاعری کی بحریں اس کی تعریف میں تنگ ہو جاتی ہیں اور شرما کر یہ بحریں اس کے ہاتھوں کے جود و سخا کی بحروں میں غرق ہو جاتی ہیں۔

بطرس بستانی

(پیدائش ۱۸۱۹ء وفات ۱۸۸۳ء)

حالاتِ زندگی:- باکمال عالم، محقق لغوی بطرس بن بولس بستانی مارونی، امیر بشیر کے عہد میں لبنان کی دبیہ نامی بستی میں پیدا ہوا۔ پھر ہوش سنبھالنے کے بعد عین ورقہ کے مدرسہ میں داخل ہوا، جہاں دس سال رہ کر اس نے عربی، سریانی، لاتینی، اور اطالوی زبانیں سیکھیں۔ فلسفہ، علم الاہیات اور فقہ میں درک حاصل کیا۔ تاریخ، جغرافیہ اور حساب میں تجربہ پیدا کیا، پھر اس کی طبیعت خدمت کنیسا کی طرف مائل ہوئی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اسے چھوڑ کر پھر تعلیم میں لگ گیا۔ بعد ازاں بیروت آیا اور وہاں امریکی مسیحی مبلغین سے ملا۔ ان کے بعض اساتذہ سے انگریزی، عبرانی، یونانی اور کچھ جدید علوم حاصل کیے، پھر ان کا ہم مذہب و ہمنوا بن گیا اور تورات کا ترجمہ کرنے میں ان کی مدد کی۔ ۱۸۶۳ء میں اس نے ایک اسکول بنایا جس کا نام "المدرسۃ الوطنیۃ" رکھا، یہ مدرسہ اپنے حسن انتظام اور اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے بہت مقبول و مشہور ہوا۔ چنانچہ شام، مصر، آستانہ، یونان اور عراق تک سے اس میں بکثرت طلبہ آنے لگے۔ پھر اس نے اس مدرسہ کا اہتمام و انصرام اپنے بیٹے سلیم بستانی کے حوالہ کر دیا اور خود یکسوئی سے مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گیا۔ ۱۸۶۹ء میں وہ اپنے قاموس المحیط کی تالیف سے فارغ ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں اس نے ایک علمی،

ادبی، سیاسی رسالہ "الجنان" نکالا، اور اس کی ادارت وتربیت کا کام اپنے بیٹے سلیم کو سونپ دیا۔ پھر اس کی مدد کے لیے ایک رسالہ "الجنۃ" اور دوسرا "الجنینۃ" نکالا۔ اس کے بعد انسائیکلوپیڈیا کا کام شروع کر دیا جو نہایت گراں قدر اور عظیم وخطیر کام ہے، جسے مکمل کرنے کے لیے انفرادی صلاحیتیں کافی نہیں، بلکہ ایک جماعت کی ضرورت ہے، لیکن متعدد مشہور زبانوں میں مہارت اور صبر وجہد استقلال نے اس کے لیے یہ مشکل کام بھی آسان کر دیا، چنانچہ اس نے انسائیکلوپیڈیا کی سات جلدیں نکالیں، وہ ساتویں جلد کی تکمیل میں لگا ہوا تھا کہ اچانک موت نے اسے آن لیا، بعد ازاں اس کے بیٹوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اس کی موت سے مشرق جدید علمی تحریک کے ایک عظیم ستون سے محروم ہو گیا۔

اس کا علمی مقام اور خدمات: بستانی نے اس دور میں کمال حاصل کیا جب ہر طرف جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے علم کا چراغ جلا کر راستہ روشن کیا۔ اپنے آپ کو رہنمائی وتبلیغ علم کے لیے وقف کیا۔ کتابیں لکھیں، رسالے نکالے، مدرسے کھولے۔ اس نے عظیم خدمات اور قابل قدر علمی تالیفات سے اپنی زندگی کو بھر لیا۔ یہی اس کی عبقریت، جواں ہمتی اور پختگی ارادہ کا ثبوت ہے۔ اس کی ہمیشہ باقی رہنے والی تالیفات میں "محیط المحیط" ہے۔ یہ جدید طرز کی لغت ہے جس میں اس نے فیروز آبادی کا قاموس، اور جوہری کا صحاح یکجا کر دیے ہیں۔ اور اسے ثلاثی مجرد کے حروف ہجاء کی ترتیب سے مرتب کیا ہے، اس میں بہت سے عامیانہ الفاظ اور ان کے مقابلہ میں ان کے ہم معنی فصیح الفاظ بھی دیے ہیں بہت سے غیر عربی الفاظ کے متعلق جن کی اصل پہلے معلوم نہ تھی یہ بتایا ہے کہ یہ کن زبانوں سے معرب کیے گئے ہیں۔ نیز اس میں جدید علوم کی بہت سی اصطلاحیں بھی دے دی ہیں۔ طلبہ کے لیے اس نے اپنی اس ضخیم کتاب کا ایک مختصر ایڈیشن "قطر المحیط" کے نام سے نکالا۔ اس کا دوسرا عظیم کام انسائیکلوپیڈیا کی تالیف ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا اس نے اس کی چھ جلدیں شائع کیں، اس کے بیٹے سلیم نے ساتویں اور آٹھویں جلدیں شائع کیں اور نویں جلد کی تکمیل میں اس نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا، پھر اس کے بقیہ بیٹوں نے اپنے چچا سلیمان بستانی، مترجم ایلیڈ، کی مدد سے نویں جلد لکھی، پھر یہ کام اسی حصہ پر بند ہو گیا۔ جب سلیمان بستانی قاہرہ پہنچا تو اس نے اس عظیم کام کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا چنانچہ اس نے اپنے دو چچا زاد بھائیوں کی مدد سے دو اگلے حصے دسواں اور گیارہواں نکالے، پھر ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے یہ سلسلہ نامکمل رہ گیا۔

ان دو گراں قدر علمی خدمات کے علاوہ بستانی نے "کشف الحجاب فی علم الحساب" اور صرف ونحو میں "مفتاح المصباح"، نیز مختلف موضوعات پر متعدد مقالات ورسائل بھی لکھے ہیں۔

احمد فارس شدیاق

(پیدائش ۱۸۰۴ء وفات ۱۸۸۷ء)

یہ ادیب ولغوی لبنان کے شہر عشقوت میں مارونی خاندان میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے عین ورقہ کے مدرسہ میں داخل ہوا، زبان اور نحو کا کچھ حصہ اس نے اپنے بھائی اسعد سے سیکھا، اور دس برس کی عمر میں ہی اس نے شاعری شروع کر دی۔ بچپن سے اسے مفردات و مترادفات (الفاظ) کے حفظ کرنے میں بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اس ضمن میں اس نے بڑی معلومات حاصل کر لیں جس کا اثر اس کی تقریروں اور تحریروں میں نمایاں ہے۔ پھر اس کے خاندان میں ایک ایسا سانحہ ہوا جس نے اسے بڑا متاثر کیا، اس کے بھائی اسعد نے جو اس پر بڑا مہربان و مشفق تھا اپنا آبائی دین چھوڑ کر انجیلی مذہب اختیار کر لیا، جس پر اس کے خاندان اور دینی پیشواؤں نے اس پر بڑے مظالم ڈھائے اور انہی کی قید میں وہ گھٹ کر مر گیا۔ اس واقعہ سے اسے بڑی تکلیف پہنچی اور وہ غصہ ہو کر مصر کے امریکی مبلغین کی زیرِ نگرانی پہنچ گیا، وہاں اس نے ایک مدت علم و تعلیم میں گذاری۔ ۱۸۳۴ء میں امریکیوں نے اسے اپنے مطبع میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کرنے کے لیے مالٹا بھیج دیا، وہ وہاں تھا کہ تورات سوسائٹی نے تورات کا عربی ترجمہ کرنے کے لیے اسے اپنے پاس لندن بلا لیا۔ چنانچہ وہ وہاں چلا گیا اور ایک مدت تک لندن میں رہا پھر وہاں سے پیرس چلا گیا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تونس کے احمد پاشا بای وہاں پہنچے ہوئے تھے، چنانچہ شدیاق ان سے ملا اور ان کی مدح میں قصیدہ پیش کیا، امیر نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں انعامات واکرامات سے نوازا، اس پر شاعر نے کہا "میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ زمانہ نے شاعری کی قدردانی کے لیے کوئی منڈی بچائی ہوگی" پھر تونس پہنچ کر اس نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام احمد رکھا۔ وہ مسلسل رسالہ "الرائد التونسی" میں اپنے مقالات شائع کرتا اور بای کے انعامات واکرامات سے فیض حاصل کرتا رہا۔ ادھر اس کے علم و فضل کا تعارف ہوتا رہا اور اس کی شہرت و مقبولیت بڑھتی گئی تا آنکہ صدارت عظمیٰ نے اسے آستانہ بلا لیا۔ وہاں جا کر اس نے رسالہ "الجوائب" نکالا۔ اس کی نثر ونظم نیز سیاسی سرگرمیوں نے ملک میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور وہ مشرق و مغرب میں پہنچنے لگا۔ وہ مشرق کی سیاست کے بارے میں متن سند کی حیثیت رکھتا اور ہر سیاسی مسئلہ میں اسی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ مقبولیت و شہرت کی وجہ سے عزت و ثروت احمد فارس کے غلام بن گئے۔ امراء و رؤساء اس کی دوستی کے خواہش مند رہنے لگے۔ حکومت علیہ نے ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں متعدد القاب اور مختلف تمغے عطا فرمائے۔

آخری عمر میں انہوں نے "الجوائب" کی ادارت اپنے بیٹے کے حوالے کر دی۔ اور وہ مستقل پہلی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا رہا تا آنکہ ۱۸۸۴ء میں سوڈانی حوادث کے بعد وہ بند ہو گیا۔ پھر شدیاق بڑھاپے میں مصر پہنچا۔ مصریوں نے اس کا شایان شان استقبال کیا اور عزت و احترام سے اپنا مہمان بنایا۔ بعد ازاں وہ واپس آستانہ چلے گئے اور وہیں انہوں نے انتقال کیا۔

اس کی نثر اور شاعری:- شدیاق ادبی فنون میں کامل، فنون انشاء پر قادر، مزاح، ظرافت، وعظ و نصیحت، ادب، و سیاست سب ہی موضوعات پر لکھنے کی مہارت رکھتے تھے۔ وہ زبان کے مفردات کے حافظ، معانی و اسالیب سے خوب واقف اور عمدہ نظم و نثر نگار تھے۔ ان کی تحریر میں تراکیب شستہ و موزوں، معانی ہم آہنگ و رواں ہوتے، ان کے یہاں ہم معنی الفاظ اور جملوں کی کثرت ہے۔ مضمون کو طول دینا، تفصیل سے بیان کرنا نیز مبالغہ آرائی ان کی خصوصیات ہیں۔ ان کی شاعری نثر کے مقابلہ میں کمتر درجہ کی ہے۔ اس میں نثر کی سی حدت طرازی بھی نہیں ہوتی۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ نثر نگاری میں صاحب طرز مجدد تھے اور شاعری میں مقلد۔ لیکن اپنے معاصرین کے اعتبار سے وہ نظم و نثر دونوں میں پیش رو اور صاحب کمال تھے۔

تالیفات:- الجوائب میں شائع ہونے والے مقالات و مضامین اور نظموں کے علاوہ جو تیئیس سال تک لکھے جاتے رہے، ان میں سے مشہور ترین یہ ہیں:

کتاب "سر اللیال فی القلب والابدال" یہ لغوی تجزیہ ہے جس میں متداول افعال اور مستعمل اسماء کو بیان کیا گیا ہے نیز اس میں صاحب قاموس نے جو لفظ یا ضرب المثل چھوڑ دی یا اس کی جو عبارت غیر واضح رہ گئی یا جہاں اس سے مادہ کی ترتیب میں سہو ہوا، ان کی بھی نشان دہی کی گئی ہے یہ کتاب ۱۲۸۴ھ میں آستانہ سے شائع ہوئی۔

دوسری کتاب "الساق علی الساق فیما ہو الفاریاق" ہے اس میں فاریاق اس کے نام فارس شدیاق کا مخفف ہے۔ جو اپنے نام کی جگہ استعمال کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب اس نے یورپ کی سیاحت کے دوران لکھی ہے اس میں اپنے سفروں کے واقعات و احوال اور ابتدائی عمر میں جھیلے ہوئے مصائب کا ذکر ہے۔ اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کنبہ کے لوگوں کو للکارا اور دھمکایا ہے پھر ہر موضوع پر جداگانہ مترادف الفاظ جمع کیے ہیں۔ مثلاً کھانے پینے کے متعلق، سونگھنے کی چیزیں اور ان کے متعلقات، زیورات اور جواہر وغیرہ سے متعلقات۔ یہ اس کتاب کے اہم مباحث ہیں۔ اس سلسلہ میں مصنف پر ادب میں جسارت کرنے، لغو مذاق کرنے اور اپنے مرتبہ سے گرے ہوئے نازیبا الفاظ استعمال کرنے پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

مزید برآں اس کی ایک کتاب "الجاسوس علی القاموس" ہے جس میں اس نے وہ تمام

مآخذ جمع کر دیے ہیں جن کی مدد سے اس نے قاموس فیروز آبادی پر اضافے اور اصلاحیں کی ہیں۔ ایک اور کتاب "کشف المخبا عن فنون اوربا" ہے۔ یہ کتاب اس کے یورپ کی سیاحت کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک تصنیف "الواسطۃ فی احوال مالطہ" ہے جس میں اس جزیرہ کا وصف، اس کی زمین اور باشندوں کے حالات نیز اس کی موجودہ اور گذشتہ تاریخ کا ذکر ہے۔

اس کی نثر کا نمونہ:- آپ دیکھیں گے کہ بہت سے لوگ مبالغہ آرائی سے اپنے وطن کی مدح کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کی یاد میں بے چین بے قرار رہتے ہیں۔ وہاں کے جنگلوں، چراگاہوں، باغوں، حوضوں، تالابوں، قلعوں، میدانوں، پہاڑوں، ٹیلوں، ٹیکریوں، محلوں، مکانوں، پودوں، درختوں، سبزیوں، پھلوں، پرندوں، چرندوں اور سیرگاہوں کی تعریفیں کرتے کرتے ان کی زبانیں تھکی جاتی ہیں وہاں کی خوشگوار آب و ہوا کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اس کے موسم کا ایسا سماں باندھتے ہیں کہ گویا اس میں بہار کے سوا کوئی فصل ہی نہیں ہوتی اور جیسے اس کے ہر علاقہ سے زرخیزی کے باعث سونا اور چاندی پھوٹ کر نکلتا رہتا ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ وہاں کا ایک مہینہ دوسری جگہوں کے ہزار برس سے بہتر ہے۔ ان کا دعوی ہوتا ہے کہ ہر علاقہ اس کی پیداوار کا محتاج ہے۔ پھر وہ بے قرار و حیران ہو کر ٹھنڈی آہیں بھرنے اور چیخنے چلانے لگتا ہے کہ لوگو! حب وطن ایمان ہے۔ میں نے دنیا کی اونچ نیچ دیکھی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ دیس دیس مارا مارا پھرا ہوں کوئی علاقہ ایسا نہیں جسے میں نے نہ دیکھا ہو اور ہر جگہ کے بسنے والوں کے حالات میں نے معلوم کر ڈالے مگر کسی علاقہ میں بھی وہ پرسکون و خوشگوار زندگی نہیں پائی جو میرے وطن میں نصیب ہے۔ ہمارے ملک کے کیا کہنے۔ شعراء اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ دیکھو فلاں شاعر نے یوں اس کی مدح سرائی کی ہے۔ فلاں اس کی تعریف میں یوں قصیدہ خواں ہے اور لیجئے آپ بھی سنیے جو اس کے نالوں، ندیوں، بلبلوں اور چڑیوں، سرسبز باغوں اور پھولوں، قلعوں اور محلوں، کارخانوں اور مکانوں، ہرنوں اور چراگاہوں نیز سرسبز و زرخیز فضاؤں کی خوشگواری، باغوں کی تر و تازگی اور گل لالہ کی خوبصورتی کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ اتنی تعریفیں سن چکنے کے بعد ذرہ آپ ان سے سوال کیجئے کہ میاں یہ تو بتاؤ تمہارا سب سے قریبی پڑوسی کیسا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ آپ کے اور اس کے تعلقات نہایت شگفتہ ہوں گے وہ آپ کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتا ہو گا؟ اور آپ دیکھیں گے کہ وہ فوراً ہی پھٹ پڑے گا اور کہے گا "کس کا نام لے دیا آپ نے۔ وہ تو نہایت ہی نکما پڑوسی ہے۔ نہایت نالائق، بلکہ ملک و قوم کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ" آپ پھر اس سے دریافت کیجئے "اچھا اس سے آگے کا پڑوسی کیسا تھا؟ شاید اس سے آپ کی خوب نبتی ہو گی؟ اس سے آپ کی پرخلوص دوستی ہو گی؟" اور وہ

کہے گا: "ہائے میری بدنصیبی و بدبختی وہ تو پہلے سے بھی زیادہ ناکارہ ہے۔" پھر آپ اس سے پوچھیے کہ تمام محلے والے کیسے ہیں؟ اور وہ کہے گا "وہ سب کے سب خراب اور باعث اذیت و مصیبت ہیں" پھر آپ اس سے دریافت کیجیے "اچھا ساری قوم اور ملک کے لوگوں کا کیا حال ہے؟" اور وہ کہے گا "وہ تو بڑے خائن، فریبی، بے وفا اور چال باز ہیں جب بھی ان سے کوئی معاملہ پڑا انھوں نے کسی نہ کسی پہلو سے نقصان پہنچانے میں دریغ نہ کیا۔" دیکھا آپ نے یہ ہے اس کے ملکی بھائیوں کا حال؟ اب آپ اس سے زیادہ سوالات نہ کیجیے اور سمجھ لیجیے کہ ہر جواب انھی جوابوں سے ملتا جلتا ہوگا۔ لیکن کوئی مضائقہ نہیں اگر آپ لگے ہاتھوں اس سے کہیں کہ ایک طرف آپ کے وطن میں وہ بے بڑے محاسن تھے اور دوسری طرف یہ باعث عار عیوب و نقائص ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو وہ کہے گا "جناب عالی! ہمارے آباء و اسلاف بڑے نیک اور بلند کردار تھے، انھوں نے ہی اپنی کوششوں اور محنتوں سے اس میں وہ محاسن پیدا کیے تھے، لیکن پھر زمانہ خراب ہوگیا اور بعد کی نسلیں بگڑ گئیں۔ اب وہ خوبیاں تو رہ گئیں لیکن انسان بدل گئے۔ ذرا ان سے پوچھیے تو سہی! کہ آخر زمانہ کا کیا مطلب ہے؟ وہ تو کبھی بھی انسانوں کی تاریخ میں نیک اور صالح نہیں رہا تاریخیں اس پر گواہ ہیں۔ پھر آخر یہ کیا عجوبہ ہے کہ تمام لوگ تو بگڑ گئے اور خراب ہوگئے لیکن تم ہی اکیلے نیک اور صالح بچ گئے؟ تمہیں اپنے سوا سب ہی برے نظر آتے ہیں؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر تم نیک و صالح ہوتے تو کسی دوسرے کی عیب جوئی نہ کرتے نہ کسی کو باعث ننگ و عار بتاتے۔ کیونکہ جو برا ہوتا ہے اسے دوسروں میں برائی ہی برائی نظر آتی ہے۔ اس کے متعلق ہمارے شاعر حکیم نے کہا ہے:-

ومن یک ذا فم مر مریض یجد مرّا به الماء الزلالا

جس کا منہ بیماری کی وجہ سے کڑوا ہوتا ہے وہ اپنی بیماری کی وجہ سے آب صاف و شیریں کو کڑوا ہی بتاتا ہے۔

اپنے ہم جنسوں اور ہم وطنوں پر طعن و تشنیع کرنے سے تم خود ہی مستحق ملامت بن جاتے ہو۔ یقیناً وہ شخص جو خود کو چھوڑ کر اپنے جملہ اہل وطن کو بے وقوف و ناکارہ خیال کرتا ہے اس قابل ہے کہ ساری قوم اس کی حماقت و دیوانگی کا اعلان کرتی رہے۔

اعتذار

اگر وقت اور حالات ناسازگار نہ ہوتے تو ہم یہاں اس تحریک کے دیگر نمایاں اور بلند پایہ ادیبوں کا تعارف بھی کراتے۔ مثلاً محقق، لغوی، نقاد، صحافی شیخ ابراہیم یازجی، جن کی وفات ۱۹۰۶ء میں بیروت میں ہوئی۔ زعیم مشرق سعد پاشا زغلول متوفی ۱۹۲۷ء، علاوہ ازیں

ہم مغرب کے ان علماء (مستشرقین) کا بھی تذکرہ کرتے جنھوں نے مشرقی زبانوں کی تحقیق، آثار اسلامیہ کی بحث و تفتیش اپنا موضوع بنا کر اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ نادر کتابیں شائع کیں، گہرے اصول منضبط کیے اور اپنی قیمتی علمی تحقیقات سے ہمارے لیے بحث و تحقیق کی راہیں کھول دیں۔ بالخصوص سلوسٹر ڈی ساسی اٹیان کاٹرمیر، کلیمین ہیار، یہ فرانسیسی ہیں۔ فریٹاگ، ویسٹنفیلڈ ایڈورڈ گلازر، نولڈکی یہ جرمنی ہیں۔ پلومر، براؤن، مرگلیوس یہ انگریز ہیں۔ ڈوزی ہالینڈ کا، گلڈزہیر ہنگری کا۔ گویڈے اطالونی وغیرہ۔ شاید ہم دوسرے ایڈیشن میں ان کا اضافہ کرسکیں۔

مترجم

اسی طرح ہند و پاکستان کے بہت سے علماء جنھوں نے ان ملکوں میں علوم عربیہ کی بیش بہا خدمات انجام دیں اس قابل ہیں کہ ان کا تذکرہ عربی ادب میں جگہ پائے۔ سردست میں اپنے والد مرحوم کے مختصر سے تذکرہ کے ساتھ اس کتاب کو ختم کر رہا ہوں۔

محمد سورتی رح

(ولادت ۱۳۰۷ھ وفات ۱۳۶۱ھ)

حالاتِ زندگی: ابو عبداللہ محمد بن یوسف سورتی ۱۳۰۷ھ میں ضلع سورت کے ایک گاؤں سامرود میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ سات برس کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا پھر فارسی اور عربی سیکھی۔ بغرض تعلیم ایک سال سورت میں اقامت کی پھر بمبئی پہنچے۔ وہاں سے اعلیٰ تعلیم کا شوق انہیں ۱۳۲۰ھ میں دہلی لے گیا یہ شہر علوم دینیہ و عربیہ کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ وہاں مختلف مدارس اور متعدد اساتذہ سے علوم دینیہ میں سبق لیے۔ ۱۳۲۶ھ میں علامہ محمد طیب مکی سے استفادہ کرنے کے لیے حیدرآباد دکن پہنچے، پھر جب شیخ محمد طیب رام پور گئے تو وہ بھی ان کے ہمراہ رام پور گئے۔ بعدازاں ۱۳۲۹ھ میں شیخ طیب عرب ندوۃ العلماء میں ادیب اول کے عہدہ پر فائز ہوئے تو ان کے ساتھ ان کا یہ قابل شاگرد بھی لکھنو پہنچا۔ تقریباً پانچ سال تک وہ شیخ طیب کے ساتھ رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے شیخ سے منطق و فلسفہ، ادب، اصول فقہ کچھ علم کمال، تفسیر اور صحیح البخاری مکمل پڑھی۔ پھر ملک کے مختلف جلیل القدر علماء سے ملاقاتیں کیں۔ محرم ۱۳۳۵ھ میں انہوں نے ریاست ٹونک کے ایک معزز گھرانہ میں شادی کرلی۔ وہ قلمی کتابوں کی تلاش میں ٹونک کے مشہور کتب خانہ پہنچا کرتے تھے۔

ان کا علمی مقام:- علوم عربیہ و دینیہ، بالخصوص لغت، عربی شاعری، تاریخ، انساب، اسماء الرجال، حدیث، تفسیر میں ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے معارف، بابت ستمبر ۱۹۴۲ء شذرات میں ان کے متعلق لکھا ہے:

"پچھلے مہینہ کا سب سے اندوہناک علمی حادثہ مولانا محمد سورتی کی وفات ہے۔ مرحوم اس عہد کے مستثنیٰ دل و دماغ اور حافظہ کے صاحب علم تھے۔ جہاں تک میری اطلاع ہے اس وقت اتنا وسیع النظر، وسیع المطالعہ، کثیر الحافظہ عالم موجود نہیں، صرف و نحو و لغت و ادب و اخبار و انساب رجال کے اس زمانہ میں درحقیقت وہ امام تھے"۔

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:-

"مرحوم کا پایہ علم و ادب و رجال و انساب و اخبار میں اتنا اونچا تھا کہ اس عہد میں اس کی نظیر مشکل تھی۔ جو کتاب دیکھتے تھے وہ ان کے حافظہ کی قید میں آجاتی تھی۔ سینکڑوں نادر عربی قصائد ہزاروں عربی اشعار اور لغات اور انساب نوک زبان تھے۔ ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علماء و ادباء اور محدثین کی وسعت حافظہ کی جو عجیب و غریب مثالیں تاریخ میں مذکور ہیں وہ یقیناً صحیح ہیں"۔ شادی کے بعد اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ انہوں نے صرف تین مہینہ میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

عادات و اخلاق:- سورتی صاحب نہایت سادہ مزاج، بے تکلف، احباب پرور، فیاض اور مستغنی تھے۔ وہ مطالعہ کتب کے دلدادہ اور نادر کتب جمع کرنے کے شیدائی تھے۔ اگر کوئی نادر کتاب خرید نا ممکن نہ ہوتا تو اس کی نقل خود کر لیتے یا کسی کاتب سے کرا لیتے تھے۔ انہوں نے اپنا بہت بڑا قیمتی کتب خانہ چھوڑا۔ وہ علوم عربیہ و اسلامیہ کے طلباء کے بڑے ہمدرد اور مددگار تھے۔ ان کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے اور لوگوں کو مشورہ دیتے کہ اپنے ذہین بچوں کو عربی پڑھاؤ اور علوم اسلامیہ کی طرف متوجہ کرو۔ مسلکاً وہ اہل حدیث تھے اور نہایت درجہ متشدد۔ الحب اللّٰہ والبغض للّٰہ ان کا شعار تھا۔ حق کے اظہار میں وہ کبھی نہ چوکتے نہ کسی کی رعایت کرتے۔ علامہ خلیل بن محمد عرب نے ان کے مرثیہ میں بجا کہا ہے:-

یا جاھراً بالحق غیر مروّغ   ما خفت غیر اللّٰہ فی الجھاد

تعلیمی خدمات: وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ عربی کے صدر رہے جہاں ان سے بہت سے طلبہ نے کسب فیض کیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم احراری، پروفیسر محمد سرور اور ڈاکٹر ذاکر حسین ان کے ہونہار شاگردوں میں سے ہیں۔ چند ماہ انہوں نے مدرسہ رحمانیہ میں ادب و حدیث وغیرہ کی تعلیم دی تھی۔ پھر بمبئی میں قرآن و حدیث اور ادب عربی کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ "دار الحدیث" بنایا۔ انہوں نے اپنی بیماری کا آخری زمانہ علی گڑھ میں گذارا جہاں وہ گھر پر اساتذہ کی ایک جماعت کو درس قرآن و حدیث و ادب دیتے رہے۔ علی گڑھ

ہی میں ۲۳ شعبان ۱۳۶۱ بروز جمعہ (مطابق ۷ اگست ۴۲ ۱۹ء) انتقال ہوا۔

ایک شاعر نے مصرعہ تاریخ یہ کہا ہے:۔

یک آفتاب علم و عمل زیر خاک شد

۴۲ ۱۹ء

تصانیف اور تحقیقی و تنقیدی مقالات:۔ ابتداء میں انہوں نے "ابو ہریرہ رضؓ" پر ایک رسالہ لکھا جس میں اسے غیر منصرف ثابت کیا ہے اور اس پر دلائل و شواہد پیش کیے ہیں۔ اس رسالہ پر اس زمانہ کے اساتذہ نے تقاریظ لکھی تھیں۔ عربی کے منتخب اشعار کا مجموعہ "ازہار العرب" لکھا، جو شائع ہو کر متعدد امتحانات میں بطور کورس مقرر ہوتا رہا۔ اردو میں "علم الصرف" پر ایک جامع و مبسوط کتاب لکھی جو قواعد عربی کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

حیدر آباد کے دائرۃ المعارف کے لیے انہوں نے ابن درید کی گراں قدر تصنیف جمہرۃ اللغۃ نیز ابن القطاع کی کتاب الافعال، اور خطیب بغدادی کی "الکفایہ" کی تصحیح کی تھی۔ انہوں نے بندوق سے شکار کے مسئلہ پر عربی میں ایک کتابچہ بھی لکھا تھا جس میں ثابت کیا تھا گولی لگنے سے جو شکار مر جائے وہ حلال ہو گا۔ علمی اور ادبی دنیا میں ان کی عظیم خدمت دیوان حضرت حسان بن ثابت رضؓ کی طویل و مفصل شرح ہے جو تقریباً ایک ہزار صفحات قلمی ہے اور صرف "دال" کے حرف تک مکمل ہوئی ہے۔ ابن حزم اندلسی سے انہیں خاص شغف تھا اور اس پر انہوں نے بہت کچھ کام بھی کیا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی "کتاب التوحید" کا اردو ترجمہ کیا جو مع حواشی شائع ہو چکا ہے۔ آخر میں ایک عربی اردو لغت انجمن ترقی اردو (ہند) کے ایماء پر لکھ رہے تھے جو تقریباً حرف عین تک لکھ سکے۔ اور ان کے بعد اس کا بقیہ حصہ راقم الحروف نے مکمل کیا۔

ان کے علمی ادبی، تحقیقی و تنقیدی اور دینی مقالات و رسائل بے شمار ہیں، بیشتر علمی و ادبی و تنقیدی مضامین "معارف" اعظم گڑھ اور "جامعہ" دہلی میں شائع ہوتے تھے۔ تنقیدی مقالات کے سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی رحؒ کی سیرت پر تنقید بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

اثبات حدیث و سنت کے لیے وہ قرآن سے دلائل پیش کرتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی ایک تصنیف "احسن الحدیث فی اثبات حجیۃ الحدیث" ہے جو شائع نہ ہو سکی، نیز عالم برزخ کے نام سے ایک کتابچہ ہے جو "معارف" میں بھی شائع ہوا تھا۔

ان کی شاعری:۔ جاہلیت عرب کی شاعری سے دلچسپی اور اس پر عبور نیز لغت میں مہارت کی وجہ سے ان کی شاعری میں ثقیل و غریب الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کا اسلوب خالص جاہلیت کی شاعری سے ملتا جلتا ہے۔ البتہ شاعری میں جدید ایجادات ان کی جدت پسندی کی دلیل ہے۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ دینی موضوعات پر مشتمل ہے۔

ویسے مدح، غزل، عتاب وہجو، مرثیہ و وصف میں بھی انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ دینی غلبہ کی وجہ سے وہ غلو اور مبالغہ سے کام نہیں لیتے لہٰذا ان کی شاعری میں معنوی بلندی تو ملتی ہے لیکن شاعرانہ ٹیپ ٹاپ اور مبالغہ آرائی ناپید ہے۔ ایک جگہ اپنے متعلق وہ خود کہتے ہیں:۔

ولست بشاعر السفساف انی — ابی لی ذالکم دینی و عدّی

میں شاعر یاوہ گو نہیں ہوں۔ ان لغویات سے مجھے میرا دین اور میری وسیع معلومات باز رکھتی ہیں۔

ان کی شاعری میں زہد اور شکوۂ احباب کا عنصر نمایاں ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں بھی انہوں نے قصیدے کہے ہیں۔

شاعری کا نمونہ:۔ ایک طویل مدحیہ قصیدہ میں جس کا مطلع ہے:۔

ودع اُمینة حان منك رحیل — و اخوالصبابة للوداع یمیل

امینہ کو وداع کہو کہ کوچ کی گھڑی آگئی ہے اور عاشق کو وداع سے پالا پڑتا ہی ہے۔

ابتدائی تشبیب کے بعد گریز کے لیے وہ بجائے اونٹ کے جدید سواری ریل کا ذکر کرتے ہیں:۔

فاذا عرتك من الزمان ملمة — فنجاة امرك فیه هذا الریل
فاركبه من سار علی علاته — یطأ الاكام لهن منه الیل
یمشی علی كرة یضج تأوهاً — كغمامة قصف لها تزجیل
تمشی الریاح وراءه وكانها — وكانه قطم تلته افیل
دعّبة فی سیره جوابة — فاللیل والایام فیه مثیل
وامامه حاد اصم كانه — جن یدا بمهامه مغلول
یستاقه فی شدة و صرامة — نار وماء فی حشاه ثمیل
یعدو علی صمم یواصل مشرقاً — من مغرب وكذا له التعدیل
فیسیر اسبوعًا بساعات كذا — شهراً بیوم لیس فیه حویل
یطوی البلاد قفاره وبحاره — و سهوله و وعوره فیجول
هذا الذی یمشی بنا متحزما — عند الامیر له النّدیٰ داصول

جب زمانہ کے ہاتھوں تجھے کوئی حادثہ پیش آئے تو اس سے نجات کی صورت یہ ریل ہے۔ اس پر سوار ہو کر سفر کر، یہ ہر حالت میں رواں رہتی ہے۔ کنکروں اور پتھروں کو اڑاتی چلی جاتی ہے۔ وہ گیند کی طرح تیزی سے گھومنے والے پہیوں پر بادل کی طرح گرجتی کڑکڑاتی ہوئی گڑگڑ

ہوئی چلتی ہے۔ ہوائیں اس سے پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی ایک غضب ناک ساربان ہے اور ہوائیں اس کے اونٹوں کے بچے ہیں جو پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ نہایت تیز روی سے یہ اپنے فاصلے طے کرتی ہے اور دن و رات اس کے لیے یکساں ہیں۔ اس کے آگے انجن ہے جو بڑا بھاری اور قدآور ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگلوں کا دیو ہے جسے جکڑ کر قابو میں لے لیا گیا ہے۔ اس کے پیٹ میں آگ اور پانی بھرا ہوا ہے۔ یہ تیزی اور قوت سے گاڑی کو ہانکتا لیے چلا جاتا ہے۔ لوہے کی سخت پٹڑیوں پر دوڑتا ہے اور مشرق و مغرب کو ایک کرتا ہے۔ ہفتوں کی منزلوں کو یہ گھنٹوں میں اور مہینوں کی منزلوں کو یہ دنوں میں طے کرتی ہے۔ دریاؤں، جنگلوں، نرم اور سخت زمینوں، سب ہی کو یہ طے کرتی ہے۔ یہ ہے وہ سواری جو ہمیں صاحب جود و سخا امیر (ممدوح) کے پاس پہنچا دے گی۔

اسی قصیدہ میں جب وہ ممدوح کی تعریف کرتے ہیں تو دینی غلبہ انہیں بجائے مدح کے پند و نصیحت پر مجبور کر دیتا ہے:۔

امّا المعازف والملاهی کلها	فبمثل امرك ينبغی التبديل
يا حبذا ان كنت تسعٰی فی الهدی	تعليم دين الله وهو وسيل
القوم اصبح علمهم بطلانهم	هجروا الكتاب فما اليه سبيل
فابن المدارس للكتاب ونشره	والسنة الغراء فهی اصيل
يا ايها الملك العزيز جنابه	الدهر فان فاعلمن وغول
فاعمل لربك شاكراً متبصرًا	ترضی مغبته غداة تحول
واعلم بانك قائم يوما لدیٰ	رب الانام تجاهه فتقول
ماذا تقول غداة تلقی احمدا	والدين مهجور الفناء ذليل؟

یہ کھیل کود، یہ آلات طرب، آپ جیسے آدمیوں کو چاہیے کہ ان سب کو بدل ڈالیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ دین اللہ کی طرف رہنمائی کرنے میں کوشاں ہو جائیں یہی بنیادی معاملہ ہے۔ قوم کا علم غلط ہوتے جا رہا ہے، قرآن کریم کو وہ چھوڑ بیٹھی ہے اور اس تک پہنچنے کا راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ آپ قرآن مجید کی تعلیم کے لیے درس گاہیں بنایئے اور سنت غراء کو عام کیجیے۔ اے عالی مرتبت بادشاہ! یہ دنیا فانی ہے اور پر فریب غور و فکر اور شکر سے اپنے رب کی خوشنودی کے کاموں میں لگ جایئے۔ کل اس کا نتیجہ بڑا خوش کن ہو گا اور یقین رکھیے کہ آپ کو ایک دن خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر جواب دینا ہو گا۔ آپ جب روز حشر نبی اکرم ؐ کے سامنے پہنچیں گے اور دین اس کس مپرسی کے عالم میں ہے، تو بتایئے اس وقت انہیں آپ ؐ کیا جواب دیں گے؟

شاہ ولی اللہ کے مزار پر کہے ہوئے ایک قصیدہ میں کہتے ہیں:۔

لقد کان لا یبالو عن الحق ساعۃ ——— وحق لہ ان یدعی بمحقق

اذا قال ابدی حجۃ اللہ قاطعا ——— و فصل عن اقوال کل مزنق

وہ ایک گھڑی بھی حق سے کوتاہی نہ کرتے تھے۔ انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ "محقق" کہلائیں جب وہ کوئی مسئلہ بیان کرتے تھے تو قطعی طور پر اللہ کی حجت آشکارا کر دیتے تھے اور ہر غلط آمیز کی غلطیاں کھول کر بیان کر دیتے تھے۔

اپنے استاد علامہ محمد طیب عرب کے مرثیہ میں کہتے ہیں:۔

لیبکک علم الدین والقسرانہ ——— غریب بھذا العصر یدا لی ویسحب

لقد کان یبدی الحق محضا لطالب ——— ویزری باقوال سخاف ویضرب

اذا اعضلت بالقوم عقدۃ ایۃ ——— رما ھا یقول صائب فتنشعب

علم دین و تفسیر تیرا ماتم کریں گے کہ تیرے بعد اس زمانہ میں وہ بے یار و مددگار ہو گئے۔ وہ طالب کے لیے خالص حق واضح کر دیتے تھے اور واہیات و کمزور بات کو اُڑا کر رکھ دیتے تھے۔ جب لوگوں کے لیے کسی آیت کا مفہوم سمجھنا مشکل ہو جاتا تو وہ اس کی صحیح تفسیر کرتے تھے۔

اہل حدیث کی مدح میں کہتے ہیں:۔

اھل الحدیث عصابۃ نبویۃ ——— ترضی بفعل المصطفیٰ وبامرہ

وتحط رای الناس او اقوالھم ——— حط السیول الصخر اعلی صخرہ

"اہل حدیث" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کرنے والی جماعت ہے۔ یہ جماعت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و احکام پر راضی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں لوگوں کی آراء و اقوال کو نہایت بے دردی و حقارت سے پھینک دیتی ہے۔

"وہابی" لقب کے متعلق کہتے ہیں:۔

ان کان ھدی محمد و سبیلہ ——— ذالک التوھب فادعنی وھابی

اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے طریقہ پر کاربند ہونے کا نام تم لوگوں نے وہابی رکھا ہے تو پھر میں وہابی ہوں اور تم مجھے وہابی کے لقب ہی سے پکارو۔

———— :O: ————

ختم شد

